پاکستان سے بنگلہ دیش
اَن کہی جدوجہد
ایمبیسیڈر لیفٹیننٹ کرنل (ر) شریف الحق دالیم (بیر اُتم)

پاکستان سے بنگلہ دیش

اَن کہی جدوجہد

Bangladesh

Untold Facts

ایمبیسیڈر لیفٹیننٹ کرنل (ر) شریف الحق دالیم

مترجم: رانا اعجاز احمد

جُمہوری پبلیکیشنز

Independent & Progressive Books

• نام کتاب۔ پاکستان سے بنگلہ دیش۔اَن کہی جدوجہد
• مصنف:ایمبیسیڈر ریفٹیننٹ کرنل (ر) شریف الحق دالیم
• ترجمہ:راناا عجاز احمد • اشاعت۔2021ء
• سرورق: مصباح سرفراز • ناشر۔جمہوری پبلیکیشنز لاہور

ISBN:978-969-8455-98-9

قیمت 1200 روپے

درج بالا قیمت صرف اندرونِ پاکستان

اہتمام: فرخ سہیل گوئندی

Find us on

Jumhoori Publications

2 Aiwan-e-Tijarat Road,Lahore-Pakistan
T: +92-42-36314140 +92-42-36283098
WhatsApp: 0333-4463121
info@jumhooripublications.com
www.jumhooripublications.com

انتساب!

ان عظیم اور قابل احترام
افراد کے نام جو
آزادی، صداقت، بنیادی انسانی حقوق
اور انصاف کے قیام
کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں

فہرست

ناشر نوٹ

پاکستان کی سیاسی تاریخ المیوں اور بحرانوں سے بھری پڑی ہے۔ پاکستان، دنیا کا واحد ملک ہے، جہاں پر اکثریتی عوام (مشرقی پاکستان) نے اپنے سے کم آبادی والے مغربی پاکستان سے علیحدگی حاصل کی۔ مشرقی پاکستان کا المیہ صرف پاکستان ہی نہیں بلکہ 1947ء کے بعد خطے کا ایک اہم ترین واقعہ تھا۔ بنگال کے عوام، پاکستان کی تحریک کے بانی شمار کیے جاتے ہیں، پھر انہوں نے پاکستان یا مغربی پاکستان سے جدائی کا فیصلہ کیوں کیا؟ اس کے بارے میں ہمارے ملک میں تحقیقی بنیادوں پر کوئی کام ہوا نہ اُن وجوہات کو گہرائی میں جاننے کی کوشش کی گئی کہ، چاہتوں اور محبتوں کے پیکر، برصغیر میں فکر و دانش اور علم و فن کے دلدادہ عظیم بنگالی مغربی پاکستان سے الگ ہونے پر کیوں مجبور ہوئے۔ علیحدگی کے اس عمل میں پاکستان کی اشرافیہ نے جن جرائم کا ارتکاب کیا، ان کی بھی شعوری طور پر تحقیق نہیں کی گئی، سوائے اس کے کہ بنگلہ دیش کے قیام کی ذمہ داری چند افراد پر ڈال دی گئی جو کہ ایک درست رویہ نہیں۔ بنگال کے لوگوں نے کن مصیبتوں اور ناانصافیوں کا سامنا کیا، وہ ایک دردناک کہانی ہے، جس کے حوالے سے بنگلہ دیش میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ بنگال کے عوام نے ملٹری آپریشن کے دوران کن چیرہ دستیوں کا سامنا کیا، اس حشر کی کوئی ہلکی سی تصویر بھی ابھی تک ہمارے ہاں پیش نہیں کی گئی۔ برصغیر میں اس عظیم المیے کے حوالے سے چند ایک تحریریں ہی سامنے آئی ہیں اور وہ بھی خال خال اُن لوگوں کی ہیں جنہوں نے اپنی آنکھوں سے ملٹری آپریشن اور بنگال کے عوام کی تحریک کو اُبھرتے دیکھا۔ بنگلہ دیش کے قیام کے بعد وہاں کیا ہوا، اس بارے ہماری معلومات سرے سے ہیں ہی نہیں اور یوں ہم مشرقی پاکستان کی علیحدگی اور بنگلہ دیش کے قیام کے بعد کی صورتِ حال کو اپنی مخصوص نظروں سے دیکھتے ہیں۔

زیرِ نظر کتاب ایک ایسے انقلابی فوجی افسر اور کامیاب سفارت کار کی فکر انگیز قلم سے ہے، جس کے خاندان نے تحریک پاکستان کی بنیادیں رکھنے میں اہم کردار ادا کیا اور وہ خود پاک فوج کے محبِ وطن سپاہی کے طور پر بھی ایک جرأت مند شخص مانا گیا۔ اس کتاب میں مصنف نے اُن حالات کا ذکر کیا ہے کہ وہ کس طرح

پاکستان کے سپاہی سے بنگلہ دیش کی آزادی کی جنگ کا ہیرو بن گیا۔ بنگلہ دیش کے قیام کے بعد لیفٹیننٹ کرنل شریف الحق دالیم نے نئے ملک کی تعمیر میں بھی اہم اور بنیادی کردار ادا کیا۔ اسی اثناء میں انہوں نے وہاں آئینی آمریت کو اپنی آنکھوں کے سامنے جڑ پکڑتے دیکھا اور اس کے خلاف جدو جہد پر نکل پڑے۔ یہ کہانی تین ادوار پر مشتمل ہے؛ پاکستان، بنگلہ دیش کی جنگِ آزادی اور وہاں پر آئینی آمریت کے خلاف پرچم بلند کرنا۔ اس حوالے سے یہ کتاب پاکستان میں شائع ہونے والی ایسی پہلی کتاب ہے، جو تاریخ کے پوشیدہ اور اہم ابواب میں ان واقعات وحالات کو بے نقاب کرے گی جو قاری کو حیرت زدہ کر دیں۔ ہمارے ادارے کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ ہم نے اس موضوع سے متعلق ہر نقطہ نظر کو شائع کرنا اپنا قومی فریضہ سمجھ رکھا ہے تاکہ شفاف اور حقیقی تاریخ عوام کے سامنے پیش کی جا سکے، جس کو جاننا پاکستان کے عوام کا بنیادی حق ہے۔ اپنے موضوع کے حوالے سے یہ کتاب ایک ایسی اہم ترین تاریخی دستاویز ثابت ہوگی جو اس معاملے میں موجود بے پناہ تشنگی اور خلا کو بڑی حد تک پُر کر سکے گی۔

فرخ سہیل گوئندی

15 فروری 2012ء

عرضِ مصنف

بہت سے افراد نے بنگلہ دیش اور اس کی جنگِ آزادی کے بارے میں لکھا ہے، لیکن شاید مکمل حقائق کسی نے بھی بیان نہیں کیے۔ اصل حقائق انتہائی عبرت انگیز اور تکلیف دہ ہیں۔ جن لوگوں نے شیخ مجیب الرحمان کی مخالفت کی تھی اور ابتدا سے ہی اپنے آپ کو بدترین کے لیے تیار کر رکھا تھا، شاید ان کے لیے یہ زیادہ تکلیف دہ ثابت نہیں ہوئے ہوں گے۔ لیکن وہ لوگ جو مجیب الرحمٰن پر اندھا اعتماد رکھتے تھے، ان کے لیے مجیب کی اس مہم جوئی کے افسوسناک نتائج کا سامنا کرنا یقیناً مشکل ثابت ہوا ہوگا۔

شیخ مجیب ایک انتہائی پیچیدہ شخصیت کے مالک تھے وہ اتنے سادہ انسان نہیں تھے، جتنے نظر آتے تھے۔ اسی طرح ہماری جنگ آزادی بھی بے شمار گنجلک اور پیچیدہ واقعات اور شواہد پر مشتمل تھی۔ لٰہذا وہ تمام معاملات جن کا میں نے اس کتاب میں ذکر کیا ہے، وہ ایک علیحدہ تجزیے کے مستحق ہیں۔ آزادی سے پہلے کی تحریک میں شیخ مجیب الرحمٰن بنگالیوں کے ایک غیر متنازع اور محبوب رہنما تھے لیکن آزادی کے بعد وہ ایک ایسے آمر کی صورت میں سامنے آئے جن سے عوام شدید نفرت کرنے لگے تھے۔

شیخ مجیب کے ان دو مختلف چہروں کے درمیان واقعات اور حادثات کا ایک لمبا سلسلہ موجود ہے جو 15 اگست 1975ء کے انقلاب پر منتج ہوئے۔ میں نے ان تمام واقعات اور حادثات کو ان لوگوں کی زبان اور نقطہ نظر سے بیان کرنے کی کوشش کی ہے جو اس جدوجہد آزادی میں اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے سیاسی واقعات کے محض خاموش تماشائی نہیں تھے بلکہ عملی طور پر ان تمام میں حصہ دار تھے۔ میں نے یہ بھی کوشش کی ہے کہ عوام کے ذہنوں میں جنم لینے والے مختلف سوالات اور خدشات کے ازالے کے لیے ان افراد کے نقطہ نظر کو بھی بیان کروں جو قوم میں ایک قابل احترام اور باعزت مقام رکھتے ہیں۔ اس کتاب کا مقصد عوام پر کسی قسم کے نظریات یا خیالات کو ٹھونسنا نہیں ہے بلکہ ان کے سامنے ایسے حقائق پیش کرنا ہے جن کا وہ از خود تجزیہ کر کے سچائی کو تلاش کر سکیں۔

سُرمئی عقاب

1964ء میں اس نے پاکستان ایئر فورس اکیڈمی رسالپور میں فائٹر پائلٹ کی تربیت مکمل کی اور 1965ء کی پاک ہند جنگ میں مغربی پاکستان کی فضاؤں کی حفاظت میں پروازوں کے دوران اپنے ساتھیوں سے ''سرمئی عقاب'' کا خطاب پایا۔ ناقابلِ شکست پاک فضائیہ کے شاہینوں کے ہمراہ وہ بادلوں سے اوپر ہواؤں میں اڑا لیکن اس کا دلِ ہمیشہ ان سے نیچے اس مٹی میں ہی رہا جہاں مشرقی بنگال کے آتش بجاں (فسٹ ایسٹ بنگال رجمنٹ) لاہور کے تحفظ میں اپنی جانوں کے نذرانے پیش کررہے تھے۔ پاکستان کی مٹی اور سرزمین، جس سے والہانہ عشق اسے اپنے ان آباء سے ورثے میں ملا تھا جنہوں نے 1906ء میں ڈھاکہ میں مسلم لیگ کے قیام کی صورت میں پاکستان کی بنیاد رکھی تھی۔ ڈھاکہ کے ایک ممتاز اور متمول گھرانے سے اس کے والد، دادا اور نانا برِصغیر میں اسلامی قومیت کے احیاء اور تجدّد کے علمی سرچشمے علی گڑھ کے فارغ التحصیل اور مسلم لیگ کے ہراول دستے کے علمبرداروں میں سے تھے۔ علم اور ایمان کی حرارت تو تھی ہی لیکن اصلاً وہ عمل کا غازی تھا۔ پاکستان کی مٹی کی کشش اور محبت میں ایک روز وہ لڑاکا طیارے کی کاک پٹ سے نکلا اور 1966ء میں پاکستان ملٹری اکیڈمی کے کیڈٹوں کی صف میں آ کھڑا ہوا۔ شمالی چٹانوں کے سے جفاکش ڈیل ڈول، صورِ اسرافیل کی سی اپنی گرجدار آواز، سندربن کے رائل ٹائیگرز جیسی باوقار چال ڈھال اور کاکول کے کالے گراؤنڈ کو اپنی ایڑیوں کی ضرب سے پانی پانی کردینے والا شریف الحق دالیم پاکستان ملٹری اکیڈمی کا پہلا اور آخری بانکا بنگالی بٹالین سارجنٹ میجر ثابت ہوا۔ زیرِ تربیت کیڈٹوں کو ان کی صلاحیتوں کی بنیاد پر ملے عارضی عہدوں میں بٹالین سارجنٹ میجر تیسرا بڑا عہدہ تھا جسے برفانی بھیڑیوں کا سا انداز اختیار کرتے ہوئے اپنے ساتھی کیڈٹوں اور جونیئرز کے شہری اور دیہی راحت وآرام اور آزادیوں کے خُو گر رگ وپے میں عسکری نظم وضبط اتارنا تھا۔ یہ ڈھلائی ہی تو انہیں سرد اور گرم تربیت گاہوں کو پسینہ اور آگ اگلتی سرحدوں کو خون کا نذرانہ دینے کے قابل بنا سکتی تھی۔ بنگالی سارجنٹ میجر نے یہ ڈھلائی اس انداز میں کی کہ کاکول کے در و دیوار اور اونچے سَرو اسے اب بھی یاد کرتے ہیں۔ وہی نہیں اس کے ساتھی کیڈٹ بھی جن میں سے بائیس جنرل کے رینک کو پہنچے، اسے کہیں پیار کے ساتھ، کہیں شکووں، کہیں مرعوبیت، کہیں رشک بھرے اور کہیں ماضی کے

رومان میں ڈوبے ہوئے جذبات سے یاد کرتے ہیں۔کوئی اسے چنگیز اور ہلاکو سے تشبیہ دیتا ہے،کوئی ڈھاکہ کا بدمعاش،کوئی پی ایم اے کا جگا اور اٹیلا دی ہن ،نا قابلِ شکست سارجنٹ میجر کو پی ایم اے کے باکسنگ رنگ میں اس کی طاقت، پنچ اور مارنے کیسس کلے (محمد علی) کا عرفِ عام دلوایا لیکن ایک امر پر اب بھی وہ سب متفق ہیں کہ اگر میجر والیم ڈھاکہ پر جنرل آغا محمد یحییٰ خان کی یلغار کے نتیجے میں جنم لینے والے بنگلہ دیش کی پکار پر کوئٹہ گیریژن سے لبیک کہتے ہوئے 13/14 اپریل 1971ء کی تاریک شب سرحد پار نہ کر جاتا تو 38ویں پی ایم اے کے جرنیلوں میں وہ یقیناً ایک نمایاں نام ہوتا۔

زندگی بھر کسی نہ کسی مشن اور بھلے مقاصد کے تابع رہتے ہوئے اس نے اپنی ذات کی ہمیشہ نفی کی۔نفی کی یہ روایت اس نے امن اور جنگ اور سفر وحضر ہر صورتِ حال اور ہر مقام پہ قائم رکھی۔وہ 25 مارچ 1971ء کے المیے کے بعد مغربی پاکستان سے ناتا توڑ کر کلکتہ کے ''مجیب نگر'' میں قائم ''بنگلہ دیش'' کی عبوری حکومت سے جا ملنے والے پہلے 3 بنگالی افسروں کا قائد اور رہبر تھا۔ مجیب نگر میں بنگلہ دیش کے عبوری صدر نذرالاسلام، عبوری ''وزیر اعظم'' تاج الدین، وزیر خارجہ مشتاق احمد کھنڈکر، وزیر خزانہ قمر الزمان اور منظم ہوتی بنگلہ دیش مکتی باہنی (آزاد فوج) کے کمانڈر انچیف پاپا ٹائیگر جنرل ایم اے او جی عثمانی نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ وہ سب اسے ذاتی اور خاندانی حوالوں سے بہت عزیز رکھتے تھے۔اس کے لیے عبوری حکومت کا حصہ ہو جانا معمولی سی بات ہوتی لیکن اس نے فرار کے دوران اپنے ہم سفر لیفٹیننٹ نور کو جنرل عثمانی کے ملٹری سیکرٹیری کے طور پر چھوڑا اور خود تیسری بنگال رجمنٹ کے لیفٹیننٹ مطیع الرحمٰن کے ساتھ آگ اور بارود میں ڈھکی سرحد کی طرف بڑھ گیا۔ بہاولنگر سے پاکستانی سرحد عبور کرتے ہی اس کا چرچا بھارتی عسکری ہائی کمان میں دور دور تک پہنچ گیا تھا۔مکتی باہنی کی تربیت اور انتظام وانصرام کا ذمہ دار اور بانی جنرل اُبان سنگھ چند روز میں ہی اس کی عسکری امور پر گرفت اور جنگی صلاحیتوں کا معترف اور مداح ہو گیا۔ ڈھاکہ کے انار (والیم) کی شہرت بھارتی وزیر اعظم اندرا گاندھی تک جا پہنچی اور وہ لاکھوں مشرقی پاکستانی باغیوں اور مہاجرین کے تین میں پہلا اور آخری باغی قرار پایا جس کی سیاسی پناہ کا محضر نامہ جواہر لعل نہرو کی بیٹی نے اپنے دستخط سے جاری کیا۔ اگر وہ چاہتا تو نہ صرف عبوری حکومت کا اہم حصہ ہو سکتا تھا بلکہ کلکتہ میں قیام کے دوران وہ بھارت کی مشرقی کمان کے جنرل جگجیت سنگھ اروڑا کے فورٹ ولیم ہیڈ کوارٹر کے ''مہربان'' سائے تلے مستقبل کے ڈھاکہ کی نئی کہکشاں کی طرف عمودی پرواز بھی کر سکتا تھا۔ جنرل ابان سنگھ نے جس کا اِس باکمال پاکستانی باغی سے دیکھتے دیکھتے قلبی تعلق اور رشتہ سا بن گیا تھا،اسے پیشکش کی کہ وہ پاکستان آرمی اور اس کے سابقہ سرحدی دستوں پر مشتمل مکتی باہنی کے مقابلے میں انڈین آرمی کے زیر سایہ ایک الگ فورس کی تشکیل میں مدد دے جو اس کے اپنے زرّیں مستقبل اور انڈیا بنگلہ دیش دوستی،تعاون اور یکجہتی کی ضمانت بنے۔اپنی ذات کی تو وہ مستقلاً نفی کر ہی چکا تھا،اِس پیشکش نے اس پر بھارتی عزائم کا پردہ چاک کر دیا۔اس کے انکار کے بعد یہ متوازی فورس قادر صدیقی اور عوامی لیگ کے ان رہنماؤں کے زیر سرپرستی تشکیل دی گئی جو اپنا تن من دھن بھارت سے وابستہ کر چکے تھے۔اِس متوازی

فورس کو بالآخر پاکستان کی تربیت یافتہ اس باغی سپاہ مکتی باہنی کی جگہ لینا تھی جو بنگلہ دیش کی آزادی کے بعد کروٹ بدلتے ہوئے ماضی کے پُلوں کو بحال کرسکتی تھی۔ مجیب نگر میں چندروزہ قیام نے اس کے اندر کے مسلمان کو بیدار ہی نہیں جھنجوڑ کے رکھ دیا تھا۔ ان بھارتی عزائم کے پیش نظر بنگلہ دیش کی جدوجہدِ آزادی کے پیچیدہ اور دشوار گزار میدان میں اترنے کے ساتھ ہی اس نے زمین اور آسمان سے یہ عہد و پیمان کرلیا تھا کہ وہ مسلم بنگال کو اس کی وہی روح واپس لوٹائے گا جس نے 1906ء میں ڈھاکہ میں جنم لیا تھا۔

میدان جنگ کے ہراول میں کھڑا ہونے کے اپنے فیصلے کے مطابق اسے مکتی باہنی کا گوریلا ایڈوائزر مقرر کردیا گیا...... اسی مقام سے اس نے بھارتی سرزمین پر رہتے ہوئے مشرقی پاکستان کی سرحدوں پر منڈلاتے اور اس کے طول و عرض میں جنگ و جدل میں مصروف گوریلا دستوں سے وہ رشتے استوار کیے جو بنگلہ دیش کی آزادی کے بعد وہاں 15 اگست 1975ء کے انقلاب کا ہراول، بازوئے شمشیرزن اور قلب ونگاہ بنے۔ کرائے کے بھارتی گوریلوں، اور ''را'' کے تنخواہ دار کارندوں، سیاسی ٹھگوں اور خاندانی لٹیروں کے ہجوم نے متلوّن مزاج مستقلاً جذبات سے مغلوب اور قصیدہ گوؤں کی تعریف وتوصیف کے سمندر میں ڈوبے بنگلو بندھو شیخ مجیب الرحمٰن کی حدِ نگاہ کو بنگلو بھوّن اور دھان منڈی تک محدود کرڈالا تھا۔ اس کا کبھی ہمالہ کی مشرقی چوٹیوں کو چھوتا قد کاٹھ اور وجود اب صدارتی محل کی جھیل سمت ان کھڑکیوں میں سما گیا تھا جنہیں ملک کے طول وعرض پہ چھائے ظلم وستم، جبر وتشدد اور لوٹ مار کے خلاف عوامی ردِعمل کے خوف میں بند کردیا گیا تھا۔ دہلی سے ڈھاکہ واپسی کے ساتھ ہی اسے اپنی کوکھ سے جنم لینے والے فرینکسٹائن نے آلیا تھا۔ اپنے ہاتھوں اِس اسیری سے اس کی رہائی ممکن ہی نہ تھی۔ حسین شہید سہروردی کا منحرف کارکن، سنتوش کے مزدور اور انسان دوست رہنما عبدالحمید خان بھاشانی اور سراج سکدار جیسے اپنے ہاتھوں قتل ہوئے ہزاروں افسانوی کرداروں کے اپنی طرف بڑھے ہاتھ جھٹک دینے والا شیخ بنگالیوں کا دوست ثابت ہوا تھا، نہ فراخدل قائد اور نہ ہی طوفانوں سے نکل کر آتی کشتی کا ''رفوگر''۔ نوکے کی شکستگی کا چارہ گر۔ جارج واشنگٹن نہ گیری بالڈی، اتاترک نہ نیلسن منڈیلا۔ مکتی باہنی کے متوازی کھڑی کی گئی مجیب باہنی، راکھی باہنی، نیل اور لال باہنی، قادر باہنی اور شیچھاشبک رضا کاروں پر مشتمل ''منگول'' لشکر نے بنگلہ دیش کو تہ و بالا کردیا، عام شہری اور سیاسی کارکن تو ایک طرف مکتی باہنی (فوجِ آزادی) کے ہزاروں بھی اس کا شکار ہوئے۔ بھارتی افواج کی طرف سے بقول مولانا بھاشانی سولہ ہزار کروڑ کی لوٹ مار کی زبانی کلامی اور بالآخر مسلح مزاحمت کرنے والے میجر جلیل جیسے جدوجہد آزادی کے کئی ہیروز کو جلا وطن کردیا گیا۔ اگر بھارتی مالِ غنیمت میں سے کچھ بچ گیا تھا تو اسے منگول لشکر لے اُڑا۔ پاکستانی عسکری آمریت سے نجات حاصل کرنے والا بنگال اب اپنے فسطائی حکمران ٹولے کے زیرِ سایہ خاک وخون میں نہا رہا تھا۔

15 اگست 1975ء کو شریف الحق دالیم اور مکتی باہنی میں اس کے جدوجہد آزادی کے ساتھیوں نے عالمی سطح پر مسلّمہ بدعنوان سیاسی قتل و غارت میں طاق فسطائی حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک طویل عرصے کے لیے ''فاتح'' بھارت بھی بنگلہ دیش کی اُس مقدس سرزمین سے بے دخل ہوگیا جسے اندرا

گاندھی نے اپنے آخری ایام میں کفِ افسوس ملتے ہوئے ایک بار پھر دوسرا پاکستان قرار دے دیا تھا۔ بھارت کے یوم آزادی کے روز لگنے والی یہ چوٹ نا قابل برداشت تھی۔ ایسی کہ لال قلعے میں بھارتی مسلح افواج کی پریڈ کے دوران روسٹرم پر مشیر ایل۔کے۔جھا کی طرف سے بنگلہ دیش میں انقلاب اور شیخ مجیب الرحمٰن کی ہلاکت کی سرگوشی سنتے ہی وہ اپنا دِل پکڑے خطاب ادھورا چھوڑ کر چلی گئیں۔ اسی دوران وزیر اعظم ہاؤس کی ایمرجنسی میٹنگ کے دوران حواس باختگی کے عالم میں سگریٹ کے کش پہ کش لگاتے ہوئے انہوں نے بنگلہ دیش پر فوری فوج کشی کا حکم دیا لیکن جنرل اِبان سنگھ نے جو انقلاب کے ہراول کے ہر رکن سے گہری ذاتی شناسائی رکھتا تھا، انہیں یہ کہتے ہوئے اِس انتہائی اقدام سے باز رکھا کہ اِس کے نتیجے میں دالیم اور اس کے ساتھی بنگلہ دیش ہی نہیں مغربی بنگال اور پورے خطے میں بھارت کے لیے نہ بجھنے والی مزاحمت کی آگ بھڑکا سکتے تھے۔ اعلیٰ ترین مشاورتی اجلاس میں موجود سب ہی سیاسی اور عسکری رہنماؤں نے جب اس کی تائید کی تو اندرا گاندھی نے سرد آہ بھرتے ہوئے تسلیم کیا کہ اکھنڈ بھارت کے احیاء کے اپنے خواب کی تعبیر دیکھنے کے جنون میں بنگلہ دیش کا قیام ان کی زندگی کی سب سے بڑی غلطی تھی!

16 دسمبر 1971ء سے ایک آدھ روز پیشتر مکتی باہنی کے کمانڈر انچیف جنرل عثمانی نے جو بنگلہ دیش بھارت جائنٹ کمانڈ کے بھی سربراہ تھے، میجر دالیم اور ان کے رفقاء کے زیرِ اثر، بھارتی ہائی کمان سے یہ مطالبہ کیا تھا کہ پاکستانی سپاہ کے ہتھیار ڈالنے کی تقریب ان کے سامنے ہوگی نہ کہ جنرل اروڑا کے حضور۔ وہ پاکستانی سپاہ کو اپنے اور ان کے ازلی دشمن کے سامنے سر جھکانے کی ذلت سے بچانا چاہتے تھے۔ لیکن جیت بہر حال مکتی باہنی کے متوازی کھڑے کیے گئے ''منگول'' لشکر اور اس بھارتی ہائی کمان کی ہی ہوئی جسے ہزار سالہ ہزیمتوں کا بدلہ لینے کا موقع مل رہا تھا۔ جنرل عثمانی اور ان کے رفقاء احتجاجاً اس تقریب میں شامل نہ ہوئے۔ 15 اگست 1975ء کا انقلاب تاریخ کی اگلی کروٹ ہی نہیں، ایک حوالے سے 16 دسمبر کا مسکت جواب بھی تھا۔ پاکستان دو لخت ہو گیا تھا لیکن اس کے نتیجے میں بھارت کے مشرق میں اس کے ایک کمزور صوبے کے مقابلے میں ایک ایسی اسلامی ریاست وجود میں آ گئی تھی جو کہیں بڑا درد ِسر ثابت ہو رہی تھی۔ 15 اگست ہندوستان کی انگریزوں سے آزادی کا دِن تو تھا ہی وہ شمال کے بنیوں سے بنگلہ دیش کی آزادی کا دِن بھی ثابت ہوا۔ پاکستان ملٹری اکیڈمی کا بٹالین سارجنٹ میجر، 62ویں فیلڈ کا باغی توپچی، ڈھاکہ کا انار، 38ویں پی ایم اے کورس کا تیسواں جنرل تو نہ بن سکا تھا لیکن بنگلہ دیش کا وہ ہیرو ضرور بن گیا جسے بھارت کی مشرقی سرحد پر کھڑے اٹھارہ کروڑ بنگالی تو کبھی بھلا نہ پائیں گے لیکن یہ ضروری تھا کہ اس کا ذکر بھارت کے شمال مغرب میں موجود ان کے سترہ کروڑ جڑواں پاکستانی بھی سنتے جن کا ماضی مشترکہ جدوجہد سے عبارت تھا، جو اپنوں اور غیروں کی ایک سی سازشوں اور مظالم کا نشانہ بنے اور جن کا مستقبل باوجود وقتی اور عارضی رکاوٹوں اور دشواریوں کے ایک دوسرے سے جُڑا ہوا تھا۔ ایک ہی آفاقی نظریے اور نظامِ حیات کے قائل پینتیس کروڑ لوگ جن کے دشمن اور حریف تو صدیوں سے مشترک تھے ہی، ہیرو اور باغی بھی اب مشترک ہو چکے ہیں۔

ذاتی طور پر میجر شریف الحق دالیم سے میری دو ہی یادیں وابستہ ہیں۔ 1970ء کے اواخر میں، میں اور فرسٹ ایسٹ بنگال رجمنٹ، سینئر ٹائیگرز سے میرا دوست لیفٹیننٹ حفیظ الدین احمد مشرقی پاکستان کے جیسور عسکری مستقر سے ایک ساتھ ہلکے ہتھیاروں اور جنگی معاملات کے کورس پر نامزد ہونے کے بعد انفنٹری سکول کوئٹہ میں زیرِ تربیت تھے۔ (حفیظ، پاکستان کی فٹ بال ٹیم کا کپتان، آزادی کے بعد وزیرِاعظم بیگم خالدہ ضیا کی کابینہ کا اہم رکن بھی رہا)۔ میجر دالیم اِن دنوں کوئٹہ میں مقیم 62 فیلڈ رجمنٹ آرٹلری میں بیٹری کمانڈر تھے اور اِس دوران ایک روز وہ حفیظ سے ملنے آئے۔

''ینگ مین۔ وقتِ رخصت مہمان ہم دونوں سے مخاطب ہوا،'' گھر، ملک، قومیں اور فوج کی یونٹیں اور دستے سب انصاف سے ہی بقاء پاتے ہیں، بے انصافی انہیں برباد کر دیا کرتی ہے۔'' اس نے مجھے اور حفیظ کو کوئٹہ شہر کے مشہور لال کباب کے لیے دعوت دی لیکن ہم دونوں کی اگلے روز کی بھاری مصروفیت کے پیشِ نظر معذرت قبول کرتے ہوئے افسر کوارٹرز کے گول پتھروں کے صحن میں کھڑی نیلی فوکسی میں بیٹھ گیا۔

''تم دونوں یاد رکھنا، انڈیا، مشرقی اور مغربی پاکستان دونوں کی تاک میں ہے۔ وہ جانتا ہے ڈھاکہ اور اسلام آباد، دو ہاتھ اس بھارت کا سینڈوچ بنا سکتے ہیں، جو خود کبھی ایک ملک تھا نہ اسے رہنا ہے۔'' کھڑکی کا شیشہ چڑھاتے ہوئے اس نے کہا تھا۔ تو پچی میجر اپنے کسرتی بدن، تھائی بُش شرٹ اور گیریژن کی اکلوتی نیلی فوکسی کے حوالوں سے البیلا اور رنگین مزاج دکھائی دے رہا تھا لیکن اس کی گہری اور پُر معنی، دوٹوک اور کھری گفتگو اس کے بھڑکیلے ظاہر پر حاوی نکلی تھی۔ افسر میس میں جہاں صبح دوپہر شام زیرِ تربیت افسروں کا آمنا سامنا ہونے کا موقع ہوتا، پیدل اور سوار دستوں کے مشرقی پاکستانی بجھے بجھے، سنبھلے سکڑے، اداس اور تنہا تنہا دکھائی دیتے تھے۔ میجر دالیمؔ مجھے ان سب سے جدا پُرعزم، پُرحوصلہ اور زندگی سے بھرپور دکھائی دیا تھا۔ میرا جی چاہا میں اسے دوبارہ اور بار بار مِلوں لیکن انفنٹری اسکول کی کمر توڑ مصروفیات نے ہم سب کو دنیا و مافیہا سے بے خبر کر رکھا تھا۔ ایسی دوسری ملاقات ہم دونوں کے مقدر میں نہ تھی، اگرچہ میدانِ جنگ میں ہم پھر آمنے سامنے ہوئے اور یہ ایسی ملاقات تھی جس میں گفتگو کا ذریعہ ہم نہیں ہمارے ہتھیار بنے، میرے ہاتھوں میں تنی 7.62 انچ دھانے کی سب مشین گن اور اس کے مجروح خون آلودہ ہاتھوں میں آگ برساتی 9 ملی میٹر دھانے کی سٹین مشین کاربائن۔

جولائی 1971ء کی ایک نصف شب اس نے میری بٹالین کے بالمقابل سرحد پار مورچہ بند مکتی باہنی کے آٹھویں باغی سیکٹر کے ایک بھاری نفرلڑا کا دستے کی قیادت کرتے ہوئے ہمارے بٹالین ہیڈکوارٹر پر انتہائی منظم، جارحانہ اور دلیرانہ شب خون مارا۔ مشین گنوں، ہلکی مارٹروں، رائفلوں اور راکٹ لانچروں کی اندھا دھند مار میں اس شب محمد پور کے مڈل اسکول میں مورچہ بند ہمارے ہیڈکوارٹر کے در و دیوار لرز اٹھے اور درختوں کا گھنا جھنڈ اپنے بال و پر کھو بیٹھا۔ نزدیکی پاک بھارت سرحد کے آر پار پھیلی دانت بھنگا جھیل اور ''کالے'' جنگل کی آڑ لیتے ہوئے وہ ہمارے سروں پر آ پہنچا تھا۔ بٹالین ہیڈکوارٹر میں اس قسم کی صورتِ حال کے مقابلے کے

لیے کسی محفوظ دستے کی عدم موجودگی میں، میں دفتری بابوؤں، افسروں کے اردلیوں اور باورچیوں کو لیے ممکنہ سرعت کے ساتھ اس کے تعاقب میں نکلا۔ ایک آدھ مقام پر ہمارا فائری تبادلہ ہوا لیکن مشن مکمل کرنے کے بعد وہ اپنے دستے کے ساتھ چھلاوے کی طرح سرحد پار کر گیا۔ طوفانِ باد و باراں اور اندھیری شب کے دوران بٹالین ہیڈکوارٹر کو یوں گولے بارود اور خاک و خون کی زد میں رکھتے ہوئے آٹھویں باغی سیکٹر کے کمانڈر نے اپنی تین کمپنیوں پر مشتمل ایک بٹالین سے سرحد کے اندر نفوذ کرتے ہوئے ہماری دو جنگی چوکیوں مندرہ اور کاک ڈانگا کو اپنے محاصرے میں جکڑ لیا۔ اگلے چار روز کی شدید، مسلسل اور خونریز لڑائی کے بعد ہی کہیں ہم وہ محاصرہ توڑنے کی پوزیشن میں آ سکے۔ اس لڑائی کے دوران گرفتار ہونے والے مکتی باہنی کے قیدیوں میں سے ایک سینئر سردار نے مجھے بتایا کہ محمد پور میں شب خون کی قیادت جو گھس بیٹھ اور کامیاب محاصرے کا اہم ترین ابتدائیہ تھا، گوریلا ایڈوائزر ''دالیم بھائی'' کر رہے تھے۔ محاصرہ ٹوٹنے کی شام مجھے نیلی فوکسی اور تھائی شرٹ والا وہ البیلا میجر بہت یاد آیا جس نے 1970ء کی خزاں میں کوئٹہ کی سنگلاخ زمین پر گھر، ملک، قوم، یونٹ اور دستوں میں انصاف کی ناگزیر اہمیت کا ذکر کیا تھا۔ پاکستان کا باغی سپاہی، مکتی باہنی کا گوریلا مشیر اور بنگلہ دیش کا ہیرو میجر شریف الحق دالیم جس نے کبھی دشمن کے مشرقی اور مغربی پاکستان دونوں کی تاک میں ہونے کا ذکر اور تنبیہہ کی تھی! اپنے قیام کے ساتھ ہی پاکستان عدم مساوات، حق تلفی اور بے انصافی کی راہ پر چل نکلا تھا۔ یونٹیں اور دستے ٹوٹ چکے تھے، اب گھر اور ملک ٹوٹ رہا تھا۔ دشمن مغربی اور مشرقی پاکستان ہر دو کی تاک میں تھا جب کہ ہم سب دانستہ اور نادانستہ اس کے ہاتھوں میں کھیل رہے تھے۔

سفیر کرنل شریف الحق دالیم اگر زندہ ہیں تو نہ جانے کہاں ہوں۔ مسحور کن سندر بن کے کسی دُور افتادہ جزیرے پر، مشرق کے تورا بورا آسام، رانگا ماٹی اور اراکان کے پہاڑی سلسلوں کی کسی کھوہ میں، دلپذیر ''سلہٹ'' کے چائے کے باغوں کی کسی سرسبز ڈھلوان پر یا گنگا میا اور جمنا پار کسی باڑی میں، دھیرج کے عادی دریا بھیرب کنارے یا 'کبوتر کی آنکھ' شفاف مغربی ندی کو باڈک کے آئینے میں یا عظیم پدما اور پایاب میگھنا کنارے کسی تنہا بھاشا میں۔ لیکن نہیں، یہ ممکن نہیں مجھے یقین ہے عظیم چین اور بنگلہ دیش کے رشتوں کی بنیاد رکھنے والا، مشرق بعید میں سنگاپور اور ہانگ کانگ سے افریقی مغریب میں لیبیا اور کینیا سے یوگنڈا، زمبیا، صومالیہ اور نائیجیریا تک سے اسے جوڑنے والا سفیر اور ہائی کمشنر، بنگلہ دیش پر تنے بھارتی بالادستی کے جال کو تار تار کر ڈالنے والا اس کا شجاع اور بہادر بیٹا ''بیر اُتم''، برہمنی سامراج کے شمال اور مشرق میں آزادی کے لیے برسرِ پیکار قوموں اور ان کے دستوں کا دمساز ''سرمئی عقاب'' اس جہاں یا اُس جہاں، جہاں بھی ہو گا وہ بنگلہ دیش اور اپنے لوگوں اور رنگ و نسل، زبان اور عقائد کی تمیز سے بالاتر رہتے ہوئے انسان کی فلاح و بہبود، حریتِ فکر و عمل اور اعلیٰ اقدار کے تحفظ کے لیے کوئی شمع جلائے ہوئے، کسی نئے سفر کسی اگلی منزل کو نکلا ہوا ہو گا۔ کسی اعلیٰ و ارفع پرواز پر کہ میدانی توپوں کے کمانڈر، گوریلا دستوں کے رہنما، فضائیہ کے شاہین اور حریتِ فکر و عمل کے پروانے کا آشیاں کرگسوں کے اس جہاں میں نہیں، وہیں کہیں ہو سکتا ہے جہاں آسمان اور زمین قوموں کے مقدر کے

فیصلوں کے لیے ملتے ہوں۔

ع قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

میں اپنے عزیز دوست فرخ سہیل گوئندی اور ریما گوئندی کا مشکور ہوں کہ پہلے تو انہوں نے سفیر کرنل شریف الحق دالیم کی خودنوشت Untold Facts کہیں سے حاصل کی اور پھر مجھے یہ موقع دیا کہ میں اب بھی ایک ہی خواب 1940ء کی قراردادِ لاہور کی تعبیر پاکستان اور بنگلہ دیش کی تاریخ کے خونچکاں باب کے اس ناقابلِ فراموش، زندہ جاوید کردار کو اپنے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کرسکوں۔

مجھے یقین ہے بہت جلد قاہرہ کے حزب التحریر، یمن کے چوراہوں، باسفورس کے پانیوں اور تیونس کی شاہراہوں پر طلوع ہونے والی صبح کی روشنی، مارگلہ کی پہاڑیوں سے بھی اُترے گی اور مسجدوں کی بستی ڈھاکہ کو بھی اپنی گداز محبت بھری لپیٹ میں لے رہی ہوگی۔ اس صبح پاکستان کا باغی، بنگلہ دیش کا ہیرو اور ڈھاکہ کا سفیر کرنل شریف الحق دالیم ہی نہیں، 1971ء کی داستان رنج والم کے مشرقی اور مغربی سب ہی کردار اوران کی روحیں بیت المکرّم کے اس پار مصری، تیونسی، مراکشی، ترک اور یمنی ہجوموں کی طرح جوق در جوق اکٹھے ہوکر یہ سوال کریں گے، یہ ہم نے اپنے ساتھ کیا کیا؟

ڈھونڈو اسے

وہ کون تھا جس نے رشتے اور پُل تڑوائے؟؟

نسیمِ حجاز میں لپٹی وہ صبح بہار رشتوں اور پُلوں کی بحالی کی صبح ہوگی، رشتے اور پُل جو چودہ سو سال پہلے قائم ہوئے اور 23 مارچ 1940ء کو جن کی تجدید کے لیے اٹھا پرچمِ حریت بنگال ہی کے غلامی سے ناآشنا ہاتھوں میں تھا۔

میجر آفتاب احمد

324- بحریہ ٹاؤن، لاہور

حصہ اوّل

پاکستان کے سیاسی حالات

1۔ایوب دَور کے آخری ایام

فوج کے ذریعے جنرل ایوب خان کا اقتدار پر قبضہ پاکستان کے لیے ایک بہت بڑی تباہی کا موجب بنا۔ مارشل لاء کے نفاذ نے جمہوریت کا گلا گھونٹ دیا تھا،فوجی حکومت نے پاکستان کے مسلمانوں کے بارے میں تاثر کوداغ دار کر دیا تھا جب کہ اس وقت ہندوستان میں جمہوریت اپنی جڑیں مضبوط کر رہی تھی جو بے شمار زبانوں اور تہذیبی ورثوں کے ساتھ ایک کثیر نسلی ملک ہے۔ایوب خان نے مارشل لاء کے فرمانوں کے ذریعے سیاستدانوں کی مذمت کرتے ہوئے قومی سیاست کو بدنام کر دیا تھا۔انہوں نے بنیادی حقوق اور حق رائے دہی پر قدغن لگاتے ہوئے لوگوں پر آمرانہ حکومت ٹھونس دی تھی۔

ایوب خان کا بنیادی جمہوری نظام وسیع پیمانے پر بدعنوانیوں کی بنیادی وجہ بنا۔ایوب خان مرکز کو مضبوط بنانا چاہتے تھے جس کے نتیجے میں وفاقی ڈھانچا کمزور ہو چکا تھا۔یہ ان بنیادی اصولوں کے خلاف تھا جن پر پاکستان معرض وجود میں آیا تھا۔ایوب خان نے پاکستان کے دونوں حصوں کے درمیان اختلافات اور عدم مساوات کو مزید بڑھاوا دیا۔قیام پاکستان کے وقت ہی سے حکمران طبقہ پنجابیوں اور مہاجروں پر مشتمل تھا جو کہ مشرقی پاکستان کے بنگالیوں کو ہندوؤں کے زیر اثر، کمزور اور اطاعت گزار خیال کرتا تھا۔اگرچہ بنگال کے مسلمانوں نے تحریک پاکستان میں ہراول دستے کا کردار ادا کیا تھا، یہاں تک کہ مسلم لیگ کا قیام مشرقی پاکستان کی سرزمین پر ہوا اور تحریک پاکستان کا پہلا شہید مشرقی پاکستان کے شہر کھلنا کا ایک بنگالی نوجوان تھا۔ اس طرح پاکستان کے مشرقی اور مغربی حصوں کے درمیان لوگوں میں نفرت کے بیج پہلے دن ہی بو دیے گئے اور قومی سطح پر ٹوٹ پھوٹ کا آغاز کر دیا گیا۔ایوب خان نے وفاقی دارالحکومت کراچی سے اسلام آباد، پنجاب میں منتقل کر دیا جس نے غیر پنجابی لوگوں کے دلوں میں بداعتمادی کو جنم دیا اور وہ حکومت کی انصاف پسندی کے بارے میں مشکوک ہو گئے۔

ایوب خان کا خیال تھا کہ وہ شاید اپنا بنیادی جمہوری نظام متعارف کرا کے ساری عمر اقتدار میں رہ سکیں گے۔اس وقت مشرقی پاکستان کے جرأت مند سیاسی رہنماؤں نے بنیادی جمہوریت کے خلاف بیانات

دیئے جو کہ اخبارات میں شائع ہوئے۔ ان کے اس عمل کو ملک کے باضمیر اور دانشور طبقے کی جانب سے بہت پذیرائی ملی۔ سیاست میں درست وقت پر درست قدم اٹھانا بہت اہم ہوتا ہے کیوں کہ بے وقت اٹھایا گیا قدم قوم کو تباہی سے دوچار کر سکتا ہے، خاص طور پر جب قوم ابھی تشکیلی مراحل سے ہی گزر رہی ہو۔ اس وقت سیاستدانوں کے لیے وقت کا اہم تقاضا خاص طور پر بنگالیوں میں ایوب خان کے خلاف ایک وسیع قومی اتحاد تشکیل دینا تھا۔ لیکن دونوں حصوں کے سیاسی رہنما یہ تاریخی کام سرانجام دینے میں ناکام رہے۔ ایوب خان نے اس انتشار سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور بنیادی جمہوریت کا جن قوم پر مسلط کر دیا۔ تاہم تاریخ کسی کو معاف نہیں کرتی۔ یہ ایک آفاقی سچائی ہے۔ مقدر تاریخ کے دھارے میں وقوع پذیر ہونے والے اعمال اور واقعات کے قدرتی نتائج کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ اقتدار پر قابض اکثر لوگ اس سچائی کو بھول جاتے ہیں اور اس طرح تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔

ایوب خان نے پیشے کے اعتبار سے تیسرے درجے کے ایک وکیل منعم خان کو اپنے ایک انتہائی بااعتماد پٹھو کے طور پر منتخب کیا اور اسے مشرقی پاکستان کا گورنر مقرر کر دیا۔ ان کے ذریعے بنگالی وراثت اور تہذیب کو تباہ کرنے کی کوششیں شروع کی گئیں۔ یہ وہ وقت تھا جب بدعنوانی اور دہشت گردی کو پہلی مرتبہ مشرقی پاکستان کی یونیورسٹیوں اور اہم کالجوں میں متعارف کروایا گیا جس نے کسی نہ کسی طرح کچھ طالب علم رہنماؤں کو اپنے حلقۂ اثر میں لینے کا بندوبست کیا۔ لیکن اس کا آخری نتیجہ کوئی زیادہ خوش کن نہ تھا۔ مشرقی پاکستان کی طلبا برادری اپنے نچلے طبقوں میں اپنے نظریاتی اور دوسرے اختلافات کو پس پشت ڈالتے ہوئے اتحاد قائم کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ حتیٰ کہ مختلف سیاسی پارٹیوں سے تعلق رکھنے والے طلبا کی جماعتیں بھی منعم خان کے شیطانی منصوبوں کے خلاف متحد ہو گئیں۔ منعم خان کے بیٹے خسرو نے طلبا میں ایوب دشمن جذبات کو مادی طور پر کچلنے کے لیے مسلح گروپ منظم کیے۔ حکمرانوں کے بیٹوں اور بھتیجوں کی اس قسم کی بداعمالیاں کبھی بھی سیاسی تاریخ میں مثبت نتائج پیدا نہیں کر سکیں۔ بہت تھوڑے سے عرصے میں منعم خان کی عوام دشمن پالیسیوں نے بنگال کے عوام میں عمومی سطح پر اور طلبا میں خاص طور پر ایوب دشمن جذبات پیدا کرنے میں جلتی پر تیل کا کام کیا۔

1965ء کی پاک بھارت جنگ کے بعد سیاسی ماحول مزید نازک صورت اختیار کر گیا۔ سیاسی میدان میں کچھ غیر متوقع اور بڑے اہم واقعات وقوع پذیر ہوئے جنہوں نے ملک میں سیاسی پیش رفتوں پر کافی حد تک حقیقی اثرات مرتب کیے۔

2۔ قومی سیاست میں کرشماتی رہنما زیڈ اے بھٹو کا ظہور

1965ء کی جنگ کے بعد ایوب خان اور ہندوستان کے وزیراعظم لال بہادر شاستری کے درمیان تاشقند میں ایک تاریخی معاہدے پر دستخط کیے گئے۔ پاکستان کے عوام خاص طور پر مغربی پاکستان کے عوام نے اس معاہدے کو مکمل طور پر ملک کو فروخت کرنے کے مترادف خیال کیا اور ایوب دشمنی میں مزید اضافہ ہو گیا۔

ذوالفقار علی بھٹو نے جو اس وقت وزیر خارجہ تھے، عوام کی نبض کو محسوس کر لیا اور اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں بہت جذباتی تقریر کی، معاہدہ تاشقند پر تنقید کی اور ایک ڈرامائی انداز میں راسٹرم سے نیچے اتر آئے۔ انہوں نے احتجاج کے طور پر وزارتِ خارجہ سے بھی استعفیٰ دے دیا۔ پاکستان واپسی پر وہ ایک سیاسی پارٹی جس کا نام پاکستان پیپلز پارٹی (پی پی پی) رکھا، تشکیل دے کر عملی سیاست میں داخل ہو گئے اور ایوب مخالف تحریک شروع کر دی۔ بہت کم مدت میں پاکستان پیپلز پارٹی بہت زیادہ مقبول ہو گئی اور اس نے مغربی پاکستان میں وسیع البنیاد حمایت حاصل کر لی۔

کرشماتی بھٹو مغربی پاکستان کے نوجوانوں اور طلبا میں ایک دیوتا کی حیثیت اختیار کر گئے۔ نوجوانوں نے ان کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے ایوب مخالف مہم میں شمولیت اختیار کر لی۔ وہ لوگوں میں پی پی پی کو مقبول بنانے میں ایک اہم ذریعہ بن گئے اور ساتھ ہی ساتھ اس کی تحریک کو آگے لے کر چلتے رہے۔ طلبا نے اس وقت سے جب نظریہ پاکستان کا اعلان کیا گیا تھا یعنی برصغیر میں مسلمانوں کا علیحدہ وطن کا مطالبہ کیا گیا، ہراول دستے کا کردار کیا تھا۔ یہ رجحان قیام پاکستان کے بعد بھی جاری رہا۔ 1968ء کے اختتام تک بھٹو کی ایوب مخالف تحریک مغربی پاکستان میں ایک عوامی تحریک کی صورت اختیار کر چکی تھی۔

3۔ شیخ مجیب الرحمٰن نے اپنے چھے نکات کا اعلان کر دیا

مشرقی پاکستان 1965ء کی جنگ میں مغربی پاکستان سے مکمل طور پر کٹ گیا تھا۔ مشرقی پاکستان میں ہندوستانی جارحیت کے خلاف اپنی سرحدوں کا دفاع کرنے کے لیے بمشکل تین دن کی فوجی قوت اور وسائل دستیاب تھے کیوں کہ مشرقی پاکستان تقریباً مکمل طور پر مغربی پاکستان پر انحصار رکھتا تھا۔ 17 دن کی جنگ کے بعد اس کی بیرونی تجارت بالکل ختم ہو گئی تھی۔ اس صورتِ حال میں عوامی لیگ کے رہنما شیخ مجیب الرحمٰن نے مشرقی پاکستان کے لیے معیشت، دفاع اور بیرونی تجارت میں خود مختاری حاصل کرنے کے لیے اپنے مشہور چھے نکاتی سیاسی پروگرام کا اعلان کیا۔ اگرچہ یہ خود مختاری کے لیے ایک پروگرام تھا، تاہم مجیب الرحمٰن نے کہا تھا کہ ان کا پروگرام وفاقی ڈھانچے کو مضبوط بنانے کے لیے، وہ نظریہ جس پر پاکستان معرض وجود میں آیا تھا، بحث مباحثے کے لیے کھلا ہے۔

چھے نکاتی فارمولے کا متن

یہ متن ابتدائی طور پر شائع کیا گیا تاہم بالآخر عوامی لیگ کے منشور میں ترمیم شدہ حالت میں شامل کیا گیا۔

نکتہ نمبر 1

اصل: آئین میں قراردادِ لاہور کی بنیاد پر پاکستان کے لیے وفاقی ڈھانچا اپنے درست مفہوم میں پیش

کیا جانا چاہیے اور بالغ حق رائے دہی کی بنیاد پر براہِ راست منتخب کی گئی پارلیمانی طرزِ حکومت کو یقینی بنایا جائے، جس میں مقننہ کو بالادستی حاصل ہو۔

ترمیم شدہ: حکومت کی نوعیت وفاقی اور پارلیمانی ہوگی جس میں وفاقی مقننہ اور وفاق کو تشکیل دینے والے یونٹوں کی مقننہ ہمہ گیر بالغ حق رائے دہی کی بنیاد پر منتخب کی جائے گی۔ وفاقی مقننہ میں نمائندگی آبادی کی بنیاد پر ہوگی۔

نکتہ نمبر 2

اصل: وفاقی حکومت کے پاس صرف دو شعبے یعنی دفاع اور امور خارجہ ہوں گے باقی تمام شعبے وفاق کی ریاستوں کے پاس ہوں گے۔

ترمیم شدہ: وفاقی حکومت صرف دفاع اور خارجہ امور کی ذمہ دار ہوگی اور کرنسی کے بارے میں ان امور کی ذمہ دار ہوگی جن کی تشریح ذیل میں نکتہ نمبر 3 میں کی گئی ہے۔

نکتہ نمبر 3

اصل: (الف) دونوں حصوں کے لیے علیحدہ لیکن آسانی سے قابل تبدیل کرنسیاں جاری کی جاسکتی ہیں۔
(ب) پورے ملک کے لیے ایک کرنسی بھی رکھی جاسکتی ہے۔

اس صورت میں مشرقی پاکستان سے مغربی پاکستان سرمائے کی ترسیل کو روکنے کے لیے موثر آئینی قانون وضع کرنا ہوگا۔ مشرقی پاکستان کے لیے علیحدہ بینکنگ دفاتر اور علیحدہ مالی اور زری پالیسی اختیار کرنا ہوگی۔

ترمیم شدہ: دو علیحدہ کرنسیاں ہوں گی جو ملک کے دونوں حصوں کے درمیان ہر حصے کے لیے آسانی سے قابل تبدیل ہوں گی یا اس کے متبادل کے طور پر ایک کرنسی ہوسکتی ہے جس کے لیے وفاقی محفوظہ نظام قائم کیا جائے جس میں علاقائی وفاقی محفوظہ بینک ہوں گے جو ایسے اقدامات تجویز کریں گے جو ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں وسائل کی منتقلی اور سرمائے کے بہاؤ کو روکیں۔

نکتہ نمبر 4

اصل: ٹیکس لگانے اور محصولات جمع کرنے کا اختیار وفاق میں شامل وحدتوں کے پاس ہوگا، وفاقی مرکز کے پاس ایسا کوئی اختیار نہیں ہوگا۔ مطلوبہ اخراجات سے نمٹنے کے لیے وفاق کا ٹیکسوں میں حصہ ہوگا۔ انضمامی وفاقی فنڈ ریاست کے تمام ٹیکسوں پر ایک مخصوص شرح فی صد عائد کر کے حاصل کیا جائے گا۔

ترمیم شدہ: مالیاتی پالیسی تشکیل دینا وفاقی وحدتوں کی ذمہ داری ہوگی۔ وفاقی حکومت کو دفاع اور خارجہ معاملات پر ضروری اخراجات کے لیے مطلوبہ ذرائع آمدنی مہیا کیے جائیں گے۔

نکتہ نمبر 5

اصل: (ا) زرمبادلہ کی صورت میں حاصل ہونے والی آمدنی کے دونوں حصوں کے علیحدہ علیحدہ

اکاؤنٹ ہوں گے۔

(2) مشرقی پاکستان کو حاصل ہونے والی آمدنی مشرقی پاکستان کی حکومت کے کنٹرول میں ہوگی اور مغربی پاکستان کی مغربی پاکستان کی حکومت کے کنٹرول میں ہوگی۔

(3) وفاقی حکومت کی زرمبادلہ کی ضروریات کو دونوں حصے پورا کریں گے جو کہ برابر کی بنیاد پر یا مقرر کی گئی شرح کے مطابق ادا کیا جائے گا۔

(4) مقامی پیداوار دونوں حصوں میں بغیر ڈیوٹی کے لائی جا سکیں گی۔

(5) آئین میں وحدتوں کی حکومتوں کو بیرونی ممالک کے ساتھ تجارتی اور کاروباری تعلقات استوار کرنے، تجارتی مشن قائم کرنے اور معاہدے کرنے کا اختیار دیا جائے گا۔

ترمیم شدہ: آئین میں ایسی دفعات شامل کی جائیں گی جن کے تحت وفاقی وحدتوں میں سے ہر ایک وحدت اپنا علیحدہ زرمبادلہ کا اکاؤنٹ قائم کر سکے گی اور یہ متعلقہ وحدت کی حکومت کے کنٹرول میں ہوگا۔ وفاقی حکومت کے اخراجات وفاقی وحدتوں کی حکومتیں مہیا کریں گی جس کی شرح آئین میں دیئے گئے طریقہ کار کے تحت متعین کی جائے گی۔ علاقائی حکومتوں کو آئین کے تحت اختیار حاصل ہوگا کہ ملک کی خارجہ پالیسی کے مطابق جو کہ وفاقی حکومت کی ذمہ داری ہوگی۔ وہ دوسرے ممالک کے ساتھ تجارت اور امداد کے معاہدات طے کر سکیں۔

نکتہ نمبر 6

اصل: مشرقی پاکستان ملیشیا اور پیرا ملٹری فوج کا قیام۔

ترمیم شدہ: وفاقی وحدتوں کی حکومتوں کو ملیشیا یا پیرا ملٹری فوج قائم کرنے کا اختیار حاصل ہوگا تاکہ وہ قومی سلامتی کی مؤثر طور پر حفاظت کر سکیں۔

حکمران فوجی ٹولے نے مجیب کے چھ نکاتی پروگرام کو اشتعال انگیز خیال کیا اور مزید برہم ہوگیا۔ چھ نکات واضح طور پر ظاہر کرتے تھے کہ مشرقی پاکستان کا مغربی پاکستان کس طرح استحصال کیے ہوئے تھا۔ حکمرانوں کو ان نکات میں بغاوت کی بو آنے لگی۔ انہوں نے چھ نکات کو ملک توڑنے کی سازش قرار دیا۔ بنیادی طور پر چھ نکات مشرقی پاکستان کے عوام کی خودمختاری کو قائم رکھنے کے لیے ایک سیاسی پروگرام تھا۔ حکمران طبقے نے شیخ مجیب الرحمٰن اور عوامی لیگ کے دوسرے اعلیٰ رہنماؤں کو یکے بعد دیگرے مختلف جھوٹے الزامات لگا کر ہراساں کرنا شروع کر دیا۔ کسی ایک مخصوص الزام میں جب وہ ضمانت کا بندوبست کر لیتے تو انہیں ایک دوسرے الزام میں گرفتار کر لیا جاتا اور واپس جیل بھجوا دیا جاتا۔ مجیب الرحمٰن کو اس طرح کئی مرتبہ گرفتار کیا گیا تو انہیں عوام کی ہمدردی حاصل ہوگئی اور وہ اس کے اور اس کے مؤقف کے ساتھ ہمدردی رکھنے لگے، اس طرح چھ نکاتی پروگرام مشرقی پاکستان کے عوام میں بھی مقبولیت حاصل کرنے لگا۔

بتدریج چھے نکاتی پروگرام پورے مشرقی پاکستان کے عوام کا مطالبہ بن گیا۔ بنگال کے مسلمانوں نے اس کے حق میں کھلم کھلا آواز اٹھانا شروع کردی۔ جب یہ معاملہ ایک بڑے سیاسی مسئلے کی صورت اختیار کر گیا تو اچانک 6 جنوری 1968ء کو دو سینئر سی ایس پی آفیسر اور فوج اور سول بیوروکریسی کے 26 دوسرے بنگالی افسروں کو گرفتار کر لیا گیا۔ حکومتی پریس ریلیز میں کہا گیا کہ ان گرفتار شدہ افراد نے دسمبر 1967ء میں کسی وقت ڈھاکہ میں ہندوستانی قونصلیٹ میں مشرقی پاکستان کو مسلح بغاوت کے ذریعے علیحدہ کرنے کی سازش کی تھی۔ 17 جنوری کو غیر متوقع طور پر شیخ مجیب الرحمٰن کو جیل سے رہا کر دیا گیا۔ لیکن انہوں نے جیسے ہی جیل کے گیٹ سے باہر قدم رکھا، انہیں دوبارہ گرفتار کر لیا گیا اور 18 جنوری کو ڈھاکہ چھاؤنی میں منتقل کر دیا گیا۔ حکومت کی پریس ریلیز میں کہا گیا کہ مجیب سازش کیس کے سب سے بڑے ملزم ہیں۔

یہ مشہور اگرتلہ سازش کیس تھا۔ ملزمان کی کل تعداد 35 تھی۔ اس کیس میں بانگو بیر جنرل عطاالغنی عثمانی کا نام بھی شامل تھا۔ حکومتی وعدہ معاف گواہ 11 تھے۔ 21 اپریل کو ایک خصوصی ٹریبونل تشکیل دیا گیا۔ 19 جون کو کرمت والا چھاؤنی میں مقدمے کی سماعت شروع ہوئی۔ شیخ مجیب الرحمٰن کسی طور پر بھی اس سازش میں شریک نہیں تھے، لیکن اس کے باوجود انہیں ان کے متوقع سیاسی مستقبل کو ختم کرنے کے لیے شامل کیا گیا۔ البتہ وہ تمام سول اور فوجی انتظامیہ کے افسر جنہیں گرفتار کیا گیا تھا حکمران ٹولے کے نکتہ چین تھے۔ وہ حکمرانوں کی بدنظمی، استحصال اور بے توجہی کے براہِ راست شکار تھے۔

بحریہ کے لیفٹیننٹ کمانڈر معظم حسین مسلح افواج کے بنگالی ارکان کے ساتھ غیر منصفانہ سلوک پر بہت تنقید کرتے تھے اور اس قسم کے امتیازی رویے کے خلاف کھل کر بات کرتے تھے۔ وہ محبِ وطن اور تخیل پرست انسان تھے۔ اور بنگالی مسلمانوں کے لیے ایک آزاد ملک کے خواب دیکھا کرتے تھے۔ وہ اس منصوبے کے خالق تھے جو جسے انہوں نے اس وقت کی پاکستانی فوج، بحریہ، اور ایئر فورس کے محبِ وطن اور جرأت مند افراد اور سول بیوروکریٹس کی مدد سے تیار کیا تھا۔ وہ ایوب مخالف تحریک سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مشرقی پاکستان کو ایک آزاد ملک بنانے کے لیے مسلح انقلاب لانا چاہتے تھے۔

نچلے طبقے کے ایک بڑے اور مقبول رہنما عبدالحمید بھاشانی بھی آزاد مشرقی پاکستان کے خواب دیکھتے تھے۔ تاہم تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ شیخ مجیب الرحمٰن نے کبھی بھی آزاد بنگلہ دیش کی خواہش نہیں کی تھی۔ ان کا مطالبہ مشرقی پاکستان کی خودمختاری تھا۔

ایوب منعم ٹولہ اگرتلہ سازش کیس کی سماعت کی تشہیر اخبارات میں باقاعدگی سے کراتا رہا۔ وہ بنگالی مسلمانوں کے ہندوستان دشمن جذبات سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اگر ایک مرتبہ لوگ اس بات کے قائل ہو گئے کہ شیخ مجیب ہندوستان کی مدد سے پاکستان کو توڑنا چاہتے تھے تو وہ مجیب کے خلاف ہو جائیں گے اور اس طرح مجیب اور عوامی لیگ کی عوامی حمایت ختم ہو جائے گی اور لوگ انہیں ہندوستان کا ایجنٹ سمجھنا شروع کر دیں گے۔ لیکن اس کا نتیجہ بالکل برعکس نکلا۔

کیس کی سماعت سے لوگوں کو بڑے واضح انداز میں دکھائی دینے لگا تھا کہ یہ کیس ایک من گھڑت ڈرامے سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ یہ کیس بنگالیوں کے خلاف تیار کیا گیا ہے جس کے نتیجے میں حکومت کے خلاف غم اور غصے کا ایک طوفان کھڑا ہو گیا۔ اس بات کا ذکر بہت اہم ہے کہ مغربی پاکستان کی طرح مشرقی پاکستان میں بھی ایوب، منعم دشمن تحریک کا ہراول دستہ طلبا پر مشتمل تھا۔ ان کے گیارہ نکاتی پروگرام نے بڑے پیمانے پر لوگوں کی توجہ حاصل کر لی تھی اور وہ ان گیارہ نکات میں اپنی امنگوں اور خواہشات کا عکس دیکھ رہے تھے۔ گیارہ نکاتی پروگرام کی عوامی حمایت کے بعد یہ تحریک بڑی تیزی سے پھیلتی چلی گئی۔ خود مختاری کا سوال اس وقت ایک اہم مسئلہ بن کر کھڑا ہو گیا اور پورا مشرقی پاکستان اس تحریک کی لپیٹ میں آ گیا۔

4۔ طلبا کی ''یونائیٹڈ ایکشن کمیٹی'' کا گیارہ نکاتی پروگرام

مرکزی حکومت کی عوام دشمن پالیسیوں کے نتیجے میں قومی بحران اور طلبا کے مسائل ہر روز بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ عوام اور طلبا اسے زیادہ برداشت نہیں کر سکتے، اسی لیے ایک مشترکہ تحریک کے آغاز کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ ہم تمام طلبا تنظیمیں عوام سے اپیل کرتی ہیں کہ وہ مشرقی پاکستان کے عوام کے مفادات کے تحفظ کے لیے ہمارے گیارہ نکاتی پروگرام کو آمرانہ حکومت کے خلاف ایک بھرپور اور مکمل جدوجہد میں تبدیل کر دیں۔

1-(الف) صوبے کے کالجوں کو اپنے کنٹرول میں لانے کی حکومتی پالیسی کا فوری خاتمہ ہونا چاہیے اور تمام کالج بشمول جگن ناتھ کالج جو حکومتی کنٹرول میں لیے گئے ان کو فوراً خود مختار حیثیت میں دوبارہ بحال کیا جائے۔

(ب) عوام میں خاص طور پر دیہاتی علاقوں میں تعلیم کے فروغ کے لیے پورے مشرقی پاکستان میں مزید سکول اور کالج قائم کیے جائیں اور تمام تعلیمی اداروں، سکولوں، کالجوں کو جو غیر حکومتی اداروں نے قائم کیے ہیں فوری طور پر حکومتی منظوری دی جائے۔ پیشہ ورانہ تربیت کے لیے حکومت کو مزید انجینئرنگ سکول، کالج، ٹیکنیکل اور پولی ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ قائم کرنے چاہئیں۔ حکومت کو مزید کمرشل ادارے بھی قائم کرنے چاہئیں۔

(ج) صوبے کے تمام کالجوں میں آئی اے، آئی ایس سی، آئی کام، بی اے، بی ایس سی اور بی کام جیسے کورس شام کی شفٹ میں شروع کرنے اور تمام تسلیم شدہ کالجوں میں ایم اے، ایم ایس سی، اور ایم کام کی کلاسیں چلانے کے لیے انتظامات کیے جائیں۔

(د) طلباء کی ٹیوشن فیسوں میں 50 فیصد کمی کی جائے۔ مستحق طلبا کے سکالرشپس اور وظائف میں اضافہ کیا جائے۔ ان طلبا کے وظائف اور سکالرشپس بند نہیں کیے جا سکتے، جو طلبا سیاست میں حصہ لیتے ہیں۔

(ہ) حکومت ہاسٹلوں اور کینٹینوں میں کھانوں میں 50 فیصد سبسڈی دے۔

(و) ہالوں اور ہاسٹلوں کی کمی کے مسئلے کو فوری طور پر حل کرنے کی ضرورت ہے۔

(ز) تمام درجوں میں ذریعہ تعلیم مادری زبان ہونا چاہیے۔ دفتروں اور عدالتوں میں بنگالی رائج کی جائے۔ تمام تعلیمی اداروں میں مناسب تعداد میں تجربہ کار اساتذہ اور پروفیسر مہیا کیے جائیں۔ اساتذہ کی تنخواہوں میں اضافہ کیا جائے۔ اظہارِ رائے کی آزادی کو یقینی بنایا جائے۔

(ح) آٹھویں جماعت تک تعلیم مفت اور لازمی قرار دی جائے۔

(ط) میڈیکل یونیورسٹی کا قیام عمل میں لایا جائے۔ آٹومیشن نظام کا خاتمہ کیا جائے۔ نامزدگی کے ذریعے داخلے بند کیے جائیں۔ میڈیکل کونسل کو کالعدم قرار دیا جائے۔ دانتوں کے شعبے کو مکمل کالج میں تبدیل کیا جائے۔ حکومت میڈیکل طلبا کے تمام مطالبات منظور کرے۔ نرسنگ سٹاف اور طلبا کے مطالبات پر حکومت کو غور کرنا ہوگا۔

(ع) انجینئرنگ کی تعلیم میں آٹومیشن نظام کو ختم کیا جائے۔ 10 فیصد اور 75 فیصد کے قانون کا خاتمہ کیا جائے۔ مرکزی لائبریری کے لیے مناسب انتظامات اور آخری سال اور انجینئرنگ کے طلبا کے تمام دوسرے مطالبات حکومت تسلیم کرے۔

(ک) پولی ٹیکنک کے طلبا کو مختصر کورسوں کا موقع دیا جائے۔ بورڈ کا فائنل امتحان ختم کر دینا چاہیے اور طلبا کو ڈپلومہ یا ڈگری ان کے سمسٹر امتحانات کی بنیاد پر دی جائے۔

(ل) حکومت فوری طور پر ٹیکسٹائل، سرامکس، لیدر ٹیکنالوجی اور فائن آرٹس کے طلبا کے تمام مطالبات تسلیم کرے۔ ایم بی اے، قانون اور سوشل ویلفیئر کے طلبا کے تمام مطالبات بھی فوری طور پر منظور کیے جائیں۔ ڈھاکہ اور دوسری یونیورسٹیوں کے کامرس اور ٹریڈ ڈیپارٹمنٹس کو مکمل فیکلٹیز میں تبدیل کیا جائے۔

(م) زرعی یونیورسٹی اور کالجوں کے طلبا کے جائز مطالبات تسلیم کیے جائیں۔ زرعی ڈپلومہ کے طلبا کے مختصر کورسز کا مطالبہ اور دیگر مطالبات حکومت فوراً تسلیم کرے۔

(ن) طلبا کو ریل گاڑیوں، لانچوں اور سٹیمروں میں شناختی کارڈ دکھانے پر کرائے میں 50 فیصد رعایت دی جائے۔ اس طرح کی رعایت ماہانہ ٹکٹوں پر بھی دی جائے۔ مغربی پاکستان کی طرح مشرقی پاکستان میں بھی شہر کے اندر کسی بھی فاصلے تک سفر کے لیے 10 پیسے کرایہ مقرر کیا جائے۔ لمبے سفر میں طلبا کو 50 فیصد رعایت دی جائے۔ طالبات کے لیے مناسب تعداد میں مخصوص بسیں مہیا کی جائیں۔ حکومتی اور نیم حکومتی اداروں کے زیر انتظام منعقد کیے جانے والے کھیلوں اور ثقافتی پروگراموں میں تمام طلبا کے لیے 50 فی صد رعایت دی جائے۔

(س) طلبا کے لیے ملازمتوں کے حصول کو یقینی بنایا جائے۔

(ع) بدنامِ زمانہ یونیورسٹی آرڈیننس کا خاتمہ کیا جائے۔ یونیورسٹیوں اور دوسرے تعلیمی اداروں کو مکمل خودمختاری دی جائے۔

-2 تعلیم کے فروغ کے خلاف حکومتی دستاویز نیشنل ایجوکیشن کمیشن رپورٹ اور حمید الرحمٰن کمیشن رپورٹ کو فوراً منسوخ کیا جائے اور حکومت ایک ترقی پسندانہ قومی تعلیمی پالیسی اپنائے جو عوام دوست ہو اور ملازمتوں کے حصول میں معاون ثابت ہو۔

(الف) ملک میں بالغ حق رائے دہی اور براہِ راست ووٹ کی بنیاد پر پارلیمانی جمہوریت کا نفاذ کیا جائے۔ آزادی تقریر اور پریس کی آزادی کو یقینی بنایا جائے۔ روزنامہ اتفاق پر سے پابندی فوراً اٹھائی جائے۔

-3 مشرقی پاکستان کو مندرجہ ذیل مطالبات تسلیم کرتے ہوئے مکمل خودمختاری دی جائے۔

(الف) ملک کا ڈھانچا وفاقی ہونا چاہیے اور دستور ساز اسمبلی خودمختار ہونی چاہیے۔

(ب) وفاقی مرکز کی ذمہ داری دفاع، امور خارجہ اور کرنسی تک محدود ہوگی۔ باقی تمام معاملات پر صوبوں کو مکمل اختیار ہوگا۔

(ج) دونوں حصوں میں ایک ہی کرنسی چلے گی۔ کرنسی کا اجرا وفاق کی ذمہ داری ہوگا۔ لیکن آئین میں اس بات کا تحفظ فراہم کیا جائے کہ سرمایہ مشرق سے مغرب کی جانب نہیں جائے گا۔ اس نظام کے تحت مرکز میں ایک وفاقی ریزرو بینک ہوگا، اور مشرقی پاکستان کی علیحدہ معاشی پالیسی ہوگی۔

(د) ٹیکس اور ریونیو جمع کرنے کا تمام اختیار صوبائی حکومتوں کے پاس ہوگا۔ وفاقی حکومت کو ریونیو جمع کرنے کا کوئی اختیار نہیں ہوگا۔ صوبے ریونیو کا ایک حصہ مرکز کو دیں گے جس کا فیصلہ آئین میں دستور ساز اسمبلی کرے گی۔ ہر صوبے کے لیے رقم کا تعین آئین میں کیا جائے گا۔ اس قسم کی تمام ترسیلات ریزرو بینک کے ذریعے کی جائیں گی۔

(و) ہر صوبہ اپنی بیرونی تجارت کا علیحدہ حساب رکھے گا۔ ایسی تمام آمدنیاں صوبوں کو ملیں گی اور ان پر صوبوں کو مکمل اختیار حاصل ہوگا۔

(ز) مشرقی پاکستان کو اپنی ملیشیا یا پیرا ملٹری فورس قائم کرنے کی اجازت ہوگی۔ مشرقی پاکستان میں اسلحہ ساز فیکٹری کا ہونا ضروری ہے۔ بحریہ کا ہیڈ کوارٹر مشرقی پاکستان منتقل کیا جائے۔

-4 مغربی پاکستان میں بلوچستان، شمالی مغربی سرحدی صوبہ اور سندھ کو مکمل خودمختاری دی جائے گی تا کہ وہ ایک ذیلی وفاق تشکیل دے سکیں۔

-5 بینک، انشورنس کمپنیاں، پٹ سن کی تجارت اور بڑی صنعتیں قومیائی جائیں۔

-6 زرعی شعبے پر ٹیکس کم کرنا ہوں گے۔ کسانوں کے تمام نہ ادا کیے گئے قرضے معاف کیے جائیں۔ پٹ سن کے لیے کم از کم قیمت 40 روپے فی من مقرر کی جائے اور گنے کے کاشتکاروں کے لیے

ایک منصفانہ قیمت مقرر کی جائے۔

7- مزدوروں کو منصفانہ اجرت دی جائے اور انہیں جائز بونس بھی ملنے چاہیں۔ محنت کش طبقے کی تعلیم، رہائش اور طبی سہولیات کے لیے حکومت کو انتظامات کرنے چاہئیں۔ تمام مزدور دشمن کالے آرڈیننس واپس ہونے چاہئیں اور مزدوروں کا ہڑتال اور یونین سازی کے حقوق بحال ہونا چاہئیں۔

8- مشرقی پاکستان میں سیلاب کی روک تھام کے لیے اور آبی وسائل کو قابو کرنے کے لیے جامع پالیسی تشکیل دی جائے۔

9- ہنگامی قانون کو دیگر استبدادانہ فرمانوں اور قوانین کے ساتھ ختم کرایا جائے۔

10- پاکستان کو آزادانہ خارجہ پالیسی اپنانی چاہیے اور سینٹو اور سیٹو اور پاکستان امریکہ دفاعی معاہدے سے نکل جانا چاہیے۔

11- تمام گرفتار شدہ طلبا، محنت کشوں، کسانوں، سیاسی لیڈروں اور سرگرم کارکنوں کو جو مختلف جیلوں میں بند ہیں، فوری طور پر رہا کیا جائے اور ان کے خلاف تمام وارنٹوں کو منسوخ قرار دیا جائے اگرتلہ سازش کیس اور دوسرے سیاسی کیس فوری طور پر واپس لیے جائیں۔

آل سٹوڈنٹس یونائیٹڈ ایکشن کمیٹی میں عبدالرؤف صدر ایسٹ پاکستان سٹوڈنٹ لیگ، خالد محمود علی جنرل سیکریٹری ایسٹ پاکستان سٹوڈنٹ لیگ، سیف الدین احمد صدر ایسٹ پاکستان سٹوڈنٹس یونین، شمس الضحیٰ جنرل سیکریٹری ایسٹ پاکستان سٹوڈنٹس یونین، مصطفیٰ جمال حیدر صدر ایسٹ پاکستان سٹوڈنٹس یونین، دیپادت سیکریٹری ایسٹ پاکستان سٹوڈنٹس یونین، طفیل احمد نائب صدر ڈی یو سی ایس یو، ناظم کامران چوہدری جنرل سیکریٹری ڈی یو سی ایس یو شامل تھے۔ اس وقت کی سیاسی لیڈر شپ طلبا تحریک کے ساتھ قدم ملا کر چلنے میں ناکام ہوگئی تھی۔ طلبا کے گیارہ نکاتی پروگرام نے عوامی لیگ کے چھے نکاتی پروگرام کو دھندلا دیا تھا، اور وہ عوام میں بہت زیادہ مقبولیت اختیار کر گیا تھا۔ اس وقت کی طلبا کی یونائیٹڈ ایکشن کمیٹی کے مشہور آٹھ لیڈروں نے سیاسی لیڈروں کے اثر کو ماند کر دیا تھا۔ اور جب مجیب الرحمٰن کو اگرتلہ سازش کیس سے رہائی ملی تو وہ ریس کورس میں ایک عوامی جلسے میں یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ ”جیل سے رہا ہونے کے بعد جو کچھ میں نے دیکھا ہے وہ یہ ہے کہ طلبا کی گیارہ نکاتی تحریک نے عوامی لیگ کے چھے نکات کو نگل لیا ہے۔“ اس وقت یہ تحریک اپنے عروج پر تھی۔ صدر ایوب اس صورت حال کی گمبھیرتا اور خطرے کو پوری طرح بھانپ چکے تھے۔ اس دوران اگرتلہ سازش کیس کے ایک ملزم ظہور الحق کو حکومت کی حراست میں ہی گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ ایوب حکومت کی اس بربریت کے خلاف نچلے طبقے کے لیڈر مولانا بھاشانی نے پرزور آواز بلند کی۔ انہوں نے ماضی میں ہر عوامی تحریک کو لیڈر شپ مہیا کی تھی۔ وہ احتجاج کی علامت تھے اور انہوں نے عوام کو کبھی مایوس نہیں کیا تھا۔ وہ کس طرح خاموش رہ سکتے تھے۔ انہوں نے چھاؤنی کا گھیراؤ کرنے کی دھمکی دی۔ اُن کی آواز پر مشرقی

پاکستان کے دلیر نوجوان مارشل لاء کے خلاف سینہ سپر ہو گئے۔ یہاں بھی ایک مرتبہ پھر یہ طلبا ہی تھے جنہوں نے ہراول دستے کا کردار ادا کیا۔ رات کے وقت کرفیو نافذ کر دیا جاتا تھا۔ لیکن رات کی خاموش تاریکی میں ''جئے بنگلہ'' کے نعرے سنائی دیتے تھے۔ یہ تحریک ایک سے دوسرے کیمپس میں اور پھر صوبے کے دارالحکومت میں ہر جگہ پھیل گئی۔ لوگ رات کو کرفیو کی خلاف ورزی کرتے ہوئے گلیوں میں اکٹھے ہو جاتے، گولیاں چلتیں، بہت سے محبِ وطن نوجوانوں نے فوجی جتھے کی ظالمانہ کارروائیوں میں جانوں کے نذرانے پیش کیے۔ لیکن یہ کارروائیاں مشرقی پاکستان کے دلیر ناقابلِ شکست لوگوں کے عزم کو متزلزل نہ کر سکیں۔ وہ ایک بے خوف جذبے سے آگے بڑھے اور وہ اپنے مقبول لیڈر کو چھاؤنی سے چھین لانے کا ارادہ کیے ہوئے تھے۔ اس قسم کے پرعزم جذبے کے سامنے ایوب انتظامیہ بے اثر ہو کر بکھر گئی اور مجموعی صورتِ حال بہت پیچیدہ ہو گئی۔

5۔ اُس وقت میں کوئٹہ میں تھا

ہماری قومی تاریخ کے اس نازک وقت میں میری تقرری کوئٹہ میں تھی۔ میں 62 فیلڈ رجمنٹ آرٹلری کی 16 ڈویژن میں تھا۔ میرا قیام کنگز روڈ پر آرٹلری آفیسرز میس میں تھا۔ میرے علاوہ کوئٹہ میں بنگالی افسروں کی خاصی تعداد موجود تھی، جو مختلف رجمنٹوں اور بٹالینوں میں تھے۔

کرنل دستگیر ڈویژنل ہیڈکوارٹر میں G-1 کے طور پر خدمات انجام دے رہے تھے۔ میجر حفیظ کی پوسٹنگ میری ہی رجمنٹ میں تھی، کیپٹن شاہد 33 کیولری رجمنٹ میں، کیپٹن شرفل 33 کیولری رجمنٹ میں، کیپٹن محسن بلوچ رجمنٹ میں اور میجر ملک ایک بریگیڈ کے بی ایم تھے۔ میجر قادر انجینئرنگ بٹالین کیپٹن مولا ای ایم ای میں، کیپٹن اے ایم ایس امین سکول آف انفنٹری اینڈ ٹیکٹکس میں، کیپٹن حنان شاہ سکول میں، کیپٹن ذاکر، کیپٹن ہدیٰ، کیپٹن شفاعت اور لیفٹیننٹ ہارون 26 فیلڈ رجمنٹ آرٹلری میں، کیپٹن مظہرالدین لیفٹیننٹ کے بی 63 فیلڈ رجمنٹ آرٹلری میں، کیپٹن جمال سی ایم ایچ میں، کیپٹن قاسم اے ایس سی بٹالین میں اور کیپٹن سخاوت لوکیٹنگ بیٹری میں تھے ان افسروں کے علاوہ جے سی اوز، این سی اوز اور سپاہیوں کی ایک بڑی تعداد سکول آف انفنٹری اینڈ ٹیکٹکس، ای ایم ای بٹالین، سگنل بٹالین اور ڈویژنل ہیڈکوارٹر میں تعینات تھے۔ کچھ سٹاف کالج اور 33 کیولری رجمنٹ میں بھی تھے۔

کوئٹہ میں بنگالی دوستوں کا حلقہ چھوٹا لیکن خوش باش تھا۔ ہمارے درمیان بڑے پُرتپاک اور دوستانہ مراسم تھے اور وقت بڑے خوش گوار اور شان دار ماحول میں گزر رہا تھا۔ اکثر اوقات ہم کسی ایک مقام پر اکٹھے ہوا کرتے تھے، عام طور پر یہ کسی شادی شدہ افسر کا گھر ہوتا تھا۔ ہم گپ شپ لگاتے، باتیں کرتے، سیاست پر بحث کرتے، گانے گاتے، مذاق کرتے اور وہ سب کچھ کرتے جس سے ہمیں خوشی اور سکون ملتا۔ قومی بحران نے ہم سب کو ایک دوسرے کے مزید نزدیک کر دیا تھا۔ ہم سب اس وقت کی صورتِ حال سے آگاہ تھے۔ جو کچھ ہو رہا تھا اس پر بہت پریشان تھے۔ ان واقعات کا کیا نتیجہ نکلے گا؟ صدر کا اقتدار کا لالچ ملک

کو کدھر لے کر جائے گا؟ پاکستان کیسے زندہ رہے گا؟ یہ پاگل پن، بے انصافی، ناجائز استحصال کب ختم ہوگا؟ ایوب انتظامیہ بری طرح ناکام ہو چکی تھی۔ کیا وہ عظیم تر قومی مفاد میں گفت وشنید کے ذریعے کوئی سیاسی حل ڈھونڈنے کے لیے تیار تھی؟ یا کیا وہ محض اپنے اقتدار کی خاطر قوم کو مزید تباہی اور مکمل بربادی کی طرف کھینچ کر لے جائے گی؟ ہم اپنی خفیہ ملاقاتوں میں خیالات کا تبادلہ کرتے رہتے تھے۔ ہم ان تمام سوالوں کے جواب تلاش کرنے کی کوشش کرتے۔ ہم معلومات کا تبادلہ کرتے اور ان ملاقاتوں میں گھسی پٹی بحثیں کرتے رہتے تھے۔ ہم اس وقت کی صورتِ حال کے پس منظر میں ہر نئی پیش رفت اور خبر کا تجزیہ کرنے کی کوشش کرتے۔ ہمیں مشرقی پاکستان کے بارے میں گھروں سے آنے والے خطوط سے خبریں ملتی تھیں۔ ہم آل انڈیا ریڈیو، وائس آف امریکہ، بی بی سی اور وائس آف آسٹریلیا بڑے دھیان سے سنتے تھے۔ قومی میڈیا میں خبریں اور رپورٹیں یک طرفہ پروپیگنڈا پر مشتمل تھیں لہٰذا زیادہ قابل اعتبار نہیں تھیں۔

بعض اوقات بنگالی ہم وطن سگنل سینٹر سے وہ خفیہ معلومات لے کر آتے جو آرمی ہیڈ کوارٹر، ڈویژنل ہیڈ کوارٹر کو بھیجتا تھا۔ ہم ان رپورٹوں سے فوجی ٹولے کے ارادوں کا کچھ اندازہ لگا سکتے تھے۔ لیکن یہ سب کچھ بہت کم تھا۔ ہم مشرقی پاکستان میں جاری سیاسی تحریک میں روزمرہ ہونے والی پیش رفتوں کو جاننے کے لیے بہت بے چین رہتے تھے۔ ڈیڑھ ہزار میل دُور ہمیں مختلف ذرائع سے جو رپورٹیں موصول ہوتی تھیں، وہ کوئی زیادہ مفصل نہیں ہوتی تھیں، لیکن ہم تازہ ترین واقعات سے آگاہ رہنے کے لیے پوری احتیاط کے ساتھ ممکنہ حد تک کوشش کرتے رہتے تھے۔ ہم معمول کے مطابق اپنے فرائض انجام دے رہے تھے، اگرچہ غصے سے ابل رہے ہوتے تھے۔ ہمیں اپنی نفرت اور غصے کے جذبات کو اپنے اعلیٰ افسروں خاص طور پر غیر بنگالیوں کی چوکس نگاہوں کے سامنے دبا کر رکھنا پڑتا تھا۔ ہر صورتِ حال کا سکون کے ساتھ اپنے اندرونی جذبات کا اظہار کیے بغیر سامنا کرنا ہوتا تھا۔ ہمارا ہر لمحہ اور ہر گھڑی، ناامیدی، امید اور مایوسی میں گزر رہا تھا۔ یہ ایک خوف ناک بے یقینی کی حالت تھی۔

6۔ اگرتلہ سازش کیس واپس لے لیا گیا

22 فروری 1969ء کو اچانک ایک حکومتی نوٹیفکیشن کے ذریعے اگرتلہ سازش کیس واپس لے لیا گیا۔ اسی سہ پہر کو مجیب اور دوسرے نظر بند افراد کو کرمتولا چھاؤنی سے رہا کر دیا گیا۔ اس دوران سندھ، شمال مغربی سرحدی صوبے اور بلوچستان میں ایوب مخالف تحریک زور پکڑ چکی تھی۔ اس وقت لوگوں کا مطالبہ ''ون یونٹ'' نظام کا خاتمہ تھا۔ تحریک پورے مغربی پاکستان میں پھیل گئی۔ دونوں حصوں کے سیاستدانوں نے پاکستان کے دونوں حصوں میں گورنمنٹ مخالف تحریک کو مربوط کرنے کے لیے ڈیموکریٹک ایکشن کمیٹی (ڈی اے سی) تشکیل دی۔ نواب زادہ نصر اللہ خان کو ڈی اے سی کا لیڈر مقرر کیا گیا۔ مغربی پاکستان میں ریٹائرڈ ایئر مارشل اصغر خان نے ایوب مخالف تحریک میں قابل قدر کردار ادا کیا۔ مغربی اور مشرقی پاکستان میں تحریک کے

زور پکڑنے پر ایوب خان قومی بحران کا کوئی جامع حل تلاش کرنے کے لیے سیاستدانوں کی گول میز کانفرنس بلانے پر مجبور ہو گئے۔

مجیب اور بھاشانی کو بھی گول میز کانفرنس میں مدعو کیا گیا تھا۔ ہمیں اور ملک سے باہر دوسرے لوگوں کو حکومت کے اس قدم سے امید کی کچھ کرن نظر آنے لگی۔ ہمارا خیال تھا کہ شاید اس میں شرکت کرنے والے ارکان ملک کے وسیع تر مفاد کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس کا کوئی جامع حل تلاش کرنے کی سنجیدہ کوشش کریں لیکن اب بھی تشویش اور پریشانی قائم تھی۔

7۔ شیخ مجیب ایک دیو مالائی رہنما کی حیثیت اختیار کر گئے

شیخ مجیب رہائی پانے کے بعد مشرقی پاکستان میں عوام کے ایک غیر متنازع لیڈر کی حیثیت اختیار کر چکے تھے۔ تاہم اس میں ان کے اپنے کردار کا کوئی عمل دخل نہ تھا۔ یہ مولانا بھاشانی تھے جنہوں نے شیخ مجیب اور دوسرے لوگوں کو جیل سے رہائی دلوانے کے لیے تحریک کو قیادت فراہم کی۔ بنگالی عوام ہر تحریک میں ہمیشہ آگے آگے رہے تھے اور سیاسی لیڈر شپ ان کے پیچھے پیچھے چلتی رہی تھی۔ پوری قوم خود مختاری حاصل کرنے کے لیے بے قرار تھی۔ وہ کچھ بھی کر گزرنے کو تیار تھے لیکن ان کے سامنے کوئی بھی ایسا لیڈر موجود نہیں تھا جو قومی سطح پر قابل احترام اور قابل اعتبار حیثیت کا مالک ہو۔

ایک ایسا لیڈر جس کی زندگی ایثار و قربانی پر مشتمل ہو اور قوم کی رہنمائی کے لیے کرشماتی شخصیت کا مالک ہو۔ بھاشانی جوان صفات کے مالک تھے، بوڑھے اور عمر رسیدہ ہو چکے تھے۔ انہوں نے بہت زیادہ قربانیاں دی تھیں اور ان میں دانش کی کمی بھی نہیں تھی۔ لیکن کمزور صحت کی وجہ سے ان کی انتظامی قوت دم توڑ چکی تھی۔ لہٰذا ان کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ تحریک کی رہنمائی کرتے ہوئے اس کو قدم بہ قدم آگے بڑھاتے ہوئے مکمل انقلاب تک پہنچا سکیں، اگرچہ وہ ایک مقبول شخصیت کے مالک تھے۔ دوسری جانب اگرتلہ سازش کیس نے شیخ مجیب کو راتوں رات ایک دیو مالائی ہیرو میں تبدیل کر دیا تھا۔ مندرجہ بالا حالات کے پیش نظر بنگالیوں کے پاس اس کے علاوہ کوئی دوسرا متبادل نہیں تھا کہ وہ شیخ مجیب کو اپنا لیڈر تسلیم کر لیں جو کہ انہیں کامیابی کی منزل تک رہنمائی مہیا کر سکے۔

8۔ ایوب خان گول میز کانفرنس طلب کرنے پر مجبور ہو گئے اور مجیب نے اس میں شمولیت کی دعوت قبول کر لی

شیخ مجیب الرحمٰن نے ایوب خان کی آمدہ گول میز کانفرنس میں شرکت کی دعوت قبول کر لی۔ وہ اور ڈیموکریٹک ایکشن کمیٹی کے دوسرے رہنما اس بات پر متفق تھے کہ وہ کانفرنس میں گیارہ نکاتی پروگرام کی بنیاد پر بات چیت کریں گے۔ مولانا بھاشانی نے کانفرنس میں شرکت سے انکار کر دیا۔ یہ ان کی سیاسی

دانش اور بصیرت تھی۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ کانفرنس سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ وہ واضح طور پر بھانپ چکے تھے کہ اس پیچیدہ سیاسی بحران کا حل سوائے مشرقی پاکستان کی آزادی کے اور کچھ بھی نہیں ہوسکتا۔ اس سوچ کے تحت انہوں نے ڈھاکہ کے پلٹن میدان میں ایک بہت بڑی سیاسی ریلی سے خطاب کرتے ہوئے کہا، ''مغربی پاکستان السلام وعلیکم۔'' انہوں نے شیخ مجیب کو بھی کانفرنس میں شمولیت سے منع کیا۔ مغربی پاکستان میں ذوالفقار علی بھٹو نے کانفرنس میں شامل نہ ہونے کا فیصلہ کیا۔ مولانا بھاشانی اور ذوالفقار علی بھٹو دونوں کی جانب سے کانفرنس کو مسترد کرنے پر لوگوں کے دلوں میں کانفرنس کی کامیابی کے بارے میں شکوک پیدا ہوگئے۔

ہر کوئی مایوسی اور ناامیدی کا شکار تھا۔ افق پر جو امید کی ایک ہلکی سی روشنی نظر آرہی تھی، وہ اچانک اندھیروں میں ڈوب گئی۔ ہمیں ایک غیر یقینی مستقبل نظر آرہا تھا۔ تاہم 26 فروری 1969ء کو راولپنڈی میں دو انتہائی بااثر رہنماؤں کی غیر موجودگی میں گول میز کانفرنس شروع ہوگئی۔ افتتاحی اجلاس کے بعد کانفرنس 10 مارچ تک ملتوی کردی گئی۔ 10 مارچ کے اجلاس میں شیخ مجیب نے معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے سٹوڈنٹ ایکشن کمیٹی کے گیارہ نکات کی بجائے اپنا چھے نکاتی پروگرام پیش کردیا۔ شیخ مجیب کی اس خلاف ورزی کے نتیجے میں ڈیموکریٹک ایکشن کمیٹی اپنے وقت سے پہلے ہی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوگئی، کانفرنس بھی ناکام ہوگئی۔ تاہم 13 مارچ کو چیئرمین نے اپنی تقریر میں دو تجاویز قبول کرلیں۔

1۔ بالغ حق رائے دہی کی بنیاد پر براہِ راست انتخابات

2۔ پارلیمانی جمہوریت کی بحالی

14 مارچ کو شیخ مجیب اور ان کا نو رکنی وفد ڈھاکہ واپس چلا گیا۔ اس وقت تک ایک نئی سازش تشکیل پارہی تھی۔

9۔ ایوب مخالف تحریک میں شدت

پورے ملک میں ایوب مخالف تحریک اپنے عروج پر پہنچ گئی۔ صدر ایوب کے ذاتی اثر و رسوخ اور مقبولیت میں کمی آنے لگی۔ 1968ء میں وہ پھیپھڑوں میں انجمادِ خون میں مبتلا ہوگئے اور جسمانی طور پر معذور ہوگئے تھے۔ گرتی ہوئی صحت کے ساتھ ان کے کام کرنے کی استعداد میں بھی خاطر خواہ کمی آ گئی۔ وہ پہلے کی طرح اِدھر اُدھر گھوم سکتے تھے اور نہ ہی لوگوں سے رابطہ رکھ سکتے تھے۔ مسلح افواج اور یونٹوں کی جانب سے بھی وہ تنہائی کا شکار ہوتے جارہے تھے۔ روزمرہ کے انتظامی امور چلانے کے لیے وہ چند ''جی حضور'' قسم کے بیوروکریٹس کے محتاج ہوتے چلے گئے۔ وہ اپنے روزمرہ کے معمولات میں کمی کرنے پر مجبور ہوچکے تھے۔ سازشی جرنیلوں نے ان کی خرابئ صحت سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔

بھٹو اور ایوب مخالف بیوروکریٹس کے طاقتور ٹولے نے جرنیلوں کے ساتھ ساز باز شروع کردی۔

ایوب کے اپنے نامزد کردہ آرمی چیف جنرل آغا محمد یحییٰ خان نے اس سازش کو لیڈر شپ مہیا کی۔

1958ء میں جب جنرل ایوب خان آرمی چیف آف سٹاف کے طور پر سکندر مرزا کو اقتدار سے ہٹانے کی سازش کر رہے تھے، اس وقت نوجوان جنرل یحییٰ خان، جنرل ہیڈ کوارٹرز میں ایوب خان کے سب سے زیادہ بااعتماد سٹاف آفیسر تھے۔ انہوں نے اقتدار پر قبضے کے لیے انتہائی مستعدی سے تمام تر تفصیلات طے کرتے ہوئے ایوب خان کا مکمل اعتماد جیت لیا تھا۔ اس کے انعام میں 1966ء میں جب جنرل موسیٰ خان آرمی چیف آف سٹاف کے عہدے سے ریٹائر ہوئے تو کئی ایک سینئر جرنیلوں کو پس پشت ڈالتے ہوئے جنرل یحییٰ خان کو آرمی چیف مقرر کر دیا گیا۔ جنرل ایوب، یحییٰ خان کو ایک سادہ مزاج، خوش باش اور من موجی قسم کا آفیسر خیال کرتے تھے جو کسی قسم کے سیاسی عزائم نہیں رکھتا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ وہ اس کے ذریعے فوج پر مکمل کنٹرول رکھ سکیں گے۔ لیکن ان کا یہ خیال غلط تھا۔ ایک طرف جنرل یحییٰ خان نے دوسرے طالع آزما جرنیلوں کو ساتھ ملا کر اقتدار پر قبضے کے لیے منصوبہ بندی شروع کر دی اور دوسری جانب جنرل پیرزادہ کے ذریعے ایوب مخالف تحریک میں تیزی لانے کے لیے بھٹو کی حوصلہ افزائی کرنے لگے۔ انہوں نے بھٹو کو اس تحریک میں شدت پیدا کرنے کے پیغامات بھیجے۔

جرنیلوں کی اس خاموش آشیر باد کے ساتھ بھٹو نے وسیع پیمانے پر ایوب مخالف تحریک شروع کی بلکہ عزیز احمد اور ان کے پیروکاروں نے بھی بیوروکریٹس کے درمیان ایک کامیاب ایوب مخالف تحریک کی ابتدا کر دی۔ ان کی اس خفیہ منصوبہ بندی نے طاقتور بیوروکریسی کے ایک قابل قدر حصے میں ایوب مخالف جذبات کو جنم دیا۔ اس کے علاوہ جنرل اکبر نے، جو انٹیلی جینس کے سربراہ تھے، منصوبے کے ایک حصے کے طور پر ایوب خان کو ملک کی زبوں حالی کے بارے میں رپورٹس بھیجنی شروع کر دیں۔ اس طرح ایوب خان مکمل طور پر ناامید اور کمزور ہو گئے اور تمام تر خود اعتمادی سے محروم ہو گئے۔

19 مارچ کو جنرل یحییٰ خان نے مشرقی پاکستان سے جنرل مظفر الدین کو طلب کیا۔ جرنیلوں کا بند کمرے میں ایک خفیہ اجلاس ہوا۔ اجلاس میں سی جی ایس جنرل گل حسن نے جرنیلوں کی جانب سے آرمی چیف کو مشورہ دیا، ''ہم ملک کی تباہ ہوتی ہوئی صورتِ حال کو مزید برداشت نہیں کر سکتے۔ ملکی سالمیت اور اتحاد دونوں خطرے میں ہیں۔ ایوب انتظامیہ مکمل طور پر ختم ہو چکی ہے۔ اس مرحلے پر اس کے سوا کوئی دوسرا متبادل موجود نہیں کہ ملک اور قوم کے وسیع تر مفاد میں آپ کی سربراہی میں مارشل لاء نافذ کر دیا جائے۔ برائے مہربانی جتنی جلد ہو سکے اقتدار پر قبضہ کر لیں۔'' اس کے بعد فیصلہ کیا گیا کہ 25 مارچ کو ملک میں ایک مرتبہ پھر مارشل لاء نافذ کر دیا جائے۔ اجلاس کے بعد مکمل یقین دہانی حاصل کرنے کے بعد جنرل یحییٰ، صدر سے ملاقات کے لیے گئے۔ ملاقات کے دوران انہوں نے واضح طور پر جنرل ایوب کو بتا دیا کہ ''ہم مزید تباہی نہیں دیکھنا چاہتے۔ اس کو روکنے کے لیے آپ 25 مارچ تک جو کچھ آپ کر سکتے ہیں کریں۔'' صورتِ حال میں بہتری کے لیے مشرقی اور مغربی پاکستان کے دونوں گورنروں کو تبدیل کر دیا گیا۔ لیکن اس قدم سے بھی تباہ ہوتی

ہوئی صورتِ حال میں کوئی بہتری پیدا نہ ہو سکی۔

10۔ جنرل یحییٰ خان نے اقتدار پر قبضہ کر لیا

25 مارچ کو جنرل راؤ فرمان علی اور جنرل مظفر الدین کے ہمراہ راولپنڈی آئے ہوئے جرنیلوں نے جنرل یحییٰ کے ساتھ بند کمرے میں ایک اور اجلاس کیا۔ یحییٰ خان کرسی صدارت پر تھے۔ بہت سے فارمیشن کمانڈر بھی اس اجلاس میں حاضر تھے۔ مارشل لاء کے نفاذ کا طریقہ کار طے کرنے کے بعد وہ ایوان صدر گئے۔ صدر نے کہا، ''جہاں تک میرا خیال ہے مارشل لاء کے نفاذ کے علاوہ کوئی دوسرا متبادل نہیں ہے۔'' جنرل یحییٰ نے ٹھنڈے لہجے میں کہا، ''بالکل درست ہے۔'' صدر ایوب کا خیال تھا کہ جرنیل ان کی قیادت میں مارشل لاء کے نفاذ کا سوچ رہے ہیں۔ لیکن جنرل یحییٰ خان نے بڑی سختی سے کہا، ''مارشل لاء فوجی شخصیات کے زیر قیادت لگایا جائے گا۔'' اس پر فیلڈ مارشل ایوب خان نے کہا، ''جو آپ کہہ رہے ہیں اسے میں سمجھتا ہوں، میں استعفیٰ دے رہا ہوں۔'' ایوب خان کی تقریر ریکارڈ کر لی گئی۔ اسی روز جنرل یحییٰ خان نے بھٹو سے ملاقات کی اور کہا، ''ایوب ناکام ہو چکا ہے۔ میں نے اقتدار پر قبضہ کر لیا ہے۔ اب تمہاری کیا رائے ہے؟'' بڑی چالاکی کے ساتھ بھٹو نے مشروط حمایت کر دی۔

25 مارچ کی رات کو ایوب خان کی تقریر قومی میڈیا پر نشر کر دی گئی۔ مارشل لاء نافذ ہو گیا، یحییٰ خان چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بن گئے، آئین معطل کر دیا گیا اور صدارتی آرڈیننس جاری کر دیئے گئے۔

مارشل لاء کے نفاذ کا جواز پیش کرنے کے لیے صدر ایوب نے اپنی تقریر میں کہا کہ ''مکمل انتظامی، معاشی اور سیاسی بدنظمی کی وجہ سے مارشل لاء کا نفاذ کرنا پڑا ہے۔'' اپنے دَور کے آخری ایام کی صورتِ حال کے بارے میں، جب کہ ملک کا پورا انفراسٹرکچر تقریباً مکمل طور پر تباہ ہو چکا تھا، فیلڈ مارشل نے بڑی بے بسی کے انداز میں افسوس کا اظہار کیا، ''صدر کے طور پر میں ملک کی تباہی کو نہیں دیکھ سکتا، اس لیے میں نے مستعفی ہونے کا فیصلہ کیا ہے۔'' اس طرح ایک اور مطلق العنان حکمران اپنے افسوس ناک انجام کو پہنچا جیسا کہ تاریخ میں ہمیشہ ہوتا آیا ہے۔

مجموعی صورتِ حال کی روشنی میں اور خاص طور پر گول میز کانفرنس کی ناکامی کے بعد لوگوں کو مارشل لاء کے نفاذ اور جنرل یحییٰ خان کے اقتدار پر قبضے سے کوئی حیرانی نہیں ہوئی تھی کیوں کہ یہ کوئی انہونی بات نہیں تھی۔ جب گفت و شنید کے ذریعے سیاسی مسائل کا کوئی حل تلاش کرنے میں ناکامی کا سامنا ہو تو مطلق العنان حکمران ہمیشہ بندوق کے زور پر کوئی حل مسلط کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ گول میز کانفرنس کی ناکامی کے بعد ایوب خان کے پاس دستبرداری اور مارشل لاء کے نفاذ کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔ پرزور عوامی تحریک کے سامنے ایوب خان کو اقتدار میں رکھتے ہوئے یا ان کی انتظامیہ کو قائم رکھتے ہوئے صورتِ حال پر قابو پانا ممکن نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ فوجی جرنیلوں نے درست طور پر ایوب خان کو ہٹانے اور جنرل یحییٰ خان کی

زیر قیادت مارشل لاء کے نفاذ کا فیصلہ کیا۔

گاہے بگاہے یہ کہا جاتا رہا کہ جنرل یحییٰ خان نے بے دلی اور مجبوری کے تحت اقتدار سنبھالا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ 1965ء کی جنگ کے بعد جب سیاسی صورتِ حال خراب ہونا شروع ہوئی، پس منظر میں طالع آزما جرنیل بڑے ٹھنڈے اور محتاط طریقے سے ملک پر قبضہ کرنے کی منصوبہ بندی کر رہے تھے۔ اگرچہ جنرل یحییٰ خان کا اقتدار پر قبضہ قدرے اچانک تھا، تاہم سیاستدان حیران تھے اور نہ ہی ناراض۔ انہوں نے کسی حد تک بغیر خوش آمدید کہے اسے قبول کر لیا تھا۔

اقتدار پر قبضے کے 24 گھنٹے کے اندر یحییٰ خان نے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے طور پر قوم سے خطاب کرتے ہوئے کہا، ''میں آپ کو واضح طور پر بتانا چاہتا ہوں کہ میرے کوئی سیاسی عزائم نہیں ہیں۔ میرا واحد مطمع نظر جس قدر جلد ممکن ہو سکے ایک آئینی حکومت کا قیام اور واپس بیرکوں میں جانا ہوگا۔ میں پختہ یقین رکھتا ہوں کہ ایک تعمیری سیاسی عمل کی موجودگی، براہِ راست ووٹنگ اور بالغ حق رائے دہی کے ذریعے انتخابات کا انعقاد اور عوام کے منتخب کردہ نمائندوں کو اقتدار کی منتقلی ایک دیانت دار، درست اور صاف شفاف انتظامیہ کے قیام کی اوّلین شرائط ہیں۔ منتخب پارلیمنٹ ایک نیا آئین پیش کرے گی اور سیاسی اور معاشی مسائل کا حل اور منصفانہ سماجی نظام قائم کرنا اس کی ذمہ داری ہوگی۔ اسے ان مسائل کو بھی حل کرنا ہوگا جنہوں نے لوگوں کے ذہنوں میں تشویش پیدا کر رکھی ہے۔''

یحییٰ خان کی اس تقریر کے بعد اچانک تمام تحریکیں، ہڑتالیں اور سیاسی مظاہرے رک گئے۔ طلبا اور اساتذہ نے بھی اپنی تحریکیں روک دیں اور سڑکوں سے غائب ہو گئے۔

11۔ اختتام کی شروعات

یہ متحدہ پاکستان کے اختتام کی ابتدا تھی۔ تیسری دنیا کے کسی بھی دوسرے ملک کی طرح، ہمارے سیاستدانوں نے اقتدار کے بھوکے جنرل کی تقریر کو سنجیدگی سے نہیں لیا تھا۔ اس کی انتظامیہ کو اکثر لوگوں نے ایوب خان کے بغیر ایوب انتظامیہ کا تسلسل قرار دیا۔ ابتدا میں جرنیلوں نے اسی طرح حکومت کرنے کی کوشش کی جس طرح ایوب خان کر رہے تھے۔ ان میں سیاسی بصیرت اور دانش کی کمی تھی، اس لیے وہ ان جذبات کا درست اندازہ نہ لگا سکے جو عوام میں ایک لمبی ایوب مخالف تحریک کے نتیجے میں جنم لے چکے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ بڑا مسئلہ بعض مطلوبہ تبدیلیوں کے بعد تباہ شدہ انتظامیہ کی بحالی ہے۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ سیاسی پارٹیوں اور ان کے رہنماؤں سے گفت وشنید کے ذریعے وہ مشرقی پاکستان میں بنگالیوں اور حق خود ارادیت کے مسئلے سمیت تمام سیاسی مسائل کا حل تلاش کر لیں گے۔

ایوب انتظامیہ میں طاقت کا ارتکاز چند فوجی اور سول بیوروکریٹس کے ہاتھوں میں تھا۔ اپنے اقتدار کے خاتمے کے نزدیک صدر بتدریج مکمل طور پر سول بیوروکریٹس پر انحصار کرنے لگے تھے، جو ان کی

ناکامی کی وجوہات میں سے ایک اہم وجہ تھی۔ اس لیے اقتدار سنبھالنے کے بعد جنرل سول بیوروکریٹس کے بارے میں بہت محتاط ہو گئے تھے۔ جنرل ایس جی ایم پیرزادہ، جنرل یحییٰ خان کا پرنسپل سٹاف آفیسر بن گیا۔ اس کے تحت بریگیڈیئر رحیم کو مارشل لاء معاملات کا انچارج اور بریگیڈیئر کریم کو سول معاملات کا انچارج مقرر کیا گیا۔ بعد میں دونوں کو میجر جنرل کے عہدے پر ترقی دے دی گئی۔ یہ دونوں آفیسر سپر سیکریٹری کے طور پر کام کر رہے تھے اور تمام وزارتوں کے سیکریٹریوں پر برتری رکھتے تھے۔ کوئی بھی انتظامی معاملہ ان آفیسرز کی نظروں سے گزرے بغیر صدر کے علم میں نہیں لایا جا سکتا تھا۔ اس طرح جنرل پیرزادہ نے کامیابی کے ساتھ ساری بیوروکریسی کو صدر سے دُور رکھا۔ ایوب دَور کے بہت سے سینئر بیوروکریٹس کو ان کے عہدوں سے ہٹا دیا گیا، ان میں سے کچھ کو استعفے دینے پر مجبور کر دیا گیا، جن میں الطاف گوہر، این اے فاروقی، فدا حسین وغیرہ شامل تھے۔ اس طرح فوجی ٹولے کے اقتدار میں آنے کے پہلے دن ہی سے بیوروکریسی ان کی جانب سے اٹھائے گئے اقدامات پر ناخوش تھی۔ جنرل پیرزادہ بتدریج جنرل یحییٰ خان کے چیف ایڈوائزر اور سیاسی گرو کی حیثیت اختیار کر چکے تھے۔ سنڈے ٹائمز نے انہیں ''راسپوتین'' قرار دیا۔

31 مارچ کو یحییٰ خان نے صدارت کا عہدہ سنبھال لیا، جس کا جواز یہ پیش کیا گیا کہ سفارتی پیچیدگیوں سے بچنے اور بیرونی دنیا کی منظوری حاصل کرنے کے لیے یہ ناگزیر ہو چکا تھا لہٰذا انہوں نے مجبوراً یہ عہدہ سنبھالا ہے۔ تاہم صدر بننے کے بعد بھی انہوں نے آرمی چیف کا عہدہ اپنے پاس ہی رکھا۔ جنرل ایوب خان نے اقتدار سنبھالنے کے بعد سویلین کابینہ تشکیل دی تھی لیکن یحییٰ خان نے سویلین کو اقتدار میں شامل کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے نتیجے میں ان کی کابینہ، جس کی تشکیل 17 اگست کو عمل میں آئی تھی، کے تمام ارکان مسلح افواج کے ممبران تھے۔ جنرل یحییٰ خان، جنرل رحیم، جنرل پیرزادہ، ایئر مارشل نور خان اور ایڈمرل احسن کابینہ کے ارکان میں شامل تھے۔ اس طرح طاقت کا جو مرکز قائم کیا گیا اس کا نام ''کونسل آف ایڈمنسٹریشن'' رکھا گیا۔ سیکریٹری اس کے تحت تھے اور صرف ضرورت محسوس ہونے پر ان کی رائے حاصل کرنے کے لیے طلب کیا جاتا تھا۔ صدر جنرل یحییٰ اور اس کے جنرل یہ خیال کرتے تھے کہ مضبوط مسلح افواج، اس کی تنظیمی قوت، عملی سوجھ بوجھ، تکنیکی فوقیت، عصرِ حاضر کی سائنسی جانکاری تک رسائی مسلح افواج کو یہ حق تفویض کرتی ہے کہ قوم اور ملک کو جدید بنانے میں وہ رہنمائی کے فرائض ادا کرے۔

اس دوران ایئر مارشل نور خان نے مزدوروں اور طلبا کے مطالبات کو پیش نظر رکھتے ہوئے دوررس اقدامات اٹھائے۔ انہوں نے مزدوروں کے بہت سے مطالبات کی معقولیت کو تسلیم کیا۔ ان کے ہڑتال کے حق کو جائز قرار دیا۔ انہوں نے ایوب خان کی تعلیمی پالیسیوں کو ختم کر دیا اور نئی پالیسیاں تشکیل دینے کے لیے اقدامات اٹھائے۔ انہوں نے یونیورسٹی اساتذہ کی تقرریوں اور ترقیوں کی کمیٹی میں طلبا کی نمائندگی کا مسئلہ بھی اٹھایا۔ جنرل یحییٰ خان اور ان کی کونسل آف ایڈمنسٹریشن نور خان کے ان اقدامات پر بے چین ہو گئی۔ اپنے مفادات سے وابستہ گروہ خوف زدہ ہو گئے۔ کاروباری برادری، سول بیوروکریسی، جنرل پیرزادہ اور

جنرل حامد نے صدر جنرل یحییٰ خان کو قائل کیا کہ نور خان یہ تمام اقدامات اپنی مقبولیت میں اضافہ کرنے کے لیے اٹھا رہا ہے اور وہ اسی مقصد کے لیے وہ تمام ناجائز تجاویز کمیٹی کے اجلاسوں میں پیش کر رہا ہے۔ صدر جنرل یحییٰ خان متذبذب ہو گئے۔ انہوں نے خیال کیا کہ نور خان یہ تمام کام اپنے سیاسی عزائم حاصل کرنے کے لیے کر رہا ہے۔ اس شک کے نتیجے میں جنرل یحییٰ خان اور نور خان کے درمیان ایک کشمکش پیدا ہو گئی اور جنرل یحییٰ خان نے کونسل آف ایڈمنسٹریشن کو ختم کر دیا۔ ایئر مارشل نور خان اور ایڈمرل احسن کو چیف آف ایئر سٹاف اور چیف آف نیول سٹاف کے عہدوں سے ریٹائر کر دیا گیا اور دونوں کو بالترتیب مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان کا گورنر مقرر کر دیا۔

اس دوران جنرل یحییٰ خان نے اعلان کیا کہ وہ مرکز میں کونسل آف ایڈمنسٹریشن کی بجائے سول کابینہ تشکیل دے رہے ہیں۔ مشرقی اور مغربی پاکستان دونوں میں سے پانچ پانچ افراد کا انتخاب کر کے نئی کابینہ تشکیل دی گئی۔ ایک مارشل لاء آرڈیننس کے ذریعے ایوب خان کا 1962ء کا آئین اور اس کی متعلقہ شقیں بحال کی گئیں اور گورنروں کو وہی اختیارات اور ذمہ داریاں سونپی گئیں۔ اس کے نتیجے میں صوبائی انتظامیہ میں مبارزت آرائی متعارف کروادی گئی کیوں کہ گورنروں کی تقرری کے بعد بھی صوبائی اور زونل مارشل لاء ایڈمنسٹریٹرز نے صدر سے براہِ راست رابطہ رکھا ہوا تھا جو چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بھی تھے۔

انتظامی ڈھانچے میں ان تمام تبدیلیوں نے لوگوں کے دل میں شکوک پیدا کر دیئے، کیا صدر اپنے اقتدار کو طول دینے کے لیے اپنی پوزیشن مستحکم کر رہے تھے؟ کیا وہ انتخابات کے انعقاد اور عوام کے منتخب نمائندوں کو جس قدر جلدی ہو سکے، اقتدار سونپنے اور واپس بیرکوں میں جانے کے قوم سے کیے گئے وعدے سے منحرف ہو رہے تھے؟ تاہم صدر گاہے بہ گاہے یقین دہانی کراتے رہے کہ ان کا ارادہ اقتدار کو منتقل کرنے کے بعد واپس بیرکوں میں جانے کا ہے۔ صدر یحییٰ خان کی حکومت سویلین بیوروکریسی خاص طور پر سی ایس پی آفیسرز کے لیے کوئی زیادہ خوشگوار نہیں تھی۔ جنرل پیرزادہ اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے دفتر میں دو دوسرے ''سپر سیکریٹریوں'' جنرل رحیم اور جنرل کریم کے کہنے پر 303 سی ایس پی آفیسرز کو رشوت ستانی کے الزامات کے تحت ملازمتوں سے برخاست کر دیا گیا۔ ان میں چند بڑے ہونہار اور مستعد آفیسرز بھی شامل تھے۔ اگرچہ ان کے خلاف بدعنوانیوں کے الزامات عاید کیے گئے لیکن ان کو برخاست کرنے سے پہلے مناسب تحقیقات کی گئیں نہ ہی انہیں اپنے خلاف لگائے گئے الزامات کا دفاع کرنے کا موقع مہیا کیا گیا۔ ان میں سے چند آفیسرز بعد میں بے گناہ ثابت ہوئے اور دوبارہ بحال کر دیئے گئے۔

12۔ قومی مناقشات

حکمران طبقے کے ہاتھوں مشرقی پاکستان کے بنگالیوں کے استحصال، نفرت اور کمینگی کے مظاہرے نے اس صوبے کے لوگوں کو باغی اور غضبناک کر دیا تھا۔ اس غصے میں کمی لانے اور بنگالیوں کو خوش کرنے کے

لیے صدر نے مخصوص اقدامات پر غور کیا۔ انہوں نے کچھ سینئر بنگالی سی ایس پی آفیسرز کو سینٹرل سیکریٹریٹ میں سیکریٹریوں کے عہدے پر فائز کیا اور احکامات جاری کیے کہ جب بھی کسی منسٹری میں کوئی اعلیٰ عہدہ خالی ہوتو وہاں بنگالیوں کا تقرر ترجیحی بنیادوں پر کیا جائے۔ ان کے حکم پر مسلح افواج میں بنگالیوں کا کوٹا دگنا کر دیا گیا۔ اگر چہ بنگالیوں میں جنم لینے والے غصے کی شدت کو کم کرنے کے لیے ان کی مخلص اور سنجیدہ کوششیں کسی حد تک قابل تعریف تھیں، لیکن ان کو بہت کم اور انتہائی تاخیر سے لیے گئے اقدامات خیال کیا گیا کیوں کہ معاملات اب اس سے بہت آگے بڑھ چکے تھے۔ 1969ء تک بنگالی قوم خودمختاری یا آزادی کسی ایک بات کا اٹل فیصلہ کر چکی تھی۔ اس موقع پر بنگالی قومی سطح پر صدر کے ان اقدامات کو انتہائی معمولی خیال کر رہے تھے جب کہ لوگ اس وقت خودمختاری یا آزادی طلب کر رہے تھے۔ یہ بعید از قیاس نظر آتا تھا کہ اس قدر معمولی اقدامات کے نتیجے میں وہ اپنی تحریک سے علیحدہ ہو جائیں گے۔

صدر نے اپنی کابینہ اگست کے مہینے میں تشکیل دی۔ زیادہ تر ارکان جن کا انتخاب کیا گیا، عمر رسیدہ بوڑھے افراد تھے۔ مغربی پاکستان سے ایک ریٹائرڈ میجر جنرل، ایک ریٹائرڈ چیف جسٹس، نام نہاد بائیس خاندانوں میں سے اور جاگیردار اور صنعت کار طبقوں سے ایک ایک فرد کا چناؤ کیا گیا۔ مشرقی پاکستان سے دو سابقہ سی ایس پی آفیسر ایک سیاستدان، ایک نجی کاروباری شعبے سے اور ایک ماہر تعلیم کا انتخاب کیا گیا۔ جنرل یحییٰ خان کی تشکیل دی گئی اس نئی کابینہ نے لوگوں پر کوئی اثر مرتب نہ کیا۔ مارشل لاء کے تحت دوسری کسی بھی کابینہ کی طرح اس کابینہ کے اختیارات بھی بہت محدود تھے۔ کسی بھی وزیر کے پاس کسی بھی اہم معاملہ پر کوئی فیصلہ لینے کا اختیار نہ تھا۔ تمام بڑے اور اہم فیصلے صدر اور ان کی کچن کابینہ میں طے ہوتے تھے۔ وزرا کو افتتاحی فیتے کاٹنے، عوامی جلسے کروانے، تقریبات اور دعوتوں میں حاضری دینے تک محدود رکھا گیا تھا۔ اپنی وزارت کے لیے وہ مکمل طور پر صدر کی شفقت اور التفات کے محتاج تھے۔ لہٰذا ان کا اہم ہدف صدر کو خوش رکھنا تھا۔

جب جنرل یحییٰ خان نے اقتدار سنبھالا تو ملک خوف ناک سیاسی اور آئینی بحران سے گزر رہا تھا۔ سماجی اقتصادی حالت بھی خطرناک حد تک تباہ ہو چکی تھی۔ نہ صرف قومی اتحاد بلکہ معیشت کو بھی تباہی و بربادی کا سامنا تھا۔ جنرل یحییٰ کی حکومت اس صورتِ حال سے نمٹنے کی کوئی صلاحیت یا اہلیت نہیں رکھتی تھی۔ کسی بھی فوجی حکومت کی کامیابی کے لیے عوامی مقبولیت کی ضرورت ہوتی ہے جس سے جنرل یحییٰ کی انتظامیہ محروم تھی۔ اس کے علاوہ ملک میں موجود مؤثر پریشر گروپس مثلاً شہری دانشور طبقے، بیوروکریسی اور کاروباری برادری کی حمایت حاصل کرنا بھی اتنا ہی اہم ہے، جنرل یحییٰ خان یہ بھی حاصل نہ کر سکے تھے۔ مزید برآں فوجی ٹولے کے اندر خود بھی اقتدار کی کشمکش پائی جاتی تھی۔ ان سب سے بڑھ کر اہم بات یہ تھی کہ جنرل یحییٰ خان کو مسلح افواج کی وہ مکمل حمایت حاصل نہیں تھی جو جنرل ایوب کو حاصل تھی۔ ان سب حقائق کی موجودگی میں یحییٰ خان کی حکومت ایک کمزور اور نازک انتظامیہ کے علاوہ کچھ نہیں تھی۔

اس دوران معاشی ترقی اور وسائل کی منصفانہ تقسیم جیسے اہم مسائل پر قومی اختلافات کھل کر سامنے

آ چکے تھے۔ اکثر دانشور ماہرین سمجھتے تھے کہ موجودہ سرمایہ دارانہ ڈھانچے میں رہتے ہوئے کسی قسم کی سماجی اقتصادی ترقی ممکن نہیں۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ حکومت لوگوں کے زندہ رہنے کے لیے کم از کم بنیادی ضروریات کی فراہمی یقینی بنائے۔ وہ موجود سماجی اقتصادی ڈھانچے میں مکمل تبدیلی چاہتے تھے۔ اس کے لیے انقلابی اقدامات اٹھانے کی ضرورت تھی۔ جنرل یحییٰ خان کے زیر قیادت ٹولے سے اس بات کی توقع ناممکن تھی۔ وہ اور ان کے حواری وقت کے اس اہم ترین مطالبے کو پورا کرنے کے قابل نہیں تھے۔ تاہم پھر بھی جنرل یحییٰ خان نے اپنی حدود میں رہتے ہوئے اعلان کیا، ''اس وقت ہمارے پاس ایک جامع منصوبے کے تحت معاشی ترقی کے لیے آگے بڑھنے کے سوا کوئی دوسرا متبادل موجود نہیں ہے۔ اگر ہم سماجی انصاف قائم کرنے میں ناکام ہو جاتے ہیں تو پھر معاشی ترقی کے لیے ہماری تمام کوششیں رائیگاں جائیں گی۔ معاشرے میں پائے جانے والے فرق کو ختم کرنا ہوگا۔ اگر ہم مراعات یافتہ اور محروم طبقے کے درمیان فرق کو کم کرنے اور توازن پیدا کرنے میں ناکام ہوتے ہیں، تو ہم معاشرتی بدامنی، نفرت اور طبقاتی تصادم کو روک نہیں سکیں گے۔ اس کے نتیجے میں معاشی شعبے میں کچھ بھی حاصل نہیں کیا جا سکے گا۔ کوئی ترقی نہیں ہوگی۔ ایک اچھی منصوبہ بندی کے تحت ترقی کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کے معیارِ زندگی میں ہر طرف بہتری پیدا ہو اور مراعات یافتہ طبقے پر محروم طبقات کے مفادات کو ترجیح دی جائے۔''

اس پالیسی کو حقیقی معنوں میں اور قوت کے ساتھ نافذ کرنے کے لیے انفراسٹرکچر میں ایک انقلابی تبدیلی کی ضرورت تھی۔ محض سطحی تبدیلیوں سے کچھ بھی حاصل کرنا ناممکن تھا۔ جنرل یحییٰ خان کی حکومت نے 1969-70ء اور 1970-71ء کے بجٹ میں مزدوروں کی کم از کم اجرت مقرر کی اور صحت، تعلیم اور رہائشی شعبوں میں زیادہ فنڈ مختص کیے۔ اس دوران بیرونی امداد میں قابلِ قدر کمی واقع ہوگئی۔ قومی بچتوں میں بہت زیادہ کمی آ گئی۔ اس کے نتیجے میں منصوبہ بندی کمیشن کو بجٹ کی تخصیصات میں تبدیلیاں کرنا پڑیں۔ 1969ء میں مشرقی پاکستان میں ابھرنے والی عوامی تحریک اور مغربی پاکستان کے خلاف جذبات کی ایک بڑی وجہ دونوں حصوں میں پایا جانے والا معاشی فرق بھی تھا۔ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے درمیان ایک بڑا معاشی خلا پایا جاتا تھا۔ فرق کا یہ خلا لمبے عرصے کی محرومی اور استحصال کے نتیجے میں بہت شدید ہو چکا تھا۔ ملک کے اندر اور باہر ماہرین کہہ رہے تھے کہ جب تک یہ لگاتار بڑھنے والا خلا پُر نہیں کیا جاتا، پاکستان کے اتحاد کو قائم رکھنا مشکل ہو گا۔ مغربی پاکستان کو پاکستان کے اس اتحاد کو قائم رکھنے کے لیے بہت زیادہ معاشی اور سیاسی قربانیاں دینا پڑنی تھیں۔ کیا حکمران اشرافیہ اس قسم کے سخت اقدامات اٹھانے کے لیے تیار تھی؟

اگر حکمران طبقہ اس طرح کی مطلوبہ قربانیاں دینے پر متفق بھی ہو جاتا تو بھی ایک مختصر سے عرصے میں اس فرق کو کم کرنا ناممکن تھا۔ اس قسم کی صورتِ حال میں جنرل یحییٰ خان کی حکومت کو چوتھا پانچ سالہ منصوبہ تیار کرنا تھا۔ شروع میں شیخ مجیب نے اس کی مخالفت کی۔ ان کا کہنا تھا کہ عبوری حکومت ہونے کے ناتے، جنرل یحییٰ خان کی حکومت طویل المدتی پانچ سالہ منصوبہ تیار کرنے کی مجاز نہیں ہے۔ لیکن بعد میں انہیں اس

حقیقت کا ادراک ہو گیا کہ معاشی پہیے کو گھومتا رکھنے کے لیے اور بیرونی امداد کے مسلسل بہاؤ کے لیے پانچ سالہ منصوبہ ضروری تھا۔ 3 فروری 1970ء کو نیشنل اکنامک کونسل کا اجلاس صدر کی زیر قیادت شروع ہوا۔ اس اجلاس میں مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان کی جانب سے شریک ہونے والے نامزد وزرا میں اختلافِ رائے پیدا ہو گیا۔ اس اختلافِ رائے کے دوران صدر کو دو پالیسی اعلانات کرنا پڑے۔ کمیٹی کے ممبران کو ہدایات دی گئی تھیں۔

(1) سماجی انصاف پر زیادہ زور دیا جائے۔

(2) علاقائی تفاوتوں کو قابل قدر حد تک کم کرنا ہوگا۔

صدر کی خواہش کے مطابق پانچ سالہ منصوبے کا ایک ڈرافٹ تیار کیا گیا۔ یہ ڈرافٹ مغربی اور مشرقی پاکستان کے ماہرین معاشیات کے دو علیحدہ علیحدہ پینلوں کے سامنے غور کے لیے پیش کیا گیا۔ دونوں پینلوں کی رپورٹس نیشنل اکنامک کونسل کے سامنے رکھی گئیں۔ یہ دونوں رپورٹیں ایک دوسرے کے یکسر متضاد تھیں۔ 2 جون 1970ء کو نیشنل اکنامک کونسل نے پانچ سالہ منصوبے کو حتمی شکل دینے کے لیے اجلاس کیا۔ اجلاس میں ان دونوں رپورٹوں پر تلخ بحث مباحثہ ہوا۔ اس نے پہلے سے ہی گرم سیاسی ماحول میں مزید گرمی پیدا کر دی۔ بہت سی تبدیلیوں کے بعد آخر کار جون 1970ء کے اختتام پر نیشنل اکنامک کونسل نے چوتھا پانچ سالہ منصوبہ منظور کر لیا۔ اس منصوبے میں فنڈز کی تقسیم اس طرح سے کی گئی تھی:

کروڑ روپوں میں

	مشرقی پاکستان	مغربی پاکستان
حکومتی شعبہ	2980 (60 فیصد)	1960 (40 فیصد)
نجی شعبہ	1000 (39 فیصد)	1600 (61 فیصد)
کل	3980 (52.5 فیصد)	3560 (47.5 فیصد)

چوتھے پانچ سالہ منصوبے کا مقصد مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان معاشی تفاوت کو بتدریج کم کرنا تھا۔ ڈاکٹر ملک اور احسن الحق کے علاوہ کابینہ میں مشرقی پاکستان کے تین وزرا نے فنڈ کی اس تقسیم پر احتجاج کیا۔ مغربی پاکستان کے وزرا نے اپنا نقطہ نظر بیان کرتے ہوئے کہا کہ یہ تقسیم پاکستان کے دونوں حصوں میں موجود معاشی تفاوت کو ختم کرنے کے لیے ایک اہم قدم ہے۔ 2 جون 1970ء کو سالانہ بجٹ کے موقع پر بنگالی وزرا جی ڈبلیو چوہدری، حفیظ الدین اور شمس الحق نے نیشنل اکنامک کونسل کے 71-1970ء کے منصوبے پر شدید تنقید کی۔ انہوں نے کہا کہ سالانہ منصوبے کے اہداف چوتھے پانچ سالہ منصوبے سے مطابقت نہیں رکھتے جس کا مقصد معاشی خلا کو کم کرنا اور مشرقی پاکستان کے لوگوں کی فی کس آمدنی میں اضافہ کرنا تھا۔ لہٰذا ان کی رائے کے مطابق سالانہ منصوبہ ناقابل قبول تھا۔

لیکن صدر نے ان کے احتجاج کو نظر انداز کرتے ہوئے نیشنل اکنامک کونسل کو اپنے منصوبے کے اطلاق کا حکم جاری کر دیا۔ اس کے نتیجے میں تینوں وزرا نے مشترکہ طور پر صدر کو لکھا: ''ہم بجٹ کی اس قسم کی امتیازی تقسیم کے خلاف احتجاج کے طور پر کابینہ کے عہدوں سے استعفے پیش کرتے ہیں۔ اس قسم کے ناجائز غیر منصفانہ سلوک کو قبول کرتے ہوئے ہمارے لیے وزرا کی حیثیت سے کام کرنا ممکن نہیں ہے۔'' ان کا خیال تھا کہ ان کے مشترکہ استعفوں کے نتیجے میں دوسرے دو وزرا کے لیے مستعفی ہونے کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہیں رہے گا اور بنگالی ارکان کے اس قسم کے احتجاجی استعفے بنگالیوں کی سیاسی تحریک پر مثبت اثرات ڈالیں گے۔ جنرل یحییٰ خان کے اپنے چنے ہوئے وزرا بھی ان کی حکومت کی بنگال دشمن پالیسیوں پر تنقید کر رہے ہیں۔

اس قدم کے فوراً بعد صدر نے تینوں وزرا جی ڈبلیو چوہدری، حفیظ الدین اور شمس الحق کو گفت و شنید کی دعوت دی۔ اس ملاقات میں انہوں نے کہا کہ جلد ہی وہ نیشنل اکنامک کونسل کا ہنگامی اجلاس طلب کریں گے اور انہوں نے ان وزرا کو یقین دلایا کہ اس ہنگامی اجلاس میں وہ واضح طور پر نیشنل اکنامک کونسل کو بتائیں گے کہ مشرقی پاکستان سے ان کی کابینہ کے ساتھیوں نے انہیں بتایا ہے کہ 71-1970ء میں بجٹ کی تقسیم امتیازی ہے۔ فنڈز کی یہ تقسیم مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان معاشی تفاوت کو کم کرنے کے لیے موزوں نہیں ہے، لہٰذا ان کے لیے اس بجٹ کو منظور کرنا ممکن نہیں ہے۔

جب کمیشن کو صدر کے خیالات کا علم ہوا تو صدر کے خیالات میں اس اچانک تبدیلی پر بیوروکریٹس بہت پریشان ہوئے۔ تاہم انہیں بغیر کوئی سوال کیے فنڈز کی اس تقسیم کو تبدیل کرنا پڑا اور 150 کروڑ روپے مشرقی پاکستان میں سیلاب کی روک تھام کے لیے مختص کر دیے گئے۔ صدر اور کمیشن نے ضرورت پڑنے پر مزید فنڈز کی فراہمی کی یقین دہانی کرائی۔ چوتھے پانچ سالہ منصوبے اور 71-1970ء کے سالانہ بجٹ سے دو باتیں واضح ہو چکی تھیں۔ اوّل، جنرل یحییٰ اور ان کے حکمران ٹولے کو یہ بات اچھی طرح سمجھ آ گئی تھی کہ اگر اس تفاوت کو کم نہ کیا گیا تو پاکستان کے اتحاد کو برقرار نہیں رکھا جا سکے گا۔ لہٰذا انہوں نے موجود خلا کو کم کرنے کے لیے کچھ اقدامات اٹھانے کی کوشش کی۔ دوئم، اگرچہ صدر اور کچھ دوسرے لوگوں نے خلوصِ دل سے دونوں حصوں کے اتحاد کو قائم رکھنے کی کوششیں کیں، تاہم مغربی پاکستان کی حکمران اشرفیہ کے کچھ ارکان میں بنگالیوں کے خلاف شدید نفرت اور الجھاؤ پایا جاتا تھا۔ لہٰذا پاکستان کا متحد رہنا ڈانواں ڈول نظر آ رہا تھا۔

13۔ ساٹھ کے عشرے میں پاکستان کی خارجہ پالیسی

اس جگہ میں مناسب خیال کرتا ہوں کہ ساٹھ کے عشرے میں پاکستان کی خارجہ پالیسی پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے۔ پچاس کے عشرے کے دوران پاکستان کو ایشیا میں امریکہ کا سب سے بڑا دوست ملک ہونے کا اعزاز حاصل ہو چکا تھا، اور روس، پاکستان سے شدید ناراض تھا۔ 1960ء میں کمیونسٹ روس کا پاکستان کے خلاف معاندانہ رویہ عروج پر تھا۔ اس سال یوٹو کے واقعہ کے بعد خروشیف نے پاکستان پر

راکٹ حملے کی دھمکی دے رکھی تھی۔ بعد میں اگرچہ پاک امریکہ تعلقات پاکستان کی دوطرفہ پالیسی کے باعث اچھے اور خوشگوار ہی رہے۔ تاہم ایوب دَور میں پاکستان کے چین اور روس کے ساتھ تعلقات میں بھی گرم جوشی پیدا ہوگئی تھی۔ اس کے نتیجے میں پاکستان کو چین اور روس سے تکنیکی اور مالی معاونت حاصل ہونے لگی۔

1969ء میں پاکستان کی داخلی صورتِ حال انتہائی خراب ہوگئی اور جنرل یحییٰ خان نے اقتدار سنبھال لیا۔ دنیا میں پاکستان کا تاثر بھی بہتر نہ رہا۔ جنرل یحییٰ کی حکومت حقیقت میں بغیر کسی خارجہ پالیسی کے تھی۔ خارجہ تعلقات کے بارے میں تمام تر فیصلے نیشنل سیکیورٹی کونسل کے رکن سیکریٹری جنرل پیرزادہ اور جنرل عمر کے ہاتھوں میں تھے۔ ان دونوں جنرلوں میں سے کسی کو بھی خارجہ معاملات، بین الاقوامی تعلقات اور سفارتی سرگرمیوں کی کوئی تربیت نہ تھی۔ اس کے باوجود یہ دونوں اپنے آپ کو کسی طور پر بھی ہنری کسنجر سے کم تر سفارت کار خیال نہیں کرتے تھے۔ ان کے جابرانہ رویے کے باعث ایک بڑے قابل اور صاحب علم سیکریٹری خارجہ کو ریٹائرمنٹ لینی پڑ گئی۔ اسے اس لیے ریٹائرڈ کر دیا گیا تھا کیوں کہ اس نے ان دونوں خود ساختہ سفارت کاروں اور خارجہ معاملات کے ماہرین سے اختلاف کیا تھا۔ اگرچہ جنرل یحییٰ خان اندرونی دباؤ اور پیچیدہ سیاسی صورتِ حال سے نمٹنے میں اس قدر مصروف تھے کہ وہ خارجہ معاملات کی طرف زیادہ توجہ نہیں دے سکتے تھے۔ پھر بھی اس وقت پاکستان کے خارجہ تعلقات میں چند اہم واقعات رونما ہوئے ان واقعات نے پاکستان کی خارجہ پالیسی کو کافی تحریک بخشی۔ 1969ء میں امریکہ کے صدر نکسن بائیس گھنٹے کے سرکاری دورے پر پاکستان آئے۔ اپنے دورے کے دوران انہوں نے جنرل یحییٰ خان کو چین امریکہ تعلقات کو بہتر بنانے میں ثالثی کے لیے ذاتی دلچسپی لینے کی درخواست کی۔ اس کے بدلے میں نکسن نے پاکستان کو ایک بڑے دوست ملک کے طور پر تمام ممکنہ فوجی اور سول امداد دینے کا وعدہ کیا۔ جنرل یحییٰ خان نے اس ذمہ داری کو بڑی خوشی سے قبول کیا اور چین امریکہ تعلقات کو معمول پر لانے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس طرح پاکستان اور امریکہ کے درمیان بندھن مزید مضبوط ہوگیا۔ چین نے بھی یحییٰ خان کے ذاتی جذبے اور دلچسپی کو سراہا اور تعریف کی۔ اس طرح جنرل یحییٰ خان کے دَور میں پاک چین اور پاک امریکہ تعلقات میں غیر متوقع طور پر بہتری آ گئی۔

صدر نکسن کے دورے کے فوراً بعد جنرل یحییٰ خان اسلامی سربراہی کانفرنس میں شرکت کے لیے رباط گئے۔ یہ ان کا پہلا بیرونی دورہ تھا۔ ہندوستان کی حکومت نے بھی ایک مسلمان وزیر کی قیادت میں ایک وفد شمولیت کے لیے رباط روانہ کیا۔ لیکن اس وفد کو کانفرنس میں شمولیت کی اجازت نہ دی گئی اور اسے واپس آنا پڑا۔ اس کے نتیجے میں پاکستان کے عوام بہت زیادہ خوش ہوئے۔ جنرل یحییٰ خان کانفرنس سے ایک فاتح کے طور پر واپس آئے۔ لوگوں نے انہیں ہندوستانی وفد کی کانفرنس میں شمولیت میں ناکامی پر مبارکبادیں دیں۔ بعد میں جنرل یحییٰ خان ایران کے دورے پر گئے۔ صدر خود بھی شیعہ مسلک سے تعلق رکھتے تھے۔ صرف یہی

نہیں ان کے آباؤاجداد بھی ایران ہی سے ہجرت کر کے پاکستان آئے تھے۔اس لیے وہ شاہِ ایران کے ساتھ بڑے قریبی ذاتی تعلقات قائم کرنے میں کامیاب رہے۔ان کے گہرے ذاتی تعلقات کی وجہ سے جنرل یحییٰ خان کے دَور میں پاک ایران تعلقات میں بہت گرم جوشی رہی۔

اس تمام صورتِ حال کے باوجود پاکستان ایک مرتبہ پھر 70-1969ء میں روس کے منفی دباؤ کا شکار رہا۔روس، ایوب خان کی جگہ لینے والے کو موافق نقطہ نظر سے نہیں دیکھتا تھا۔''پراودا'' نے پاکستان میں محافظوں کی تبدیلی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:''جب ایوب خان نے سیاسی رہنماؤں سے بات چیت کرنے کی ابتدا کی تو حزب مخالف تقسیم ہوگئی تھی۔لیکن بتدریج امریکہ کی حامی اور چین کی حامی قوتوں نے اتحاد کرلیا اور ایوب مخالف تحرک شروع کردی۔پاکستان کے مسائل کو مارشل لاء کے نفاذ کے ذریعے حل نہیں کیا جاسکتا۔'' مارچ 1969ء میں ایوب حکومت کے خاتمے سے تھوڑا پہلے روس کے وزیر دفاع مارشل اے اے گریچوف نے پاکستان کا دورہ کیا۔اپنے دورے کے دوران انہوں نے پاکستانی جنرلوں کو مطلع کیا تھا کہ ایوب خان کو اقتدار سے ہٹانے کا کوئی بھی قدم غلط قدم ہوگا اور ملک کے لیے انتہائی نقصان دہ ثابت ہوگا۔اگر چہ روس جنرل یحییٰ خان کے اقتدار پر قبضے کو پسند نہیں کرتا تھا پھر بھی کوسی جن اور پوڈ گورنی نے 11 اپریل کو اپنے خیر سگالی کے پیغامات بھجوائے۔اس کے بعد مئی میں کوسی جن نے پاکستان کا دورہ کیا۔اس دورے کا مقصد جنرل یحییٰ خان سے روبرو گفتگو کرنا تھا۔اپنی گفتگو کے دوران کوسی جن نے اپنے خیالات کا کھل کر اظہار کیا:''پاکستان، روس اور چین کے ساتھ بہ یک وقت خوشگوار تعلقات نہیں رکھ سکتا۔'' اس کے جواب میں یحییٰ خان نے کوسی جن سے سوال کیا،''روس کس طرح بہ یک وقت پاکستان اور ہندوستان دونوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھ سکتا ہے؟'' کوسی جن نے جواب دیا،''جو کچھ ایک سپر پاور ممکنہ طور پر کر سکتی ہے۔پاکستان جیسا ایک چھوٹا سا ملک وہ کرنے کا متحمل نہیں ہوسکتا۔'' پاکستان کے بارے میں روس کا رویہ اس بیان سے پوری طرح واضح ہو جاتا ہے۔ایوب خان کے بعد چینیوں نے یحییٰ خان کو روسیوں کی دوستی کے خلوص کے بارے میں متنبہ کردیا تھا۔ کوسی جن کے بیان سے چین کے انتباہ کی تصدیق ہوتی تھی۔یحییٰ خان کو کوسی جن کے دورے کے بعد ایک نازک دُہری مشکل کا سامنا کرنا پڑا۔ایک طرف روس تھا اور دوسری طرف امریکہ اور چین تھے۔کس سمت جایا جائے؟ انہوں نے فیصلہ کرنے سے پہلے جون 1970ء میں ماسکو، اکتوبر میں واشنگٹن اور نومبر میں پیکنگ کا دورہ کرنے کا فیصلہ کیا۔

14۔ 70-1969ء میں پاک بھارت تعلقات تشویش ناک حد تک خراب ہو گئے

70-1969ء میں خاص طور پر اگر تلہ سازش کیس کے بعد پاک ہند تعلقات تشویش ناک حد تک بگڑ چکے تھے۔فوجی اور سول انٹیلی جینس ایجنسیاں صدر کو رپورٹیں دے رہی تھیں کہ ہندوستان واضح طور پر مشرقی پاکستان میں مداخلت کر رہا ہے۔انہوں نے صدر کو بتایا کہ ہندوستان، مشرقی پاکستان میں خود ارادیت

کی تحریک کی براہِ راست مدد کر رہا ہے۔ ایک دوست ملک نے بھی انہیں اس قسم کی معلومات فراہم کیں۔ جنرل یحییٰ خان نے ان الزامات کو سنجیدگی سے نہ لیا، لیکن جس وقت انہوں نے حقیقت کا ادراک کیا تو صورتِ حال قابو سے باہر ہو چکی تھی۔ ان کی کابینہ کے بہت سے ساتھیوں نے بھی پاکستان کو دو حصوں میں توڑنے کی ہندوستانی سازش کی عوامی جلسوں میں بات کی تھی اور عوام اور صدر کو متنبہ کیا تھا۔ لیکن عوام نے بھی اور صدر نے بھی ان کے اس واویلے پر کان دھرنا مناسب خیال نہ کیا۔

15۔ جنرل یحییٰ خان اور سیاسی پیش رفتیں

25 مارچ 1969ء کو جب جنرل یحییٰ نے ملک کا اقتدار حاصل کیا تو انہوں نے اعلان کیا تھا کہ وہ جلد سے جلد اقتدار عوام کی منتخب حکومت کو منتقل کر دیں گے اور بیرکوں میں واپس چلے جائیں گے۔ جنرل ایوب نے بھی ایسا ہی وعدہ کیا تھا جب انہوں نے 1958ء میں اقتدار سنبھالا تھا۔ لیکن ان کے اعلانات اور وعدوں میں کچھ تضاد پایا جاتا تھا۔ ایوب خان نے کہا تھا کہ وہ ملک کی بہتری کے لیے ایک موزوں آئین تشکیل دیں گے لیکن جنرل یحییٰ نے اپنی 10 اپریل کی تقریر میں واضح طور پر اعلان کیا تھا: ''ہمارا مقصد ملک میں ایک مثبت سیاسی عمل کا آغاز کرنا ہے تا کہ اقتدار انتخابات کے ذریعے منتخب کیے گئے عوامی نمائندوں کو سونپا جا سکے۔'' انتخابات کے بارے میں ان کا بیان بہت واضح تھا: ''انتخابات براہِ راست کروائے جائیں گے اور منتخب نمائندے نیا آئین تشکیل دینے کے ذمہ دار ہوں گے۔'' 10 اپریل اور 28 جولائی کے درمیان جنرل یحییٰ خان نے سیاستدانوں سے گفت وشنید کی اور 28 جولائی کو اپنے منصوبے کا اعلان کیا۔ اگر چہ جنرل یحییٰ خان نے مارشل لاء نافذ کیا، قومی اسمبلی کو ختم کیا، آئین کو منسوخ کیا اور کابینہ کو برخاست کر دیا لیکن انہوں نے سیاسی جماعتوں پر پابندی نہیں لگائی تھی۔ انہوں نے اپنے پیش رو جنرل ایوب کی طرح سیاستدانوں کو گرفتار نہیں کیا تھا بلکہ انہوں نے صدر کا عہدہ سنبھالنے سے پہلے مسٹر بھٹو اور مولانا بھاشانی سے ملک میں موجود سیاسی صورتِ حال کے بارے میں گفت وشنید بھی کی تھی۔ اسی لیے سیاسی رہنما ان کے اقتدار سنبھالنے پر حیران نہیں ہوئے تھے بلکہ لوگوں نے مارشل لاء کے نفاذ اور اس ابتری کی فضا سے چھٹکارے پر سکھ کا سانس لیا تھا جس نے ایک لمبی ایوب مخالف تحریک کے بعد جنم لیا تھا۔ اگر چہ عوام نے انہیں اقتدار سنبھالنے پر اس طرح سے خوش آمدید نہیں کہا تھا جس طرح جنرل ایوب خان کو کہا گیا تھا، وہ کسی حد تک لاتعلق رہے تھے۔

جنرل یحییٰ خان نے سیاسی مسائل کا حل تلاش کرنے کے لیے جنرل ایوب خان کی طرح کسی گول میز کانفرنس کا اہتمام نہیں کیا تھا۔ اس کی بجائے انہوں نے ملک کے طول وعرض کا دورہ کیا اور مختلف سیاسی جماعتوں کے سیاسی رہنماؤں سے دو طرفہ سیاسی گفت وشنید کی۔ جائز طور پر انہوں نے شیخ مجیب الرحمٰن کے ساتھ اپنی گفتگو کو خاص اہمیت دی۔ تاہم شیخ مجیب الرحمٰن ابتدا میں جنرل یحییٰ خان کے خلوص کے پوری طرح قائل نہیں تھے۔ لیکن بعد میں ان کے اور صدر کے درمیان ایک خاص قسم کی ذاتی گرم جوشی پیدا ہو گئی تھی۔ اس

طرح جنرل یحییٰ خان شیخ مجیب الرحمٰن کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

جنرل یحییٰ کی سیاسی گفت وشنید کا اصل مقصد پاکستان کی سالمیت کو قائم رکھتے ہوئے موجود سیاسی صورتِ حال کا ایک قابل قبول حل تلاش کرنا تھا۔ فوجی ٹولے کے تمام جنرل ملک کے اتحاد کو برقرار رکھنے کے سوال پر ایک تھے۔ اس گفت وشنید کی تمام تر تفاصیل سے تمام جنرلوں کو آگاہ رکھنا پڑتا تھا اور صدر اپنے جنرلوں سے مشورے اور ان کی منظوری کے بعد کوئی فیصلہ لے سکتے تھے۔ اس طرح وہ اپنے کچھ اچھے ارادوں اور خیالات پر عمل کرنے سے کسی حد تک معذور تھے۔ بعض مواقع پر ان کے سوچے سمجھے منصوبوں اور اقدامات کی بھی مخالفت کی گئی اور وہ ترک کر دیئے گئے۔ بنیادی طور پر فوجی ٹولے میں بعض جنرلوں پر شیخ مجیب کی بد اعتمادی اس کی وجہ تھی۔ وہ خود بھی شیخ مجیب اور ان کے چھے نکات کے حوالے سے صدر کے رویے کے بارے میں زیادہ پر تیقن نہیں ہوتے تھے۔

ان تمام سیاسی مذاکرات میں سب سے مشکل نکات یہ تھے۔ کیا شیخ مجیب اپنے چھے نکات میں پاکستان کی سالمیت کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری کسی قسم کی تبدیلی کرنے کو تیار ہوں گے؟ کیا فوجی ٹولہ آخرکار اقتدار شیخ مجیب الرحمٰن کو سونپنے کے لیے تیار ہوگا، اگر وہ انتخابات جیت جاتے ہیں؟ صدر کی مولانا بھاشانی کے ساتھ گفتگو کے دوران بھاشانی نے کوئی واضح بات نہیں کی تھی کہ اس آئینی بحران پر کیسے قابو پایا جا سکتا ہے۔ انہوں نے صدر سے کہا کہ آزادی سے لے کر آج تک پاکستان کی کسی بھی حکومت نے غریب اور راندے ہوئے محنت کش طبقے کے لیے کچھ نہیں کیا۔ انہوں نے صدر سے درخواست کی کہ معاشرے کے غریب طبقے کے معیارِ زندگی کو بہتر کرنے کے لیے کچھ ٹھوس اقدامات اٹھائے جائیں۔ اس گفت وشنید کے دوران ایک موقع پر صدر نے مولانا سے درخواست کی، ''مولانا آپ ان مسائل کے حل کے لیے میرے ساتھ شامل کیوں نہیں ہو جاتے؟'' جواب میں مولانا نے کہا: ''میرا کام استحصال زدہ محروم طبقے کے مطالبات حکومت تک پہنچانا اور ساتھ ہی لوگوں کو حکومت کی ناکامیوں سے آگاہ کرنا ہے۔ مجھے حکومت میں شامل ہونے کی کوئی خواہش نہیں ہے۔ مولانا سے گفت وشنید کرتے ہوئے صدر کم مراعات یافتہ طبقے کے لیے ان کے بے لوث اور پر خلوص جذبے سے بے حد متاثر ہوئے۔

صدر نے مشرقی پاکستان کے دوسرے اعتدال پسند رہنماؤں سے بھی گفت وشنید کی۔ ان سب نے صدر کو بتایا کہ صرف ایک قابل قبول سیاسی حل کی تلاش ہی پاکستان کی سالمیت کو بچا سکتی ہے۔ لیکن کچھ رہنماؤں نے شیخ مجیب کے ارادوں کے بارے میں شکوک کا اظہار بھی کیا۔ طبقہ اشرافیہ سے تعلق رکھنے والے بھٹو جو جاگیرداروں کی نمائندگی کرتے تھے، اس وقت مغربی پاکستان میں اپنی مقبولیت بڑھانے میں مصروف تھے۔ ساتھ ہی وہ بڑی ہوشیاری کے ساتھ حکمران ٹولے میں موجود چند با اثر جنرلوں سے تعلقات کا فائدہ اٹھا رہے تھے۔ مغربی پاکستان میں مقبولیت حاصل کرنے کے لیے وہ مختلف صوبوں میں مختلف لوگوں سے مختلف باتیں کر رہے تھے۔ مثال کے طور پر پنجاب میں انہوں نے کہا: ''اگر ضرورت پڑی تو ہم گھاس کھا لیں گے اور

اپنا کھویا ہوا وقار حاصل کرنے کے لیے ہندوستان کے ساتھ ہزار سال تک جنگ کریں گے۔'' بھٹو کے اس قسم کے جملے ان دنوں میں پنجابیوں کے جذبات اور احساسات کی ترجمانی کرتے تھے کہ وہ ایوب خان کے تاشقند معاہدے کو ایک شرمناک توہین خیال کرتے تھے۔

دوسرے چھوٹے صوبوں میں بھٹو علاقائی استحصال اور منصفانہ اور مساویانہ معاشرتی رتبے کے حصول کے لیے اسلامی سوشلزم کے قیام کی بات کرتے تھے۔صدر کے ساتھ اپنی گفت وشنید کے دوران انہوں نے بھی بھاشانی کی طرح موجودہ آئینی بحران پر قابو پانے کے لیے کوئی واضح بات نہیں کی تھی۔انہوں نے شیخ مجیب کے چھے نکات پر بھی خاموشی اختیار کیے رکھی اور کوئی تبصرہ نہ کیا، اگرچہ چھے نکات اس وقت کی قومی سیاست میں انتہائی اہم معاملہ تھا۔انہوں نے اپنی گفتگو میں ملک کے اندرونی بحران کی بجائے بین الاقوامی معاملات پر زیادہ زور دیئے رکھا جب کہ اس وقت ملک کی اپنی سالمیت خطرے میں تھی۔بھٹو کے ایسے رویے نے قوم کو مایوس کیا۔

پاکستان کی دوسری دائیں بازو کی جماعتوں نے خاص طور پر مذہبی جماعتوں نے اپنی باتوں میں سیاسی فلسفے، ریاست اور مذہب پر روشنی ڈالی۔انہوں نے اس وقت کے اہم مسائل مثلاً مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے درمیان کشمکش، علاقائی تفاوت وغیرہ پر کوئی بات نہ کی۔ان جماعتوں نے شیخ مجیب کے چھے نکات پر بھی خاموشی اختیار کیے رکھی۔روس کی حامی ولی خان کی جماعت اے این پی نے اور مظفر احمد اور بائیں بازو کی دوسری جماعتوں نے صدر سے مذاکرات سے انکار کر دیا۔پہلے دن ہی سے انہوں نے مارشل لاء حکومت کی مخالفت شروع کر دی تھی۔

1969ء میں چار ماہ کی لمبی گفت وشنید کے بعد صدر نے 28 جولائی کو قومی تشریاتی رابطے پر اپنا پالیسی بیان جاری کیا۔انہوں نے کہا، ''ملک کے سیاسی رہنماؤں نے اہم قومی مسائل پر مختلف آراء کا اظہار کیا ہے۔شیخ مجیب الرحمٰن نے 1956ء کے آئین کی بحالی کی شدید مخالفت کی جب کہ بہت سے سیاسی رہنما سمجھتے ہیں کہ انتخابات کے جلد انعقاد کے لیے اس کی بحالی ضروری ہے۔کچھ نے مشورہ دیا کہ انتخابات اسی طریقے سے ہونے چاہئیں جس طرح 1955ء میں سیاسی لیڈروں کے درمیان باہمی مفاہمت پر ہوئے تھے۔ شیخ مجیب نے واضح الفاظ میں کہا کہ انتخابات عوام کی براہِ راست رائے دہی کی بنیادوں پر ہونے چاہئیں۔ مغربی پاکستان کے بعض سیاستدانوں نے مشورہ دیا ہے کہ مرکز میں دو ایوان ہونے چاہئیں۔1955ء میں مغربی پاکستان کے تمام صوبوں کو اکٹھا کر کے ''ون یونٹ'' تشکیل دیا گیا تھا۔بہت سے اس کے خلاف ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ''ون یونٹ'' ختم کر دیا جائے اور چاروں صوبوں کو مکمل حق خود ارادیت کے ساتھ دوبارہ بحال کر دیا جائے۔سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ اگر شیخ مجیب اپنے چھے نکات میں کوئی رعایت نہیں کرتے تو کیا مرکز اپنے فرائض ادا کر سکے گا؟ اس صورت میں صوبوں اور مرکز کے درمیان کیا تعلق ہوگا؟'' اس پس منظر میں صدر نے بات کرتے ہوئے مزید کہا، ''آپ اس بہت بڑے تفاوت کو دیکھ سکتے ہیں جو سیاستدانوں کی آراء کے

درمیان پایا جاتا ہے۔ میں ماضی میں بھی کہہ چکا ہوں اور اب بھی کہتا ہوں کہ ان معاملات کے بارے میں میرے خیالات بڑے واضح اور صاف ہیں۔ فیصلہ عوام نے کرنا ہے۔ ایک بات میں یہاں پوری طرح واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ عوام کسی بھی قسم کی حکومت اور آئین کا انتخاب کر سکتے ہیں لیکن پاکستان کے نظریے اور اس کے اتحاد کو ہر صورت میں برقرار رکھنا ہوگا۔ پاکستان کے نظریے اور اس کی سالمیت کو لازماً قائم رکھنا ہوگا۔ ہماری اوّل اور آخری ترجیح خود پاکستان ہونا چاہیے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جائز علاقائی مطالبات کو نظر انداز کر دیا جائے۔ پاکستان کے اتحاد کو خطرے میں ڈالے بغیر ایسے ذرائع اور راستے تلاش کیے جا سکتے ہیں۔
پھر صدر نے بنگالی عوام کی شکایات اور مطالبات کا ذکر کیا: ''قومی سطح پر بنگالیوں کو اپنا کردار ادا کرنے کے جائز مواقع سے لمبے عرصے سے محروم رکھا گیا ہے۔ لہٰذا اس قسم کے امتیازات کے خلاف ان کی شکایات بڑی جائز ہیں۔ میں ان امتیازات کو رفع کرنے کا وعدہ کرتا ہوں۔''

پاکستان کی تاریخ میں کسی بھی سربراہِ مملکت نے مشرقی پاکستان کے مسائل پر اس قدر کھلے اور درست انداز میں بات نہیں کی تھی۔ ایک لمبے عرصے تک بنگالیوں کو فیصلہ سازی سے دُور رکھنے کی پالیسی نے محرومی کا ایک شدید احساس پیدا کر دیا تھا، جو بتدریج رنج و ملال میں تبدیل ہو گیا اور آخر کار احتجاج کی صورت میں سامنے آیا۔ ایک پر تشدد تحریک ملک کی سالمیت کے لیے خطرہ بن چکی تھی۔ آئینی کمیٹی کے سربراہ جسٹس شہاب الدین نے بنگالیوں کی سوچ کے بارے میں اپنی رپورٹ میں لکھا: ''بنگالیوں کے ساتھ نوآبادیاتی رویہ روا رکھا گیا۔''

تاریخ میں پہلی مرتبہ کسی سرکاری دستاویز میں پاکستان میں جاری سیاسی صورتِ حال کو بیان کرنے کے لیے مغربی پاکستان کے ہاتھوں مشرقی پاکستان کے استحصال کو بیان کرتے ہوئے ''نوآبادیاتی'' کا لفظ استعمال کیا گیا۔ اس صورت حال میں پاکستان کے اتحاد کو صرف مشرقی پاکستان کے عوام کے حق خود ارادیت کے جائز مطالبے پر غور کرتے ہوئے بچایا جا سکتا تھا۔ دونوں حصوں کے عوام اپنے وطن عزیز پاکستان کے بکھرنے کے خواہش مند نہیں تھے۔ وہ صرف یہ چاہتے تھے کہ ان کے جائز مطالبات کو تسلیم کر لیا جائے۔ کئی برسوں سے مشرقی پاکستان کے عوام کی قومی سطح پر شمولیت کے حق سے انکار اس افسوس ناک بحران کی بنیادی وجہ تھا جس کا قوم کو 1971ء میں سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔

صدر جنرل یحییٰ خان نے اپنی خوش امیدی کا اظہار کیا کہ عوام اور سیاسی رہنما قومی اتفاق رائے اور اپنے مشترکہ اقدام سے یقینی طور پر اس بحران سے، جس کا قوم کو سامنا ہے، نکلنے کا کوئی راستہ تلاش کر لیں گے۔ انہوں نے یہ وضاحت بھی کی اگر وہ اس میں ناکام رہتے ہیں تو پھر وہ خود اس کا حل تلاش کرنے پر مجبور ہوں گے۔ اگست تک صدر بہ خوبی سمجھ گئے تھے کہ سیاستدانوں کے لیے مکمل اتفاق رائے سے اہم مسائل کا حل تلاش کرنا ممکن نہیں، اس لیے انہوں نے اقتدار کی منتقلی کے خفیہ منصوبے پر کام شروع کر دیا۔ صدر، جنرل حامد، جنرل پیرزادہ، دونوں مارشل لاء ایڈمنسٹریٹروں، دونوں صوبوں کے گورنروں نے تواتر کے ساتھ اجلاسوں کا

سلسلہ شروع کر دیا۔ انہوں نے سیاسی رہنماؤں اور سیاسی پارٹیوں کی جانب سے اٹھائے جانے والے ہر قدم اور بیان کا احتیاط کے ساتھ تجزیہ کیا۔ فوج اور سول انٹیلی جنس کی رپورٹوں کا بھی سنجیدگی کے ساتھ تجزیہ کیا جا رہا تھا۔ کابینہ کا ان اجلاسوں کے ساتھ کوئی تعلق نہ تھا۔

اب تک شیخ مجیب الرحمٰن، مشرقی پاکستان کے عوام کے ایک بڑے ترجمان کے طور پر سامنے آ گئے تھے۔ ان کا پہلا اور سب سے اہم مطالبہ قومی انتخابات کی حتمی تاریخ کا اعلان تھا۔ انہوں نے 1956ء کے آئین کی بھی مخالفت کی۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ 1956ء کے آئین کے مطابق رائے دہی کی بجائے لوگوں کی براہِ راست رائے دہی ہونی چاہیے۔ انہوں نے 1956ء کے آئین میں بیان کیے گئے مرکز اور صوبوں کے تعلقات کے خلاف بھی شدید احتجاج کیا۔ انہوں نے مغربی پاکستان کے سیاستدانوں کے ''ون یونٹ'' توڑنے کے مطالبے کی بھی حمایت کی۔ عوامی لیگ کے علاوہ باقی تمام رہنما چند تبدیلیوں کے بعد 1956ء کے آئین کو بحال کرنے کے حق میں تھے۔ انہوں نے آئین میں ضروری تبدیلیاں کرنے اور صوبائی خود مختاری قائم کرنے کے اپنے مطالبے کو دہرایا۔ انہوں نے مجیب کے چھے نکات کی مخالفت کی لیکن وہ علاقائی تفاوت کو ختم کرنے کے لیے آئینی تبدیلیاں کرنے کے حق میں تھے۔ ان سب نے بہ یک زبان براہِ راست ووٹنگ اور عام انتخابات کے حق میں بات کی۔ اسلام پسند جماعتوں نے مضبوط مرکز کے قیام اور اسلامی طرزِ حکومت کا مطالبہ کیا۔ تاہم انہوں نے مشرقی پاکستان کے صوبائی خود مختاری اور خود ارادیت کے مطالبے کی مخالفت نہ کی، لیکن خود ارادیت کے سوال پر ان کے نظریات مشرقی پاکستان کے لوگوں جیسے نہیں تھے۔

بھٹو نے بھی 1956ء کے آئین کی مخالفت کی۔ وہ پارلیمانی جمہوریت کے شدید مخالف تھے۔ وہ دل و جان سے یقین رکھتے تھے کہ ''ویسٹ منسٹر'' قسم کی جمہوریت پاکستان جیسے ایک غیر ترقی یافتہ ملک کے لیے موزوں نہیں۔ ان کے نقطۂ نظر سے اس قسم کی حکومت ملک میں بدنظمی اور ابتری میں اضافہ کرے گی اور سیاسی استحکام کبھی بھی حاصل نہیں ہو سکے گا۔ اس نظام کے تحت عوام اور ملک کے لیے کوئی ترقی نہیں ہو سکے گی۔ یہ بھٹو کا پختہ یقین تھا۔ ایوب خان نے بھی بالکل یہی سوچا تھا۔ بھٹو کی رائے یہ تھی کہ مرکز صوبے کے تعلقات، آئین میں اسلامی نظریے کی شمولیت، ون یونٹ کو توڑنے جیسے معاملات کا حل یحییٰ خان انتظامیہ کی ذمہ داری ہے۔ انہوں نے کہا: ''ان تمام مسائل کا حل صدر کو خود اپنے طور پر تلاش کرنا ہوگا۔'' مغربی پاکستان کے اکثر سیاستدانوں نے ون یونٹ کے خاتمے کے لیے آوازیں اٹھائیں۔ پنجابی رہنما خاموش تھے گویا اس مطالبے کو تسلیم نہیں کر سکتے تھے، لیکن وہ اس خطرے کو بھانپتے ہوئے اس مسئلے پر خاموش تھے۔ بائیں بازو کی جماعتیں عام لوگوں کی نجات کے لیے سوشلزم قائم کرنا چاہتی تھیں۔

ان تمام مطالبات کے پیشِ نظر صدر کو مندرجہ ذیل تین مسائل کے بارے میں غور و فکر کرنا پڑا:

1۔ بنگالیوں کی براہِ راست رائے دہی اور عام انتخابات کا مطالبہ۔

2۔ مرکز اور صوبوں کے تعلقات۔

3- موجودہ پیچیدہ سیاسی صورتِ حال کے پیش نظر ون یونٹ کا خاتمہ اور دوبارہ صوبوں کا قیام۔

28 نومبر 1969ء کو جنرل یحییٰ نے قوم سے اپنے خطاب میں ان اہم مسائل کی بات کی۔ انہوں نے کہا کہ ستم ظریفانہ طور پر ملک کے رہنما قومی اہمیت کے مسائل پر اتفاقِ رائے قائم کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ سیاستدانوں پر براہِ راست الزام لگانے کی بجائے انہوں نے ہوشیاری کے ساتھ اس ناکامی کا الزام حالات کی پیچیدگی پر ڈال دیا۔ پھر انہوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ موجودہ صورتِ حال میں انتخابات کے سوال کو مندرجہ ذیل چار طریقوں سے حل کیا جا سکتا ہے:

1- منتخب نمائندوں کا ایک خصوصی آئین ساز اجلاس طلب کیا جائے جن کی ذمہ داری نیا آئین تشکیل دینا ہو۔

2- 1956ء کا آئین بحال کر دیا جائے۔

3- ایک نیا آئین تشکیل دیا جائے اور اس پر ریفرنڈم کروایا جائے۔

4- تمام سیاسی رہنماؤں کے ساتھ گفت وشنید کے ذریعے پرانے آئین کی خوبیوں اور خامیوں کا جائزہ لیا جائے اور پھر انتخابات کے انعقاد کے لیے ایک ''لیگل فریم ورک'' تشکیل دیا جائے۔

ان چاروں طریقوں کے اچھے اور برے پہلو بیان کرنے کے بعد صدر نے چوتھے متبادل کو بہترین اور قابلِ قبول قرار دیا۔ براہِ راست رائے دہی کے ذریعے انتخابات، ون یونٹ کے خاتمے اور مرکز اور صوبوں کے تعلقات، ان تینوں اہم مسائل کے بارے میں انہوں نے کہا: ''قومی اسمبلی براہِ راست رائے دہی کے ذریعے تشکیل دی جائے گی۔ ون یونٹ ختم کرنے کے بعد صوبائی اسمبلیاں بھی براہِ راست انتخابات کے ذریعے منتخب کی جائیں گی۔'' انہوں نے امید ظاہر کی کہ مختلف صوبوں کے رہنما قوم کے لیے آئین تشکیل دینے کے لیے یقیناً اتفاقِ رائے پیدا کر لیں گے۔ فوجی ٹولے کے بااثر ارکان ایئر مارشل نور خان اور جنرل حمید نے صدر کی تجاویز سے اختلاف کیا۔ ان کا خیال تھا کہ اگر مرکز میں دو ایوانوں کا نظام متعارف نہ کروایا گیا تو پھر بنگالی اپنی اکثریت کی بنیاد پر پاکستان کے دوسرے صوبوں پر اپنا تشکیل کردہ آئین ٹھونس دیں گے۔ اس لیے انہوں نے مطالبہ کیا کہ آئین کے بارے میں کوئی بھی فیصلہ پارلیمنٹیرین کے 60 فیصد ووٹ حاصل کرنے کے بعد کیا جائے۔ 25 نومبر تک صدر نے بڑی مشکل سے اپنی داخلی کابینہ کے ارکان کو اس بات پر قائل کیا کہ وہ اُن کے قوم سے اگلے خطاب تک اپنے 60 فیصد والے مطالبے سے لاتعلق رہیں۔

جب مشرقی پاکستان کے عوام نے 28 نومبر کو صدر کی تقریر سنی تو وہ حیران تھے کہ 60 فیصد والے مطالبے کی کوئی بات نہ تھی۔ جہاں تک مرکز اور صوبوں کے تعلق کی بات تھی، شیخ مجیب الرحمٰن کا نقطہ نظر یہ تھا کہ اس مسئلے پر منتخب حکومت ضروری فیصلہ کرے گی اور صدر نے شیخ مجیب الرحمٰن کا یہ مطالبہ تسلیم کر لیا۔ مغربی پاکستان میں بہت سے لوگوں نے اس بات پر صدر پر تنقید کی کیوں کہ اُن کا خیال تھا کہ صدر کو براہِ راست رائے دہی اور ''ون یونٹ'' کے خاتمے جیسے مسائل پر خود فیصلہ نہیں لینا چاہیے۔ صدر نے صوبائی خودمختاری کے

مطالبے کو بھی تسلیم کرلیا۔ انہوں نے مرکز اور صوبے کے تعلقات کے حوالے سے کہا، ''میں نے پہلے ہی مرکز اور صوبے کے تعلقات پر اپنے خیالات کا اظہار کر دیا ہے۔ مشرقی پاکستان کے بنگالیوں کو ہمیشہ قومی معاملات پر فیصلوں میں شرکت کرنے کے ان کے جائز حق سے محروم رکھا گیا ہے۔ اس قسم کی محرومیوں کے خلاف ان کی شکایات اور غصہ جائز ہے۔ ہمیں اس قسم کی محرومیوں کا ازالہ کرنا ہوگا۔ اس قسم کی محرومیوں اور شکایات کو صرف پاکستان کی سالمیت اور اتحاد کو قائم رکھتے ہوئے دونوں حصوں کو خود ارادیت کا حق دیتے ہوئے دُور کیا جا سکتا ہے۔ حق خود ارادیت کافی نہیں ہوگا۔ صوبوں کو معاشی شعبے میں بھی حق خود ارادیت دینا ہوگا۔ دونوں حصوں کا اپنے معاشی وسائل پر اختیار حاصل ہونا ضروری ہے۔ انہیں ایسی ترقیاتی سرگرمیاں جاری رکھنے کا اختیار ہونا چاہیے جو مرکز کے مفاد کے منافی نہ ہوں۔''

صدر کی 28 نومبر کی تقریر کی ملک کے اندر اور باہر تعریف کی گئی۔ ظاہری طور پر یوں محسوس ہوتا تھا کہ موجودہ بحران پرامن طور پر حل ہو جائے گا۔ نیویارک ٹائمز نے شہ سرخی کے ساتھ خبر شائع کی: ''پاکستان ایک مثال قائم کر رہا ہے۔ صدر جنرل آغا محمد یحییٰ خان براہِ راست ووٹنگ کے ذریعے عوام کے منتخب نمائندوں کو پُرامن طور پر اقتدار منتقل کر کے تمام دُنیا کے لیے ایک منفرد مثال قائم کر رہے ہیں۔ اس مرتبہ مشرقی پاکستان کے بنگالیوں کو مرکز میں اکثریت حاصل کرنے کا موقع حاصل ہوگا۔ آبادی کے لحاظ سے یہ ان کا جائز حق ہے۔'' کرسچن سائنس مانیٹر نے لکھا، ''جنرل یحییٰ خان نے براہِ راست انتخابات کا وعدہ کرتے ہوئے اپنی کامیابی کا ثبوت دیا ہے۔ آنے والی اسمبلی جو آئین تیار کرے گی وہ بنگالیوں کو مکمل خود ارادیت عطا کرے گا۔ پہلی مرتبہ بنگالیوں کو قومی معاملات میں اپنا مکمل کردار ادا کرنے کا موقع ملے گا۔'' امریکی کانگریس میں مسٹر سیکیز نے کہا، ''صدر یحییٰ خان کی مثال نہ صرف دوسرے ممالک کے لیے ایک رہنمائی ہے بلکہ قابل تعریف بھی ہے۔ ان کے اقدامات پاکستان کو جمہوریت کی طرف لے جائیں گے۔'' امریکہ کے صدر نکسن نے واشنگٹن میں یونانی سفیر سے کہا، ''یونانی پاکستان کی مثال کی تقلید کر سکتے ہیں۔''

صدر کا منصوبہ ملک کے اندر اور باہر علاقائی تفاوت کو ختم کرنے کی جانب دوررس نتائج کا حامل خیال کیا جا رہا تھا۔ جنرل یحییٰ کے منصوبے کے نفاذ سے یہ نظریہ کہ فوجی حکمران کبھی اقتدار نہیں چھوڑتے، غلط ثابت ہونے کو تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی صدر کی تقریر کے حوالے سے کچھ سوالات اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ کیا مسلح افواج بھی یعنی فوجی ٹولے کے تمام ارکان بھی اقتدار منتقل کرنے کے بارے میں ایسے ہی سوچ رہے تھے؟ کیا شیخ مجیب، پاکستان کے اتحاد کو بچانے کے لیے اپنے چھ نکات میں تبدیلی کرنے کے لیے رضامند ہو جائیں گے؟ کیا وہ انتخابات کے ذریعے محض اپنے آپ کو ملک کا ایک غیر متنازع لیڈر ثابت کرنے کی کوشش میں تھے؟ کیا وہ انتخابات کے بعد بھی بنگالی قومیت کے چیمپئن رہ سکیں گے؟ مغربی پاکستان کے دوسرے رہنماؤں خاص طور پر بھٹو کے ذہن میں کیا تھا؟ کیا وہ ان قربانیوں کے لیے تیار تھے جو صدر کی تجاویز کو قابل عمل بنانے کے لیے ضروری تھیں؟ جنرل یحییٰ کے منصوبے کا انحصار مندرجہ ذیل تین عوامل پر تھا:

اوّل: شیخ مجیب الرحمٰن اپنے چھے نکات میں ضروری تبدیلیاں کرلیں۔ حق خودارادیت حاصل کرنے کے بعد وہ ملک کے اتحاد کو قائم رکھنے کے لیے اپنی تمام علیحدگی پسندی کی سرگرمیاں ترک کردیں۔

دوئم: ملک کے اتحاد کی خاطر مغربی پاکستان کے سیاستدان، جاگیردار، صنعت کار اور کاروباری طبقہ پرخلوص قربانیاں پیش کرے تاکہ بنگالیوں کے دلوں سے وہ بداعتمادی، احساس محرومی دُور کیا جاسکے جو لمبے عرصے سے سیاسی اور معاشی شعبوں میں ان کے استحصال اور بنگالی عوام کی آرزوؤں اور تمناؤں کو کچلے رکھنے کی وجہ سے پیدا ہو چکا تھا۔

سوئم: فوجی جنرل منتخب نمائندہ حکومت کو اقتدار منتقل کرنے کے لیے تیار ہوں۔

بنگالی عوام کے دلوں میں ایک لمبے عرصے کے استحصال، محرومی اور نامعقول حکمرانی کے نتیجے میں جس غصے اور بداعتمادی نے جنم لیا تھا، ۷۰-۱۹۶۹ء میں وہ ایک کینسر کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ اس بے چینی اور بے قراری کی جڑیں بہت گہری تھیں۔ کینسر زدہ ملک کو بچانے کے لیے صدر کے منصوبے نے کچھ امید کی کرنیں پیدا کی تھیں لیکن کچھ لوگ ان کے اس پرخلوص منصوبے کو شک کی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ فوجی ٹولے کے کچھ جنرل، مسٹر بھٹو اور مغربی پاکستان کے کچھ دوسرے سیاستدان خیال کرتے تھے کہ جنرل یحیٰی خان بنگالیوں کو محض خوش کرنے کے لیے نامناسب مراعات دے رہے ہیں اور اس طرح قومی مفادات کا سودا کیا جارہا تھا۔ لیکن دوسری جانب گورنر مشرقی پاکستان ایڈمرل احسن اور چیف زونل مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل یعقوب، صدر کے منصوبے کو بنگالی عوام کی جانب سے ملنے والی قبولیت پر بہت خوش تھے۔ ملٹری انٹیلی جنس کے چیف جنرل اکبر اور سول انٹیلی جنس کے چیف رضوی نے صدر کو رپورٹ پیش کی کہ عوام کے کثیر حصے نے صدر کے منصوبے کو مثبت انداز میں لیا ہے۔ سوائے چند تنگ نظر سیاستدانوں، کاروباری افراد اور بیوروکریسی کے ایک چھوٹے سے حصے کے، مسلح افواج کے نوجوان آفیسرز اور ارکان کی اکثریت اور صاحب فہم جنرل ہر قیمت پر ملک کی سالمیت اور اتحاد کو قائم رکھنے کے حق میں تھے۔ وہ کسی بھی طریقے سے اس بداعتمادی اور نفرت کو ختم کرنے کے حامی تھے جو مغربی اور مشرقی پاکستان کے عوام کے دلوں میں پیدا کی گئی تھی۔

تاہم صدر ان انتہائی اہم سیاسی معاملات سے نمٹنے میں اپنے چند جنرلوں کے دباؤ میں تھے۔ بھٹو اور کچھ دوسرے تنگ نظر سیاستدانوں نے 29 نومبر 1969ء اور 30 مارچ 1970ء کے عرصے کے دوران مطالبہ کیا تھا کہ لیگل فریم ورک آرڈر کے تحت صدر کو خودمختاری کے دائرہ کار کی تشریح کرنی چاہیے۔ ان کا خیال تھا کہ اس کے نتیجے میں شیخ مجیب الرحمٰن بھی، اگر وہ اقتدار میں آجاتے ہیں، حق خودمختاری کے نعرے کے تحت علیحدگی کا کوئی مطالبہ نہیں کرسکیں گے۔ ان کے اس مطالبہ میں شاید کچھ منطق موجود تھی۔ لیکن اس دوران شیخ مجیب الرحمٰن نے گورنر احسن کے ذریعے واضح طور پر مطلع کردیا تھا کہ حق خودمختاری اور براہ راست انتخابات کے معاملے میں اگر کوئی تبدیلیاں کی گئیں تو مزید گفت و شنید کے راستے بند ہوجائیں گے اور خوں ریز تحریک شروع ہوجائے گی۔

فوجی ٹولے کے بہت سے ارکان سمجھتے تھے کہ انتخابات سے پہلے چھے نکات کے بھیس میں مجیب

کے علیحدگی کے منصوبے کو اگر ضرورت ہو تو طاقت سے کچل دیا جانا چاہیے۔ ان کا خیال تھا کہ شیخ مجیب الرحمٰن ایک منتخب لیڈر بن گیا تو پھر اس سے معاملہ کرنا مشکل ہو جائے گا۔ لیکن گورنر احسن نے صدر کو آگاہ کیا کہ اگر مجیب کے خلاف کسی قسم کی طاقت کا استعمال کیا گیا تو پاکستان کا اتحاد خطرے میں پڑ سکتا ہے۔ صدر احسن کی رائے سے اتفاق رکھتے تھے۔ ان کا پختہ خیال تھا کہ پاکستان کا اتحاد صرف مجیب کے چھ نکات میں تبدیلیوں کے ذریعے قائم رکھا جا سکتا تھا۔ ان کے اس پختہ یقین کی بنیاد مجیب کا صدر سے کیا گیا وعدہ تھا۔ اس سے پہلے شیخ مجیب صدر سے وعدہ کر چکے تھے کہ وہ پاکستان کی سالمیت اور اتحاد کو بچانے کے اپنے چھ نکاتی پروگرام میں ضروری تبدیلیاں کر دیں گے۔

اس دوران ایک امید افزا بات سامنے آئی۔ فروری 1970ء میں شیخ مجیب نے جی ڈبلیو چوہدری سے گفتگو کرتے ہوئے اپنے اس خیال کا اظہار کیا کہ صوبائی انتخابات بھی لیگل فریم ورک آرڈر کے تحت عام انتخابات کے ساتھ بہ یک وقت ہونے چاہئیں۔ ان کی منطق یہ تھی کہ چھ نکات پر کوئی سمجھوتہ کرتے ہوئے ان کے لیے صوبائی انتخابات علیحدہ سے لڑنا مشکل ہو جائے گا۔ بھٹو نے مجیب کی بات کی حمایت کی اور رائے دی کہ مرکزی انتخابات اور صوبائی انتخابات بہ یک وقت ہونے چاہئیں۔ اس بات سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ شیخ مجیب ذاتی طور پر پاکستان کو توڑنا نہیں چاہتے تھے۔ مجیب اور بھٹو کی رائے کو تسلیم کرتے ہوئے صدر یحییٰ نے عام انتخابات اور صوبائی انتخابات بہ یک وقت کروانے کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ انہوں نے اپنے فوجی ٹولے کو بتایا کہ اس مرحلے پر براہِ راست انتخابات میں کسی قسم کی تبدیلی یا حق خود مختاری کے دائرہ کار کی تشریح کی کوئی کوشش بنگالیوں کے دلوں میں شکوک و شبہات کو جنم دے گی اور اس طرح پر امن انتقال اقتدار کی کوششیں رائیگاں جائیں گی۔ لہٰذا کوئی بھی دوسرا اقدم اٹھانا نا معقول اور الٹے اثرات کا حامل ہوگا۔ اگرچہ حکمران فوجی ٹولے کے کچھ ارکان نے کھلم کھلا صدر کے خلاف کوئی بات نہ کی، جنرل حامد، جنرل ٹکا اور جنرل عمراب بھی یہی سمجھتے تھے کہ صدر بنگالیوں کو خوش کرنے کے لیے غیر ضروری طور پر بہت کچھ دے رہے ہیں۔ خاص طور پر انہوں نے شیخ مجیب کے ساتھ صدر کے لچکدار رویے پر تنقید کرنا شروع کر دی۔ ان دنوں میں جنرل پیرزادہ نے خفیہ طور پر بھٹو سے نزدیکی تعلقات قائم کر رکھے تھے۔ 31 مارچ 1970ء کو صدر نے قوم سے اپنے خطاب کے دوران عوام کو بتایا کو لیگل فریم ورک آرڈر درج ذیل باتوں پر مشتمل ہے:

1۔ اسلام پاکستان کا نظریہ ہوگا۔

(مجیب نے اپنی انتخابی مہم میں بھی اس کی مخالفت نہیں کی تھی۔ ان کے انتخابی منشور میں یہ پہلے ہی بیان کیا گیا تھا کہ اگر انہیں منتخب کر لیا گیا تو وہ اور عوامی لیگ کوئی ایسا قانون منظور کرنے کی اجازت نہیں دیں گے جو قرآن اور سنت کے خلاف ہو۔ عوامی لیگ نے اس پر قوم سے وعدہ کر رکھا تھا۔ مجیب اپنی مہم یہ کہہ کر چلا رہے تھے کہ ان کا آئین، اسلام اور نظریہ پاکستان پر مبنی ہوگا۔ انہوں نے یہ اس لیے کہا تھا کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ مشرقی اور مغربی پاکستان دونوں حصوں کے عوام مذہب کے بارے میں بہت حساس ہیں)۔

2۔ جمہوری طور پر منتخب حکومت آزادانہ اور منصفانہ انتخابات کو یقینی بناتے ہوئے آئین کو از سرِ نو مرتب کرے گی۔ اس پر کسی نے کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔

3۔ قومی اتحاد کو برقرار رکھنے کے لیے آئین میں ضمانت مہیا کی جائے گی۔

(مجیب کے ذہن میں جو کچھ بھی تھا، لیکن انہوں نے اس کے خلاف کبھی بات نہ کی تھی)۔

4۔ دونوں حصوں میں موجود تفاوت خاص طور پر معاشی تفاوت کو ختم کرنے کے لیے جن اقدامات کی ضرورت ہے، ان کا وضاحت سے ذکر کیا جائے گا جو آئین کا حصہ بن جائیں گے۔

(دونوں حصوں میں سے کوئی سیاستدان بھی اس کے خلاف کچھ نہیں کہہ سکتا تھا)۔

5۔ مرکز اور صوبے کے تعلقات ایسے ہوں گے کہ صوبوں کو مکمل خود مختاری اور حق خوارادیت حاصل ہوگا۔ مرکز کے پاس قوم کی حاکمیت اور سالمیت کے تحفظ کے لیے ضروری اختیار ہوگا۔ مرکز کے پاس اپنی دوسری ذمہ داریاں پوری کرنے کے لیے بھی مناسب اختیارات ہوں گے۔ آئین تشکیل دینے کے بعد آئین کا مسوّدہ صدر کے سامنے پیش کرنا ہوگا۔ کوئی بھی توضیح یا تشریح جو صدر کرے گا آئین میں شامل کی جائے گی۔

لیگل فریم آرڈر کی تمہید میں 27 آرٹیکل اور دو جدول تھے، اس لیے یہ ایک عارضی آئین کی طرح ہی نظر آتا تھا۔ یہ پانچ اہم اصول آرٹیکل 20 کا حصہ تھے۔ آئین تشکیل دینے کے لیے دوسرے متعلقہ ضروری فرمان دوسرے آرٹیکلز میں شامل تھے۔

لیگل فریم ورک آرڈر (ایل ایف او) کے آرٹیکل کے مطابق منتخب حکومت کو آئین تشکیل دینے کے لیے 120 روز دیئے گئے تھے۔ ماضی کے تجربے سے یہ بات سامنے آ چکی تھی کہ 1947ء میں آزادی سے لے کر نو برسوں میں یعنی 1947ء سے 1956ء تک اگرچہ دو انتخابات ہو چکے تھے، پہلا آئین دوسرے انتخابات کے بعد تشکیل دیا جا سکا تھا۔ لہٰذا اس قسم کی تکرار کو روکنے کے لے ایک ٹائم فریم دے دیا گیا تھا۔ صدر جنرل یحیٰی خان کی انتقالِ اقتدار کے بارے میں نیک نیتی کسی حد تک اس ٹائم فریم سے بھی ظاہر ہوتی تھی۔ مشرقی پاکستان کے سیاسی حلقوں میں (ایل ایف او) کے حوالے سے ملے جلے جذبات پائے جاتے تھے۔ کچھ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ ایل ایف او صدر کے 28 نومبر کے قوم سے خطاب کے منافی تھا۔ تاہم شیخ مجیب الرحمٰن نے "ایل ایف او" کو منظور کر لیا تھا، وہ جانتے تھے کہ صدر کے لیے ان تمام متعلقہ لوگوں کو قائل کرنا مشکل تھا جو پس پردہ تھے۔ اگرچہ اس نے کسی حد تک اختلافات کو بھی جنم دیا لیکن کوئی بھی سیاسی پارٹی "ایل ایف او" کو مسترد نہ کر سکی کیوں کہ اس کے پانچ اصول کسی پارٹی کے منشور کے خلاف نہ تھے۔ تاہم کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ آرٹیکل جس میں کہا گیا ہے کہ آئین کو صدر سے منظور کروانا ہوگا، آئین ساز اسمبلی جیسے خود مختار ادارے کے بنیادی حق کے خلاف جاتا ہے۔

4 مارچ 1970ء کو یحیٰی خان، ڈھاکہ گئے۔ ہوائی اڈے پر پریس کانفرنس میں انہوں نے کہا، "میں اس تنقید کو جائز خیال نہیں کرتا کہ ایل ایف او آئین ساز اسمبلی یا لوگوں کی خود مختاری کو محدود کرتا ہے۔ میری

واحد خواہش جمہوریت کو بحال کرنا ہے۔ میں نے اب تک اپنے الفاظ کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ہر ممکن قدم اٹھایا ہے۔ جب میں یہاں تھا میں نے ''ایل ایف او'' کے اس پہلو پر جس میں کہا گیا ہے کہ آئین کا مسودہ صدر سے منظور ہونا ضروری ہے۔ تمام سیاسی پارٹیوں کے رہنماؤں سے گفت وشنید کی ہے۔ ان کی اکثریت نے ''ایل ایف او'' کو خوش آمدید کہا ہے اور اسے قبول کیا ہے۔ اگر آئین ''ایل ایف او'' کے مطابق تشکیل دیا جاتا ہے تو پھر میں اسے کیوں قبول یا منظور نہیں کروں گا؟ صدر کی منظوری صرف ایک ضابطے کی کارروائی ہے۔'' کیا صدر اپنے وعدے پر عمل کریں گے؟ انہوں نے اس کا جواب جی ڈبلیو چوہدری کے ایک سوال پر دیا، ''میں کوئی احمق نہیں ہوں جو نوشتہ دیوار نہ پڑھ سکوں۔ 69-1968ء کی ایوب خان کے خلاف تحریکیں عوام کی آمریت کے خلاف جدوجہد تھیں۔ کوئی جنرل بھی جمہوریت کے مطالبے کو نظر انداز نہیں کرسکتا۔ حکومت اور مسلح افواج کے سربراہ کے طور پر میری ذمہ داری ملک کے اتحاد کو قائم رکھنا ہے۔ پاکستان کو توڑنے کی کسی بھی سازش کو میں برداشت نہیں کروں گا۔ اگر ساڑھے سات کروڑ بنگالی بالواسطہ سازش کی بجائے کھلم کھلا آزادی کا مطالبہ کررہے ہوتے تو یہ ایک بالکل جدا معاملہ ہوتا۔ مشرقی پاکستان کے عوام نے سب سے پہلے پاکستان کا مطالبہ کیا تھا۔ انہوں نے قومی جدوجہد میں دوسرے علاقوں کے مقابلے میں انہوں نے زیادہ قربانیاں دیں اور قائداعظم کا سب سے بڑھ کر ساتھ دیا۔ اگر مشرقی پاکستان کے ساتھ ناانصافیاں نہ کی گئی ہوتیں تو پاکستان کی سالمیت کو کوئی خطرہ نہ ہونا تھا۔ اس مرتبہ براہِ راست انتخابات کے ذریعے مشرقی پاکستان کے عوام نہ صرف صوبائی خودمختاری کا حق حاصل کرلیں گے بلکہ مرکز میں حکومت کرنے کا حق بھی حاصل کرسکیں گے۔ اہم معاملات پر ان کے نظریات بھی جائز اہمیت اور تقدم حاصل کرسکیں گے۔ ایوب خان کو دیکھ لیں۔ ہم دونوں ذاتی طور پر ان کی عزت کرتے ہیں لیکن آج وہ کس قدر قابل رحم حالت میں ہیں۔ حقیقت میں وہ اپنے ملک میں جلاوطنی کی زندگی بسر کررہے ہیں۔ اس سب کے وہ ذاتی طور پر ذمہ دار ہیں۔ اگر میں ان جمع شدہ بحرانوں کو جو مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان پائے جاتے ہیں، حل کرنے میں اور قوم کو بچانے میں ناکام رہتا ہوں تو میرا انجام بھی یہی ہوگا۔ کیا آپ یہ چاہتے ہیں؟''

صدر یحیٰی کے اس جواب سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شاید وہ ملک کی سالمیت کی خاطر سنجیدگی سے دونوں حصوں کے درمیان پائے جانے والے مسائل کو حل کرنے کی کوشش میں تھے ورنہ وہ کیوں آزادانہ اور منصفانہ انتخابات کا انعقاد چاہتے تھے؟ اگر ان کے ارادے اچھے نہ ہوتے تو وہ آسانی کے ساتھ ووٹوں میں فراڈ کے ذریعے مشرقی پاکستان سے اپنی پسند کے 40 یا 50 لوگ منتخب کرواسکتے تھے۔ ان کے حکمران فوجی ٹولے کے ایک رکن نے صدر کو بتایا کہ حالات سے یوں نظر آرہا ہے کہ مجیب اور اس کی پارٹی مشرقی پاکستان سے تمام کی تمام نشستیں جیت جائے گی۔ اگر ایسا ہوجاتا ہے تو اسے قابو میں رکھنا مشکل ہوجائے گا۔ صدر نے واضح الفاظ میں جواب دیا، ''اگر ساڑھے سات کروڑ بنگالی مجیب اور اس کی پارٹی کو ووٹ دیتے ہیں اور مجیب قومی مفاد کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھاتے تو پھر آپ اور میں انہیں روکنے والے کون ہوتے ہیں؟ علاوہ ازیں میری ذمہ

داری منتخب نمائندگان کو اقتدار منتقل کرنا ہے، پاکستان کو توڑ نا نہیں ہے۔ہم سب کو وفادار رہنا چاہیے۔ ہمیں صبر سے کام لینا ہوگا۔ پاکستان کی سالمیت کو صرف مشرقی اور مغربی پاکستان کے عوام کے دلوں میں سے ایک بد اعتمادی ختم کر کے قائم رکھا جاسکتا ہے۔ملک کو طاقت یا انتخابات میں مداخلت کے ذریعے نہیں بچایا جاسکتا۔''

16۔سیاسی جماعتوں نے انتخابی مہم کا آغاز کر دیا

اس وقت تک تمام سیاستدانوں اور سیاسی جماعتوں نے انتخابی مہم کا آغاز کر دیا تھا۔ایک انتخابی جلسے میں شیخ مجیب الرحمٰن نے کہا،''پاکستان قائم رہنے کے لیے بنایا گیا تھا۔کوئی بھی طاقت پاکستان کو تباہ نہیں کرسکتی۔''متحدہ پاکستان کے حق میں تمام سیاستدانوں کی جانب سے اس قسم کے بیانات کی روشنی میں کوئی بھی شخص یہ تصور نہیں کرسکتا تھا کہ ملک کبھی بکھر سکتا ہے۔اس دوران سیاسی سرگرمیوں پر سے تمام پابندیاں اٹھالی گئیں اور یکم جنوری 1970ء سے سیاسی سرگرمیاں پورے زور وشور سے شروع ہوگئیں۔ بلاروک ٹوک انتخابی مہم کے نتیجے میں سیاسی صورتِ حال میں گرم جوشی پیدا ہوگئی۔شیخ مجیب الرحمٰن پورے مشرقی پاکستان میں بنگالی قومیت، چھے نکات اور''جیو بنگلہ'' کے نام پر مہم چلا رہے تھے۔

اچانک 14 اگست 1970ء کو ڈھاکہ یونیورسٹی کے طلبا نے رسمی طریقے سے آزاد بنگلہ دیش کا جھنڈا لہرا دیا۔اس جلسے کی صدارت وائس چانسلر ابوسعید چوہدری کر رہے تھے۔زونل مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل یعقوب علی خان نے انہیں بلایا اور وضاحت طلب کی،مسٹر چوہدری کو بتایا گیا کہ اس قسم کا عمل ملک کے وجود کے لیے خطرہ ہے اور قابل تعزیر ہے۔تاہم اس موقع پر چوہدری کو گورنر ایڈمرل احسن کی ذاتی مداخلت کی وجہ سے بچالیا گیا۔اس دوران انٹیلی جینس رپورٹیں جو صدر کو بھیجی گئیں،ان میں کہا گیا کہ شیخ مجیب اپنی جماعت کے کارکنوں کے ساتھ ملاقاتوں میں کہتے ہیں کہ انتخابات کے بعد وہ''ایل ایف او'' کو خاطر میں نہیں لائیں گے، وہ آئین اپنی مرضی کے مطابق تشکیل دیں گے اور صدر کو مسوّدہ منظور کرنے کے لیے مجبور کر دیں گے۔ صدر جنرل یحییٰ خان اس قسم کی رپورٹیں ملنے کے بعد بہت غصے میں آ گئے۔دوسری جانب آل انڈیا ریڈیو کلکتہ نے''ایپار بنگلہ او پار بنگلہ'' کے نام سے ایک پروگرام شروع کر دیا،جس میں آزاد بنگلہ دیش کی حمایت کی جارہی تھی۔انٹیلی جینس ایجنسی نے یہ رپورٹ بھی دی کہ ہندوستان سرحد پار سے عوامی لیگ کی جیت کے لیے اور اگر ضرورت پڑے تو قانون نافذ کرنے والی ایجنسیوں سے مسلح تصادم کے لیے بڑی مقدار میں رقوم اور اسلحہ بھجوا رہا ہے۔نہ صرف قومی انٹیلی جینس ایجنسیوں نے بلکہ بعض دوست ممالک کی انٹیلی جینس ایجنسیوں نے بھی ایسی ہی اطلاعات دیں۔

مشرقی پاکستان کے بعض سیاستدانوں نے بھی صدر کو شیخ مجیب الرحمٰن اور ہندوستان کے درمیان گٹھ جوڑ کی اطلاعات دیں۔صدر نے اگرچہ ان اطلاعات پر برہمی کا اظہار کیا لیکن گورنر احسن کے خصوصی مراسلات اور آراء کی روشنی میں انہوں نے ان تمام رپورٹوں کو بے بنیاد خیال کرتے ہوئے نظر انداز کر دیا۔

گورنر احسن کو پختہ یقین تھا کہ شیخ مجیب، پاکستان کو توڑنے کے لیے کوئی قدم نہیں اٹھائیں گے اور انہوں نے صدر کو بھی اس کا قائل کر لیا۔ تاہم انتخابی مہم نے سیاسی میدان کو بہت پریشان کن بنا دیا تھا۔ لوگوں کے دلوں میں چند نئے شکوک جنم لینے لگے۔ کیا انتخابات کا انعقاد ممکن ہو سکے گا جب کہ صورتِ حال زیادہ سے زیادہ پریشان کن ہوتی چلی جا رہی تھی۔ اس دوران میں مشرقی پاکستان میں دو اہم واقعات رونما ہوئے۔ اگست 1970ء میں شدید سیلاب آ گئے اور نومبر میں ایک سائیکلون نے تباہی مچا دی۔

جب مشرقی پاکستان پر سائیکلون کی آفت آئی تو صدر، عوامی جمہوریہ چین کے دورے پر تھے۔ انہوں نے اپنے دورے کو منسوخ کر دیا اور فوری طور پر ڈھاکہ پہنچ گئے۔ مقامی انتظامیہ نے بتایا کہ سائیکلون کا حملہ اتنا شدید نہیں تھا، جتنا اخبارات میں بتایا گیا اور صدر کے لیے اس صورتِ حال کا سامنا کرنے کے لیے ڈھاکہ میں موجود ہونا ضروری نہیں۔ اس یقین دہانی کے بعد صدر ڈھاکہ میں دو دن قیام کرنے کے بعد واپس اسلام آباد پہنچ گئے۔ اس بات نے مشرقی پاکستان کے عوام پر منفی اثرات مرتب کیے۔ انہوں نے خیال کیا کہ صدر مشرقی پاکستان کے عوام کی تکالیف سے لاتعلق ہیں۔ متاثرہ افراد کے مصائب کے بارے میں اس قسم کے لاتعلقی اور بے پروائی کے رویے نے مشرقی پاکستان کے لوگوں کے دلوں میں صدر کے لیے مزید نفرت اور غصے کو جنم دیا۔ وہ مصیبت کے اس وقت میں صدر کی جانب سے زیادہ ہمدردی اور خلوص کی توقع رکھتے تھے۔ شیخ مجیب نے اس واقعہ سے انتخابی مہم میں لوگوں کے جذبات ابھارنے میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑی۔ انہوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا کہ مشرقی پاکستان کے عوام مغربی پاکستان کے حکمران طبقہ کی نگاہوں میں کوئی اہمیت نہیں رکھتے جو ان کی دکھ اور تکالیف سے مکمل طور پر لاتعلق ہیں۔ اس قدرتی تباہی نے صورتِ حال کو مزید پیچیدہ کر دیا۔

مشرقی اور مغربی پاکستان دونوں حصوں کے رہنماؤں کی اکثریت نے اس قدرتی تباہی کو ایک قومی سانحہ قرار دیا اور کہا کہ انتظامیہ کو اپنے تمام تر وسائل بروئے کار لاتے ہوئے اس آفت کا مقابلہ کرنا چاہیے اور قومی انتخابات ملتوی کر دینے چاہئیں۔ بھٹو اور مولانا بھاشانی نے ''انتخاب سے پہلے روٹی'' کا مطالبہ کیا اور مؤخر الذکر نے صدر سے انتخاب ملتوی کرنے کی درخواست کی۔ شیخ مجیب الرحمٰن نے مخالفت کی اور خبردار کیا کہ اگر انتخابات کو ملتوی کرنے کی کوئی سازش کی گئی تو مشرقی پاکستان میں شدید خون خرابہ ہو گا۔ اس انتباہ کے بعد صدر نے دوسرے رہنماؤں کی تجاویز کو نظر انداز کر دیا اور طے شدہ پروگرام کے تحت انتخابات کرانے کے اپنے سابقہ وعدے پر قائم رہے، ان کا خیال تھا کہ اس طرح شیخ مجیب خوش ہو جائیں گے۔ شیخ مجیب واقعتاً بہت خوش تھے۔ انہوں نے خفیہ ذرائع سے صدر کو پیغام بھیجا اور پاکستان کی سالمیت کے اپنے وعدے کو دہرایا۔ صدر مجیب کے وعدے پر اعتماد رکھتے تھے۔ 1970ء کے نومبر اور دسمبر میں ڈھاکہ میں شیخ مجیب اور صدر جنرل یحیٰی کے درمیان تین پُرتپاک خفیہ ملاقاتیں ہوئیں۔ ان ملاقاتوں میں سے ایک میں شیخ مجیب نے وعدہ کیا کہ جب آئین کا مسوّدہ تیار ہو جائے گا تو وہ اسے صدر کے مطالعہ اور منظوری کے لیے پیش کریں

گے۔ انہوں نے صدر کو یقین دلایا کہ ان کے چھے نکات پاکستان کو توڑنے کے لیے تشکیل نہیں دیئے گئے۔ انہوں نے مزید کہا کہ وہ پاکستان کا آئندہ آئین نہ صرف چھے نکات کی بنیادوں پر تشکیل دیں گے بلکہ ایل ایف او کے پانچ اصولوں کو بھی مدِ نظر رکھا جائے گا۔ شیخ مجیب الرحمٰن کے ساتھ اس گفتگو کے بعد صدر مطمئن ہو کر واپس اسلام آباد آ گئے۔

شیخ مجیب کے ساتھ ان تین ملاقاتوں کے بعد صدر کا یقین مزید پختہ ہو گیا کہ عام انتخابات کے بر وقت انعقاد کا ان کا فیصلہ درست تھا۔ وہ اس بات کے بھی قائل ہو چکے تھے کہ پاکستان کی علاقائی سالمیت کو صرف انتخابات کے ذریعے ہی یقینی بنایا جا سکتا ہے۔ انتخابی مہم کے نتیجے میں یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ شیخ مجیب الرحمٰن کے علاوہ کوئی بھی دوسرا رہنما رائے دہندگان کی ایک بڑی اکثریت کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ بھٹو مغربی پاکستان کے نسبتاً سب سے زیادہ مقبول رہنما تھے لیکن یہاں اسلامی جماعتیں اور دیگر دائیں بازو کی جماعتیں بھی مخصوص علاقوں میں اپنا اثر رکھتی تھیں۔ اس کے علاوہ نیشنل عوامی پارٹی کے ولی خان شمال مغربی سرحدی صوبے اور بلوچستان میں مقبول رہنما تھے۔ مسٹر بھٹو کا ہندوستان دشمن پروپیگنڈا پنجاب میں خاص طور پر مقبول تھا۔ انہوں نے جنرل پیرزادہ کے حکمران فوجی ٹولے کے بعد طاقتور جنرلوں مثلاً جنرل گل حسن اور جنرل حامد وغیرہ سے باقاعدہ رابطہ رکھا ہوا تھا۔ جنرل شیر علی جماعت اسلامی کے خاموش حامی تھے۔ جیسے جیسے دن گزرتے گئے ان کی ہندوستان کے خلاف بلاغت اور فصاحت سے پر تقاریر اور اعلانِ تاشقند کے خلاف ان کے بھرپور احتجاج نے خصوصاً پنجاب میں زیادہ تحسین و آفرین سمیٹی۔ دوسرے علاقوں میں ان کے ''اسلامی سوشلزم'' کے نعرے نے لوگوں کو بہت حد تک ان کی جانب راغب کیا تھا۔

تاہم فوجی حکمران ٹولے کے بہت سے جنرل صدر کی سیاستدانوں کے ساتھ گفت و شنید کو ایک کمزوری کی علامت کے طور پر منفی انداز میں دیکھتے تھے۔ ان کی رائے میں مشرقی پاکستان کی صورتِ حال کو بعض قوم دشمن سیاستدانوں اور بدمعاش عناصر کو سزائیں دیتے ہوئے قابو کیا جا سکتا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ شیخ مجیب اور ان کے ساتھیوں کے کردار کو بے نقاب کرتے ہوئے جیسا کہ وہ ہندوستان کے ساتھ گٹھ جوڑ کر کے پاکستان کے مفاد کے خلاف کام کر رہے تھے، ان کے غبارے سے ہوا نکال دینا زیادہ مناسب ہو گا۔ ان کا خیال تھا کہ اس طرح مجیب اور اس کی پارٹی اپنی مقبولیت سے محروم ہو جائے گی۔ جنرلوں کے اس قسم کے خیالات محض مشرقی پاکستان میں موجود صورتِ حال سے ان کی لاعلمی، کوتاہی اور سیاسی بصیرت میں کمی پر دلالت کرتے تھے۔ اس وقت پاکستان میں ایک جمہوری بنیادوں پر منتخب حکومت کا قیام انتہائی ضروری ہو چکا تھا۔ پاکستان جمہوریت کے وعدے پر قائم کیا گیا تھا۔ قائداعظم نے بڑے واضح الفاظ میں بتا دیا تھا کہ پاکستان ایک جمہوری ملک ہو گا۔ لیکن بدقسمتی سے حقیقت میں ایسا نہ ہو سکا۔

پاکستان کے قیام سے لے کر آج تک یہاں کوئی ایسی حکومت نہ آئی تھی جو صاف شفاف جمہوری انتخابات کے نتیجے میں وجود میں آئی ہو۔ صوبوں کے لیے پہلے انتخابات 1946ء میں برطانوی راج کے تحت

محدود رائے دہی کے ذریعے ہوئے تھے لیکن مرکزی حکومت کی تشکیل کے لیے پارلیمنٹ کا انتخاب بالواسطہ ووٹنگ کے ذریعے کیا گیا۔ 1951ء اور 1954ء کے انتخابات غیر جانبدارانہ اور منصفانہ نہیں تھے، دونوں محض ڈھونگ تھے۔ جعلی ووٹوں، دھاندلیوں، انتظامیہ کی جانبداری، بیلٹ بکسوں کی ہائی جیکنگ، مخالف امیدواروں کو بلاوجہ خوف زدہ اور اغوا کرنے کی وجہ سے حکمران جماعت اپنا اعتبار کھو چکی تھی۔ انتظامیہ نے بے شرمی کے ساتھ مخالف امیدواروں کے خلاف الزامات عائد کر کے انتخابات سے عین پہلے انہیں حراست میں لے لیا تھا۔ اس تمام صورتِ حال میں باشعور اور سیاسی طور پر ترقی یافتہ بنگالیوں نے حکومتی پارٹی مسلم لیگ کو بُری طرح شکست دی تھی اور مشرقی پاکستان میں جگتو فرنٹ کو ووٹ دے کر اقتدار میں لے آئے تھے۔ لیکن تھوڑے ہی عرصے میں سازشی انداز میں اس کی حکومت کو ختم کر دیا گیا تھا۔ آخر کار 1958ء میں جمہوریت کو مکمل طور پر دفن کرتے ہوئے مارشل لاء نافذ کر دیا گیا۔ اقتدار پر قبضہ کرنے کے بعد صدر ایوب نے بنیادی جمہوریت کے نام سے نیا نظام متعارف کروایا اور ان بنیادی نمائندوں کی بالواسطہ ووٹنگ کے ذریعے مرکز میں اپنی پسند کی حکومت قائم کر لی۔

17۔ الیکشن کمیشن کا قیام

کسی بھی بالواسطہ رائے دہی میں عوامی خواہشات کی عکاسی نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا ایوب خان کی بنیادی جمہوریت پر قائم حکومت کو حقیقی نمائندہ حکومت قرار نہیں دیا جا سکتا۔ جنرل یحییٰ خان کا آزادانہ اور منصفانہ جمہوری انتخابات کروانے کا فیصلہ بلاشبہ ایک جرأت مندانہ قدم تھا۔ 28 جولائی 1969ء کو انہوں نے سپریم کورٹ کے بنگالی جج اے ستار کی سربراہی میں الیکشن کمیشن تشکیل دینے کے اپنے فیصلے کا اعلان کیا۔ جسٹس ستار کو آزادانہ اور اور منصفانہ انتخابات کروانے کے لیے مناسب انفراسٹرکچر قائم کرنے اور ووٹروں کی نئی فہرستیں تیار کروانے کے لیے مکمل آزادی اور ذمہ داری سونپی گئی۔ انہوں نے ووٹروں کی فہرستیں تیار کرنے کا مشکل کام 15 جون 1970ء تک مکمل کر لیا۔ مشرقی اور مغربی پاکستان میں ووٹروں کی کل تعداد بالترتیب تین کروڑ بارہ لاکھ چودہ ہزار نو سو پینتیس (3,12,14,935) اور دو کروڑ باون لاکھ چھے ہزار دو سو تریسٹھ (2,52,06,263) تھی۔ کل آبادی کے پچاس فی صد کو ووٹروں کے طور پر فہرست میں شامل کیا گیا تھا۔ 1970ء میں پہلی مرتبہ یہ فیصلہ کیا گیا کہ انتخابات کی ووٹنگ قبائلی علاقوں میں بھی کروائی جائے گی۔ آبادی کے لحاظ سے قومی اور صوبائی اسمبلیوں میں سیٹوں کی تعداد کا اعلان ایل ایف او میں کیا گیا تھا جو مندرجہ ذیل ہے:

قومی اسمبلی

مشرقی پاکستان	162
پنجاب	82
سندھ	27

شمالی مغربی سرحدی صوبہ	18
بلوچستان	4
قبائلی علاقہ جات	7
کل	300

صوبائی اسمبلیاں

مشرقی پاکستان	300
پنجاب	180
سندھ	60
بلوچستان	20
شمالی مغربی سرحدی صوبہ	40

مندرجہ بالا تعداد کے حوالے سے انتخابی حلقوں کا تعین کرنے کے لیے جسٹس ستار کی زیر قیادت ہائی کورٹ کے دو ججوں پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دی گئی تھی۔ ان دو ممبران میں سے ایک کا تعلق مشرقی پاکستان سے اور دوسرے کا مغربی پاکستان سے تھا۔

پورے ملک میں لوگوں نے نئی ووٹر فہرستوں کی تیاری اور کمیٹی کے ذریعے انتخابی حلقوں کی حد بندی کے عمل کو خوش آمدید کہا۔ وہ صدر کے کیے گئے تمام انتظامی فیصلوں سے خوش تھے۔ یہ ایک ہمہ گیر بیت تھی کہ فوجی قبضے کے بعد سیاسی سرگرمیوں کو محدود کر دیا جاتا ہے۔ لیکن صدر یحییٰ خان نے مارشل لاء کے نفاذ کے بعد بھی سیاسی سرگرمیوں کی کھلی چھٹی دے رکھی تھی۔ تاہم سیاسی جماعتیں اپنی سرگرمیاں مارشل لاء ضابطہ نمبر 60 اور اس کے اصولوں کے تحت ہی جاری رکھ سکتی تھیں۔ مارشل لاء ضابطہ 60 میں کہا گیا تھا کہ کوئی بھی سیاسی پارٹی نفرت انگیز جھگڑوں، علاقائی دشمنی یا نظریہ پاکستان کے خلاف بات نہیں کرے گی یا ایسی سرگرمیوں میں ملوث نہیں ہوگی۔ مذہب کے خلاف کوئی بات نہیں کرے گا۔ لیکن عوامی لیگ کے رہنماؤں نے اپنی انتخابی مہم میں ضابطہ 60 کی کھلم کھلا خلاف ورزیاں کیں۔ انہوں نے مغربی پاکستان کے خلاف تقریریں کر کے بنگالی قومیت کے حق میں جذبات ابھارنے کی کوشش کی، شرپسند طلبا اور کارکنوں نے دوسری سیاسی پارٹیوں کے جلسوں اور ریلیوں پر حملے کرنے شروع کر دیئے۔ معاشرے کے امن کو خطرے میں ڈالتے ہوئے لوٹ مار اور مار دھاڑ کی سرگرمیاں شروع کر دیں۔

حکمران فوجی ٹولے میں بہت سے لوگوں نے صورتِ حال کا فائدہ اٹھاتے ہوئے صدر پر کمزور ہونے کا الزام لگانا شروع کر دیا۔ اپنے آپ کو ان الزامات سے بری الذمہ قرار دینے کے لیے صدر کو کہنا پڑا کہ منتخب نمائندوں کو اقتدار منتقل کرنے کے ان کے ارادوں کو ان کی کمزوری خیال نہیں کیا جانا چاہیے۔ انہوں نے خاص طور پر شیخ مجیب الرحمٰن اور بھٹو سے اپنے پارٹی کارکنوں کو قابو میں رکھنے اور اپنی سیاسی سرگرمیاں پر امن

انداز میں جاری رکھنے کی درخواست کی۔ انہیں معاشرتی نظم وضبط قائم رکھنے کو کہا گیا تا کہ دنیا کو یہ پیغام دیا جاسکے کہ پاکستانی قوم حقیقت میں جمہوری سوچ کی حامل ہے اور جمہوری حکومت قائم کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔لیکن ان کی یہ پرخلوص اپیلیں حاضرہ صورت حال میں سیاسی رہنماؤں پرکوئی معنی خیز اثر ڈالنے میں ناکام رہیں اوران کی جماعتوں کی سرگرمیوں سے یہ بات پوری طرح مترشح ہورہی تھی۔

اگرچہ 24 سیاسی جماعتوں نے 1970ء کے انتخابات میں حصہ لیا، ان میں اکثر قومی سطح پرکوئی اثر ڈالنے کے لیے بہت غیر اہم اور چھوٹی تھیں۔ الیکشن کمیشن نے ہر پارٹی کو انتخابی نشانات تقسیم کر دیئے۔ ترقی پذیر ممالک میں لوگوں کی اکثریت اَن پڑھ ہے اور وہ اپنی پسند کی پارٹی کا نام نہیں پڑھ سکتے۔ اس لیے نشانات دے دیئے جاتے ہیں تا کہ ووٹر ان نشانوں سے اپنی پسند کی پارٹی کی شناخت کر کے ووٹ ڈال سکیں۔ مغربی پاکستان میں قومی اسمبلی کی 138 نشستوں کے لیے پارٹیوں کے اور آزاد امیدواروں کی کل تعداد 800 تھی۔ مشرقی پاکستان میں 162 نشستوں کے لیے پارٹیوں کے نامزد اور آزاد، کل ملا کر 781 امیدوار میدان میں تھے۔ پرانی روایتی مسلم لیگ جماعت تین حصوں میں تقسیم ہو چکی تھی۔ دو دائیں بازو کی مذہبی جماعتیں، جماعت اسلامی اور جمعیت العلما اسلام ملک کو آزادی ملنے سے بھی پہلے سے قائم تھیں۔ عوامی لیگ آزادی کے بعد قائم کی گئی تھی اور مشرقی پاکستان میں سب سے بڑی پارٹی کے طور پر سامنے آئی تھی۔ ذوالفقار علی بھٹو کی پاکستان پیپلز پارٹی (پی پی پی) مغربی پاکستان میں ایوب مخالفت کے ذریعے بہت کم عرصے میں سب سے مقبول پارٹی بن چکی تھی۔ پچاس کے عشرے کے وسط میں جب پاکستان نے امریکہ سے خصوصی دوستی بڑھائی تھی، پاکستان میں کمیونسٹ پارٹی پر پابندی لگادی گئی تھی۔ عوامی لیگ خارجہ پالیسی کے معاملے پر 1957ء میں دو حصوں میں بٹ گئی تھی۔ پاکستان نیشنل عوامی پارٹی مولانا بھاشانی کی قیادت میں قائم ہوئی، بعد میں نیشنل عوامی پارٹی بھی پیکنگ حمایتی اور ماسکو حمایتی دو گروپس میں بٹ گئی تھی۔ 1947ء کے بعد مشرقی پاکستان میں نیشنل کانگریس کی ایک شاخ نے اپنا نام تبدیل کر کے محض کانگریس رکھ لیا تھا۔

یہاں دو بہت اہم قومی معاملات پر روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے۔ اوّل، کوئی بھی سیاسی پارٹی ملک کے دونوں حصوں میں اپنا اثر نہیں رکھتی تھی۔ دوئم، پاکستان کے دونوں حصوں میں کوئی بھی واحد رہنما قومی سطح پر مقبولیت نہیں رکھتا تھا۔ شیخ مجیب الرحمٰن اور ان کی پارٹی کو مشرقی پاکستان میں سب سے زیادہ مقبولیت حاصل تھی جب کہ مغربی پاکستان میں بھٹو اور اس کی جماعت پی پی پی کو مقبولیت کے حوالے سے دوسری تمام پارٹیوں بشمول دائیں بازو کی جماعتوں کے سب پر برتری حاصل تھی، جس کے نتیجے میں انتخابی مہم کے ساتھ ہی علاقائی تقسیم میں بہت زیادہ اضافہ ہوگیا تھا۔ بہت سے لوگ اس مظہر سے خوف زدہ ہو گئے تھے۔ بعد میں دونوں جماعتیں جو انتخابات میں کامیاب ہوئیں، بجائے قومی جماعتوں کے علاقائی جماعتوں کے طور پر سامنے آئیں۔ اس مرحلے پر میں متحدہ پاکستان کے آخری دنوں کے ہیروز اور ان کی جماعتوں کے منشوروں پر بحث کرنا مناسب خیال کرتا ہوں، جو مجیب اور بھٹو تھے۔ شیخ مجیب کا پروپیگنڈا مکمل طور پر چھے نکات پر مبنی تھا۔

بنگالی مسلمانوں کی اکثریت کے جذبات کو مدنظر رکھتے ہوئے مجیب نے اعلان کیا، ''اسلام ہمارا عقیدہ اور مذہب ہے، عوامی لیگ عوام سے یہ وعدہ کرتی ہے کہ قرآن اور سنت کے خلاف کوئی قانون آئین میں شامل نہیں کیا جائے گا۔'' بہرحال انہوں نے اپنے اس وعدے کی خلاف ورزی کی۔ بنگلہ دیش کی آزادی کے بعد اس نومولود ملک پر سیکولرازم کا بھوت وارد کر دیا، اپنی انتخابی مہم کے دوران انہوں نے عوامی جلسوں میں واضح طور کہا، ''چھے نکات پاکستان کو تباہ کرنے کے لیے نہیں گھڑے گئے۔ یہ پروگرام وفاقی حکومت کی کارکردگی کو مؤثر بنانے کے لیے تشکیل دیا گیا ہے۔ پاکستان قائم رہنے کے لیے وجود میں آیا تھا، کوئی طاقت پاکستان کو تباہ نہیں کر سکتی۔ لیکن جب بنگلہ دیش وجود میں آ گیا تو اسی شیخ مجیب نے دعویٰ کیا کہ وہ اس کی آزادی کی تحریک کے لیے 1968ء سے منصوبہ بندی کر رہے تھے۔ انہوں نے مزید تسلیم کیا، ''آزادی کی تحریک 1948ء سے شروع ہوئی تھی جس نے عوامی تحریکوں کے نتیجے میں 1962ء، 1954ء، 1952ء اور 1969ء میں تیزی پکڑی اور 1971ء میں اپنے اختتام کو پہنچی اور ملک ایک خوں ریز جنگ کے بعد آزاد ہو گیا۔''

مجیب کے کردار کا دوغلا پن ان بیانات میں بڑے واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ عوامی جلسوں میں انہوں نے کہا، ''میرا مقدس ترین فرض معاشی تفاوت کو دُور کرتے ہوئے اپنے عوام کے معیارِ زندگی کو بلند کرنا ہے۔'' لیکن سربراہِ مملکت کے طور پر اقتدار سنبھالتے ہی پوری قوم کے پیروں میں سوشلزم کی بیڑیاں پہنا دیں۔ اس کے اثرات آج بھی لوگوں کے لیے مصیبت کا باعث بنے ہوئے ہیں۔ مجیب کی عوامی مہم کا بنیادی نقطہ پاکستان مخالف پروپیگنڈا تھا۔ انہوں نے عوام سے مغربی پاکستان کے حکمران طبقے کے ہاتھوں لمبے عرصے کے استحصال، محرومیوں اور استبداد کو ختم کرتے ہوئے ایک ''سنار بنگلہ'' قائم کرنے کے نام پر ووٹ طلب کیے تھے۔ جنرل یحییٰ حکومت کے اس وقت کے وزیر اطلاعات جی ڈبلیو چوہدری نے سیاسی صورتِ حال کے بارے میں براہِ راست آگاہی حاصل کرنے کے لیے پورے مشرقی پاکستان میں چپے چپے کا سفر کیا۔ اس دوران انہوں نے نہ صرف انتظامیہ کے نمائندوں سے بات چیت کی بلکہ لوگوں سے بھی ملاقاتیں کیں۔ اس قسم کے میل ملاپ سے اُن کے علم میں آیا کہ عوامی لیگ کے کارکن پورے مشرقی پاکستان کے دیہاتوں میں ''سنار بنگلہ'' کا تصور بڑا بڑھا چڑھا کر پیش کر رہے تھے اور اس تصور نے بتدریج لوگوں کی سوچوں میں گھر کر لیا تھا۔ پارٹی کارکن ''جے بنگلا'' کے نعرے بھی لگاتے تھے۔

اس قسم کا پروپیگنڈا قومی مفادات کے لیے خطرہ بن سکتا تھا، اس لیے مسٹر چوہدری نے صدر سے درخواست کی وہ شیخ مجیب کو بلا کر واضح الفاظ میں پوچھیں کہ آیا وہ پاکستان کے اتحاد کی خاطر چھے نکات میں ترمیم کے تیار ہیں یا نہیں۔ اگر شیخ مجیب اپنے چھے نکات کو تبدیل نہیں کرنا چاہتے تو پھر صدر بنگالی مسلمانوں کی خواہش جاننے کے لیے ریفرنڈم کروائیں کہ آیا وہ پاکستان کے اتحاد کو برقرار رکھتے ہوئے صوبائی خودمختاری چاہتے ہیں یا آزادی چاہتے ہیں۔ اس حوالے سے جی ڈبلیو چوہدری نے صدر ڈیگال کے جرأت مندانہ اقدامات کی مثال پیش کی، جو انہوں نے الجیریا کا مسئلہ حل کرنے کے لیے اٹھائے تھے۔

اس وقت مولانا بھاشانی نے ''ووٹوں سے پہلے چاول'' کا نعرہ بلند کیا اور انتخابی دوڑ سے نکل کر الگ کھڑے ہو گئے۔ ماسکو کے حامی خود ساختہ پروفیسر مظفر احمد کی عوام میں کوئی خاص حمایت نہیں تھی لہٰذا اس وقت بائیں بازو کی جماعتیں بہت سے ٹکڑوں میں بٹ چکی تھیں۔ اس کے باوجود گورنر احسن کے دور میں انتظامیہ بائیں بازو والوں کو مکمل نیست و نابود کرنے کے لیے ان پر ٹوٹ پڑی۔ ان کی بائیں بازو سے نفرت ''سیٹو'' کے ساتھ لمبے عرصے سے تعلق کا نتیجہ تھی۔ فوجی ٹولے کے ارکان میں عوامی سطح پر سیاسی سوجھ بوجھ کے فقدان کی وجہ سے مسٹر احسن نے بائیں بازو کے خلاف غلط وقت پر انتہائی شدید اقدامات اٹھائے، جب عوامی جمہوریہ چین پاکستان کے ساتھ ملکی سطح پر دوستانہ تعلقات استوار کرنے کی ابتدا کر رہا تھا۔ ان کے مولانا اور بائیں بازو کے ساتھ سخت رویے نے دونوں ملکوں کے درمیان جنم لینے والے دوستانہ تعلقات پر شدید منفی اثرات مرتب کیے۔

گورنر احسن کی بائیں بازو کے خاتمہ کی اس بے رحم مہم میں بائیں بازو کے کئی رہنماؤں نے اپنی جانوں کی قربانی دی تھی جس کے نتیجے میں نومبر 1971ء میں جب بھٹو نے بھارت کی جارحیت کے خلاف چین کی مدد حاصل کرنے کے لیے پیکنگ کا دورہ کیا تو چینی قیادت نے انہیں مطلع کیا کہ مشرقی پاکستان میں بائیں بازو کے بیسیوں رہنماؤں کو قتل کر دیا گیا۔ انہیں بائیں بازو کی مختلف جماعتوں سے تعلق رکھنے والے 60 ایسے رہنماؤں کی فہرست تک پیش کی گئی۔ اس صورتِ حال میں ماسکو کی حامی جماعتیں شش و پنج میں تھیں۔ وہ فیصلہ نہیں کر پا رہی تھیں کہ کس کی حمایت کی جائے۔ ابھی تک ماسکو، مغربی پاکستان میں ولی خان کی نیشنل عوامی پارٹی اور مشرقی پاکستان میں مظفر کی نیشنل عوامی پارٹی کی حمایت کر رہا تھا۔ لیکن اچانک 16 اگست 1970ء کو ریڈیو ماسکو کی نشریات میں کہا گیا، ''عوامی لیگ میں چھپے ہوئے رجعت پسندوں کے چہرے بے نقاب ہو چکے ہیں۔ وہ امریکہ کے آلہ کار بن کر ملک کو توڑنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ آج مشرقی پاکستان میں صرف شیخ مجیب اور اس کی جماعت ترقی پسند اور بائیں بازو کی سیاسی قوتوں کو قیادت مہیا کر رہی ہے۔'' 1967ء میں ماسکو کا عوامی لیگ کے ساتھ رویہ غیر دوستانہ تھا لیکن بعد میں ہندوستان کی جانب سے اس کی حمایت پر ماسکو نے بھی اپنے رویے میں تبدیلی پیدا کر دی۔ شیخ مجیب کا عوامی جمہوریہ چین کے بارے میں رویہ ہمیشہ غیر دوستانہ رہا تھا اور وہ پاک چین دوستی کو اشتعال انگیز خیال کرتے تھے۔

آیئے اب بھٹو اور ان کے انتخابی منشور پر بات کرتے ہیں۔ بھٹو کے لیے کوئی ایسا نعرہ بلند کرنا ممکن نہ تھا جو پورے مغربی پاکستان کے لوگوں کو متوجہ کر سکتا، جیسا کہ مجیب کے معاملے میں تھا جو بنگالی قومیت کے نام پر پورے مشرقی پاکستان کے عوام کی حمایت حاصل کر سکتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مغربی پاکستان میں چاروں صوبوں کے سیاسی تقاضے علیحدہ علیحدہ تھے۔ لہٰذا بھٹو کو لوگوں کی حمایت حاصل کرنے کے لیے مختلف جگہوں پر مختلف مسائل کے بارے میں بات کرنا پڑتی تھی۔ اور یہی وجہ تھی کہ انہیں ہندوستان کے خلاف اور ون یونٹ کے خلاف بھی بات کرنا پڑتی تھی۔ ایک طرف انہیں طاقتور جاگیردار طبقہ کو خوش رکھنا پڑتا تھا اور

دوسری جانب کسانوں کوخوش کرنے کے لیے زرعی اصلاحات کے وعدے کرنا پڑتے تھے۔انہوں نے اسلامی قوتوں کو بھی اپنے اسلامی سوشلزم کے بارے میں قائل کرنے کی کوشش کی۔اس کے علاوہ انہیں جنرلوں کوخوش رکھنے کے لیے اوران کی حمایت حاصل کرنے کے لیے بھی بہت سی حکمت عملیاں اختیار کرنی پڑیں۔ان کا نعرہ تھا،''اسلام ہمارا دین ہے، جمہوریت ہماری سیاست اورسوشلزم ہماری معیشت ہے۔'' انہوں نے اعلان کیا کہ وہ اسلامی سوشلزم کے نفاذ کے لیے سارا اقتصادی، معاشی انفراسٹرکچر تبدیل کرنے کے حق میں ہیں۔تاہم بھٹو نے شیخ مجیب کے چھ نکات پر کبھی کوئی تبصرہ نہ کیا اور مشرقی پاکستان میں اپنی مہم کے لیے کوئی دلچسپی نہ دکھائی۔اس سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ وہ صرف مغربی پاکستان میں اپنی پوزیشن کو مستحکم کرنے میں دلچسپی رکھتے تھے۔وہ پاکستان کے اتحاد سے لاتعلق تھے،اگرچہ اس وقت پاکستان کے اتحاد کی حفاظت سب سے اہم سیاسی مسئلہ تھا۔

دائیں بازو اور مذہبی بنیادوں کی حامل سیاسی جماعتیں مغربی پاکستان میں مقابلتاً بہتر حمایت رکھتی تھی لیکن وہ اپنے قدامت پسندانہ نعروں مثلاً اسلامی نظریات یا مضبوط مرکزی حکومت وغیرہ سے بھٹو کے ترقی پسندانہ نظریات کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔مغربی پاکستان میں ایوب مخالف لمبی تحریک کے نتیجے میں عوام کے سیاسی شعور میں کسی حد تک بہتری آئی تھی۔پرانی قیادت کے لیے انہیں گھسے پٹے انداز پر فصاحت اور مذہبی نعروں سے مطمئن کرنا مشکل ہو گیا تھا۔بھٹو نے اس صورتِ حال کو مکمل طور پر اپنے مفاد میں استعمال کیا۔ انہوں نے مغربی پاکستان کے تمام صوبوں کا دورہ کیا اور عوام کی حمایت حاصل کرنے کے لیے ہر صوبے کے مقامی مسائل کو اپنے انتخابی پروپیگنڈے کا حصہ بنایا۔ایک مقرر کی حیثیت سے وہ مجیب کے ہم پلہ تھے۔انہوں نے اپنی شعلہ فشاں تقریروں کی مدد سے مغربی پاکستان کے عوام کو پوری طرح متحرک کر دیا تھا۔ان کی تقاریر نے خاص طور پر طلبا اور نوجوان طبقے میں ہلچل مچادی۔

اس وقت مغربی پریس اور میڈیا نے پہلے ہی شیخ مجیب کی کامیابی کی پیش گوئیاں شروع کر دی تھیں۔مجیب اور ان کی پارٹی انتخابات میں واحد اکثریت حاصل کرلے گی، یہ ایک ایسا نتیجہ تھا جو لوگوں کو صاف نظر آ رہا تھا۔صدر جانسن کے دور میں پاکستان کے امریکہ کے ساتھ تعلقات میں خرابی آ چکی تھی۔ لیکن 1969ء میں نکسن کے اقتدار میں آتے ہی ان میں دوبارہ گرم جوشی پیدا ہونا شروع ہو گئی تھی۔اس وقت مسٹر اے بلڈ مشرقی پاکستان میں امریکی قونسل جنرل تھا۔اس کی مشتبہ سرگرمیاں پاکستان کے مفادات کے حوالے سے متعصبانہ خیال کی جاتی تھی۔وہ ذاتی طور پر شیخ مجیب سے ہمدردی رکھتا تھا۔اس کے کہنے پر فورڈ فاؤنڈیشن اور کچھ امریکن معیشت دان، مجیب اور ان کی جماعت کی مالی طور پر حمایت اور مدد کرتے تھے۔ انہوں نے شیخ مجیب کے ساتھ خفیہ طور پر تواتر سے ملاقاتیں کیں اور ان کے چھ نکاتی پروگرام کو تشکیل دینے میں بھی ان کا ہاتھ تھا۔حکومت کو ان کی ملاقاتوں کا علم ہوا اور اس کے نتیجے میں مسٹر اے بلڈ کو ایسی سرگرمیوں کے بنا پر ڈھاکہ سے نکال دیا گیا۔پھر امریکہ کے سفیر مسٹر فارلینڈ نے شیخ مجیب الرحمٰن سے ملاقات کی اور

انہیں واضح الفاظ میں بتایا گیا کہ امریکہ کسی بھی قسم کی علیحدگی کی سرگرمیوں میں نہ تو ان سے ہمدردی رکھتا ہے اور نہ ہی اس کی مدد کرے گا۔

15 اگست 1970ء کو ایک حکومتی اعلان میں انتخابات کی تاریخیں مقرر کر دی گئیں۔ 7 دسمبر کو قومی اسمبلی کے انتخابات اور 17 دسمبر کی تاریخ صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات کے لیے مقرر کی گئی۔ حکومت نے یہ اعلان بھی کیا کہ سیاسی رہنماؤں کو قومی میڈیا مثلاً قومی ریڈیو اور قومی ٹی وی پر اپنے انتخابی منشوروں پر بات کرنے کا موقع بھی دیا جائے گا۔ یہ پاکستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ہوا تھا کہ سیاسی جماعتوں کے سیاسی رہنماؤں کو ایسا موقع مہیا کیا گیا تھا۔ ایوب دَورِ حکومت میں اور ایوب سے پہلے بھی حزب مخالف کے رہنما ایسی سہولتوں سے محروم ہی رہتے تھے۔ 28 اکتوبر سے 19 نومبر کے درمیان 14 سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں نے قومی ریڈیو اور ٹیلیویژن پر انتخابی تقاریر کیں۔ میڈیا کی مہم کا آغاز شیخ مجیب نے کیا گیا اور اختتام سندھ یونائیٹڈ فرنٹ کے جی ایم سید پر ہوا۔ پارٹی رہنماؤں کی تمام تقاریر ان کے پہلے سے عوامی جلسوں میں کیے گئے اعلانات پر مبنی تھیں۔

18۔ مجھے جسمانی تربیتی (پی ٹی) کورس کے لیے بھیج دیا گیا

میں نے اس خاص وقت میں فزیکل ٹریننگ کورس کے لیے کوئٹہ چھوڑ دیا اور کاکول ایبٹ آباد پہنچ گیا۔ پی ٹی سکول میں میرا رابطہ کیپٹن رفیق سے ہوا، جو وہاں چیف انسٹرکٹر تھے۔ وہ سکول میں واحد بنگالی آفیسر تھے۔ میجر سلام ایک دوسرے بنگالی آفیسر اس وقت پی ایم اے میں پلاٹون کمانڈر کے طور پر تعینات تھے۔ یہ دونوں بعد میں بنگلہ دیش فوج میں جنرل بن گئے تھے۔ سکول میں میری ملاقات لیفٹیننٹ رفیق سے بھی ہوئی جو ایک ٹرینی آفیسر تھا۔ میرا چچازاد بھائی منا، بعد میں بنگلہ دیش فوج میں کرنل منیر الاسلام، اس وقت پی ایم اے میں کیڈٹ تھا۔ تمام بنگالیوں سے میرا تعلق کیپٹن رفیق اور میجر سلام کے ذریعے قائم ہوا۔ ہمارے تعلقات بہت قریبی نوعیت کے بن چکے تھے۔ اپنے فرصت کے اوقات میں ہم کیپٹن رفیق کے میس میں یا میجر سلام کے بنگلے پر ایک دوسرے سے ملاقات کرتے تھے اور گھنٹوں گپ شپ میں مصروف رہتے تھے۔ ہم سب موجودہ سیاسی صورتِ حال اور آنے والے انتخابات کے بارے میں بہت دلچسپی لیتے تھے۔ ہم یہ بحث کرتے ہوئے کہ کیا ہونے والا ہے اور اس سب کا نتیجہ کیا نکلے گا، چائے کے کپ میں طوفان پیدا کیا کرتے تھے۔ کیپٹن رفیق کی رہائش پر ہم اکثر باقاعدگی سے رہنماؤں کی ٹیلی ویژن تقاریر سنا کرتے تھے۔

اگرچہ اس وقت یہ بالکل واضح ہو چکا تھا کہ مولانا بھاشانی انتخابات کے خلاف تھے۔ پھر بھی ہم اور پاکستان کے دونوں حصوں کے عوام ان کی تقریر بڑے دھیان سے سنا کرتے تھے۔ وہ واحد رہنما تھے جو بنگلہ اور اردو دونوں میں بول سکتے تھے۔ ان کی تقریروں کی مشرقی اور مغربی پاکستان، دونوں میں بہت تعریف کی جاتی تھی۔ ہم شیخ مجیب اور بھٹو کو بھی بڑی دلچسپی سے سنتے تھے۔ ٹی وی پر بھٹو کی کارکردگی شیخ مجیب کی نسبت

زیادہ سحر انگیز تھی۔ اپنی تقریروں میں رہنماؤں نے بہت سے معاملات پر بات کی تھی۔ جمہوریت سے شروع ہو کر انسانی حقوق، معاشی صورتِ حال، زمینی اصلاحات، تعلیمی نظام، خارجہ معاملات، آئین وغیرہ، انہوں نے کوئی موضوع چھوڑا نہیں تھا۔ اگرچہ شیخ مجیب نے معاشرتی اور معاشی مسائل پر بھی بات کی، ان کا اہم مرکزی نقطہ بنگالی قومیت پرستی اور علاقائی تفاوت تھا۔

دوسری جانب بھٹو کا اصل موضوع اسلامی سوشلزم، پاک و ہند تعلقات اور کشمیر تھا۔ دوسری دائیں بازو کی جماعتوں نے اسلامی قوانین متعارف کرانے اور بیرونی نظریات کے حملوں سے اسلام کو بچانے کے وعدے کیے۔ ولی خان نے علاقائی محرومیوں اور خود مختاری پر زور دیا۔ راندے ہوئے طبقات کے چمپئن مولانا بھاشانی نے سیاسی اور آئینی معاملات پر زیادہ بات نہ کی، ان کے خطاب کی روح محروم طبقات کے مطالبات تھے۔ ان کی تقریر کے اہم پہلو غریب لوگوں کی خواہشات اور ضروریات تھیں۔ سیاسی رہنماؤں کی ٹی وی اور ریڈیو تقاریر کے بعد ملک میں انتخابی جوش و جذبہ عروج کو پہنچ چکا تھا۔ اس طرح شہری آبادی بہت حد تک مجموعی انتخابی صورتِ حال سے آگاہ ہو چکی تھی۔ انتخابات سے چار دن پہلے 3 دسمبر کو صدر نے قومی نشریاتی رابطے پر سیاستدانوں کو سنجیدگی سے ایک دوسرے کو برداشت کرنے کا پرزور مشورہ دیا تاکہ حکومت اپنا انتقالِ اقتدار کا وعدہ پورا کر سکے۔ انہوں نے ایک مرتبہ پھر کہا، ''بہت سے لوگوں کو حکومت کے دیانت دارانہ ارادوں پر شک تھا۔ لیکن اب یہ صاف طور پر واضح ہو چکا ہے کہ حکومت اپنے انتخابات کروانے کے وعدے پر سختی سے قائم ہے۔ حکومت کا وعدہ انتخابات کرواتے ہوئے جمہوریت کی بحالی کے ذریعے بارآور ہوگا۔'' 2 نومبر 1970ء کو ڈھاکہ میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے صدر نے کہا: ''مشرقی پاکستان کو خود مختاری کے مکمل حقوق دیئے جائیں گے۔'' نہ صرف یہ بلکہ انہوں نے یہ بھی کہا کہ وہ ذاتی طور پر اس بات کی حمایت کرتے ہیں کہ مشرقی پاکستان کے عوام کو اپنے معاملات کے بارے میں خود فیصلہ کرنا چاہیے۔ انہوں نے مزید کہا: ''اس جغرافیائی فاصلے کے مدِنظر جو دونوں حصوں کے درمیان پایا جاتا ہے، پاکستان کے اتحاد کو برقرار رکھنے کا یہ واحد راستہ ہے۔''

19۔ قومی اور صوبائی انتخابات کا انعقاد

7 دسمبر 1970ء کو قومی انتخابات ہو گئے۔ لوگ مشرقی پاکستان میں شیخ مجیب اور ان کی جماعت کی مکمل کامیابی پر حیران نہیں تھے۔ عوامی لیگ کی کامیابی پہلے سے ہی متوقع تھی۔ مشرقی پاکستان کی 162 نشستوں میں سے 160 پر عوامی لیگ کامیاب ہو گئی تھی۔ دو افراد جو عوامی لیگ کے علاوہ منتخب ہوئے تھے ایک چکما قبائل کے راجہ تری دیو رائے اور دوسرے نور الامین تھے۔ لیکن مغربی پاکستان میں عوامی لیگ ایک بھی نشست حاصل نہ کر سکی تھی۔ پاکستان کے عوام کے لیے دائیں بازو کی روایتی جماعتوں کی شکست اور ایک غیر پنجابی بھٹو اور اس کی جماعت کی جیت ایک غیر متوقع بات تھی۔ بھٹو کی پی پی پی نے مغربی پاکستان کی

138 نشستوں میں سے 81 نشستیں حاصل کی تھیں۔ باقی کی 57 نشستیں 7، سیاسی جماعتوں اور 15 آزاد امیدواروں میں تقسیم ہوئی تھیں۔ مجیب کی طرح بھٹو کی جماعت اور مغربی پاکستان کی دوسری جماعتیں مشرقی پاکستان میں کوئی نشست حاصل نہیں کر سکی تھیں۔ اس کے نتیجے میں بھٹو اور شیخ مجیب الرحمٰن بالترتیب مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان کے بڑے لیڈروں کے طور پر سامنے آئے۔ بہت سے لوگوں کا خیال تھا کہ صدر انتخابات کے نتائج پر پریشان ہو گئے تھے۔ لیکن ایسی کوئی بات نہ تھی۔ صدر اور ان کے حکمران فوجی ٹولے کے اکثر ارکان اچھی طرح جانتے تھے کہ اگر انتخابات ہوتے ہیں تو عوامی لیگ یقیناً جیت جائے گی اور شیخ مجیب ایک بڑے منتخب لیڈر بن جائیں گے۔ صدر نے نتائج سے پوری طرح باخبر ہوتے ہوئے انتخابات کروائے تھے کیوں کہ وہ خلوص کے ساتھ سمجھتے تھے کہ انتخابات کے بعد شیخ مجیب ان سے کیے گئے اپنے گزشتہ وعدوں پر قائم رہیں گے اور پاکستان کے اتحاد کو قائم رکھنے کے لیے اس کے مطابق اپنے چھ نکات میں ترمیم کر لیں گے۔ قومی انتخابات کے فوراً بعد صوبائی انتخابات بھی ہو گئے تھے۔

20۔ ڈھاکہ کا ایک مختصر دورہ

اس دوران مجھے کوئٹہ سے اطلاع دی گئی کہ پی ٹی کورس کے بعد مجھے ایک مرتبہ پھر کوئٹہ کے سکول آف انفنٹری اینڈ ٹیکٹکس سے اوڈبلیو جے ٹی سی (OW-JTC) کا ایک کورس بھی کرنا پڑے گا۔ مجھے اپنی واپسی پر فوری طور پر اس کورس میں شامل ہونا تھا۔ اس حکم کے ملنے کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ خواہ چند دنوں کے لیے سہی مجھے چھٹی لے کر اصل صورتِ حال سے آگاہ ہونے کے لیے ڈھاکہ جانا چاہیے۔ میں نے چھٹی کی درخواست دی جو منظور کر لی گئی۔ کورس کے اختتام پر میں کاکول سے سیدھا پندرہ دن کی چھٹی پر جنوری 1971ء کے پہلے ہفتے میں ڈھاکہ پہنچ گیا۔ ڈھاکہ کی زمین پر قدم رکھتے ہی میں سیاسی حدت کو محسوس کر سکتا تھا۔ میں نے صورتِ حال میں بہت تناؤ محسوس کیا۔ ہر کوئی سوچ رہا تھا کہ فوجی ٹولے کو اب اقتدار بنگالیوں کو سونپنا پڑے گا، جیسا کہ انتخابات ہو چکے تھے اور کوئی دوسرا متبادل نہیں تھا۔ مختلف طبقات سے تعلق رکھنے والے اپنے دوستوں سے بات چیت کرنے کے بعد مجھے سمجھ آئی کہ ہر کوئی یقینی طور پر خیال کر رہا تھا کہ شیخ مجیب الرحمٰن ہی پاکستان کے آئندہ منتخب وزیرِاعظم ہوں گے۔ بعض لوگوں نے کہا کہ اگر فوجی ٹولے نے اقتدار منتقل کرنے سے انکار کر دیا تو پاکستان قائم نہیں رہ سکے گا۔ اگرچہ وہ اس کی پیش گوئی تو کر رہے تھے لیکن کوئی بھی واضح طور پر نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ کس طرح ہوگا۔ اس خوف ناک منظرنامے کے بارے میں کسی کا واضح تصور نہیں تھا جو فوجی ٹولے کے انتقالِ اقتدار سے انکار کی صورت میں جنم لے سکتا تھا۔ یہ بات بھی پوری طرح واضح نہیں تھی کہ آیا بنگالی سیاسی قیادت ایک آزاد بنگلہ دیش قائم کرنے کا کوئی حتمی منصوبہ رکھتی بھی ہے یا نہیں۔

جب میں چھٹی پر تھا تو اچانک ایک دن مجھے باپی کی رہائش گاہ پر شیخ مجیب کے بیٹے شیخ کمال سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ میں نے دوٹوک انداز میں اس سے پوچھا، ''اگر شیخ مجیب اپنے اس وعدے سے انحراف

کرتے ہیں جو انہوں نے صدر سے کیا تھا اور اپنے چھ نکات پر مبنی آئین تشکیل دینے کی کوشش کرتے ہیں تو پھر فوجی حکمران ٹولہ ان کو اقتدار منتقل نہیں کرے گا۔ تو کیا اس صورتِ حال میں عوامی لیگ عوام کو پاکستان کو توڑنے اور آزاد بنگلہ دیش قائم کرنے کی تحریک میں شامل ہونے کو کہے گی؟ کیا عوامی لیگ نے اس کے لیے کوئی تیاری کر رکھی ہے؟ کیا عوامی لیگ ایسی قربانی دینے کے لیے تیار ہے جو حکمران فوجی ٹولے کی اس فوجی کارروائی کا سامنا کرنے کے لیے دینی پڑے گی جو وہ صورتِ حال کو قابو میں لانے کے لیے عمل میں لائے گا؟ کیا عوامی لیگ ایک مسلح جدوجہد کے لیے عوام کی قیادت کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہے؟ سب سے بڑھ کر شیخ مجیب الرحمٰن کے ذہن میں کیا ہے؟''

شیخ کمال میرے ان براہِ راست سوالات سے قدرے گھبرا گیا لیکن اس نے جواب میں کہا، ''بنگلہ بندھو علاقائی تفاوت کو بشمول مشرقی پاکستان کے جہاں بھی موجود ہے، ختم کرنے اور صوبوں میں جمہوری طور پر خودمختار حکومتیں قائم کرنے کے حق میں ہیں۔ وہ ان کی جماعت پرامن اور منصفانہ انتخابات میں اکثریت حاصل کر چکی تھی۔ عوامی لیگ انتقالِ اقتدار کے عمل میں حکومت کے ساتھ تعاون کرنے کو تیار ہے جیسا کہ اس نے انتخابات کے انعقاد کے لیے کیا تھا۔ عوامی لیگ یقین رکھتی ہے کہ جنرل یحییٰ اور ان کا حکمران فوجی ٹولہ منتخب نمائندوں کو پرامن طور پر اقتدار منتقل کرنے میں پرخلوص ہے۔ فوجی حکومت کے لیے اب انتخابات کے انعقاد کے بعد اقتدار منتقل نہ کرنا ممکن نہ ہوگا۔ علاوہ ازیں اس معاملے پر بات چیت کے لیے وہ بہت جلد ڈھاکہ آ رہے ہیں۔'' کمال نے اطلاع دی۔

اس گفتگو سے میں یہ سمجھ سکتا تھا کہ عوامی لیگ کی قیادت انتقالِ اقتدار کے بارے میں کوئی شک وشبہ نہیں رکھتی اور وہ کسی غیر قانونی کارروائی کی تیاری نہیں کر رہی۔ شیخ کمال نے صدر اور شیخ مجیب کے درمیان ہونے والی آئندہ گفتگو پر خاص زور دیا۔ یہ بات بھی واضح تھی کہ عوامی لیگ انتقالِ اقتدار کے عمل کو آسان بنانے کے لیے بات چیت کے ذریعے چھ نکات کے سوال کو حل کرنے کے لیے بھی تیار تھی۔ جس طرح کہ اس نے انتخابات کے معاملے میں کیا تھا۔ میں نے شیخ کمال کی باتوں سے یہ تاثر لیا کہ شیخ مجیب صدر سے کیے گئے اپنے گزشتہ وعدے کو قائم رکھنے کے لیے اپنے چھ نکات میں ضروری تبدیلیاں کرنے کو تیار ہیں۔ آخر میں میں نے شیخ کمال سے دوبارہ سوال کیا، ''فرض کریں اگر فوجی ٹولہ حتمی طور پر شیخ مجیب کو اقتدار منتقل کرنے سے انکار کر دیتا ہے اور فوجی حل کا راستہ اختیار کرتا ہے تو اس صورتِ حال میں شیخ مجیب اور عوامی لیگ آمرانہ حکومت کے خلاف مسلح جدوجہد کے لیے عوام کی قیادت کرنے کے لیے تیار ہے؟'' جواب میں شیخ کمال نے کہا کہ شیخ مجیب سازشی نہیں ہیں، وہ علاقائی تفاوت کو دُور کرنے اور صوبائی خودمختاری قائم کرنے میں یقین رکھتے ہیں۔ چھ نکات کا مقصد پاکستان کو توڑنا نہیں ہے۔ اس نے مزید کہا، ''شیخ مجیب کو غدار یا سازشی ثابت کرنے کی تمام کوششیں اگرتلہ سازش کیس میں ناکام ہو چکی ہیں، اسی طرح مستقبل میں بھی ان کے خلاف تمام پروپیگنڈا ناکام ہو جائے گا۔'' میں نے کمال سے پوچھا، ''جنرل یحییٰ کی حکومت انتخابات سے پہلے مغربی

پاکستان سے یہاں بڑی تعداد میں فوجی یونٹس بھجواتی رہی تھی، کیا تمہیں اس بات کا علم ہے؟ طاقت کے اس قسم کے اجتماع سے آپ کیا اخذ کرتے ہیں؟''

کمال نے جواب میں کہا کہ 1965ء کی جنگ کے بعد ہم نے آواز اٹھائی تھی کہ مشرقی پاکستان کے دفاع کو نظر انداز کیا جا تا رہا ہے۔ اس دباؤ کے نتیجے میں اب یحییٰ حکومت مشرقی پاکستان میں مناسب فوج رکھنے پر مجبور ہوئی ہے۔ طاقت کے اس اجتماع سے محض یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حکومت عوامی مطالبے کے سامنے سرنگوں ہوئی ہے۔ یہ مشرقی پاکستان کے عوام کی فتح ہے۔

اس بیان سے بھی یہ بات سمجھ آتی ہے کہ عوامی لیگ اور شیخ مجیب کو فوجی کارروائی کی کوئی توقع نہ تھی اور نہ ہی انہوں نے مسلح جدوجہد یا مزاحمتی تحریک کی کوئی تیاری یا منصوبہ بندی کی ہوئی تھی۔

حکمران فوجی ٹولے میں بصیرت کے فقدان کی وجہ سے 25 اور 26 مارچ 1971ء کی درمیانی شب پوری قوم سراسیمگی کا شکار ہوگئی تھی جب فوجی ٹولے نے مشرقی پاکستان کے معصوم عوام پر غیر متوقع طور پر ظلم و بربریت کا آغاز کر دیا۔ بنگالی قوم پوری طرح بے بس تھی۔ ان نازک حالات میں عوامی لیگ عوامی مزاحمت پیدا کرنے کے لیے قیادت مہیا کرنے میں بری طرح ناکام ہو چکی تھی۔ شیخ مجیب نے اپنی گرفتاری اور مغربی پاکستان کی محفوظ جنت میں پہنچنے پر سکھ کا سانس لیا تھا۔ فوجی کارروائی کے آغاز سے پہلے بہت سے لوگوں نے شیخ مجیب سے متوقع فوجی کارروائی کا سامنا کرنے کے لیے لوگوں کو منظم کرتے ہوئے قیادت مہیا کرنے کی درخواست کی تھی۔ لیکن انہوں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا اور اس کے جواب میں واضح طور پر کہا، ''میں ساری زندگی آئینی طور پر جمہوریت کے قیام کے لیے جدوجہد کرتا رہا ہوں۔ میں بندوقوں کی سیاست پر یقین نہیں رکھتا۔'' یہی مجیب الرحمٰن تھے جنہوں نے بعد میں بغیر کسی ہچکچاہٹ کے دعویٰ کیا کہ آزادی کا اعلان کرنے والے وہ خود تھے اور جنگ آزادی کا واحد اور تنہا علمبردار ہونے کا بھی انہوں نے دعویٰ کیا۔ شرمناک طور پر انہوں نے اگرتلہ سازش کا اہم معمار ہونے کا دعویٰ کرتے ہوئے یہ سہرا اپنے سر پر سجانے کی کوشش کی۔ اور پھر یہی شیخ مجیب تھے جنہوں نے جمہوریت کا زبردست داعی ہوتے ہوئے آزادی کے بعد بنگلہ دیش میں اپنے خاندان کی حکومت قائم کرنے کے لیے جمہوریت کا گلا دبانے کی کوشش کی۔ اس قسم کا ابن الوقت اور موقع پرست انسان ہونے کے حوالے سے ایک عبرت ناک خاتمہ ان کی تقدیر بن گیا تھا۔

21۔ کوئٹہ میں واپسی

میرے مشرقی پاکستان میں قیام کا جلد ہی خاتمہ ہو گیا اور اپنی چھٹیوں میں مزید دو ہفتے کا اضافہ کروانے میں ناکامی کا سامنا کرتے ہوئے میں کوئٹہ واپس پہنچ گیا۔ میرا کورس چند دنوں میں شروع ہو گیا۔ مقامی یونٹ کا آفیسر ہونے کی وجہ سے میں اپنے میس میں رہ کر کورس میں شرکت کر سکتا تھا۔ کوئٹہ میں تمام بنگالی میری واپسی کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ اپنی واپسی پر میں ان سب سے ملا اور انہیں مشرقی

پاکستان کی مجموعی صورتِ حال سے آگاہ کیا اور اپنے تاثرات بھی بتائے۔ اکثر دوست عوامی لیگ کی قیادت کے ذہنوں میں موجود ابہام اور فوجی ٹولے کے ارادوں کے بارے میں خوش فہمی پر مایوس ہوئے۔ اگرچہ شیخ مجیب اور ان کی عوامی لیگ فوجی کارروائی کی اہمیت کو اپنی لاعلمی کی بنا پر سمجھنے میں ناکام رہے تھے، بہت سے لوگ نتائج کی پیش بینی کر رہے تھے۔ ہم سب بہت زیادہ پریشان اور تشویش کا شکار تھے۔ بہت سے لوگوں کا اب بھی شیخ مجیب اور شیخ کمال کی طرح یہی خیال تھا کہ فوجی ٹولہ یقیناً پرامن طور پر اقتدار منتقل کر دے گا اور اس کے بدلے شیخ مجیب اپنے وعدے کا پاس رکھتے ہوئے آئین کی تشکیل کے لیے اپنے چھ نکات میں ضروری ترامیم پر راضی ہو جائیں گے اور اس طرح پاکستان کے اتحاد کو بچایا جا سکے گا۔ ڈھاکہ سے واپس آنے کے بعد میرے ذہنی تناؤ میں بہت زیادہ اضافہ ہو چکا تھا کہ سب کچھ غیر یقینی نظر آ رہا تھا۔ ہم سب بڑی بے چینی میں دن گزار رہے تھے۔

22۔ صدر نے مجیب اور بھٹو دونوں کو مبارک باد دی اور ڈھاکہ روانہ ہو گئے

انتخابات کے بعد صدر نے شیخ مجیب الرحمٰن اور ذوالفقار علی بھٹو کو ان کی انتخابی کامیابیوں پر مبارک باد کے پیغامات بھیجے۔ انہوں نے تمام سیاسی قیدیوں کو بھی غیر مشروط طور پر رہا کر دیا۔ اقتدار کی منتقلی کے حوالے سے وہ جلد از جلد شیخ مجیب اور بھٹو سے مذاکرات کا سلسلہ شروع کرنا چاہتے تھے۔ صدر جنرل یحیٰ نے محمد یوسف ہارون، جو نام نہاد 22 خاندانوں میں ایک تھے، کے ذریعے شیخ مجیب کو اسلام آباد آنے کی دعوت دی۔ (شیخ مجیب کے ہارون کے ساتھ پراسرار تعلقات قابل پرسش ہیں) آئندہ ہونے والا وزیراعظم اسلام آباد آنے کے لیے تیار نہ تھا۔ انہوں نے تمام سیاسی مذاکرات اسلام آباد کی بجائے ڈھاکہ میں کرنے میں ہی ہوش مندی خیال کی۔ مجیب کی اسلام آباد نہ جانے کی جو بھی وجوہات تھیں، ان کی بجائے صدر بات چیت کے لیے ڈھاکہ پہنچ گئے۔ وہ وہاں 12 جنوری 1971ء کو پہنچے۔

اس دوران میں صدر نے پہلے ہی اپنی کابینہ اور اپنے اہم آئینی مشیر جی ڈبلیو چوہدری کی مدد سے آئین کا مسوّدہ تیار کر لیا تھا۔ انہوں نے اس تیار شدہ مسوّدے کی بنیاد پر شیخ مجیب سے بات چیت کرنے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔ اس مسوّدے کے اہم نکات مندرجہ ذیل تھے:

1۔ مرکزی حکومت کے لیے اختیارات کا ایک چارٹر تیار کیا جائے گا۔ باقی ماندہ اور دوسرے اختیارات صوبائی حکومتوں کے پاس ہوں گے۔ مغربی پاکستان کے صوبوں سے متعلق مرکز کے کسی بھی اختیار کو چارٹر میں علیحدہ سے درج کیا جائے گا۔ چارٹر میں درج اختیارات کے علاوہ دوسرے تمام اختیارات مشرقی پاکستان کی صوبائی حکومت کے پاس ہوں گے۔

2۔ مرکز کے چارٹر میں کم سے کم اختیارات درج کیے جائیں گے۔ مرکز کے ہاتھ میں صرف 5 سے 6 ایسے موضوعات ہوں گے جو معاملات کو چلانے کے لیے ازحد ضروری ہیں۔ باقی تمام اختیارات اور

موضوعات صوبوں کے پاس ہوں گے۔

3۔ آئین میں ایسا کوئی قانون شامل نہیں ہوگا جس کی بنا پر قومی یک جہتی، معاشی منصوبہ بندی، اور ہم آہنگی کے بہانے سے مرکز صوبائی معاملات میں مداخلت کر سکے۔ ایسا قانون جیسا کہ 1962ء کے آئین میں شامل کیا گیا تھا، عوام میں بہت ناپسند کیا گیا تھا۔

4۔ موجودہ سیاق وسباق میں معیشت مرکز اور صوبوں کے درمیان ایک کلیدی عنصر ہے۔ لہٰذا مستقبل کے آئین میں مندرجہ ذیل اصولوں کو قانونی حیثیت دی جائے۔

(i) مرکزی ذرائع جیسا کہ بیرونی امدادیں اور بیرونی رقوم مشرقی پاکستان اور دوسرے چاروں صوبوں کے درمیان ان کی آبادی کی بنیاد پر تقسیم کی جائیں۔ دیگر ذرائع مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے دوسرے چاروں صوبوں میں آدھے آدھے تقسیم کر دیئے جائیں۔ بیرونی قرضہ جات اور امداد مرکز کے ذریعے حاصل کی جائے گی اور مرکزی حکومت ایسے کسی بھی معاہدے پر دستخط کرنے کی ذمہ دار ہوگی۔

(ii) مرکزی بجٹ محصولات اور تمام ترقیاتی اخراجات اسی طرح مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے دوسرے چار صوبوں میں آبادی کی بنیاد پر یا مساوی بنیادوں پر تقسیم کیے جائیں گے۔

(iii) محصولات کی وصولی صوبائی بنیادوں پر کی جائے گی۔ ہر قسم کے محصولات اور ٹیکس صوبائی حکومتوں کا استحقاق ہوگا۔ تاہم جمع شدہ محصولات کا ایک طے شدہ حصہ مرکز کے لیے مقرر کیا جائے گا اور آئین میں اس کا ذکر کیا جائے گا۔

(iv) مرکزی حکومت کی تمام انتظامی ذمہ داریاں مثلاً آئینی معاملات، انتظامی امور، قانونی معاملات وغیرہ ڈھاکہ اور اسلام آباد دونوں دارالحکومتوں میں ازسرنو تقسیم کیے جانے چاہئیں تاکہ دونوں حصے جو جغرافیائی اعتبار سے میلوں دُور ہیں، تنہا محسوس نہ کریں۔ مرکزی معاملات سے متعلق دفاتر ڈھاکہ میں بھی قائم کرنا ہوں گے۔

(v) مرکزی حکومت کی ملازمتوں کے لیے تمام بھرتیاں آبادی کی بنیاد پر یا مشرقی پاکستان اور دوسرے چار صوبوں کے درمیان برابری کی بنیاد پر کی جائیں گی۔

(vi) مرکزی حکومت میں نمائندگی کی عدم برابری کو ختم کیا جائے گا۔ جوائنٹ سیکریٹری اور اس کے اوپر کی سطح پر متناسب نمائندگی قائم کی جائے گی۔

مسوّدے میں جی ڈبلیو چوہدری نے واضح طور پر ذکر کیا کہ مشرقی پاکستان کو اس کے جائز حقوق سے ہمیشہ محروم رکھا گیا۔ انہوں نے ڈرافٹ میں یہ ذکر بھی کیا کہ معاشی وسائل محصولات کی تقسیم، ترقیاتی اخراجات اور زرمبادلہ کی تخصیص اور بیرونی امداد کی تقسیم میں مشرقی پاکستان کو مغربی پاکستان کے مقابلے میں ہمیشہ اس کے جائز حصے سے محروم رکھا گیا جس کے نتیجے میں مشرقی پاکستان، مغربی پاکستان کے داخلی علاقے کی حیثیت اختیار کرتا چلا گیا۔ پاکستان کا اتحاد قائم رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ بتدریج مناسب پالیسیاں

اپناتے ہوئے اس فرق کو دُور کیا جائے۔ صرف اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے اور اس تفاوت کو دُور کرتے ہوئے پاکستان کے اتحاد کو بچایا جا سکتا ہے اور ایک مضبوط پاکستان وجود میں آ سکتا ہے۔ اگر علاقائی عدم توازن کو ختم کر دیا جائے تو سیاسی استحکام بحال ہو سکتا ہے۔ ان خطوط پر مخلصانہ اور عملی اقدامات اٹھانے سے ہی مشرقی پاکستان کے عوام کا اعتماد اور بھروسا حاصل کیا جا سکتا ہے اور اس طرح قومی یک جہتی اور اتحاد کی راہ ہموار کی جا سکتی ہے۔

جی ڈبلیو چوہدری کے ڈرافٹ میں مزید کہا گیا کہ اس طریقے سے مشرقی پاکستان کے لوگ اس استحصال اور استبداد کو بھول سکتے ہیں جس کا وہ دو عشروں سے زائد عرصے سے شکار ہیں۔ ان کے دلوں سے مغربی پاکستان کے خلاف جذبات کو ختم کرتے ہوئے پاکستان کو ایک طاقت ور ملک بنانے کے لیے سنجیدہ کوششیں کی جا سکتی ہیں۔ معاشیات اور محصولات کے حوالے سے تفصیلی قوانین وضع کرنا اس وقت ممکن نہیں۔ لہٰذا ایسے معاملات کے لیے قوانین متعلقہ ادارہ ہی تیار کرے گا اور آئین میں اسے یہ اختیار دیا جائے گا۔ وہ ادارہ معاشی اور محصولاتی معاملات کے حوالے سے اس طرح سے قوانین تشکیل دے گا کہ ماضی کے غیر منصفانہ استحصال کے دوبارہ مواقع پیدا نہ ہو سکیں۔

جی ڈبلیو چوہدری نے مندرجہ بالا ڈرافٹ 11 دسمبر 1970ء کو صدر کے سامنے پیش کر دیا جنہوں نے اس سے اتفاق کیا اور اس بارے میں جی ڈبلیو چوہدری کو خط لکھا۔ صدر، مسٹر چوہدری کو اپنے ساتھ ڈھاکہ لے گئے۔ ان کا خیال تھا کہ شیخ مجیب اپنے وعدے پر عمل کریں گے اور انہیں اس آئینی مسوّدے پر گفت وشنید کرنی ہوگی اور اس صورت میں چوہدری صاحب وہاں موجود ہوں گے اور گفتگو میں مددگار ثابت ہو سکیں گے۔ شیخ مجیب الرحمٰن اور صدر کے درمیان ملاقات 12 جنوری 1971ء کو ہوئی۔ بند کمرے کا یہ اجلاس تین گھنٹوں تک جاری رہا۔ اجلاس میں کوئی تیسرا شخص موجود نہیں تھا۔ اس ملاقات کے فوراً بعد صدر نے اپنے آئینی معاملات کے وزیر جی ڈبلیو چوہدری کو بلایا اور انہیں بتایا: ''شیخ مجیب نے ان سے دھوکا کیا ہے۔ وہ اپنے وعدے پر قائم نہیں رہے۔ میرے بہت سے مشیروں نے مجھے ان پر اعتماد نہ کرنے کو کہا تھا۔ لیکن میں نے ان کے مشورے کو نظر انداز کرتے ہوئے ان پر اعتماد کیا۔ مجیب نے میرے اخلاص کو میری کمزوری خیال کرتے ہوئے بہت بڑی غلطی کی ہے۔'' گفتگو کا خلاصہ یہ تھا کہ شیخ مجیب نے مسوّدے پر صدر سے گفتگو کرنے سے مکمل طور پر انکار کر دیا تھا اور انہوں نے اس ملاقات میں واضح طور پر کہہ دیا تھا کہ اکثریت کا نمائندہ ہونے کی حیثیت سے آئین کا مسوّدہ وہ خود تیار کریں گے اور صدر کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے، ان کی واحد ذمہ داری جتنا جلدی ممکن ہو سکے، قومی اسمبلی کے اجلاس کا بندوبست کرنا ہے۔ انہوں نے صدر کو متنبہ کیا کہ اگر وہ جلد از جلد اسمبلی کا اجلاس طلب کرنے میں ناکام ہو جاتے ہیں تو اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے سنگین نتائج کے وہ ذاتی طور پر ذمہ دار ہوں گے۔

صدر، شیخ مجیب الرحمٰن کے اس قسم کے غیر متوقع رویے سے بہت زیادہ مایوس ہوئے۔ حکمران

ٹولے میں بھی ان کی حیثیت غیر محفوظ ہوگئی تھی۔ آئندہ ابواب میں یہ دیکھا جاسکتا ہے کہ صدر نے شیخ مجیب الرحمٰن کے تقریباً تمام مطالبات تسلیم کر لیے تھے۔ اگرچہ مرکزی اور صوبائی تعلقات کے معاملات پر کچھ معمولی سے اختلافات موجود تھے۔ صدر صوبائی خودمختاری اور خودارادیت کے سوال پر بھی پوری طرح متفق ہو گئے تھے۔ ان کے مسودے کے مطابق صرف خارجہ تعلقات، کرنسی اور دفاع تین معاملات تھے جو مرکزی حکومت کے پاس رکھے گئے تھے، باقی تمام معاملات صوبائی انتظامیہ کو سونپ دیئے گئے تھے۔ دوسرے دو یا تین متعلقہ امور جیسا کہ پاسپورٹ، قومیت اور امیگریشن وغیرہ انہوں نے مرکز کے پاس رکھنے کی تجویز دی تھی جب کہ مرکز کو محصولات اکٹھا کرنے کا کوئی حق نہیں دیا گیا تھا۔ وہ آئینی تحفظ چاہتے تھے۔ وہ آئین میں ایسے قوانین شامل کرنا چاہتے تھے جو اس بات کی ضمانت مہیا کرسکیں کہ صوبے اپنے محصولات کا ایک مقررہ حصہ مرکز کو ادا کریں گے۔ صدر یہ ضمانت محض اس بات کو یقینی بنانے کے لیے چاہتے تھے کہ مرکزی حکومت اپنی آزادی کو برقرار رکھتے ہوئے اپنے فرائض ادا کرسکے۔ جہاں تک خارجہ تعلقات کا تعلق تھا، وہ سیاسی، سفارتی اور معاشی معاملات میں ایک مختلف اور علیحدہ پالیسی پر متفق نہیں تھے۔ ان معاملات پر ان کا نقطہ نظر یہ تھا کہ صوبے بیرونی مشنوں میں اپنے معاشی اور تجارتی نمائندے متعین کرسکتے ہیں جو اگرچہ صرف اپنے صوبوں کو جواب دہ ہوں گے لیکن مرکز کی پالیسی کے خلاف کسی قسم کی سرگرمی میں ملوث نہیں ہوں گے۔

پہلی ملاقات کی قطعی ناکامی کے بعد صدر اور شیخ مجیب الرحمٰن کے درمیان مزید ملاقاتوں کا انتظام کیا گیا تھا۔ لیکن جس انداز سے گفتگو جاری تھی، اس سے یہ بات واضح ہوچکی تھی کہ پاکستان تباہی کی جانب بڑھ رہا تھا۔ ڈھاکہ سے روانگی پر پہلے صدر نے صحافیوں کو بتایا کہ ان کی شیخ مجیب الرحمٰن سے مفید گفتگو ہوئی ہے۔ انہوں نے پریس کانفرنس میں واضح طور پر اشارہ دیا کہ جب شیخ مجیب اقتدار سنبھالیں گے تو وہ حکومت میں نہیں ہوں گے۔ عام طور پر یہ توقع کی جارہی تھی کہ شیخ مجیب بہت جلد حکومت بنائیں گے۔ لیکن پھر شیخ مجیب اور صدر کے درمیان مبینہ افہام و تفہیم کا کیا ہوا؟ جیسا کہ اس سمجھوتے کے تحت خیال کیا جارہا تھا کہ یحییٰ خان پارلیمانی طرزِ حکومت کے تحت آئینی صدر یا سربراہِ مملکت کی ذمہ داری سنبھالیں گے۔ اس پس منظر میں صدر کے بیان نے تمام لوگوں کو پریشان کر دیا۔ کیا باہمی اعتبار کی وہ بنیادیں جو صدر اور شیخ مجیب کے درمیان بتدریج استوار ہوئی تھیں، متزلزل ہوچکی تھیں؟ کیا ان دونوں کے درمیان اختلافِ رائے پیدا ہو چکا تھا؟ اس تمام صورتِ حال کا نتیجہ کیا ہوگا؟

صدر نے یہ اشارہ بھی دیا کہ اپنی واپسی پر وہ بھٹو اور مغربی پاکستان کے دوسرے سیاستدانوں سے بات کریں گے اور ان سے درخواست کریں گے کہ وہ ڈھاکہ جائیں اور مجیب الرحمٰن کو یہ سمجھانے کی کوشش کریں کہ ملک کے عظیم مفاد میں وہ ایک معقول رویہ اپنانے کی کوشش کریں۔ بہ صورتِ دیگر انہوں نے متنبہ کیا کہ اگر اس کے کوئی غلط نتائج نکلتے ہیں تو قوم کی نظروں میں تمام سیاسی رہنما ذمہ دار ٹھہریں گے۔ 12 جنوری کی ملاقات کی ناکامی کے بعد مسٹر چوہدری نے فوری طور پر کابینہ میں شامل اپنے دوسرے بنگالی

ساتھیوں سے بات چیت کی۔ جو کچھ صدر کے ذہن میں تھا، انہوں نے حفیظ الدین کو اس بارے میں آگاہ کیا اور انہیں مجبور کیا کہ وہ شیخ مجیب الرحمٰن کے پاس جائیں اور انہیں حالات سمجھانے کی کوشش کریں کیوں کہ ان کے شیخ مجیب کے ساتھ قریبی تعلقات تھے۔ حفیظ الدین، شیخ مجیب الرحمٰن سے ملاقات کے لیے گئے (اس ملاقات میں عوامی لیگ کے جنرل سیکریٹری تاج الدین احمد بھی موجود تھے) اور شیخ مجیب سے درخواست کی کہ وہ اپنے سابقہ وعدے کے مطابق آئین کا مسودہ صدر کو دکھائیں۔ شیخ مجیب نے جواب میں کوئی واضح بات نہ کی اور ان کی بجائے تاج الدین نے جواب دیا۔ انہوں نے بڑے واضح طور پر بات کی: ''شیخ مجیب نے ایسا کوئی وعدہ نہیں کیا تھا۔ اس لیے عوامی لیگ اپنا آئینی مسودہ کسی کو دکھانے کی پابند نہیں ہے۔'' اس طرح صدر ڈھاکہ سے شکستہ دل واپس آئے اور بھٹو سے ملنے کے لیے لاڑکانہ چلے گئے۔ گفت وشنید کے دوران بھٹو نے صدر اور شیخ مجیب کے درمیان ناکام ملاقات کا پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ جنرل حامد اور جنرل پیرزادہ بھی صدر کے ساتھ لاڑکانہ گئے تھے۔

23۔ بھٹو بھی شیخ مجیب سے گفت وشنید کے لیے ڈھاکہ گئے

اس دوران بھٹو بھی ان معاملات پر شیخ مجیب سے گفت وشنید کے لیے ڈھاکہ گئے۔ وہ وہاں 27 جنوری کو پہنچے اور شیخ مجیب الرحمٰن کی رہائش گاہ پر انہوں نے شیخ مجیب سے تین مرتبہ ملاقاتیں کیں۔ اگرچہ ملاقاتیں خوشگوار ماحول میں ہوئیں لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہ ہو سکا۔ شیخ مجیب نے بھٹو کو واضح طور پر بتایا کہ وہ اپنے چھ نکات پر کوئی سمجھوتہ نہیں کریں گے۔ جواب میں بھٹو نے کہا کہ چھ نکات در پردہ علیحدگی پسندی پر مبنی ہیں، اس لیے وہ اور ان کی پارٹی کسی ایسے آئینی مسودے کی حمایت نہیں کر سکتی تھی جو ان نکات کی بنیاد پر تشکیل دیا گیا ہو۔ اس طرح پاکستان کے دونوں حصوں کی اکثریتی پارٹیوں کے رہنماؤں کے درمیان کوئی سیاسی سمجھوتہ طے نہ پا سکا جو پاکستان کے اتحاد کے لیے بنیادی حیثیت رکھتا تھا۔ مسٹر ہارون نے اس وقت پس پردہ رہتے ہوئے بہت مشکوک کردار ادا کیا۔ انہوں نے بڑی ہوشیاری سے شیخ مجیب کے سامنے بھٹو کو ملٹری ٹولے کے ایجنٹ کے طور پر پیش کیا اور اس وجہ سے شیخ مجیب ہر معاملے میں بھٹو کے بارے میں شک وشبے کا شکار رہے۔ اس قسم کی باہمی بد اعتمادی اور خلوص کے فقدان کی وجہ سے شیخ مجیب اور بھٹو کی گفتگو ناکام رہی۔ ان ملاقاتوں کے بارے میں بعد میں مسٹر بھٹو نے کہا: ''شیخ مجیب چھ نکات پر مبنی آئین قوم پر مسلط کرنے کی سازش کر رہے تھے۔ ان کا مقصد جس قدر جلدی ممکن ہو سکے قومی اسمبلی کا اجلاس بلانا تھا تا کہ وہ اپنی ایک بڑی اکثریت کے بل بوتے پر اپنے چھ نکات کے ذریعے قوم کا گلا گھونٹ سکیں۔ وہ قوم کو چھ نکات کو سمجھنے کے لیے زیادہ موقع نہیں دینا چاہتے تھے۔''

24۔ یحییٰ اور بھٹو کی لاڑکانہ ملاقاتوں نے شکوک وشبہات کو جنم دیا

بھٹو کی ڈھاکہ سے واپسی کے چند دن بعد لاڑکانہ میں ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ شیخ مجیب کا

ان ملاقاتوں کوشک وشبہ کی نظروں سے دیکھنا قدرتی امر تھا۔ اس حوالے سے بھٹو نے کہا: ''ہم نے چھے نکات کی اہمیت اور مفہوم پر غور کیا ہے۔ ہم ان کے مقاصد سے خوف زدہ ہو گئے ہیں۔ اس کے باوجود میں نے صدر سے وعدہ کیا ہے کہ میں ان پر کسی مصالحتی حل کی تلاش کے لیے بھرپور کوشش کروں گا۔ لاڑکانہ میٹنگ کے بعد فوجی ٹولے نے فروری کے وسط میں اسلام آباد میں ایک رسمی اجلاس کا انعقاد کیا۔ اس میں ملک کی تازہ ترین سیاسی صورتِ حال پر غور کیا گیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ شیخ مجیب کے غیر لچکدار رویے سے سختی سے نمٹا جائے۔ بھٹو کے اشتعال انگیز بیانات کو نظر انداز کرتے ہوئے ٹولے میں موجود باغی جنرلوں جنرل حامد، جنرل عمر، جنرل گل حسن اور پیرزادہ نے بھٹو کو پاکستان کی بنیاد اور مفادات کا واحد حمایتی سیاستدان قرار دیا۔ اس بات نے صورتِ حال کو مزید پیچیدہ کر دیا اس اجلاس میں کابینہ کو تحلیل کرنے کا فیصلہ بھی کیا گیا۔ صدر اور ایڈمرل احسن کو شیخ مجیب کے ساتھ مذاکرات کے ذریعے کوئی سیاسی حل تلاش کرنے میں ناکامی پر تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ ایڈمرل احسن کو (گورنری سے) مستعفی ہونے پر مجبور کر دیا گیا اور ان کی جگہ عقاب صفت جنرل ٹکا خان کا بطور گورنر تقرر کر دیا گیا۔

17 فروری کو کابینہ تحلیل کر دی گئی۔ 84 گھنٹوں کے اندر سابقہ وزرا سے نئی تشکیل دی گئی مشاورتی کونسل میں مشیر بننے کی پیشکش کی گئی۔ سوائے احسان الحق اور جسٹس کارنیلئس کے سب نے صدر کی اس پیشکش کو ٹھکرا دیا۔ مجیب کی بار بار دھمکیوں کے پیش نظر 13 فروری کو صدر نے اعلان کیا کہ اسمبلی کا اجلاس 3 مارچ کو ڈھاکہ میں ہوگا۔ بھٹو نے صدر کے اعلان کی پرزور مخالفت کی۔ انہوں نے کہا کہ جب تک ان کے اور شیخ مجیب کے درمیان آئین کے مسوّدے پر کوئی سمجھوتہ طے نہیں پا جاتا قومی اسمبلی کا اجلاس نہیں ہوگا۔ انہوں نے یہ دعویٰ بھی کیا کہ رولز آف بزنس کے حوالے سے بھی کسی سمجھوتے پر پہنچنا ہوگا۔ انہوں نے خبردار کیا کہ اگر ان کے مطالبات پورے نہ کیے گئے تو پورے مغربی پاکستان میں خیبر سے لے کر کراچی تک آگ بھڑک اٹھے گی۔ بھٹو اچھی طرح جانتے تھے کہ فوجی ٹولے میں اکثریت ان کے حق میں ہے۔ انہیں یہ بھی علم تھا کہ مجیب کے انکار سے صدر کی اپنی پوزیشن بھی کافی حد تک کمزور ہو چکی تھی۔ صدر اور مجیب کے درمیان مذاکرات کی ناکامی کے بعد حکمران فوجی ٹولے کے جنرلوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ آئین کے حوالے سے موجودہ سیاسی صورتِ حال میں وہ محض خاموش تماشائی نہیں رہ سکتے۔ ایک موقع پر انہوں نے جنرل یحییٰ کو اقتدار سے الگ کرنے اور ان کی جگہ جنرل حامد کو صدر مقرر کرنے کا فیصلہ بھی کر لیا تھا۔ لیکن جنرل یحییٰ کو جو ذمہ داریاں چین اور نکسن کی جانب سے دی گئی تھیں، ان کو مدِنظر رکھتے ہوئے یہ منصوبہ ختم کر دیا گیا اور جنرل یحییٰ کو صدر کے عہدے پر برقرار رکھنے کا فیصلہ کیا گیا۔ بھٹو کے شدید دباؤ کے نتیجے میں بے اختیار اور بے بس صدر کو یکم مارچ کو قومی نشریاتی رابطے پر 3 مارچ کو ڈھاکہ میں ہونے والے قومی اسمبلی کے اجلاس کو ملتوی کرنے کا اعلان کرنا پڑا۔ کہا جاتا ہے کہ صدر کی یہ تقریر بھٹو اور جنرل پیرزادہ نے مل کر تیار کی تھی۔ قومی اسمبلی کے اجلاس کے التوا کی خبر سن کر مشرقی پاکستان کے عوام غم و غصے سے پھٹ پڑے۔

25۔ تحریک عدم تعاون کی اپیل

اس کے جواب میں شیخ مجیب الرحمٰن نے اپنے عدم تعاون پروگرام کا اعلان کر دیا جس کے نتیجے میں مشرقی پاکستان میں تمام انتظامیہ شیخ مجیب کے قبضے میں آ گئی۔ عملی طور پر مغربی پاکستان میں مرکز کے ساتھ تمام تر مواصلات منقطع ہو چکے تھے۔ لیکن اس مرحلے پر صدر اور شیخ مجیب کے درمیان مواصلاتی رابطے ابھی تک قائم تھے۔ 7 مارچ کے عوامی جلسے سے پہلے صدر نے شیخ مجیب الرحمٰن سے ٹیلی فون پر لمبی بات کی جو خوشگوار اور پر جوش تھی۔ دونوں کا خیال تھا کہ صورتِ حال پر پرامن طریقے سے قابو پایا جائے۔ صدر نے مجیب کو خبردار کیا اور درخواست کی کہ وہ کوئی ایسا قدم نہ اٹھائیں جس سے پیچھے ہٹنا مشکل ہو جائے۔ جواب میں شیخ مجیب نے صدر کو ڈھاکہ آنے کی دعوت دی تاکہ وہ خود اس دھماکہ خیز صورتِ حال کا نظارہ کر سکیں جو مشرقی پاکستان میں پیدا ہو چکی تھی۔

7 مارچ کے تاریخی عوامی جلسے میں شیخ مجیب الرحمٰن نے آزادی کا اعلان نہ کیا۔ لیکن انہوں نے 25 مارچ کو ڈھاکہ میں قومی اسمبلی کا اجلاس بلانے کے حوالے سے چار نکاتی مطالبہ پیش کر دیا۔ انہوں نے اعلان کیا کہ ان مطالبات کو قومی اسمبلی میں شمولیت کے لیے پیشگی شرائط سمجھا جائے۔ ان کے مطالبات درج ذیل تھے:

1۔ مارشل لاء فوری طور پر اٹھایا جائے۔
2۔ فوج واپس بیرکوں میں چلی جائے۔
3۔ پولیس اور فوج کی کارروائی کے نتیجے میں جو ہلاکتیں ہوئی ہیں ان کی عدالتی تحقیقات کا حکم دیا جائے۔
4۔ اقتدار فوری طور پر منتقل کر دیا جائے۔

شیخ مجیب نے یہ بھی اعلان کیا کہ ان مطالبات کے تسلیم کیے جانے تک عدم تعاون کی تحریک جاری رہے گی۔ اس طرح 3 مارچ سے 25 مارچ تک شیخ مجیب کی زیر نگرانی ایک متوازی انتظامیہ وجود میں آ گئی جو اس باغیانہ سیاسی صورتِ حال میں حقیقی حکمران بن چکے تھے۔

15 مارچ کو صدرِ پاکستان کو بچانے کے لیے آخری کوشش کے طور پر ڈھاکہ آئے جس کی حالت ایک انتہائی نازک مریض کی ہو چکی تھی۔ اسی دوران شیخ مجیب نے اشتعال انگیز بیان دیا: ''مشرقی پاکستان کے عوام، سول بیوروکریٹس، دفاتر، عدالتوں اور فیکٹریوں کے کارکن، والدین اور طلبا پہلے ہی ثابت کر چکے ہیں کہ وہ ہتھیار ڈالنے کی بجائے جانوں کی قربانی دینے پر تیار ہیں۔ بنگالی عوام کی امنگوں اور آرزوؤں کو اب مزید دبایا نہیں جا سکتا۔ یہ تحریک اس وقت تک جاری رہے گی جب تک آزادی حاصل نہیں ہو جاتی۔'' انہوں نے بنگلہ دیش پر حکومت کرنے کے لیے 31 انتظامی احکام جاری کیے جن میں حکومتی اور نیم حکومتی دفاتر بند رہنے کے احکامات بھی شامل تھے، مغربی پاکستان کے ساتھ تمام رابطے اور مواصلات

منقطع کر دیئے گئے، صرف ٹیلی فون، ٹیلیکس اور وائرلیس کے ذرائع مواصلات کام کر رہے تھے۔ اس طرح آزادی کی تیاری نے عملی شکل اختیار کرنا شروع کر دی تھی۔

سوائے مسلح افواج کے تمام حکومتی ادارے شیخ مجیب کی ہدایات پر عمل کر رہے تھے۔ بیرونی نیوز ایجنسیاں بھی اپنے خیالات کا پرچار کر رہی تھیں۔ 9 مارچ کو ''ڈیلی ٹیلیگراف'' نے لکھا، ''یوں معلوم ہوتا ہے کہ شیخ مجیب نے عملی طور پر آزادی کا اعلان کر دیا ہے۔'' اس کے اداریے میں لکھا گیا، ''اس دوران سننے میں آیا ہے کہ آزاد مشرقی پاکستان کا نام بنگلہ دیش ہوگا۔ ایک مختلف قومی پرچم بھی تیار کر لیا گیا ہے۔'' 13 مارچ کو آکونومسٹ نے بھی ایسی ہی خبر شائع کی۔ 15 مارچ کو ''دی ٹائمز'' نے بھی اسی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھا، ''پاکستان آج مکمل تباہی کے دہانے پر کھڑا ہے۔'' اس دوران ہندوستانی حکومت نے انڈین ایئر لائنز کے جہاز کے اغوا کا بہانہ بناتے ہوئے اپنی فضائی حدود میں مغربی اور مشرقی پاکستان کے درمیان تمام پروازوں پر پابندی عائد کر دی۔ اس نازک صورتِ حال میں ہندوستان کی جانب سے اس قسم کا انتہائی فیصلہ بہت تشویش ناک تھا۔ پاکستان نے امریکہ اور انگلینڈ کی ثالثی کے ذریعے مدد کے لیے کوشش کی۔ روس سے بھی اس معاملے میں ثالثی کی درخواست کی گئی۔ لیکن ہندوستان کسی بھی تیسرے فریق کی ثالثی سے انکار کرتے ہوئے اپنے فیصلے پر سختی سے قائم رہا۔ بعد میں عدالتی تحقیقات سے یہ بات سامنے آئی کہ تمام کے تمام اغوا کنندگان مقبوضہ کشمیر سے تعلق رکھنے والے ہندوستانی انٹیلی جینس کے افراد تھے۔ شیخ مجیب نے ہندوستانی پابندی کی حمایت کی اور کہا، ''اغوا کا واقعہ فوجی ٹولے کا اقتدار منتقل نہ کرنے کا جواز مہیا کرنے کے لیے ایک گھناؤنا ہتھکنڈا ہے۔'' جب جنرل یحییٰ خان پورے خلوص اور سنجیدگی سے اقتدار کی منتقلی کا کوئی پرامن طریقہ تلاش کر رہے تھے، ایسے وقت میں شیخ مجیب کی جانب سے اس قسم کا بیان قابلِ افسوس تھا۔ مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان کے درمیان ہوائی رابطے کو منقطع کرنے کے ہندوستانی فیصلے کی حمایت نے حکمران فوجی ٹولے میں شامل جنرلوں میں شیخ مجیب کے بارے میں شکوک وشبہات کو مزید مضبوط کیا۔ بہت سے جنرل اس بات کے قائل ہو گئے کہ شیخ مجیب، ہندوستان کا چیلا ہے۔ اغوا کے بارے میں بھٹو کا بیان بھی غیر ذمہ دارانہ تھا۔ انہوں نے اغوا کنندگان کو پاکستانی قرار دیتے ہوئے انہیں قومی ہیرو کا درجہ دیا۔ مغربی اور مشرقی پاکستان کے دو اکثریتی رہنماؤں کا ہندوستانی منصوبے، جس نے پاکستان کی سالمیت اور خود مختاری کو خطرے میں ڈال دیا تھا، کے بارے میں رویہ ان کے سیاسی دیوالیہ پن کی نشاندہی کرتا تھا۔ قومی اسمبلی کے اجلاس اور آئین کے مسودے پر کسی سمجھوتے سے قبل مجیب کی جانب سے انتقالِ اقتدار کے مطالبے پر بھٹو کا ردِعمل بھی اتنا ہی افسوس ناک اور مایوس کن تھا۔

26۔ صدر کی متحدہ پاکستان کو بچانے کی آخری کوشش، بھٹو ان کے پیچھے ڈھاکہ پہنچے لیکن مذاکرات ناکام رہے

14 مارچ کو صدر آخری مرتبہ کسی حل کی تلاش کی کوشش میں ڈھاکہ روانہ ہوئے۔ بھٹو نے بیان

دیا: "اگر آئین پر سمجھوتے سے قبل انتقالِ اقتدار کی کوئی کوشش کی جاتی ہے تو پھر مغربی اور مشرقی پاکستان کے دونوں اکثریتی رہنماؤں کو علیحدہ علیحدہ اقتدار منتقل کیا جائے۔" اگلے روز ایک قدم مزید آگے بڑھتے ہوئے انہوں نے کہا: "موجودہ وقت میں اگر پاکستان کے دونوں حصوں میں جغرافیائی فرق کو مدِ نظر رکھا جاتا ہے تو پھر اکثریت کی بنیاد پر انتقالِ اقتدار کا اصول اپنا جواز کھو دیتا ہے۔" 15 مارچ کو صدر اس وقت ڈھاکہ پہنچے جب شیخ مجیب، مشرقی پاکستان کی آزادی کا تقریباً اعلان کر چکے تھے۔ دوسری جانب مغربی پاکستان میں بھٹو دو حکومتوں کے حق میں اپنے بیان کے حوالے سے ملک کی تقسیم کو تقریباً قبول کر چکے تھے۔ صدر یحییٰ خان اور چھوٹی پارٹیوں کے دوسرے رہنما اب بھی پاکستان کی سالمیت اور اتحاد کو بچانے کے لیے سنجیدہ کوششوں میں مصروف تھے۔ یحییٰ خان نے بھٹو سے ڈھاکہ آنے کی درخواست کی، بھٹو کا جواب تھا کہ وہاں جا کر مذاکرات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں جب کہ شیخ مجیب بالواسطہ طور پر پہلے ہی مشرقی پاکستان کی آزادی کا اعلان کر چکے ہیں۔ اس قسم کے بیانات سے یہ بات مکمل کر سامنے آ گئی تھی کہ بھٹو کے لیے اقتدار ملک کے حصے بخرے ہونے سے اہم تھا۔ وہ اور شیخ مجیب دونوں صرف اور صرف اقتدار کے بھوکے تھے۔ انہیں اس بات سے کوئی غرض نہ تھی کہ ملک اور قوم کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ اقتدار کی خاطر وہ بیرونی طاقتوں کی مداخلت قبول کرنے پر بھی تیار تھے۔

حکمران فوجی ٹولے نے جب کہ صدر ابھی ڈھاکہ میں ہی تھے: "امکانی منصوبے" پر کام کرنا شروع کر دیا۔ منصوبے کے مطابق مغربی پاکستان سے فوجی یونٹیں ہوائی جہازوں کے ذریعے کولمبو کے راستے مشرقی پاکستان بھیجنا شروع کر دی گئی تھیں تا کہ طاقت میں اضافے کے جاری عمل میں تیزی پیدا کی جا سکے۔ ہندوستان کی حکومت نے کولمبو کے راستے مغربی اور مشرقی پاکستان کے درمیان رابطے کو منقطع کروانے کے لیے کولمبو حکومت پر دباؤ ڈالنا شروع کیا، لیکن اسے کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ کولمبو حکومت نے اس دباؤ کے سامنے جھکنے سے انکار کر دیا۔ ڈھاکہ کی زمین پر قدم رکھتے ہی صدر محسوس کر رہے تھے کہ صورتِ حال میں بہت بڑی تبدیلی آ چکی تھی۔ انہیں یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کسی اجنبی زمین پر کھڑے ہوں۔ یہ اب جانا پہچانا مشرقی پاکستان نہیں تھا۔ تاہم اس معاندانہ صورتِ حال میں صدر اور شیخ مجیب کے درمیان پہلی ملاقات 16 مارچ کو ہوئی۔ اس دن 11 بجے صبح شیخ مجیب صدر سے ملاقات کے لیے ایوانِ صدر میں پہنچے۔ ان کی کار پر ایک سیاہ جھنڈا لہرا رہا تھا۔ یہ ان شہیدوں کی یاد میں تھا جو ایک ہفتہ قبل پولیس فائرنگ میں مارے گئے تھے۔ ملاقات میں شیخ مجیب نے فوری انتقالِ اقتدار اور مارشل لاء اٹھانے کا مطالبہ کیا۔ انہوں نے اپنا چار نکاتی مطالبہ بھی صدر کو پیش کیا۔ اس صورتِ حال میں اس مسودے کی بنیادوں پر مذاکرات کا کوئی امکان موجود نہیں تھا، جو صدر نے 1969-70ء میں انتقالِ اقتدار کے حوالے سے تیار کیا تھا۔ لہٰذا صدر کے سامنے صرف دو راستے تھے۔

پہلا، بنگلہ دیش کی آزادی کو قبول کرنا۔

دوسرا، شیخ مجیب کے خلاف غداری کے حوالے سے مناسب کارروائی کرنا۔

لیکن ان حالات میں کسی قسم کی فوجی کارروائی سے نہ صرف انسانی جانوں کے اتلاف کے امکانات تھے بلکہ یہ بھی پوری طرح واضح نہ تھا کہ اس کے حتمی نتائج کیا نکلیں گے۔ اس قسم کی صورتِ حال میں کوئی فیصلہ کرنا بہت مشکل ہو چکا تھا۔ حکمران ٹولے کے عقاب صفت جرنیلوں نے خیال کیا کہ وہ بنگالیوں کی بغاوت کو بندوق کے زور پر 72 گھنٹوں کے اندر کچل سکتے ہیں۔ اس قسم کے خیالات کا موجب 1969ء میں کامیاب مارشل لاء کا نفاذ تھا۔ لیکن وہ بھول گئے تھے کہ اس وقت مشرقی پاکستان کے عوام نے مارشل لاء کو اس لیے قبول کر لیا تھا کیوں کہ فوجی ٹولے نے جلد سے جلد ممکنہ عرصے میں اقتدار منتخب حکومت کے حوالے کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ 1971ء تک صورتِ حال میں بہت بڑی تبدیلی آ چکی تھی۔ بنگالی قوم پرستی عروج پر تھی۔ خودمختاری کے مطالبے نے پورے مشرقی پاکستان میں ایک بے تاب عوامی تحریک پیدا کر دی تھی۔ یحییٰ خان نے شیخ مجیب الرحمٰن سے مخاصمت کا راستہ اختیار نہ کرنے کی پرزور اپیلیں کیں۔ ملاقات کے دوران شیخ مجیب متذبذب نظر آ رہے تھے۔ وہ ان حتمی نتائج کے بارے میں خدشات کا شکار تھے، جو برآمد ہو سکتے تھے۔ اگرچہ وہ انقلابی نعرے لگا رہے تھے لیکن باطنی طور پر مجیب موقع پرست کردار کے حامل کمزور اور بزدل سیاستدان تھے۔ اس وقت جب یحییٰ خان اور شیخ مجیب ناممکن کو ممکن بنانے کی کوشش میں مصروف تھے، عقاب صفت جنرل مشرقی پاکستان میں فوجی کارروائی کی منصوبہ بندی کر رہے تھے۔

20 مارچ کو اخبارات میں یہ بات سامنے آئی کہ صدر اور شیخ مجیب کے درمیان چھ نکات، مارشل لاء کے اٹھائے جانے اور انتقالِ اقتدار کے لیے ایک مصالحتی سمجھوتہ تلاش کر لیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں کیے جانے والے اعلان کے مسوّدے کو بھی آخری شکل دے دی گئی تھی جس کے مطابق مرکزی اور صوبائی دونوں حکومتوں کے لیے کابینہ کے ارکان منتخب ارکان سے لیے جائیں گے۔ قومی اسمبلی کو دو کمیشنوں میں تقسیم کر دیا جائے گا۔ یہ دونوں کمیشن مشرقی اور مغربی پاکستان کے عوامی مطالبات کی روشنی میں قوانین وضع کریں گے، جو آئین کا حصہ بن جائیں گے۔ اس بنیاد پر اسمبلی کے اجلاس میں قوم کے لیے نیا آئین تشکیل دیا جائے گا۔ اس مسوّدہ اعلان میں مرکز اور مشرقی پاکستان کے تعلقات کا تعین اس آئینی مسوّدے کی بنیاد پر کیا گیا تھا جو جی ڈبلیو چوہدری نے جنوری 1971ء میں پیش کیا تھا۔ مسوّدے میں پاکستان کے اتحاد کو برقرار رکھتے ہوئے شیخ مجیب کے چھ نکات کے زیادہ تر حصوں کو شامل کر لیا گیا تھا۔ لیکن حکمران ٹولے کے زیادہ تر جنرل ابتدا ہی سے مسوّدہ اعلان کے بارے میں منفی روّیہ رکھتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ صدر کو یہ مسوّدہ اعلان دباؤ کے تحت تیار کرنا پڑا تھا، لہٰذا یہ ان کے لیے قابل قبول نہیں ہے۔ ان جرنیلوں کی اس قسم کی ذہنیت اور لاعلمی قوم کے لیے تباہی و بربادی کا باعث بن گئی۔

آئیے ڈھاکہ مذاکرات کی جانب واپس جاتے ہیں۔ مسوّدہ اعلان کی تیاری کے لیے ہر روز صبح و شام اجلاس ہو رہے تھے۔ یہ مذاکرات دو سطحوں پر صدر اور شیخ مجیب الرحمٰن کے درمیان اور دونوں اطراف کے ماہرین کے درمیان ہو رہے تھے۔ صدر کے پینل کے ماہرین میں جسٹس کارنیلئس، جنرل پیرزادہ اور ایم ایم

احمد شامل تھے۔ چوتھے ممبر کرنل حسن تھے۔ فوجی ٹولے کے طاقتور ارکان جنرل حامد، جنرل گل حسن، جنرل عمر، جنرل مٹھا اور چند دوسرے بھی اس وقت ڈھاکہ میں موجود تھے۔ وہ اپنے درمیان اور صدر کے ساتھ روز بہ روز کی سیاسی پیش رفتوں پر بات چیت کرنے کے لیے باقاعدہ اجلاس کر رہے تھے۔ وہ معاشی میدان میں مرکزی اور صوبائی تعلقات اور دوسرے متعلقہ امور کے بارے میں گفت وشنید کرتے تھے۔ کرنل حسن کے مطابق، ''جب صدر کسی مصالحتی حل پر پہنچنے کے لیے مایوسی کے عالم میں یکے بعد دیگرے مجیب الرحمٰن کے مطالبات کو تسلیم کر رہے تھے تو جرنیلوں نے صدر کو متنبہ کیا کہ ''اگر انہوں نے مرکزی حکومت کمزور کرنے کے لیے کوئی رعایت دی تو اس کے سنگین نتائج کے وہ خود ذمہ دار ہوں گے۔'' پاکستانی فوج کے مغرور جرنیل یہ سمجھتے تھے کہ قوم کی عزت وتوقیر کو قائم رکھنے کے وہ واحد ذمہ دار ہیں۔ 1958ء سے جب جنرل ایوب خان نے اقتدار پر قبضہ کیا تھا، فوج اور جرنیلوں نے اپنے آپ کو پوری قوم کا واحد نگران خیال کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ سیاستدانوں کو افسوس کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ لیکن ان میں کچھ استثنیٰ بھی تھا۔ مسلح افواج میں بہت سے لوگ اس نازک سیاسی صورتِ حال کا ایسا سیاسی حل چاہتے تھے جو مشرقی اور مغربی پاکستان دونوں کے عوام کے لیے قابلِ قبول ہو۔

اس وقت مسلح افواج اور مغربی پاکستان کے عوام کا ایک اکثریتی حصہ شیخ مجیب الرحمٰن کو بطور وزیر اعظم قبول کرنے کے لیے تیار تھا، بہ شرط یہ کہ وہ پاکستان کی علاقائی سالمیت کو برقرار رکھیں۔ اسی طرح مشرقی پاکستان کے عوام بھی پاکستان کو توڑنے کے حق میں نہیں تھے۔ ان کا مطالبہ حقیقی خودمختاری کا تھا۔ انہوں نے صرف معاشی تفاوت کے خلاف آواز اٹھائی تھی اور بہتر روزگار کی خاطر غیر منصفانہ استحصال کا خاتمہ چاہتے تھے۔ لیکن عام لوگوں کی رائے اس وقت کوئی وزن نہیں رکھتی تھی۔ پاکستان کے مقدر کا انحصار اس وقت واضح طور پر صرف دو رہنماؤں پر تھا، مغربی پاکستان میں یہ ذوالفقار علی بھٹو تھے اور مشرقی پاکستان میں شیخ مجیب الرحمٰن تھے۔ لیکن جاہ وثروت کے طالب یہ دونوں رہنما اس وقت محض اقتدار کے حصول میں اندھے ہو رہے تھے جو انہیں قومی مفاد سے بھی زیادہ عزیز تھا۔ 1970ء کے انتخابات کے بعد قومی پالیسیوں کے بارے میں فیصلہ کرنے کے لیے عوامی لیگ کا پہلا عظیم جلسہ 3 جنوری کو ریس کورس میں ہوا۔ اس دن شیخ مجیب نے خود اپنی پارٹی کے منتخب قومی اور صوبائی اسمبلی کے ممبران سے حلف لیا۔ اس حلف کے آخری الفاظ ''جے بنگلہ، جے پاکستان'' تھے۔ (روزنامہ ڈینک پاکستان، 4 جنوری 1971ء)

روزنامہ ''ڈینک پاکستان'' نے جو رپورٹ شائع کی، وہ یہ تھی: ''شیخ مجیب نے لوگوں سے اپیل کی کہ جمہوری فتح کے فوائد کو مستحکم کرنے کے لیے اور ملک میں چاروں طرف امن وامان قائم رکھنے کے لیے اور اشتعال انگیزی پھیلانے والے ایجنٹوں کی کارروائیوں کو دبانے کے لیے اپنی آنکھیں کھلی رکھیں۔ انہوں نے عوامی لیگ کو اردگرد ہر جگہ ہر یونین میں منظم کرنے کی ہدایت کی تاکہ ان عناصر کا خاتمہ کیا جاسکے جو رات کے اندھیرے میں پیچھے سے خنجر گھونپ کر عوام کو مار ڈالتے ہیں۔ انہوں نے ان عناصر سے لڑنے کے لیے تیاری

کرنے کو کہا۔ انہوں نے ان انقلابیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، جو رات کو حملے کرتے تھے، کہا کہ رات کے اندھیروں میں لوگوں کو قتل کرنے سے انقلاب نہیں آیا کرتے۔ ڈاکو اور چور انقلاب نہیں لا سکتے۔ انہوں نے عوام کو بانس کی لاٹھیاں اور سُندری لکڑی کے ڈنڈے تیار کرنے کا مشورہ دیا اور کہا کہ ''میں ان میں سے ہر ایک ہاتھ میں بانس کی لاٹھیاں یا سُندری کے ڈنڈے دیکھنا چاہتا ہوں۔'' اوّل ''جئے پاکستان'' کا نعرہ مارتے ہوئے پاکستان کے ساتھ اپنی حمایت کا اظہار کیا۔ دوسرے، انقلابیوں کے بارے میں اُن کی بات پاکستان کے ساتھ ان کی وفاداری کو ظاہر کرتی ہے کیوں کہ انقلابی، جنہوں نے ایک آزاد مشرقی پاکستان کے قیام کے لیے مسلح جدوجہد کے پروگرام کا اعلان کر رکھا تھا، شیخ مجیب انہیں دہشت گرد یا اشتعال انگیزی پھیلانے والے ایجنٹ خیال کرتے تھے اور انہوں نے ان دہشت گردوں کو ختم کرنے کے لیے بانس کی لاٹھیوں اور شندری کے ڈنڈوں کے بڑے پیمانے پر بندوبست کرنے کی اپیل کی تھی۔ اس تقریر میں شیخ مجیب نے اپنے وعدے پر قائم رہنے پر صدر کا بھی شکریہ ادا کیا تھا۔ اس دن کے ''پاکستان آبزرور'' نے رپورٹ شائع کی، ''شیخ مجیب نے صدر کا شکریہ ادا کیا کہ انہوں نے اپنے انتخاب کرانے کے وعدے کو پورا کر دیا ہے۔ تاہم انہوں نے کہا کہ ان کے ماتحتوں میں سے ایک طبقہ ہے جو اب انتخابات کے نتائج کو ختم کرنے کی سازشیں کر رہا ہے۔''

معاملہ بالکل صاف تھا۔ مجیب کی مبارک باد بالکل درست تھی اور یحییٰ خاں فوری طور پر حکامات میں منتخب نمائندگان کو انتقالِ اقتدار کے بارے میں اپنی سنجیدگی اور خلوص کو ثابت کر دیا تھا۔ انہوں نے حکم دیا کہ قومی اسمبلی کا اجلاس ڈھاکہ میں 3 مارچ کو منعقد ہو گا۔ 22 فروری کو انہوں نے اپنی کابینہ تحلیل کر دی۔ 28 فروری کو شیخ مجیب نے پورے مشرقی پاکستان کے عوام کو حیران اور ششدر کر دیا اور اعلان کیا، ''چھ نکات کسی پر بھی ٹھونسے نہیں جائیں گے۔'' (ڈان، یکم مارچ 1971ء) یہاں یہ ذکر کر دینا اہمیت کا حامل ہو گا کہ ''ڈان'' کا مالک بدنام زمانہ 22 خاندانوں میں سے ایک ہارون خاندان تھا۔ شیخ مجیب الرحمٰن، ہارون خاندان کے ایک ادارے ''الفا انشورنش کمپنی'' میں ملازم تھے اور بغیر کوئی کام کیے ایک بھاری تنخواہ وصول کر رہے تھے۔ تاہم چھ نکات کے بارے میں شیخ مجیب کے بیانات نے نہ صرف افواج میں موجود بہت سے افراد اور ان لوگوں کی توقعات پر پانی پھیر دیا جو تحریک کے لیے سرگرم تھے بلکہ یہ اس بات کے بھی غماز تھے کہ مغربی پاکستان کے عوام میں بھی مقبولیت حاصل کرنے کے لیے سرتوڑ کوشش کر رہے تھے۔ دوسرے الفاظ میں، یہ بیانات پاکستان کے وزیر اعظم کے طور پر اقتدار حاصل کرنے کی تیاریوں سے پوری طرح ہم آہنگ تھے۔

دوسری جانب بھٹو نے صدر کے 13 فروری کے اعلان کی بڑی شدت سے مخالفت کی۔ انہوں نے متنبہ کیا، ''اگر مغربی پاکستان سے کسی منتخب نمائندے نے قومی اسمبلی کے ہونے والے سیشن میں شرکت کے لیے ڈھاکہ جانے کی کوشش کی تو اس کی ٹانگیں چیر دی جائیں گی۔'' بھٹو کی جانب سے اس قسم کی شدید مخالفت کے پیش نظر صدر اپنی یکم مارچ کی تقریر میں سیشن کو ملتوی کرنے پر مجبور ہو گئے۔ اس اعلان کے خلاف مشرقی پاکستان میں جو ردّ عمل پیدا ہوا، وہ محض آزاد بنگلہ دیش کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ 2 مارچ کو مسٹر اے ایس

ایم رب نے طلبا اور نوجوانوں کی جانب سے ڈھاکہ یونیورسٹی میں آزاد بنگلہ دیش کا پرچم لہرایا۔ شیخ مجیب نے اس پر طالب علم رہنماؤں کی جھاڑ جھپٹ کی، اس بات کی گواہی دینے والے بہت سے عینی شاہد آج بھی موجود ہیں۔ 3 مارچ کو پلٹن میدان میں چترا لیگ کے اجلاس میں، چترا لیگ کے جنرل سیکریٹری مسٹر شاہ جہاں سراج نے ''اعلانِ آزادی'' پڑھا۔ اس نے اعلان کیا کہ جلسے کے بعد شیخ مجیب جلوس کی قیادت کریں گے۔

لیکن بعد میں شیخ مجیب نے خود اس اعلان کو منسوخ کیا۔ انہوں نے طلبا رہنماؤں کو اس وقت کے آئی جی تسلیم الدین کا حوالہ دیتے ہوئے بتایا کہ اگر انہوں نے جلوس کی قیادت کا فیصلہ کیا تو فوجی حکمران ٹولے نے پہلے سے ہی انہیں قتل کروانے کا منصوبہ تیار کر رکھا ہے۔ یہ ایک بہت زیرک فیصلہ تھا۔ کیا حقیقت میں ان کی زندگی کو خطرہ تھا جو انہوں نے جلوس کی قیادت سے انکار کیا یا ''اعلانِ آزادی'' کا پڑھا جانا ان کے اس فیصلے کی اصل وجہ تھی، اس پر غور کی ضرورت ہے۔

7 مارچ کو ریس کورس میں ایک بہت بڑے عوامی جلسے میں شیخ مجیب نے تقریر کی، انہوں نے کہا، ''ہماری یہ جدوجہد نجات کے لیے جدوجہد ہے۔ یہ جدوجہد ہماری آزادی کے لیے جدوجہد ہے۔'' لیکن تقریر کے آخر میں انہوں نے یہ نعرہ بلند کیا، ''جوائے بنگلہ، جوائے پنجاب، جوائے سندھ، جوائے بلوچستان، جوائے فرنٹیئر، جوائے پاکستان۔'' کیا عوامی لیگ کے پاس شیخ مجیب کی ایسی تقریر کو، جس کے آخر میں یہ الفاظ کہے گئے، حتمی اعلانِ آزادی قرار دینے کا کوئی جواز موجود ہے؟ میں اس بات کا فیصلہ اپنے ہم وطنوں پر چھوڑتا ہوں۔ یہ بات حیران کن ہے کہ ''شادھنتر یودھر اتہاس دالیل پترا'' (تاریخ جنگ آزادی) کے نام سے شائع ہونے والی کتاب میں یہ نعرے حذف کر دیئے گئے ہیں۔ اس کے پیچھے کیا راز ہے؟ لیکن شیخ مجیب نے اس دن اپنی تقریر کا اختتام ان الفاظ سے کیا، یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو اخبارات کے صفحوں پر موجود ہے اور ایسے لوگ ابھی تک زندہ ہیں جو اُس وقت وہاں موجود تھے اور اس بات کی تصدیق کرتے ہیں۔ 14 مارچ کو شیخ مجیب نے اعلان کیا کہ وہ صدر جنرل محمد یحییٰ خان سے بات چیت کرنے کے لیے تیار ہیں۔ اس اعلان کے فوراً بعد 15 مارچ کو جنرل یحییٰ خان، ڈھاکہ پہنچ گئے اور 16 مارچ کو 11 بجے صبح صدر اور شیخ مجیب کے درمیان ڈیڑھ گھنٹے کی بند دروازے کے پیچھے پوری تنہائی میں ملاقات ہوئی۔ اس میں کوئی معاون موجود نہ تھا۔ 17 مارچ کو اس قسم کی ایک دوسری خصوصی اور دوستانہ ملاقات ہوئی اس میں بھی کوئی معاون موجود نہ تھا۔ صدر اور شیخ مجیب کے درمیان تیسری بند کمرہ ملاقات 19 مارچ جمعہ کے روز ہوئی۔ اسی دن رات کو دونوں اطراف سے تین تین مشیروں کی علیحدہ ملاقات ہوئی۔ 20 مارچ کو شیخ مجیب ایوانِ صدر پہنچے۔ اُن کے ساتھ ان کے قریبی ساتھی تھے اور صدر سے 130 منٹ تک بات چیت کرتے رہے۔ اس ملاقات کے بعد انہوں نے اپنی رہائش گاہ پر ایک پریس کانفرنس میں کہا، ''بات چیت میں کچھ پیش رفت ہوئی ہے۔'' انہوں نے یہ بھی کہا، ''ہم قومی بحران کو ختم کرنے کی جانب بڑھ رہے ہیں۔'' ان ملاقاتوں کے بعد مشرقی پاکستان میں اخبارات نے رپورٹ دی کہ صدر اور شیخ مجیب الرحمٰن کے درمیان کوئی اہم اور وسیع مفاہمت ہو چکی ہے۔ اس سلسلے میں ''ڈان'' نے پی

پی پی کے ایک ذریعے کے حوالے سے شائع کیا: ''مسٹر بھٹو سوموار کو اپنی پارٹی کے اہم ارکان کے ساتھ پوری رات اس بات کا جائزہ لیتے رہے کہ صدر یحییٰ اور مجیب الرحمٰن کے درمیان ملک کے موجودہ سیاسی بحران کے خاتمے کے لیے ہونے والی مفاہمت کی کیا شرائط ہوسکتی ہیں۔'' (ڈان، 25 مارچ 1971ء)

اس وقت تک شیخ مجیب اور ان کی عوامی لیگ نے واضح طور پر کچھ نہیں بتایا تھا کہ صدر اور شیخ مجیب کے درمیان کیا معاہدہ طے پایا تھا۔ لوگوں کو اس بارے میں اندھیرے میں کیوں رکھا گیا؟ 25 مارچ کو اپنی گرفتاری سے فوراً پہلے شیخ مجیب نے ایک فرانسیسی اخبار ''لاموندے'' کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا: ''کیا پاکستان کی حکومت کو اس بات کا علم نہیں ہے کہ مشرقی پاکستان کو صرف میری ذات ہی کمیونسٹوں سے بچا سکتی ہے؟'' دوسرے الفاظ میں وہ یہ اشارے دے رہے تھے کہ یہ وہ نہیں بلکہ کمیونسٹ ہیں جو پاکستان کو توڑنے کی کوشش کر رہے ہیں، لہٰذا اب سوائے اس کے کہ ملک کو بچانے کے لیے انہیں اقتدار سونپ دیا جائے اور کوئی دوسرا متبادل موجود نہیں ہے۔ یہ انٹرویو ''لاموندے'' میں 31 مارچ 1971ء کو شائع ہوا۔ 25 مارچ کو رات تقریباً ساڑھے گیارہ بجے پاکستان کی فوج شہر میں داخل ہوگئی۔ اس دوران شیخ مجیب پہلے ہی اپنے ساتھیوں کو بھاگ جانے اور اپنی جانیں بچانے کی ہدایت دے چکے تھے۔ انہوں نے اپنے خاندان کے افراد اور گھریلو گائے کو بھی محفوظ مقام پر پہنچا دیا تھا۔ حتیٰ کہ ان کے جانے پہچانے باڈی گارڈز بھی ساڑھے دس کے بعد سے ان کی رہائش گاہ روڈ نمبر 32 پر نظر نہیں آ رہے تھے۔ فوج نے اپنی کارروائی کا آغاز کر دیا تھا۔ راجہ باغ پولیس لائن، فیل خانہ پی ڈی آر ہیڈ کوارٹرز، ڈھاکہ یونیورسٹی کے علاقوں پر دھاوے بولے گئے اور تقریباً آدھی رات کو شیخ مجیب کو ان کی رہائش گاہ روڈ نمبر 32 سے اٹھا کر دھان منڈی پہنچا دیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وحشیانہ اور بے رحمانہ نسل کشی کا کام شروع ہوگیا۔

جنگ آزادی کے تمام مہینوں میں بیگم فضیلت النساء (شیخ مجیب الرحمٰن کی بیوی)، شیخ حسینہ، شیخ ریحانہ اور خاندان کے دوسرے افراد حکومتِ پاکستان کی میزبانی کو قبول کرتے ہوئے پرلطف اور محفوظ زندگی بسر کر رہے تھے۔ ان کی زندگی پرامن اور معمول کے مطابق بسر ہو رہی تھی۔ شیخ مجیب کے والد اور والدہ کا پی جی ہسپتال میں علاج ہو رہا تھا اور بیگم مجیب اور شیخ حسینہ ہسپتال میں باقاعدگی سے ان سے ملاقات کے لیے آتی تھیں۔ وہ ہسپتال میں رات بھی رہ سکتی تھیں۔ اگر مندرجہ بالا حقائق کا احتیاط کے ساتھ تجزیہ کیا جائے تو ایک بات بہت واضح ہو جاتی ہے کہ 7 مارچ 1971ء کو ایک بالواسطہ اشارے کے علاوہ شیخ مجیب نے 3 جنوری اور 25 مارچ 1971ء کے درمیانی عرصے میں پاکستان کی علاقائی سلامتی کے حوالے سے کوئی بات کی تھی اور نہ ہی کوئی پوزیشن لی تھی۔ واحد استثنیٰ ان کی صدر یحییٰ کے ساتھ 21 مارچ 1971ء والی ملاقات تھی۔ شیخ مجیب کے مشیروں میں تاج الدین، نذر السلام، مشتاق احمد، قمر الزمان اور منصور علی تھے، جو عوامی لیگ کی پہلی صف کے رہنماؤں میں سے تھے۔ آئینی معاملات میں اہم مشیر ڈاکٹر کمال حسین تھے۔ معروف ماہرین معاشیات کی ایک معقول تعداد بھی مدد کے لیے موجود تھی۔ اگرچہ انہوں نے براہِ راست مذاکرات میں حصہ نہیں لیا تھا لیکن

انہوں نے غیر لچکدار مطالبات کے بارے میں کمل کر باتیں کی تھیں۔ کچھ غیر ملکی ماہرین معاشیات جن کی پشت پناہی فورڈ فاؤنڈیشن کر رہی تھی، ان کی مدد کے لیے حاضر تھے۔ صدر اور شیخ مجیب کے درمیان ملاقاتیں 22 مارچ تک جاری رہیں۔ اس وقت تک چھوٹی پارٹیوں کے رہنما بھی ڈھاکہ پہنچ چکے تھے۔ 21 مارچ کو بھٹو اپنے پارٹی رہنماؤں کے ساتھ ڈھاکہ پہنچے۔ بھٹو یہ سوچ کر فوراً ڈھاکہ پہنچے تھے کہ صدر اور شیخ مجیب کے درمیان ایک سمجھوتے کا ہونا ناگزیر تھا۔ مغربی پاکستان کے اکثریتی رہنما ہونے کی حیثیت سے ان کی موجودگی بلاشبہ بہت اہم اور ضروری تھی۔ اس لیے بھٹو کا وہاں پہنچنا سیاسی مبصرین کی نگاہ میں مثبت اثرات کا حامل خیال کیا جا رہا تھا۔

لیکن واقعات جو ظہور پذیر ہوئے، انہوں نے اس کے برعکس ثابت کیا۔ ڈھاکہ پہنچنے کے فوراً بعد انہوں نے صدر کے مسودہ اعلان کی شدید مخالفت کی۔ انہوں نے دعویٰ کیا کہ اگر قومی اسمبلی کے اجلاس سے پہلے مارشل لاء ختم کر دیا گیا اور اقتدار منتقل کر دیا گیا تو پھر آئینی خلا پیدا ہو جائے گا۔ اس کے نتیجے میں، آئینی خلا کے پیش نظر مسودہ اعلان خود بخود کالعدم ہو جائے گا۔ لہٰذا انہوں نے مطالبہ کیا کہ ہر کام قومی اسمبلی کی باقاعدہ منظوری حاصل کر کے کیا جائے۔ بھٹو کے اس قسم کے منفی رویے اور سرگرمیوں نے نہ صرف کسی سمجھوتے پر پہنچنے کے عمل میں رکاوٹ ڈالی بلکہ صورتِ حال کو تعطل کا شکار کر دیا۔ تاہم صدر کے کہنے پر 22 مارچ کو ان کے، شیخ مجیب اور بھٹو کے درمیان ایک اجلاس کا انتظام کیا گیا۔ اس اجلاس سے صرف ایک دن پہلے ایک مایوس کن واقعہ رونما ہوا۔ اچانک شیخ مجیب نے صدر سے ملاقات کی درخواست کی، صدر سے مثبت جواب ملنے کے بعد شیخ مجیب، تاج الدین کے ساتھ ایوانِ صدر میں آئے۔ اس ملاقات میں شیخ مجیب نے بالکل غیر متوقع طور پر صدر کو آگاہ کیا کہ عوامی لیگ چاہتی ہے کہ اقتدار مشرقی اور مغربی پاکستان کی دونوں اکثریتی پارٹیوں کو علیحدہ علیحدہ سونپ دیا جائے۔ انہوں نے مزید کہا کہ موجودہ صورتِ حال میں وہ قومی اور صوبائی حکومتیں تشکیل دینے کے قابل نہیں ہیں۔ اس کا مطلب تھا کہ انہوں نے باضابطہ طور پر ملک کو دو حصوں، مغربی پاکستان اور بنگلہ دیش میں تقسیم کرنے کا انتخاب کر لیا تھا۔ صدر اُن کی اس تجویز پر مکمل طور پر مایوس ہو گئے تھے۔ انہوں نے شیخ مجیب سے اپنی تجویز واپس لینے کی درخواست کی۔ انہوں نے اُن کو یاد دلایا کہ وہ اقتدار منتخب نمائندوں کو منتقل کرنے کے قوم سے کیے گئے وعدے کے پابند ہیں اور سربراہِ مملکت کے طور پر ان کے پاس ملک کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ انہوں نے شیخ مجیب کو متنبہ کیا کہ ان کی طرف سے علیحدگی کے کسی بھی قدم کے خلاف آہنی ہاتھوں سے نمٹا جائے گا۔ اس طرح اعتماد، بھروسے اور مفاہمت کی جو فضا ان دونوں کے درمیان اس دوران میں پیدا ہوئی تھی، 21 مارچ کی اس فیصلہ کن ملاقات میں تحلیل ہو گئی۔ مزید مذاکرات بے کار تھے۔

یہاں ایک بہت دلچسپ سوال جنم لیتا ہے کہ شیخ مجیب نے اچانک کیوں مکمل 180 ڈگری کا موڑ لیا اور اس قدر مختلف پوزیشن اختیار کر لی؟ یہ وہی شخص تھا جو اب تک فوجی حکمران ٹولے کو یقین دلا تا رہا تھا کہ اس

کی پالیسی پاکستان کو توڑنے کی نہیں ہے۔ 1970ء کے انتخابات میں انہوں نے لوگوں سے اس وعدے پر ووٹ لیے تھے کہ "پاکستان قائم رہنے کے لیے بنایا گیا تھا۔ کوئی طاقت بھی پاکستان کو تباہ کرنے کے قابل نہیں ہے۔" (شیخ مجیب کا عوامی جلسوں میں بیان، بنگلہ دیش دستاویزات) شیخ مجیب اچھی طرح جانتے تھے کہ فوجی حکمران ٹولہ، پاکستان کی علاقائی سالمیت پر کسی قسم کا سمجھوتہ نہیں کرے گا۔ وہ اپنی پوری طاقت سے اس کی مخالفت کرے گا اور نتیجہ بہت خوفناک نکلے گا۔

اگر ہم حالات کا محتاط تجزیہ کریں تو پتا چلتا ہے کہ یہ قریبی تعلقات ہارون خاندان کے ساتھ گہری دوستی کے نتیجے میں مزید مضبوط ہوئے۔ 1958ء میں جب ایوب خان نے اقتدار پر قبضہ کیا تو ان لوگوں میں جنہیں بدعنوانیوں کی بنا پر سرعام کوڑے مارے گئے، ہارون خاندان کا ایک شخص بھی شامل تھا۔ نہ صرف یہ کہ خاندان کے سربراہ یوسف ہارون کو ایک لمبے عرصے تک، جب بھٹو وزیر خارجہ تھے، جلاوطنی کی زندگی بسر کرنا پڑی بلکہ انہیں سی آئی اے کا ایجنٹ بھی قرار دیا گیا۔ ایوب خان نے خود بھی امریکہ کی خاموش رضامندی اور مدد سے اقتدار پر قبضہ کیا تھا۔ لیکن 1965ء کی جنگ کے دوران امریکہ کا رویہ پاکستان کا اہم فوجی اتحادی ہونے کی حیثیت سے تسلی بخش نہ تھا۔ ایوب خان نے اس معاملے میں اپنی ناراضی کا اظہار کرتے ہوئے امریکہ کے اہم دشمن عوامی جمہوریہ چین سے تعلقات بڑھانے کے لیے فوری اقدامات کیے۔ ایوب خان کے اس توہین آمیز رویے کو امریکی مفادات کے خلاف خیال کرتے ہوئے امریکہ نے ایوب مخالف سازش میں عملی طور پر حصہ لینا شروع کر دیا۔ اس سازش میں الفا انشورنس کے تنخواہ دار ممبر شیخ مجیب اور ناراض ہارون خاندان کو شامل کیا گیا۔ 1966ء کے چھے نکات اسی سازش کا حصہ تھے۔

اگرچہ چھے نکات اپنی نوعیت میں بہت زیادہ شدت پسندانہ نظر آتے تھے، شیخ مجیب الرحمٰن نے انہیں ظاہری طور پر کبھی بھی پاکستان کو توڑنے کے لیے استعمال نہیں کیا تھا۔ حتیٰ کہ اُن لمحات میں بھی جب پاکستان کی سالمیت خطرے میں نظر آ رہی تھی، شیخ مجیب پاکستان کے اتحاد کے حامی تھے۔ بنیادی طور پر وہ انہیں انتخابات جیتنے کے لیے استعمال کر رہے تھے۔ حقیقت میں چھے نکات کو امریکہ کی حمایت حاصل تھی جس کا مقصد پاکستان کو توڑنا نہیں بلکہ صرف ایوب خان کو سبق سکھانا تھا۔ امریکہ نے کبھی بھی پاکستان کو توڑنے کی کسی تحریک کی حمایت نہیں کی تھی، یہاں تک کہ اس وقت کے امریکی سفیر جے فارلینڈ نے شیخ مجیب کو اس سلسلے میں خاص طور پر متنبہ کیا تھا۔ ان پُر ہنگام دنوں میں 7 مارچ کو امریکی سفیر ڈھاکہ آیا اور شیخ مجیب سے دو مرتبہ خفیہ ملاقاتیں کیں جو بوڑھی گنگا میں ایک کشتی میں تفریحی سیر کے دوران کی گئیں۔ ان ملاقاتوں کے بارے میں جی ڈبلیو چوہدری نے "متحدہ پاکستان کے آخری دن" میں ذکر کیا ہے، "مارچ کے مہینے میں امریکی سفیر جے فارلینڈ، ڈھاکہ آیا اور شیخ مجیب کو واضح الفاظ میں بتایا کہ امریکہ موجودہ بحران کو پاکستان کا داخلی معاملہ خیال کرتا ہے اور اس سلسلے میں شیخ مجیب کو امریکہ کی جانب سے کسی ایسی حمایت یا مدد کی توقع نہیں رکھنی چاہیے جو پاکستان کے مفادات کے خلاف جاتی ہو۔"

ان تمام حقائق سے بہ خوبی آگاہ ہوتے ہوئے شیخ مجیب کسی سیاسی حل کی جانب بڑھنے کی لمبے عرصے کی کوششوں پر پانی پھیرتے ہوئے کس طرح وفاق کے بھیس میں پاکستان کو توڑنے کی اپنی تجویز صدر کے سامنے پیش کرنے کی جرأت کر سکتے تھے؟ سفیر فارلینڈ نے بعد میں ایک موقع پر جی ڈبلیو چوہدری کو لندن میں مجیب کی طاقت کے حقیقی ذریعے سے آگاہ کیا جس کے بل بوتے پر انہوں نے اس قسم کا غیر متوقع قدم اٹھانے کی جرأت کی۔ فارلینڈ نے جی ڈبلیو چوہدری کو بتایا: ''جب مارچ 1971ء میں میں نے ڈھاکہ کا دورہ کیا اور شیخ مجیب کے ساتھ ملاقاتوں میں ان پر واضح کیا کہ امریکہ، پاکستان کے مفاد کے خلاف ان کے کسی بھی قدم کی حمایت نہیں کرے گا تو مجیب بہت زیادہ پریشانی اور گھبراہٹ کا شکار ہو گئے۔ لیکن انہیں سوویت یونین اور ہندوستان کی حمایت اور مدد کی یقین دہانی کروادی گئی تھی۔ وہ دونوں اس جدوجہد میں ان کی ہر قسم کی مدد کرنے کے لیے تیار تھے۔ 1970ء کے انتخابات کے بعد ماسکو کے کہنے پر روس کی حمایتی تمام پارٹیوں نے شیخ مجیب کو پوری مدد اور حمایت مہیا کرنا شروع کر دی تھی۔ ان کے ذریعے شیخ مجیب نے سوویت یونین کی حمایت حاصل کر لی تھی۔ ہندوستان کی حمایت اور مدد حاصل کرنے کے لیے تاج الدین کو ذریعہ بنایا گیا۔'' (حکومت پاکستان کی خفیہ دستاویزات)

1952ء کی زبان کی تحریک، 1957ء میں مولانا بھاشانی کی ''السلام علیکم''، 1966ء کی عوامی بغاوت، سراج شیکدار کے ''ڈیموکریٹک ایسٹ بنگال پلان'' کا اعلان، قاضی ظفر کے ''انڈی پنڈنٹ پیپلز ڈیموکریٹک ایسٹ بنگال ایکشن پلان'' کا اعلان، 1970ء میں مولانا بھاشانی کے ''آزاد مشرقی پاکستان'' کا اعلان، مشرقی بنگال انقلابی طلبا یونین کا 1970ء کا ''پیپلز ڈیموکریٹک سٹیٹ اسٹیبلشمنٹ ایکشن پلان''، 1971ء میں نئے سال کے آغاز پر مجاہد سانگ کا ''انڈیپنڈنٹ ایسٹ پاکستان فریم ورک''، مزدور کسان سوشلسٹ پارٹی کا انقلابی حکومت کے قیام کا مطالبہ، بائیں بازو کے گروپس کی جانب سے وقفے وقفے سے ہونے والی اکا دکا گوریلا کارروائیوں سے یہ بات واضح ہو رہی تھی کہ اس وقت مشرقی پاکستان کے عوام کی سوچ کسی سمجھوتے اور کسی رعایت کے بغیر صرف اور صرف مکمل آزادی پر مرتکز ہو چکی تھی۔ عوام کے اس قسم کے غیر لچکدار رویے کی موجودگی میں شیخ مجیب کے لیے کسی مصالحتی حل پر متفق ہونا ممکن نہیں رہا تھا۔ اس حوالے سے طالب علم رہنما شاہ جہان سراج کا بیان اہمیت کا حامل ہے۔ اس نے کہا: ''یہ درست ہے کہ عوامی لیگ کے ایک بڑے حصے کی جانب سے شیخ مجیب پر اپنے چھ نکات میں رعایت برتنے اور پاکستان کے اتحاد کو بچانے کے لیے اقتدار کے حصول کے لیے ایک مصالحتی حل کو قبول کر لینے کے لیے دباؤ ہے۔ گول میز کانفرنس میں مرکز میں عوامی لیگ اور پیپلز پارٹی کی ایک مخلوط حکومت قائم کرنے کا فیصلہ کیا جا چکا ہے۔ اگرچہ اس فیصلے کو خفیہ رکھا گیا تھا، ہمیں اس کے بارے میں علم ہو گیا تھا۔ اسی رات ہم میں سے کچھ نے رات دس بجے دھان منڈی کی ایک دکان میں ایک میٹنگ کا اہتمام کیا اور لمبے بحث مباحثے کے بعد صبح ایک بجے کے قریب ہم نے قرآن پاک پر ہاتھ رکھتے ہوئے حلف اٹھایا۔ ڈیڑھ بجے صبح ہم شیخ مجیب کی رہائش گاہ پر گئے اور انہیں کھلے الفاظ میں بتایا کہ اگر انہوں

نے ہماری تجویز کو قبول نہ کیا تو ان کے ساتھ ہمارے سیاسی تعلقات خراب ہو جائیں گے۔" اس وقت شاہ جہان سراج "آزاد بنگلہ دیش سٹوڈنٹ ایکشن کمیٹی" کا جنرل سیکریٹری تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک مجموعی صورتِ حال عوامی لیگ کی قیادت کے ہاتھوں سے مکمل طور پر باہر ہو چکی تھی، اس حقیقت کو شیخ مجیب اور ان کی پارٹی بہ خوبی سمجھتی تھی۔ ہندوستان اور روس نے رہنماؤں کی اس نازک پوزیشن سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور انہیں ہر قسم کی ممکنہ حمایت اور امداد کا یقین دلایا۔ مشرقی پاکستان میں ان کے ایجنٹ شیخ مجیب کی تقدیر پر مکمل کنٹرول حاصل کیے ہوئے تھے اور شیخ مجیب مکمل بے بسی کی حالت میں تھے۔ ان کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا کہ اپنی ذات اور پارٹی کو بچانے کے لیے ان کی مدد و حمایت حاصل کریں۔ اس طرح جب انہوں نے 21 مارچ کو اپنی پالیسی میں اچانک یوٹرن لیا تو وہ اس جتھے کے ہاتھوں مجبورِ محض بن چکے تھے۔ لیکن شاہ جہان سراج کے بیان سے ایک اور بات بھی واضح ہوتی ہے کہ ان تمام تر رکاوٹوں اور مجبوریوں کے باوجود شیخ مجیب اور ان کی پارٹی نے 21 مارچ کو صدر، مجیب اور بھٹو ملاقاتوں میں طے شدہ پروگرام کے مطابق بنگلہ دیش کی آزادی کا اعلان کرنے کے ہر قسم کے دباؤ کی بھرپور مزاحمت کی۔ کچھ عرصہ بعد ان ملاقاتوں کا ذکر کرتے ہوئے بھٹو نے کہا تھا، "اس ملاقات میں شیخ مجیب نے براہِ راست تجویز پیش کی کہ میں مغربی پاکستان کی وزارتِ عظمیٰ سنبھال لوں اور وہ مشرقی پاکستان کے وزیرِاعظم بن جائیں گے۔ ان کے نزدیک اس وقت کے سیاسی بحران کو حل کرنے کا کوئی دوسرا متبادل نہیں تھا۔" بھٹو نے مزید کہا، "شیخ مجیب کی اس تجویز کے پیش نظر میں نے صدر کو واضح الفاظ میں کہا کہ میں اس تجویز کو قبول نہیں کر سکتا کیوں کہ یہ پاکستان کو توڑنے کے مترادف ہوگا۔"

پاکستان کی تاریخ میں 23 مارچ 1971ء بہت اہم دن تھا۔ یہ صرف یوم جمہوریہ ہی نہیں تھا بلکہ اس دن بانی پاکستان محمد علی جناح نے اعلان کیا تھا: "ہندوستانی مسلمان اپنے علیحدہ وطن کے لیے اپنی جدوجہد جاری رکھیں گے۔" اس اعلان کے نتیجے میں تحریک پاکستان کا آغاز ہوا تھا۔ یہ دن پاکستان کے قیام سے ہی پورے پاکستان میں پوری شان وشوکت کے ساتھ منایا جا رہا تھا۔ لیکن 23 مارچ 1971ء ایک استثنیٰ تھا۔ ایوان صدر اور چھاؤنیوں کے علاوہ، تمام دیگر سرکاری دفاتر اور عمارات، عدالتوں اور دوسرے اہم مقامات پر شیخ مجیب کی ہدایت کے مطابق پاکستان کے پرچم کی بجائے آزاد بنگلہ دیش کا پرچم لہرایا گیا۔ اپنی رہائش گاہ پر انہوں نے طلبا اور عوام کے جلوسوں سے سلامی لی۔ ان واقعات سے یہ تاثر پیدا ہوا کہ بنگلہ دیش پہلے سے ہی ایک آزاد مملکت ہے۔ اس کے علاوہ اس روز شیخ مجیب کے بیانات انتہائی اشتعال انگیز تھے۔ اس نے فوجی ٹولے میں موجود مجیب دشمن طبقے کے روّیے اور خیالات کو مزید سخت کر دیا۔ اس طرح 23 مارچ 1971ء نے قومی تاریخ میں ایک سیاہ باب کو جنم دیا۔ اسی دن شیخ مجیب نے اپنا مسوّدہ آئین صدر کے ماہرین کے سامنے پیش کیا، جو صدر کے مسوّدہ آئین کے بالکل برعکس تھا۔ اس مسوّدے میں شیخ مجیب نے واضح طور پر ملک کو تقسیم کرنے کی وکالت کرتے ہوئے وفاق کی تشکیل کی تجویز پیش کی تھی۔ اس طرح انہوں نے پاکستان کو تقسیم نہ کرنے کے قوم

سے کیے گئے اپنے وعدے اور الفاظ سے روگردانی کی ابتدا کی۔ اس قسم کی غداری نے صدر یحییٰ کو مکمل طور پر مایوس اور حیرت زدہ کر دیا تھا۔ اپنے ساتھیوں کے سامنے وہ غصے سے پھٹ پڑے اور کہا" وہ فوجی سپاہی نہیں ہیں، وہ مکار سیاستدان ہیں۔ اپنے الفاظ ان کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ وہ اپنے ذاتی مفاد کی خاطر کچھ بھی کر سکتے ہیں۔" اس کے بعد صدر بو جھل دل کے ساتھ 25 مارچ کو ڈھاکہ سے واپس اسلام آباد پہنچ گئے۔ واپسی پر انہوں نے اور بھٹو نے مذاکرات کی ناکامی کا مکمل الزام شیخ مجیب کو دیا۔ انہوں نے شیخ مجیب کو غدار بھی قرار دیا۔ قوم سے اپنے خطاب میں انہوں نے کہا: "مجیب کی تجویز پاکستان کو توڑنے کی ایک سوچی سمجھی چال تھی۔ کسی قسم کے معقول مذاکرات کے لیے ان کے غیر لچکدار رویے اور ہٹ دھرمی سے یہ بات مکمل کر سامنے آ گئی ہے کہ وہ اور ان کی سیاسی پارٹی پاکستان کی دشمن ہیں، وہ پاکستان کو توڑنا چاہتے ہیں۔ ان کی خواہشات اور اہداف پاکستان کی خودمختاری اور علاقائی سالمیت کے لیے چیلنج ہیں۔ اس قسم کی سرگرمیوں کے خلاف مناسب کارروائی کی جائے گی۔" صدر کی اس تقریر کے جواب میں تاج الدین احمد نے کہا:" صدر کی تقریر سے واضح طور پر ثابت ہو گیا ہے کہ وہ اور ان کا حکمران فوجی ٹولہ کبھی بھی انتقالِ اقتدار کے لیے سنجیدہ نہ تھا اور کبھی بھی پاکستان کے سیاسی بحران کا ایک قابلِ قبول حل نہیں چاہتا تھا۔ مذاکرات کے نام پر وہ صرف وقت حاصل کرنا چاہتے تھے۔ مذاکرات کے بہانے انہوں نے مغربی پاکستان سے مزید فوجی اور اسلحہ یہاں پہنچایا ہے۔ وہ مشرقی پاکستان کے عوام کی جائز تحریک کو بندوق کے ذریعے دبانے کی سازش کر رہے ہیں۔ یہ یقیناً قوم سے بے وفائی ہے۔ صدر مذاکرات کے بھیس میں فوجی کارروائی کے منصوبے کو حتمی شکل دینے کے لیے یہاں آئے تھے۔"

27۔ علیحدگی ناگزیر نہ تھی

پاکستان جیسے ایک کثیر النسل ملک میں بنیادی مسئلہ ملک کے تمام معاشرتی گروہوں کے سابقہ اشرافیہ میں قومی اتفاقِ رائے اور تعلقاتِ کار پیدا کرنا ہوتا ہے۔ اس اتفاقِ رائے اور اشتراک پر مبنی ایک حکمت عملی اور پروگرام تشکیل دینے کی ضرورت ہوتی ہے، جس میں مندرجہ ذیل پہلوؤں پر زور دیا گیا ہو:

1۔ تمام نسلوں کی اشرافیہ پر مشتمل ایک نمائندہ حکومت کا قیام۔

2۔ مختلف نسلوں کے درمیان قومی اتفاقِ رائے اور تعلقاتِ کار کا قیام۔

3۔ تمام نسلوں کے اشتراک اور وحدت پر مبنی ایسے قومی اداروں کا قیام اور ترویج جن تک ہر کسی کو آسان اور مساوی رسائی حاصل ہو۔

4۔ قوم کی خواہشات اور اہداف کو حقیقت کا روپ دینے کے لیے مختلف نسلوں کی اشرافیہ کے ذریعے عوام کو منظم کرنا۔

5۔ نسلی گروہوں کی کسی بھی علیحدگی پسند تحریک کو سر اٹھاتے ہی دبا دینا۔ تاہم یہ کام طاقت سے نہیں

بلکہ مثبت نوعیت کی روک تھام کے ذریعے کیا جانا چاہیے۔

6۔ اس بات کو یقینی بنانا کہ معاشی فوائد اور ترقی کے اثرات عوام تک اور نسلی گروہوں تک برابری کی سطح پر پہنچیں۔ مختلف نسلی گروہوں کے اندر دولت اور دوسرے فوائد کی تقسیم ان کے اپنے طبقہ اشرافیہ کی ذمہ داری ہونی چاہیے۔

یہ حکمت عملی ہمارے قومی مسائل کے لیے کوئی امرت دھارا نہیں تھی لیکن اس سے یہ امید پیدا ہو سکتی تھی کہ قومی سیاسی ڈھانچے میں نسلی گروہوں کے اخراج کی بجائے ان کی شمولیت ہمارے کثیر النسلی ملک کے اتحاد کے لیے ایک کلیدی کردار ادا کر سکتی تھی۔ یہ توقع رکھی جا سکتی ہے کہ انصاف کی خاطر عوام اور مختلف نسلی گروہ ایک مخصوص مدت کے لیے سست رفتار صنعتی ترقی اور عصر حاضر کا ساتھ دینے میں کوتاہیوں کو کسی حد تک برداشت کر سکتے ہیں۔ ایک ایسے معاشرے میں جہاں انصاف ہو اور لوگ غلط طریقوں سے حاصل کی گئی دولت کے گھمنڈ میں من مانی نہ کر رہے ہوں، کوئی بھی شخص وقتی طور پر غربت کو بھی برداشت کر لیتا ہے۔ کوئی بھی ملک اس وقت ترقی کرتا ہے جب اس کے عوام متحد ہوں۔ اگر وہ مختلف بنیادوں پر منقسم ہیں تو پھر وہاں ایک ایسا نیا طبقہ جنم لے لیتا ہے جو ہر شخص کو یا اکثریتی نسلی گروہوں کو غریب تر اور محرومیت کا شکار بناتا چلا جاتا ہے۔ اس لیے ایک کثیر النسلی ملک میں اشرافیہ کو مل جل کر اپنے اور ملک کے مفاد میں کام کرنا پڑتا ہے۔ وہ بعض اوقات اپنے نسلی مفادات کی ترویج کے لیے آپس میں لڑ بھڑ بھی سکتے ہیں۔ تاہم اس کے باوجود انہیں ایک دوسرے کی رواداری، باہمی افہام و تفہیم اور مصالحت کی صلاحیتوں پر اعتماد کو متزلزل نہیں ہونے دینا چاہیے۔ ورنہ علیحدگی کے پر خطر اور یک طرفہ راستے کے کھلنے کے امکانات یقینی ہو جائیں گے۔

''اسلام یا اسلامی ریاست'' کے محافظ یعنی پنجابی مہاجر، جن کا مرکزی حکومت میں غلبہ تھا، ابتدا ہی سے بنگالیوں کو پسماندہ قوم اور مغربی پاکستان پر ایک بوجھ کے طور پر دیکھتے تھے۔ وہ پوری طرح اس بات کے قائل تھے کہ پاکستانی قومیت کی جو صورت اُن کے ذہن میں ہے اور معاشی ترقی کا جو جذبہ ان میں پایا جاتا ہے، وہ بنگالی نسلیت اور اس کے مخلوط ہندو رجحانات سے متضاد ہے۔

تاہم اس بات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ ایوب حکومت کی معاشی پالیسیاں مشرقی پاکستان میں نئے صنعت کاروں کی تعداد میں اضافے کے لیے معاون اور مددگار ثابت ہوئی تھیں۔ ان نئے ابھرتے ہوئے صنعت کاروں کے لیے مغربی پاکستان کے مستحکم اور مراعات یافتہ صنعتی اداروں سے مقابلہ کرنا بہت مشکل تھا۔ ان میں اپنی کمتری اور عدم تحفظ کا احساس بہت بڑھ چکا تھا، اس لیے انہوں نے فوری طور پر ان مقامی بنگالی سیاستدانوں کی طرف دست تعاون دراز کیا جو اس علاقے کے لیے زیادہ سیاسی خودمختاری کی جدوجہد کر رہے تھے۔ خودمختاری کے لیے ان کی یہ جنگ بنگالی صنعت کاروں کے لیے کسی حد تک ایک مؤثر ہتھیار تھی جس کی مدد سے وہ مرکزی حکومت پر درآمدی لائسنسوں اور زر مبادلہ کے کوٹے میں اضافہ کے لیے دباؤ ڈال سکتے تھے۔ مزید برآں، جدوجہد کے آخری مرحلے میں بنگالی عوام کے مختلف عناصر ایک واحد سیاسی پلیٹ فارم پر جمع

ہونے کے لیے مستحق ہو سکتے تھے۔ حکمران اشرافیہ ناجائز طور پر اپنے بنگالی ہم وطنوں کو ہندو ور، رجحانات کی حامل پسماندہ نسل کے زمرے میں رکھتی تھی۔ اس قسم کے مسلسل رویے نے علیحدگی کے رجحانات کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا اور ان حالات میں شیخ مجیب پر مقدمہ پہلے سے ہی دیمک زدہ اتحاد کے لیے موت کے پروانے پر دستخط کرنے کے مترادف تھا۔ یہاں دوبارہ اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ شیخ مجیب کے چھ نکات میں کوئی پہلو بھی نیا نہ تھا۔ اسی طرح کے، اور حقیقتاً ملتے جلتے خیالات اور نظریات کا اظہار پہلے بھی کئی مرتبہ قومی اسمبلی کے بنگالی ممبران قومی اسمبلی کے ایوان میں کر چکے تھے۔

صرف اگرتلہ سازش کیس کے اعلان کا وقت اہمیت کا حامل تھا۔ یہ اس وقت سامنے آیا جب ملک شدید سیاسی بحران کی گرفت میں تھا۔ پاکستان میں ہر جگہ عوام ایوب کی مستبد قیادت اور آمرانہ حکومت کے خلاف بغاوت کر رہے تھے۔ صدر ایوب صاف صاف نظر آنے والے نسلی اختلافات کو کم کرنے کی کوششوں کی بجائے پنجابی مہاجر اشرافیہ کی بالادستی کو مزید استوار کرنے اور مضبوط کرنے میں مصروف تھے۔ مارشل لا دور میں بنگالی بہ مشکل ہی مرکزی حکومت میں کلیدی پوزیشنوں میں کہیں نظر آتے تھے۔ 1960ء کے عشرے کے اختتام پر جب بنگالیوں کا صبر جواب دینے لگا تھا تو اس سے بھی بدترین ردعمل سامنے آیا اور مرکزی حکومت نے ان کے رہنماؤں کو غدار اور دشمن ملک بھارت کے ساتھی ثابت کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ یقیناً یہ وہ استحقاق نہیں تھا جو بنگالیوں کے ذہنوں میں اس وقت تھا جب 1947ء میں انہوں نے واضح طور پر پاکستان کا انتخاب کیا تھا۔ بنگالیوں نے قیام پاکستان کی جدوجہد میں انتہائی اہم کردار ادا کیا تھا، جسے مغربی پاکستان کے حکمران طبقے نے آسانی سے بھلا دیا تھا۔ مسلم لیگ کا قیام ڈھاکہ میں ہوا تھا اور پہلا شہید جس نے پاکستان کے لیے اپنی جان کا نذرانہ پیش کیا تھا وہ کھلنا سے تعلق رکھنے والا ایک بنگالی تھا۔

شیخ مجیب کے شدید مطالبات کی نوعیت کے باوجود پاکستان ابھی تک بنگالیوں کو دل و جان سے زیادہ عزیز تھا۔ بنگالی صرف ملکی انتظام انصرام میں اپنا جائز حق طلب کر رہے تھے۔ وہ ایسے سیاسی نظام کے خواہش مند تھے جو قومی سطح پر برابری اور اتحاد کو یقینی بنائے۔ وہ ایک مکمل آمرانہ حکومت کی بجائے، جو انہیں ہندو بالادستی اور نوآبادیاتی استحصال کی یاد دلاتا تھا، ایک مضبوط پارلیمانی جمہوری نظام کے خواہاں تھے۔ لہٰذا یہ کہنا کسی طور پر غلط نہ ہوگا کہ بنگالی جدوجہد ایک اچھی طرح سوچے سمجھے اہداف کی خاطر تھی نہ کہ اپنی ایک علیحدہ آزاد ریاست کے قیام کے لیے۔ تاہم بنگالیوں کو قومی معاشی اور سیاسی زندگی میں مکمل شمولیت سے انکار سے حکمران ٹولے نے نادانستہ طور پر بنگالی اشرافیہ کو اپنے عوام کی جانب دھکیل دیا اور انہیں اپنی نسلی تہذیب اور زبان کو قومی اتحاد کی قیمت پر تقویت دینے کے لیے مجبور کر دیا۔ اس طرح ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں اس ناہموار ترقی نے بنگالی اشرافیہ کو مرکزی حکومت کے خلاف اپنے عوام کے ساتھ اتحاد قائم کرنے اور قوم پرستی کو پرجوش نسل پرستی میں تبدیل کرنے پر مجبور کر دیا، اور انہوں نے اس نسل پرستی کے جذبے کو ایک ایسے ذریعے کے طور پر استعمال کیا جس نے اشرافیہ اور عوام کو باہم ایک دوسرے سے جوڑ دیا۔ غیر مساوی

ترقی، استحصال، محرومی اور نسل پرستی کے یہ مظاہر اُن جونکوں کی طرح ہوتے ہیں جو ایک دوسرے پر پلتے ہیں اور پھر واپسی کا کوئی راستہ باقی نہیں رہ جاتا۔ بدقسمتی سے پاکستان اسی چوراہے پر کھڑا تھا اور شاید پہلے ہی ناگزیر تباہی و بربادی کی جانب بڑھ رہا تھا۔ کسی بھی ملک کا حصوں بخروں میں بٹ جانا عوام اور سیاست کے خلاف فیصلہ نہیں ہوتا، یہ عوام کو قومی معاملات سے باہر رکھنے اور ان کو ایک طرف رکھتے ہوئے معاملات طے کرنے کے خلاف فیصلہ ہوتا ہے۔

28۔ فوجی ٹولے کی طرف سے گولی کے استعمال کے فیصلے نے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی

آخر کار حکمران فوجی ٹولے نے سیاسی تحریک کو گولی اور بندوق کے ذریعے حل کرنے کا فیصلہ کیا اور 25 مارچ 1971ء کی رات ایک خوف ناک رات میں ڈھل گئی۔ پاکستانی فوج نے بنگالیوں پر ان کی سیاسی تحریک کو کچلنے کے لیے اپنی بے مثال وحشیانہ اور ظالمانہ کارروائیوں کا آغاز کر دیا۔ اس طرح راستوں کی جدائی ناگزیر ہوگئی۔

25 مارچ کی رات کو ہونے والی نسل کشی نے اس قسم کے تمام مظالم کی تاریخ کے نئے ریکارڈ قائم کر دیئے۔ فوج نے وحشیانہ انداز میں ہزاروں معصوم بچوں، خواتین اور مردوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس کھلم کھلا دہشت گردی اور نسل کشی میں ایجنسیوں کو بھی نہ بخشا گیا۔ شیخ مجیب سے حکمران فوجی ٹولے کی متوقع مسلح کارروائی کے خلاف مسلح مزاحمت کو منظم کرنے کے لیے بار بار لیڈر شپ مہیا کرنے کی درخواست کی گئی۔ لیکن شیخ مجیب نے ان اپیلوں پر کوئی توجہ نہ دی اور ہمیشہ اس بات کو دہرایا کہ "میں نے اپنی ساری زندگی میں جمہوری سیاست کی ہے۔ میں بندوقوں کی سیاست پر یقین نہیں رکھتا۔" یہ کیسی ستم ظریفی تھی! پوری قوم نے اُن کے کہنے پر ہمیشہ قربانیاں دی تھیں۔ دھرتی کے بہت سے سپوتوں نے ان کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے اپنی جانیں دی تھیں۔ انہوں نے انہیں ایک غیر متنازع لیڈر کے طور پر قبول کیا تھا۔ وہ انہیں جو بھی وہ مانگتے دینے کے لیے تیار تھے۔ اسی لیڈر نے ایک نازک وقت میں پوری قوم کو پیچھے چھوڑا اور مغربی پاکستان جانے کے لیے اپنی گرفتاری پیش کر دی۔ ایک وقت کے لیے پوری بنگالی قوم سکتے میں آ گئی۔ پورا مشرقی پاکستان ناامیدی میں حوصلے ہار بیٹھا۔ عوامی لیگ کے دوسرے لیڈروں نے بھی عوام کو بے یار و مددگار چھوڑا اور اپنے آپ کو بچانے کے لیے رُوپوش ہو گئے۔ لیڈروں کی اس قسم کی بے وفائی پر عوام کو اپنی قسمت خود اپنے ہاتھوں میں لینا پڑی اور انہوں نے چیلنجوں کا سامنا کرنے کا فیصلہ کیا۔ امن پسند بنگالیوں نے اپنی حفاظت کی خاطر اسلحہ اٹھا لیا۔

اس نازک موڑ پر 26 اور 27 مارچ کی رات کو ایک غیر معروف نوجوان میجر ضیاالرحمٰن نے جس کا تعلق ایسٹ بنگال رجمنٹ سے تھا، قومیت کے جذبے سے سرشار ہوتے ہوئے بغاوت کا فیصلہ کیا۔ وہ اپنے

دوسرے بنگالی ساتھیوں سے مشورہ کرنے کے بعد ریڈیو سٹیشن آیا اور قوم سے آزادی کی جنگ منظم کرنے کی تاریخی اپیل کی۔ لوگوں کو اس کی اس پرجوش اپیل میں امید کی ایک کرن نظر آئی۔ اس پرجوش اپیل کے نتیجے میں پورے مشرقی پاکستان میں لوگوں نے مزاحمت کی تحریک منظم کرنی شروع کر دی۔ مسلح افواج اور قانون نافذ کرنے والی دوسری ایجنسیوں کے بنگالی ممبران نے اس مسلح جدوجہد کو منظم کرنے میں ہراول دستے کا کام کیا جو آخر کار ایک خوں ریز قومی جنگ آزادی کا روپ دھار گئی۔ میجر ضیا کی یہ کمزور سی آواز چٹاگانگ کے کلور گھاٹ ریڈیو سٹیشن کے نشریاتی مرکز سے نشر ہوئی، اس نے کہا، ''موجودہ حالات میں، میں اپنے آپ کو' سوادھن بنگلہ لبریشن گورنمنٹ'' کا عبوری سربراہ مقرر کرتا ہوں۔'' تاہم بعد کی نشریات میں ایک اضافہ تھا جس میں کہا گیا تھا، ''بنگلہ بندھو شیخ مجیب الرحمن کی رہنمائی میں۔'' اس وقت اس اپیل کا باریک بینی سے تجزیہ کرنے کا کسی کے پاس وقت ہی نہ تھا۔

29۔ اعلانِ آزادی کے بارے میں عوامی لیگ کی من گھڑت کہانیاں

1972ء میں جب ملک نے آزادی حاصل کر لی تھی تو اس وقت حکومت اور حکمران جماعت عوامی لیگ نے میجر ضیا کی علیحدگی کے اعلان کے حوالے سے کچھ من گھڑت کہانیاں پھیلانا شروع کیں۔ پہلی کہانی یہ تھی کہ شیخ مجیب نے اپنی گرفتاری سے پہلے ظہور احمد چوہدری کو چٹاگانگ میں ایک ٹیلی فون پیغام بھیجا تھا۔ یہ پیغام ''اعلانِ آزادی'' پر مشتمل تھا۔ لیکن فوج نے اپنی کارروائی کے آغاز سے پہلے ڈھاکہ اور بیرونی شہروں کے درمیان ہر قسم کا مواصلاتی نظام ناکارہ کر دیا تھا۔ لہٰذا یہ کہانی خود بخود نامعقول ثابت ہوتی ہے۔

پھر ایک دوسری کہانی گھڑی گئی۔ کہا گیا کہ وائرلیس کے ذریعے ''اعلانِ آزادی'' چٹاگانگ بندرگاہ پر لنگر انداز ایک آسٹریلوی بحری جہاز کے کپتان کو بھیجا گیا۔ کپتان نے بعد میں یہ پیغام ظہور احمد چوہدری تک پہنچایا۔ اس وقت ڈھاکہ سے چٹاگانگ میں لنگر انداز کسی بھی بحری جہاز کے کپتان کو وائرلیس پیغام بھیجنا ممکن نہ تھا کیوں کہ اس وقت چٹاگانگ کی بندرگاہ کے علاقے میں پاکستانی فوج اور ایسٹ بنگال رجمنٹس اور ای پی آر (ایسٹ پاکستان رائفلز) میں شدید لڑائی جاری تھی۔ مزید برآں، حملہ کرنے سے پہلے تمام مواصلاتی مراکز بشمول وائرلیس مراکز کے پوری طرح فوج کے کنٹرول میں تھے۔ لہٰذا یہ کہانی بھی غلط ثابت ہوئی۔

آخر میں یہ بات بنائی گئی کہ چٹاگانگ کی ای پی آر کو ''اعلانِ آزادی'' نشر کرانے کی ہدایت دی گئی تھی۔ یہ ساری کہانی ''جنگ آزادی کی تاریخ'' نامی کتاب میں شامل تھی۔ لیکن اگر اسے عقلی طور پر پرکھا جائے تو واضح طور پر نظر آ جاتا ہے کہ یہ کہانی بھی محض گھڑی گئی تھی۔ سب سے پہلے تو یہ کہ ڈھاکہ اور دوسرے شہروں میں ٹی وی، ریڈیو، ٹیلی فون اور وائرلیس جیسے تمام ذرائع مواصلات مسلح افواج کے مکمل کنٹرول میں تھے۔ آیئے اب اس کہانی کا تجزیہ کرتے ہیں کہ دراصل ڈھاکہ ای پی آر کے ذریعے چٹاگانگ ای پی آر سے

رابطہ قائم کیا گیا تھا۔ اگر اس مرحلہ پر ڈھاکہ ای پی آر اس پوزیشن میں تھی کہ شیخ مجیب کے احکامات پر عمل کر سکے تو پھر انہیں یہ پیغام خود ہی پورے مشرقی پاکستان میں براہِ راست پھیلانے کو کہا جا سکتا تھا۔ پھر یہ ڈھاکہ ای پی آر سے چٹاگانگ ای پی آر کا راستہ کیوں اختیار کیا گیا؟ مزید برآں ای پی آر کے ہیڈ کوارٹر اور سگنل سینٹر پر 23 مارچ کو ہی فوج مکمل کنٹرول حاصل کر چکی تھی۔ اس پر بھی مستزاد یہ تھا کہ چٹاگانگ ای پی آر ہیڈ کوارٹر کا انچارج ایک نوجوان کیپٹن رفیق الاسلام تھا۔ وہ ان آفیسرز میں سے تھا جن کے ساتھ ضیاالرحمٰن نے کلور گھاٹ ریڈیو سٹیشن سے اپنے اعلان کی منصوبہ بندی کی تھی۔ بعد میں وہ سیکٹر ون میں لڑتا رہا۔ آزادی کے بعد اسے اچانک فوج سے ریٹائر کر دیا گیا۔ اس نے جنگ آزادی کے بارے میں دو کتابیں لکھی تھیں۔ اپنی کسی بھی کتاب میں اس نے ڈھاکہ سے شیخ مجیب کی جانب سے ملنے والے کسی بھی پیغام کا ذکر نہیں کیا۔ اگر حقیقت میں ڈھاکہ سے کوئی پیغام بھیجا گیا تھا تو پھر میجر ضیا نے کیوں اپنے آپ کو حکومت کا عبوری سربراہ قرار دیا۔ اس کے علاوہ چٹاگانگ سے عوامی لیگ کے ایک دوسرے لیڈر عبدالحنان نے 26 اور 30 مارچ کے درمیان چٹاگانگ ریڈیو سے ایک سے زائد مرتبہ اپنے بیانات نشر کیے۔ تو پھر انہوں نے کیوں اپنے تمام بیانات میں ایک دفعہ بھی کہیں یہ ذکر نہیں کیا کہ ڈھاکہ سے شیخ مجیب الرحمٰن کی طرف سے کسی ''اعلانِ آزادی'' کا پیغام ملا تھا۔ لہٰذا واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ میجر ضیاالرحمٰن تھے جنہوں نے 26 اور 27 مارچ کی درمیانی شب کلور گھاٹ ریڈیو سٹیشن سے پہلی مرتبہ آزادی کا اعلان کیا۔ اس حقیقت کو تاریخ سے مٹایا نہیں جا سکتا، خواہ کتنی بھی کوشش کیوں نہ کر لی جائے۔

30۔ وحشیانہ نسل کشی کی رونگٹے کھڑے کر دینے والی داستانیں

آج کے دن تک انسانی تاریخ میں بے شمار رونگٹے کھڑے کر دینے والی دہشت ناک اور وحشیانہ نسل کشی کی داستانیں لکھی جا چکی ہیں اور دستاویزات تیار کی گئی ہیں۔ صدر ذوالفقار علی بھٹو کے آرمی چیف جنرل ٹکا خان نے، جسے پورے بنگلہ دیش میں ''مشرقی پاکستان کا جلاد'' کہا جاتا ہے، مصر کے مشہور صحافی مسٹر ہیکل کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا تھا، ''مارچ کے اوائل میں جب میں مشرقی پاکستان پہنچا تو وہاں دفاعی تیاریاں بہت کمزور تھیں۔ انٹیلی جینس ایجنسیاں اس وقت کی مجموعی صورتِ حال کے بارے میں رپورٹوں کی اہمیت کا اندازہ لگانے میں ناکام ہو چکی تھیں۔ وہاں پر موجود لوگ ان سے تعاون نہیں کر رہے تھے۔ انٹیلی جینس کے محکمے میں بنگالی آفیسروں کا اخلاص بھی مشکوک تھا۔ اس قسم کی صورت اس سے پہلے کبھی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ مسلح افواج کے صرف مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والے افراد سے حاصل ہونے والی معلومات ہی ایسی تھیں جن پر انحصار کیا جا سکتا تھا۔ غدار مجیب کی سازش کے نتیجے میں پوری بنگالی قوم ہی باغی ہو چکی تھی۔ ان سب نے حقیقتاً مسلح افواج سے بائیکاٹ کر رکھا تھا۔''

مسٹر ہیکل کے مطابق جنرل ٹکا خان کو یہ بات سمجھ نہ آ سکی تھی کہ ان کا مقابلہ قومی انقلاب سے تھا۔

وہ نہیں سمجھ سکے تھے کہ اس تحریک کی جڑیں شدید قسم کی قومیت کے جذبے میں پیوست تھیں۔ بنگالیوں کی اس قومیت پرمبنی تحریک کے پس منظر میں بہت سی وجوہات کارفرما تھیں۔ اس کے بعد ٹکا خان نے ڈھاکہ کے مذاکرات اوران کی ناکامی کا ذکر کرتے ہوئے کہا، ''جب ڈھاکہ مذاکرات ناکام ہوگئے تو صدر نے مجھے حکم دیا کہ آگے بڑھ کر بنگالیوں کی اس بغاوت کو فوجی کارروائی کے ذریعے کچل دوں اور امن وامان بحال کروں۔''

مسٹر ہیکل کا بیان درج ذیل ہے:

''25 مارچ کی رات تقریباً ساڑھے گیارہ بجے پاکستانی فوج نے سوئی ہوئی بنگالی قوم پر اپنی شدید کارروائی کا آغاز کردیا۔ بنگالی گولیوں کی آواز سے خوف زدہ ہوکر اپنی نیندوں سے اُٹھ بیٹھے۔ ڈھاکہ یونیورسٹی کا علاقہ، سوتی جمیل پولیس ہیڈکوارٹرز اور پیل خانہ ای پی آر ہیڈکوارٹرز اس کارروائی کا اصل ہدف بنے۔ اندھادھند فائرنگ ہو رہی تھی۔ مشین گنوں، راکٹوں حتیٰ کہ ٹینکوں کے فائر کی آوازیں بھی سنی جاسکتی تھیں۔ ان کے ساتھ مرتے ہوئے لوگوں کی چیخ وپکار بھی شامل تھی۔ آگ کے شعلوں سے پورے ڈھاکہ کا آسمان روشن ہو رہا تھا۔ اقبال ہال اور جگن ناتھ ہال پر مشین گنوں کے فائر اور مارٹر کے گولے پھینکے گئے، بیسیوں طلبا مارے گئے۔ بے شمار لوگ نیند میں ہی میں مارے گئے۔''

ڈھاکہ یونیورسٹی پر حملے کا منظر بڑے واضح طور پر بیان کیا گیا ہے۔ وہ لکھتا ہے، ''آدھی رات کے فوراً بعد پاکستانی ٹینکوں کی ایک قطار ڈھاکہ یونیورسٹی کی جانب روانہ ہوئی۔ فوج نے برٹش کونسل کے علاقے پر قبضہ کرکے اسے فائرنگ کا مستقر بنالیا اور چاروں طرف طلبا کے رہائشی ہالوں پر فائرنگ شروع کردی۔ صرف اقبال ہال میں دوسو طالب علم نیند کے عالم میں ہی مرگئے۔ اقبال ہال باغی طلبا کے مراکز میں شامل تھا۔ دو روز تک بہت سی مردہ لاشیں میدانوں میں، کمروں کے اندر اور سڑکوں پر پڑی رہیں۔ اگلے دن سپاہیوں نے میدانوں میں بڑی بڑی اجتماعی قبریں کھودیں اور ان قبروں میں لاشیں ڈال کر انہیں مٹی سے برابر کردیا گیا۔ اجتماعی قبریں کھودنے کے لیے بڑے بلڈوزر استعمال کیے گئے۔ یونیورسٹی کیمپس اور شہر کی مضافاتی آبادیاں آگ میں جل رہی تھیں۔''

اس وقت ورلڈ بینک کا ایک ملازم ہنڈوک وینڈر ہیزڈن، ڈھاکہ میں موجود تھا۔ اس نے نیویارک ٹائمز میں ایک مضمون لکھا جو کہ 14 جولائی کو ''دی ٹائمز آف لنڈن'' نے بھی دوبارہ شائع کیا۔ اسی دن نیویارک ٹائمز نے اس مضمون پر مبنی اداریہ بھی تحریر کیا جس میں بنگالیوں کے خلاف مغربی پاکستان کی فوج کے ظلم اور بربریت کے بارے میں تفصیلات دی گئی تھیں۔ دنیا کے لوگ یہ اداریہ پڑھ کر ششدر رہ گئے۔ ٹائمز کے اداریے اور ہینڈوک کے مضمون نے دنیا کی ہمدردیاں بنگالیوں کے ساتھ شامل کرنے میں بہت مدد دی۔ 27 مارچ کو صبح 9 بجے سے دوپہر تک کرفیو اٹھالیا گیا۔ ہزاروں خوف زدہ مرد اور خواتین اپنے بچوں کو لے کر اپنی زندگیاں بچانے کے لیے شہروں سے نکل کر دیہاتوں کا رخ کرنے لگے۔ انہیں اپنے راستے میں بھی پاکستانی فوج کی فائرنگ کا سامنا کرنا پڑا۔ بہت سے لوگ مارے گئے۔ ان بھاگتے ہوئے غیر مسلح معصوم لوگوں پر پہلی

گاپٹروں کے ذریعے بھی فائرنگ کی گئی۔

لوگوں کے دلوں میں اس طریقے سے خوف پیدا کیا گیا تھا۔ پولیس اور ای پی آر کے سینکڑوں غیر مسلح سپاہیوں کو ان کی بیرکوں میں مار دیا گیا۔ مسلح افواج میں موجود بنگالی سپاہیوں پر بھی اچانک حملہ کر کے انہیں وحشیانہ طریقے سے مار ڈالا گیا۔ ان تمام لوگوں نے جو بھاگ سکتے تھے اسلحہ خانوں کو لوٹا اور شہروں میں مختلف مقامات اور جگہوں پر مزاحمت شروع کر دی۔ لیکن ان کی غیر منظم مزاحمت پاکستانی فوج کے شدید حملے کے سامنے تیزی سے کمزور ہونے لگی۔ مسلح افواج کے جو ارکان بھاگ سکتے تھے، وہ دیہاتوں اور دیہاتی علاقوں میں جا چھپے۔ پاکستان کی فوج نے ان سے انتقام لینے کے لیے ان کا پیچھا کیا۔ پاکستانی فوج کے جنرل فضلِ مقیم نے فوج کے اس شدید ترین حملے کی تعریف کرتے ہوئے کہا، ''پاکستانی فوج کو بنگالیوں کی بغاوت کی سرکوبی کے لیے خودکار رائفلیں، مارٹرز اور حتیٰ کہ ضرورت کے مطابق ٹینک بھی استعمال کرنا پڑے۔ ان تمام ہتھیاروں سے نکلنے والی آوازوں سے یوں محسوس ہوتا تھا کہ پورا ڈھاکہ میدانِ جنگ بن چکا ہے۔''

مشرقی پاکستان میں موجود تمام غیر ملکی صحافیوں کو چھاؤنی میں لے جایا گیا اور اس رات ایک خصوصی طیارے کے ذریعے انہیں ملک سے نکال دیا گیا۔ مسلح افواج کے ارکان نے اپنی حراست میں موجود صحافیوں سے بدسلوکی بھی کی۔ صرف تین صحافی فوج کے ہاتھوں سے نکل کر فرار ہونے میں کامیاب ہو سکے۔ یہ مسٹر آرنلڈ زیتھلن، مسٹر مائیکل لورنٹ اور مسٹر سائمن ڈرنگ تھے۔ انہی صحافیوں کے ذریعے دنیا کو بعد میں اُس بربریت اور نسل کشی کی سفاکانہ کارروائی کا علم ہوسکا جو 25، 26 مارچ کی رات کو پاکستانی فوج نے حکمران فوجی ٹولے کے حکم پر برپا کی۔ مسٹر سائمن ڈرنگ نے ''ڈیلی ٹیلی گراف'' میں اپنے مضمون میں لکھا، ''ڈھاکہ کو پاکستان کو متحد رکھنے کی بھاری قیمت چکانا پڑی تھی۔''

31۔ بے چین سوچیں اور قومی جدوجہد میں شرکت کی شدید خواہش

25، 26 مارچ کی رات کو جو کچھ ہوا اور اس کے بعد کے واقعات کا علم ہمیں 30 مارچ 1971ء کو وائس آف امریکہ، بی بی سی، آل انڈیا ریڈیو اور ریڈیو آسٹریلیا کے ذریعے ہوا۔ ہمیں اپنے رشتہ داروں، نزدیکی تعلق داروں اور دوستوں کے بارے میں جنہیں ہم پیچھے چھوڑ آئے تھے، بہت زیادہ پریشانی لاحق ہو گئی۔ ہم کہ جو مشرقی پاکستان سے دُور تھے، پاکستانی فوج کے اس قسم کے ظلم وستم اور اشتعال انگیز کارروائی پر بہت زیادہ برہم تھے، اور یہ سوچنا شروع کر دیا تھا کہ باہر رہتے ہوئے ہم کیا کر سکتے ہیں۔ کیا اعلانِ آزادی کے حوالے سے ہم پر بھی کچھ ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں؟ ہم میں سے اکثریت پورے دل وجان سے یہ چاہتی تھی کہ ہم بھی اپنے دوسرے ساتھی بنگالیوں کے ساتھ آزادی کے لیے اس تحریک میں شامل ہوں۔ ہم اپنا وقت بہت زیادہ قابلِ رحم حالت اور بوجھل دلوں کے ساتھ گزار رہے تھے۔

اس دوران ہمارا کورس تقریباً ختم ہونے کو تھا۔ انفنٹری سکول میں کورس کے دوران کیپٹن اے

طاہر، لیفٹیننٹ موتی اور سیکنڈ لیفٹیننٹ نور چوہدری کے ساتھ میرے نزدیکی تعلقات استوار ہو گئے تھے۔ ہم خیالی ہمیں ایک دوسرے کے نزدیک لے آئی تھی۔ میں مقامی آفیسر تھا۔ وہ مجھے ملنے کے لیے ہمارے کنگز رود آرٹلری میس میں اکثر آیا کرتے تھے۔ ہم اپنا فرصت کا وقت مختلف تفریحات میں بسر کرتے تھے۔ ہم میس میں اکٹھے کھانا کھاتے، شہر میں مل کر گھومتے، سینما دیکھنے اکٹھے جاتے اور تہوار کی راتوں میں کلب میں بھی اکٹھے ہی جاتے تھے۔ لیفٹیننٹ شوری بھی کبھی کبھی ہمیں ملا کرتا تھا۔ اگرچہ ہم مل بیٹھ کر بہت مزے مزے کی باتیں کرتے تھے لیکن اکثر بنگلہ دیش کی صورتِ حال پر بھی بات چیت ہوتی تھی۔ ہمارے دل اور جذبات ہمیشہ مشرقی پاکستان میں آزادی کی جنگ لڑنے والوں کے ساتھ ہوتے تھے۔ ہم سب کے ذہنوں میں ایک ہی بات تھی کہ ہمیں بھی اس جدوجہد میں ضرور حصہ ڈالنا چاہیے۔ ہمیں ہر بات خاموشی سے قبول کرتے ہوئے سہم کر نہیں بیٹھے رہنا چاہیے۔ ہم اپنے آپ سے کہتے تھے کہ قومی آزادی کی اس جدوجہد میں جس طرح سے بھی ممکن ہو سکے ہمیں ضرور شامل ہونا چاہیے۔ لیکن ہم اس وقت کیا کر سکتے تھے؟ اس موقع پر ہمیں معلوم ہوا کہ 16 ڈویژن کو مشرقی پاکستان لے جایا جا رہا ہے۔ یہ بہت خوش کن خبر تھی۔ اگر ڈویژن جاتی ہے تو مجھے بھی اپنی یونٹ کے ساتھ بنگلہ دیش جانے کا موقع مل سکتا تھا جو 16 ڈویژن کا حصہ تھی۔ طاہر، موتی، نور اور شوری سب ہی بہت خوش تھے۔ کورس ختم ہو گیا تھا۔ لیکن حکام نے اچانک ہیڈ کوارٹر کے فیصلے کا اعلان کیا کہ بنگالی آفیسر جو مشرقی پاکستان میں مقیم مختلف یونٹوں سے آئے تھے، انہیں ان کی یونٹوں میں واپس نہیں بھیجا جائے گا بلکہ ان تمام کو مغربی پاکستان میں مقیم یونٹوں میں بھیج دیا جائے گا۔ کیا معاملہ تھا؟ پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ کورس کے بعد افسر معمول کے مطابق واپس اپنی یونٹ میں چلا جاتا تھا۔ پھر ایسا فیصلہ کیوں کیا گیا تھا؟ ہم سب بہت حیران تھے۔

کیپٹن طاہر، لیفٹیننٹ موتی اور لیفٹیننٹ نور تمام کی یونٹیں مشرقی پاکستان میں تھیں۔ اس طرح وہ تمام تنہا رہ گئے۔ میں اپنی یونٹ میں واپس آ گیا۔ لیکن یونٹ میں شامل ہونے کے بعد میں نے کچھ تبدیلیاں محسوس کیں۔ ماحول مختلف تھا۔ صورتِ حال میں تناؤ تھا۔ ایک دن میرے سی او لیفٹیننٹ کرنل میاں حفیظ نے مجھے اپنے دفتر میں طلب کیا اور کسی حد تک پریشان لہجے میں کہا: ''شریف، میں تمہیں ملٹری کمانڈر کے عہدے سے سبک دوش کرنا چاہتا ہوں۔'' میں اس بیان پر حقیقتاً ششدر رہ گیا۔ لیفٹیننٹ کرنل حفیظ کے ساتھ میرے ذاتی تعلقات بہت نزدیکی اور دوستانہ تھے۔ کنوارا اور خوش باش بے فکرا لیفٹیننٹ کرنل حفیظ مجھے بہت زیادہ پسند بھی کرتا تھا۔ اس لیے میں نے اس سے براہِ راست پوچھا: ''جناب! میں اپنی یونٹ میں ایک سینئر افسر ہوں اور میں ملٹری کمانڈر ہی رہنا پسند کرتا ہوں۔''

میری درخواست کا کوئی جواب نہ دیا گیا۔ مجھے اس کے فیصلے پر بہت دکھ ہوا لیکن میں کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ میں فوری طور پر کیپٹن طاہر کے میس کی جانب گیا تاکہ اُسے اس فیصلے کے بارے میں بتا سکوں۔ لیفٹیننٹ موتی اور لیفٹیننٹ نور کو بھی وہیں بلا لیا۔ آپس میں بات چیت کرنے کے بعد ہم نے اپنی حرکات اور

سرگرمیوں میں بہت زیادہ محتاط اور ہوشیار رہنے کا فیصلہ کیا۔ ہماری جانب سے کسی قسم کی کوتاہی بہت زیادہ فیصلہ کن اور خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ ہمیں مکمل طور پر معمول کے مطابق کام کرتے رہنا چاہیے اور ایک دوسرے سے انتہائی احتیاط کے ساتھ ملنا چاہیے۔ اس وقت کسی بھی ایسے شخص سے، جسے ہم اچھی طرح جانتے نہ ہوں یا قابل اعتبار نہ ہو، بنگلہ دیش کی بات کرنا درست نہ تھا۔ لیفٹیننٹ کرنل میاں حفیظ سے ملاقات کے بعد مجھے یقین نہیں تھا کہ آیا میں یونٹ کے ساتھ بنگلہ دیش جا رہا ہوں یا نہیں۔ حالات بڑی تیزی سے تبدیل ہو رہے تھے۔ اچانک سینئر ترین بنگالی آفیسر کرنل دستگیر کو، جو ڈویژن ہیڈ کوارٹرز میں جی آئی بھی تھے، مجاہد کور ہیڈ کوارٹرز لاہور کا آئی جی مقرر کر دیا گیا۔ کوئٹہ میں تمام بنگالی تقرری کے اس حکم پر پریشان ہو گئے۔ اگرچہ میرے لیے یہ کوئی بڑی حیرانی کی بات نہیں تھی لیکن اکثر بنگالی جی ایچ کیو کے خفیہ فیصلے سے بے خبر ہونے کی وجہ سے ششدر رہ گئے تھے۔ 16 ڈویژن کے تمام بنگالی جو مشرقی پاکستان جانے کے لیے بے تاب تھے، مایوس ہو چکے تھے اور ان کی امیدیں غارت ہو چکی تھیں۔ ایک دن میں لیفٹیننٹ نور کے ساتھ کرنل دستگیر سے ملنے کے لیے اُن کے گھر گیا۔ ان کے بیوی بچے اس وقت مشرقی پاکستان میں تھے۔ میں نے اُن سے پوچھا،

''جناب! کیا اس کے بعد بھی ہم سب کو خاموش بیٹھے رہنا چاہیے؟''

''تم کیا کرنا چاہتے ہو؟'' انہوں نے پوچھا۔

''ہمیں اپنی قومی جدوجہد میں جیسے بھی ممکن ہو سکے کچھ حصہ توڑ النا چاہیے۔'' میں نے جواب دیا۔

''کیا تم پاگل ہو گئے ہو۔ تم ڈیڑھ ہزار میل کی دُوری سے کیا کر سکتے ہو؟'' کرنل دستگیر نے سوال کیا۔

''ہم فرار ہو سکتے ہیں اور آزادی کی جنگ میں شریک ہو سکتے ہیں یا ہم بلیلی میں اسلحہ کے ڈپو کو اُڑا سکتے ہیں۔ اس طرح دفاعی قوت کی اسلحہ کی دوسری لائن تباہ ہو جائے گی۔ یہ حکمران فوجی ٹولے کے لیے ایک ناقابل تلافی نقصان ہوگا۔ اُن کی لڑنے کی قوت اس طرح بہت حد تک کمزور پڑ جائے گی۔'' میں نے جواب دیا۔

''کیا تم سودائی ہو گئے ہو۔ اس قسم کی جذباتی کارروائی نہ صرف تمہارے لیے تباہ کن ثابت ہوگی بلکہ دوسرے تمام بنگالیوں کو بھی مصیبت میں ڈال دے گی۔ یہ مکمل طور پر ناممکن ہے۔'' کرنل نے کہا۔

اس نے ہمیں مزید یاد دلایا ''تم سب نے پاسنگ آؤٹ پریڈ میں حلف اٹھایا ہے کہ تم آئین سے وفادار رہو گے۔ لہٰذا اپنے حلف سے وفادار رہو اور اپنی دیانت داری کا ثبوت دو۔'' آخر میں انہوں نے کہا کہ میری نگرانی کی جا رہی ہے، لہٰذا ہمیں ان کے پاس زیادہ نہیں آنا چاہیے۔

کتنی عجیب بات تھی۔ ہم سب جانتے تھے کہ مسٹر دستگیر ایک مخلص، بنگالی قومیت میں ڈوبے ہوئے اور محب وطن شخص تھے۔ ہم اس وجہ سے اس کی بہت عزت کرتے تھے۔ لیکن یہ کیا تھا؟ آج ہم اُن کے

منہ سے کیا سن رہے تھے؟ میرا دل نفرت سے بوجھل ہونے لگا۔ میں نے نور سے کہا، "آؤ چلتے ہیں۔"

جب ہم باہر آ رہے تھے تو انہوں نے کہا، "اتنے زیادہ جذباتی نہ ہو جاؤ۔ ذرا سوچو۔ اگر بنگلہ دیش حقیقت کا روپ دھار لیتا ہے۔ اپنے آپ کو محفوظ رکھو۔ بنگلہ دیش تمہارے اور مجھ جیسے آفیسروں کے بغیر نہیں چل سکتا۔"

اس قسم کی موقع پرستی کو ہم نے مکمل طور پر قابلِ نفرت خیال کیا۔ اس دنیا میں لوگوں کو سمجھنا حقیقت میں بہت مشکل ہے۔ میں اور نور نفرت اور غصے کے عالم میں باہر آ گئے۔ اس کے بعد جس دن وہ لاہور کے لیے روانہ ہو رہے تھے، ہم ریلوے سٹیشن گئے اور درخواست کی، "جناب! ابھی وقت ہے، ہماری آزادی کی تحریک کو آپ جیسے تجربہ کار آفیسروں کی ضرورت ہے۔ اگر آپ راضی ہو جائیں تو ہم آپ کو وہاں لے جا سکتے ہیں اور اپنی جان کی بازی لگا کر یہاں سے فرار ہو جائیں گے۔" وہ اس بات پر راضی نہ ہوئے اور لاہور کے لیے روانہ ہو گئے۔ ہم پریشانی کے عالم میں واپس آ گئے۔

اس کے بعد میں نے تنہا ملیر اسلحہ خانے کو اڑانے کا منصوبہ تیار کر لیا۔ اس وقت اسلحہ ڈپو میں میرا ایک بہت قریبی دوست تعینات تھا۔ میں نے اس سے ملاقاتوں کے بہانے خفیہ معلومات جمع کرنی شروع کر دیں۔ میرا یہ دوست بنگالیوں سے بہت ہمدردی رکھتا تھا۔ متعلقہ معلومات جمع کرنے کے بعد میں نے ایک خاکہ تیار کیا۔ ایک دن میں اپنے اس خاکے کے ساتھ میجر قادر کو ملنے گیا۔ وہ یہاں سب سے زیادہ سینئر بنگالی انجینئر آفیسر تھا۔ میں اپنے اس خاکے کی اس سے پڑتال کروانا چاہتا تھا۔ میں نے اپنا خاکہ کھول کر اس کے سامنے رکھا اور صاف الفاظ میں اپنے منصوبے کے بارے میں اُسے بتایا۔ میرا منصوبہ سن کر وہ بہت زیادہ خوف زدہ ہو گیا۔ اس نے کہا، "کتنا خطرناک کام ہے۔ کیا تم پاگل ہو چکے ہو؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ تم کیا کرنے جا رہے ہو؟ اگر تمہارا منصوبہ کامیاب ہو جاتا ہے تو پھر پورا کوئٹہ شہر تباہ ہو جائے گا۔ اس کے ساتھ ہم سب ختم ہو جائیں گے۔ تمہاری یہ کارروائی بہت پُر خطر ہے۔ میں اس معاملے میں تمہاری حوصلہ افزائی نہیں کر سکتا۔ میں تم سے درخواست کرتا ہوں کہ مجھے غلط نہ سمجھنا۔" یہاں بھی ویسی ہی مایوسی کا سامنا ہوا۔ واپس آنے سے پہلے میں نے اس سے درخواست کی کہ وہ اس منصوبے کے بارے میں کسی اور سے کوئی بات نہ کرے۔ وہ راضی ہو گیا لیکن اس کے جواب میں مجھے اس سے وعدہ کرنا پڑا کہ میں اس قسم کی خطرناک سرگرمیوں سے باز رہوں گا۔ لیکن میں نے اپنے منصوبے پر کام جاری رکھا۔ اچانک میرے دوست کو ڈپو سے تبدیل کر دیا گیا۔ یہ میرے لیے بہت بڑا صدمہ تھا۔ میں بہت مایوس ہو چکا تھا۔ جیسے ہی وہ وہاں سے گیا، ڈپو تک میری رسائی ختم ہو گئی۔ اس طرح مجھے مجبوراً اپنا منصوبہ ختم کرنا پڑا۔ یہ ایک تکلیف دہ عمل تھا لیکن مجھے یہ برداشت کرنا پڑا۔

حصہ دوم
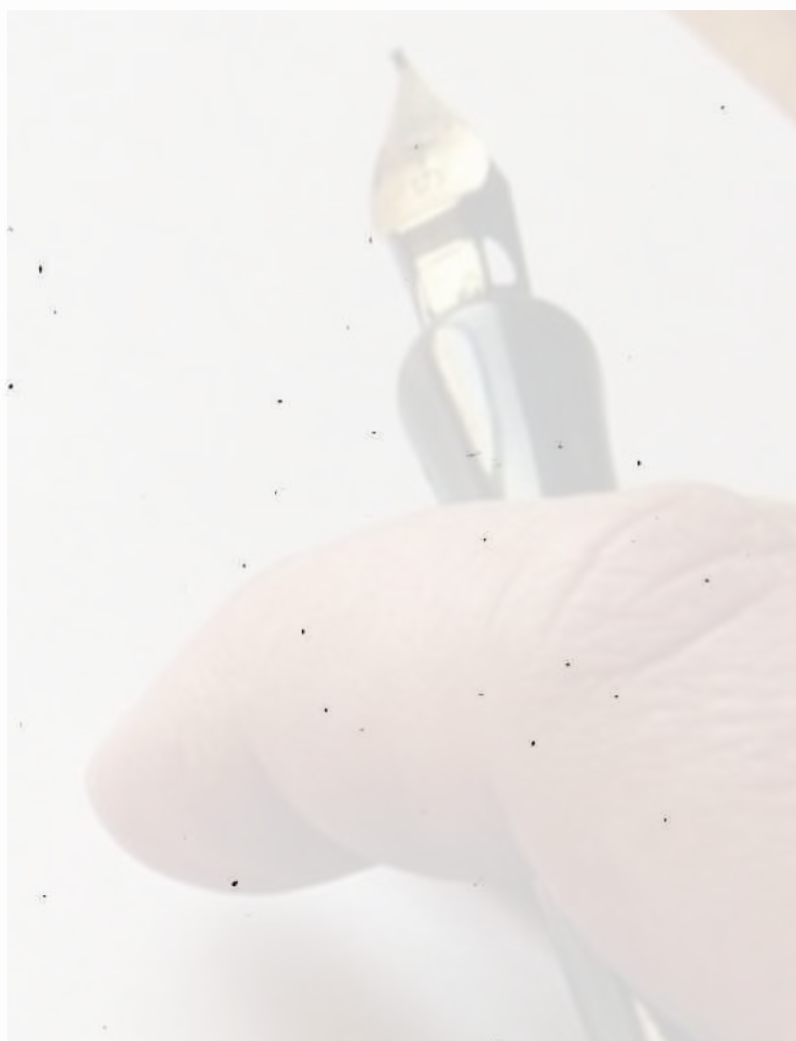
عظیم فرار اور دہلی کے تجربات

32۔ منصوبہ بندی اور فرار

میں نے از سر نو سوچنا شروع کر دیا کہ کیا کیا جائے۔ میں نے فرار ہونے اور آزادی کی جنگ میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا۔ اس مرحلے پر ایک روز لیفٹیننٹ نور میرے میس میں آیا۔ ہم لان میں بیٹھے ہوئے تھے اور باتیں کر رہے تھے، اچانک نور نے کہا، ''جناب، کیپٹن طاہر آپ سے ملنا چاہتا ہے۔ وہ آپ سے کوئی اہم بات کرنا چاہتا ہے۔'' میں نے کہا، ''ٹھیک ہے آج رات ہم اس کے میس میں کھانا کھائیں گے۔''

نور چلا گیا۔ میں غور کرتا رہا لیکن مجھے کچھ سمجھ نہ آیا کہ کیپٹن طاہر مجھ سے کیوں ملنا چاہتا تھا اور ایسی اہم بات کیا ہو سکتی تھی جس کے لیے وہ فوری طور پر مجھ سے بات چیت کرنا چاہتا تھا۔ شام کو میں اس کے میس میں پہنچ گیا۔ لیفٹیننٹ نور وہاں پہلے سے موجود تھا۔ رات کے کھانے سے قبل ہم سب کمرے میں بیٹھے موسیقی سن رہے تھے اور موسیقی کے شور میں ہم دھیمے دھیمے لہجے میں آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ بغیر کسی تمہید کے کیپٹن طاہر نے سیدھے سادے الفاظ میں مجھے بتایا، ''دالیم میں نے اور لیفٹیننٹ نور نے چمن کے راستے افغانستان فرار ہونے کا منصوبہ بنایا ہے، وہاں سے پھر بنگلہ دیش پہنچ جائیں گے۔ میں سمجھتا ہوں کہ مقامی آفیسر ہونے کے ناتے تم علاقے سے پوری طرح آشنا ہو گے۔ ہمیں تمہاری مدد کی ضرورت ہو گی۔''

اس کے اس بے باک انداز سے میں اس کے اخلاص کو محسوس کر سکتا تھا۔ جواب میں میں نے کہا، ''سر میں خود بھی فرار ہونے کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔''

کیپٹن طاہر میرا جواب سن کر بہت خوش ہوا۔ اس نے بڑی گرم جوشی سے مجھے اپنے گلے سے لگایا اور کہا، ''اگر یہ بات ہے تو کوئی وقت ضائع کیے بغیر کسی طرح بارڈر پر جانے کا بندوبست کرو اور ریکی کر کے آؤ۔''

میں اس بات سے متفق ہو گیا اور رات کا کھانا کھانے کے بعد اپنے میس میں واپس آ گیا۔ ہم تینوں نے قرآن پر حلف اٹھایا کہ ہم اپنے منصوبے کے بارے میں کسی سے کوئی بات نہیں کریں گے۔

دوسرے ہی روز علاقے کی ریکی کی مشق کا بہانہ بنا کر میں ایک فوجی جیپ میں چمن کی طرف

روانہ ہو گیا۔

میں ریکی کرنے کے بعد اسی رات کو خوش کن معلومات کے ساتھ واپس آ گیا۔ کیپٹن طاہر اور لیفٹیننٹ نور دونوں یہ بات سن کر بہت خوش ہوئے کہ میرے کچھ مقامی دوست مدد کرنے کے لیے تیار تھے۔

جب ہمارے فرار کا منصوبہ آخری مراحل میں تھا، ایک رات حوالدار نذیر، جو ڈویژن کی سگنل کور میں تھا، اچانک مجھے ملنے کے لیے آ گیا۔ یہاں میں نے سینئر اور جونیئر تمام بنگالیوں سے اچھا قریبی تعلق رکھا ہوا تھا۔ نذیر کی طرح بہت سے لوگ میرے پاس اپنے ذاتی مسائل پر مشورہ لینے کے لیے آیا کرتے تھے۔ لیکن جب میں نے اسے دیکھا تو میں بہت زیادہ حیران اور پریشان ہوا۔ وہ غیر معمولی طور پر خاموش اور سکوت میں تھا۔ اس کی آنکھوں سے ایک خوف جھلک رہا تھا۔ میں فوراً سمجھ گیا کہ کوئی بہت زیادہ غلط کام ہو چکا ہے۔ میں اسے لے کر سیدھا اپنے کمرے میں آ گیا۔ ''کیا ہوا ہے نذیر، تم اتنے مایوس کیوں نظر آ رہے ہو؟'' میں نے پوچھا۔ جواب میں نذیر نے کہا، ''جناب، بہت ہی خوفناک واقعہ ہو گیا۔ ڈویژنل کمانڈر نے ایک خفیہ پیغام کے ذریعے جی ایچ کیو کو مطلع کیا ہے کہ 3 جی سی اوز اور دو این سی اوز جن کا تعلق ای ایم ای بٹالین سے تھا، چمن بارڈر پر فرار ہونے کی کوشش میں پکڑے گئے ہیں۔''

میں یہ خبر سن کر گم سم ہو گیا اور سکتے میں آ گیا۔ میرا سر گھومنے لگا۔ میں نے حوالدار نذیر کا شکریہ ادا کیا اور اس کے جانے کے بعد فوراً کیپٹن طاہر کے پاس پہنچا۔ ہم نے نور کو بھی بلا لیا۔ لمبے بحث مباحثے کے بعد تقریباً آدھی رات کو ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ حالیہ واقعات کے پیش نظر چمن کے راستے فرار ہونا بہت خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ لہٰذا ہمیں اس راستے کو ترک کرنا پڑا اور دوسری سرحدوں سے نکلنے کی منصوبہ بندی کرنی پڑی۔ وہ راستے جو ہمارے لیے کھلے تھے، ان میں کشمیر، لاہور، سیالکوٹ یا بہاول نگر کے راستے شامل تھے۔ بہاول نگر کے راستے راجستھان کے صحرا کو پار کرنے میں دو سے تین دن لگ سکتے تھے، دوسرے کسی بھی علاقے سے بارڈر پار کرنے میں 5 سے 6 دن لگ سکتے تھے۔ اتنا وقت حاصل کرنا بہت مشکل تھا۔ لہٰذا ہم نے بہاولنگر سیکٹر کا ایک اچھے متبادل کے طور پر انتخاب کیا۔ نہ صرف یہ کہ اس سیکٹر کے ذریعے ہمیں کم سے کم وقت درکار تھا بلکہ یہ ہمارا ڈویژنل آپریشنل علاقہ بھی تھا۔ لہٰذا اپنے فرار کے لیے اس علاقے کے بارے میں متعلقہ معلومات حاصل کرنا آسان تھا۔ اس بارے میں تمام قسم کی معلومات حاصل کرنا اور فرار کے منصوبے کا خاکہ تیار کرنا میرے ذمے لگایا گیا۔ اس طرح وقت گزرتا چلا گیا۔

یہ اپریل کے پہلے ہفتے میں چھٹی کا روز تھا۔ دوپہر کے وقت میں کھانے کے بعد اپنے بستر پر آرام کر رہا تھا۔ کسی نے دروازے کو کھٹکھٹایا۔ یہ لیفٹیننٹ موتی تھا۔ وہ بہت پریشان نظر آ رہا تھا۔

''کیا ہوا ہے؟'' میں نے دریافت کیا۔

''سر، میں کچھ دنوں سے ایک دردناک ذہنی اذیت سے گزر رہا ہوں۔ آخر کار میں نے مشورے کے لیے آپ کے پاس آنے کا فیصلہ کیا۔''

''کیا کوئی بڑا گھمبیر مسئلہ ہے۔'' میں نے پوچھا۔

''جی ہاں! میں نے فرار ہونے کا فیصلہ کیا ہے۔ میں کسی بھی طریقے سے میں فرار ہو کر آزادی کی جنگ میں حصہ لینا چاہتا ہوں۔ اگر میں ناکام ہوتا ہوں تو مجھے اس کے نتائج کی کوئی پروا نہیں ہے۔ خواہ کچھ بھی ہو جائے، میں ہر قسم کا خطرہ لینے کے لیے تیار ہوں۔ آپ کیا کہتے ہیں؟''

میں نے سیدھا اس کی آنکھوں میں دیکھا اور اس کے باطن کو پڑھنے کی کوشش کی۔ وہ بہت زیادہ سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔ لیکن ہم نے اپنا منصوبہ کسی کے بھی سامنے نہ کھولنے کا حلف لے رکھا تھا۔ لہٰذا میں نے موتی سے اپنے منصوبے کے بارے میں کوئی بات نہ کی اور کہا، ''موتی میں تمہارے اخلاص کی قدر کرتا ہوں۔ لیکن اس معاملے میں میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟''

موتی کچھ سوچ رہا تھا۔ میں نے بیرے کو بلایا اور اسے کچھ کھانے کے لیے لانے کا کہا۔ موتی کھانے پر ٹوٹ پڑا۔ میں اس کے کھانے کے انداز سے سمجھ گیا کہ اس نے دوپہر کا کھانا نہیں کھایا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد موتی نے اچانک سوال کیا، ''سر، آپ پوری صورتِ حال سے مجھ سے زیادہ واقف ہیں۔ آپ کیا سوچتے ہیں؟ کیا ہم سب کو خاموش اور بے حس و حرکت بیٹھے رہنا چاہیے؟ ہم پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی؟ کیا آپ کچھ کرنے کے بارے میں نہیں سوچ رہے؟''

میں نے اس کے سوالوں کا فوری کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے صرف یہ کہا، ''کل شام 6 بجے چائنا کیفے آنا، ہم اس بارے میں مزید بات کریں گے۔'' موتی چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد میں نے کپڑے تبدیل کیے اور اپنی کار میں سیدھا لیفٹیننٹ نور کے میس میں جا پہنچا۔ وہ سہ پہر کے لیے آرام کر رہا تھا۔ میں نے اسے جگا دیا۔

نور مجھے دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ ''سر، آپ اس وقت؟ خیریت تو ہے؟''

''میں یہاں ایک ضروری معاملے پر بات کرنے کے لیے آیا ہوں۔'' جب میں نے اُسے موتی کے بارے میں تفصیل بتائی تو اس نے پوچھا، ''آپ اس کے بارے میں کیا سوچتے ہیں؟''

میں نے کہا، ''اسے ساتھ لے جانے کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟'' نور نے کچھ دیر سوچا اور کہا، ''مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن ہمیں کیپٹن طاہر کی رائے بھی لینی چاہیے۔''

''آؤ پھر کیپٹن طاہر کے پاس چلیں۔'' میں نے کہا۔ ہم کیپٹن طاہر کے میس میں گئے اور اُسے ساری بات بتائی اور کہا کہ ہم دونوں کو اسے ساتھ لے جانے میں کوئی اعتراض نہیں۔ کیپٹن طاہر بھی راضی ہو گیا اور کہا، ''اگر تم دونوں موتی کو قابلِ اعتبار خیال کرتے ہو تو پھر وہ ہمارے ساتھ شامل ہو سکتا ہے۔''

دوسرے دن شام کو پروگرام کے مطابق نور اور میں دونوں چائنہ کیفے گئے۔ وہاں پہنچ کر ہمیں معلوم ہوا کہ موتی نے پہلے ہی ہمارے پسندیدہ کھانوں کا آرڈر دے دیا تھا۔ چائنہ کیفے اس وقت کوئٹہ میں واحد چینی ریستوران تھا۔ یہ وقت گزاری کے لیے ہماری سب سے زیادہ پسندیدہ جگہ تھی۔ ایک چینی خاندان جو

میاں بیوی اور بیٹی پر مشتمل تھا، اس ریستوران کو چلا رہا تھا۔ ہم ان کے جانے پہچانے با قاعدہ مستقل گاہک تھے، اس لیے وہ ہم سب کا خاص خیال رکھتے تھے۔ ہمارے پہنچنے کے فوراً بعد کھانا چن دیا گیا۔ کھانا کھاتے ہوئے ہم نے بات چیت شروع کر دی۔

میں نے یہ کہتے ہوئے بات کا آغاز کیا، ''موتی، میں تمہارے کل والے سوالوں کا جواب دینے لگا ہوں۔ بعض وجوہات کی بنا پر میں کل تمہیں فوری جواب نہیں دے سکتا تھا۔ میں، نور اور کیپٹن طاہر بھی کسی مناسب وقت پر فرار ہونے کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔ پہلے ہم نے چمن بارڈر کے بارے میں سوچا تھا لیکن ای ایم ای بٹالین کے افسوس ناک واقعے کے بعد ہم نے اس راستے کو ترک کر دیا ہے اور اب ہم بہاولنگر سیکٹر سے راجستھان کے صحرا کے راستے بارڈر عبور کرنے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔ اگر تم پسند کرو تو ہمارے ساتھ شامل ہو سکتے ہو۔'' اس پیشکش پر موتی کا چہرہ کھل اُٹھا۔

''سر، مجھے یقین تھا کہ اس نازک وقت میں آپ بے کار نہیں بیٹھیں گے۔ میں اتنا خوش ہوں کہ آپ کو بتا نہیں سکتا۔ مجھے آپ پر فخر ہے سر۔'' میں نے ایک جیبی قرآن مجید نکالا اور اسے اس پر ہاتھ رکھ کر حلف اٹھانے کو کہا۔ اس نے اس پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور میں نے حلف کے الفاظ دہرانے شروع کیے:

''کہو، میں کسی بھی صورت میں کسی کو بھی اپنے منصوبے کے بارے میں نہیں بتاؤں گا۔ میں کوئی بھی ذمہ داری جو ضروری خیال کی جائے گی بغیر کوئی سوال کیے نبھاؤں گا۔ میں تجسس کی وجہ سے منصوبے کے بارے میں کوئی بھی غیر ضروری یا ناجائز سوالات نہیں کروں گا۔ ہم تمام بات چیت ایک دوسرے پر مکمل اعتبار کرتے ہوئے کریں گے۔''

جو کچھ میں نے کہا تھا، موتی نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے دہرایا۔ اس طرح اس شام کی ہماری یہ ملاقات اختتام کو پہنچی۔ مجھے یہ مختصر ترین اور محفوظ ترین راستہ تلاش کرنے، ضروری نقشہ جات حاصل کرنے اور ساتھ ہی ہماری فوج اور دشمن کی فوج کی علاقے میں پوزیشنوں کے بارے میں بالکل درست معلومات حاصل کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ مجھے ایک قطب نما، دوربین اور ٹیم کے ممبران کے لیے اسلحہ حاصل کرنے کی ذمہ داری بھی دی گئی تھی۔ مجھے یہ تمام ذمہ داریاں مقامی افسر ہونے کی وجہ سے سونپی گئی تھیں۔ یہ تمام رجمنٹ کے سٹور میں موجود تھیں لیکن انہیں وہاں سے سوائے عملی عسکری ضروریات کے کوئی شخص نہیں نکال سکتا تھا۔ لہٰذا مجھے دوسرے ذرائع اختیار کرنا پڑے۔ نقشہ جات کے لیے میں نے ایک بنگالی این سی او حوالدار شفیق کی خدمات حاصل کرنے کا فیصلہ کیا جو انفنٹری سکول میں انٹیلی جنس سیکشن میں تعینات تھا۔ کورس کے دوران میرے اس کے ساتھ بڑے قریبی تعلقات قائم ہو چکے تھے۔ وہ میری بہت زیادہ عزت کرتا تھا جس کی وجہ ایک تو میرا بنگالی ہونا تھا، دوسرے میں نے کورس میں بہت اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کیا تھا۔ بعض اوقات ہم ملک کی مجموعی صورتِ حال کے بارے میں بھی تبادلہ خیال کیا کرتے تھے۔ وہ ہمیشہ میرا بہت مددگار رہا تھا اور خلوصِ دل سے میری مدد کرتا تھا۔ نقشہ جات کے حصول کے لیے میں نے اس کی مدد حاصل کرنے کا سوچا۔

شفیق میرے میس میں آیا، دوسرے معاملات پر بات چیت کرنے کے بعد میں نے اسے کہا، ''شفیق مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے اگر تم اجازت دو تو میں بات کروں۔''

وہ گھبرا گیا اور بولا، ''سر، ہچکچاہٹ کا اظہار کر کے مجھے شرمندہ نہ کریں۔ آپ مجھے بتائیں۔ اگر میں آپ کی کچھ مدد کر سکا تو مجھے خوشی ہوگی۔''

''میں جو کچھ کہنے والا ہوں وہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ شفیق نے جواب دیا، ''مجھے معلوم ہے کہ آپ کسی معمولی چیز کے بارے میں نہیں کہیں گے۔ آپ بتائیں میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔''

میں نے نقشہ جات کے نمبر ایک کاغذ پر لکھے اور کہا، ''مجھے ان سب کی ضرورت ہے۔'' اسے نقشہ جات کے نمبر دیکھ کر شاید اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ مجھے کیوں چاہئیں۔ وہ خاموش رہا اور میری طرف دیکھتا رہا۔ وہ شاید میرے ارادوں کے بارے میں اندازہ لگا رہا تھا۔

اُسے خاموش دیکھ کر میں نے کہا، ''ہاں! میں یہاں سے فرار ہونے کی منصوبہ بندی کر رہا ہوں۔ اسی لیے مجھے ان نقشہ جات کی ضرورت ہے۔''

میری بات کو خاموشی سے سننے کے بعد اس نے کہا، ''لیکن سر...''

میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا، ''ہاں! مجھے علم ہے کہ یہ کام خطرناک ہے۔ اگر حکام کو اس بات کا علم ہوتا ہے تو تمہیں سزا بھی مل سکتی ہے۔ لہٰذا فیصلہ کرنے سے پہلے ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچ لو۔ میری طرف سے تم پر کوئی بندش نہیں ہے کہ تم خطرہ مول لے کر میری مدد کرو۔ لیکن میری صرف ایک درخواست ہے کہ اگر تم اس کے برعکس فیصلہ کرتے ہو تو اس بارے میں کسی بھی شخص سے کوئی بات نہ کرنا۔ مجھے تم پر مکمل بھروسا ہے کہ تم میرے اس اعتبار کو ٹھیس نہیں پہنچاؤ گے۔''

حوالدار شفیق سیدھا میری آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ میری بات ختم ہونے سے پہلے وہ آگے بڑھا اور جذباتی انداز میں مجھے گلے سے لگا لیا اور کہا، ''سر، آپ نے مجھ پر اعتبار کیا ہے، میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں آپ کے اس اعتبار کو اپنی جان کی قیمت پر بھی ٹھیس نہیں پہنچنے دوں گا۔ آپ مجھے کل پانچ بجے کھوکھا بازار میں ملیں۔ میں دیکھوں گا کہ آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔''

اگلے دن میں کھوکھا بازار میں حوالدار شفیق کا انتظار کر رہا تھا۔ ہر لمحہ بڑے ہیجان میں گزر رہا تھا۔ پانچ سے پندرہ منٹ گزر گئے، وہاں حوالدار شفیق کا کوئی نام و نشان نظر نہ آ رہا تھا۔ کوئی غلط کام نہیں ہوا ہوگا، میں نے اپنے آپ کو اچھی امید دلاتے ہوئے سوچا۔ یا شاید وہ میرے منہ پر انکار نہیں کرنا چاہتا تھا اور اب نہ آ کر مجھے یہ سمجھانا چاہتا ہوگا کہ وہ اس سلسلے میں میری مدد کرنے کے قابل نہیں تھا۔ میں اس قسم کی بہت سی باتیں سوچ رہا تھا اور گزرتے لمحوں میں ہجوم کو غور سے دیکھتا جا رہا تھا۔ جب پانچ بج کر بیس منٹ ہو گئے تو میں نے سوچا شفیق آج نہیں آئے گا۔ جیسے ہی میں باہر آ رہا تھا، میں نے اسے تیزی سے اپنی طرف آتے دیکھا۔ اس کے

بائیں ہاتھ میں ایک بیگ تھا اور وہ دائیں ہاتھ سے اپنے پہنچنے کا اشارہ دے رہا تھا۔ میں اُسے دیکھ کر بہت خوش ہوا۔

''سر، تاخیر کی وجہ سے معافی چاہتا ہوں، دراصل مجھے کوئی ٹیکسی نہیں مل سکی۔'' شفیق نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔

میں نے کہا، ''آؤ، کہیں چل کر بیٹھتے ہیں۔''

ہم مارکیٹ میں ایک بجی کباب ہاؤس میں جا کر بیٹھ گئے۔ اس دن ہم نے یونٹوں کے مابین ایک ہاکی میچ کھیلا تھا۔ یہ ایک سخت کھیل تھا۔ اس میچ کے بعد میں نے تقریباً ڈیڑھ گھنٹے تک ورزش کی تھی اور مجھے بہت زیادہ بھوک لگ رہی تھی۔ ہم نے دو سالم بجی مرغوں اور کڑاہی کباب اور نان کا آرڈر دیا۔ ہم سکون سے بیٹھ گئے۔ بیرے نے ہمارے سامنے قہوہ رکھ دیا اور چلا گیا۔ ہم نے ایک خاموش کونے میں ایک میز کا انتخاب کیا تھا۔ ریکارڈ پلیئر پر مقبول فلمی گیت چل رہے تھے۔ اس نے ہمیں رازداری سے بات چیت کرنے کا موقع فراہم کیا۔ ہمارے ساتھ والے میز کے لوگ بھی ہماری باتیں نہیں سن سکتے تھے۔

''میں تو مایوس ہو گیا تھا اور تمہارے لیے پریشان بھی تھا۔'' میں نے کہا۔

''میں نے کس مشکل کے ساتھ آپ کی مطلوبہ چیزیں حاصل کی ہیں، صرف میرا خدا جانتا ہے۔'' شفیق نے جواب دیا، ''یہ خطرناک کام تھا لیکن جب کہ آپ ملک کے لیے اپنی جان خطرے میں ڈال رہے ہیں، اور اگر اس معاملے میں مجھ پر کوئی افتاد آتی ہے تو میں یہ سوچ کر اپنے آپ کو تسلی دے لوں گا کہ اس جدوجہد میں میں نے اپنا حقیر سا حصہ ڈالا ہے۔'' حوالدار شفیق نے یہ کہتے ہوئے میز کے نیچے سے بیگ مجھے پکڑا دیا۔ ''میں ہمیشہ تمہاری قربانی کو یاد رکھوں گا۔ اس وقت تمہارا شکریہ ادا کر کے میں تمہاری وقعت کو کم نہیں کرنا چاہتا۔ لیکن اب ایک اور بات، 25 اور 26 مارچ کی شرم ناک نسل کشی کے بعد میں نے یہاں بہت سے بنگالیوں سے بات کی تھی کہ کیا کیا جانا چاہیے، لیکن کسی نے بھی تم جیسا بے لوث خلوص نہیں دکھایا۔ کچھ میرے خیالات سے خوف زدہ ہو گئے تھے۔ کچھ نے بڑے غصے میں مجھے تنبیہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ میں کوئٹہ میں بہت سے بنگالیوں کے لیے خطرناک بن گیا تھا۔ کچھ نے میرے ساتھ کوئی بھی بات نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس قسم کی صورتِ حال میں تمہاری مدد نے مجھے گرویدہ کر دیا ہے۔ تمہارا حصہ کسی طور پر بھی کم تر نہیں ہے۔ اگر اللہ سبحانہٗ تعالیٰ نے مجھے آزادی کی جنگ میں حصہ لینے کا موقع عطا کیا اور میں زندہ رہا تو پھر میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہارا نام بنگلہ دیش کی تاریخ میں شامل ہوگا۔ یہ میرا تم سے پکا وعدہ ہے۔'' حوالدار شفیق بہت زیادہ جذباتی ہو گیا۔ اس کے رخساروں پر آنسو بہنے لگے۔ اس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا، ''سر، یہ کچھ بھی نہیں جو میں نے آپ کے لیے کیا ہے۔ میری خواہش ہے کہ میں آپ کے ساتھ جا سکتا۔ لیکن یہ ممکن نہیں ہے کیوں کہ میرے بیوی بچے بھی یہاں ہیں۔ میں اپنے بیوی بچوں کو یہاں چھوڑ کر کیسے بھاگ سکتا ہوں؟ یہ نااہلی ہمیشہ میرے ضمیر کو کچوکے لگاتی رہے گی۔ میں شاید اپنے آپ کو کبھی معاف نہ کر سکوں۔''

''میرے بھائی پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ بنگلہ دیش میں بھی ہر کوئی اس جدوجہد میں ذاتی طور پر شامل نہیں ہوسکتا۔ بہت سے لوگ تمہاری طرح بالواسطہ طور پر اپنا حصہ ڈال رہے ہوں گے۔ تمہارا حصہ بھی کسی طور پر اُن لوگوں سے کم نہیں ہوگا جو خود ذاتی طور پر اس جنگ میں حصہ لے رہے ہیں۔ اس طرح تم بھی جنگ آزادی کے سپاہیوں میں شامل ہو۔'' حوالدار شفیق نے میرے الفاظ سننے کے بعد اپنے آپ پر قابو پالیا۔ اس دوران بیرے نے کھانا لاکر رکھ دیا تھا۔ ہم دونوں نے خوب سیر ہوکر کھانا کھایا۔

''آج ہماری رات کی مشقیں ہیں۔ وقت بہت کم ہے، مجھے اب فوراً واپس جانا چاہیے۔'' حوالدار شفیق نے کھانا کھانے کے دوران کہا۔ کھانا ختم کرنے کے بعد میں نے شفیق کو اپنی کار میں لفٹ کی پیشکش کی۔ کار میں بیٹھتے ہوئے حوالدار شفیق نے کہا، ''سر، اگر مجھے کچھ ہوگیا تو برائے مہربانی میرے بیوی بچوں کا خیال رکھنا۔''

''اگر میں زندہ رہا تو پھر تم یقین رکھو۔'' میں نے اس سے وعدہ کیا۔ حوالدار شفیق کو اس کی منزل پر اتارنے کے بعد میں اپنے کنگز روڈ کے میس میں واپس آ گیا اور اپنے محبوب خوبانی کے درخت کے نیچے بیٹھ گیا جو لان کے درمیان ایک چھتری کی طرح کھڑا تھا۔ بہار کی ہوا غیر معروف جنگلی پھولوں کی خوشبو سے لدی ہوئی چل رہی تھی۔ کوہ مردار پر بڑا سا چاند نمودار ہو رہا تھا۔ چاندنی باغ کی روشنیوں پر غالب آ رہی تھی۔ فضا میں خاموشی اور سکون طاری تھا۔ میں کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے حوالدار شفیق کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

اب بنگلہ دیش کو آزادی حاصل کیے بیس سال گزر چکے ہیں۔ لیکن اب تک کیا ہوا ہے؟ کیا حوالدار نذیر اور حوالدار شفیق کو کسی قسم کی پذیرائی حاصل ہوسکی؟ وہ اور ان جیسے بہت سے لوگوں کو آج مکمل طور پر فراموش کر دیا گیا ہے۔ کوئی بھی ان کو یاد کرنے کی زحمت نہیں کرتا۔ نہ صرف یہ کہ آزادی سے لے کر اب تک ہر حکومت نے ان سے بے وفائی اور بے اعتنائی برتی بلکہ شرم ناک طور پر ہر حکومت اپنی پوزیشن کو مستحکم کرنے کے لیے تاریخ کو بگاڑنے اور حقائق کو اپنی مرضی کے مطابق توڑنے مروڑنے میں پہلی حکومت سے بازی لے جانے کی کوششوں میں مصروف رہی۔ آزادی کے بعد ''دوست'' ہمسایہ ملک نے اقتدار کی مسند عوامی لیگ کو سونپی جس نے طاقت کے زور پر اپنی گرفت کو مضبوط کرنا شروع کر دیا۔ شیخ مجیب پاکستان سے واپس آئے اور انہوں نے نو ماہ کی لمبی جدوجہد کا سہرا اپنے اور عوامی لیگ کے سر باندھنے کی کوشش کی جب کہ حقیقت میں 1971ء میں لڑی جانے والی آزادی کی یہ جنگ عوام نے محض اپنے بل بوتے پر لڑی تھی۔ کسی مخصوص پارٹی یا گروپ نے اس جدوجہد کا آغاز نہیں کیا تھا۔ لہٰذا کسی پارٹی یا فردِ واحد کے لیے یہ بات جائز نہیں کہ وہ آزادی کی اس جدوجہد کا سہرا اپنے سر باندھنے کی کوشش کرے۔ ''انڈیا بنگلہ دیش موئتری سمتی'' کے صدر پروفیسر شانتی میورائے، جو اس وقت وزیراعظم اندرا گاندھی کے مشیر تھے، کے درج ذیل بیان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے: ''شیخ مجیب اور ان کی پارٹی عوامی لیگ نے عوام کی امنگوں سے بے وفائی کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہ کی اور ہندوستان کے ساتھ غلامی کے ایک ایسے معاہدے پر دستخط کر دیئے جس نے حقیقت میں بنگلہ دیش کو

بھارت کی طفیلی ریاست کا درجہ دے دیا۔'' (روزنامہ ''انقلاب''، 23 مارچ 1994ء)

جمہوریت کے نام نہاد چمپئن شیخ مجیب الرحمٰن نے خود اس نومولود ریاست میں جمہوریت کا گلا گھونٹنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ انہوں نے لوگوں کے تمام انسانی اور بنیادی حقوق چھین لیے اور آمرانہ حکومت متعارف کرائی۔ اس طرح بنگلہ دیش کی نومولود ریاست میں موروثی حکومت کے سیاہ باب کا آغاز کر دیا گیا۔ انہوں نے بڑے منظم انداز میں جنگ آزادی لڑنے والوں کو صفحۂ ہستی سے مٹاتے ہوئے آزادی کی روح کو کچلنے کا آغاز کیا۔ وہ اور ان کے آقا جانتے تھے کہ آزادی کے حقیقی مجاہدوں کو خریدا نہیں جا سکتا۔ قوم کے خلاف کسی بھی سازش کے نتیجے میں وہ ہراول محافظ دستے کے طور پر سامنے ڈٹ جائیں گے۔ وہ شیخ مجیب اور ان کے غیر ملکی آقاؤں کی کسی بھی سازش کو بے نقاب کرنے کے لیے اپنی آواز بلند کریں گے۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے مقبوضہ قوتوں سے ملک کو آزاد کرایا تھا۔ اس لیے یہ وہ لوگ تھے جو قوم دشمنی کے ناپاک منصوبوں کے خلاف سینہ سپر ہو سکتے تھے۔ اس لیے جنگ آزادی کے یہ مجاہد شیخ مجیب، ان کی حکومت اور ان کے توسیع پسند غیر ملکی اتحادیوں کے لیے اہم خطرہ بنے ہوئے تھے۔ ان کے اثر و رسوخ کو ختم کرنے کے لیے ایک طرف مجیب حکومت نے نفرت انگیز پروپیگنڈا مہم کا آغاز کیا اور دوسری طرف انہوں نے سیاسی مخالفت کو دبانے کے بہانے سینکڑوں اور ہزاروں آزادی کے مجاہدین کا قتل عام شروع کر دیا۔ سفید جھوٹ کو سچ ثابت کرنے کے لیے شیخ مجیب نے دعویٰ کیا کہ اُن کی ہدایت پر شہید ضیا نے ریڈیو پر آزادی کا اعلان کیا تھا۔

اس طرح شیخ مجیب نے خود تاریخ کو بگاڑنے کے عمل کا آغاز کیا۔ انہوں نے شہید ضیا کو اعلانِ آزادی کے اعزاز سے محروم رکھنے کی کوشش کی۔ آزادی کے فوراً بعد 9 اپریل 1973ء کو ایک سہ طرفہ معاہدے پر دستخط کیے گئے۔ اس معاہدے کے تحت جنگی مجرموں کو غیر مشروط طور پر رہا کر دیا گیا۔ ایک عام معافی کا اعلان بھی کیا گیا اور اس طرح شیخ مجیب نے ذاتی طور پر شکست خوردہ قوتوں کو ایک مرتبہ پھر عوامی خواہشات کے برخلاف بنگلہ دیش کی سرزمین پر مستحکم کرنے کا فریضہ ادا کیا۔ شیخ مجیب کو جنگی مجرموں کو غیر مشروط طور پر رہا کرنے کا اختیار کس نے دیا تھا؟ اس وقت آزادی کی حامی نام نہاد قوتوں کے چمپئن کہاں تھے؟ انہوں نے اس شخصی آمریت کے خلاف آواز کیوں نہ اٹھائی؟ شیخ مجیب کے دورِ حکومت میں پروفیسر غلام اعظم اور دوسرے جنگی مجرموں کے خلاف کوئی ٹربیونل کیوں قائم کیا گیا؟ غلام اعظم نے بنگلہ دیش کی تحریک کی مخالفت اپنے سیاسی نظریے کی بنیاد پر کی تھی۔ وہ اور ان کی پارٹی یقین رکھتی تھی کہ اگر ہندوستان کی مدد سے اور عوامی لیگ کی قیادت میں جنگ لڑی گئی تو بنگلہ دیش حقیقی آزادی حاصل نہیں کر سکتا۔ کیا وہ اپنے سیاسی تجزیے اور پیش بینی میں غلط تھے؟ لیکن پھر بھی اگر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ انہوں نے جرم کا ارتکاب کیا تھا تو پھر بڑے مجرم شیخ مجیب اور ''عوامی بکسالائنس'' ہیں کیوں کہ انہوں نے اور ان کی پارٹی نے آزادی حاصل کرنے کے بعد آزادی کی جنگ کی بنیادی روح کے خلاف ایک شرم ناک منصوبے کے ذریعے ریاستی طاقت کو انوکھے انداز میں غصب کرتے ہوئے قوم سے غداری کی تھی۔ آزاد بنگلہ دیش میں ان کی حکومت نے دھرتی کے ہزاروں سپوتوں کو

وحشیانہ انداز میں موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ اس لیے انصاف کا تقاضا تو یہ تھا کہ مسٹر غلام اعظم اور دیگر افراد سے پہلے ان پر مقدمہ چلایا جاتا۔

قابل احترام مسز جہاں آراء امام ایک دلیر مجاہد آزادی رومی شہید کی والدہ ہیں۔ ان کے خاوند کو رومی کے ساتھ حراست میں لیا گیا تھا اور بعد میں وہ پاکستانی فوج کی حراست میں رومی کی موت کی خبر سن کر صدمے سے چل بسے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انہوں نے نا قابل تلافی نقصان برداشت کیا تھا۔ ان حقائق کی موجودگی میں ''عوامی بکسالائٹس'' سے ان کے گٹھ جوڑ کو کیسے جائز قرار دیا جاسکتا ہے جن کے ہاتھ شہیدوں کے خون سے رنگے ہوئے تھے؟ ''گونو عدالت'' کے اس سٹیج سے جہاں مجرموں کے لیڈر بیٹھے ہوئے نظر آرہے تھے، وہ کس طرح جنگی مجرموں پر مقدمات کا مطالبہ کرسکتی تھیں؟ یہ شہید رومی کے خون سے ایک واضح بے وفائی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ ''عوامی بکسالائٹس'' کے ساتھ شامل ہو کر جنہوں نے سینکڑوں مجاہدین آزادی کو قتل کیا تھا، انہوں نے حقیقی مجاہدین آزادی کی نظروں میں اپنی حیثیت کھو دی ہے۔ آزادی کے ایک مجاہد کے طور پر ان کے اس قسم کے روّیے پر مجھے خود بھی بہت افسوس ہوا تھا۔ رب، شاہ جہان سراج، مینن اور مختلف انقلابی پارٹیوں کے دوسرے نام نہاد ترقی پسند رہنما بھی اسی جرم میں برابر کے شریک ہیں۔ ان لوگوں کے کہنے پر اور ان کی قیادت میں ہزاروں مجاہدین آزادی اور ان کی پارٹیوں کے کارکنوں نے ''عوامی بکسالائٹس'' کی جابرانہ حکومت کی دہشت گردی کے خلاف مزاحمت کرتے ہوئے اپنی جانوں کے نذرانے پیش کیے۔ بعد میں ''عوامی بکسالائٹس'' کو جنگ آزادی کے واحد چمپئن کے طور پر پیش کرنے کی ان کی ناکام کوششوں نے بنگلہ دیش کے باشعور عوام کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ عوامی لیگ میں ان کے ادغام نے لوگوں کے ذہنوں میں موجود اس خیال کی تائید کردی کہ وہ عوامی لیگ کی بی ٹیم تھے۔ یہ تمام موقع پرست اور مفاد پرست لوگ تھے۔ شہیدوں کے خون سے اس قسم کی بے وفائی ان سب کو تاریخ کے کوڑے دان میں پھینک دے گی۔ تاریخ کا فیصلہ ظالمانہ اور ناگزیر ہے۔ یہ تاریخ دانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ حقائق کی روشنی میں سچ کو تلاش کریں۔ انسانی تاریخ ہمیشہ حقائق کی بنیادوں پر پروان چڑھی ہے۔ بنگلہ دیش کے معاملے میں بھی اس میں کوئی استثنٰی نہیں ہوگا۔

آزادی کے بعد ہم مجاہدین آزادی کو ان کا جائز مقام دینے میں ناکام رہے ہیں، یہاں تک کہ میں شہید حوالدار نذیر اور حوالدار شفیق کے خاندانوں کو فوجی پنشن دلوانے میں پوری طرح ناکام رہا ہوں۔ حوالدار شفیق اور حوالدار نذیر، دونوں نے مغربی محاذوں پر جامِ شہادت نوش کیا تھا۔ میں انہیں شہید خیال کرتا ہوں لیکن مجیب کی حکومت انہیں غدار قرار دیتی ہے۔ لہٰذا ان کے خاندانوں کو فوجی پنشن سے محروم رکھا گیا تھا۔ وہ قومیں جو اپنے شہیدوں کو جائز مقام اور عزت نہیں دیتیں، ذلت اور خواری کا شکار ہو جاتی ہیں۔ یہ ایک قرین از قیاس اور قدرتی امر ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ آزادی کے بیس سال بعد بھی ہم اقوامِ عالم میں ایک باوقار اور باعزت مقام حاصل کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ تمام قوم نااہل اور بدعنوان قیادت کے ہاتھوں یرغمال بنی

ہوئی ہے۔قوم عوام دشمن قیادت کے استبداد کے ہاتھوں بتدریج قوتِ حیات سے محروم ہوتی چلی جارہی ہے۔ ایک بے جان اور بے حس قوم مستقبل کی ترقی کی جانب ہر قدم پر لڑکھڑاتے ہوئے آگے بڑھ رہی ہے۔ایک مفلوج ہستی کی طرح، ہلاکت کی جانب بڑھتی ہوئی قوم دوسروں کے رحم وکرم اور مدد کے سہارے زندہ رہنے کی کوشش کررہی ہے۔ خارجی اور داخلی پالیسیوں میں ایک انحراف پایا جاتا ہے جو قومی عزم پیدا کرنے میں رکاوٹ ہے اور قومی اعتماد کو کمزور کررہا ہے۔ معیشت متزلزل اور لڑکھڑا رہی ہے،قوم کے ہاتھوں میں کشکول ہے اور ملک ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف کے سامنے گھٹنے ٹیکے ہوئے ہے۔ایسے کوئی حالات نظر نہیں آرہے جو کسی بہتر مستقبل کی امید دلاتے ہوں۔اس طرح آزادی لوگوں کی ایک بھاری اکثریت کے لیے بے معنی ہو کر رہ گئی ہے۔

آیئے کوئٹہ کی جانب واپس چلتے ہیں۔ایسٹ بنگال رجمنٹ کے میجر ملک ابھی تک بریگیڈ میجر کے طور پر خدمات انجام دے رہے تھے۔ بہاولنگر، فورٹ عباس سیکٹر اُن کے آپریشنل علاقے کے اندر تھا۔ بہاولپور اور پھر بہاولنگر اور یہاں سے فورٹ عباس کے راستے میں ایک چھوٹا سا سٹیشن ہارون آباد آتا ہے۔ ہارون آباد سے ہمیں اپنا سفر پیدل کرنا تھا۔ہمیں پاکستان اور ہندوستان کی دفاعی لائنوں میں سے گزر کر 20 میل کا فاصلہ طے کرکے سری کرن پور پہنچنا تھا۔ پاکستان اور ہندوستان کی دفاعی پوزیشنوں میں فوجی دستوں کی صف بندی کا خفیہ نقشہ میجر ملک سے حاصل کرنے کی کوشش کرنی پڑی تھی۔ان نقشوں پر انتہائی خفیہ دفاعی صف بندی کی تفصیلات دکھائی گئی تھیں۔ہمیں بڑی تیزی سے کام کرنا تھا۔ نقشے حاصل کرنے کے فوراً بعد، دوسرے روز میں نے میجر ملک کو فون کیا کہ میں آپ سے فوری طور پر ملنا چاہتا ہوں۔ میں ان کے دفتر میں لیفٹیننٹ موتی کے ساتھ پہنچا۔ وہ دفتر میں اکیلے تھے۔

جیسے ہی ہم داخل ہوئے، انہوں نے اپنی مخصوص بھاری آواز میں مجھ سے پوچھا، ''دالیم کیا مسئلہ ہے؟''

''میں آپ کی نئی کار دیکھنے آیا ہوں۔یہ کیسی چل رہی ہے؟'' میں نے جواب دیا۔

''ہاں! وہ تمہاری فوکس ویگن جتنی دلکش تو نہیں لیکن مجھے کوئی شکایت نہیں ہے۔''

''سر، گھر چلتے ہیں۔ہم دوپہر کا کھانا اکٹھے کھائیں گے۔''

''تم دوپہر کا کھانا کھانا چاہتے ہو، خوش آمدید۔اپنی بھابی کو فون کرکے بتادو۔ کیا مسئلہ ہوا ہے؟ کیا پھر کسی سینئر سے جھگڑا ہو گیا ہے؟ میرے خیال میں، میں اس نوجوان سے واقف نہیں ہوں جو تمہارے ساتھ ہے۔'' میں اس وقت بھابی سے باتیں کررہا تھا۔

''ہیلو بھابی، میں دالیم ہوں۔ہم دوپہر کے کھانے کے لیے گھر آرہے ہیں۔ہم تین ہوں گے۔ امید ہے کہ کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔''

''آج یہ سورج کس جانب سے نکل آیا ہے؟ اب جو یہ دوپہر کے کھانے کا پوچھ رہے ہو، کیا اتنے

عرصے میں کبھی بھابی کو یاد کیا تھا؟'' وہ چڑھ دوڑیں۔ میں جواب دیتے ہوئے تھوڑا سا گھبرا گیا۔

''یقین مانیے بھابی، میں کورس میں بہت زیادہ مصروف تھا، اس وجہ سے آپ سب کو ملنے نہیں آ سکا۔ صرف میرا خدا جانتا ہے کہ میں نے آخری چند روز کیسے گزارے ہیں۔''

''چلو جلدی آ جاؤ۔'' انہوں نے کہا۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور سلام کہتے ہوئے ریسیور رکھ دیا۔

''سر، گھر کی جانب سے ٹھیک ہے۔ ہاں، میں نے آپ کا تعارف کروانا تھا۔ یہ 3 ایسٹ بنگال رجمنٹ سے لیفٹیننٹ موتی ہیں۔ اور موتی یہ 'سینئر ٹائیگرز' سے میجر ملک ہیں۔''

لیفٹیننٹ موتی نے میجر ملک کے ساتھ ہاتھ ملایا اور کہا، ''سر، اگرچہ مجھے پہلے آپ سے ملاقات کا موقع نہیں مل سکا، لیکن میں نے آپ کے بارے میں کافی سن رکھا تھا۔''

خوش باش میجر ملک مسکرایا۔ ''موتی یہاں او ڈبلیو جے ٹی سی کے لیے آیا ہے۔ اس نے کورس میں بہت عمدہ کارکردگی دکھائی ہے۔'' میں نے بتایا۔

''بہت اچھی بات ہے۔ میں نے سنا ہے کہ تمہاری کارکردگی بھی بہت زیادہ عمدہ رہی ہے۔'' میجر ملک کی بات نے مجھے کسی حد تک گڑبڑا دیا۔ میں نے جواب میں کوئی بات نہ کی۔

''آئیے اب چلتے ہیں۔''

''تمہارا مطلب ہے، ابھی اس وقت؟'' میجر ملک نے پوچھا۔

''جی ہاں! اتنی زیادہ محنت کا کیا فائدہ ہے، سر۔''

''دالیم، تم آج بہت مختلف نظر آ رہے ہو، لیکن خیر چلو چلتے ہیں۔'' میجر ملک نے اپنے پی اے کو بلایا، اسے کچھ ہدایات دیں اور پھر ہم دفتر سے باہر آ گئے۔

ہم ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے۔

''اچھا تو اب مجھے بتاؤ، اصل مسئلہ کیا ہے؟''

''سر معاملہ انتہائی خفیہ ہے۔ ہم نے فرار کا منصوبہ بنایا ہے۔''

میجر ملک کو میری اس قسم کی کھلم کھلا براہِ راست بات پر دھچکا سا لگا، کچھ دیر کے لیے وہ مکمل خاموش رہے۔ بھابی کچن میں کھانا پکانے میں مصروف تھیں۔

''ایک منٹ۔'' میجر ملک اٹھ کر گئے اور تھوڑی دیر بعد سگریٹوں کے پیکٹ کے ساتھ واپس آئے۔ انہوں نے کہا ''تمہیں علم ہے میرا بیٹ مین زیادہ قابل اعتبار شخص نہیں ہے۔ میں نے اسے کینٹین پر بھیج دیا ہے۔'' میں سمجھ سکتا تھا کہ میجر ملک نے ہماری گفتگو کے گمبھیرپن کی وجہ سے احتیاطی اقدامات لیے ہیں۔

''تم یہ بات یقین سے کہہ رہے ہو؟''

''جی سر، اس طرح زندہ رہنے کا کوئی فائدہ نہیں ۔ یہ شرمناک بات ہے۔ اس نازک مرحلہ پر جنگ آزادی کو آگے لے جانے کے لیے قوم کو ہمارے جیسے افراد کی ضرورت ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے، سر؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں! تمہاری بات کافی حد تک درست ہوسکتی ہے لیکن ہمارے پاس اس جدوجہد کے بارے میں کوئی مستند اطلاعات نہیں ہیں۔ کیا ایسے حالات میں اس قسم کا قدم اٹھانا عقل مندی ہوگا؟ کیا یہ بہت زیادہ خطرناک نہیں ہے؟''

''سر، آپ کی بات میں وزن ہے اور جو آپ کہہ رہے ہیں قابل غور ہے۔ لیکن جس طرح سے فوجی، مشرقی پاکستان بھیجے جارہے ہیں اور ان کی لاشوں کے بیگ واپس لائے جارہے ہیں، اس سے عیاں ہوتا ہے کہ وہاں کوئی کارروائی ہورہی ہے۔ اس کے علاوہ، کیا آپ سمجھتے ہیں کہ بین الاقوامی پریس اور میڈیا سب جھوٹا پروپیگنڈا کررہے ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے، اس مہم میں میں تمہاری کیا مدد کرسکتا ہوں؟'' میجر ملک نے پوچھا۔

''ہم ہارون آباد سے کرن پور پہنچنے کی کوشش کریں گے۔ کافی غوروخوض کے بعد ہم نے اس سیکٹر کو مناسب ترین خیال کیا ہے۔''

''تمہارا فیصلہ بالکل درست ہے۔ چمن بارڈر کے بعد یہ سب سے زیادہ موزوں راستہ ہے۔ یہ تمہارے صرف دو یا تین دن لے گا۔'' میجر ملک نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

''سر آپ کو خفیہ آپریشنل علاقوں کی نشاندہی کرنی ہوگی۔'' میں نے درخواست کی۔

''کھانا تیار ہے اور میز پر لگا دیا گیا ہے۔'' ایپرن باندھے بھابی نے آکر ہمیں اطلاع دی۔

جیسے ہی بھابی سامنے آئیں میجر ملک نے صورتِ حال کو ہلکا پھلکا کرنے کے لیے موضوع بدلا۔ انہوں نے کہا، ''آؤ، پہلے کھانے سے انصاف کرلیں۔ بھوکے پیٹ کوئی بھی درست طور پر نہیں سوچ سکتا۔'' ہم سب اٹھے اور کھانے کی میز کے گرد بیٹھ گئے۔ تمام بچے سکول گئے ہوئے تھے۔ کھانا بہت اشتہا انگیز تھا۔ تازہ مچھلی مختلف طریقوں سے پکائی گئی تھی۔

''بھابی کی کیا بات ہے! آپ نے یہ سب کچھ کیسے تیار کرلیا؟'' میں نے سوال کیا۔

''میں نے آج صبح ہی یہ اوڑک سے منگوائی تھیں۔'' اوڑک، کوئٹہ سے دس پندرہ میل دُور ایک چھوٹی سی سرسبز وادی ہے۔ ایک پہاڑی ندی وادی کے بالکل درمیان سے گزرتی ہے۔ تمام وادی مختلف قسم کے پھلوں کے باغات سے بھری ہوئی ہے۔ اس کے چاروں طرف بلند پہاڑ ہیں۔ یہ تمام گہرے سبز رنگ کے چیل کے درختوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ یہ ندی ٹراؤٹ اور میٹھے پانی کی دوسری قسم کی مچھلیوں سے بھری ہوئی ہے۔ بنگالیوں کو جب بھی موقع ملتا، وہ اوڑک سے مچھلیاں منگواتے۔ ہم کنوارے لڑکے اکثر مچھلیوں سے کاربھر کرنسی بھی بھابی کے کچن میں جا دھمکتے تھے اور تازہ مچھلی اور چاولوں سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ ہم نے

چاولوں اور مچھلیوں سے خوب پیٹ بھرا اور بھابی کا شکریہ ادا کر کے واپس ڈرائنگ روم میں آ کر بیٹھ گئے اور دوبارہ باتیں کرنے لگے۔

کھانا کھاتے ہوئے میجر ملک نے میری درخواست کا جواب سوچ لیا تھا۔ انہوں نے صوفے پر دراز ہوتے ہوئے سگریٹ سلگایا اور کہا، ''میں تمہاری جرأت کو خراجِ تحسین پیش کرتا ہوں۔ لڑکو! میں تمہاری ضرور مدد کروں گا لیکن ایک درخواست ہے کہ یہ بات مکمل طور پر صرف تمہارے اور میرے درمیان ہی رہنی چاہیے۔''

''یقیناً سر، ہم آپ سے مخلصانہ وعدہ کرتے ہیں۔''

''لیکن نقشے کہاں سے آئیں گے؟ تم علاقے کے آپریشنل نقشہ جات کہاں سے حاصل کرو گے۔'' میجر ملک نے ایک سوالیہ نگاہ ڈالی۔

''ہم نے پہلے ہی ان کا انتظام کر لیا ہے۔'' میں نے فوراً کہا، ''اپنی رجمنٹ سے نہیں، کہیں اور سے۔'' میجر ملک نے اطمینان کا سانس لیا اور پھر کہا، ''پھر کل مجھے وہ دے دینا۔''

''سر، کل نہیں، میں آپ کو ابھی دوں گا اور کل واپس لے لوں گا۔'' میں نے موتی کو بھیجا کہ کار سے نقشے نکال لائے۔ وہ لے کر آیا۔ میجر ملک نے ان کا معائنہ کیا اور کہا، ''زبردست!''

وہ اُٹھ کر اندر گئے اور نقشوں کو محفوظ جگہ پر رکھ کر واپس آ گئے۔

''سر، اب ہم اجازت چاہتے ہیں، آج اور بھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔''

''میں سمجھتا ہوں، دالیم تم جانتے ہو، مجھے یقین ہے کہ تم جیسے لوگوں کی قربانی یقیناً بنگلہ دیش کو آزادی دلوا دے گی۔ میری بھی خواہش ہے کہ تم لوگوں کے ساتھ شامل ہو جاؤں۔'' میجر ملک بہت سنجیدہ نظر آ رہے تھے اور ان کی آواز بھاری ہو رہی تھی، ''لیکن میں اپنے بیوی بچوں کی ذمہ داری کے ساتھ بندھا ہوا ہوں۔ میں ان کو کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔ میں ان سے جدا ہو کر کیسے جا سکتا ہوں۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں سر، لیکن سر، اگرچہ آپ کا ہمارے ساتھ جانا ممکن نہیں لیکن آپ کی مدد بہت اہمیت رکھتی ہے۔ اس طرح آپ بھی آزادی کے مجاہدین میں شامل ہیں۔ اگر ہم زندہ رہے تو پھر اس قومی جدوجہد میں آپ نے جو حصہ ڈالا ہے، وہ ضرور قوم کے علم میں ہوگا۔ یقین کیجئے سر، آپ واحد سینئر آفیسر ہیں جن سے ہمیں پرخلوص مدد اور حوصلہ افزائی ملی ہے۔ ہم باقی تمام کو جانتے ہیں۔ تمام منافق اور کاغذی شیر ہیں۔ وہ تمام خودغرض اور بزدل ہیں۔ وہ صرف نام ہی کے بنگالی ہیں۔''

میں میجر ملک کی آنکھوں میں آنسو دیکھ سکتا تھا۔ ہمیں میجر ملک ایم کیو جیسے خوش باش اور بے فکرے انسان میں ایک حقیقی محبِّ وطن کی جھلک نظر آئی۔ اس سے میرے دل میں ان کی عزت و توقیر کئی گنا مزید بڑھ گئی۔ ہم کھڑے ہو گئے اور ان کو سلیوٹ پیش کیا۔ وہ ہمارے ساتھ ہی گھر سے باہر نکلے، جب میں کار کی جانب بڑھ رہا تھا تو انہوں نے اچانک مجھے اور موتی کو جذباتی انداز میں گلے لگاتے ہوئے کہا، ''لڑکو میں

تمہاری خیریت کے لیے دعا گو ہوں، اپنا خیال رکھنا۔'' ہم میس میں واپس آ گئے۔

''ایمان داری کی بات ہے، میجر ملک ایک شان دار انسان ہے۔'' موتی نے کہا۔

''میں بھی نہیں سمجھتا تھا کہ ہمیں ان سے اس قسم کا تعاون ملے گا۔ اس دنیا میں لوگوں کو سمجھنا حقیقتاً بہت مشکل ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ کچھ معاملات پر بات چیت کرنے کے بعد موتی چلا گیا۔

لیفٹیننٹ شومی لاہور واپس جا رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ میں اس سے اس کی دوربین اور قطب نما مانگوں گا۔ ایک دن وہ مجھ سے ملنے کے لیے میس میں آیا۔ یورپیوں کی طرح سرخ سفید، مضبوط جسم اور خوب صورت شباہت کا مالک شومی ہمیشہ مسکراتا رہتا تھا۔ لیکن اس روز وہ بہت اداس نظر آ رہا تھا۔

''شومی کیا تم لاہور واپس جانا اچھا محسوس نہیں کر رہے؟'' میں نے پوچھا۔

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ یہاں آپ کے ساتھ میرا بہت اچھا وقت گزرا ہے۔ میں نے آپ کے ساتھ بہت خوشگوار وقت گزارا ہے۔ آپ سے جدا ہونا مجھے بالکل اچھا نہیں لگ رہا، لیکن اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہیں۔ مجھے اپنی یونٹ میں تو بہر حال واپس جانا ہی ہوگا۔ میں آپ کو کبھی بھی بھول نہیں سکتا، سر۔ اگر آپ یہاں نہ ہوتے تو یہاں زندگی بہت بے کیف ہوتی۔''

''شومی میں آج تم سے کچھ مانگنا چاہتا ہوں۔ لیکن پہلے وعدہ کرو کہ اگر تم میری درخواست پر عمل کرنا مشکل محسوس کرو تو پھر تم کسی اور سے اس کا ذکر نہیں کرو گے۔''

''خدا کے لیے سر، مجھے شرمندہ نہ کریں۔ بلا جھجک بات کریں آپ کو کیا چاہیے۔'' شومی کی بات سے پورا خلوص ٹپک رہا تھا۔ میں اس پر بھروسا کر سکتا تھا۔

''میں فرار ہو کر آزادی کی جنگ میں شریک ہونا چاہتا ہوں۔ میں راجستھان سیکٹر سے پار جاؤں گا اگر تم مجھے اپنی دوربین اور قطب نما دے دو تو میں تمہارا بہت شکر گزار ہوں گا۔''

''شان دار بات ہے۔ بہت اچھا خیال ہے۔ میں اپنی دوربین اور قطب نما ضرور آپ کو دوں گا۔ لیکن کیا آپ مجھے ساتھ نہیں لے جا سکتے۔ میری آپ سے درخواست ہے۔ مجھے اپنے ساتھ لے جانے پر غور کریں۔''

''ٹھیک ہے شومی، تمہارا بہت بہت شکریہ۔ میں اس مدد پر تمہارا ہمیشہ شکر گزار رہوں گا۔ فی الحال میں یہ فیصلہ نہیں کر سکتا کہ تمہیں اپنے ساتھ لے کر جا سکتا ہوں یا نہیں۔ مجھے اس بارے میں غور کرنا ہوگا۔ مجھے امید ہے کہ تم بُرا نہیں مناؤ گے۔''

''بالکل نہیں سر، آپ غور کریں اور پوری طرح سوچ سمجھ کر مجھے جواب دیں۔ اگر آپ مجھے ساتھ نہیں لے جا سکتے تو کسی قسم کی ہچکچاہٹ محسوس نہ کریں۔ میں بالکل بُرا محسوس نہیں کروں گا۔ اب مجھے اجازت دیں۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ تم دوپہر کا کھانا کھائے بغیر نہیں جا سکتے۔ کھانے کا وقت ہو چکا ہے۔'' پھر

میں نے کھانے کا آرڈر دیا۔ کھانا کھانے کے بعد شومی واپس جانا چاہتا تھا۔

''اپنے کمرے میں ہی رہنا، اندھیرا چھانے کے بعد میں آؤں گا۔'' جانے سے پہلے میں نے اسے بتایا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے جلدی جلدی کپڑے تبدیل کیے اور کیپٹن طاہر سے ملنے کے لیے روانہ ہو گیا۔ راستے میں، میں نے موتی اور نور کو بھی ساتھ لے لیا۔ غور اور سوچ بچار کے بعد ہم سب شومی کو اپنے ساتھ لے جانے کے لیے متفق ہو گئے۔ شام سے ذرا پہلے میں شومی کے پاس پہنچ گیا۔ شومی میرا انتظار کر رہا تھا۔ اس کا بیٹ مین روانگی کے لیے اس کا سامان تیار کر رہا تھا۔

''آؤ، چائنیز کھاتے ہیں۔'' میں نے اسے کار میں بٹھایا اور چائنہ کیفے کی طرف روانہ ہو گیا۔ ہم ایک خاموش کونے میں بیٹھ گئے اور کھاتے ہوئے باتیں کرتے رہے۔

''سر، آپ نے کل کہا تھا کہ آپ راجستھان سیکٹر سے گزر کر بارڈر پار کریں گے۔ کیا ایسا ہی ہے؟'' شومی نے پوچھا۔ ''بالکل، بالکل۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اس صورت میں میرا آپ کے ساتھ جانا ممکن نہیں ہوگا۔ آپ کو شاید علم نہیں، مجھے ریت سے الرجی ہے۔ میرے جسم پر خارش ہونے لگتی ہے اور چھالے پڑ جاتے ہیں۔ کل یہ بات میرے ذہن میں نہیں آئی تھی۔ میں آپ پر بوجھ نہیں بننا چاہوں گا۔ آپ کو مسائل کا سامنا ہو سکتا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ کے منصوبے میں میری وجہ سے رکاوٹ پیدا ہو۔ لہٰذا میں نے یہیں رہنے کا فیصلہ کیا ہے۔'' شومی نے کہا اور میری جانب دیکھا۔ میں اس کی آنکھوں میں غم و ملال کی پرچھائیاں دیکھ سکتا تھا۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے تسلی دینے کی کوشش کرنے لگا۔

''شومی دل چھوٹا مت کرو۔ اگر تم صحرا میں ہمارا ساتھ نہیں دے سکتے تو کیا ہوا۔ یہ کوئی آخری بات نہیں ہے۔ تم لاہور کے بارڈر سے فرار ہونے کی کوشش کر سکتے ہو۔''

''جی ہاں، یہ سیکٹر میرے لیے سب سے زیادہ موزوں ہوگا۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں سر، میں وہاں پہنچنے کے فوراً بعد فرار ہونے کی کوشش کروں گا۔''

''تمہیں ضرور کوشش کرنی چاہیے۔ میں اللہ تعالیٰ سے دعا کروں گا کہ تم اپنی کوشش میں کامیابی حاصل کر سکو۔'' میں نے شومی سے کہا۔ کھانا کھانے کے بعد ہم شومی کے میس میں واپس آ گئے۔ اس نے کافی کا آرڈر دیا۔

''سر، کیا آپ کو جلدی تو نہیں؟'' اس نے پوچھا، ''آج میں بہت پژمردگی محسوس کر رہا ہوں۔ اگر آپ کچھ مزید وقت میرے ساتھ گزار سکیں تو نوازش ہوگی۔'' شومی نے درخواست کی۔

''کوئی بات نہیں، آج مجھے کوئی خاص کام نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ ہم آدھی رات تک گپ شپ لگاتے رہے، ہم ماضی کی یادوں اور مستقبل کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔

''ایک منٹ رکیے، سر۔'' شومی اٹھا اور ایک چھوٹا ہینڈ بیگ لا کر مجھے دے دیا۔ اس میں دوربین، قطب نما اور اس کا ذاتی ہتھیار G2-7 چائنیز پسٹل موجود تھے۔ ''انہیں رکھ لیں سر، آپ کو ان کی ضرورت پڑ

سکتی ہے۔''

''میں نے تمہاری پسٹل نہیں مانگی تھی۔''

''رکھ لیں سر، آپ کو اس کی ضرورت بھی پڑ سکتی ہے۔'' شومی نے جواب دیا۔

''بہت بہت شکریہ۔ لیکن ایک بات غور سے سن لو۔ میں جانتا ہوں کہ تمہیں اپنا یہ مخصوص سامان گم کرنے پر سزا بھی ہو سکتی ہے۔ ملتان یا کسی دوسرے سٹیشن پر یہ ایف آئی آر درج کروا دینا کہ تمہارا یہ ذاتی سامان کچھ دوسرے سامان کے ساتھ ڈبے سے چوری ہو گیا ہے۔ ایف آئی آر کی نقل اپنے پاس رکھنا۔ اس طرح اگر تمہارا کورٹ مارشل بھی ہوتا ہے تو تمہاری سزا میں کافی حد تک کمی ہو سکتی ہے۔''

''بہت اچھا خیال ہے۔ میں بالکل ایسا ہی کروں گا، جیسا آپ نے کہا ہے۔''

''چلو پھر اب میں چلتا ہوں۔ پہلے ہی کافی رات ہو چکی ہے۔'' ہم دونوں باہر آ گئے۔ میں نے خدا حافظ کہنے سے پہلے ایک مرتبہ دوبارہ شومی کا شکریہ ادا کیا۔ شومی کے لاہور روانہ ہونے سے ایک روز پہلے میں نے رات کے کھانے پر اسے دعوت دی۔ ہمیشہ سے خوش باش شومی اپنے اصل مزاج میں نہیں تھا۔ میں اس فرق کو محسوس کر سکتا تھا۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد ہم کافی کے لیے لان میں آ کر بیٹھ گئے۔

''سر! آج رات آپ کے ساتھ آخری رات ہے۔ صرف خدا ہی جانتا ہے کہ ہماری دوبارہ ملاقات ہو گی یا نہیں۔'' شومی نے کہا۔

''تم نے بالکل ٹھیک کہا ہے۔ کوئی شخص نہیں کہہ سکتا کہ مستقبل میں کیا ہو گا۔ کوئٹہ میں گزرے دن اور تمہاری یادیں مجھے ہمیشہ عزیز رہیں گی۔'' میں نے جواب دیا۔

اب شومی کے جانے کا وقت ہو گیا تھا۔ اسے کل ایک لمبے سفر پر روانہ ہونا تھا۔ شومی آخری مرتبہ مجھ سے گلے ملا اور کہا، ''سر اپنا خیال رکھیں۔ اللہ ہمیشہ آپ کے ساتھ ہو۔''

''شومی میں ایک مرتبہ پھر تمہارا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اگر ہم زندہ رہے تو پھر ہم آزاد بنگلہ دیش میں دوبارہ ملیں گے۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔ خدا حافظ میرے دوست۔'' میری آواز بھرا گئی۔ میں بہ مشکل اپنے جذبات پر قابو پا سکا۔ شومی تیزی سے ٹیکسی میں بیٹھا اور نکل گیا۔

اب تک ہر کام بڑے آرام سے ہو رہا تھا۔ اچانک ہمیں پہلی رکاوٹ کا سامنا ہوا۔ اچانک کیپٹن طاہر کی تبدیلی کے احکامات آ گئے۔ انہیں بلوچ سینٹر، ایبٹ آباد میں متعین کیا گیا تھا۔ اسے فوری طور پر شمولیت کے احکام دیئے گئے تھے۔ یہ خبر سن کر ہم کیپٹن طاہر کو ملنے کے لیے دوڑے۔

اس نے ہمیں بتایا کہ اسے اپنی تعیناتی کی جگہ پر کل صبح ہوائی جہاز کے ذریعے روانگی کے لیے کہا گیا ہے۔ اس نے چند روز کی چھٹی کی درخواست دی تھی۔ لیکن ملک میں ایک ہنگامی قسم کی صورتِ حال تھی، اس کی چھٹی کی درخواست منظور نہیں کی گئی تھی۔

''ہم عجیب دہری مشکل میں پھنس گئے ہیں۔ اب ہمیں کیا کرنا ہو گا؟'' میں نے پوچھا۔

طاہر نے جواب دیا، ''ٹھیک ہے۔ اس صورتِ حال میں میرا آپ لوگوں کے ساتھ جانا کسی طور پر بھی ممکن نہیں ہے۔ لیکن منصوبے پر جلد از جلد عمل کرنے کی ضرورت ہے۔''

ہم سمجھ گئے تھے کہ اب تبدیلیوں کے احکام آنے شروع ہو گئے ہیں اور کسی بھی وقت موتی اور نور کو بھی ایسے احکامات موصول ہو سکتے ہیں۔ اس سے پیشتر کہ ہمیں ایک دوسرے سے جدا کر دیا جاتا ہمیں راہِ فرار اختیار کرنی تھی۔ دوسرے روز ہم سب کیپٹن طاہر کو الوداع کہنے ہوائی اڈے گئے۔ طاہر ایک شان دار شخصیت کے مالک تھے۔ ایک نوجوان ذہین کمانڈ آفیسر اپنا رینجر کورس مکمل کرنے کے بعد حال ہی میں امریکہ سے لوٹے تھے۔ وہاں سے واپسی کے فوراً بعد سینیئر ٹیکنیکل کورس کے لیے انہیں کوئٹہ آنا پڑا تھا۔ وہ ایک دلیر، ذہین، ہوشیار، غیر معمولی طور پر خود اعتماد نوجوان تھے۔ بہت تھوڑے عرصہ میں انہوں نے ہمارے دل جیت لیے تھے۔ ہم ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے تھے۔ پاکستان آ کر جن لوگوں نے جنگ آزادی میں شمولیت اختیار کی، ان میں سے میں، لیفٹیننٹ موتی اور لیفٹیننٹ نور پہلے جتھے میں تھے۔ ہمارے بعد آنے والوں میں کیپٹن طاہر، میجر منظور، اور کیپٹن ضیا الدین شامل تھے۔ وہ سیالکوٹ سیکٹر سے بارڈر پار کر کے آئے تھے۔ ہم سب جنگ آزادی میں کندھوں سے کندھا ملا کر لڑے تھے اور بعد میں آزاد بنگلہ دیش میں محروم طبقات کے لیے کی گئی جدوجہد میں کیپٹن طاہر کی قربانیوں سے پوری قوم اچھی طرح آگاہ ہے۔ موجودہ اور آنے والی نسلوں کے محبِ وطن افراد میں سے داستانوی ہیرو کیپٹن طاہر کو ہمیشہ عزت و احترام سے یاد رکھا جائے گا۔ ان کا نام بنگلہ دیش کی تاریخ میں سنہری حروف سے لکھا جائے گا۔ بنگلہ دیش کی سرزمین پر ان کے تاثر کو ماند کرنے کی کوئی بھی کوشش کارگر ثابت نہیں ہو سکے گی۔ شہید طاہر اپنی موت کے بعد آج بھی زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گا۔

اگرچہ کیپٹن طاہر کا تبادلہ بہت زیادہ حوصلہ شکن تھا۔ لیکن ہم نے اپنے آپ پر قابو رکھا۔ ان کی روانگی کے بعد ہم نے اپنے منصوبے پر پورے زور شور سے عمل کرنا شروع کر دیا۔

شومی کی پسٹل ہمارے لیے بہت اچھی ثابت ہوئی تھی۔ میرے پاس دو ذاتی ہتھیار تھے، ایک 32. ویبلے سکاٹ ریوالور اور دوسری 25. والتھر پسٹل تھی۔ شومی کی پسٹل مل جانے کے بعد ہتھیاروں کا مسئلہ حل ہو گیا تھا۔ اب ہماری تمام تیاریاں مکمل تھیں۔ اب ہم وقت اور موقع کے انتظار میں تھے۔

اس دوران ہماری 16 ڈویژن کی یونٹیں ترجیحی بنیادوں پر مشرقی پاکستان پہنچائی جا رہی تھیں۔ ان تمام یونٹوں میں سے جواب تک بھیجی گئی تھیں، بنگالیوں کو چھوڑ دیا گیا تھا۔ اس سے مجھے یقین ہو گیا تھا کہ جلد ہی میرے تبادلے کے احکام بھی موصول ہو جائیں گے۔ اپنی یونٹ میں، میں واحد بنگالی آفیسر تھا۔ پھر یوں ہوا کہ مجھے اور لیفٹیننٹ نور کو تقریباً بہ یک وقت تبادلے کے احکام موصول ہوئے۔ میرا کھاریاں اور نور کا کوہاٹ تبادلہ کر دیا گیا۔ ہم نے اپنی نئی تعیناتی کی جگہوں پر جاتے ہوئے فرار ہونے کا منصوبہ بنایا۔ اس طرح ہمیں سات روز مل گئے تھے جو کسی بھی تبادلے کی صورت میں اپنی جگہ پہنچنے کے لیے معمول کا وقت ہوتا ہے۔

لیکن مسئلہ موتی کے ساتھ تھا۔ اس کے تبادلے کے ابھی تک احکامات نہیں آئے تھے۔ بہت سے بنگالی آفیسرز جو مشرقی پاکستان سے انفنٹری سکول آف ٹیکٹکس میں مختلف کورسوں کے لیے آئے تھے، ان کی تقرری مغربی پاکستان میں مختلف یونٹوں میں کردی گئی تھی۔ صرف موتی کے تبادلے اور تعیناتی کے احکام میں تاخیر ہو رہی تھی۔ ہمیں اس غیر معمولی تاخیر کے بارے میں کچھ کرنا تھا۔ اچانک موتی کو ایک خیال آیا۔ اس نے میرے میس سے براہِ راست راولپنڈی میں جی ایچ کیو کی ایم ایس برانچ میں فون کیا۔ خوش قسمتی سے جب اس نے ایسٹ بنگال کے تبادلوں، تعیناتیوں اور ترقیوں سے متعلقہ آفیسر انچارج سے رابطہ کیا تو موتی کو پتا چلا کہ وہ کرنل کو ذاتی طور پر جانتا تھا۔ وہ لوئر ٹوپا پبلک سکول میں موتی کے ایک روم میٹ کلاس فیلو کے والد تھے۔ اس نے اس تعلق کا پورا پورا فائدہ اٹھایا۔

''انکل! میں اکیلا ہی یہاں سکول میں گل سڑ رہا ہوں جب کہ باقی تمام آفیسروں کی تعیناتی کی جا چکی ہے۔ برائے مہربانی میرے لیے کچھ کریں، میں یہاں مایوسی کے عالم میں بہت اکتاہٹ کا شکار ہوں۔ برائے مہربانی میرے لیے کچھ کریں۔ انکل میری آپ سے التماس ہے۔''

''میرے بیٹے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہاری تعیناتی کے احکام آج جاری ہوجائیں گے۔ تم پشاور میں 6 ایسٹ بنگال رجمنٹ میں شمولیت کے لیے تیاری کرو۔''

''شکریہ انکل، میرا دوست بشیر آج کل کہاں ہوتا ہے؟ بڑا عرصہ ہوا ہے ہماری ملاقات نہیں ہوئی۔''

''بشیر چھٹیوں پر گھر میں ہے۔ ملتان کے راستے پشاور آتے ہوئے تم بشیر اور اپنی آنٹی سے بھی مل سکتے ہو۔''

''ٹھیک ہے انکل، میں ایسے ہی کروں گا۔ برائے مہربانی میری تعیناتی کے احکام آج ہی جاری کرنے کی کوشش کیجیے۔ خدا حافظ۔ موتی نے ریسیور نیچے رکھا اور خوشی سے چلا اٹھا،''ہرے، بات بن گئی ہے ، سر۔''

''بہت خوب، حقیقتاً کمال ہوگیا ہے۔'' ہم نے جواب دیا۔

اگلے روز جیسا کہ کرنل انکل نے وعدہ کیا تھا، موتی کے تبادلے کے احکام موصول ہو گئے۔ موتی کو صبح پہلے سگنل کے ذریعے اپنے تبادلے کے احکامات مل گئے تھے۔ ہماری تیاری مکمل تھی، صرف روانگی باقی تھی۔

کھیلوں کے بعد میں میس میں ورزش کر رہا تھا۔ نور اور موتی مجھے ملنے کے لیے آئے۔ دونوں بڑے خوشگوار موڈ میں تھے۔ ورزش کے بعد میں نے تیزی سے غسل کیا اور کپڑے بدل لیے۔ ہم سب نیچے آئے اور لان میں بیٹھ گئے۔ ہم نے اپنی روانگی کے بارے میں اہم فیصلے کیے۔ نور، کوہاٹ کے لیے ریل گاڑی سے روانہ ہوگا۔ لیکن آدھے راستے میں وہ بہاولپور اتر جائے گا اور سرکٹ ہاؤس میں قیام کرے گا۔

موتی اور میں نے اگلے روز وہاں ملنا تھا۔ موتی اور میں کیسے سفر کریں گے، اس کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا گیا تھا۔ جیسا کہ ہمارے حلف میں شامل تھا کہ کوئی شخص بھی غیر ضروری سولات نہیں اٹھائے گا، چنانچہ اس کے بعد ہم ''تمبولا نائٹ'' کے لیے کلب میں چلے گئے۔

میرے کمانڈنگ آفیسر نے مجھے جس قدر جلدی ممکن ہو سکے کھاریاں کے لیے روانہ ہونے کو کہا۔ لہٰذا میں اپنی تیاریوں میں مصروف ہو گیا۔ میں نے اپنا تمام بھاری سامان اپنے بیٹ مین کے ذریعے ریل گاڑی کے ذریعے کھاریاں روانہ کر دیا۔ میں نے اپنے کمانڈنگ آفیسر کو مطلع کیا کہ بجائے ریل گاڑی کے میں ہوائی جہاز کے ذریعے لاہور آؤں گا اور کھاریاں میں یونٹ میں رپورٹ کرنے سے پہلے درمیانی عرصہ لاہور میں گزاروں گا۔

اصل مسئلہ میری نئی خریدی ہوئی کار تھی۔ میں اسے کسی طرح بھی بیچنے کی کوشش نہیں کر سکتا تھا۔ اس سے شکوک جنم لے سکتے تھے۔ میں نے اسے اپنے ایک قریبی دوست کے پاس چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ اس کا تعلق لاہور سے تھا۔ میرے اس کے گھر والوں کے ساتھ بڑے قریبی تعلقات تھے اور وہ بھی مجھے بہت پسند کرتے تھے۔ میں تقریباً ان کے گھر کے فرد کی حیثیت رکھتا تھا۔ ایک دن میں نے اسے کہا، ''میں براستہ لاہور ہوائی جہاز کے ذریعے جا رہا ہوں، میری کار اپنے پاس رکھو اور اسے اپنی سہولت کے مطابق لاہور بھیج دینا۔ میں وہاں سے لے لوں گا۔''

میرے دوست نے خوشی سے یہ ذمہ داری قبول کر لی۔ ''اُس کے بارے میں فکر چھوڑ دو۔ میں سب انتظام کر دوں گا۔ تم جاؤ اور لاہور میں اچھا وقت گزارو۔ تم کب جا رہے ہو؟''

''جلد ہی۔'' میں نے جواب دیا۔ کار کا مسئلہ اس طرح حل ہو گیا تھا۔ اس موقع پر ایک اور آفت آن پڑی۔ ایک شام لیفٹیننٹ نور کھیلوں کے بعد اپنے میس کے اینٹی روم میں بیٹھا تھا۔ مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والے کچھ آفیسرز بھی وہاں موجود تھے۔ باتیں کرتے ہوئے ایک مقام پر انہوں نے بنگالیوں اور خاص طور پر شیخ مجیب کو گالیاں دینی شروع کر دیں۔

ان میں سے ایک نے کہا، ''نور تم بہت خوش قسمت ہو۔ مجیب اب تمہیں جنرل بنا دے گا۔ کیا نہیں؟ حرامی مجیب، وہ غدار ہے۔'' لیفٹیننٹ نور اس گفتگو پر بہت غصے میں آ گیا اور اس نے جواب دیا، ''اگر شیخ مجیب غدار ہے تو جنرل یحییٰ ایک بدمعاش ہے۔ وہ ہزاروں بنگالیوں کو مار رہا ہے اور ہماری ماؤں بہنوں کی عزتیں لوٹ رہا ہے۔ وہ بڑا حرامی ہے۔''

لیکن اس پر اس کی تسلی نہ ہوئی۔ اس نے جذباتی ہو کر سٹینڈ سے صدر جنرل یحییٰ کی تصویر اٹھائی اور اسے زمین پر پھینک دیا اور اسے قدموں کے نیچے مسل دیا۔ یہ ایک سنگین جرم تھا۔ اسے فوری طور پر کھلی حراست میں لے لیا گیا۔ کورٹ مارشل کی کارروائی شروع کر دی گئی۔ میں اور موتی اس اچانک افتاد پر بہت زیادہ پریشان ہو گئے۔ ہم دونوں ششدر رہ گئے تھے۔ یہ خبر سننے کے بعد ہم بھاگم بھاگ اس کے

میس میں پہنچے۔

''یہ تم نے کیا کر دیا ہے نور؟ عین آخری لمحات میں تم نے سب کچھ خطرے میں ڈال دیا ہے۔اس قسم کے رویے سے ہم بھی خطرے میں پڑ سکتے ہیں۔ ہر کوئی جانتا ہے کہ ہم ایک دوسرے کے قریبی دوست ہیں۔تم نے اس قسم کی بے وقوفی کا مظاہرہ کیسے کیا ہے؟ تمہیں شرم آنی چاہیے۔''

میں اچانک اس پر بہت زیادہ برہم ہو گیا۔ ''سر، مجھے بہت افسوس ہے۔ میں بالکل اپنے ہوش و حواس سے باہر ہو گیا تھا۔ مجھے بہت زیادہ افسوس ہے۔ جو کچھ ہوا ہے، اس پر بہت رنجیدہ بھی ہوں۔اب آپ لوگوں کو میرے بارے میں زیادہ سوچتے ہوئے وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے بلکہ جس قدر جلدی ہو سکے، فرار ہونے کی کوشش کرنی چاہیے۔ جب شہادتوں کا سلسلہ شروع ہو گا تو وہ آپ کو بھی بلا سکتے ہیں۔آپ لوگوں کو اس کیس میں ملوث ہونے سے پہلے نکل جانا چاہیے۔ میرے ساتھ جو بھی ہو گا، وہ اہمیت نہیں رکھتا۔لیکن اگر آپ لوگ بھی اس معاملے میں الجھ گئے تو آپ فرار ہونے کا موقع کھو دیں گے۔لہٰذا میں آپ سے التماس کرتا ہوں کہ مجھے اکیلا اپنی قسمت کے سہارے چھوڑ دیں اور جس قدر جلدی ہو سکے فرار ہونے کا سوچیں۔اگر آپ کے ساتھ کچھ ہوتا ہے تو میں اپنے آپ کو کبھی معاف نہیں کر پاؤں گا۔''

نور ایک بچے کی طرح آنسوؤں سے رونے لگا۔ ہمارے پاس اسے تسلی دینے کے لیے کوئی الفاظ نہ تھے۔ ہم بوجھل دل کے ساتھ میس میں واپس آ گئے۔اچانک جو کچھ ہو گیا تھا، وہ ناقابل تصور تھا۔ میں لیفٹیننٹ نور کے مستقبل کے بارے میں سوچ کر خوف زدہ ہو گیا تھا۔ بے چارہ نور! بہت سی تبدیلیوں کے بعد موتی اور میں نے 16 اپریل کو اپنے سفر پر روانہ ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ان دنوں ملتان کے راستے ہر روز لاہور کی پرواز جایا کرتی تھی۔ موتی نے اپنے سکول ایجوٹنٹ سے درخواست کی کہ وہ بجائے ریل گاڑی کے ہوائی جہاز کے ذریعے جانا چاہتا ہے اور پشاور جانے سے پہلے اپنے دوست کو ملنے کے لیے کچھ دن ملتان قیام کرنا چاہتا ہے۔ایم ایس برانچ کے کرنل کا نام سننے کے بعد ایجوٹنٹ نے سارے معاملے کو معمول کے مطابق لیا اور اسے ہوائی جہاز کے ذریعے سفر کی اجازت دے دی۔اس طرح موتی نے بھی 16 اپریل کو اُسی پرواز پر اپنی سیٹ کنفرم کروا لی۔

جیسا کہ نور کھلی حراست میں تھا، ہمارے لیے اس سے ملنا ممکن تھا۔اگر وہ بند حراست میں ہوتا تو اس کے ساتھ ملاقات کا کوئی امکان نہیں ہو سکتا تھا۔ جب سے لیفٹیننٹ نور کو حراست میں لیا گیا تھا، میں بہت پریشانی میں وقت گزار رہا تھا۔ میرا ضمیر اسے پیچھے چھوڑ جانے کی اجازت نہیں دے رہا تھا۔اس پورے عرصے میں ایک بات میرے ذہن میں آ رہی تھی۔ کیا ہم کوئی ایسا طریقہ تلاش نہیں کر سکتے کہ نور کو بھی اپنے ساتھ لے جائیں؟ بہت سوچ بچار کے بعد میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔ 15 کی صبح میں موتی کے پاس گیا۔ میں نے دیکھا کہ موتی نے اپنا بھاری سامان اپنے بیٹ مین کے ساتھ بھجوا دیا تھا۔ موتی غسل کر رہا تھا۔

''کیا معاملہ ہے سر؟ اتنی صبح صبح، خیریت تو ہے نا؟'' موتی نے پوچھا۔

''میں تمہارے ساتھ ایک اہم اور ضروری بات کرنے کے لیے آیا ہوں۔'' موتی جانتا تھا کہ جب سے نور گرفتار ہوا تھا میں بہت اذیت سے گزر رہا تھا۔ میں ہر وقت اس کے بارے میں سوچتا رہتا تھا۔

''کیا نور کے بارے میں کوئی بات ہے؟'' اُس نے پوچھا۔

''ہاں! تم ٹھیک نتیجے پر پہنچے ہو۔ میرے پاس نور کو ساتھ لے جانے کی ایک ترکیب ہے۔'' موتی نے مجھے فوراً خاموش کرادیا۔

''کیا آپ پاگل ہو گئے ہیں سر؟ آپ کیسے اسے ساتھ لے جانے کا سوچ رہے ہیں جب کہ وہ حراست میں ہے؟ اگر ہم اسے ساتھ لے جاتے ہیں تو ہمارے پکڑے جانے کے تمام امکانات موجود ہیں۔''

''برائے مہربانی پہلے میری ترکیب سن لو، میں تم سے التماس کرتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے! بتائیں آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟''

''دیکھو موتی، نور پہلا شخص تھا جس نے فرار ہونے کے لیے میری مدد طلب کی تھی۔ میں جانتا ہوں کہ اچانک غصے میں آ کر اس سے ایک سنجیدہ غلطی ہو گئی۔ انسان خطا کا پتلا ہے۔ اس کے علاوہ اس کے مستقبل کے بارے میں سوچو۔ میں اسے اس حالت میں چھوڑ کر فرار ہونا مشکل محسوس کر رہا ہوں۔ کسی بھی صورت میں میں اُسے پیچھے چھوڑ جانے پر راضی نہیں ہوں۔''

''دھیان سے سنو۔ میں اس کے لیے تین دن کے لیے ''attend C'' (بیماری کی وجہ سے گھر پر آرام) کا انتظام کرنا چاہتا ہوں اور آج اسے بہاولپور کے لیے روانہ کر دوں گا۔ وہ وہاں ہمارا انتظار کرے گا۔ میں اسے اپنی اگلی چال کے بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔ میں اسے صرف یہ بتاؤں گا کہ ہم اگلے روز 2 سے 3 بجے سہ پہر بہاولپور ریلوے سٹیشن پر ملیں گے۔ اگر وہ کوئی سوال پوچھے بغیر میرے احکامات پر عمل کرنے کو تیار ہو تو پھر اسے ساتھ لے جاتے ہیں۔ اگر راستے میں اس کے ساتھ کچھ غلط ہو جاتا ہے تو پھر ہمارے راستے میں یا ہمارے اگلے قدم کے بارے میں وہ کچھ بتانے کے قابل نہیں ہوگا۔ اس طرح ہمارا راز افشا نہیں ہو سکے گا۔ تمہارا کیا خیال ہے؟''

''ٹھیک ہے۔ آپ کی بات میں وزن ہے۔ لیکن آپ اُس کے لیے ''attend C'' کا انتظام کیسے کریں گے؟''

''پہلے تم یہ بتاؤ کہ کیا تم اسے ساتھ لے جانے پر متفق ہو؟''

''ٹھیک ہے، اگرچہ یہ اب بھی خطرناک ہے لیکن میں یہ خطرہ مول لینے کو تیار ہوں۔'' موتی نے کہا۔

میں نے خوشی سے موتی کو گلے سے لگا کر کہا، ''شکریہ! تم عظیم ہو موتی۔ اب میرے ساتھ آؤ۔''

ہم کیپٹن جمال سے ملنے کے لیے سیدھے سی ایم ایچ پہنچے۔ جب میں ڈھاکہ کالج میں طالب علم تھا تو طلبا سیاست میں سرگرم ہونے کی وجہ سے ہمارا تعارف ہوا تھا۔ بعد میں یہ جان پہچان کوئٹہ میں آ کر دوستی

میں بدل گئی تھی۔ جب ہم سی ایم ایچ کے ''بیرونی مریضان'' کے شعبہ میں پہنچے تو ہم نے کیپٹن جمال کو مریضوں کے ساتھ مصروف پایا۔

ہمیں دیکھ کر وہ ہماری جانب آئے اور کہا،''میرے دوستو! ہسپتال میں کیسے آئے ہو؟ بیٹھو، میں ابھی آپ سے بات کرتا ہوں۔''

''نہیں ہم بیٹھ نہیں سکتے۔ میں ایک ضروری کام کے سلسلے میں آیا ہوں۔''

''ٹھیک ہے، بتاؤ!'' کیپٹن جمال نے کہا۔

میں نے موتی کا مختصر سا تعارف کروایا اور کہا،''میں کل روانہ ہو رہا ہوں، لہٰذا میں نے سوچا کہ جانے سے پہلے آپ سے ملاقات کرلوں۔ آپ کو ملے بغیر کیسے جا سکتا تھا؟ اب جب کہ میں جا رہا ہوں۔ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ برائے مہربانی لیفٹیننٹ نور چوہدری کے لیے تین دن کی "attend C" کی چٹ لکھ دیں۔ وہ بے چارہ مکمل بکھر چکا ہے اور بہت دباؤ میں ہے۔''

کوئٹہ میں موجود تمام بنگالی نور کے بارے میں سن کر پریشان تھے۔ بہت سے اس کے لیے ہمدردی کے جذبات رکھتے تھے۔ کیپٹن جمال بھی ان میں سے ایک تھے۔

کیپٹن جمال نے ایک منٹ میں ''attend c'' کی چٹ لکھ کر مجھے تھما دی اور کہا،''اسے کہنا کہ جب مجھے فرصت ہوتی ہے تو انہی دنوں میں اس سے ملوں گا۔'' یہ کہنے کے بعد وہ بڑبڑائے،''بے چارے نے اپنے آپ کو مصیبت میں ڈال لیا ہے۔ خدا جانے اس کے ساتھ کیا ہوتا ہے۔ نوجوان خون اور گرم مزاجی سب بہت بڑا مسئلہ ہوتا ہے۔''

''آپ بالکل درست فرما رہے ہیں۔ اللہ حافظ!'' میں ان سے گلے ملا اور خدا حافظ کہہ کر باہر آ گیا۔ بولان ایکسپریس نے 3 بج کر 30 منٹ پر روانہ ہونا تھا۔ ہم دونوں نے میرے میس میں جلدی سے دوپہر کا کھانا کھایا اور نور کی رہائش گاہ پر پہنچ گئے۔ نور چوہدری بستر پر اپنی لنگی میں لیٹا ہوا تھا۔

''نورا گر تم میرے احکام پر بغیر کوئی سوال کیے عمل کرنے پر تیار ہو تو پھر ہم نے تمہیں اس صورتِ حال میں بھی ساتھ لے جانے کا فیصلہ کیا ہے۔ کیا تم یہ کرنے کو تیار ہو؟'' میں نے نور سے پوچھا۔

شروع میں وہ میری یہ بات سن کر پریشان ہوا لیکن جلد ہی اس نے اپنے آپ پر قابو پا لیا اور کہا، ''لیکن...''

میں نے اسے روک دیا،''کوئی لیکن ویکن نہیں۔ وقت ضائع مت کرو۔''

''میں تیار ہوں۔'' اس نے کہا۔

''بہت خوب! اب غور سے سنو۔'' موتی صبح سے خاموشی کے ساتھ میرے ہر قدم کی پیروی کر رہا تھا۔ وہ اب بھی خاموش ہی رہا۔''تمہارے پاس تین دن کے لیے ''attend c'' ہے یعنی مکمل طور پر ''بیڈ ریسٹ''۔ ٹھیک ہے۔ یہ چٹ اپنے بیٹ مین کے ذریعے ایجوٹنٹ کو بھجوا دو، اور پھر اسے تین روز کی چھٹی دے

دو۔" بیٹ مین مقامی باشندہ ہونے کی وجہ سے تین دن کی چھٹی پا کر بہت خوش ہوگیا اور فوراً ہی غائب ہوگیا۔

"اب کپڑے پہن لو اور دو جوڑے کپڑے چھوٹے بیگ میں رکھ لو۔ تم نے آج سہ پہر بولان ایکسپریس پکڑنی ہے۔ تمہارا ٹکٹ لاہور تک ہوگا، لیکن تم جیسا کہ طے کیا گیا ہے بہاولپور اتر جاؤ گے۔ تم وہاں سرکٹ ہاؤس میں قیام کرو گے۔ کل سہ پہر 2 سے 3 بجے کے درمیان ہم بہاولپور سٹیشن پر ملیں گے۔ بہاولپور پہنچنے کے بعد تم نے پتا لگانا ہوگا کہ وہاں سے بہاولنگر جانے کے کیا ذرائع ہیں اور کتنا وقت لگتا ہے۔ تم ایک فوجی آفیسر کی طرح ظاہر کرو گے جو بہاولپور میں اپنی پوسٹنگ کی جگہ جا رہا ہو۔ کیا تم سمجھ گئے ہو؟"

نور نے اپنے کپڑے اور دوسری ضرورت کی اشیاء ایک بیگ میں رکھیں۔ ہم میری کار میں ریلوے سٹیشن کی جانب روانہ ہوگئے۔ ہم نے نور کے لیے فرسٹ کلاس کے کوپے میں ایک برتھ بک کروالی۔ ریل گاڑی پہلے ہی پلیٹ فارم پر کھڑی تھی، ہم کوپے میں جا کر بیٹھ گئے۔ دروازے کو اندر سے کنڈی لگا دی۔ میں نے پانچ ہزار روپے اور ایک 25. والتھر پسٹل 25 گولیوں کے ساتھ نور کو دیا۔ نور نے خاموشی سے یہ چیزیں اپنے بیگ میں رکھ لیں۔ تھوڑی دیر بعد گارڈ کی سیٹی اور انجن وسل دونوں کی آواز آئی۔ ٹرین روانہ ہونے والی تھی۔ ہم ایک دوسرے سے گلے ملے۔

"دھیان رکھنا، اللہ تمہارا نگہبان ہو۔" میں نے کہا۔ ریل گاڑی چل پڑی۔ موتی اور میں پلیٹ فارم سے نیچے اتر آئے۔ بولان میل سٹیشن سے نکل گئی اور یوں نور کا بے یقینی کی جانب سفر شروع ہوگیا۔

ہم ریلوے سٹیشن سے باہر آئے۔ اس رات میں نے میس میں کھانا کھانا تھا۔ راستے میں میں نے موتی کو اس کی جگہ اتار دیا اور کہا کہ کل ایئر پورٹ پر ملاقات ہوگی۔ رات گئے تک ہم ڈویژنل آرٹلری کے بینڈ کے ساتھ پیتے اور کھاتے رہے۔ سارے دن کے ذہنی دباؤ کی وجہ سے میں تھکاوٹ محسوس کر رہا تھا۔ اور دوسرے میرا ذہن نور کے بارے میں سوچتے ہوئے پورے تناؤ میں تھا۔ لیکن اب میرے بس میں کچھ نہ تھا۔ میں نے جہاں تک ممکن تھا، معمول کے مطابق نظر آنے کی کوشش کی اور تمام رسمی کارروائیوں کے مکمل ہوتے ہی میں اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔ شام کو تیز پھوار پڑی تھی، لہٰذا رات قدرے ٹھنڈی تھی۔ اردلی نے ایک چھوٹا سوٹ کیس تیار کر رکھا تھا جو میں نے کل ساتھ لے کر جانا تھا۔ میری دو بہت پسندیدہ فوٹو البم ابھی تک میرے میز پر پڑی تھیں۔ ان کے ساتھ خوبانی کی لکڑی سے بنے ایک "لیٹر بکس" میں "نمی" کے تمام خطوط محفوظ پڑے ہوئے تھے۔ میز پر نمی کی ایک زندگی سے بھرپور تصویر سٹینڈ پر لگی ہوئی تھی۔ مجھے ان سب کو ضائع کرنا تھا۔ میں اپنے پیچھے کوئی نشانی چھوڑ کر نہیں جانا چاہتا تھا۔ یہ بہت خطرناک ہوسکتا تھا۔ میں فوٹو البم پر آخری نظر ڈالی۔ ہر فوٹو کے ساتھ اس کی اپنی یادیں وابستہ تھیں۔ تصویروں پر ایک نظر ڈالنے کے بعد میں نے دونوں البم آتش دان میں دہکتی ہوئی آگ میں پھینک دیں۔ آگ کے شعلوں نے انہیں اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ میں نے سارے خطوط بھی آتش دان کی نذر کر دیئے۔ وہ بھی تصویروں کے ساتھ جلنے لگے تھے۔ ان کو اس طرح جلتے ہوئے دیکھ کر مجھے گہرا دکھ محسوس ہوا۔

میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ایک دن میں اپنے اس قیمتی اثاثے سے اس طرح محروم ہوجاؤں گا۔ میں نے جلتے ہوئے شعلوں پر نظر ڈالی۔ شعلے کس بے دردی سے میرے اس قیمتی خزانے کو نگل رہے تھے جس کو میں نے ہمیشہ جان سے بھی عزیز رکھا تھا۔ میری آنکھوں سے آنسو بہ کر رخساروں پر آ گئے۔ میں نے اپنے جگری دوست ریاض الحسن چوہدری نبی کی بہن نمی سے اپنی پہلی ملاقات کو یاد کیا۔ میں، نبی، شپن، ٹوٹو اور حیدر ایک دوسرے کے بہت نزدیک تھے۔ جب کبھی بھی میں چھٹیوں میں ڈھاکہ جاتا تو ہم تقریباً 24 گھنٹے سیر کیا کرتے تھے۔ ہم مل کر کھانا کھاتے، اِدھر اُدھر گھومتے اور رات کو بھی اکٹھے مل کر ہی سوتے تھے۔ ہم ہر قسم کی موج مستی کرتے تھے۔ ہم سینما جاتے، شکار کھیلتے اور پکنک مناتے۔ جب ہم ان سرگرمیوں سے اکتا جاتے تو ہم کاکسز بازار، رنگامتی اور کپتائی یا ٹکناف کی جانب نکل جاتے۔

فروری 1968ء میں، میں چھٹیوں پر گھر گیا ہوا تھا۔ ہم ہمیشہ کی طرح اپنا وقت موج مستیوں میں گزار رہے تھے۔ ایک دن حیدر خبر لے کر آیا کہ جمنا کی جھیلوں میں نقل مکانی کر کے بہت سے پرندے آئے ہیں۔ اسی رات ہم شکار کے لیے روانہ ہو گئے۔ ہم آریچا تک کار کے ذریعے گئے۔ وہاں سے ہم نے ایک دیہاتی کشتی کرایہ پر حاصل کی، ہم صبح منہ اندھیرے ہی روانہ ہو گئے۔ ناشتہ بھی کشتی ہی میں کیا۔ ملاحوں نے ہمارے لیے ہلسا مچھلی اور چاول تیار کیے۔ دوسرے روز ہم سہ پہر کو گھر واپس پہنچے۔ سارا دن ہم شکار کھیلتے رہے تھے۔ ہم نے اچھا خاصا شکار جمع کر لیا تھا۔ ایک بڑی بطخ، چار چاس (سائبیریا کی مرغابیاں) اور اکیس بالی ہش (پانی کی مرغابیاں)۔ سردیوں میں یہ تمام پرندے جھنڈوں کی صورت میں سائبیریا سے آتے ہیں اور گرمیاں شروع ہونے سے پہلے واپس چلے جاتے ہیں۔ جیسے ہی ہم گھر پہنچے، میری دو چھوٹی بہنوں کیا اور موانے مجھے قابو کر لیا۔ برٹش کونسل میں کوئی فنکشن تھا اور انہوں نے مجھے وہاں لے جانے کی درخواست کی۔ رات اور دن کے شکار کے بعد ہم سب بہت تھکے ہوئے تھے۔ کوئی بھی دوسرا لڑکا یہ خدمت انجام نہیں دینا چاہتا تھا۔ میں ان بے چاری لڑکیوں کو انکار نہ کر سکا۔ کافی اصرار کے بعد میں نے نبی کو اپنے ساتھ جانے کے لیے تیار کر لیا۔

جب ہم برٹش کونسل پہنچے تو شام 8 بجے سے اوپر وقت ہو چکا تھا۔ ہمیں صرف چند ایک لڑکیاں برآمدے میں کھڑی نظر آئیں۔ وہاں تو فنکشن تھا، پھر اتنے کم لوگ کیوں تھے۔ شاید کوئی غلطی ہو گئی تھی۔ جیسے ہی میں نے پورچ کے نیچے گاڑی کھڑی کی موانے شیشہ نیچے کیا اور وہاں کھڑی ہوئی لڑکیوں میں سے ایک کا نام پکار کر بلایا، ''ہائے نمی، اِدھر آؤ۔''

''یہ نمی کون ہے؟'' میں نے پوچھا۔ ان میں سے ایک لڑکی ہماری کار کے پاس آ گئی۔ ''فنکشن تو ختم ہو چکا ہے۔'' لڑکی نے جواب دیا۔ اچانک نبی نے لڑکی سے سوال کر دیا، ''پھر تم یہاں کیا کر رہی ہو؟''

''میں رکشے کا انتظار کر رہی ہوں، ابھی تک کوئی نہیں ملا۔''

موانے مجھے کہا، ''بھیا یہ نمی ہے۔ نبی بھیا کی بہن۔ یہ ''ہولی کراس'' میں پڑھتی ہے۔ ہم فنکشن سے تو رہ ہی گئے ہیں، چلو اس کو گھر چھوڑ آتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے، چلو چلیں۔'' ہم نے نمی کو کار میں بٹھالیا اور نمی کے گھر کی جانب روانہ ہو گئے۔ مجھے علم تھا کہ نمی کی دو بہنیں ہیں لیکن آج تک کسی کو دیکھا نہیں تھا۔ دبلی پتلی لیکن صحت مند جسم کی مالک سانولی سی نمی، مہوا اور کیا کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی۔

نمی میرے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے پیچھے دیکھنے والے آئینے میں سے دیکھا۔ لڑکی پیاری لگ رہی تھی۔ سب سے دلکش اس کے بال تھے۔ ایک موٹی کالی چٹیا اس کے گھٹنوں سے بھی نیچے تک لٹکی ہوئی تھی۔ اس جدید دور میں اس قدر گھنے اور لمبے بال شاذ ہی نظر آتے تھے۔ نمی نے نیوی بلیو قمیص اور چوڑی دار پاجامہ پہن رکھا تھا۔ مجموعی طور پر مجھے یہ لڑکی پہلی نظر میں ہی بھا گئی تھی۔

یہ پسند رفتہ رفتہ محبت میں تبدیل ہو گئی۔ میں اپنے آپ پر حیران تھا۔ میں کافی جانا پہچانا لڑکا تھا۔ نہ صرف ایک اچھے طالب علم کے طور پر بلکہ سکول، کالج اور یونیورسٹی میں دیگر غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا تھا۔ میں دوسرے حلقوں میں بھی کافی شہرت رکھتا تھا۔ مجھے سکول کے دنوں سے ہی لڑکیوں کے ساتھ گھلنے ملنے کے مواقع میسر آتے رہتے تھے۔ لیکن مجھے کبھی بھی سطحی قسم کی محبت یا فریفتگی، جو بھی کہہ لیں، پسند نہیں تھی۔ ایسی بات بھی نہیں تھی کہ مجھے کبھی صنف نازک کی جانب سے محبت نامے وصول نہیں ہوئے تھے جیسا کہ اس عمر میں کتابوں کے تبادلے کے دوران عام طور پر ہوتا ہے لیکن انہوں نے کبھی بھی میرے ذہن پر کوئی اثر نہیں ڈالا تھا۔ میں ایسی باتوں کو ہمیشہ گھٹیا اور احمقانہ خیال کیا کرتا تھا۔ اگرچہ مجھے خود ایسے معاملات میں کوئی خاص دلچسپی نہ تھی، تاہم میں نے ایسی مہمات میں اپنے بہت سے دوستوں کی مدد ضرور کی تھی۔ بس اس سے آگے نہیں۔

میرے اصل شوق طلبا سیاست، کھیلیں، گانے، موسیقی، ڈرامے اور سماجی سرگرمیاں تھیں۔ دوسرے معاملات کے لیے میرے لیے بہ مشکل ہی کوئی وقت ہوتا تھا۔ اور یہ ایک عجیب بات تھی کہ نمی پہلی نظر ہی میں میرے دل میں اتر گئی تھی۔ اس دن کے بعد میں اس کی جانب مزید کھنچتا چلا گیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ اس کے لیے میری محبت مزید گہری ہوتی چلی گئی۔ یہ ایک عجیب سا احساس تھا۔ جواب میں نمی نے بھی مجھے دل کی گہرائیوں سے پسند کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس کا پیار فرشتوں کی طرح پاک اور بے لوث تھا۔ نمی نے پورے دل و جان سے میرا انتخاب کر لیا تھا۔ اس کی محبت اور خلوص بے مثال تھی۔ وہ میرے خواب بن چکی تھی اور میں اسے زندگی سے بڑھ کر پیار کرتا تھا۔

ہمارے والدین نے ہمارے اس معاملے کو خوش دلی سے قبول کر لیا۔ دونوں جانب بھائی اور بہنیں خوش تھیں۔ اگلی مرتبہ جب میں ڈھاکہ گیا تو ہماری منگنی ہو گئی اور یہ فیصلہ کیا گیا کہ اگلے سال ہماری شادی کر دی جائے گی۔ لیکن اب سب کچھ الٹ پلٹ ہو چکا تھا۔ مستقبل غیر یقینی ہو چکا تھا۔ ڈھاکہ سے واپسی کے بعد سے مجھے اس کے بارے علم نہیں تھا۔ مجھے حقیقتاً علم نہ تھا کہ وہ کیسی تھی اور اس وقت کہاں تھی۔ اس کے والد 1969ء سے کلکتہ مشن آف پاکستان میں ڈپلومیٹ تھے۔ وہ کلکتہ میں نمی کی چھوٹی بہن مانو کے ساتھ رہتے

تھے۔نمی کی والدہ، ہپی اور نمی کی تعلیم کی غرض سے ڈھاکہ میں ہی رہتی تھیں۔

مجھے ابا، آنٹی، شپن، مہوا، کیا، سنگیتا اور اپنے دوستوں بڈی، ٹوٹو، ہپی اور حیدر کے بارے میں بھی کچھ علم نہ تھا۔ مجھے یقین تھا کہ شپن اور بڈی اس نازک وقت میں بے کار نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ انہوں نے ضرور اس جدوجہد میں شرکت اختیار کر لی ہوگی۔ وہ خطرناک قدم جو ابھی میں اٹھانے والا تھا، ابا اور میرے خاندان کے دوسرے افراد کو خطرے میں ڈال سکتا تھا۔ وہ پاکستان فوج کے تشدد کا نشانہ بن سکتے تھے۔ خاص طور پر ابا جو حکومت کے ایک چھوٹے افسر تھے۔ جب یہ خیالات میرے ذہن میں آتے تو میں ذہنی طور پر کمزوری محسوس کرنے لگتا تھا۔ میں نے اپنے دل میں ایک عجیب سا درد محسوس کیا۔ لیکن نہیں، میں اس طرح کمزوری کا مظاہرہ نہیں کر سکتا تھا۔ ہر قیمت پر، حتیٰ کہ اپنی جان کی قیمت پر بھی مجھے وہاں جانا تھا اور آزادی کی جنگ میں شامل ہونا تھا۔ مجھے اپنے ارادے پر مضبوطی سے قائم رہنا تھا۔ قومی ذمہ داری سب سے پہلے تھی اور اس پر کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر نمی، ہپی یا میرے خاندان کے کسی فرد کے ساتھ کچھ ہو جاتا ہے تو یہ میرے لیے سب سے زیادہ تکلیف دہ بات تھی، لیکن اگر میں جنگ آزادی میں شامل ہونے سے رہ جاتا ہوں تو میں اپنے آپ کو کبھی معاف نہیں کر سکتا تھا۔ میں اپنی باقی زندگی ایک بزدل شخص کی طرح بسر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ خطوط اور تصاویر تمام جل کر راکھ ہو چکی تھیں۔ دن بھر کے تناؤ اور دباؤ کی وجہ سے میں بے حد تھک چکا تھا۔ مجھے صبح 8 بجے ایئرپورٹ پر پہنچنا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو بستر پر گرا دیا اور لائٹ بجھا دی۔

میں معمول کے مطابق صبح 6 بجے اٹھا۔ میس ویٹر نے مجھے چائے لا کر دی۔ چائے ختم کرنے کے بعد میں نے کپڑے پہنے اور نیچے ہال میں اپنا آخری ناشتہ کرنے کے لیے چلا گیا۔ میس کے ویٹر فدا خان نے بڑے دھیان سے میری خدمت کی۔ ناشتے کے بعد میں نے کک، میس ویٹروں اور میس حوالدار کو ٹپ دی اور باہر آ گیا۔

وہاں باہر کاروں اور جیپوں کی ایک قطار میرا انتظار کر رہی تھی۔ ڈویژن آرٹلری کے اکثر افسران نے مجھے ہوائی اڈے پر الوداع کہنے کا پروگرام بنایا ہوا تھا۔ میں ان کی محبت اور خلوص سے بے حد متاثر ہوا۔ ان کی محبت اور گرم جوشی اور حکمران فوجی ٹولے کے وحشیانہ پن میں کتنا فرق تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ کیا حکمران فوجی ٹولے کو مشرقی پاکستان میں عوام کو کچلنے کے اپنے فیصلے میں مغربی پاکستان کے عوام کی کسی قدر حمایت حاصل ہوگی؟ اس وقت لیفٹیننٹ کرنل میاں حفیظ آئے اور کہا، ''شریف وقت ہو گیا ہے، چلو چلیں۔''

''جی سر!'' میں نے ان سب لوگوں کو جو ایئرپورٹ تک نہیں جا رہے تھے، جلدی جلدی خدا حافظ کہا اور کرنل حفیظ کے ساتھ اُن کی جیپ میں بیٹھ گیا۔ جب انہوں نے جیپ سٹارٹ کی تو ہر کوئی روانگی کے لیے تیار ہو گیا۔ قافلہ ایئرپورٹ کی جانب جا رہا تھا۔ تقریباً تیس منٹ بعد ہم وہاں پہنچ گئے۔ موتی پہلے ہی اندر جا چکا تھا اور میرا انتظار کر رہا تھا۔

میں نے حیرانی کا اظہار کرتے ہوئے کہا، ''بہت خوب، موتی تم کہاں جا رہے ہو۔'' گویا مجھے

کچھ معلوم نہ ہو۔''

میں ملتان جا رہا ہوں اور پھر پشاور جاؤں گا۔'' لیفٹیننٹ موتی نے جواب دیا۔

''اوہ! یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ جہاز میں ہمارا وقت اچھا کٹ جائے گا۔'' میں نے کہا۔ اندر آنے کے بعد میں اپنے سارے دوستوں سے بات چیت کر رہا تھا۔ اچانک ڈویژنل آرٹلری کمانڈر بریگیڈیئر بادشاہ پتا نہیں کہاں سے آ گیا۔ وہ مجھے ایک اچھے بندوقچی کے طور پر بہت پسند کرتا تھا۔ وہ بڑے کھلے مزاج اور گرم جوش شخصیت کا مالک ایک پٹھان تھا۔ جیسے ہی وہ پہنچا ہم سب نے اسے سلیوٹ کیا۔

''شریف! الا کا، تم ہمیں چھوڑ کر جا رہے ہو، قدرے افسوس کی بات ہے۔ لیکن اسی کا نام زندگی ہے۔ پریشانی کی ضرورت نہیں، ہم ملتے رہا کریں گے۔'' بریگیڈیئر نے کہا۔ روانگی کا اعلان سنائی دیا۔ میں نے وہاں موجود تمام افسروں کو گلے سے لگایا اور خدا حافظ کہا۔ بریگیڈیئر صاحب کے اشارے پر کچھ جونیئر آفیسروں نے مجھے کندھے پر اٹھا لیا اور ''For he was a jolly good fellow'' کے نعرے مارتے ہوئے مجھے جہاز کی سیڑھیوں تک لے گئے۔

اپنے پرانے دوستوں اور ساتھیوں کو پیچھے چھوڑتے ہوئے حقیقت میں جذبات سے میرا گلا رندھ گیا۔ تاہم میں نے اپنے آپ پر قابو پایا اور ہوائی جہاز میں داخل ہو گیا۔ موتی پہلے ہی اندر جا چکا تھا۔ میں کھڑکی سے دیکھ سکتا تھا کہ تمام افسر ایک قطار میں کھڑے تھے اور اپنے ہاتھ ہلا رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد جہاز نے ٹیک آف کرنا شروع کر دیا، میرے تمام دوست اب بھی وہاں کھڑے تھے۔ کچھ نے آخری مرتبہ اپنے رومال ہلا کر مجھے الوداع کہا۔ جہاز نے فضاؤں میں بلند ہونے سے پہلے ایئر پورٹ پر دو چکر کاٹے اور پھر اپنی منزل کی جانب روانہ ہو گیا۔ دھیرے دھیرے کوئٹہ شہر آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ ہر چیز کو پیچھے چھوڑتے ہوئے جہاز ملتان کی جانب رواں دواں تھا۔ اس طرح اَن جانے راستوں کی جانب ہمارے سفر کا آغاز ہوا۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کے بعد فوکر فرینڈ شپ طیارہ، ملتان کے ہوائی اڈے پر لینڈ کر گیا۔ جیسے ہی ہم جہاز سے باہر آئے، ہم نے ملتان کی گرم ہوا کو اپنے چہروں پر محسوس کیا۔ ملتان، کوئٹہ کی نسبت زیادہ گرم تھا۔

بہاولپور اور بہاولنگر کی جانب گرمی میں بتدریج اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔ چھوٹا سا ایئر پورٹ چھاؤنی کے بالکل اندر واقع ہے۔ ''ٹرانزٹ لاؤنج'' کی جانب جائے بغیر میں موتی کے پیچھے پیچھے ''آمد'' کے سیکشن میں پہنچا اور وہاں اپنا لاہور کا اگلا سفر منسوخ کرا لیا اور ہم دونوں ایئر پورٹ سے باہر نکل آئے۔ مرکزی شہر ہوائی اڈے سے تقریباً پانچ میل دُور تھا۔ ہم نے ایک ٹیکسی لی اور چند ضروری اشیاء خریدنے کے لیے شہر کی جانب روانہ ہو گئے۔ ہم نے وہاں سے سروائیول کٹ، اینٹی سنیک کٹ اور فرسٹ ایڈ باکس خریدا۔ موتی اور اپنے لیے دو جوڑے ریگستانی جوتوں کے خریدے، برانڈی کی ایک بوتل، کچھ میٹھی گولیاں اور چیونگم خریدی۔ لیفٹیننٹ نور کے لیے بھی جوتوں کا ایک جوڑا خریدا۔ پھر ہم جیولری کی دکان پر گئے۔ وہاں ایک ایک تولے کی ٹھوس سونے کی انگوٹھیوں کا آرڈر دیا اور ان پر ''S'' اور ''M'' کے الفاظ کندہ کروائے۔ یہ سب کچھ خریدنے

کے بعد ہم ریلوے سٹیشن پر پہنچے۔

ہمیں پتا چلا کہ اگر کوئی شخص 12 بجے کی ریل گاڑی پکڑے تو وہ آسانی سے دو بجے سے سوا دو بجے تک بہاولپور پہنچ سکتا ہے۔ ہم نے سوچا کہ دو بنگالیوں کو مل کر سفر نہیں کرنا چاہیے، اس سے شکوک جنم لے سکتے ہیں۔ یہ فیصلہ ہوا کہ موتی ریل گاڑی پکڑے گا اور میں بس کے ذریعے سفر کروں گا۔ بس کے ذریعے میں نے موتی سے پہلے بہاولپور پہنچ جانا تھا۔ ملاقات کی جگہ ریلوے سٹیشن طے ہوئی۔ میں نے موتی کو ریلوے سٹیشن پر خدا حافظ کہا اور اُسی ٹیکسی میں بس سٹینڈ کی جانب روانہ ہو گیا۔ بہاولپور کے لیے ہر پندرہ منٹ بعد بس روانہ ہو رہی تھی۔ میں روانگی کے لیے تیار ایک بس میں بیٹھا اور 2 بجے سے پہلے بہاولپور پہنچ گیا۔ بس سٹینڈ سے میں نے ایک تانگہ لیا اور ریلوے سٹیشن پہنچ گیا۔ جب میں سٹیشن میں داخل ہوا تو میں نے نور کو ہاتھ میں اخبار اٹھائے پلیٹ فارم پر کھڑے دیکھا۔ ہم نے بغیر کوئی بات کیے نگاہوں کا تبادلہ کیا۔ میں دوسرے کونے پر جا کر کھڑا ہو گیا۔

تقریباً سوا دو بجے موتی کی ریل گاڑی پہنچی۔ موتی پلیٹ فارم پر اترا اور ہم تینوں علیحدہ علیحدہ سرکٹ ہاؤس کی جانب روانہ ہو گئے۔ جب ہم بہ حفاظت نور کے کمرے میں پہنچ گئے تو خوشی سے ایک دوسرے کے گلے ملے۔ نور نے پہلے ہی ہمارے دوپہر کے کھانے کا انتظام کر رکھا تھا۔ نور نے ہمیں بتایا کہ اسے راستے میں کسی مسئلے کا سامنا نہیں ہوا تھا۔ اس نے مزید بتایا کہ یہاں سے بہاولنگر جانے کے دو طریقے ہیں۔ ریل گاڑی کے ذریعے تقریباً تین گھنٹے لگتے ہیں۔ ریل گاڑی 4 بجے شام کو روانہ ہو گی۔ ٹیکسی کے ذریعے کم از کم دو گھنٹے لگ جاتے ہیں۔ ہم نے ٹیکسی لینے کا فیصلہ کیا۔ اگر ہم بہاولنگر سے ساڑھے سات بجے والی ریل گاڑی سے رہ جاتے ہیں تو پھر ہمیں فورٹ عباس کے لیے روانہ ہونے سے پہلے پوری رات بسر کرنی تھی۔ بہاولنگر بارڈر کی چھاؤنی ہے۔ وہاں پر رات بسر کرنا بہت زیادہ خطرناک ہو سکتا ہے۔ نور نے بتایا کہ بہاولپور سے بہاولنگر جانے والی ریل گاڑی مقامی ریل گاڑی تھی اور مقامی ریل گاڑی کے اوقات بہت بے قاعدہ تھے۔ جیسا کہ ہم کوئی خطرہ لینے کو تیار نہیں تھے، ہم نے ٹیکسی کا انتخاب کیا۔ اس طرح ہم فورٹ عباس کے لیے ساڑھے سات بجے شام چلنے والی گاڑی کے وقت سے بہت پہلے بہاولنگر پہنچ سکتے تھے۔ دوپہر کے کھانے کے بعد ہم نے کچھ دیر آرام کیا۔ تقریباً 4 بجے ٹیکسی حاصل کی اور بہاولنگر کی جانب روانہ ہو گئے۔ ڈرائیور سندھی تھا۔ اسے ہم نے کہا کہ اگر وہ ہمیں شام 7 بجے سے پہلے بہ حفاظت بہاولنگر پہنچا دیتا ہے تو اسے اچھی خاصی بخشش دی جائے گی۔ نوجوان ڈرائیور نے کہا، ''یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے، سر۔'' اس نے حقیقت میں بہت تیز رفتاری سے گاڑی چلانا شروع کر دی۔ اس کی ٹیکسی گرینڈ ٹرنک روڈ پر اڑتی چلی جا رہی تھی۔ ڈرائیور نے کیسٹ پلیئر میں کچھ فلمی گیت لگا دیئے۔ ہم تینوں خاموشی سے موسیقی سن رہے تھے اور ماضی، حال اور مستقبل کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ اپنے خیالات میں کھوئے ہوئے ہم تینوں کو نیند آنے لگی تھی۔ اچانک ہم سب ایک بھاری آواز کی وجہ سے جاگ گئے۔ ٹیکسی ایک جھٹکے کے ساتھ رک گئی۔

''کیا ہوا ہے؟ کیا خرابی ہوئی ہے؟'' ہم تقریباً بہ یک وقت بول اٹھے۔

ڈرائیور نے جواب دیا،''پہلے مجھے چیک کر لینے دیں۔'' اور کار سے باہر نکل گیا۔

کچھ دیر کے بعد اچھی طرح چیک کرنے کے بعد وہ واپس آیا اور بولا''صاحب گاڑی کا کرینک شافٹ ٹوٹ گیا ہے۔''

''پھر، اب کیا کرنا ہے۔'' ہم میں سے ایک نے پوچھا، یہ نور تھا۔

ڈرائیور نے جواب دیا،''گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ بہاولنگر صرف پانچ یا چھ میل دُور ہے۔ آپ کو یقیناً کوئی دوسری ٹرانسپورٹ مل جائے گی۔''

ہمیں اپنی منزل پر پہنچنے کے لیے کسی دوسری ٹرانسپورٹ کا انتظار کرنا تھا۔ کیسی مصیبت تھی۔ اگر اتنا زیادہ فاصلہ طے کرنے کے بعد ہم ناکام ہو جاتے ہیں تو کیا ہوگا؟ ہم سب نے گاڑی کو دھکا لگا کر سڑک کے ایک کنارے کیا۔ اب ہم سوائے اس کے کچھ نہیں کر سکتے تھے کہ کسی دوسری ٹرانسپورٹ کے آنے کا انتظار کریں۔ ہماری آنکھیں سڑک پر لگی ہوئی تھیں لیکن کوئی گاڑی یا دوسری چیز نظر نہیں آ رہی تھی۔ وقت گزرتا چلا جا رہا تھا۔ اندھیرا چھانے لگا تھا اور ہم اب بھی انتظار میں کھڑے تھے۔ بہاولپور کی روشنیاں دُور افق پر دیکھی جا سکتی تھیں۔ اب ہم بے صبرے ہونے لگے تھے۔ ہمارے حوصلے پوری طرح ٹوٹ چکے تھے اور ہم مکمل مایوس ہو گئے تھے۔ اچانک ہمیں دُور کسی گاڑی کی بتیاں دکھائی دیں جو کچھ فاصلے پر ہماری طرف آ رہی تھی۔ ہم تینوں عین سڑک کے درمیان کھڑے ہو گئے۔ یہ جو کچھ بھی تھا ہمیں اسے لازمی روکنا تھا۔ جب گاڑی ہمارے قریب آئی تو پتا چلا کہ یہ لینڈ کروزر تھی۔ جیسے ہی ہم نے اپنے ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا، جیپ رُک گئی۔ روڈز اور ہائی وے کا ایک انجینئر بہاولنگر جا رہا تھا۔ اس شخص نے ہمارے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے کہا،''اگر آپ تکلیف محسوس نہ کریں تو میں آپ کو لفٹ دے سکتا ہوں۔'' تکلیف، جہنم میں گئی، ہم تو اس کی بات سن کر چاند پر پہنچ چکے تھے۔ ہم نے اس کا شکریہ ادا کیا اور ٹیکسی ڈرائیور کو پیسے ادا کرنے کے بعد اپنے سامان کے ہمراہ جیپ پر سوار ہو گئے۔

تقریباً آدھ گھنٹے کے بعد ہم بہاولنگر میں داخل ہو چکے تھے۔ ساڑھے سات بج چکے تھے۔ ہماری ریل گاڑی یقیناً نکل گئی ہوگی۔

انجینئر نے پوچھا،''آپ کو کہاں اتار دوں۔''

''کہیں بھی۔'' ہم نے کہا۔ ہم اسے یہ نہیں بتانا چاہتے تھے کہ ہماری منزل ریلوے سٹیشن ہے۔ اس نے ہمیں شہر کے مرکز میں اتار دیا۔ ہم نے وہاں سے تانگہ لیا اور سٹیشن کی جانب چل پڑے۔ جب ہم سٹیشن پر پہنچے تو وہاں بہت رش تھا اور کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ یہ بہت غیر متوقع بات تھی، عام طور پر ریل گاڑی کی روانگی کے بعد سٹیشن اجاڑ ہو جاتے ہیں۔ پھر اتنا زیادہ رش کیوں تھا۔ میں بھاگ کر سٹیشن ماسٹر کے کمرے میں گیا اور فورٹ عباس جانے والی ساڑھے سات بجے والی گاڑی کے بارے میں استفسار

کیا۔اس نے بتایا کہ گاڑی لیٹ ہوگئی تھی اور ابھی تک نہیں پہنچی تھی۔میری ساری پریشانی دُور ہوگئی۔جب میں نے یہ خبر موتی اور نور کو بتائی تو وہ بھی بہت خوش ہوئے اور خوشی سے چلاتے اور تانگے سے نیچے چھلانگیں لگاتے ہوئے اترے۔ہم نے تانگے والے کو پیسے ادا کیے اور اپنے سامان کے ہمراہ پلیٹ فارم پر آ گئے۔

یہاں میں ایک بھکاری کے پاس سے گزرا۔میں نے جوش میں آ کر اسے سو روپے کا نوٹ دے دیا۔بے یقینی میں اس کی آنکھیں باہر آ گئیں۔ریل گاڑی سوا آٹھ بجے پہنچی۔ہم نے فورٹ عباس کے لیے فرسٹ کلاس کے تین ٹکٹ خریدے۔یہ بارڈر کا علاقہ تھا، یہاں ہم تینوں کے علاوہ کوئی اور فرسٹ کلاس کا مسافر نہ تھا۔

ہمیں آسانی سے ایک خالی کمپارٹمنٹ مل گیا جس پر ہم نے قبضہ جما لیا، اور ''بفے کار'' سے اپنے رات کے کھانے کا آرڈر دے دیا۔ویٹر نے کھانا لا کر دیا، اس دوران ریل گاڑی چلنا شروع ہوگئی تھی۔ہم تینوں نے رات کا کھانا کھانے کے بعد دروازے کو مقفل کیا اور اپنے پیدل سفر کی منصوبہ بندی کرنے میں مصروف ہوگئے۔ہم سب نے کالے رنگ کے لباس پہن لیے اور ان کی خفیہ جیبوں میں بیس ہزار روپے چھپا لیے۔ہر ایک کے لیے کپڑوں کا فالتو جوڑا تھا۔ہم نے تمام ضروری اشیاء کمر پر لٹکانے والے بیگ میں رکھ لیں۔نقشے باہر نکالے جن پر رات کو پیدل چلنے کے راستے کی نشاندہی کی گئی تھی۔ہم نے اپنے راستے میں پاکستانی فوج کی ایک متحرک ٹینک بٹالین، ٹینکوں کی پیش قدمی روکنے والی رکاوٹوں اور سرنگیں بچھے علاقوں کے بارے میں صلاح مشورہ کیا۔ہمیں ان کے درمیان واقع خالی جگہوں کو تلاش کرنا تھا اور اپنے راستے کا تعین کرنا تھا۔ہمیں پیدل چلتے ہوئے اپنے علاقے اور دشمن کے علاقے میں پٹرولنگ پارٹیوں کا سامنا کرنے کا احتمال بھی موجود تھا۔ہمارا منصوبہ حتیٰ المقدور ان سے بچ کر نکلنے کا تھا۔اگر ایسا ممکن نہ ہو سکے تو ہم دشمن پر قابو پانے کے لیے لڑنے کے لیے بھی تیار تھے۔کسی بھی صورت میں ہم گرفتار نہیں ہونا چاہتے تھے۔اگر ضروری ہوا تو خود کشی کر لیں گے لیکن ہتھیار نہیں ڈالیں گے۔اگر صورتِ حال ایسی ہو جائے کہ ہمیں ایک دوسرے سے جدا ہونا پڑے تو پھر ہر آدمی اپنے طور پر سری کرن پور پہنچنے کی کوشش کرے گا۔ہم نے پیدل چلنے کے لیے قطب نما پر سمتیں سیٹ کیں۔پیچھے لٹکائے جانے والے بیگ کے علاوہ دوربین، ایک کمبل، ٹارچ اور اپنے ذاتی ہتھیاروں کو بھی مناسب جگہ پر چھپانا تھا۔ہم نے صرف اپنے شناختی کارڈ اپنے پاس رکھے باقی تمام کاغذات جلا کر چلتی ہوئی ریل گاڑی کے فلش سے نیچے بہا دیئے۔ہمارے پاس دو کیمرے اور ایک جیبی سائز کا قرآن مجید تھا۔

چلنے کے لیے طریقہ کار یہ طے ہوا تھا کہ موتی آگے ہوگا، پھر میں اور میرے بعد نور آخر میں ہوگا۔سامان والا بیگ سب باری باری اٹھائیں گے۔ہر ایک گھنٹہ چلنے کے بعد دس منٹ کا وقفہ ہوگا۔اس وقفے میں ہمیں کمبل کے نیچے ٹارچ کی روشنی میں قطب نما اور نقشے کو چیک کرنا تھا۔اس طرح ہم جان سکیں گے کہ ہم درست راستے پر جا رہے ہیں۔اگر ضرورت محسوس ہوئی تو قطب نما پر سمتوں کا از سر نو تعین کیا جا سکتا تھا۔ہم

تینوں کو رات کے وقت چلنے کی مناسب تربیت دی گئی تھی اور ہم تمام طریقوں سے بہ خوبی واقف تھے۔ تقریباً سوا دس بجے ہماری ریل گاڑی ہارون آباد سٹیشن پر پہنچ گئی۔ یہ ایک چھوٹا سا سٹیشن ہے اور جس جگہ ہماری بوگی رکی تھی، وہاں اندھیرا تھا۔ ہم ڈبے سے اتر کر باہر آ گئے، چند مسافر اترے اور چڑھے اور گاڑی روانہ ہو گئی۔ جو مسافر اترے تھے، وہ معمول کے راستے سے باہر نکل گئے۔ صرف ہم ہی باقی رہ گئے تھے۔ ہم اپنے اردگرد کا بہ غور جائزہ لینے لگے۔ روشنی صرف سٹیشن کے سامنے کے حصے کو روشن کیے ہوئے تھی، باقی علاقہ اندھیرے میں گھرا ہوا تھا۔ سٹیشن میں داخل ہونے کے راستے کے باہر ایک چھوٹا سا میدان تھا، جس میں چائے کی چند دکانیں تھیں اور کچھ تانگے مسافروں کے انتظار میں کھڑے تھے۔ چار پانچ سو گز کے فاصلے پر ریلوے لائن کے متوازی گرینڈ ٹرنک روڈ چل رہی تھی۔ سڑک پر گاہے بہ گاہے بڑی بڑی گاڑیاں گزر رہی تھیں۔ ہارون آباد کا چھوٹا سا شہر سڑک کی دوسری جانب واقع تھا۔ یہ شہر ایک بازار اور اس کے گردونواح میں رہائشی مکانات پر مشتمل تھا، ہم نے اپنے سفر کا آغاز شہر کی دائیں جانب سے ایک محفوظ فاصلہ رکھ کر کرنا تھا۔ یہ بارڈر کا علاقہ تھا اور رات کا وقت تھا، اس لیے کوئی زیادہ لوگ نظر نہیں آ رہے تھے۔ ایسے نظر آ رہا تھا کہ پورا شہر سو رہا ہے۔ جب سب لوگ باہر نکل گئے تو ہم مین گیٹ سے بچتے ہوئے پلیٹ فارم کے ایک سرے سے باہر آ گئے۔

ہم نے ہائی وے کو پار کیا اور صحرائی جنگل میں داخل ہو گئے۔ شہر کے ختم ہوتے ہی صحرائی علاقہ شروع ہو جاتا ہے جہاں اونچے نیچے ریت کے ٹبے اور چھوٹی چھوٹی خاردار جھاڑیاں پھیلی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ جہاں کہیں بھی تھوڑا بہت پانی میسر آتا تھا، وہاں چند گھر اور اردگرد زیرِ کاشت رقبہ نظر آ جاتا تھا جس میں پھلیاں، مکئی اور دوسری فصلیں کاشت کی گئی تھیں۔ ہمیں تمام راستے میں اس طرح کے علاقے سے گزرنا تھا۔ کمبل کے نیچے میں اور موتی قطب نما پر سمتوں کا تعین کر رہے تھے اور نقشوں کی پڑتال کر رہے تھے۔ ہمارے سفر کا آخری مرحلہ آن پہنچا تھا۔ نقشے کے مطابق یہاں نزدیک ہی ''ٹوبھوں'' کی قطار ہونی چاہیے تھی۔ ''ٹوبھے'' بہت گہرے تالابوں کی ایک قطار ہوتی ہے۔ ان کنواں نما تالابوں میں بارش کا پانی جمع کر لیا جاتا ہے اور پھر ضرورت کے مطابق استعمال کیا جاتا ہے۔ فصلوں کو انہی سے پانی دیا جاتا ہے۔ اس ''ٹوبھے'' کو تلاش کرنے کے لیے نور کو بھیجا گیا۔ تھوڑی دیر میں وہ اسے تلاش کر کے واپس آ گیا۔ ہم پیچھے اٹھائے جانے والے بیگ کو وہیں چھوڑ کر اپنا سارا سامان لے کر ''ٹوبھے'' پر پہنچے اور اس کو ایک کنوئیں میں پھینک دیا۔ اس طرح اب ہم اپنا سفر شروع کرنے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔ اللہ کا نام لیتے ہوئے ہم سب نے سری کرن پور کی جانب اپنے سفر کا آغاز کر دیا۔

ہمیں 4 سے 5 میل فی گھنٹہ کی رفتار سے سفر کرنا تھا۔ وہ ایک چاندنی رات تھی۔ صاف آسمان روشن ستاروں سے بھرا ہوا تھا۔ قطبی ستارہ، برجِ ذات الکرسی، دبِّ اکبر اور ستاروں کے دیگر جھرمٹ صاف نظر آ رہے تھے۔ اگر ضرورت پڑتی تو ہم ستاروں کی مدد سے اپنے درست رُخ کا تعین آسانی سے کر سکتے تھے۔ ہم میں سے ہر ایک دوسرے سے علیحدہ ہو جانے کی صورت میں بغیر نقشے اور قطب نما کے منزلِ مقصود

پر پہنچ سکتا تھا۔ پہلا گھنٹہ بغیر کسی رکاوٹ یا پریشانی کے گزر گیا۔ سارے راستے میں ہماری کسی سے بھی مڈبھیڑ نہیں ہوئی تھی۔ آرام کرنے کے بعد ہم نے دوبارہ سفر شروع کر دیا۔ ہم تقریباً دس منٹ تک چلے ہوں گے کہ موتی اچانک رُک گیا۔ ہمارے سامنے ٹینک کو روکنے والی رکاوٹ، ایک نہر کھڑی تھی۔ نہر میں پانی تھا۔ نہر کے دونوں کنارے 60 ڈگری کے زاویے پر بلند ہو رہے تھے۔ اس قسم کی رکاوٹوں کو فائر لائن سے تحفظ دیا گیا ہوتا ہے، لہٰذا اسے عبور کرنے سے پہلے علاقے کی ریکی ضروری تھی۔ موتی اور میں ریکی کرنے کے لیے آگے بڑھے۔ ہم ایک دوسرے آڑ میں لیتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے تاکہ کسی بھی ناگہانی صورتِ حال سے نمٹا جا سکے۔ نور ایک جھاڑی کے پیچھے ہماری واپسی کا انتظار کر رہا تھا۔ ہم نے دیکھا کہ نہر میں گردن کی گہرائی جتنا اور بعض جگہوں پر چھاتی کی گہرائی تک پانی تھا۔ اس کو آسانی سے چلتے ہوئے پار کیا جا سکتا تھا۔ اس میں کسی قسم کا بہاؤ نہیں تھا۔ پار کرنے والی جگہ سے میں بلند کنارے پر کھڑے ہو کر دوربین کی مدد سے احتیاط کے ساتھ ارد گرد کا جائزہ لے رہا تھا۔ موتی واپس گیا اور نور کو ہمراہ لے کر آ گیا۔

سب ٹھیک تھا، ''آگے بڑھو'' حکم دے دیا گیا۔ موتی اور نور کے گزر جانے کے بعد میں نے رکاوٹ کو پار کیا اور دوسرے کنارے پر پہنچ گیا۔ یہاں سے ہم نے اپنا سفر دوبارہ شروع کر دیا۔ ہم نے اپنی رفتار کو منصوبے کے مطابق قائم رکھا ہوا تھا اور ایک دوسرے کو اشاروں کے ذریعے پیغامات دے رہے تھے۔
اگلے دس منٹوں کے بعد ہم نے دوبارہ دس منٹ کے لیے آرام کرنا تھا۔ موتی نے اشارہ دیا اور فوری طور پر زمین پر لیٹ گیا۔ ہم نے چار اونٹوں پر ایک پٹرولنگ پارٹی کو آتے دیکھا۔ یہ معمول کی پٹرولنگ تھی جو صحرائی علاقے میں ''بی او پیز'' (بارڈر آبزرویشن پوسٹوں) کے درمیان کی جاتی تھی۔ ہم فوری طور پر رینگ کر نزدیکی جھاڑی میں چھپ گئے اور زمین پر بے حس و حرکت لیٹے رہے۔ پٹرولنگ پارٹی ہمارے قریب سے گزرتی ہوئی شمال کی جانب نکل گئی۔ انہیں کچھ پتا نہیں چلا تھا کہ تین زندہ انسان ان کے قدموں کے نیچے لیٹے ہوئے ہیں۔
پٹرولنگ پارٹی جلد ہی ریت کے ٹیلوں میں غائب ہو گئی۔ ہم کھڑے ہو گئے اور اپنا سفر دوبارہ شروع کر دیا۔

اپنے دوسرے آرام کے بعد کچھ فاصلے تک چلنے کے بعد ہمیں کھدائی کی آوازیں آئیں۔ نقشے کے مطابق اس مخصوص علاقے میں کسی دفاعی پوزیشن کی نشاندہی نہیں کی گئی تھی۔ پھر کون کھدائی کر رہا تھا؟ موتی کو ریکی کے لیے بھیجا گیا۔ کچھ لوگ ایک نئی دفاعی پوزیشن کے لیے مورچے کھود رہے تھے۔ اس صورتِ حال نے ہمیں اپنے راستے سے ہٹ کر ایک چکر کاٹ کر دوبارہ اپنے راستے پر آنے کے لیے مجبور کر دیا۔ ہم نے اس کے مطابق عمل کیا، اپنے قطب نما اور ''نائٹ مارچ چارٹ'' کو دوبارہ سیٹ کیا۔ ہم نے دوبارہ سفر شروع کیا لیکن دفاعی پوزیشن کو پار کرنے کے بعد ہمیں ایک اور نہر کا سامنا کرنا پڑ گیا۔ کیا ہم راستہ بھٹک گئے تھے؟ ہم کمبل کے نیچے چھپ گئے اور نقشے کو غور سے دیکھا۔ نہیں ہم بالکل درست راستے پر تھے۔ کیا یہ کوئی نئی نکالی گئی نہر تھی اور ابھی تک اس کی نقشے پر نشاندہی نہیں کی گئی تھی؟ یا ہم پہلے ہی ہندوستانی علاقے میں داخل ہو چکے تھے؟ میری گھڑی کے مطابق اس وقت صبح کے ڈھائی بج رہے تھے۔ ہاں! ہم اب تک ہندوستانی علاقے میں

کافی آگے آ چکے تھے۔ یہ ایک ہندوستانی دفاعی رکاوٹ تھی۔ ہم نے نہر پار کر لی اور آگے بڑھے۔

اب ہمارا سفر زیادہ خطرناک ہو چکا تھا۔ ہمیں بہت زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔ ہمیں ایک گھنٹے یا آدھے گھنٹے کے بعد سری کرن پور پہنچ جانا چاہیے تھا۔ نہر کو پار کرنے کے بعد ہم بنکروں میں کھڑے ہندوستانی ٹینک دیکھ سکتے تھے۔ ہمیں ان بنکروں سے انسانوں کے بولنے کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ تمام علاقہ غیر معمولی طور پر خاموش اور پر سکون تھا۔ سحری کا وقت ہو رہا تھا۔ اس قسم کی صورتِ حال ایسے سفر کے لیے بہت شان دار تھی۔ ہم اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھ کر ہندوستانی دفاعی پوزیشن سے گزر گئے۔ کوئی بھی ہمیں نہیں دیکھ سکا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک ایسی پوزیشن کے قریب پہنچ گئے جہاں چند ٹینک اور گاڑیاں وغیرہ کھڑی تھیں۔ یہ ضرور کوئی ہیڈ کوارٹر ہوگا۔ ہم نے خاموشی سے علاقے کا جائزہ لیا اور منزل کی جانب سفر جاری رکھا۔ اس دوران دور افق پر روشنیاں نظر آنے لگی تھیں، یہ سری کرن پور کی روشنیاں تھیں۔ اب مزید چار یا پانچ میل کا سفر باقی تھا اور پھر ہم سری کرن پور پہنچ جائیں گے۔ ہم بہت پر جوش ہو رہے تھے اور ہمارے حوصلے بلند تھے۔ ہم اپنی تکان بھول چکے تھے اور روشنیوں کی جانب تقریباً دوڑتے ہوئے جا رہے تھے۔

تقریباً پونے چار بجے ہم سری کرن پور کے باہر ایک گاؤں میں پہنچ گئے تھے۔ اکثر گھر کچی مٹی کے بنے ہوئے تھے، جیسا کہ عموماً دیہاتوں میں ہوتے ہیں۔ ہر گھر میں کچی دیواروں سے گھرا ہوا ایک صحن تھا۔ گاؤں کے اندر سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ہم نے ایک شکستہ سے خالی گھر میں پناہ لے لی۔ اس گھر کے صحن کو بھی کچی دیواروں نے گھیر رکھا تھا۔ اب ہم سوچ رہے تھے کہ ہمارا اگلا قدم کیا ہونا چاہیے؟ کیا اس عجیب وقت پر قصبے میں داخل ہونا مناسب ہوگا؟ ایک اجنبی چھوٹے سے قصبے میں اس وقت ہمارے جیسے تین اجنبیوں کا گھومنا شکوک پیدا کر سکتا تھا۔ لہٰذا ہم نے دن چڑھنے کا انتظار کرنا مناسب خیال کیا۔ اس کے بعد ہم اپنے اگلے قدم کے بارے میں کوئی فیصلہ کریں گے۔ اس تھکا دینے والے سفر کے بعد اب آرام کرنے کا بھی فیصلہ کیا۔

اچانک ہمیں ریل گاڑی کی آواز سنائی دی۔ میں نے باہر دیکھا اور ایک ریل گاڑی کو چھے سات سو گز کی دُوری پر ایک ریلوے سٹیشن میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔ ہم نے فوری طور پر ریل گاڑی پکڑنے کا فیصلہ کیا تا کہ بارڈر کے علاقے سے جتنی جلدی ممکن ہو سکے دُور سے دُور نکل جائیں۔ ہم نے سٹیشن کی جانب دوڑ لگا دی۔ جب ہم قریب پہنچے تو ہمیں پلیٹ فارم پر ایک سرخ رنگ کی ریل گاڑی کھڑی نظر آئی۔ ہمیں کچھ معلوم نہ تھا کہ یہ ریل گاڑی کہاں جا رہی ہے اور کہاں سے آئی ہے۔ ہمیں صرف ایک بات کا علم تھا کہ یہ ایک ہندوستانی مسافر ریل گاڑی تھی۔ سٹیشن پر بہت کم لوگ تھے۔ ہم ایک خالی ڈبے میں گھس گئے جہاں کوئی مسافر نہ تھا، اس کی تمام کھڑکیاں بند کر دیں اور دروازوں کو اندر سے مقفل کر دیا۔ چند ثانیوں میں وسل بجاتے ہوئے ریل گاڑی چلنا شروع ہو گئی۔ ہم پر سکون ہو چکے تھے۔ پلیٹ فارم پر ہم نے سٹیشن کا نام سری کرن پور پڑھ لیا تھا۔ یہ راجستھان صوبے کے ضلع گنگا نگر کی سب ڈویژن تھا۔ ہماری منزل دہلی تھی۔ لیکن ریل گاڑی جنوب کی

جانب جا رہی تھی۔ دہلی شمال میں تھا۔ تھوڑی دیر بعد ریل گاڑی ایک سٹیشن پر رُکی، یہ جنکشن تھا۔ مخالف سمت سے ایک اور ریل گاڑی اندر آئی۔ یہ بھی ایک پسنجر گاڑی تھی۔ ہم نے جلدی سے ریل گاڑی تبدیل کی اور آنے والی گاڑی کے ایک ڈبے میں گھس گئے اور اندر سے دروازے مقفل کر دیئے۔ تھوڑی دیر بعد گاڑی چلنا شروع ہوگئی۔

اب ہم شمال کی جانب جا رہے تھے۔ اپنے راستے میں ہم ایک مرتبہ پھر سری کرن پور سے گزرے۔ ریل گاڑی نے شمال کی جانب سفر جاری رکھا۔ لمبے تھکا دینے والے پیدل سفر کی تکان اور ریل گاڑی کے چلنے کی یکساں تال کی وجہ سے ہم تینوں گہری نیند سو گئے۔ پھر ایک دھکا لگا اور ہماری آنکھیں کھل گئیں۔ گاڑی ایک سٹیشن پر کھڑی تھی۔ میں نے کھڑکی کھولی۔ صبح کا وقت تھا۔ میں نے سٹیشن کا نام پڑھا جو کہ سری گنگا نگر تھا۔ ہم تینوں بہت خوش تھے۔ ہم ریل گاڑی سے نیچے اترے۔ اب ہم بارڈر سے بہت دُور پہنچ چکے تھے۔ ہم اپر کلاس کے ویٹنگ روم میں گئے، ہاتھ منہ دھوئے اور کپڑے تبدیل کیے تا کہ قدرے بہتر نظر آسکیں۔ پھر ہم نے بیٹھ کر اپنے اگلے قدم کے بارے میں سوچ بچار شروع کر دی۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ اب ہم اپنے آپ کو کلکتہ یونیورسٹی کے طالب علم ظاہر کریں گے جو کہ ایک مطالعاتی دورے پر پورے راجستھان میں گھوم پھر رہے ہیں۔ ہم نے اپنے نام بھی ہندوؤں والے منتخب کر لیے۔ میرا نام سری شومن بینر جی، موتی کا نام سری منوج بوس اور نور کا نام سری نارائن گنگولی تجویز کیا گیا۔ اب کچھ رقم کا بندوبست کرنا تھا۔ ہم چوں کہ کلکتہ کے بنگالی طالب علم تھے، اس لیے پاکستانی کرنسی کو تبدیل کروانا خطرناک ہوسکتا تھا۔ ہم نے سونے کی دو انگھوٹھیاں بیچنے کا پروگرام بنایا۔

ہمیں سٹیشن ماسٹر سے پتا چلا کہ مرکزی شہر تقریباً ایک میل دُور تھا۔ دکانیں صبح 9 بجے کھلنا شروع ہوتی تھیں۔ اس لیے ہمیں اس وقت تک ویٹنگ روم میں ہی انتظار کرنا تھا۔ ٹھیک نو بجے ہم نے کندھوں پر اپنے کیمرے لٹکائے، نور نے اپنی پشت پر بیگ اٹھایا اور ہم باہر نکل آئے۔ ہم تینوں نے ”رے بین“ کے چشمے لگائے ہوئے تھے۔ ہم حقیقت میں ٹورسٹ نظر آ رہے تھے۔ مرکزی شہر میں پہنچ کر ہمیں پتا چلا کہ گنگا نگر، مشرقی پاکستان کے کسی بھی ضلعی ہیڈ کوارٹر کی طرح چند سڑکوں اور گلیوں پر مشتمل ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔ تمام دکانیں سڑکوں اور گلیوں کی دونوں جانب تھیں۔ ہم نے چند سناروں کی دکانیں تلاش کیں اور سب سے بڑی دکان میں داخل ہو گئے۔ اس کا مالک دھوتی باندھے ہوئے ایک موٹا سا ہندو تھا جس نے ماتھے پر تلک لگا رکھا تھا۔ وہ اپنے ہاتھ میں گھنٹی پکڑ کر اپنی پوجا میں مشغول تھا۔ جیسے ہی ہم اندر داخل ہوئے وہ آگے آیا اور پوچھا کہ ہمیں کیا چاہیے۔

اس کے جواب میں، میں نے کہا، ”ہم کلکتہ سے آئے ہیں اور طالب علم ہیں۔ ہم مطالعاتی دورے پر ہیں اور ہمارے پاس رقم ختم ہوگئی ہے اور ہم اپنی سونے کی انگھوٹھیاں فروخت کرنا چاہتے ہیں۔“
اس آدمی نے دونوں انگھوٹھیاں ہاتھ میں لے کر ان کو اچھی طرح جانچا پرکھا اور کہا، ”چار سو روپے۔“

وہ کیا بک رہا تھا۔ ہم جانتے تھے کہ پاکستانی روپے کی ہندوستانی روپے کی نسبت زیادہ قیمت تھی۔ اور پاکستان کے مقابلے میں یہاں سونا بھی زیادہ مہنگا تھا۔ لہٰذا ہمیں اس سے کہیں زیادہ ملنا چاہیے جتنا وہ بتا رہا تھا۔ بنیا ہماری صورتِ حال سے فائدہ اٹھا کر ہمیں لوٹنا چاہ رہا تھا۔ اس کی بدمعاشی پر ہمیں بہت طیش آیا۔ ہم اپنی انگوٹھیاں لے کر اس کی دکان سے باہر آ گئے۔ پھر ہم نے ایک کیمرہ فروخت کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس سڑک پر کیمروں کی ایک بہت بڑی دکان تھی۔ دکان کا مالک چوبیس پچیس سال کا ایک نوجوان لڑکا تھا۔ اس نے عمدہ لباس پہن رکھا تھا۔ ہم نے اپنی ملی جلی اردو اور ہندی میں بیان کرنے کی کوشش کی اور کہا کہ ہم اپنا ایک کیمرہ فروخت کرنا چاہتے ہیں۔ ہماری بات سن کر نوجوان نے ہمارے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا۔ اس نے کیمرے دیکھے اور کہا، ''یہ باہر کے قیمتی کیمرے ہیں۔ یہ امپورٹڈ ہیں۔''

''ہاں! درست ہمیں یہ باہر مقیم رشتہ داروں نے تحفے میں دیئے تھے۔ ہم انہیں بیچنا چاہتے ہیں کیوں کہ ہمارے پاس اور کوئی متبادل نہیں ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''لیکن اس چھوٹے سے شہر میں آپ کو ان کی صحیح قیمت نہیں مل سکے گی۔ اور پھر اگر آپ نے انہیں بیچ دیا تو دوبارہ خرید نہیں سکیں گے۔ کیا آپ کے پاس بیچنے کے لیے کوئی اور چیز نہیں ہے۔'' اس نے پوچھا۔

''ہاں! ہمارے پاس ہے۔'' میں نے انگوٹھیاں نکالیں اور اُسے دے دیں اور سنار کی دکان پر تلخ تجربے کے بارے میں بھی بتایا۔

ساری بات سننے کے بعد نوجوان مسکرایا اور کہا، ''بنیے نے تمہیں غیر ملکی سمجھتے ہوئے چالاک بننے کی کوشش کی تھی۔ ٹھیک ہے آپ یہاں بیٹھیں اور میں دیکھتا ہوں کہ آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔''

نوجوان انگوٹھیاں لے کر باہر نکل گیا اور دکان میں موجود لڑکے کو ہمارے لیے چائے لانے کو کہا۔

لیکن میں نے کہا، ''چائے کا تکلف نہ کریں۔ بس انگوٹھیاں بیچ دیں ہم آپ کے ہمیشہ شکر گزار رہیں گے۔''

وہ مسکرایا اور بولا، ''کوئی بات نہیں، آپ چائے پئیں اور مجھے کوشش کرنے دیں۔ آپ لوگ اتنی دُور سے راجستھان آئے ہیں، میرا خیال ہے آپ کو چائے کا ایک کپ پلانا میرا حق ہے۔'' ہم اس لڑکے کے خلوص سے مسحور ہو کر رہ گئے۔ تمام لوگ ایک جیسے نہیں ہوتے۔

لڑکا پہلے ہی چائے لینے جا چکا تھا۔ وہ نوجوان بھی ساری دکان ہمارے اوپر چھوڑ کر باہر نکل گیا۔ ہمیں اس اجنبی جگہ پر ایسے ہمدرد شخص کا مل جانا بڑی خوش قسمتی تھی۔ تھوڑی دیر بعد لڑکا گرما گرم لچیاں (تیل میں تلی ہوئی باریک روٹیاں) اور ترکاری اور چائے لے کر آ گیا۔ ہماری دبی ہوئی بھوک اس گرما گرم کھانے کو دیکھ کر دوبارہ جاگ اٹھی۔ ہم ان پر تقریباً جھپٹ پڑے اور پھر بڑے اطمینان سے چائے پی۔ اس لذیذ اور مزے دار ناشتے کے بعد ہم بہت تر و تازہ محسوس کر رہے تھے۔ بیس منٹ یا لگ بھگ اتنے وقت میں وہ نوجوان

مسکراتے ہوئے چہرے کے ساتھ آ گیا۔

''آپ کا کام ہو گیا ہے۔'' اس نے کہا اور مجھے آٹھ سو پچاس روپے تھما دیئے۔

''کیا آپ نے چائے پی لی ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''جی ہاں! ہمیں لچیوں، ترکاری اور چائے کا بہت لطف آیا ہے۔ خیر، آپ کا نام کیا ہے؟''

''میرا نام رمیش ترپاٹھی ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ ہم نے بھی اسے اپنے نقلی نام بتائے۔

''آپ اگر کبھی کلکتہ تشریف لائیں تو ہمیں ضرور ملیے گا۔ اس دُور دراز مقام پر آپ کے اس تعاون پر ہم آپ کے بہت شکر گزار ہیں۔'' میں نے کہا۔

نمبر 3 پارک سرکس، ایک فرضی پتہ اسے دے دیا گیا۔ پھر ہم سب نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اس کی دکان سے باہر آ گئے۔ یہ بات درست نہیں کہ اس مادی دنیا میں اچھے لوگ موجود نہیں۔ دنیا اسی وجہ سے قائم ہے کہ ابھی تک اس میں رمیش ترپاٹھی جیسے لوگ موجود ہیں۔ رمیش کی دکان سے ہم سیدھے ایک ریستوران میں پہنچے۔ لچی ترکاری کھانے کے بعد ہماری بھوک میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ پیٹ بھر کر کھائے بغیر ہم کسی چیز پر غور نہیں کر سکتے تھے۔ ہم نے چکن کری، پراٹھے، دال اور سبزیاں جی بھر کر کھائیں جو مختلف طریقوں اور مختلف ذائقوں میں پکائی گئی تھیں۔ لڑکا جو ہمیں کھانا کھلا رہا تھا، ہمارے کھانے کے انداز پر حیران ہو رہا تھا۔

خوب سیر ہو کر کھانے کے بعد نور اخبار خریدنے کے لیے باہر چلا گیا۔ وہ دو یا تین اخبار لے کر آیا جو اُسے مل سکے۔ تاریخ 17 اپریل 1971ء تھی۔ ان میں بنگلہ دیش کے بارے میں تصاویر کے ساتھ بہت سی خبریں تھیں۔ ان میں نذرالاسلام اور تاج الدین احمد کی قیادت میں عوامی لیگ کی عبوری حکومت تشکیل دینے کے بارے میں بھی خبر تھی۔ آزادی کی جدوجہد اور مکتی باہنی کے بارے میں بھی خبریں تھیں۔ ان اخبارات سے ہمیں آزادی کی اس جنگ میں ہندوستانی حکومت کی خاموش حمایت کا اور ہجرت کر کے آنے والے بنگالی مہاجروں کی کھلم کھلا حمایت کا بھی علم ہوا۔ ایک تصویر میں میجر خالد مشرف کو آزادی کے مجاہدین کے ساتھ میدانِ جنگ میں دکھایا گیا تھا۔ ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ آزادی کی جدوجہد کے بارے میں جتنا کچھ ہمیں علم تھا، بات اس سے بہت آگے بڑھ چکی تھی۔ بنگلہ دیش میں حقیقی جنگ لڑی جا رہی تھی۔ قابض افواج سے اپنی دھرتی کو آزاد کرانے کے لیے عوام نے بغاوت کرتے ہوئے ہتھیار اٹھا لیے تھے۔ ہم نے آزادی کی جنگ میں شامل ہونے کے لیے خطرہ اٹھاتے ہوئے کوئی غلطی نہیں کی تھی۔

ہم نے اس جدوجہد میں شامل ہونے کے لیے جس قدر جلدی ہو سکے، میدان جنگ میں پہنچنے کے لیے تمام تر کوششیں کرنا اپنا اوّلین اخلاقی فرض خیال کیا۔ ہم نے دھیمی آواز میں اپنے مستقبل کے اقدامات کے بارے میں بحث کرنا شروع کر دی۔ ہندوستان کی سیکورٹی ایجنسیوں سے گزرتے ہوئے مجیب نگر پہنچنے کی کوشش انتہائی خطرناک ہو گی۔ جیسا کہ عام طور پر کہا جاتا ہے ہمیں بارڈر پار کرنے کے فوراً بعد اپنے آپ کو ہندوستانی حکام کے حوالے کر دینا چاہیے تھا۔ یہ درست طریقہ کار تھا۔ اگر ہم رضاکارانہ طور پر اپنی

حوالگی دے دیتے تو پھر ہندوستانی حکام کے ذہن میں ہمارے ارادوں اور خلوص کے بارے میں کسی قسم کے شکوک پیدا نہیں ہونے تھے۔ اس کے برعکس اگر ہم اپنے راستے میں پکڑے جاتے ہیں تو متعلقہ حکام کے ذہن میں ہمارے لیے شکوک پیدا ہونا قدرتی امر تھا۔ لیکن ہم اپنی حوالگی کس جگہ دیں؟ اگر ہم گنگانگر میں حوالگی دیتے تو یہ وقت کا ضیاع تھا، کیوں کہ ہمارے بارے میں تمام فیصلے مرکز سے ہی آنے تھے۔ اس حوالے سے یہاں اپنے آپ کو مقامی حکام کے حوالے کرنا اور پھر مرکزی حکومت کے فیصلے کا انتظار کرنا محض وقت کے ضیاع کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ اس کے علاوہ اس مرحلے پر پر جوش ایجنسی آفیسرز ہمارے مشن کے بارے میں، جو پاکستانی فوج کے تین تربیت یافتہ آفیسر تھے، سچ اگلوانے کی کوشش میں ہر ممکنہ طریقہ آزمانے کی کوشش کریں گے۔ اور ہم میں سے کوئی بھی اس وقت ذہنی اور جسمانی طور پر یہ سب کچھ جھیلنے کے لیے تیار نہ تھا۔ اس لیے ہم نے سوچا کہ بہتر ہوگا کہ ہم دہلی پہنچ کر اپنے آپ کو دہلی میں وزارتِ امور خارجہ کے حوالے کریں، جو بھی ہونا ہے وہیں ہونے دیں۔

اس طرح، ہم نے اپنے آپ کو دہلی میں وزارت امورِ خارجہ کے حوالے کرنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن ہم نے اپنے آپ کو بارڈر حکام کے حوالے کیوں نہیں کیا اور دہلی کیوں پہنچے ہیں، اس بارے میں ہندوستانی حکام کو جتنی جلدی ہو سکے مطلع کرنا ضروری ہے۔ اس فیصلے کے بعد وزیراعظم اندرا گاندھی کے نام خط تحریر کیا گیا جس میں سیاسی پناہ حاصل کرنے کی وجوہات بیان کرنے کے ساتھ ساتھ کسی بھی قسم کی غلط فہمیاں دُور کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ لفافے پر جو پتہ تحریر کیا گیا، وہ یہ تھا، ''عزت مآب وزیراعظم اندرا گاندھی، بذریعہ وزارت خارجہ امور، نیو دہلی''۔ ہم سب مل کر گئے اور مقامی ڈاک خانے میں یہ خط بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک پوسٹ کر دیا گیا۔ یہ کام کرنے کے بعد ہم دوبارہ اسی ریستوران میں واپس آ گئے۔ پوسٹ ماسٹر نے ہمیں بتایا کہ خط دو روز میں اپنی منزل کو پہنچ جائے گا۔ اس خط کی ایک نقل مجیب نگر کی عبوری بنگلہ دیش حکومت کو بھی ارسال کی جانی تھی۔ ہم نے اس کا پتہ اخبار سے حاصل کیا تھا۔ لیکن راجستھان جیسی دُور افتادہ جگہ سے اس پتہ پر خط بھجوانا عقل مندی نہ تھی۔ لہٰذا یہ خط دہلی سے پوسٹ کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔

نور کو دہلی کے لیے ریل گاڑی کے ٹکٹ خریدنے کے لیے بھیجا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا اور بتایا دہلی کے لیے ہماری گاڑی ''کالکا میل'' ساڑھے سات بجے شام کو روانہ ہوگی۔ اس نے ہمارے لیے سیکنڈ کلاس کے تین ٹکٹ خریدے تھے۔ رقم محدود ہونے کی وجہ سے فرسٹ کلاس کے ٹکٹ نہیں خریدے جا سکتے تھے۔ ابھی ریل گاڑی کی روانگی میں بہت زیادہ وقت تھا۔ لہٰذا دوپہر کے کھانے سے قبل ہم شہر دیکھنے کے لیے نکل پڑے۔ ہم خاص ٹورسٹوں کے انداز میں تصاویر لیتے ہوئے آزادی سے گھوم پھر رہے تھے۔ جلد ہی ہم نے گنگانگر کا چھوٹا سا قصبہ پوری طرح گھوم پھر کر دیکھ لیا تھا۔ لہٰذا ہم نے میٹنی شو دیکھنے کا ارادہ کیا۔ سینما گھر میں ہندی فلم ''انجانا'' لگی ہوئی تھی۔ فلم کی کاسٹ میں ببیتا اور راجندر کمار تھے۔ ہم نے ٹکٹ خریدے اور اندر چلے گئے۔ یہ ایک مخصوص قسم کا دیہاتی سینما گھر تھا جس میں انتظامات بس یوں ہی سے تھے۔ دوپہر کے وقت سورج

سر پر آ گیا تھا اور ہال کی ٹین کی چھت گرم ہو گئی تھی جس سے کافی گرمی پیدا ہو گئی تھی۔ یہ نئی ریلیز تھی، اس لیے تماشائیوں کی تعداد غیر معمولی تھی اور رش کی وجہ سے اندر کا ماحول کافی گھٹن زدہ ہو گیا تھا۔ تاہم ہم نے چنا جور اور نٹس کھاتے ہوئے کافی لطف اٹھایا۔ فلم ختم ہونے پر ہم باہر آئے، اس وقت ساڑھے چار بج رہے تھے۔ ہم پھر اسی ریستوران میں واپس آئے جہاں ہم صبح کے وقت گئے تھے۔ ہم نے دوبارہ پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔ ہم پرسکون تھے اور پونے سات بجے سٹیشن پر پہنچ گئے۔ ہمارے خیال میں کالکا ایکسپریس پہنچنے والی تھی۔ لیکن ہم نے سٹیشن کو تقریباً ویران پایا۔ جب ہم نے ٹکٹ کلکٹر سے استفسار کیا تو اس نے بتایا کہ گاڑی تو ساڑھے چھے بجے کی جا چکی ہے۔

بیڑہ غرق! ہم مایوسی سے چلا اٹھے جیسے کہ آسمان ہم پر آ گرا ہو۔ نور نے غلطی سے بورڈ سے ساڑھے چھے کی بجائے ساڑھے سات پڑھ لیا تھا۔ ہم سخت مایوس اور غصے میں تھے۔ موتی اور میں نور پر اپنی پوری آواز کے ساتھ برس رہے تھے۔ کلکٹر نے ہمارا چیخنا چلانا سنا تو وہ آگے آیا اور کہا، ''جو ہو گیا ہے اسے بھول جائیں، اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔ یہاں سے ٹیکسی لیں اور اُسے کہیں کہ وہ آپ کو اگلے سٹیشن پر ریل گاڑی پہنچنے سے پہلے پہنچا دے۔ ابھی یہ ممکن ہے۔'' اس نے ٹیکسی تلاش کرنے میں بھی ہماری مدد کی۔ ڈرائیور ایک سکھ تھا، کلکٹر نے ڈرائیور کو ہماری بپتا پنجابی میں بتائی اور اسے کہا کہ ہمیں گاڑی پہنچنے سے پہلے اگلے سٹیشن پر پہنچا دے۔ ہم کلکٹر کا شکریہ ادا کرنے کے بعد فوراً ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ ڈرائیور نے اپنی ایمبیسڈر ٹیکسی پوری رفتار سے دوڑا دی۔ سڑک کی حالت اچھی نہیں تھی، اس سے بے پروا سردار جی اچھلتی ہوئی اور اڑتی ہوئی ٹیکسی کو دوڑائے چلے جا رہے تھے۔ ہم خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ اگرچہ ہم بات نہیں کر رہے تھے لیکن دل ہی دل میں ہم میں سے ہر ایک یہ سوچ رہا تھا کہ اب شاید ہی ہم میدانِ جنگ تک پہنچ پائیں گے۔ جس انداز سے سردار جی ٹیکسی کو اُڑائے چلے جا رہے تھے، ہم کسی بھی لمحے راجستھان کے اس دُور دراز علاقے میں شہادت کا رتبہ حاصل کر سکتے تھے۔ ہم نے اللہ تعالیٰ کے حضور دعا کرنا شروع کر دی۔ بہر حال سردار جی کی کوشش بارآور ثابت ہوئی اور وہ ریل گاڑی آنے سے پہلے ہمیں اگلے سٹیشن پر پہنچانے میں کامیاب ہو گئے۔

''ویکھو صاحب جی اسیں پہنچ گئے آں۔'' سردار جی کا چہرہ فخر سے سرخ ہو رہا تھا۔ ہم ٹیکسی سے باہر نکلے اور سردار جی کو کرائے کے علاوہ ایک معقول بخشش پیش کی، سردار کا چہرہ مزید کھل اٹھا۔ ریل گاڑی اگلے پندرہ منٹوں میں سٹیشن پر پہنچ گئی۔ ہم اپنی ریزروڈ بوگی میں داخل ہوئے اور سکھ کا سانس لیا۔

ریل گاڑی دوبارہ اپنے وقت پر چل پڑی۔ ہم اس ٹرین کے کمپارٹمنٹ میں چار مسافر تھے۔ اس میں ایک بوفے کار بھی تھی۔ پیسے ادا کرنے پر بستر بھی دستیاب تھا۔ رات کے کھانے کے بعد ہم نے بستر حاصل کیے اور اپنی مخصوص نشستوں پر دراز ہو گئے۔ کالکا ایکسپریس رات کے اندھیروں کو چیرتی ہوئی اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھی۔ دوسرے دن صبح صبح ہم نے دہلی پہنچ جانا تھا۔ ہم پیٹ بھر کر کھانے اور ایک پر جوش دن گزارنے کے بعد اب پورے اطمینان میں تھے۔ مجھے کچھ معلوم نہیں کہ میں کب چلتی ہوئی ریل گاڑی کی

آوازوں کی تال پر اپنے غیر یقینی مستقبل کے بارے میں سوچتا ہوا نیند کی وادیوں میں اتر گیا۔ اسی طرح میرے دوسرے ساتھی بھی سو گئے۔ کئی دنوں کے بعد یہ ایک گہری اور پر سکون نیند تھی۔

ریل گاڑی کے ایک اچانک جھٹکے سے میری آنکھ کھل گئی۔ جیسے ہی میں نے اپنی آنکھیں کھولیں میں نے اپنے ساتھی مسافر کو پہلے سے ہی جاگتے ہوئے اور کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے پایا۔ میں ابھی تک لیٹا ہوا تھا اور سپیدۂ سحر نمودار ہوتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ رفتہ رفتہ اندھیرا چھٹنے لگا تھا اور ابھرتا ہوا سورج افق سے جھانکنے لگا تھا۔ دہکتے ہوئے سورج سے آسمان سرخ ہو رہا تھا اور قدرت ایک دوسرے دن کے آغاز پر اپنی نیند سے بیدار ہو رہی تھی۔ میں نے اپنی قریبی کھڑکی کو کھولا اور صبح کی تازہ ہوا کا ایک جھونکا میرے چہرے سے ٹکرایا۔ یہ بہت شان دار اور تازگی لیے ہوئے تھا۔ جیسے ہی میں نے اپنا چہرہ گھمایا، میں نے اپنے ساتھی کو ابھرتے ہوئے سورج کے سامنے جھکے ہوئے کچھ بڑبڑاتے ہوئے دیکھا، میں سمجھ گیا کہ وہ سورج دیوتا کی پوجا کر رہا تھا۔ میں ٹوائلٹ میں چلا گیا۔ جب میں واپس آیا تو موتی اور نور ابھی تک سو رہے تھے۔ میں نے انہیں جگایا، ہم اٹھ کر بیٹھ گئے۔ یہ ساڑھے چھے کا وقت تھا، کالکا میل وسل بجاتے ہوئے آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ ہم سمجھ چکے تھے کہ ریل گاڑی دہلی میں داخل ہو رہی ہے۔ سات بجے ہم نے دہلی پہنچ جانا تھا۔ ٹھیک وقت پر کالکا میل، دہلی سٹیشن کے پلیٹ فارم پر پہنچ گئی۔ پلیٹ فارم پر صبح کے اس وقت بھی لوگوں کا ہجوم تھا۔ ہر ایک مصروف تھا اور اِدھر اُدھر بھاگ رہا تھا۔ پلیٹ فارم پر ایک دوسرے کے آگے پیچھے کئی ریل گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ہماری ریل گاڑی اپنے مخصوص پلیٹ فارم پر جا کر رک گئی۔ یہ یقین کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ ہم اتنی آسانی سے دہلی پہنچ سکتے تھے۔

33۔ نٹ راج ہوٹل میں دو راتیں

ہم ریل گاڑی سے نیچے اترے۔ جیسے ہی ہم باہر آئے ہم حقیقتاً انتظار کرتے ہوئے ٹیکسی ڈرائیوروں کے ہجوم میں گھر گئے۔

ان میں سے ایک آگے آیا اور کہا، ''بنگالی بابو! ٹیکسی چاہیے۔''

میں نے کہا، ''ہاں! ہمیں کسی درمیانے درجے کے ہوٹل میں لے جاؤ۔ کسی معقول ہوٹل میں جو مرکزی شہر کے قریب ہو۔''

''لے چلتے ہیں، آیئے!''

اس نے ہمارا کچھ سامان اٹھالیا اور اپنی ٹیکسی کی جانب چل پڑا۔ ہم اس کی ٹیکسی میں بیٹھ گئے اور تقریباً بیس پچیس منٹ بعد ڈرائیور نے ایک ہوٹل کے سامنے ٹیکسی روک دی۔ یہ ہوٹل نٹ راج تھا۔ ہم نے ٹیکسی والے کو کرایہ ادا کیا اور استقبالیہ پر پہنچ کر دو کمرے بک کروائے۔ ایک موتی اور نور کے لیے اور ایک میرے لیے۔ پورٹر نے ہمارا سامان اٹھایا اور ہمارے کمروں میں لے گیا۔ دونوں کمرے ایک دوسرے کے

ساتھ ساتھ تھے۔ یہ تھری یا فور سٹار ہوٹل تھا۔ خوب صورت اور صاف ستھرا۔ نرخ بھی معقول تھے۔ ہر کمرے کے ساتھ ایک بالکنی اور باتھ روم تھا۔ ہم سب نے گرم پانی سے غسل کیا۔ لمبے سفر کے بعد یہ حقیقتاً تازگی بخش تھا۔

ہم نے ایک ہی کمرے میں مل کر ناشتہ کیا اور وہیں فیصلہ کیا 20 تاریخ کو ہمیں اپنے آپ کو وزارتِ امورِ خارجہ کے حوالے کر دینا چاہیے۔ ہمارا خیال تھا کہ اس وقت تک انہیں ہمارا خط بھی مل چکا ہوگا۔ ہمارے پاس جو رقم تھی وہ تقریباً ختم ہونے کو تھی۔ لہٰذا سب سے پہلے ہمیں کچھ نقد رقم کا بندوبست کرنا تھا۔ دہلی میں بہت زیادہ ٹورسٹ گھوم رہے ہوتے ہیں۔ ہم کچھ پاکستانی روپے تبدیل کر سکتے تھے۔ استقبالیہ سے ہم نے مرکزی شہر کے بارے میں دریافت کیا۔ استقبالیہ پر موجود نوجوان آدمی نے ہمیں بتایا کہ ''کناٹ پلیس'' شہر کا مرکز کہلاتا ہے۔ یہ ٹیکسی پر 10 منٹ کی مسافت پر ہے اور پیدل پندرہ منٹ کا راستہ ہے۔ ہم دہلی سے مکمل ناواقف تھے، اس لیے ہم نے ٹیکسی لینے کا فیصلہ کیا۔ میں نے کاؤنٹر سے ہوٹل کا کارڈ اٹھا کر جیب میں ڈال لیا۔ ہم ایک ٹیکسی پر بیٹھے اور شہر کے دل کناٹ پلیس پہنچ گئے۔ پورا شہر زندگی کی گہما گہمی سے جاگ اٹھا تھا۔ ہم بھی ہجوم میں شامل ہو گئے۔ کئی قسم کے ایجنٹ اور دلال ہمارے اردگرد منڈلانے لگے۔ انہوں نے ہمیں ٹورسٹ سمجھا ہوا تھا۔ کچھ ہمیں صنفِ نازک کے ساتھ محفل کی دعوت دے رہے تھے جب کہ کچھ غیر ملکی شرابوں کی پیشکش کر رہے تھے۔

اچانک ایک نوجوان سکھ نے پیچھے سے سرگوشی کے انداز میں کہا، ''ڈالر، ڈالر۔''

''ڈالر نہیں پاکستانی۔'' موتی نے گھومے بغیر ہی کہا۔

''ٹھیک ہے ایک روپیہ ساٹھ پیسے۔'' آدمی نے جواب دیا۔

''بہت کم ہیں۔'' موتی نے سودا بازی کرتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے، ایک روپیہ ستر پیسے۔'' سکھ نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے۔'' موتی نے کہا۔ ہم نے چلنا جاری رکھا۔

''آؤ۔'' سکھ نے ہمیں اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ ہم اس کے پیچھے چلتے ہوئے ایک نزدیکی ٹیکسی کے قریب پہنچ گئے۔ وہ ڈرائیور تھا۔ ہم ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ اس نے ٹیکسی چلائی اور ہمیں ''لال قلعے'' کے بالکل سامنے لے گیا۔

ٹیکسی روکنے کے بعد اس نے کہا، ''کتنی رقم تبدیل کرنا چاہتے ہیں؟''

''دس ہزار۔'' میں نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے۔ یہاں انتظار کریں۔ میں پندرہ بیس منٹ میں رقم لے کر آتا ہوں۔'' ڈرائیور اپنی ٹیکسی لے کر چلا گیا۔ ہمارے سامنے مشہور لال قلعہ تھا اور ہماری پشت کی جانب جامع مسجد تھی۔ ہم بہت پریشان ہو رہے تھے۔ یہ آدمی ہمیں لال قلعے کے قریب کیوں لے کر آیا ہے؟ اسے ہندوستانی فوج کا ہیڈکوارٹر

خیال کیا جاتا تھا، کیا وہ کوئی چال چل رہا تھا؟ لیکن اس وقت ہم اس کے علاوہ کچھ کر بھی نہیں سکتے تھے۔ تاہم ہم اس جگہ سے ہٹ کر سڑک پار کر کے جامع مسجد کے گیٹ کے سامنے آ گئے اور ہجوم میں کھڑے ہو کر انتظار کرنے لگے۔ تقریباً آدھ گھنٹے بعد وہی ٹیکسی آئی اور اس درخت کے نیچے کھڑی ہو گئی ڈرائیور اکیلا ہی تھا، اس کا مطلب تھا کہ وہ غلط انسان نہ تھا۔ نوجوان ٹیکسی سے باہر آیا اور ہمیں تلاش کرنے لگا۔ ہم نے جلدی سے سڑک پار کی اور تیزی سے اُس کی جانب بڑھے۔ مطمئن ہوتے ہوئے اس نے پوچھا، ''آپ سب کہاں چلے گئے تھے؟''

''ہم مسجد کے سامنے کچھ تصاویر لے رہے تھے۔'' میں نے کہا۔

''ٹیکسی میں بیٹھ جایئے۔'' ہم اندر بیٹھ گئے۔ اس نے ہندوستانی سو روپے کے نوٹوں کا ایک بھاری بنڈل میری طرف بڑھایا اور کہا کہ گن لو۔

رقم گننے کے بعد میں نے بھی اسے دس ہزار پاکستانی روپے پکڑا دیئے۔ اس نے گنے اور اپنی جیب میں رکھ لیے۔ پھر اس نے کہا، ''چلیں میں آپ کو واپس ''کناٹ پلیس'' اتار آتا ہوں۔'' ہم نے کہا، ''ٹھیک ہے۔''

ٹیکسی ہمیں واپس کناٹ پلیس لے آئی۔ ہم نیچے اترے اور ہجوم میں شامل ہو گئے، ٹیکسی واپس چلی گئی۔ اب ہماری جیب میں اچھی خاصی رقم آ گئی تھی اور ہمارا اعتماد بڑھ گیا تھا۔ ہم سارا دن شہر میں گھومتے رہے۔ ہم نے دوپہر کا کھانا ہوٹل ''اوبرائے'' میں کھایا اور رات کو ''اشوکا'' ہوٹل میں۔ یہ دونوں ہوٹل ان دنوں میں دہلی کے سب سے اعلیٰ ہوٹل تصور کیے جاتے تھے۔ رات کے کھانے کے بعد ہم ایک نئی ریلیز ہوئی فلم ''ریشماں اور شیرا'' دیکھنے ایک سینما ہال میں گھس گئے۔ فلم تقریباً آدھی رات کو ختم ہوئی، لیکن کناٹ پلیس اب بھی زندگی سے بھرپور نظر آ رہا تھا۔ لوگوں کے ہجوم میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ ہم ایک ڈسکو کلب میں داخل ہو گئے اور ساری رات لطف اندوز ہوتے رہے۔ صبح تقریباً چار بجے کے قریب ہم نیند اور تھکاوٹ سے چور اپنے ہوٹل میں واپس پہنچے۔ ہمارا مقصد زیادہ سے زیادہ لطف و انبساط حاصل کرنا تھا۔ دو دن بعد ہمارا مقدر کیا ہوگا؟ کوئی نہیں جانتا تھا۔ لہٰذا ہم ہر ہر لمحے کو بہترین انداز میں گزارنا چاہتے تھے۔ ہوٹل میں پہنچ کر ہم نے ایک دوسرے کو شب بخیر کہا اور دروازے کے باہر ''ڈونٹ ڈسٹرب'' کی تختی لٹکا کر سیدھے اپنے بستروں میں پہنچ گئے۔ میں بستر پر گرتے ہی گہری نیند سو گیا۔

دوسرے دن صبح ساڑھے دس بجے ہماری آنکھ کھلی۔ ناشتہ کرنے کے بعد ہم پیدل چلتے ہوئے کناٹ پلیس پہنچ گئے۔

''ہائے شریف!'' انیتا نے مجھے دُور سے اشارہ کیا اور ہمارے قریب آ گئی۔ انیتا، شیرون، الوانا اور کرسٹائن چار نوجوان لڑکیاں تھیں یہ سب ٹورسٹ تھیں۔ گزشتہ رات ڈسکو کلب میں ہمارا تعارف ہوا تھا۔ شیرون امریکن تھی اور باقی تینوں سویڈش تھیں۔ وہ ہندوستان کی مل کر سیاحت کر رہی تھیں۔ پچھلی رات ہم میں

بہت دوستی ہوگئی تھی اور ہم نے ڈسکو کلب میں بہت انجوائے کیا تھا۔ ہیلو ہائے کے بعد ہم نے انہیں تجویز پیش کی۔ ''آؤ مل کر تاریخی مقامات کی سیر کرتے ہیں۔''

وہ راضی ہوگئیں۔ ہم نے دو ٹیکسیاں کرایہ پر لے لیں اور سارا دن مختلف مقامات دہلی کے لال قلعہ، قطب مینار، اکبر کے محل، جامع مسجد، نئی دہلی، پرانی دہلی، راشٹر پتی بھون، گیٹ آف انڈیا، نہرو پارک، راج پتھ، گاندھی جی کی سمادھی اور بہت سی دوسری جگہوں پر گھومتے پھرتے رہے۔ اکبر کے محل میں شام کو ہم نے ''لائٹس اور ساؤنڈز'' کا خوب صورت پروگرام دیکھا۔ شو دیکھنے کے بعد ہم کناٹ پلیس واپس آئے۔ ہم نے رات کا کھانا اکٹھے کھایا اور پھر دوبارہ ڈسکو کلب چلے گئے۔ ساری رات ہم نے خوب لطف اٹھایا۔

یہ لڑکیاں حقیقت میں زندگی کی علامات تھیں۔ وہ صرف حال میں مست رہنا چاہتی تھیں، انہیں کل کی کوئی فکر نہ تھی۔ وہ ہر گزرے ہوئے لمحے سے لطف اٹھانا چاہتی تھیں۔ غم و فکر سے بے پروا تھیں۔ وہ محض زندگی سے لطف اٹھانے کے لیے پیدا ہوئی تھیں۔ سیدھی سادی اور بندھنوں سے آزاد زندگی، وہ آزاد پنچھیوں جیسی زندگی بسر کر رہی تھیں۔ ان کے طرزِ زندگی اور ہمارے طرزِ زندگی میں بہت زیادہ فرق تھا۔ اس کے باوجود یہ دو دن ان کی معیت میں بسر کر کے ہمیں بہت لطف آیا تھا۔ دوسرے روز ہمیں ''وزارتِ امورِ خارجہ'' میں حاضر ہونا تھا، اس لیے ہم نے رات دو بجے اُن سے اجازت چاہی اور واپس اپنے ہوٹل میں آ گئے۔ صبح کے وقت اس خط کی نقل، جو ہندوستانی وزیراعظم کو بھیجا گیا تھا، کلکتہ کے پتہ پر بنگلہ دیش کی عبوری حکومت کے وزیراعظم کو ارسال کر دی تھی۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ صبح دس بجے ہم وزارتِ امورِ خارجہ کے لیے ہوٹل سے روانہ ہوں گے، اور روانہ ہونے سے پہلے جس قدر ممکن ہو سکے، مقامی اور غیر ملکی صحافیوں اور میڈیا کے نمائندگان سے رابطہ کرنے کی کوشش کی جائے اور انہیں مطلع کیا جائے کہ پاکستانی فوج کے تین آفیسر جو وہاں سے فرار ہو کر ہندوستانی سرحد عبور کر کے یہاں آئے ہیں، سیاسی پناہ کے حصول کے لیے صبح گیارہ بجے وزارتِ امورِ خارجہ میں پیش ہو رہے ہیں۔ میڈیا کے افراد جو ان آفیسروں کو ملنے کے خواہش مند ہوں، وہ اس وقت وزارت امورِ خارجہ کے دفتر پہنچ جائیں۔ یہ شان دار خیال موتی کے ذہن میں آیا تھا۔ اس طرح ہمارے فرار کی خبر پھیل جائے گی۔ لہٰذا یہ خیال اچھا تھا۔ یہ ذمہ داری بھی اُسے ہی سونپی گئی۔ اس کے بعد ہم نے ایک دوسرے کو شب بخیر کہا اور سو گئے۔

34۔ ہم نے اپنے آپ کو وزارتِ امورِ خارجہ کے حوالے کر دیا

اگلی صبح سات بجے ہم سب تیار تھے۔ موتی نے بہت سی خبر رساں ایجنسیوں، روزناموں، ہفتہ وار رسائل اور نمائندگان کے ٹیلی فون نمبر ڈائریکٹری سے حاصل کر لیے تھے۔ موتی نے جب اپنا کام ختم کر لیا، تو تقریباً ساڑھے نو بجے ہم نے ایک ٹیکسی لی اور سیدھے راشٹر پتی بھون کے جنوبی بلاک میں پہنچ گئے، جہاں وزارت امورِ خارجہ کا دفتر واقع تھا۔ اس جگہ کو تلاش کرنا کوئی مشکل کام نہ تھا۔

ابھی گیارہ نہیں بجے تھے۔ جب ہم وہاں پہنچے تو گارڈز کی تبدیلی کی تقریب ہو رہی تھی۔ یہ بڑی دلچسپ تقریب تھی۔ ہم نے دلچسپی سے ساری تقریب کو دیکھا اور گھڑسوار گارڈز کے ساتھ کچھ تصاویر بھی لیں۔ راشٹر پتی بھون سرخ پتھر سے بنائی گئی ایک بہت بڑی اور شان دار عمارت تھی جو وائسرائے کی سرکاری رہائش گاہ کے طور پر تعمیر کی گئی تھی۔ آزادی کے بعد اسے راشٹر پتی بھون میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ بڑی عمارت کے دونوں طرف تمام وزارتوں کے دفاتر واقع ہیں۔ ان کے درمیان کئی ایک خوب صورت باغات تھے۔ اس کی سیڑھیوں سے مشہور راج پتھ شروع ہوتا ہے اور تھوڑے فاصلے پر ''گیٹ آف انڈیا'' کھڑا ہے۔ عام طور پر قومی دنوں کی تقریبات میں فوجی پریڈ راج پتھ پر ہوتی ہے جو کہ ایک شان دار اور پرشکوہ تقریب ہوتی ہے۔ یہ ساری معلومات ہمیں ٹیکسی ڈرائیور نے دی تھیں۔

ٹھیک گیارہ بجے ہم وزارتِ امورِ خارجہ کے استقبالیہ ہال میں داخل ہوئے۔ استقبالیہ پر ایک خاتون بیٹھی ہوئی تھی۔ تھوڑی دُور مہمانوں کے علاقہ میں کچھ لوگ کیمروں کے ساتھ نظر آ رہے تھے۔ موتی کی سوچ کام دکھا گئی تھی۔ وہ سارے صحافی تھے، جو اس سنسنی خیز خبر کے حصول کے لیے وہاں پہنچ چکے تھے۔ ہم سیدھے اس خاتون کے پاس گئے۔

''صبح بخیر میڈم!'' خاتون نے سر اٹھا کر میری جانب دیکھا۔

''میں جناب وزیرِ خارجہ سے ملنا چاہتا ہوں۔ معاملہ بہت اہم اور خفیہ ہے۔'' میں نے کہا۔

خاتون میرے اس رویے پر قدرے گھبرا گئی تھی۔

''کیا آپ کی پہلے سے اپوائنٹ منٹ ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں میڈم۔'' میں نے جواب دیا۔

''تو پھر میں آپ کو کیسے اندر جانے دوں؟'' وہ حیران تھی، اگرچہ بات معقول تھی۔ جب ہم بات کر رہے تھے تو انتظار میں بیٹھے دو صحافی آگے آئے اور ہمیں دیکھنے لگے۔ یہ دونوں بہت متجسس تھے۔ اس لیے ہم نے خاتون پر اپنی شناخت ظاہر نہ کی، بلکہ کہا، ''ہم تین کلکتہ سے تعلق رکھنے والے طالب علم ہیں۔ کیا آپ مہربانی فرما کر ہمیں کسی ذمہ دار شخص سے ملوا سکتی ہیں جس سے ہم بات کر سکیں؟''

شاید اسے ہم پر قدرے رحم آ گیا تھا، اس نے کہا: ''یقیناً، میں جوائنٹ سیکریٹری اے کے رائے سے بات کرتی ہوں، وہ بھی بنگالی ہیں۔''

''سر، میرے پاس تین بنگالی طالب علم کھڑے ہیں، وہ آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔'' استقبالیہ خاتون فون پر بات کر رہی تھی۔

اس نے ریسیور میری طرف بڑھایا اور کہا، ''یہ مسٹر رائے سے بات کریں۔ وہ لائن پر ہیں۔''

''صبح بخیر سر، ہم تین بنگالی آفیسر ہیں۔''

میری مزید کوئی بات سنے بغیر مسٹر رائے نے شستہ بنگالی میں بات کرتے ہوئے کہا، ''خوش

آمدید، خوش آمدید، آپ کب پہنچے ہیں؟''

''بالکل ابھی، ابھی، سر۔'' میں نے جواب دیا۔

''برائے مہربانی یہیں میرا انتظار کریں، میں ایک منٹ میں آ رہا ہوں۔'' مسٹر رائے نے ٹیلی فون بند کر دیا۔

انتظار میں کھڑے صحافی ہماری بات نہیں سن سکے تھے کیوں کہ میں بہت دھیمی آواز میں بول رہا تھا۔ ایک منٹ کے اندر اندر چھ سات آدمی لفٹ کے ذریعے نیچے آ گئے۔ ان میں سے دو یونیفارم میں بریگیڈیر تھے۔ باقی ماندہ سول کپڑوں میں تھے۔ ان میں سے سب سے چھوٹے قد کے نظر کا چشمہ اور آدھے بازوؤں والی قمیص اور پتلون پہنے ایک صاحب آگے آئے اور اپنا تعارف کرایا، ''میرا نام اے کے رائے ہے۔''

خاتون استقبالیہ پہلے ہی احترام میں اٹھ کر کھڑی ہو چکی تھی۔ انتظار میں کھڑے صحافی ہم پر جھپٹ پڑے، چند کیمروں کی فلیش لائیٹس بھی جلیں۔ مسٹر رائے ان صحافیوں سے جنہوں نے ہمیں گھیر رکھا تھا، درخواست کر رہے تھے۔ ''برائے مہربانی ہمیں راستہ دے دیں۔'' انہوں نے بڑی ہوشیاری سے مجھے بنگالی زبان میں کچھ بھی نہ کہنے کو کہا۔ تھوڑی سی دھکم پیل کے بعد ہم صحافیوں کے دائرے سے نکل کر لفٹ کے ذریعے پہلی منزل پر پہنچ گئے۔ یہ سارا معاملہ بہت سنسنی خیز تھا۔ خاتون استقبالیہ مکمل طور پر گم سم ہو گئی تھی۔ ہمیں اس کا شکریہ ادا کرنے کا بھی موقع نہ مل سکا تھا۔ مسٹر رائے ہمیں اپنے کمرے میں لے گئے۔ صرف ایک سکھ جوان ہمارے ساتھ کمرے میں آیا۔ اس سکھ جوان نے سفید قمیص اور سفید پتلون پہن رکھی تھی۔ اس سکھ کا تعارف جنرل اوبان سنگھ کے طور پر کرایا گیا۔ مسٹر رائے نے جنرل سے ہمارا تعارف کرا دیا۔ خوش پوش بیروں نے پہلے ہی جب ہم ایک دوسرے سے تعارف ہی کر رہے تھے، چائے لا کر رکھ دی تھی۔ ہم چائے پیتے ہوئے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔

''میں ایک مرتبہ پھر حکومت ہندوستان کی جانب سے آپ کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ آپ کی جرأت اور ہوشیاری قابل تعریف ہے۔ اس تاریخی شہر دہلی تک پہنچ کر آپ نے ناممکن کام کو ممکن بنا دیا ہے۔ ایک تاریخ ہے جو آپ نے رقم کی ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے جنرل صاحب؟'' مسٹر رائے خوشگوار انداز میں بات کر رہے تھے۔

''سر، کیا آپ کو ہمارا خط مل گیا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں! ہمیں مل گیا تھا۔'' مسٹر رائے نے جواب دیا اور میں مطمئن ہو گیا۔

''کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟'' دو بریگیڈیروں میں سے ایک کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے مسٹر رائے سے نگاہوں کا تبادلہ کیا اور کہا، ''دوستو! یہ صرف ایک رسمی سی کارروائی ہے۔ اگر آپ کے پاس کوئی ہتھیار ہے تو وہ برائے مہربانی مجھے دے دیں۔ میں یہ کیمرہ اور فلم بھی لینا چاہوں گا، برائے مہربانی بُرا نہ مانیے

گا۔سب چیزیں آپ کو مناسب وقت پر واپس کر دی جائیں گی۔''

بریگیڈیئر بہت نرم روی سے بات کر رہا تھا۔ ہم تینوں نے اپنے ذاتی ہتھیار بمعہ کیمرے بریگیڈیئر کو تھما دیئے۔ بریگیڈیئر نے یہ سب چیزیں لیں،شکریہ ادا کیا اور باہر چلا گیا۔

جب وہ باہر نکل گیا تو مسٹر رائے نے کہا،''اگر آپ نے چائے پی لی ہے تو آیئے وزیر خارجہ صاحب کے کمرے میں سلام کرنے کے لیے چلتے ہیں۔ ہم سب کھڑے ہو گئے اور مسٹر رائے کے ساتھ دوسری منزل پر پہنچ گئے۔ جنرل اوبان سنگھ بھی ہمارے ساتھ تھا۔ مسٹر رائے نے وزیر خارجہ کے پی اے سے کوئی بات کی اور ہمیں ساتھ لے کر کمرے میں داخل ہو گئے۔ وزیر خارجہ مسٹر سورن سنگھ بھی ایک سکھ تھے۔ انہوں نے ہمیں خوش آمدید کہا۔ یہ ایک مختصر سی رسمی ملاقات تھی۔

اس کے بعد ہم باہر آ گئے اور مسٹر رائے نے کہا،''اب سے آپ حکومت ہندوستان کے مہمان ہیں۔آپ کا سامان کہاں ہے؟''

''ہوٹل میں، ہوٹل نٹ راج میں۔''میں نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے۔ہم اسے یہاں منگوانے کا انتظام کر لیں گے۔آپ اس وقت تھکے ہوئے ہیں۔آپ کی رہائش کے لیے تمام انتظامات کر لیے گئے ہیں۔اپنے آپ کو پُرسکون رکھیں اور یوں سمجھیں جیسے آپ اپنے گھر میں ہیں۔اس وقت آپ کو گیسٹ ہاؤس لے جایا جائے گا۔ہماری دوبارہ ملاقات ہوگی، پھر ہم جی بھر کر گفتگو کریں گے۔ ویسے میرا تعلق بھی بارڈر کی دوسری طرف سے ہے۔''مسٹر رائے نے کہا۔ وہ ایک بہت زیادہ پرتپاک شخصیت کے مالک انسان تھے۔ہم سب نے ان کے اس محبت بھرے خوشگوار انداز کو بہت پسند کیا۔

35۔ ہمیں جنرل اوبان سنگھ کے سپرد کر دیا گیا تھا

خدا حافظ کہنے کے بعد ہم جنرل اوبان سنگھ کے ساتھ نیچے آ گئے۔ پانچ یا چھے افراد سول کپڑوں میں نیچے سیڑھیوں کے پاس ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ جیسے ہی ہم وہاں پہنچے، یہ تمام افراد فوری طور پر ایمبیسڈر کاروں میں بیٹھ گئے جو پورچ میں کھڑی تھیں۔ایک اور کار وہاں پہنچی، جنرل اوبان سنگھ نے ہمیں اس کے اندر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ہم نے انہیں خدا حافظ کہنے کی کوشش کی لیکن وہ مسکرائے اور کہا،''میں گیسٹ ہاؤس تک آپ کے ساتھ جاؤں گا۔''

ہم ان کی سادگی اور انکساری سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ وہ ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گئے۔ ہماری کار پہلے سے موجود دونوں کاروں کے درمیان لے لی گئی۔ یہ سیکیورٹی کے پیش نظر کیا گیا تھا۔یہ خاموش طبع اور نرم گفتار جنرل اوبان کون تھا؟ وہ اس دوران اور اب تک زیادہ تر خاموش تماشائی کے طور پر ہی رہے تھے۔ وہ جہاں بھی گئے ، ہر ایک آدمی نے ان کو بہت عزت دی اور ان سے تعظیم سے بات کی۔ خاموش اور ٹھنڈی فطرت کا یہ جنرل ضرور انٹیلی جینس سیٹ اپ میں کسی بڑے عہدے پر فائز تھا۔ بعد میں میرا یہ تاثر درست

ثابت ہوا۔ بعد میں ہمیں پتا چلا کہ یہ جنرل اوبان سنگھ ''را'' (ریسرچ اینڈ انیلیسس ونگ) کے ڈائریکٹر جنرل تھے۔ بہت سے موڑوں اور چکروں کے بعد ہماری کاریں ایک یک منزلہ بنگلے کے سامنے جا کر رک گئیں۔ بنگلے کے گرد بلند چار دیواری تھی۔ گیٹ کی چھوٹی سی کھڑکی سے ایک شخص نے جھانک کر دیکھا اور اگلے ہی لمحے گیٹ چوپٹ کھول دیا گیا۔

36۔ بریگیڈیئر نارائن ہمارے ہمہ وقت کے ساتھی بن گئے

جب ہماری کاریں گیٹ سے اندر جا رہی تھیں تو گیٹ پر موجود لوگ اٹینشن حالت میں کھڑے خاموشی سے ہمیں دیکھ رہے تھے۔ ایک چھوٹے قد اور گٹھے ہوئے جسم والا آدمی ہمیں خوش آمدید کہنے کے لیے سیڑھیوں میں کھڑا انتظار کر رہا تھا۔ وہ پھرتی سے دروازہ کھولنے کے لیے آگے بڑھا اور جیسے ہی جنرل اوبان سنگھ باہر آئے اور اس سے ہاتھ ملایا، وہ اٹینشن کھڑا ہو گیا۔ وہ آدمی ہمیں بنگلے کے لاؤنج میں لے کر آ گیا۔ جنرل اوبان نے اس کا ہمارے ساتھ بریگیڈیئر نارائن کے نام سے تعارف کرایا اور کہا، ''جب تک آپ لوگ یہاں ہیں، بریگیڈیئر نارائن آپ کی دیکھ بھال کریں گے۔''

میں نے بریگیڈیئر کی جانب بڑے دھیان سے دیکھا، اس کی عمر اندازاً چالیس کے لگ بھگ تھی، اور رنگت بنگالیوں کی یا ہماری ہی طرح سانولی تھی۔ سامنے سے سر تھوڑا سا گنجا، پتلی پتلی مونچھیں، تینوں اطراف میں چھوٹے چھوٹے گھنگھرالے بال، بریگیڈیئر نارائن آدھے بازوؤں والی قمیص اور پتلون پہنے ہوئے تھے۔ اس دوران بیرے نے کولڈ ڈرنکس لا کر میز پر رکھ دیئے وہ ہمارے لیے ایک مینو بھی لے کر آیا تھا۔ بریگیڈیئر نے کہا، ''دوستو! اس وقت دوپہر کے کھانے کا وقت ہو رہا ہے، کولڈ ڈرنک پئیں اور دوپہر کے کھانے کا انتخاب کر لیں۔'' میں نے موتی کے ساتھ نظروں کا تبادلہ کیا۔ مینو میں ہر قسم کے کھانے موجود تھے۔ سبزیوں والے، چائنیز اور انڈین، کانٹی نینٹل وغیرہ۔ ہم نے چائنیز کا انتخاب کیا، میں نے ہر ایک کی خواہش کے مطابق ڈش کا انتخاب کیا۔ بیرا واپس آیا، آرڈر لیا اور خالی گلاس اٹھا کر چلا گیا۔ یہ بنگلہ انٹیلی جینس ڈیپارٹمنٹ کے سیف ہاؤسز میں سے ایک تھا۔ اس کے سامنے ایک خوب صورت لان تھا۔ باہر سے کچھ نظر نہیں آ سکتا تھا کیوں کہ اس کی دیواریں کافی بلند تھیں۔ گیٹ کے پاس ایک گارڈ روم تھا، جہاں چھ سے سات آدمی متعین تھے۔ یہ تمام سول کپڑوں میں تھے، ان کے بالوں کی حجامت سے میں نے اندازہ لگایا کہ یہ تمام فوج سے تعلق رکھتے تھے۔ تمام گھر ایئر کنڈیشنڈ تھا۔

جنرل اوبان نے کہا، ''یہ چھوٹی سی جگہ آپ کے لیے ہے۔ کسی قسم کے تکلف کی ضرورت نہیں، جس چیز کی ضرورت ہو، آپ مانگ سکتے ہیں۔ یہ آپ کا اپنا گھر ہے۔'' اس قدر خوب صورت اور آرام دہ رہائش مہیا کرنے پر ہم نے اس کا اور اس کے ذریعے حکومت ہند کا شکریہ ادا کیا۔ اگرچہ بریگیڈیئر نارائن دیکھنے میں بنگالی نظر آتا تھا لیکن حقیقت میں اس کا تعلق یوپی سے تھا، اس کا ہمیں کافی دیر بعد علم ہوا۔ تھوڑی دیر

بعد ہمیں دوپہر کا کھانا دیا گیا۔ جنرل اوبان نے بھی ہمارے اصرار پر ہمارے ساتھ ہی کھانا کھایا۔ کافی پینے کے بعد انہوں نے کہا، "ٹھیک ہے، میں اب جا رہا ہوں۔ بریگیڈیئر نارائن آپ کا خیال رکھیں گے۔ آپ لوگ تھکے ہوئے بھی ہوں گے۔ جی بھر کر آرام کریں۔ کل سے ہم اپنا کام شروع کریں گے۔" جنرل نے ہمیں خدا حافظ کہا اور چلا گیا۔

بریگیڈیئر نے ہمیں ہمارے کمرے دکھائے۔ میں نے اپنے کمرے میں جا کر دیکھا کہ کسی نے ہوٹل سے ہمارا بیگ اور کپڑے جو ہم نے وہاں دھونے کے لیے دیئے تھے، لا کر رکھ دیئے تھے۔ ہمیں ہمارے کمرے دکھانے کے بعد بریگیڈیئر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ ہم تینوں ایک ہی کمرے میں بیٹھ گئے۔ تفتیش کا مرحلہ کل سے شروع ہوگا، شاید جنرل نے جاتے ہوئے اسی بات کی جانب اشارہ کیا تھا۔

شام کو بریگیڈیئر نارائن نے ہمارے ساتھ چائے پی اور شاپنگ کے لیے ہمیں باہر لے جانے کی پیشکش کی۔ وہ حقیقت میں ہمارا بہت دھیان رکھ رہے تھے۔ ہمارا سامان دیکھنے کے بعد انہوں نے ہمیں چند ضروری اشیاء خرید کر دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ ہر ایک کے لیے دو جوڑے کپڑے، سونے والا لباس، سلیپرز اور دوسری ضروری اشیاء خریدی گئیں۔ ہم انتخاب کر رہے تھے لیکن ہمیں بل ادا کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ ہم حکومت ہند کے مہمان تھے، بریگیڈیئر نے یہ جواز پیش کیا تھا۔ شاپنگ مکمل کرنے کے بعد اندھیرا چھا جانے پر ہم اپنی جگہ واپس آ گئے۔

اس رات ہم سے باتیں کرتے ہوئے بریگیڈیئر نارائن نے ہمارے اور ہمارے خاندانوں کے بارے میں تفصیل کے ساتھ بہت سے سوالات پوچھے۔ اگلی صبح جنرل اوبان سنگھ آیا، اس کے ساتھ چار اور آدمی بھی تھے۔ ان کے حلیے سے ہم سمجھ گئے تھے کہ یہ تمام بھی ایجنسی کے بڑے آفیسرز ہیں۔ جنرل اوبان نے ان کا ہم سے تعارف کرایا اور واپس چلا گیا۔ تفتیش کا مرحلہ شروع ہو گیا۔ بعض اوقات مشترکہ طور پر، بعض اوقات علیحدہ علیحدہ فرداً فرداً، ہمیں کچھ سوال نامے بھی دیئے گئے جن کے تحریری جواب دینے تھے۔ یہ مرحلہ چار دن اور راتوں تک جاری رہا۔ ہماری ذاتی اور خاندانی زندگی، ہمارے دوستوں اور رشتہ داروں، پاکستانی فوج کے تنظیمی سیٹ اپ، میدانِ جنگ میں اس کی صف بندی، چالوں اور حکمت عملیوں کے بارے میں تمام تر معلومات حاصل کی گئیں۔ یہاں سے شروع ہو کر دفاعی تنصیبات، مواصلات کے طریقہ کار، تربیت، طرزِ زندگی، بارڈر سکیورٹی سسٹم، سب کے بارے میں سوالات کیے گئے۔ حکومت اور خارجہ تعلقات، سیاست، نئی تعمیر شدہ قراقرم ہائی وے، مسلح افواج کے بنگالی ممبران، بیوروکریٹس، غرض کوئی پہلو چھوڑا نہیں گیا تھا۔ انہوں نے بیانات اور جوابات کے تفصیلی نوٹس لیے۔ ہم نے اپنے علم اور استعداد کے مطابق ان کو درست جواب دینے کی کوشش کی۔ ہمارے جوابات کی تصدیق کے لیے ایک منظم طریقے سے پڑتال کی گئی۔ انہیں ہم سے بہت قیمتی اور خفیہ معلومات حاصل ہوئیں۔

اس دوران ہم نے بریگیڈیئر نارائن سے پوچھا کہ آیا ہندوستانی حکومت نے ہمارے بارے میں مجیب نگر کی حکومت سے رابطہ کیا ہے یا نہیں۔ اس نے ہمیں بتایا کہ رابطہ کیا جا چکا ہے اور جلد ہی عبوری حکومت کے چند رہنماؤں کی دہلی میں آمد متوقع ہے اور ان کے آنے پر ہمیں باقاعدہ طور پر ان کے حوالے کر دیا جائے گا۔

37۔ دو بنگالی سفارت کاروں سے ملاقات

ایک شام کو مسٹر اے کے رائے ہمیں دو دوسرے آدمیوں کے ہمراہ ملنے کے لیے آئے۔ وہ مسٹر شہاب الدین اور مسٹر اجمل حسین تھے۔ یہ دو بنگالی سفارت کار تھے، جو پاکستانی مشن میں سیکنڈ اور تھرڈ سیکریٹریز کے طور پر خدمات انجام دے رہے تھے۔ جب 17 اپریل کو مجیب نگر کی حکومت تشکیل دی گئی، وہ دونوں منحرف ہو گئے اور سیاسی پناہ طلب کر لی۔ ہندوستانی حکومت نے انہیں سیاسی پناہ دے دی اور ان کے تحفظ اور ضروریاتِ زندگی کی ذمہ داری بھی اٹھا لی تھی۔ انہیں بھی ہماری طرح ایک دوسرے سیف ہاؤس میں رکھا گیا تھا۔ ان دونوں سفارت کاروں نے بھی ہماری طرح جدوجہد میں شریک ہونے کے لیے اپنے کیریئر کو قربان کرتے ہوئے ایک غیر یقینی مستقبل کو اپنانے کا خطرہ مول لیا تھا۔ ہمیں ان سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ انہوں نے آزادی کی جدوجہد اور تحریک کے بارے میں بہت سی معلومات دیں۔ ہماری جرأت اور حب الوطنی پر ہمیں مبارک باد دیتے ہوئے انہوں نے کہا کہ مکتی باہنی کو ہماری طرح کے بہت سے آفیسرز کی ضرورت ہے۔ ہم نے انہیں بتایا کہ ہم نے بھی ہندوستان کی حکومت کو سیاسی پناہ کی درخواست دے رکھی ہے اور امید کرتے ہیں کہ ہماری درخواستوں کو قبول کر لیا جائے گا۔ اس رات ہم سب نے مل کر کھانا کھایا۔

ایک موقع پر مسٹر رائے نے کہا، ''کیا تم جانتے ہو کہ تمہارا کامیاب فرار ہماری جانب کے کچھ لوگوں کے لیے رنج و ملال لے کر آئے گا، اور کچھ لوگ اپنی ملازمتوں سے بھی ہاتھ دھو سکتے ہیں۔''

ہم جانتے تھے کہ جس طرح ہم چکر کاٹ کر بغیر کسی کی نظروں میں آئے دہلی پہنچ گئے تھے، وہ ذمہ دار اشخاص کے کیریئر پر اثر انداز ہو سکتا تھا۔ جو کچھ مسٹر رائے کہہ رہے تھے، اس کو خاموشی سے سننے کے علاوہ ہم کچھ کہہ نہیں سکتے تھے۔

ایک موقع پر میں نے شہاب الدین سے پوچھا، ''کیا آپ کو عبوری حکومت کے کچھ رہنماؤں کے کسی آنے والے دورے کے بارے میں کوئی علم ہے؟''

''نہیں، ہم اس بارے میں کچھ نہیں جانتے۔'' مسٹر شہاب الدین نے جواب دیا۔ میں سمجھ گیا کہ سیکیورٹی وجوہات کی بنا پر ہندوستانی حکام نے ان معلومات کو انتہائی خفیہ رکھا ہوا تھا۔ لہٰذا میں نے بھی اس مسئلے پر خاموش رہنے کا فیصلہ کیا اور موضوع بدل دیا۔

38۔ تفتیش کا مرحلہ ختم ہو گیا اور ہم عبوری حکومت کے وفد کا انتظار کر رہے تھے

تفتیشی مراحل کے دوران بریگیڈیئر نارائن ہمیں دہلی کے مختلف حصے اور اس کی زندگی دکھانے کے لیے باہر لے جاتا رہا۔ دہلی ایک تاریخی شہر ہے جو قدیم عمارتوں اور یادگاروں سے بھرا ہوا ہے۔ یہاں ماضی کے ورثے اور جدید زندگی کی جھلکیوں کا ایک حسین امتزاج نظر آتا ہے۔ شہر بنیادی طور پر دو حصوں میں تقسیم ہے۔ پرانی دہلی، جب کہ چمکتے دمکتے پوش مضافات نئی دہلی کہلاتے ہیں۔ یہ دنیا کے چند قدیم شہروں میں سے ایک ہے جہاں ابھی تک آپ قدیم اور جدید رنگوں کی آمیزش دیکھ سکتے ہیں۔

ہم نے اپنی فرصت کے اوقات میں چند فلمیں بھی دیکھیں، لیکن ہم جہاں بھی جاتے تھے ہمارے ساتھ نگران دستہ ضرور ہوتا تھا۔ تفتیش کا مرحلہ ختم ہو چکا تھا، لیکن کوئی رہنما ابھی تک ہمیں ملنے نہیں آیا تھا۔ ہمیں حقیقت میں کچھ بھی نہیں کرنا ہوتا تھا۔ فارغ رہ کر وقت گزارنا بہت مشکل ہو گیا تھا۔

39۔ تاریخی مقامات کی سیر

اچانک بریگیڈیئر نارائن نے ایک دن تجویز پیش کی، ''اگر آپ پسند کریں تو ہم جے پور، آگرہ اور فتح پور چلتے ہیں۔'' زبردست! ہم نے فوراً یہ پیشکش قبول کر لی۔ ہم نے دو جیپوں پر بذریعہ سڑک سفر کرنے کا فیصلہ کیا۔ اگر ہم ہوائی جہاز کے ذریعے سفر کرتے تو کئی ایک نظاروں سے محروم رہ سکتے تھے۔ مزید برآں سڑک کے ذریعے سفر سے ہم بہت زیادہ لطف و انبساط حاصل کر سکتے تھے۔ ضروری اجازت حاصل کرنے کے بعد ہم سب روانہ ہونے کے لیے تیار تھے۔

ایک خوشگوار صبح ہم نے سفر کا آغاز کیا۔ پہلی جیپ میں ہم تینوں بریگیڈیئر نارائن کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے جسے وہ خود ہی ڈرائیو کر رہا تھا۔ دوسری جیپ میں مسلح نگران دستہ اور ہمارا ضروری سامان تھا۔ پہلا قیام جے پور تھا، جدید اور قدیم طرزِ تعمیر کا ایک حسین امتزاج یہ شہر، گلابی شہر کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اکثر عمارتیں سرخ اور گلابی پتھر سے بنائی گئی ہیں یہی وجہ ہے کہ اسے گلابی شہر (Pink City) کہا جاتا ہے۔ جے پور سے آگرہ جاتے ہوئے ہم ''سکندرا'' میں رُکے، یہاں عظیم بادشاہ اکبر کا مقبرہ ہے۔ یہاں پرسکون اور خاموش ماحول میں سفید سنگ مرمر کے مقبرے میں مشہور اور سب سے طاقتور مغل شہنشاہ ابدی نیند سویا ہوا ہے۔ ہم متھرا اور برینداابن کے پاس سے بھی گزرے جو ہندو مت کی دو مقدس زیارت گاہیں ہیں۔ دونوں ایک دوسرے سے کوئی زیادہ فاصلے پر نہیں ہیں۔ ہندو پجاری سارا سال ملک کے طول و عرض سے ان کی زیارت کے لیے آتے ہیں۔

آخر کار ہم دریائے جمنا کے کنارے آگرہ پہنچ گئے جہاں ملکہ ممتاز محل کا سفید سنگ مرمر سے چمکتا ہوا مشہور مقبرہ تاج محل واقع ہے۔ تاج محل کا شمار دنیا کے سات عجائبات میں ہوتا ہے۔ دریا کے دوسرے

کنارے کچھ فاصلے پر آگرہ کا قلعہ ہے۔ شہنشاہ شاہ جہان نے یہ مقبرہ اپنی چہیتی ملکہ ممتاز محل کی یاد میں ایک محبت کی علامت کے طور پر تعمیر کرایا تھا۔ یہ حقیقت میں ایک حیرت زدہ حسن لیے ہوئے ہے۔ اسے دیکھنے والا کوئی بھی انسان اس کے پُرجلال حسن کا نظارہ کرتے ہوئے تاریخ میں گم ہو جاتا ہے۔ محبت کی اس علامت کی دیواروں پر قرآنی آیات کندہ کی گئی ہیں۔ اس کے حسن کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا نظارہ انسان کو مکمل طور پر اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ یہاں ہر وقت پوری دنیا سے آنے والے سیاحوں کا ہجوم رہتا ہے۔ خاص طور پر محبت کرنے والے جوڑے یہاں آکر ملکہ اور شہنشاہ کی محبت کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے اپنی محبت کے دوام کے لیے دعائیں مانگتے ہیں۔ تاج محل سے ہم آگرہ قلعہ میں گئے۔ زندگی کے آخری ایام میں شہنشاہ شاہ جہان کے بیٹے نے اپنے باپ کو اسی قلعے میں قید رکھا تھا۔ قلعے کی ایک بالکنی سے شہنشاہ تاج محل کا نظارہ کر سکتا تھا۔ آگرہ کا قلعہ بھی قدیم فنِ تعمیر کا ایک شاہکار اور حیرت انگیز عجوبہ ہے۔

آگرہ سے ہم فتح پور سیکری کی جانب روانہ ہوئے۔ اکبر نے سرخ پتھر کا یہ عظیم محل اپنی ایک راجپوت ملکہ جودھا بائی کے لیے تعمیر کیا تھا۔ اس کے صدر دروازے کو ''بلند دروازہ'' کہا جاتا ہے۔ فتح پور میں اُس دَور کے حقیقی فنِ تعمیر سے آگہی حاصل ہوئی۔ اندر سے کھلی دیواروں میں کمروں کے درجۂ حرارت کو کنٹرول رکھنے کے لیے گرم اور ٹھنڈے پانی کے بہاؤ کا ایک نظام تشکیل دیا گیا تھا۔ صحن کے وسط میں سفید سنگ مرمر سے مزین حضرت سلیم چشتیؒ کا مزار ہے۔

شہنشاہ، حضرت سلیم چشتیؒ سے خاص عقیدت رکھتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی دعا کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے اکبر کو بیٹے سے نوازا تھا۔ لہٰذا جو بھی ان کے مزار پر حاضری دیتا ہے، وہ اپنی تمناؤں اور خواہشات کی تکمیل کے لیے دعائیں مانگتا ہے۔ گائیڈ ہمیں یہ ساری داستان سنا رہا تھا۔ اس نے کہا، ''جو شخص بھی یہاں عقیدت اور اخلاص کے ساتھ دعا کرتا ہے، اس کی تمنا ضرور پوری ہوتی ہے۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے ہمیں دھاگے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے دیئے اور کہا کہ اپنی خواہشات بیان کرتے ہوئے اس دھاگے کو یہاں باندھ دیں۔ وہاں پہلے بھی بے شمار دھاگے بندھے ہوئے تھے۔ ہم تینوں نے بنگلہ دیش کی آزادی کے لیے دعا کی اور دھاگے باندھ دیئے۔

ہم محل میں گھومتے پھرتے رہے۔ دربار جہاں تان سین گایا کرتا تھا، وہ جگہ جہاں شہنشاہ اور ملکہ پانسے سے کھیلا کرتے تھے، وہ جگہ جہاں مجرموں کو ہاتھیوں کے پاؤں تلے کچلا جاتا تھا۔ ہاتھیوں اور گھوڑوں کے لیے اصطبل، اندر محل، خاص محل، ہم نے تمام جگہیں دیکھیں۔ تاہم اس محل کو پانی کی کمی کی وجہ سے اکبر کو اپنی زندگی میں ہی چھوڑنا پڑ گیا تھا۔ محل میں ہم نے ہر جگہ جنگلی موروں کی اچھی خاصی تعداد دیکھی۔ مور، ہندوستان کا قومی پرندہ ہے۔ ہم اس پُرسکون اور خاموش محل میں گھوم پھر رہے تھے اور سوچ رہے تھے کبھی یہ جگہ شان و شوکت کا مرکز تھی، چاروں طرف گہما گہمی کا سامان تھا۔ کوئی بھی نہیں جانتا کہ کتنی ان کہی داستانیں ان پتھروں کی سلوں کے نیچے دفن ہیں، اور نامکمل خواہشات و توقعات کی کتنی صدائیں آج بھی ان

راہداریوں میں گونج رہی ہیں۔ کتنے لوگ ان خفیہ تہ خانوں میں موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے ہوں گے جن کا آج تک کسی کو علم بھی نہ ہوسکا۔ یہ ایک عجیب احساس تھا۔ یوں محسوس ہورہا تھا ہم یہ سب کچھ سن رہے ہوں اور محسوس کر رہے ہوں۔

میں پتا نہیں کس طرح دوسروں سے بچھڑ گیا۔ جب مجھے اس کا احساس ہوا تو میں کسی حد تک خوف زدہ ہوگیا اور تیزی سے چل کر اپنے ساتھیوں کے پاس جا پہنچا۔ شام کا وقت ہورہا تھا، ہر چیز پر اندھیرا چھا رہا تھا۔ ہم سب اپنی جیپوں کی طرف آئے۔ اب واپسی کا وقت ہو چکا تھا۔ ہم ساری رات سفر کرتے رہے اور صبح ہونے کے قریب ہم دہلی پہنچ گئے۔ یہ ایک طوفانی دورہ تھا، لیکن ہم سب نے خوب لطف اٹھایا۔ یہ بریگیڈیئر نارائن کی مہربانی تھی۔

40۔ اعلیٰ سطح کے وفد کی آمد

ہمارے اس تیز رفتار دورے کے بعد یہ دوسری صبح تھی۔ میں نے بریگیڈیئر نارائن کو ناشتے کی میز سے غیر حاضر پایا۔ میں نے بیرے سے پوچھا کہ وہ کہاں ہیں؟

''صاحب صبح ناشتہ لے کر نکل گیا۔'' بیرے نے جواب دیا۔ ایک تجربہ کار اور تربیت یافتہ آدمی ہونے کے ناتے اس نے مزید تفصیل نہیں بتائی تھی اگرچہ شاید اسے علم بھی تھا۔ ناشتے کے بعد ہم لاؤنج میں بیٹھے گپ شپ کر رہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد بریگیڈیئر واپس آ گیا۔ وہ بہت خوش اور پرجوش نظر آرہا تھا۔ ''دوستو، جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ مجیب نگر سے بنگلہ دیش کی عبوری حکومت کے وزیراعظم تاج الدین احمد، وزیر خارجہ کھنڈکر مشتاق احمد اور مکتی باہنی کے کمانڈر انچیف کرنل ایم اے جی عثمانی پہنچ چکے ہیں۔ آج آپ کی ان سے ملاقات ہوگی۔''

یہ خبر ایسی تھی جس پر ہمیں بہ مشکل یقین آیا۔ یہ غیر متوقع خوش کن خبر سن کر ہم سب بہت زیادہ خوش ہو گئے تھے۔ اس سے بہتر اور کیا ہوسکتا تھا۔ یہی وہ لمحہ تھا جس کا ہم اتنے دنوں سے انتظار کر رہے تھے۔ ہم نے یہ خبر سننے کے لیے ایک ایک لمحہ گن گن کر گزارا تھا۔

بریگیڈیئر نے مزید بتایا، ''مجیب نگر کی قیادت آپ کے مستقبل کا فیصلہ کرے گی اور حکومت ہندوستان اس کے مطابق عمل کرے گی۔''

ابھی تک مکمل طور پر یہ پتا نہ چلا تھا کہ ہم کب جائیں گے، تاہم ہمیں کسی وقت بھی روانگی کا اشارہ مل سکتا تھا۔ لہٰذا ہمیں روانگی کے لیے ہمہ وقت تیار رہنا چاہیے تھا۔ جلد ہی ہم تیار ہو کر بیٹھ گئے۔ ہر گزرنے والا لمحہ بہت طویل محسوس ہو رہا تھا۔ اگرچہ گھڑی اپنی معمول کی رفتار سے چل رہی تھی۔ اب ایک بج چکا تھا۔ بیرے نے دوپہر کا کھانا لگا دیا تھا لیکن ہمیں کھانے کا اتنا اشتیاق نہ رہا تھا۔ پھر بھی ہم معمول کی پیروی کرتے ہوئے میز پر بیٹھ گئے اور کھانا کھانے لگے۔ ابھی ہم نے کھانا ختم ہی کیا تھا کہ پورچ پر ایک سیڈان کار رُکی اور سول

کپڑوں میں ملبوس ایک اجنبی شخص نیچے اترا۔ بریگیڈیئر نارائن اس کے استقبال کے لیے اٹھ کر دروازے تک گیا۔ اس نے اس نو وارد کو ہمارا تعارف کروایا لیکن اس کے بارے میں ہمیں کچھ نہ بتایا۔ غیر ضروری سوال پوچھنا مناسب نہیں تھا، لہٰذا ہم خاموشی سے لاؤنج میں بیٹھ گئے۔

اس شخص نے بریگیڈیئر نارائن سے کہا، ''آئیں چلتے ہیں، وقت ہو گیا ہے۔''

بریگیڈیئر نے ہماری طرف دیکھا اور یہی الفاظ دہرائے۔ ہم سب باہر آ گئے۔ نئے آنے والے کی کار میں ڈرائیور کے علاوہ پچھلی سیٹ پر تین آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔

لیکن اس مرتبہ ایک تبدیلی دیکھنے میں آئی۔ ہماری نگران گاڑی نے ہمارے ساتھ نہیں جانا تھا۔ اس کا مطلب تھا، دوسری کار میں آنے والا شخص ہمارا نگران تھا۔ چند منٹ گاڑی چلنے کے بعد ہم ایک قدرے خاموش سڑک پر پہنچ گئے۔ ہمارے آگے جانے والی گاڑی سڑک کے کنارے پہلے سے کھڑی ایک گاڑی کے پیچھے جا کر اچانک رُک گئی۔ ہماری کار اگلی کے پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔ نو وارد شخص کے اشارے پر ہم چاروں باہر آئے اور منتظر کھڑی کار میں بیٹھ گئے۔ یہ دوہرا سیکیورٹی چیک تھا۔ ہم دوبارہ آگے بڑھنا شروع ہو گئے۔ ہماری اصل کار اس دفعہ ہمارے پیچھے نہیں آ رہی تھی۔ یہ بڑی باریک بینی سے ترتیب دیئے گئے سیکیورٹی اقدامات تھے۔

تقریباً بیس منٹ چلنے کے بعد دونوں کاریں ایک جدید دو منزلہ بنگلے کے آہنی گیٹ کے سامنے رُک گئیں۔ وہاں موجود سنتری نے چھوٹے سے سوراخ میں سے جھانک کر دیکھا۔ گیٹ کھل گیا اور ہم اندر چلے گئے۔ نو وارد شخص ہمیں لے کر ایک کمرے میں داخل ہوا اور ہمیں وہاں بٹھا کر خود اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ آیا اور ہم تینوں کو پیچھے آنے کو کہا۔ ہم سیڑھیاں چڑھ کر اوپر گئے اور ایک بند دروازے کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ اس نے دروازہ کھٹکھٹایا۔

''تشریف لے آئیں۔'' کسی نے جواب دیا۔ اس آدمی نے ہمیں اندر جانے کا اشارہ دیا اور ہمارے لیے دروازہ کھول دیا۔ ہم نے اس کے اشارے کی تعمیل کی۔ وہ شخص ہمارے بعد اندر آیا۔ اندر ہم نے کرنل عثمانی کو سفید کرتے پاجامے میں صوفے پر بیٹھے ہوئے پایا۔ جیسے ہی ہم اندر داخل ہوئے، وہ ہم سے ملنے کے لیے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ اس آدمی نے باری باری کرنل عثمانی سے ہمارا تعارف کرایا۔ ہمارے تعارف کے بعد اس نے اجازت چاہی اور باہر نکل گیا۔ کرنل عثمانی نے ہمیں کرسیوں پر بیٹھنے کا اشارہ کیا جب کہ خود صوفے پر بیٹھ گئے۔

''اچھا تو لڑکو! میں آپ کو مبارک باد دیتا ہوں اور دلی خوش آمدید کہتا ہوں۔ میں آپ کی حب الوطنی سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ آپ لوگوں نے ایک معجزہ انجام دیا ہے۔ ہمیں آپ کی آمد کا وقت پر پتا چل گیا تھا۔ مجھے امید ہے کہ اس دوران آپ سے اچھا سلوک روا رکھا گیا ہو گا۔'' کرنل نے استفسار کیا۔

''جی سر، حقیقتاً بھارتی حکام نے ہمارا بہت اچھا خیال رکھا۔'' میں نے جواب دیا۔

''بہت خوب، ہمیں آپ جیسے آفیسرز کی شدت سے ضرورت ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ جیسے اور آفیسرز بھی پاکستان سے آئیں۔'' کرنل عثمانی نے کہا۔

''سر، پاکستان سے بہت سے لوگ فرار ہونا چاہتے ہیں۔ لیکن انہیں آزادی کی جدوجہد کے بارے میں اور ہندوستانی حکومت کے رویے کے بارے میں پوری طرح علم نہیں ہے اس لیے وہ ایسا کوئی قدم اٹھانے میں ہچکچاہٹ محسوس کرتے ہیں۔ اگر کسی طرح ہم انہیں بتاسکیں کہ ہندوستانی حکومت اور فوج ہمارے مقصد کے ساتھ ہمدردی رکھتی ہے اور تعاون کر رہی ہے تو بہت سے آفیسرز جن کو ہم جانتے ہیں خطرہ مول لینے کو تیار ہیں۔'' میں نے کرنل کو عثمانی کو بتایا۔

''یہ کام کیسے کیا جاسکتا ہے؟'' کرنل نے استفسار کیا۔

''ہم اپنے دوستوں اور دوسرے افسروں کو، جنہیں ہم جانتے ہیں، خط لکھ سکتے ہیں۔ اگر پاکستان میں یہ خط ان تک لے جانے کا کوئی بندوبست کیا جاسکے تو پھر انہیں پیغام مل سکتا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''اچھی تجویز ہے۔ ہم دیکھیں گے۔'' کرنل نے کہا۔ انہوں نے مزید کہا،'' وزیراعظم، وزیر خارجہ اور میں خود ہندوستان حکومت کے ساتھ باہمی دلچسپی کے امور پر بات چیت کرنے کے لیے یہاں موجود ہیں۔ میں آپ کی یہ تجویز اپنی گفتگو کے دوران پیش کروں گا۔ اب میں آپ سب کو وزیراعظم صاحب کے پاس لے کر جاؤں گا۔ وہ آپ سے ملاقات کے لیے انتظار کر رہے ہیں۔ وہ آپ کو بتائیں گے کہ بنگلہ دیش حکومت نے آپ کے لیے کیا فیصلہ کیا ہے اور آپ کو کون سی ذمہ داریاں سونپی جائیں گی۔''

ہم سمجھ رہے تھے کہ عبوری حکومت اس دوران ہندوستانی حکام کے ساتھ مشورہ کرنے کے بعد پہلے ہی ہمارے بارے میں فیصلہ کر چکی ہوگی۔ وہ ہمیں اپنے کمرے کے ساتھ ہی ایک دوسرے کمرے میں لے گئے، یہ ڈرائنگ روم تھا۔ ایک ڈبل صوفے پر وزیراعظم تاج الدین بیٹھے ہوئے تھے، انہوں نے سفاری سوٹ پہن رکھا تھا۔ اسی صوفے کے دوسرے کنارے پر وزیر خارجہ مشتاق احمد تھے۔ انہوں نے پاجامہ اور شیروانی پہن رکھی تھی اور اپنی مخصوص ٹوپی سر پر اوڑھ رکھی تھی۔ وہ دونوں ٹانگیں تہہ کر کے صوفے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ جیسے ہی ہم اندر داخل ہوئے، دونوں اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ کرنل عثمانی نے مجیب نگر کی حکومت کے وزیراعظم اور وزیر خارجہ سے ہمارا تعارف کروایا۔ وزیراعظم صاحب نے ہمارا پرتپاک استقبال کیا۔ اس دوران ایک بیرا اسنیکس اور چائے لے کر آ گیا۔ یہ بھی حکومت کا ایک گیسٹ ہاؤس تھا۔ تینوں نے ہم سے بہت سی چیزوں کے بارے میں سوالات پوچھے۔ وہ ہمارے عظیم فرار کے بارے میں بہت زیادہ متجسس تھے۔ وہ سوالات پوچھ رہے تھے اور ہم جواب دے رہے تھے۔

41۔ ہمارے قیامِ دہلی کو طویل کرنے کا فیصلہ

ایک موقع پر تاج الدین نے کہا،'' آپ آزادی کی جدوجہد کے پس منظر کے بارے میں زیادہ

نہیں جانتے۔ آزادی کی تحریک، جنگ آزادی کا آغاز کیسے ہوا تھا اور عبوری حکومت کی حکمت عملی کیا ہے۔ اس سب کے بارے میں آپ کو مکمل علم ہونا چاہیے، پھر ہی آپ اس جدوجہد میں اپنی بہترین صلاحیتوں کے مطابق پورا پورا حصہ ڈال سکتے ہیں۔ آپ سب خاص طور پر تربیت یافتہ آفیسرز ہیں، اس لیے ہم نے آپ کو کچھ مخصوص ذمہ داریاں سونپنے کا فیصلہ کیا ہے۔ آپ کو یہاں مزید دو ہفتے قیام کرنا پڑے گا تا کہ آپ کو آپ کے کام کے بارے میں ہر ایک پہلو سمجھایا جا سکے۔ جنرل اوبان اور ان کے ساتھی آپ کو مناسب طریقے سے ہدایات دیں گے۔ اس طرح آپ اس جدوجہد اور اپنے فرائض سے مکمل طور پر باخبر ہو کر اور مناسب ہدایات کے ساتھ مجیب نگر آئیں گے۔''

ہم وزیر اعظم کے اس بیان اور ان کے فیصلے پر قدرے حیران تھے۔ یہ جدوجہد بنگلہ دیش کی آزادی کے لیے تھی، لہٰذا ہمیں ہندوستانی حکومت کے افسران سے ہدایات لینے کی کیا ضرورت تھی۔ اس بارے میں ہمارے اپنے لوگ بہتر رہنمائی کر سکتے تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جدوجہد صرف ہماری اپنی نہیں تھی اور ہندوستانی حکومت کی مدد اور حمایت غیر مشروط نہیں تھی۔ یہ بات صاف سمجھ آ رہی تھی کہ بنگلہ دیش کی آزادی کی جدوجہد میں ہندوستان کی حکومت بہت زیادہ اثر ورسوخ اور عمل دخل رکھتی تھی اور مجیب نگر کی حکومت کسی بھی فیصلے سے پہلے ہندوستانی نقطہ نظر کو غیر ضروری اہمیت دے رہی تھی۔ یہ سارا معاملہ دھندلایا ہوا اور غیر واضح تھا۔ ہمارے ذہنوں میں بہت سے سوالات پیدا ہوئے۔ لیکن میں نے دل میں خیال کیا کہ بالکل اسی وقت ان تمام سوالات کے جواب حاصل کرنا مناسب نہیں ہوگا۔ ان کے لیے انتظار کرنا مناسب ہوگا۔ اپنے وقت پر جوابات خود بخود سامنے آ جائیں گے۔ باہر ڈرائنگ روم میں بریگیڈیئر نارائن ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ پہلے کی طرح ہم نے واپسی کے راستے میں بھی کاریں تبدیل کیں اور اپنے سیف ہاؤس میں پہنچ گئے۔

کار میں بریگیڈیئر نے پوچھا،''ملاقات کیسی رہی؟''

''بہت اچھی۔'' میں نے مختصر جواب دیا۔ ہم تینوں کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے لیکن موتی اور نور بڑے تلخ مزاج میں نظر آ رہے تھے۔''سر، بنگلہ دیش ایک لاحاصل معاملہ نظر آ رہا ہے۔ ایسی آزادی میں مجھے کوئی منطق یا فائدہ نظر نہیں آ رہا، جس میں محض دارالحکومت کو اسلام آباد سے دہلی منتقل کر دیا جائے۔ عوامی لیگ نے پہلے ہی قوم کو ہندوستان کے پاس بیچ دیا ہوا ہے۔ ہم نے جو خواب دیکھا تھا وہ حقیقت کا روپ دھارتا نظر نہیں آ رہا۔ یہ آزادی بالکل بے معنی ہوگی۔'' نور نے مکمل مایوسی اور جھنجھلاہٹ کے عالم میں کہا۔

''اس طرح سے بددل ہو جانا درست نہیں ہے، نور۔ ہم اس بارے میں اس وقت غور کر سکتے ہیں جب میدان میں ہوں گے۔'' موتی نے نور کو تسلی دینے کے لیے کہا۔ میں بالکل خاموش بیٹھا ہوا تھا۔ شام کو جنرل اوبان سنگھ اور مسٹر اے کے رائے تشریف لائے۔

مسٹر رائے نے ہمیں تین سربمہر لفافے تھماتے ہوئے کہا،''آپ کی التماسات منظور کر لی گئی ہیں۔ عزت مآب وزیر اعظم اور حکومت ہندوستان نے آپ تینوں کو سیاسی پناہ عطا کر دی ہے۔''

ہم نے لفافے کھولے، ان میں جو کچھ مسٹر رائے نے کہا تھا اس کی تحریری تصدیق موجود تھی۔ جنرل اوبان سنگھ نے ہمیں کہا کہ کل ہمیں ایک نئی جگہ منتقل کر دیا جائے گا، جہاں ہم مجیب نگر منتقل ہونے تک رہیں گے۔ بریگیڈیئر نارائن نے یہ تمام بندوبست کرنا تھا اور پہلے کی طرح ہمارے لیے قیام کی جگہ پر ہمارے ساتھ ہی رہنا تھا۔

جب جنرل اوبان اور مسٹر اے کے رائے چلے گئے تو ہم نے رات کا کھانا کھایا اور اپنے آپ کو پریشانی سے آزاد کرنے کے لیے فلم دیکھنے کا پروگرام بنایا۔ جب ہم فلم دیکھ کر واپس آئے تو مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ سوالات جو میرے ذہن میں ابھر رہے تھے، ابھی تک مجھے پریشان کیے ہوئے تھے۔ یہ آزادی کی تحریک دراصل کس کی تحریک تھی؟ کن محرکات کے تحت بھارت پس پردہ رہتے ہوئے اسے کنٹرول کر رہا تھا؟ قومی آزادی کی تمام تحریکیں اور جنگیں ہمیشہ قومی حکومتوں یا قومی قیادت کے تحت لڑی یا منظم کی جاتی ہیں تو پھر ہمارے سلسلے میں یہ معاملہ مختلف کیوں تھا؟ قومی آزادی کی تحریک کے لیے ایک قومی حکومت کی بجائے ہندوستانی حکومت کی خاموش منظوری اور حمایت کے ساتھ فوری طور پر عوامی لیگ کی عبوری حکومت کیوں قائم کی گئی تھی؟ پوری قوم پر، جو آزادی کی جنگ لڑ رہی تھی، عوامی لیگ کی قیادت کو مسلط کرنے کے پیچھے اصل محرکات کیا تھے؟ ایوب مخالف تحریک سے شروع ہوتے ہوئے عدم تعاون کی تحریک تک ہر سیاسی جدوجہد مشرقی پاکستان کی تمام ترقی پسند قوتوں کی مشترکہ قیادت کے تحت منظم کی گئی تھی۔ موجودہ حالات میں ہندوستان عوامی لیگ کے تنہا چلنے کے منصوبے کی حمایت کیوں کر رہا تھا؟ ہمیں ان تمام سوالات کے جوابات آنے والے واقعات کے دھارے سے ہی اخذ کرنا تھے۔ اس مرحلے پر عقل مندی کا تقاضا یہی تھا کہ کسی قسم کے اختلافِ رائے میں نہ پڑا جائے بلکہ ہر بات کو اور ہر پیش رفت کو خاموش تماشائی کی طرح سنا اور دیکھا جائے۔ ہمیں ہر وقت بہت زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔ میں اس قسم کی تمام ہنگامی صورتِ احوال پر غور کرتے ہوئے نیند کی وادیوں میں اتر گیا۔

42۔ تربیت کے لیے گیریژن منتقلی

اگلی صبح ہم تینوں کو پالم کے بین الاقوامی ہوائی اڈے کے نزدیک گیریژن علاقے کے اندر ایک تربیتی انسٹی ٹیوشن میں منتقل کر دیا گیا، جہاں ہمیں ایک شخص میجر سوراج سنگھ سے متعارف کروایا گیا۔ مضبوط جسم کا مالک میجر سوراج سنگھ ایک تجربہ کار کمانڈو آفیسر اور بغاوت اور دافع بغاوت کارروائیوں کا ماہر تھا۔ بریگیڈیئر نارائن بھی یہی کچھ تھا۔ یہ دونوں ہمارے اہم انسٹرکٹر مقرر ہوئے تھے۔ ہمارے لیے دو ہفتے کا ایک ہنگامی پروگرام تشکیل دیا گیا۔ کورس کے موضوعات بغاوت اور بغاوت کو کچلنا، عوامی جنگ، گوریلا جنگی کارروائیاں، شہروں کے اندر جنگی کارروائیاں، جنگل میں جنگی کارروائیاں، چھوٹے ہتھیاروں کا استعمال، دھماکہ خیز مواد کا استعمال اور بغیر ہتھیار کے مڈھ بھیڑ کے طریقہ کار تھے۔ ہم ان تمام چیزوں میں پہلے ہی تربیت یافتہ تھے لیکن

اپنے علم اور تجربے کو نکھارنے کے لیے ہم نے اس موقع کو بھرپور انداز میں خوش آمدید کہا۔

فوجی تربیت کے ساتھ ساتھ ہمیں آئندہ وجود میں آنے والے بنگلہ دیش کی تحریک آزادی پر ہدایات اور سیاسی تحریک بھی دی جاتی تھی۔ مسلح افواج، ایسٹ بنگال رجمنٹوں، پولیس، ای پی آر، مجاہد فورس اور دوسری قانون نافذ کرنے والی ایجنسیوں کے بنگالی ممبران نے 25 مارچ 1971ء کی رات اچانک شروع کی جانے والی فوجی کارروائی کے خلاف خود بخود اپنے طور پر ہر جگہ بغاوت کر دی تھی۔ شہروں کے باسیوں اور کسانوں یعنی عوام الناس کی ایک کثیر تعداد نے اپنی سیاسی وابستگیوں اور گروہی وفاداریوں سے قطع نظر اس بغاوت میں عملی حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ ہندوستان کی حکومت تمام پیش رفتوں پر گہری نگاہ رکھے ہوئے تھی۔ سینکڑوں اور ہزاروں پناہ گزین مشرقی پاکستان کی سرحد عبور کر کے ہندوستان میں داخل ہو چکے تھے اور اس طرح ہندوستان کی حکومت زیادہ تر انسانی بنیادوں پر اس تحریک میں ملوث ہوگئی تھی۔

اپنے طور پر خود بخود جنم لینے والی اس عوامی مسلح مزاحمت کی تحریک کو حتمی کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لیے ایک سیاسی قیادت کی ضرورت تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ قیادت صرف عوامی لیگ ہی مہیا کر سکتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ایک جلاوطن عبوری حکومت کا قیام عمل میں لایا گیا۔ ہندوستان کو عوامی لیگ اور نئی تشکیل دی گئی عبوری حکومت پر مکمل اعتماد تھا۔ ہندوستان عوامی لیگ کے رہنماؤں کو قابل اعتبار بھی خیال کرتا تھا۔ اس لیے ابتدا سے ہی آزادی کی جدوجہد کو عوامی لیگ کی قیادت میں منظم کرنے کی کوششیں کی جارہی تھیں۔ ہندوستان کی حکومت عوامی لیگ اور اس کی جلاوطن عبوری حکومت کے علاوہ کسی بھی نظریے کے حامل کسی دوسرے شخص، گروہ یا سیاسی تنظیم کی حمایت نہیں کر رہی تھی۔

ہندوستان کے خیال کے مطابق عوامی لیگ کی تن تنہا قیادت کو دو اہم رجعت پسند قوتوں کی جانب سے چیلنج کا سامنا ہو سکتا تھا۔

اوّل، سابقہ پاکستانی فوج کے بغاوت کرنے والے بنگالی ممبران تھے کیوں کہ انہیں اقتدار کا چسکا پڑا ہوا تھا، کیوں کہ تقریباً ابتدا ہی سے پاکستان فوجی حکومت کے تحت رہا تھا۔ بدقسمتی سے انہی لوگوں نے مزاحمت کی تحریک شروع کی تھی اور مکتی باہنی انہی عناصر کے اردگرد پروان چڑھی تھی۔ لہٰذا یہ خطرہ موجود تھا کہ یہ قوتیں وقت گزرنے کے ساتھ عوامی لیگ کی قیادت کو بھی چیلنج کر سکتی ہیں۔ جنرل اروڑا نے بعد میں اپنے ایک انٹرویو میں بھی اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا، ''شیخ مجیب اور ان کی پارٹی نے کبھی بھی فوجی آفیسرز پر اعتماد نہیں کیا تھا۔ (جنرل اروڑا کا بیان جو انہوں نے مسٹر نکھل چکرورتی کے ساتھ ایک انٹرویو میں دیا)۔ جنرل اروڑا نے مزید کہا کہ مسلح افواج کے بنگالی ممبران اور آفیسروں پر نہ صرف مجیب اور ان کی پارٹی شکوک وشبہات رکھتی تھی بلکہ ہندوستان کے حکام بھی اعتبار نہیں کرتے تھے۔

دوئم، عوامی لیگ کی قیادت نکسل بادیوں جیسی انتہائی بائیں بازو کی قوتوں سے بھی چیلنج کا سامنا کرنے کی امید رکھتی تھی۔ نکسل بادی پہلے ہی مکتی باہنی کی صفوں میں نفوذ حاصل کر چکے تھے۔ مغربی بنگال،

اُڑیسہ، بہار، آسام، تری پورہ، منی پور، میزورام جیسی ملحقہ ریاستوں میں نکسل وادی تحریک پروان چڑھ رہی تھی۔ یہ متحرک انتہا پسند قوتیں، بنگلہ دیش کے اندر موجود انتہا پسند قوتوں کے ساتھ گٹھ جوڑ کر کے عوامی لیگ کی قیادت اور خود ہندوستان کے لیے بھی حقیقی چیلنج بن سکتی تھیں۔ اس طرح کی متحد سیاسی قوتیں بھی اپنے سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے اور سیاسی قیادت پر قبضہ کرنے کے لیے سابقہ پاکستانی فوج کے باغی ارکان سے گٹھ جوڑ کر سکتی تھیں۔ لہٰذا پیشتر اس کے کہ یہ قوتیں جنگ کے دوران اور آزادی کے بعد کے بنگلہ دیش میں عوامی لیگ کے لیے مشکلات پیدا کریں، انہیں جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی ضرورت تھی۔ یہ ہندوستانی حکومت کی ایک سوچی سمجھی تجویز تھی اور اسے وقت ضائع کیے بغیر ابتدا ہی سے اپنا لیا گیا تھا۔

عبوری حکومت کے محترم وزیر اعظم اس معاملے میں ہندوستانی نقطہ نظر کے ساتھ پوری طرح متفق تھے۔ دونوں جانب سے ایک مشترکہ حکمت عملی تیار اور منظور کر لی گئی تھی۔ منصوبے کے مطابق ایک سپیشل سیاسی فوج قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا، خصوصی طور پر عوامی لیگ کے منتخب عہدیداروں اور کارکنوں پر مشتمل ہوگی۔ یہ فوج سینکڑوں ہزار افراد پر مشتمل ہونا تھی، اس کی تربیت ہندوستانی فوج کی مدد سے مخصوص تربیتی کیمپوں میں کی جانی تھی۔ اس فوج کی بھرتی، تربیت، اور اس کے ممبران کو مسلح کرنا اور ان کی صف بندی مکتی باہنی کے دائرہ اختیار سے مکمل باہر ہوگی۔ یہ مسلح فوج براہِ راست وزیر اعظم تاج الدین احمد کی کمانڈ میں ہوگی اور اس کی نقل و حمل اور اسلحہ کی فراہمی مکمل طور پر ہندوستانی حکومت کی ذمہ داری ہوگی۔ اس فوج کا سربراہ اور چیف کو آرڈینیٹر جنرل اوبان سنگھ ہوگا، جس کا اہم فریضہ آزادی کے بعد کے دَور میں عوامی لیگ کی حکومت کو مسلح حمایت مہیا کرنا ہوگا۔ تربیت دینے کے بعد یہ فوج جنگ کے آخری مرحلے میں گروپس کی شکل میں بنگلہ دیش کے اندر مختلف مقامات پر متعین کی جائے گی۔

اس فوج کے ممبران ملک کے اندر حربی نوعیت کے اہم مفادات پر قابض ہوں گے اور یہ عوامی لیگ کی حکومت کو درپیش کسی بھی چیلنج سے نمٹنے کے لیے تیار رہیں گے۔ اس فوج کا نام بنگلہ دیش لبریشن فورس (بی ایل ایف) رکھا گیا تھا۔ اس فوج کو مجیب باہنی اور ایک مزید نفرت انگیز نام جاتیو راکھی باہنی (جی آر بی) بھی دیا گیا تھا۔

عبوری حکومت نے فیصلہ کیا تھا کہ ہم تینوں ہندوستانی فوج اور جنرل اوبان سنگھ کے ساتھ مل کر بی ایل ایف کو قائم کرنے اور منظم کرنے کے لیے کام کریں گے۔ ہمیں غیر سیاسی خیال کرتے ہوئے اور شیخ مجیب پر ہمارے اندھے اعتماد اور احترام اور ہمارے جذبہ حب الوطنی کو پیش نظر رکھتے ہوئے حکام نے یہ فیصلہ کیا ہو گا۔ دونوں حکومتوں کے متعلقہ حکام ہماری وفاداری، پس منظر، پیشہ ورانہ صلاحیت، اندھی جرأت اور مقصد سے وابستگی کے ضرور قائل ہوئے ہوں گے۔

تاہم، ہندوستانی حکومت کی جانب سے دی گئی ہدایات کے بعد ہم پر بہت سی چیزیں واضح ہو گئی تھیں۔ تمام وہ سوالات جو ہمیں گزشتہ دو دنوں سے ستا رہے تھے، ان ہدایات کی روشنی میں ان سب کے

جوابات کھل کر ہمارے سامنے آ گئے تھے۔ ان تمام لوگوں کے بارے میں، جو اپنے وطن کی آزادی کے لیے اپنی جانوں تک کی قربانی دیتے ہوئے ہر قسم کے خطرات میں بلا جھجک کود جاتے ہیں، کس قدر غلط آراء یا انداز ے قائم کیے جا رہے تھے۔ محض ایک مخصوص سیاسی پارٹی کو اقتدار میں لانے کی خاطر آزادی کے مجاہدین کے خاتمے کے لیے کس قسم کے خطرناک منصوبے تیار کیے جا رہے تھے۔ ہندوستان کے چانکیہ ایک ایسی سازش کر رہے تھے، جو قومی اتحاد کو پارہ پارہ کرنے اور بنگالی قوم کو برہمنوں کا غلام بنانے کا موجب بن سکتی تھی۔

قوم ٹکڑوں میں بٹنے کو کھڑی تھی۔ اس کے نتیجے میں اس نومولود ملک کی بنیاد ہی کمزور ہو جائے گی۔ آزادی کی ساری روح ہی تحلیل ہو جانے کو تھی، اور خون میں نہایا ہوا بنگلہ دیش آسانی سے ایک منصب دار ریاست میں تبدیل ہو جانے کو تھا۔ آٹھ کروڑ عوام کی تمنائیں اور آرزوئیں قومی بے وفائی اور غداری کی بھینٹ چڑھ جانے کو تھیں۔

ہمارے ضمیر نے بغاوت کر دی۔ ہم اس مذموم منصوبے کا حصہ نہیں بن سکتے تھے۔ نہ صرف یہ بلکہ اس منصوبے کے خلاف ہر قیمت پر مزاحمت کرنے کی ضرورت تھی۔ ہمیں آزادی کے مجاہدین میں اس غدارانہ منصوبے کے خلاف حمایت حاصل کرنے کی ضرورت تھی۔ اور یہ صرف اس وقت ممکن ہو سکتا تھا جب ہم ایک مرتبہ میدانِ جنگ میں پہنچ جاتے۔ جب ہم وہاں پہنچ جائیں گے تو ہم اپنے دوسرے ساتھیوں کو اعتماد میں لیتے ہوئے اس معاملے پر بات چیت کر سکتے تھے اور اس مذموم منصوبے کے خلاف اپنے آپ کو پوشیدہ طور پر منظم کر سکتے تھے۔ ہم نے پختہ ارادہ کر لیا تھا کہ ہم اپنی آزادی اپنے خون اور پسینے سے حاصل کریں گے کسی دوسری طاقت سے بھیک نہیں لیں گے۔ ہمیں اپنے آپ کو ایک طویل عوامی جنگ کے لیے تیار کرنا تھا۔ عوامی جمہوریہ چین، ویت نام، الجیریا اور دنیا کے بہت سے دوسرے ممالک کی عظیم قومی تحریکوں سے سبق سیکھا جا سکتا تھا۔ ہم نے حلف اٹھایا کہ ہم اپنے آپ کو جو بھی ہو کسی قسم کے اختلافِ رائے میں نہیں ڈالیں گے اور ہر بات کو تحمل کے ساتھ برداشت کریں گے۔ سب سے پہلے ہمیں مجیب نگر پہنچنا تھا اور جدوجہد میں شمولیت اختیار کرنے کے بعد کسی فیصلے یا لائحہ عمل کو اختیار کرنے سے پہلے اپنے دوسرے ساتھیوں سے مشورہ کرنا تھا۔ اس قسم کے گمبھیر مسئلے پر بہت زیادہ محتاط اور ٹھنڈے مزاج کے ساتھ سوچنے کی ضرورت تھی۔ ہمارے کورس کی انتہائی مصروفیات کی وجہ سے وقت اڑتے ہوئے گزر گیا اور دو ہفتے یوں ہی گزر گئے۔

43۔ کلکتہ کی جانب سفر اور بھٹکتے ہوئے خیالات

آخر کار ایک دن ہم ہوائی جہاز کے ذریعے دہلی سے مجیب نگر کے لیے روانہ ہو گئے۔ سائے کی طرح ہمارے ساتھ رہنے والا ہمارا ہمہ وقت کا ساتھی بریگیڈیئر نارائن بھی ہمارے ساتھ تھا۔

ہمیں مسٹر شہاب الدین اور مسٹر امجد کی زبانی کلکتہ مشن کے انحراف کے واقعہ کا علم ہو چکا تھا۔

کلکتہ میں پاکستانی مشن میں ڈپٹی ہائی کمشنر ایک بنگالی افسر مسٹر حسین علی کے بعد مسٹر رفیق الاسلام چوہدری سنیئر ترین آفیسر تھے۔ وہ بھی بنگالی تھے۔ وہ وہاں کونسلر سیکشن میں فرسٹ سیکریٹری انچارج کے طور پر تعینات تھے۔ ان کی تقرری وہاں خفیہ طور پر قومی انٹیلی جینس ایجینسی کے ذریعے ہوئی تھی اس لیے وہ بہت اثر ورسوخ کے حامل تھے۔ عملہ کے زیادہ تر ارکان بھی بنگالی تھے۔ مجیب نگر کی عبوری حکومت کی تشکیل کے بعد مسٹر حسین علی، مسٹر رفیق الاسلام چوہدری، تھرڈ سیکریٹری مسٹر انوار الکریم چوہدری نے باقی ماندہ بنگالی عملے کے ساتھ مل کر انحراف کا فیصلہ کر لیا تھا اور نئی تشکیل دی گئی بنگلہ حکومت کی اطاعت کا اعلان کر دیا تھا۔

اگر چہ مسٹر رفیق الاسلام چوہدری کا خاندان ڈھاکہ میں مقیم تھا، پھر بھی انہوں نے اپنے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ مل کر منحرف ہونے کا خطرہ مول لینے میں کسی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ اپنے فیصلے کے مطابق انہوں نے ایک صبح مشن کی عمارت پر بنگلہ دیش کا پرچم لہرا دیا اور مشن کے غیر بنگالی عملے کو وہاں سے نکل جانے کا حکم دیا۔ اس وقت سے 19 سرکس ایونیو بیرون ملک بنگلہ دیش کا پہلا مشن بن گیا تھا۔ میں نے نمی کے والد مسٹر رفیق الاسلام کا ٹیلی فون نمبر حاصل کیا اور دہلی سے ان کے ساتھ بات کی۔ میں نے نہی، نمی اور خالہ ماں کے بارے میں ان سے پوچھا۔ انہوں نے ٹیلی فون پر تفصیلی بات چیت نہیں کی تھی اور صرف اتنا بتایا تھا کہ وہ ڈھاکہ میں نہیں ہیں اور ابھی تک کلکتہ نہیں پہنچے۔ انہوں نے مزید بتایا کہ وہ اپنے اہل خانہ کے موجودہ اتا پتہ سے بے خبر ہیں۔ اس کا مطلب تھا کہ نمی اور گھر کے دوسرے افراد جائز وجوہات کی بنا پر کسی دوسری محفوظ جگہ منتقل ہو چکے تھے۔

اگر چہ مسٹر چوہدری نے مجھے مبارک باد دی لیکن ان کے لہجے میں پریشانی اور تشویش پائی جاتی تھی۔ کلکتہ مشن کے انحراف کی خبر سننے کے بعد ان کے اہل خانہ نے یقیناً اپنا گھر چھوڑ دیا ہوگا۔ ان کے رشتہ دار اور خیر خواہ انہیں لازماً بارڈر پار کلکتہ بھجوانے کی کوشش کریں گے۔ مسٹر رفیق الاسلام کے انحراف کے بعد ڈھاکہ یا بنگلہ دیش میں کوئی بھی دوسری جگہ ان کے لیے نہیں رہ گئی تھی۔ ان کے لیے فرار ہونا بھی بہت خطرناک ثابت ہو سکتا تھا، اس لیے مسٹر چوہدری بہت زیادہ پریشان تھے۔ وہ خاص طور پر نہی کے بارے میں تشویش میں تھے۔ اگر اس نے خالہ ماں اور نمی کی بات نہ مانی اور اپنے دوستوں کے ساتھ آزادی کی جنگ میں شمولیت کا فیصلہ کر لیا تو یہ حقیقتاً تباہ کن ثابت ہو سکتا تھا۔ ان حالات میں خالہ ماں، نہی کے بغیر اکیلی نمی کے ساتھ فرار ہونے کا حوصلہ نہیں کر پائیں گی۔ اس طرح ان کی زندگیاں خطرے میں پڑ سکتی تھیں۔ ان کے لیے پاکستانی حکام کی نظروں سے بچے رہنا ناممکن تھا، اور اگر وہ پکڑی جاتی ہیں تو نتائج بہت خطرناک نکل سکتے تھے۔

مسٹر چوہدری سے بات کرنے کے بعد میں خود بھی بہت زیادہ پریشان ہو گیا تھا۔ میں نے اپنے دل کی گہرائیوں سے دعا کی، ''یا اللہ! ان پر رحم فرما اور کلکتہ پہنچنے میں ان کی مدد فرما۔'' ہمارا ہوائی جہاز ڈم ڈم ہوائی اڈے پر اترا۔ ہمیں ہوائی اڈے سے سیدھا ہوٹل سیالدہ پہنچا دیا گیا، جہاں پہلے سے انتظام کر لیا گیا تھا۔ یہ ہوٹل ریلوے سٹیشن کے بالکل قریب تھا۔

44۔ بریگیڈیئر نارائن کی دہلی واپسی

دوپہر کے کھانے کے بعد انٹیلی جینس ایجنسیوں اور مجیب نگر حکومت کے کچھ لوگ ہمیں ہوٹل سے مجیب نگر لے جانے کے لیے آ گئے۔ انہوں نے بریگیڈیئر نارائن کے ساتھ مختصر سی گفتگو کی اور ہمیں تیار ہونے کو کہا۔ ہم سب تیار ہو گئے۔ وہاں دو کاریں ہمارا انتظار کر رہی تھیں۔

اچانک بریگیڈیئر نارائن نے کہا، ''میں آپ سب کو یہاں سے ہی الوداع کہوں گا۔''

اس نے ہم سب سے ہاتھ ملائے اور گلے سے لگایا اور کہا، ''خدا حافظ، اپنا دھیان رکھیں، میں واپس دہلی جا رہا ہوں۔''

ہمیں بریگیڈیئر کو الوداع کہتے ہوئے کچھ اداسی سی محسوس ہوئی۔ ان تمام دنوں میں وہ ہمارے اتنا نزدیک رہا تھا کہ ہم اسے اپنا ساتھی ہی سمجھنے لگے تھے۔ دہلی میں ہماری آمد سے آج کے روز تک وہ سائے کی طرح ہمارے ساتھ رہا تھا۔ اس نے حقیقتاً ہمارا بڑا خیال رکھا تھا اور اپنی محبت اور خلوص کے ذریعے ہمارے دل جیت لیے تھے۔ اس وقت جدا ہوتے ہوئے ہم سب بہت جذباتی ہو چکے تھے۔

کار میں بیٹھتے ہوئے میں نے کہا، ''سر جب تک ہم زندہ ہیں، آپ کو یاد رکھیں گے۔ اگر ہم زندہ رہے تو دوبارہ ضرور ملاقات ہو گی۔ اگر ایسا نہ ہو سکا تو آپ کی یادیں، آپ کی محبت اور شفقت ہمیشہ ہمارے ساتھ رہیں گی۔''

دونوں کاریں ہوٹل کے گیٹ سے باہر نکل آئیں۔ ہم نے مڑ کر دیکھا، بریگیڈیئر نارائن، ہمارا ہمہ وقت کا ساتھی، ابھی تک وہیں کھڑا ہاتھ ہلا رہا تھا۔

حصہ سوم

1971ء کی جنگ آزادی اور عوامی لیگ کی عبوری جلاوطن حکومت

45۔ کلکتہ او کلکتہ!

وہ شخص جو استقبالیہ پارٹی کی قیادت کر رہا تھا، اس نے اپنی شناخت ظاہر نہیں کی تھی اور نہ ہی ہم نے پوچھا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے خود بخود بولنا شروع کر دیا، ''یہ کلکتہ ہے۔ یہاں سے گزرتے ہوئے آپ کلکتہ کے عظیم شہر کی کچھ جھلکیاں دیکھ سکیں گے۔''

کلکتہ، او کلکتہ! آبادی کے حوالے سے دنیا کا سب سے بڑا شہر کلکتہ بہت سے لوگوں کے لیے خوابوں کی دنیا کی حیثیت رکھتا ہے۔ جب میں بچہ تھا تو سکول میں مجھے پتا چلا تھا کہ کلکتہ دنیا کے سات عجائب میں سے ایک ہے۔ ہم بڑے شوق اور دلچسپی سے کار کی کھڑکیوں سے دیکھ رہے تھے۔ لوگوں کا ایک سمندر ہر سمت رواں دواں تھا۔ ایک ہی سڑک پر پیدل چلنے والے الیکٹرک ٹرام، رکشے جنہیں آدمی کھینچ رہے تھے، تانگے، ٹھیلے والے، گدھا گاڑیاں اور بیل گاڑیاں، کاریں، ٹرک اور بسیں ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو رہے تھے۔ غیر منظم انداز میں لوگ اور ہر قسم کی گاڑیاں ٹریفک قوانین سے بے پروا ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتی نظر آ رہی تھی، اور اس کے ساتھ ہر قسم کے ہارنوں، سیٹیوں اور آوازوں کے شور شرابے میں کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھیں۔ ہماری کاریں ایک دوسرے میں پھنسی ہوئی بے ترتیب گاڑیوں کے جال میں سے مسلسل ہارن بجاتی ہوئی آہستہ آہستہ رینگ رہی تھیں۔ وقفے وقفے سے ڈرائیور، رکشا کھینچنے والوں، آس پاس کی گاڑیوں کے ڈرائیوروں اور پیدل چلنے والوں پر ان کی اصولوں سے بے پروا حرکات پر چیخ اور چلا رہا تھا۔ انسانوں کے اس رینگتے ہوئے سمندر کے علاوہ ایک اور چیز جس نے میری توجہ حاصل کی، وہ یہ تھی کہ سڑک کے دونوں اطراف موجود دکانوں اور دفاتر کی عمارتوں پر ان کے نام، حتیٰ کہ اشتہاری سائن بورڈ بھی ہندی اور انگلش میں لکھے ہوئے تھے۔ ہم سب دوپہر کی گرمی اور حبس کی وجہ سے پسینے میں نہائے ہوئے تھے۔ اگرچہ ہم نے کھڑکیوں کے شیشے نیچے کیے ہوئے تھے لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑ رہا تھا۔ مختصراً ہمیں کہیں بھی اس نام نہاد خوابوں کے شہر کی شان و شوکت یا چمک دمک نظر نہیں آ رہی تھی۔ دہلی کے مقابلے میں

یہاں غربت اور ناداری کی علامات زیادہ واضح تھیں۔ سڑک کے کنارے کھڑی اکثر پرانی عمارتوں کی کوئی دیکھ بھال نہیں ہو رہی تھی۔ نئی تعمیر شدہ بلند و بالا عمارتوں کی حالت بھی مناسب دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے کچھ اچھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ سڑکیں ٹوٹی پھوٹی اور گڑھوں سے بھری ہوئی تھیں۔ جلد ہی ہم شہر کے عین درمیان میں واقع مشہور چوک چورنگی سے گزر رہے تھے۔ یہ سب سے زیادہ پر ہجوم چوک تھا، جس کے ارد گرد ہم دفاتر، دکانوں اور ریستورانوں پر مشتمل کنکریٹ کا بلند و بالا جنگل دیکھ سکتے تھے۔

اس کے فوراً بعد ہم ایک کھلے میدان، جسے گھارر ماٹ (میدان) کہا جاتا ہے، کے قریب سے گزرے۔ اسے شہر کا دل خیال کیا جاتا ہے۔ مغربی سمت میں مقدس دریا گنگا جنوب کی جانب بہتا ہوا نظر آ رہا تھا اور اس کے کنارے پر انگریز دور کا تعمیر کردہ فورٹ ولیم پُرشکوہ انداز میں کھڑا تھا۔ اس کے دوسرے کنارے پر ''وکٹوریہ میموریئل'' پھیلا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ نزدیک ہی مشہور پارک سٹریٹ نظر آ رہی تھی۔ ساتھ ایک کافی بڑا پارک تھا جس میں موسمی پھولوں کی کیاریوں کے ساتھ اونچے اونچے درخت بکھرے ہوئے کھڑے تھے۔ یہاں بیٹھنے کے لیے بینچ بھی موجود تھے، جو زیادہ تر ان اونچے اور سایہ دار درختوں کے نیچے رکھے ہوئے تھے۔ حیران کن طور پر دوپہر کے وقت شدید دھوپ اور گرمی میں بھی ہم نے ان بنچوں پر بے شمار مردوں اور خواتین کو بیٹھے ہوئے دیکھا۔

''گھارر ماٹ، سیاحوں، دفتروں میں کام کرنے والوں، بے روزگار افراد، طلبا اور گھومتے پھرتے لوگوں سب کے لیے پُرکشش جگہ ہے۔'' اس آدمی نے بتایا۔

گھارر ماٹ کو پیچھے چھوڑتے ہوئے ہماری کاریں چلتی رہیں اور آخر کار پارک سرکس سے ہوتی ہوئی 58 بالی گنج کے سامنے جا پہنچیں۔

46۔ 58 بالی گنج

یہ چاروں طرف سے بلند دیواروں سے گھرا ہوا ایک جدید دو منزلہ بنگلہ تھا۔ عمارت کے سامنے چھوٹی سی کھلی جگہ تھی۔ اس کھلی جگہ کے درمیان بنگلہ دیش کا قومی پرچم اپنے گہرے سبز رنگ، جس کے درمیان ایک سرخ ابھرتا ہوا سورج اور سورج کے اوپر پیلے رنگ کا بنگلہ دیش کا نقشہ تھا، ایک پول پر لہرا رہا تھا۔ گیٹ پر ایک چھوٹا سا ہجوم نظر آ رہا تھا۔ جیسے ہی جانی پہچانی کاریں نزدیک آئیں، سنتری نے گیٹ کھول دیا اور ہم اندر داخل ہو گئے۔ ہمارے ساتھ جو آدمی تھا اس نے بتایا، ''ہم مجیب نگر کی عبوری حکومت کے ہیڈ کوارٹرز پہنچ گئے ہیں۔''

وہاں چند خیمے لگے ہوئے تھے اور گیٹ پر بی ایس ایف کے مسلح گارڈ کھڑے تھے۔ سکیورٹی کے لیے چاروں کونوں پر سنتریوں کے کھڑے ہونے کے لیے جگہیں بنی ہوئی تھیں اور چند مورچے بھی کھودے گئے تھے۔ ساری عمارت لوگوں سے بھری ہوئی تھی۔

جنگ، بنگلہ دیش کے اندر لڑی جا رہی تھی اور حکومت نے اپنا ہیڈ کوارٹر بالی گنج کلکتہ میں قائم کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ ہمیں یہ سارا معاملہ قدرے ناموافق اور عقل سے بعید نظر آیا۔

میں نے اس آدمی سے پوچھا، ''کرنل عثمانی کہاں ہیں؟''

''وہ یہاں وزیر اعظم تاج الدین کے ساتھ رہتے ہیں۔'' اس آدمی نے جواب دیا۔ وہ ہمیں دوسری منزل پر واقع ایک کمرے میں لے گیا اور ہمیں وہاں بیٹھنے کو کہا۔ پھر وہ جلد واپس آنے کا کہہ کر وہاں سے چلا گیا۔ جلد ہی وہ واپس آیا اور ہمیں ایک دوسرے کمرے میں لے گیا۔ وہاں کرنل عثمانی موجود تھے۔ جیسے ہی ہم اندر داخل ہوئے، وہ آگے بڑھے اور ہمیں خوش آمدید کہا۔ کمرے کے ایک طرف ایک بیڈ اور کپڑوں کے لیے ایک شیلف تھا۔ وہیں ایک میز، چند کرسیاں اور ایک لمبا لکڑی کا بنچ بھی پڑا ہوا تھا۔ اس کمرے میں، جو سادا سا دکھائی دے رہا تھا اور کچھ بھی نہیں تھا۔

''اچھا تو لڑکو! یہ میرا چھوٹا سا دفتر اور رہائش ہے۔'' انہوں نے اپنے معمول کے مزاحیہ انداز میں خالی کرسیوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا، ''تشریف رکھیں۔'' ہم ان کے سامنے بیٹھ گئے تو انہوں نے پوچھا کہ ہم کب کلکتہ پہنچے تھے، سفر کیسا رہا، دہلی میں قیام کیسا رہا۔ پھر وہ کہنے لگے، ''یہاں سکون کریں اور آرام کریں، ہم رات کو آئندہ کے لائحہ عمل پر بات کریں گے۔ کابینہ کا ایک اہم اجلاس طلب کیا گیا ہے اور میں تھوڑی ہی دیر میں وہاں جا رہا ہوں۔ اب اس وقت کوئی بات نہیں ہو سکتی۔ لیکن بہتر ہوگا کہ اجلاس شروع ہونے سے پہلے وزیر اعظم سے سلام دعا کر لی جائے۔ میرے ساتھ آؤ۔''

ان کے کہنے پر ہم سب ان کے پیچھے چلتے ہوئے ساتھ والے کمرے میں چلے گئے۔ کرنل عثمانی نے ایک بریف کیس اور چند فائلیں اٹھائیں اور ہمیں اپنا سامان یہیں چھوڑنے کا مشورہ دیا۔ جس کمرے میں ہم داخل ہوئے تھے، وہ بھی اسی طرح وزیر اعظم کا دفتر اور رہائش گاہ تھی۔ یہ کمرا بھی کرنل عثمانی کے کمرے جیسا ہی تھا۔ تاج الدین احمد بیڈ پر لیٹے ہوئے تھے اور کچھ کاغذات دیکھ رہے تھے۔ وہ سادا پتلون اور ٹی شرٹ پہنے ہوئے تھے۔ جیسے ہی ہم کرنل عثمانی کے ساتھ اندر داخل ہوئے، وہ مسکرائے اور ہم سب سے ہاتھ ملائے۔ ایک دوسرے کا حال چال پوچھنے کے بعد کرنل عثمانی نے کہا کہ ہماری مستقبل کی ذمہ داریوں کے بارے میں وہ ہم سے رات کو بات کریں گے۔ تقریباً بیس منٹ کے بعد ہم کمرے سے باہر آ گئے۔ بعد میں وہ دونوں کابینہ کے اجلاس کے لیے روانہ ہو گئے اور ہم واپس کرنل عثمانی کے کمرے میں آ گئے۔ جانے سے پہلے کرنل عثمانی نے ہمیں بتایا تھا کہ ان کی واپسی پر ہم رات کا کھانا اکٹھے کھائیں گے۔

47۔ غیر متوقع طور پر نہی سے ٹیلیفون پر ملاقات

ان کے چلے جانے کے بعد ہمارے پاس کرنے کو کچھ نہیں تھا۔ ان کے کمرے میں دو ٹیلی فون پڑے تھے۔ دونوں ڈائریکٹ لائن پر تھے۔ مسٹر آر آئی چوہدری کے ساتھ میری دہلی سے صرف ایک مرتبہ بات

ہوئی تھی، اس کے بعد میں ان سے رابطہ نہیں کر سکا تھا۔ لہٰذا میں نے سوچا کہ انہیں اپنے یہاں پہنچنے کے بارے میں بتادوں اور خالہ ماں، نمی اور نبی کے بارے میں بھی پوچھ لوں۔ میں نے ان کی رہائش گاہ پر فون کیا۔

''ہیلو!'' دوسری سمت سے مجھے نبی کی آواز سنائی دی۔ بالکل ایہ نبی ہی تھا۔

''میں دالیم ہوں، تم کب کلکتہ پہنچے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''دالیم، تم کہاں سے آ ٹپکے؟ تم کہاں سے بول رہے ہو؟ لعنت ہو تم پر۔'' نبی بہت زیادہ پر جوش اور جذباتی ہو رہا تھا۔ شاید اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ وفورِ جذبات سے ہم دونوں قہقہے مارنے لگے۔

''تمہارے خیال میں کہاں ہو سکتا ہوں؟ میں 58 بالی گنج سے بول رہا ہوں۔ کیا تم سب ٹھیک ٹھاک ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''ہم بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں ماں، نمی اور میں بڑی مشکل سے فرار ہو کر یہاں پہنچے ہیں۔ ہم کیسے فرار ہوئے، یہ ایک لمبی داستان ہے۔ ڈھاکہ سے روانہ ہونے سے پہلے میں تمہارے گھر بھی گیا تھا۔ سب ٹھیک ٹھاک تھے۔ چاچا (میرے ابو) تمہارے بارے میں بہت زیادہ فکر مند ہیں۔ انہیں بڑے عرصے سے تمہارے بارے میں کوئی خبر یا تمہارا کوئی خط نہیں ملا جس کی وجہ سے وہ پریشان ہیں۔ شپن ایک گوریلے کے طور پر جنگ میں شامل ہو چکا ہے۔ بڈی، رومی، قاضی، جیوئل، میوا، فتح علی، الفت، بادل، چولو، عالم بھی شامل ہو چکے ہیں۔ اس وقت وہ سب میلا گڑھ میں زیر تربیت ہیں۔ اپنا کورس ختم کرنے کے بعد وہ ڈھاکہ چلے جائیں گے۔ تم اسی وقت ہمارے گھر کیوں نہیں آ جاتے؟ نمبر 3 سہروردی ایونیو، پارک سرکس، یہ میدان کے جنوبی جانب ہے۔ ایک سرخ رنگ کی دومنزلہ عمارت۔ یہ شہید سہروردی کی رہائش گاہ ہوا کرتی تھی۔ ہر ٹیکسی ڈرائیور اس گھر کو جانتا ہے۔ اس کو تلاش کرنا بالکل مشکل نہیں ہے، اگر اب بھی تم سمجھتے ہو کہ تم یہاں نہیں پہنچ سکو گے تو میں تمہیں لینے کے لیے وہاں آ جاتا ہوں۔'' نبی نے کہا۔

''نہیں اس کی ضرورت نہیں، میں پہنچ سکتا ہوں۔ شام کو کرنل عثمانی کے ساتھ ملاقات ہے جہاں مستقبل کے بارے میں فیصلہ ہوگا۔ اس وقت میں بالکل فارغ ہوں۔ میں اسی وقت آ رہا ہوں کیوں کہ مستقبل کے بارے میں کچھ علم نہیں کہ کیا ہوگا؟'' میں نے کہا۔

''اگر ایسی بات ہے تو پھر وقت ضائع کیے بغیر یہاں آ جاؤ۔'' نبی نے جواب دیا۔

میں نے فون نیچے رکھا اور موتی اور نور سے پوچھا کہ کیا وہ بھی میرے ساتھ جانا پسند کریں گے۔ وہ بھی فارغ ہی تھے، اس لیے دونوں نے میری پیشکش کو بہت خوشی سے قبول کر لیا۔

میں نے کرنل عثمانی کے خدمت گار کو کہا کہ ہم کسی کام کے لیے باہر جا رہے ہیں اور کرنل عثمانی کی واپسی کے بارے میں جاننے کے لیے اسے فون کر لیں گے۔

اس نے بتایا کہ کابینہ کا اجلاس عام طور پر کافی دیر تک جاری رہتا ہے اور آج کا اجلاس بھی آدھی

رات سے پہلے ختم نہیں ہوگا۔

ہم نے ایک ٹیکسی لی اور ڈرائیور سے نمبر 3 سہروردی ایونیو جانے کو کہا۔ وہ فوراً ہی روانہ ہوگیا۔ ہمیں یقین ہوگیا کہ وہ جگہ کو جانتا ہے۔ بیس منٹ کے بعد ٹیکسی ایک بڑی سی سرخ رنگ کی دومنزلہ عمارت کے سامنے جا کر رک گئی۔ ڈرائیور نے کہا یہ نمبر 3 سہروردی ایونیو ہے۔ جیسے ہی ہم گیٹ کی جانب بڑھے ہم نے مسلح پولیس کو عمارت کی حفاظت پر مامور پایا۔

ایک حوالدار نے ہماری شناخت کے بارے میں جاننا چاہا۔ ہم نے کہا کہ ہم بنگلہ دیشی ہیں اور نپی کے دوست ہیں۔ اس نے ہمیں انتظار کرنے کو کہا اور اندر چلا گیا۔ چند منٹ بعد نپی دوڑتا ہوا آیا اور بڑے جذباتی انداز سے میرے گلے لگ گیا۔ ہم دونوں اس قدر جذباتی ہو رہے تھے کہ تھوڑی دیر کے لیے ہم بات بھی نہ کر سکے۔ ہم دونوں کے آنسو نکل آئے تھے۔ یہ ہمارے خواب وخیال میں بھی نہیں تھا کہ ہماری اس طرح سے کلکتہ میں ملاقات ہو سکے گی۔ ہم دونوں نے اپنے آپ پر قابو پایا۔

''نپی یہ لیفٹیننٹ نور ہیں اور یہ لیفٹیننٹ موتی ہیں۔ ہم کوئٹہ سے اکٹھے فرار ہوئے تھے اور چند دن دہلی میں رہنے کے بعد ابھی ابھی کلکتہ پہنچے ہیں۔ اس وقت ہم بنگلہ دیش حکومت کے ہیڈکوارٹر 58 بالی گنج میں رہ رہے ہیں۔'' نپی، نور اور موتی دونوں سے گلے ملا اور ہمیں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر والی منزل پر لے گیا۔ اس نے ہمیں برآمدے میں پڑے ہوئے ایک صوفے پر بٹھایا اور یہ خبر سنانے کے لیے تیزی سے اندر چلا گیا۔

48۔ 3 سہروردی ایونیو وی آئی پیز کی رہائش گاہ تھی

ہماری آمد کی خبر سنتے ہی مسٹر آر آئی چوہدری، خالہ جان، اور مانو (نپی کی سب سے چھوٹی بہن) ہمیں ملنے کے لیے باہر آ گئے۔ ہم ان کی تعظیم میں کھڑے ہو گئے اور چاچا اور خالہ جان کو سلام عرض کیا۔ وہ سب ہم کو دیکھ کر بہت خوش ہو رہے تھے۔ یہ گھر لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ نپی نے بتایا کہ تقریباً 17 خاندان ان کے گھر میں پناہ گزین ہیں۔ یہ سب بنگلہ دیش سے آئے تھے جن میں کچھ بہت اہم لوگ بھی شامل تھے۔ یہ تمام ان کے رشتہ دار اور خاندانی دوست تھے۔ ہمارے آنے کی خبر پورے گھر میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ بہت سے لوگ فرار ہونے والے پاکستانی فوج کے افسروں کو دیکھنے کے لیے باہر آ گئے۔ نپی نے ان سب سے ہمارا تعارف کرایا۔ وہاں ہم مسٹر انور کریم چوہدری تھرڈ سیکریٹری کلکتہ مشن، بیگم ساجدہ چوہدری اور ان کے خاوند مسٹر غلام اکبر چوہدری عوامی لیگ کے اہم رکن اور خاندان کے نزدیکی دوست، ممبر قومی اسمبلی منتقیم چوہدری ان کی بیوی اُنا خالہ، رفیع اختر ڈولی عوامی لیگ کے ایک رہنما، سی ایس پی مسٹر عزیز الدین اور ان کی بیوی، سی ایس پی مسٹر اکبر علی خان نپی کے ماموں، مسٹر کمال صدیقی سی ایس پی، مسٹر خسروز مان سی ایس پی اور ان کی بیوی لوسی خالہ، نپی کے ایک اور رشتہ دار مسٹر مامون الرشید سی ایس پی اور ان کی بیوی راکا، مسٹر بروجن داس، مسٹر عبدالخلیق آئی جی پولیس اور ان کی بیوی سے بھی ملے۔ لیکن حیرت انگیز طور پر وہاں نمی نظر نہیں آ رہی

تھی۔ جب میں اس کے بارے میں بے چین ہونے لگا تو نبی نے میرے کان میں کہا،''وہ گھر پر نہیں ہے۔''

تھوڑی دیر بعد کہیں سے نمی بھی آ گئی۔ وہ مجھے دیکھ کر سکتے میں آ گئی۔ وہ صرف حیران ہی نہیں رہ گئی تھی بلکہ گونگی ہو گئی تھی، شاید وہ اپنی آنکھوں پر یقین نہیں کر پا رہی تھی۔ مجھے اس کی آنکھوں میں آنسو نظر آ رہے تھے۔ شاید یہ خوشی کے آنسو تھے۔

کسی طرح اس نے اپنے آپ پر قابو پایا اور پوچھا،''آپ یہاں کیسے پہنچے؟''

''میں موتی اور نور کے ساتھ کوئٹہ سے فرار ہو کر آیا ہوں، ہم دہلی سے آج ہی کلکتہ پہنچے ہیں۔''

ہر کوئی یہ جاننے کے لیے بے چین تھا کہ پاکستانی فوج کے حاضر سروس آفیسر ہوتے ہوئے اور وہ بھی پاکستان سے ہم کس طرح فرار ہونے میں کامیاب ہو سکے۔ میں اس وقت یہ کہانی سنانے کے موڈ میں نہیں تھا۔ خالہ جان شاید میرا ذہن پڑھ چکی تھیں انہوں میری جان خلاصی کرانے کے لیے کہا،''یہ ابھی ابھی آئے ہیں، انہیں تھوڑا آرام کر لینے دیں۔ کہانی بعد میں بھی سنی جا سکتی ہے۔ آؤ، آؤ اندر آ جاؤ اور آرام کرو۔'' انہوں نے کہا اور ہمیں اندر بیٹھنے والے کمرے میں لے گئیں۔ جیسے ہی وہ ہمیں اندر لے کر آئیں، باقی ماندہ لوگ قدرے مایوسی کے عالم میں اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ اب ہم تنہا رہ گئے تھے، ہم تینوں، چاچا، خالہ جان، نبی، نمی اور مانو۔

تھوڑی دیر بعد چاچا کسی کام کے لیے اٹھ کر چلے گئے۔ خالہ جان بھی کھانے پینے کا انتظام کرنے کے لیے اٹھ گئیں اور اب ہم سب نوجوان آپس میں بیٹھے رہ گئے۔ میں نمی کے چہرے کو دیکھ رہا تھا وہ ابھی تک حیرت میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں کوئٹہ جیسی دُور دراز جگہ سے فرار ہو کر یہاں تک کیسے پہنچ گیا تھا اور اس کے نگاہوں کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔

''آپ نے کوئٹہ جیسے دُور دراز مقام سے فرار ہونے کا یہ خطرہ کس طرح مول لے لیا؟'' اس نے پوچھا۔

''کچھ حاصل کرنے کے لیے خطرہ تو مول لینا ہی پڑتا ہے۔ کیا آپ نہیں سمجھتیں کہ وہاں پڑے پڑے گلنے سڑنے سے فرار ہونا زیادہ بہتر تھا۔ آپ سب نے بھی تو فرار ہونے کا خطرہ لیا ہی تھا۔'' میں نے جواب دیا۔

''آپ ہمیں اپنی کہانی سناؤ۔'' نبی نے درخواست کی۔

''یہ ایک لمبی کہانی ہے، پھر کبھی سناؤں گا۔ آج تم ہمیں 25 مارچ کی فوجی کارروائی کے بعد ڈھاکہ کی صورتِ حال اور اپنے فرار کی داستان سناؤ گے۔'' میں نے نبی سے درخواست کی۔ موتی اور نور نے بھی اصرار کیا۔

''ان خوف ناک اور ہولناک تجربات کے بارے میں آپ نہ ہی پوچھیں تو اچھا ہے۔ آج بھی جب اُن کو یاد کرتا ہوں تو میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔'' نبی نے سگریٹ سلگایا اور واقعات بیان کرنا

شروع کر دیئے۔ ہم سب بڑی خاموشی اور دلچسپی سے اس کی باتیں سن رہے تھے۔ اس دوران خالہ جان نے ہمیں چائے کے ساتھ کچھ ہلکی پھلکی کھانے کی اشیاء بھجوادیں۔ نہی اپنے خیالات میں غرق تھا اور نمی ہمیں چائے پیش کر رہی تھی۔

49۔ خالہ جان نہی اور نمی 25 اور 26 مارچ کی تباہ کن رات کے عینی شاہد تھے

فروری کے آخر میں کسی وقت مسز شریف النہار چوہدری یعنی نہی کی والدہ خالہ جان، کلکتہ سے ڈھاکہ گئیں۔ ان کا مقصد مجموعی صورتِ حال کا جائزہ لینا اور اگر ضروری ہو تو نہی اور نمی کو اپنے ساتھ کلکتہ لانا تھا۔ 25 مارچ کی رات کو ساڑھے دس بجے تک خالہ جان 32 دھان منڈی میں شیخ مجیب الرحمٰن کی رہائش گاہ پر رہی تھیں۔ وہ لال باغ میں اپنے گھر رات تقریباً پونے گیارہ بجے پہنچیں۔ گھر میں موجود تمام افراد ان کے گرد جمع ہو گئے۔ وہ سب جاننا چاہتے تھے کہ ان کے لیڈر (شیخ مجیب) نے کیا کہا تھا؟

خالہ جان نے پریشانی کے عالم میں بتایا کہ بار بار کے اصرار کے باوجود وہ عوامی قیادت اور مزاحمت کی تحریک کو منظم کرنے کے لیے زیر زمین جانے پر تیار نہیں ہوئے۔ پارٹی کے رہنماؤں، کارکنوں، طلبا رہنماؤں اور دیگر افراد نے متوقع فوجی کارروائی سے آگاہ کرتے ہوئے اس نازک وقت پر عوامی قیادت کے لیے زیر زمین روپوش ہو جانے کا مشورہ دیا۔ انہوں نے شیخ مجیب کو یہ بات باور کروانے کی کوشش کی کہ اگر فوج نے عوام کو کچلنے کے لیے کارروائی کا آغاز کیا تو ایسی صورتِ حال میں پوری قوم شیخ مجیب کو اپنی صفوں کے اندر مسلح مزاحمت کی قیادت کرتے ہوئے دیکھنے کی متمنی ہو گی۔ عوام ان سے یہی توقع رکھتے ہیں۔

لیکن شیخ مجیب صرف ایک بات پر اڑے ہوئے تھے۔ وہ بار بار یہی کہہ رہے تھے کہ وہ صرف جمہوری جدوجہد میں یقین رکھتے ہیں اور کسی قسم کی مسلح جدوجہد میں کبھی شریک نہیں ہوں گے کیوں کہ وہ بندوق کی سیاست پر یقین نہیں رکھتے۔ انہوں نے اس بات کو بھی پوری طرح تسلیم نہیں کیا تھا کہ پاکستانی فوج آخرکار معصوم لوگوں پر اپنے وحشیانہ تشدد کا آغاز کر دے گی۔ ان کا خیال تھا کہ فوج کا مسئلہ ان کی اپنی ذات سے ہے نہ کہ عوام سے۔ بہت سے لوگوں نے انہیں دلائل کے ساتھ سمجھانے کی کوشش کی کہ اب مسئلہ فوجی ٹولے اور ان کے درمیان لڑائی سے آگے نکل چکا ہے، اب معاملہ مشرقی پاکستان کے بنگالیوں اور فوجی ٹولے کے درمیان پہنچ چکا ہے اور اس حقیقت کو تسلیم نہ کرنا ایک بہت بڑی غلطی ہو گی۔ اب ہر بنگالی اپنا حق حاصل کرنے کا تہیہ کر چکا ہے اور وہ ہر قربانی دینے کے لیے تیار ہے۔ اس صورتِ حال میں یہ اشد ضروری ہے کہ لوگوں کو ناگزیر صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لے تیار کرنے کی خاطر اعلیٰ قیادت ان کے درمیان موجود ہو۔ اگر ضروری ہوا تو فوجی کارروائی کے خلاف لوگوں کی مسلح مزاحمت کی ضرورت بھی پڑ سکتی ہے اور ایسی صورتِ حال میں قیادت مہیا کرنے کے لیے لیڈر کو تیار رہنا چاہیے۔ صرف اسی صورت میں نقصانات کم سے کم ہو سکتے ہیں۔ تاریخ میں ایسی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ عوام صرف اس صورت میں کامیابی حاصل کر سکتے ہیں اگر

اپنے مقصد سے مخلص اور پرعزم قیادت موجود ہو۔

تاہم شیخ مجیب نے کسی بھی دلیل یا منطق پر کان نہ دھرے۔ آخر کار انہوں نے 27 مارچ کو ملک گیر ہڑتال کا اعلان کیا، یہ ان کے آخری الفاظ تھے۔ اس اعلان کے بعد انہوں نے تمام لوگوں سے چلے جانے کو کہا۔ پروگرام کا اعلان کرتے ہوئے انہوں نے یہ بھی کہا کہ جو کوئی بھی فوجی کارروائی کی توقع کر رہا ہے اور اس سے خوف زدہ ہے، وہ زیر زمین جا سکتا ہے۔ نمبر 32 دھان منڈی میں موجود تمام لوگ ان کی اس سادہ لوحی اور بھولپن پر بہت زیادہ مایوس ہو گئے اور ان کے ہڑتال کے اعلان کے بعد مکمل مایوسی کے عالم میں وہاں سے نکل گئے۔ خالہ جان بھی پریشان سوچوں کے ساتھ واپس آ گئیں۔

جب ہر کوئی ناگزیر فوجی کارروائی کی باتیں کر رہا تھا تو سب سے بڑے لیڈر کے طور پر شیخ مجیب مختلف انداز میں سوچ رہے تھے۔ حقیقت میں شیخ مجیب نے سروں پر منڈلاتی ہوئی فوجی کارروائی سے معصوم عوام کو تحفظ فراہم کرنے کی ذمہ داری لینے سے انکار کر دیا تھا جب کہ لوگوں نے بڑی امیدوں اور اعتماد کے ساتھ انہیں اپنے لیڈر کے طور پر منتخب کیا تھا۔ ان کے کہنے پر لوگ اپنی جانوں اور خون کا نذرانہ پیش کر کے تحریک کو اس مرحلے تک لے آئے تھے۔ پھر کیوں وہ عوام کو اس حد تک آگے لے جانے کے بعد اس آخری مرحلے میں منہ موڑ رہے تھے؟

خالہ جان اپنے ذہن میں اٹھنے والے سوالات کے معقول جواب نہ پا کر بہت زیادہ پریشان اور مایوس تھیں۔ ان کا باشعور ذہن اپنے سب سے اعلیٰ لیڈر میں اس قسم کی سادہ لوحی کو قبول نہیں کر رہا تھا۔ خالہ جان کی بات سن کر گھر میں موجود ہر فرد کو صدمہ ہوا تھا۔ اگر سب سے اعلیٰ لیڈر کا یہ فیصلہ تھا تو پھر کیا کیا جا سکتا تھا! ہر حبس زدہ لمحے کو شمار کرتے ہوئے محض اس وقت کا انتظار کیا جا سکتا تھا جب وقت خود بتا دیتا ہے کہ بدقسمت قوم کے اعلیٰ ترین لیڈر کی سوچ اور فیصلہ کس قدر درست تھا۔ خالہ جان کی ہدایت کے مطابق یہ فیصلہ کیا گیا کہ آنے والی بے یقینی کی صورتِ حال کا سامنا کرنے کے لیے سوائے چھوٹے بچوں کے ہر کوئی جاگتا رہے گا۔ رات کو کھانا کھانے کے بعد نبی اور بہن تازہ ترین صورتِ حال سے آگاہی کے لیے باہر نکل گئے۔ تقریباً ساڑھے گیارہ بجے وہ یہ اطلاع لے کر واپس آئے کہ فوج نے یونیورسٹی کے علاقے اور نئی مارکیٹ میں پہلے سے گشت شروع کر دی تھی۔ فوجی شہر کے دوسرے کئی علاقوں میں بھی پوزیشنیں سنبھال رہے تھے۔

فوج نے ٹی وی سٹیشن اور ریڈیو سٹیشن پر بھی قبضہ کر لیا تھا۔ یہ تقریباً آدھی رات کا وقت تھا، اچانک کچھ شور سنائی دیا۔ نبی نے غور سے شور سنا اور کہا کہ شہر میں ٹینک گھوم رہے ہیں۔ ٹینک کیوں؟ ہر آدمی خوف سے زرد پڑ گیا تھا۔ اچانک سب نے بولنا بند کر دیا۔ صرف دیوار پر لگے کلاک کی ٹک ٹک سنائی دے رہی تھی۔ یہ تقریباً رات کے ساڑھے بارہ کا وقت تھا کہ اچانک توپوں کے گولوں، مارٹر اور مشین گنوں کے فائر کی آواز نے رات کی خاموشی کو توڑ دیا۔ شدید فائرنگ کی آواز سے پورا ڈھاکہ شہر لرز رہا تھا۔ زمین کانپنے لگی اور کھڑکیوں کے شیشے بھی ٹوٹ کر بکھر گئے۔ اچانک آنے والی اس خوف ناک افتاد پر ہر کوئی فرش پر لیٹ گیا۔

بچے چیختے ہوئے جاگ اٹھے۔ نبی اور ہبن نے فوری طور پر تمام روشنیاں بند کر دیں۔

مہلک ہتھیاروں سے لیس بھری ہوئی فوج سوئے ہوئے معصوم عوام پر ٹوٹ پڑی تھی۔ بلا امتیاز فائرنگ کی آواز ہر جانب سنائی دے رہی تھی۔ نبی رینگتا ہوا کھڑکی کے پاس گیا۔ جیسے ہی اس نے باہر جھانک کر دیکھا، پورا آسمان فائر کیے جانے والے آگ کے گولوں سے روشن ہو رہا تھا۔ سینکڑوں اور ہزاروں روشن کرنے والی گولیاں آسمان کو چیرتے ہوئے گزر رہی تھیں۔

عظیم پور، نیو مارکیٹ، فیل خانہ اور یونیورسٹی کے علاقے میں بلند ہوتے ہوئے شعلے نظر آ رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد انہیں مرتے ہوئے لوگوں کی چیخ و پکار، زخمی مردوں، عورتوں اور بچوں کی آہ و بکا سنائی دینے لگی۔ کمرے میں موجود ہر شخص فوج کی اس درندگی اور کھلم کھلا دہشت گردی پر سراسیمہ اور خوف زدہ ہو چکا تھا۔ تمام افراد چپ سادھے ایک دوسرے سے چمٹے فرش پر لیٹے ہوئے تھے۔ قتل و غارت کا یہ کھیل ساری رات بغیر کسی وقفے کے جاری رہا۔

پو پھٹنے کے ساتھ صبح کی ہوا جلے ہوئے بارود کی بو سے بھاری ہو رہی تھی۔ کسی نے ریڈیو آن کر دیا۔ اس پر خصوصی نشریات جاری تھیں اور بار بار اعلان کیا جا رہا تھا کہ آدھی رات سے پورے مشرقی پاکستان میں کرفیو نافذ کر دیا گیا ہے۔ لوگوں کو گھروں سے باہر نہ نکلنے کو کہا جا رہا تھا۔ لوگوں کو خبردار کیا جا رہا تھا کہ وہ کسی قسم کی ملک دشمن سرگرمیوں میں حصہ نہ لیں۔ کرفیو غیر معینہ مدت کے لیے نافذ کیا گیا تھا۔ اس سارے معاملے کے بارے میں کوئی بھی کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ شیخ مجیب مکمل طور پر غلط ثابت ہو چکے تھے۔ خالہ جان نے اپنے لیڈر کے بارے میں سوچا۔ شیخ مجیب کو کیا ہو گیا تھا؟ عوامی لیگ کے دوسرے لیڈر کہاں تھے؟ کرفیو جاری تھا۔ کوئی بھی شخص حکام کی نافرمانی کرتے ہوئے باہر نکلنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ لہٰذا 26 مارچ کا پورا دن لوگوں نے گھروں میں بند رہ کر گزار دیا۔ رات کو جیسے ہی اندھیرا چھانے لگا۔ ایک مرتبہ پھر فائرنگ کا آغاز ہو گیا۔ وہی موت کی چیخ و پکار اور بے یار و مددگار لوگوں کی آہ و بکا۔ فوجی گاڑیوں اور سپاہیوں کے وزنی بوٹوں کی آوازیں گاہے بہ گاہے سنائی دے رہی تھیں۔

گھر کی تمام روشنیاں دوبارہ بند کر دی گئیں اور سب لوگ اندھیرے میں بیٹھے اللہ کے حضور دعائیں مانگ رہے تھے۔ وہ پوری طرح بے یار و مددگار اور ٹوٹ پھوٹ چکے تھے۔ صورتِ حال خوف ناک اور دردناک تھی۔ انہیں سب سے زیادہ خوف اس بات کا تھا کہ کسی بھی وقت فوج زبردستی گھر میں داخل ہو سکتی تھی اور قتل و غارت اور عصمت دری شروع کر سکتی تھی۔ گھر میں موجود خواتین اور لڑکیوں کو قدرے محفوظ اور اوجھل جگہ پر چھپا دیا گیا تھا۔ نبی، ہبن، نونی اور ماؤنے اوپر چھت پر چھپنے کا فیصلہ کیا تھا۔ بزرگوں نے کسی بھی فوجی مداخلت کا سامنا کرنے کے لیے ایک ہی کمرے میں رہنے کا فیصلہ کیا۔ ہر لمحہ طویل ہو رہا تھا اور پریشانی میں بیت رہا تھا۔ آخر کار ایک اور خوف ناک رات کا خاتمہ ہوا اور پو پھٹنے لگی۔ سورج نکلتے ہی ہر کسی میں زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ فوری طور پر ریڈیو آن کیا گیا۔ اس پر ایک اعلان ہو رہا تھا۔ حکومت نے عوام کی سہولت کے لیے چند

گھنٹے کے لیے کرفیو اٹھانے کا فیصلہ کیا تھا۔ نبی گھر کے سامنے سڑک پر نکل آیا۔ پانچ یا چھ بنگالی فوجی وردیوں میں زندگی بچانے کے لیے بھاگے جا رہے تھے۔ ان میں دو شدید زخمی تھے۔ ان کے کپڑے خون میں بھیگے ہوئے تھے۔ جب وہ قریب آئے تو اس نے دیکھا کہ ان کے زخموں سے تازہ خون ابھی رس رہا تھا۔ وہ تھکاوٹ سے چور ہو رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے نبی سے پوچھا، ''بھائی کیا ہمیں پینے کے لیے کچھ پانی مل سکتا ہے؟'' ابھی تک صبح سویرے کا وقت تھا، اس لیے سڑک پر زیادہ لوگ نہیں تھے کیوں کہ وہ ابھی تک اپنے گھروں سے نکلنے سے ہچکچا رہے تھے۔

''کیوں نہیں، آپ ہمارے گھر میں تشریف لائیں۔'' نبی نے ان سے درخواست کی۔

''نہیں بھائی، ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ کسی نہ کسی طرح ہم اپنی جانیں بچا کر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ جب تک ہم بوڑھی گنگا (دریا) کے پار نہیں پہنچ جاتے، ہم محفوظ نہیں ہیں۔ شہر میں پاکستانی فوج ہر جگہ ہم جیسے لوگوں کو تلاش کر رہی ہے۔ ہم ای پی آر سے ہیں۔ اگر انہوں نے ہمیں دیکھ لیا تو آوارہ کتوں کی طرح ہمیں مار ڈالیں گے۔ انہوں نے گزشتہ دو راتوں کے دوران ہمارے ساتھیوں کو بے رحمی سے مار ڈالا ہے۔'' نبی نے انہیں تھوڑی دیر انتظار کرنے کا کہا اور بھاگ کر گھر آیا، پانی کی ایک بالٹی اٹھائی اور ہبن کے ساتھ واپس آ گیا۔

فوجیوں نے پانی پی لیا تو نبی نے پوچھا، ''تمہارے ساتھ یہ سب کیسے ہوا؟''

''بھائی حملہ آور فوج نے ہر چیز ختم کر دی ہے۔ انہوں نے فیل خانہ، پولیس لائن اور چھاؤنی میں 25 مارچ کی رات کو، جب ہر کوئی سویا پڑا تھا، بنگالی یونٹوں پر اچانک حملہ کر دیا۔ پچھلی دو راتوں کے دوران ہم جیسے فوجی ہزاروں کی تعداد میں مارے گئے ہیں۔ تمام بستیاں جلا کر راکھ کر دی گئی ہیں۔ وہ لوگ جو کسی طرح بھاگنے میں کامیاب ہو گئے، انہوں نے اپنی جانیں بچا لیں۔ یونیورسٹی ہال کو بھاری گولہ باری کے ذریعے اڑا دیا گیا ہے۔ بہت سے طالب علم اپنی زندگیاں ہار گئے ہیں۔ اب پورے شہر میں فوج گشت کر رہی ہے۔ وہ مفرور ہونے والے لوگوں کو تلاش کر رہے ہیں اور جس پر بھی شک گزرتا ہے، اسے بلا دریغ مار ڈالتے ہیں۔

آپ جیسے نوجوان بچے بھی ان کا نشانہ ہیں۔ بھائی، آپ لوگوں کو بھی کہیں چھپ جانا چاہیے، اس سے قبل کہ بہت دیر ہو جائے۔ اپنی زندگی بچانے کے لیے بھاگ جاؤ۔ شہر چھوڑ کر دیہاتوں میں نکل جاؤ۔ قوم کو بچانے کے لیے مزاحمت کی تحریک کو منظم کرنا ہوگا اور اس کے لیے آپ جیسے نوجوان لوگوں کی ضرورت ہوگی۔ تمہیں اس وقت کہیں نکل جانا چاہیے۔ اگر ہم زندہ بچ گئے تو انشاء اللہ دوبارہ ملاقات ہوگی۔'' فوجیوں نے اجازت چاہی اور دوبارہ بھاگنا شروع کر دیا۔

نبی اور ہبن مفرور فوجیوں کا رونگٹے کھڑے کر دینے والا یہ بیان سن کر سکتے میں آ گئے۔ کیا پاگل پن ہے، حکومت اس قدر بے رحم اور وحشی کیسے ہو سکتی تھی؟ اس اندھا دھند کارروائی نے پاکستان کی بنیادوں پر کلہاڑی چلا دی تھی۔ اس سارے عمل کے بعد مشرقی پاکستان اب پاکستان کا حصہ نہیں رہ سکتا تھا۔

اس قسم کے شرم ناک ظلم کا جواب اب بنگلہ دیش کی آزادی کے علاوہ کیا ہوسکتا تھا۔ چوں کہ اب عارضی طور پر کرفیو اٹھالیا گیا تھا، اس لیے نمی نے صورتِ حال کا خود اپنی آنکھوں سے جائزہ لینے کے لیے شہر کا چکر لگانے کا پروگرام بنایا۔

جیسے ہی اس نے اپنے ارادے کا اظہار کیا، خالہ جان، نمی اور ببن نے بھی اس کے ساتھ جانے پر اصرار کیا کیوں کہ اس کا اکیلا جانا محفوظ نہیں تھا۔ وہ کار میں باہر نکل آئے۔ آہستہ آہستہ لوگ باہر نکلنا شروع ہو گئے تھے۔ سڑکوں پر بہت زیادہ رش تھا۔ لوگوں اور گاڑیوں کی ایک ندی بہتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ ہر آدمی گھبرایا ہوا نظر آ رہا تھا۔ شاید وہ کسی مزید محفوظ مقام کی تلاش میں تھے۔ کچھ لوگ روزمرہ کی ضروریات خریدنے کے لیے بازار آئے ہوئے تھے۔ ان کے گھر کے قریب واقع کچی بستی مکمل مسمار کر دی گئی تھی۔ لوگ آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں لیے اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ عام طور پر لوگوں سے بھری رہنے والی بستیاں مکمل طور پر ویران ہو گئی تھیں۔ نیو مارکیٹ سے آگے واقع کتابان بستی بھی راکھ کے ڈھیر میں بدل چکی تھی۔ فوج نے پورے فیل خانہ کو گھیرے میں لے رکھا تھا۔ مسلح فوجیوں سے لدے ہوئے فوجی ٹرک ہر سڑک اور ہر گلی میں گشت کر رہے تھے۔ تمام ٹرکوں پر مشین گنیں فٹ تھیں۔ ہر اہم جگہ پر ٹینک کھڑے تھے۔ یونیورسٹی کا علاقہ مکمل ویران پڑا تھا۔ یہ علاقہ غیر معمولی طور پر خاموش تھا۔ اقبال ہال، چترا شنگرام پریشد کی جگہ، جگن ناتھ ہال، اور رقیہ ہال گولہ باری کے نتیجے میں اینٹوں اور کنکریٹ کے ڈھیر میں تبدیل ہو چکے تھے۔

ہالوں کے نزدیک میدانوں میں بلڈوزر لاشوں کو دفن کرنے کے لیے بڑی بڑی قبریں کھود رہے تھے۔ انہوں نے ایک ایسی ہی اجتماعی قبر میں دو انسانی ٹانگیں باہر نکلی ہوئی دیکھیں کیوں کہ لاشوں کو افراتفری کے عالم میں دفن کیا جا رہا تھا۔ یہ ایک خوف ناک نظارہ تھا۔ گشت کرنے والے ٹرکوں پر فوجی عجیب نظروں سے لوگوں کو دیکھ رہے تھے۔

اچانک خالہ جان کو احساس ہوا کہ اس طرح گھومنا محفوظ نہیں۔ فوجیوں نے باشابو، رام پور ٹی وی سٹیشن، کملاپور سٹیشن اور شاہ باغ میں ریڈیو سٹیشن کو گھیرے میں لے رکھا تھا۔ سیاہ یونیفارم میں ملبوس ملیشیا فورسز کو بھی فوج کے ساتھ شامل کیا گیا تھا۔ پچھلی دو راتوں کے دوران ہر جگہ تمام کچی بستیاں مسمار کر کے ہموار کر دی گئی تھیں۔ وہ مالی باغ میں خاندان کی خیریت معلوم کرنے کے لیے ہمارے گھر بھی گئے۔ ابا انہیں دیکھ کر بہت ناراض ہوئے کہ اس طرح گھومنا پھرنا بہت خطرناک ہے اور انہیں فوراً گھر واپس جانے کو کہا۔ انہوں نے خالہ جان کو فوری طور پر گھر چھوڑنے اور دریا کے پار گاؤں جانے کا مشورہ دیا اور کہا کہ وہ بھی یہاں سے نکلنے والے ہیں۔ ڈھاکہ شہر اب بالکل محفوظ نہیں رہا تھا۔

خالہ جان نے ابا کی بات سے پورا پورا اتفاق کیا اور واپس لال باغ آ گئیں۔ صورتِ حال اس سے بہت زیادہ خوف ناک تھی جو بھاگتے ہوئے زخمی سپاہیوں نے بیان کی تھی۔ انہوں نے واپس آ کر فوری طور پر گھر کو چھوڑ دیا اور دریائے گنگا کو پار کر کے اپنے ایک دُور دراز کے رشتہ دار کے گھر ایک گاؤں میں پناہ لے

لی۔ انہیں اگلی تین راتیں وہاں بسر کرنا پڑیں۔ تین روز میں شہر میں صورتِ حال قدرے بہتر ہوگئی۔ فوج نے شہر کو مکمل طور پر اپنے قبضے میں لے لیا تھا۔ اس کے بعد وہ سب لال باغ واپس آ گئے۔ ابا ایک اعلیٰ حکومتی افسر تھے، اس لیے انہوں نے واپسی کا فیصلہ کیا تا کہ حکام کہیں شک وشبے میں مبتلا نہ ہو جائیں۔

حکومت نے ٹی وی اور ریڈیو پر اعلان کیا کہ تمام سرکاری ملازمین فوری طور پر اپنی ملازمتوں پر حاضر ہو جائیں۔ اس لیے ابا اور ہمارے خاندان کو بھی مجبوراً ڈھاکہ واپس آنا پڑا۔ اس دوران قوم چٹا گانگ سے ریڈیو پر میجر ضیاء الرحمٰن کا پر جوش بیان سن چکی تھی۔ ان کی آواز پر ایسٹ بنگال رجمنٹیں، پولیس، انصار اور مجاہد پورے مشرقی پاکستان میں مسلح مزاحمتی جدوجہد کے لیے میدان میں کود پڑے۔ ڈھاکہ، پاکستانی فوج کے کنٹرول میں تھا جب کہ دوسرے علاقوں پر آزادی کے مجاہدین قابض تھے۔ چٹا گانگ، کھلنا، کومیلا، نواکھلی، جیسور، راج شاہی، رنگ پور، دیناج پور اور باقی ماندہ مشرقی پاکستان مجاہدین آزادی کے کنٹرول میں تھے۔ ہر جگہ مقامی انتظامیہ، سیاسی لیڈر، کارکن، طالب علم، اور عوام مسلح افواج سے بغاوت کرنے والے بنگالی فوجیوں کے ساتھ شامل ہو گئے تھے۔

پورا مشرقی پاکستان میدانِ جنگ بن چکا تھا۔ یہ جنگیں مختلف جگہوں پر لڑی جارہی تھیں۔ نئی تشکیل دی گئی مکتی باہنی ہر جگہ بڑی جرأت کے ساتھ فوج سے لڑ رہی تھی۔ بنگالی فوجی اپنے طور پر، جو بھی وسائل انہیں میسر تھے، ان سے آزادی کے مجاہدین کی ٹریننگ کر رہے تھے۔ ہر چیز خود بخود عارضی انتظام کے تحت انجام پا رہی تھی۔ فوج کھوئے ہوئے شہروں اور قصبوں پر دوبارہ کنٹرول حاصل کرنے کے لیے مزید فوجی دستے بھجوا رہی تھی، جس کے نتیجے میں پاک فوج نے اپریل کے پہلے ہفتے میں اکثر شہروں اور قصبوں پر دوبارہ کنٹرول حاصل کر لیا تھا۔ دفاعی حکمت عملی کے تحت مجاہدین نے دیہاتی علاقوں میں پسپا ہونے اور لمبی گوریلا جنگ کے لیے مکتی باہنی کو از سر نو منظم کرنے کا فیصلہ کیا۔ بعض یونٹس سرحد پار کر کے ہندوستان آ گئیں اور یہاں اپنے تنظیم نو کے کیمپ قائم کیے۔ سینکڑوں ہزاروں افراد نے اپنی جانیں بچانے کے لیے سرحد عبور کر کے ہندوستان میں پناہ لے لی۔ پناہ گزینوں میں اکثریت ہندو اقلیت کی تھی۔ ہندوستان کی حکومت نے بنگالیوں کی خاموش حمایت کا اعلان کر دیا۔ ہندوستانی حکومت کا اعلان سننے کے بعد مکتی باہنی کے کمانڈرز اپنے آپ کو دوبارہ منظم کرنے کے لیے عارضی طور پر سرحد عبور کر کے ہندوستان آ جاتے تھے۔ پوری طرح مسلح اور اعلیٰ تربیت یافتہ پاکستانی فوج کا آمنے سامنے مقابلہ کرنا بہت مشکل تھا، لہٰذا گوریلا جنگ لڑنے کا فیصلہ کیا گیا کہ آزادی صرف ایک لمبی قومی جنگ آزادی کے ذریعے ہی حاصل کی جا سکتی تھی۔

50۔ ان کے فرار کی رونگٹے کھڑے کر دینے والی داستان

جب پوری قوم آزادی کی جنگ لڑ رہی تھی، 17 اپریل 1971ء کو عوامی لیگ نے ہندوستان حکومت کے ساتھ مشورے کے بعد اچانک یک وتنہا ایک عبوری حکومت تشکیل دے دی۔ عوام کو اس کے بارے میں

صرف غیر ملکی ریڈیو نشریات اور اخبارات کے ذریعے علم ہوا۔ نپی اور دوسرے افراد کو کلکتہ مشن کے انحراف کا ریڈیو کے ذریعے علم ہوا۔ اس کے والد آر آئی چوہدری بھی دوسرے لوگوں کے ساتھ منحرف ہو گئے تھے۔ حکام اب لازماً ان کے خاندانوں کو تلاش کریں گے۔ اب انہیں فوری طور پر کہیں چھپنا تھا۔ خالہ جان، نپی اور نمی نے لال باغ کو چھوڑ کر اپنی ایک خالہ کے ہاں پناہ لے لی۔ ایک جگہ زیادہ عرصہ رہنا محفوظ خیال نہیں کیا جا رہا تھا، لہٰذا وہ مسلسل ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے رہتے تھے۔ وہ انو ماما کے گھر رہے، شہید ماما کے سسرال کے گھر رہے اور آخر میں پیرو ماما کے گھر چلے گئے۔ یہاں قیام کے دوران میں ایک ناخوشگوار حادثہ پیش آ گیا۔ ایک دن انٹیلی جینس کا ایک آدمی وہاں کسی کام کے لیے آیا۔ پیرو ماما بینک منیجر تھے۔ اس نے مسز چوہدری کو پہچان لیا اور انٹیلی جینس ہیڈ کوارٹر میں اطلاع دے دی۔ دوسرے دن پیرو ماما کے گھر چھاپہ پڑا۔ لیکن اس وقت تک خالہ جان اور دوسرے افراد وہاں سے نکل گئے تھے۔ اس طرح وہ اس مرتبہ بچ نکلے۔ لیکن اس واقعہ سے یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ مسٹر چوہدری کے انحراف کی پاداش میں حکام انہیں قابو کرنا چاہتے تھے۔ اب ان کا بنگلہ دیش میں رہنا خطرناک بن چکا تھا، انہوں نے سرحد عبور کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس دوران شپن، بڈی اور دوسرے لڑکے مکتی باہنی میں شمولیت اختیار کر چکے تھے۔

نپی ان کے ساتھ جانا چاہتا تھا لیکن خالہ جان نے اس کو اجازت نہ دی۔ انہوں نے کہا، ''تم جنگ میں شامل ہونا چاہتے ہو، یہ یقیناً میرے لیے باعث فخر ہوگا۔ لیکن اس سے پہلے ہمیں سرحد پار اپنے باپ کے پاس لے جانا تمہاری ذمہ داری ہے۔ یہ وہ فرض ہے جو تمہیں جنگ میں شامل ہونے سے پہلے ہر صورت میں پورا کرنا ہوگا۔'' ان کی دلیل مضبوط تھی۔ نپی کے علاوہ سرحد عبور کروانے پر کسی بھی دوسرے شخص پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا تھا خاص طور پر جب کہ نمی جوان لڑکی تھی۔ لہٰذا نپی پہلے اس ذمہ داری سے سبکدوش ہونے کی تیاری کرنے لگا۔ فیصلہ کیا گیا کہ وہ پہلے نبی نگر اور پھر اپنے نانا کے گھر رسول آباد جائیں گے اور وہاں سے کسی مناسب موقع پر کومیلا میں کوشابہ سیکٹر سے سرحد عبور کر کے اگرتلہ پہنچ جائیں گے۔ کیسے اور کس جگہ سے سرحد عبور کی جائے گی، اس بات کا فیصلہ رسول آباد پہنچنے کے بعد کیا جانا تھا۔ ایک رات انو ماما، التو نانا، خالہ جان، نپی، شہید ماموں اور نمی ڈھاکہ سے نبی نگر، اور وہاں سے رسول آباد جانے کے لیے روانہ ہو گئے۔ وہ ''نور شنگ دی'' تک کار کے ذریعے گئے اور پھر نبی نگر کے راستے رسول آباد پہنچنے کے لیے ایک لانچ کرایہ پر حاصل کی۔ پاک فوج ابھی رسول آباد تک نہیں پہنچی تھی۔ لیکن پھر بھی ہندو اپنی جائیدادیں اور ساز و سامان فروخت کر کے ہندوستان میں پناہ کے لیے گروہوں کی صورت میں علاقہ چھوڑ رہے تھے۔

خان خاندان علاقے میں جانا پہچانا اور خوش حال گھرانہ تھا۔ نپی کے نانا اور پڑنانا بہت طاقتور اور بارسوخ زمیندار تھے، جن کا پورے علاقے پر کنٹرول تھا۔ اس کے نانا کو انگریزوں نے خطاب سے نوازا تھا۔ آبائی حویلی بہت بڑی اور پرشکوہ تھی۔ حویلی کے سامنے دو بڑے بڑے تالاب تھے۔ رسول آباد کے تروتازہ اور آزاد ماحول میں وہ سب بہت خوش تھے۔ دو یا تین دن آرام کرنے کے بعد انو ماما اور شہید ماموں ڈھاکہ

واپس چلے گئے۔ انہیں واپس جانا تھا کیوں کہ خاندان کے باقی ماندہ افراد ابھی ڈھاکہ میں تھے۔ خالہ ماں اور دیگر افراد کے ڈھاکہ سے بہ حفاظت نکل آنے پر سب نے سکھ کا سانس لیا تھا۔ جلد ہی وہ ڈھاکہ کی اذیت ناک زندگی کو بھول گئے۔ 25 اور 26 مارچ کی خوف ناک راتیں، زندگی کی خاطر پناہ کے لیے گھر گھر بھاگتے پھرنا، 27 مارچ کی صبح کا تلخ تجربہ اب محض تاریخ کا حصہ بن چکے تھے۔

سناتن دا کو خاندان کے قدیم ترین ملازموں میں سے سب سے زیادہ محترم اور قابل اعتبار خیال کیا جاتا تھا۔ وہ اور اس کے آبا واجداد کئی نسلوں سے خان فیملی کی زمینداری کی دیکھ بھال کر رہے تھے۔ سرحد عبور کروانے کے لیے بندوبست کی ذمہ داری اس نے قبول کر لی تھی۔ خاندان کے معاملات کی مجموعی ذمہ داریاں چھوٹو نانی مسز عامر علی خان کے کندھوں پر تھیں، وہ ایک ذہین اور تیز فہم خاتون تھیں جو خاندان میں مرکزی اختیارات رکھتی تھیں۔ ایک روایتی زمیندارنی، مسٹر اختر علی خان کی ماں تھیں جو ایک نوجوان سی ایس پی آفیسر تھے اور جدوجہد میں شریک ہونے کے لیے پہلے ہی بغاوت کر چکے تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی کبیر مکتی باہنی کے مقامی کمانڈر ہونے کی حیثیت سے مددگار تھے، وہ 26 مارچ کی رات کو ہوبی گنج میں ایس ڈی او تھے۔ فوجی کارروائی کے بعد پوری انتظامیہ کے ساتھ بغاوت کرتے ہوئے انہوں نے بھی مزاحمتی تحریک میں شمولیت اختیار کر لی تھی۔

یہ فیصلہ ہوا کہ ایک جرأت مند طالب علم اور نپی کا قریبی دوست مومن گائیڈ کی حیثیت سے نپی اور دوسرے افراد کے ساتھ ہوگا۔ سناتن دا کو باقی تمام معاملات کا بندوبست کرنا تھا۔ مومن اس سے پہلے بھی پناہ گزینوں کے کئی گروپس لے کر سرحد پار اگرتلہ تک پہنچا چکا تھا۔ ذہین اور ذمہ دار مومن پر گائیڈ کے طور پر اعتماد کیا جا سکتا تھا۔ تمام خفیہ راستے اسے ازبر تھے۔ وہ کئی مرتبہ بڑے مؤثر طریقے سے گشتی فوج کی نظروں میں دھول جھونک چکا تھا۔ اسی تجربہ نے اسے اس کام میں بہت زیادہ قابل بھروسا بنا دیا تھا۔ فیصلہ کیا گیا کہ کومیلا براہمن باڑی سیکٹر تک میگھنا، تیتاش اور تند و تیز گومتی دریاؤں میں سے کشتی کے ذریعہ پہنچا جائے۔ وہاں سے وہ کھیتوں اور تیپارہ پہاڑیوں پر سے اپنے پیدل سفر کا آغاز کریں گے۔ انہوں نے کوشیا سے سرحد عبور کرنی تھی اور سرحد کے پار ایک چھوٹے سے دیہاتی بازار میں پہنچنا تھا۔ وہاں سے انہوں نے اگرتلہ کے لیے کوئی پبلک ٹرانسپورٹ لینا تھی۔ اس پارٹی کو لے کر جانے کے لیے ایک بڑی کشتی کا انتظام کیا گیا۔ نانی اور سناتن دا نے ماہر اور سب سے زیادہ با اعتبار ملاح کا انتخاب کیا۔ ایک طوفانی رات کو اندھیرے میں وہ اللہ کا نام لے کر کشتی میں روانہ ہو گئے۔

مومن اور التونانا مفرور ہونے والی پارٹی کے ساتھ تھے۔ یہ ایک انجانی راہوں کا سفر تھا۔ دریا بہت تند اور تیز تھے۔ نپی اور نمی دونوں اچھے تیراک نہیں تھے۔ جیسے ہی طوفان میں شدت آئی دریا بڑی بڑی لہروں کے ساتھ مزید تند اور تیز ہو گئے۔ کشتی بے قابو لہروں پر آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ ملاح اسے محض اپنے تجربے اور ہنر کے زور پر آگے لے کر جا رہے تھے۔ خالہ ماں اور دوسرے افراد خاموشی سے اپنی زندگیوں کے

لیے دعائیں مانگ رہے تھے۔ کشتی ساری رات چلتی رہی اور پو پھٹنے کے ساتھ ایک نامعلوم جگہ پر جا کر رک گئی۔ سب کو اترنے کے لیے کہا گیا۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں سے پیدل سفر کا آغاز ہونا تھا۔ وہ دھان اور پٹ سن کے کھیتوں میں، جو پانی اور کیچڑ سے بھرے ہوئے تھے، سے گزرے اور بعض دفعہ پہاڑیوں اور جنگلوں میں ننگے پاؤں سفر کیا۔ عام دیہاتیوں جیسے لباس پہنے ہوئے وہ دوپہر سے پہلے جی ٹی روڈ پر پہنچ گئے۔ نبی اور مومن باقی افراد کو پٹ سن کے کھیتوں میں چھپا ہوا چھوڑ کر جائزہ لینے کے لیے آگے گئے اور تھوڑی دیر بعد واپس آ گئے۔ سڑک صاف تھی۔ انہیں سڑک پار کر کے کسی فوجی گشت کی آمد سے پہلے گھنے جنگلات والی پہاڑیوں میں داخل ہونا تھا۔ اگر انہیں دیکھ لیا جاتا تو ان سب کو گولیوں سے اڑا دیا جانا تھا، اس لیے سب نے بھاگتے ہوئے سڑک پار کی اور پہاڑیوں پر گھنے جنگل میں داخل ہو گئے۔

جیسے ہی وہ سڑک کے قریب پہنچے اچانک مومن نے چلا کر کہا، ''نیچے لیٹ جاؤ! فوج کی گشتی پارٹی آ رہی ہے۔''

سارے بھاگ کر پٹ سن کے کھیت کے گدلے پانی میں گھس گئے اور وہاں بے حس و حرکت لیٹ گئے۔ سڑک کی دوسری جانب پہاڑیاں اور جنگلات تھے اور چاروں طرف دھان اور پٹ سن کے کھیت تھے۔ انسانی آبادی کا کوئی نشان نظر نہیں آ رہا تھا۔ ہر کسی پر موت کا خوف طاری تھا۔ اگر فوج نے انہیں دیکھ لیا تو کیا ہو گا؟ نمی بے بسی کے عالم میں رو رہی تھی۔ خالہ جان نے خاموشی سے دلاسا دیا۔ ایک فوجی ٹرک پاس سے گزرا۔ وہ فوجیوں کی نظروں سے بچے رہے۔ اللہ تعالیٰ ان پر مہربان تھا۔ انہوں نے سڑک عبور کی اور بھاگ کر پہاڑیوں پر واقع جنگل میں گھس گئے۔ اب وہ قدرے محفوظ تھے۔ خالہ جان نیچے بیٹھ گئیں۔ انہیں کچھ آرام کی ضرورت تھی۔ چند دن پہلے یونیورسٹی کے فرش پر پھسلنے سے ان کی ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ متاثرہ ٹانگ اتنا زیادہ چلنے کی وجہ سے سوج گئی تھی۔ وہ بہت تکلیف دہ درد میں مبتلا تھیں۔ لیکن وہ بہت زیادہ قوتِ ارادی کی مالک خاتون تھیں اور سارا درد خاموشی سے سہہ رہی تھیں۔ نبی اور نمی نے ان کی ٹانگ کا معائنہ کیا اور سمجھ گئے کہ وہ شدید درد میں مبتلا اور بہت بری حالت میں تھیں۔ لیکن ان نازک لمحات میں کچھ بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ انہیں آگے بڑھنا تھا۔

نبی اگرچہ بہت پریشان تھا لیکن محض ان کو حوصلہ دینے کے لیے کہا، ''ماں! اپنی ٹوٹی ہوئی ٹانگ سے ہم سے زیادہ تیز کیسے چل رہی ہیں؟ کیا آپ ٹھیک ہیں؟''

خالہ ماں نے کوئی جواب نہ دیا لیکن اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔ پیدل سفر دوبارہ شروع ہو گیا۔ شام ڈھلے وہ بازار پہنچ گئے، جو پناہ گزینوں سے بھرا ہوا تھا۔ بہت سے ٹرک چاولوں اور کچی پٹ سن سے لدے ہوئے سڑک کے کنارے کھڑے تھے۔

مومن نے کہا، ''آخر کار ہم پہنچ گئے ہیں۔ یہ تمام چاول اور پٹ سن بنگلہ دیش سے ہندوستان سمگل ہو رہی ہے۔''

پورے دن کے پیدل سفر کی وجہ سے وہ سب بہت تھک چکے تھے۔ انہوں نے سڑک کے کنارے ایک چائے خانے سے ہلکی پھلکی غذا کے ساتھ چائے کے کپ پیے۔ پھر تھوڑا آرام کرنے کے بعد وہ ایک جیپ میں بیٹھ گئے جس نے انہیں اگرتلہ پہنچانا تھا۔ وہ تقریباً بارہ مسافر تھے جو دوسری جنگ عظیم کے زمانے کی قدیم نمونے کی چھوٹی سی جیپ کے اندر ایک دوسرے میں ٹھنس کر بیٹھ گئے۔ اس پہاڑی سڑک پر بارہ سے چودہ افراد کے وزن کو اٹھا کر چلنا اس پرانی جیپ کے لیے حقیقتاً بہت مشکل تھا۔ اگرتلہ پہنچنے سے پہلے دو تین جگہ رک کر ڈرائیور کو پرانی جیپ کے انجن کو ٹھنڈا کرنے کے لیے ریڈی ایٹر میں پانی ڈالنا پڑا۔ وہ شہر کے مرکزی حصے میں پہنچ کر جیپ سے اتر گئے۔ نپی کے ماموں مسٹر اکبر علی خان اور چند دوسرے سینئر بیوروکریٹس جو حکومت کے منحرف تھے، شہر کے مرکز سے پانچ چھ میل دُور ایک پرانے محل میں رہ رہے تھے۔ مومن اس جگہ سے واقف تھا۔ انہوں نے ایک لوکل بس لی اور اس جگہ پہنچ گئے اور اکبر علی خان کو ڈھونڈ نکالا۔

خسرو ماموں (اکبر علی خان)، خالہ ماں اور دوسرے افراد کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔

''حنا باجی کیا خوشگوار حیرت ہے۔'' وہ خوشی سے چلا اُٹھے۔

''ہاں! آخر کار ہم فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔'' خالہ ماں نے کہا۔ ''مومن گائیڈ کے طور پر ہمارے ساتھ تھا۔ ڈھاکہ ٹھہرے رہنا ناممکن ہو چکا تھا۔'' خالہ نے مزید کہا۔

''ہم بعد میں باتیں کریں گے، پہلے نہا دھو کر کھانا کھا کر آرام کر لو۔'' خسرو ماموں نے کہا۔

سارے لوگ تھکاوٹ سے چور ہو رہے تھے، ان کے جسموں سے طاقت نچڑ چکی تھی۔ وہ سب تالاب پر گئے اور جلدی جلدی ہاتھ منہ دھوئے۔ اس دوران خسرو ماموں نے چاولوں، آملیٹ اور دال پر مشتمل کھانا تیار کروالیا تھا۔ یہ کسی شاہی دعوت سے بھی بڑھ کر تھا۔ انہوں نے گرم گرم کھانے کو پورے لطف سے کھایا۔ پیٹ بھر کر کھانے کے بعد وہ سب چادروں پر لیٹ گئے جو ان کے آرام کے لیے فرش پر بچھادی گئی تھیں۔ جلد ہی وہ سبھی گہری نیند سو گئے اور خراٹے لینے لگے۔ اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے وہ اپنی منزل پر پہنچ گئے تھے۔ دوسری صبح خسرو ماموں نے ٹیلی فون کے ذریعے کلکتہ میں چاچا کو خبر پہنچادی۔ مسٹر چوہدری کو یہ جان کر بہت اطمینان ہوا کہ نپی اور سب لوگ بہ حفاظت پہنچ گئے تھے۔ انہوں نے خسرو ماموں کو کہا کہ وہ جس قدر جلدی ممکن ہو سکا، انہیں کلکتہ لانے کی کوشش کریں گے۔ اگلے چار سے پانچ دنوں میں انہیں ایک خصوصی پرواز کے ذریعے کلکتہ لے جانے کا بندوبست کر دیا گیا تھا۔

اس مرحلہ پر نپی نے خالہ ماں سے کہا کہ وہ کلکتہ نہیں جائے گا بلکہ میلہ گھر میں اپنے دوستوں کے پاس جائے گا۔ نپی اس سے پہلے اگرتلہ میں میجر خالد مشرف، کیپٹن حیدر اور کیپٹن نورالاسلام شیشو سے مل چکا تھا اور اسے پتا چلا تھا کہ شپن، بڈی اور دوسرے لڑکے میلہ گھر کیمپ میں ابھی تک زیر تربیت تھے۔ لیکن خالہ ماں اس پر قائل نہ ہوئیں۔ ان کا کہنا تھا کہ نپی کو ان کے ساتھ کلکتہ جانا ہوگا۔ کلکتہ جا کر وہ اپنے دوستوں میں شامل ہو سکتا ہے۔ لیکن نپی اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر وہ کلکتہ چلا گیا تو پھر ہو سکتا ہے مسٹر چوہدری اسے جنگ

میں شامل ہونے کی اجازت نہ دیں۔ ان کو اس بات کا قائل کرنا بہت مشکل ہوگا۔ لہٰذا ایک صبح نپی کسی کو بتائے بغیر محل سے بھاگ کر سیدھا میلہ گھر پہنچ گیا۔ خالہ ماں بہت پریشان اور بے چین ہوگئیں۔ خسرو ماموں، توفیق امام سی ایس پی اور تمام دوسرے لوگوں نے خالہ ماں کو سمجھانے کی کوشش کی۔ لیکن وہ اپنی بات پر بضد رہیں کہ نپی کو کلکتہ تک ان کے ساتھ ضرور جانا ہوگا۔ اس لیے کیپٹن شیشو، جو نپی کے خاندان سے تعلق رکھتا تھا، کو بلایا گیا اور ان سے درخواست کی گئی کہ وہ کسی طرح نپی کو میلہ گھر سے واپس لانے کا بندوبست کریں۔ شیشو بھائی نے خالہ ماں کی درخواست پر عمل کیا۔ یہ ان کے لیے ایک مشکل کام تھا اور اس طرح نپی کو آخر کار کلکتہ جانا پڑا۔ چند دن کے بعد خسرو ماموں اور توفیق امام اور ان کا خاندان بھی مجیب نگر حکومت میں شمولیت کے لیے کلکتہ آ گیا۔ کلکتہ پہنچ کر نپی پھنس گیا۔ اسے مسٹر چوہدری نے جنگ میں شامل ہونے کی اجازت نہ دی۔ جیسا کہ اس کو پہلے ہی توقع تھی۔

51۔ کرنل عثمانی کا نقطہ نظر اور منصوبہ

فرار کی یہ مسحور کن داستان سننے کے بعد کافی رات گئے ہم واپس 58 بالی گنج پہنچے۔ کرنل عثمانی ابھی تک واپس نہیں آئے تھے۔ تقریباً 9 بجے کے قریب وہ میٹنگ سے واپس آئے۔ ہم نے رات کا کھانا مل کر کھایا اور اس کے بعد ہم بیٹھ گئے۔ سب سے پہلے کرنل عثمانی نے ہمیں تحریک آزادی، ملک میں جاری جنگ اور اس وقت وہ کس مرحلے میں تھی جیسے تمام معاملات کا خلاصہ پیش کیا۔

انہوں نے کہا: ''آپ کو اس بات کا علم ہونا چاہیے اور یاد ہونا چاہیے کہ 25 مارچ کی رات کی وحشیانہ کارروائی کے بعد ایسٹ بنگال رجمنٹوں، ای پی آر، پولیس، انصار اور مجاہد فورس کے بہادر اور دلیر بنگالی ممبران نے اس کھلم کھلا تشدد اور نسل کشی کے خلاف بغاوت کر دی اور مسلح مزاحمتی جدوجہد میں کود پڑے۔ وہ ریڈیو پر میجر ضیا کی للکار کے جواب میں اسلحہ اٹھا کر میدان میں آ گئے۔ ملک بھر سے نوجوان، طلبا اور زندگی کے ہر میدان سے تعلق رکھنے والے لوگ خود بخود اپنے طور پر باہر نکلے اور لڑنے والے سپاہیوں کے ساتھ شامل ہو گئے۔ اس طرح آزادی کی یہ جنگ شروع ہوئی۔ شروع میں یہ معرکے رسمی انداز میں لڑے گئے۔ ان معرکوں کا مقصد فوج کو چھاؤنیوں میں محدود رکھنا اور مواصلات کو منقطع کرنا تھا۔ پالیسی یہ تھی کہ ان کے راستے میں جس قدر ہو سکے، رکاوٹیں کھڑی کی جائیں۔ باقاعدہ بٹالینز نے بڑی جرأت اور دلیری سے مقابلہ کیا، اگرچہ وہ تعداد میں بہت کم تھیں۔ کئی جگہوں پر ایک رجمنٹ کو پورے بریگیڈ کا مقابلہ کرنا پڑا۔ لیکن اپنے فوجیوں کی محدود تعداد کو مدِنظر رکھتے ہوئے جنگی حکمت عملی کو تبدیل کرنی پڑی ہے۔ دشمن کی طاقت پر قابو پانے کے لیے پلاٹون اور کمپنی کی سطح پر چھوٹے چھوٹے گروپس تشکیل دیئے گئے کیوں کہ دشمن کی تعداد زیادہ تھی اور ساتھ ہی دشمن کے کمزور ترین حصوں کو نشانہ بنایا گیا۔ چٹا گانگ، کومیلا، جیسور، سلہٹ، راج شاہی، دیناج پور، رنگ پور، نوا کھلی اور ملک کے دوسرے حصوں میں اسی طرح سے جنگیں لڑی گئیں۔

لیکن جلد ہی کمانڈروں پر یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ دشمن کے ساتھ روایتی انداز میں زیادہ دیر تک مقابلہ کرنا ممکن نہ ہوگا کیوں کہ ہمارے فوجی صرف پانچ باقاعدہ بٹالینز، کچھ ای پی آر کے فوجیوں، کچھ پولیس، انصار، مجاہدین اور سویلین افراد پر مشتمل تھے جو پوری طرح تربیت یافتہ اور مسلح بھی نہیں تھے۔ کمانڈروں نے سویلینز کو دو ہفتے کی چھوٹے ہتھیاروں پر بنیادی تربیت دے کر اپنی تعداد میں اضافہ کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اس قسم کی افواج کے ساتھ اعلیٰ درجے کی تربیت یافتہ اور مسلح چار سے پانچ ڈویژن فوج کا مقابلہ کرنا ممکن نہ تھا۔ مکتی باہنی کی دفاعی قوت دشمن کے بار بار کے حملوں کے نتیجے میں کمزور سے کمزور ہوتی جا رہی تھی۔ ان حالات میں ایک مضبوط اور طاقتور فوج کو دو بدو کی جنگ میں شکست دے کر آزادی حاصل کرنا ایک نا قابل عمل فعل تھا۔ اس بات نے کمانڈروں کو مجبور کر دیا کہ وہ اس عوامی جنگ کو طول دینے کی منصوبہ بندی کریں۔ انہوں نے ان پانچ باقاعدہ بٹالینوں پر مشتمل ایک گوریلا فوج قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ صرف ایک تربیت یافتہ گونو باہنی (گوریلا فوج) ہی دشمن کی عددی فوقیت کو بے اثر بنا سکتی تھی۔ اس قسم کی گوریلا فوج انتڑیوں کے کینسر کی طرح کام کرے گی۔ وہ دشمن کو اندر سے ختم کر دے گی جن کے سامنے لڑنے یا دفاع کے لیے کوئی واضح محاذ نہیں ہوگا۔ ان کا خیال تھا کہ اس حکمت عملی کو اپنائے بغیر آزادی حاصل کرنا ممکن نہیں ہوگا اور نہ ہی وہ کبھی قابض فوج کو شکست دینے کے قابل ہو سکیں گے۔ دشمن مضبوط، پوری طرح منظم اور مسلح ہے، اس کی اپنی ہوائی فوج، یقینی رسد کے ذرائع اور تازہ دم متبادل فوجی موجود ہیں۔ وہ ہماری نسبت بہت زیادہ طاقت ور ہیں اور ان کے پاس بھرپور ذرائع بھی موجود ہیں۔''

کرنل عثمانی کی کئی باتیں سننے کے بعد ہمارے ذہن میں مختلف سوالات نے جنم لیا۔ اگر فوجی حکمران ٹولہ غیر مسلح معصوم لوگوں کے خلاف وحشیانہ کارروائی کا فیصلہ نہ کرتا، خاص طور پر اگر ایسٹ بنگال رجمنٹوں، ای پی آر، پولیس اور انصار پر سوتے میں حملہ نہ کیا جاتا تو کیا ان لوگوں نے بنگلہ دیش کی آزادی کے لیے بغاوت کرتے ہوئے ہتھیار اٹھانا تھے؟ کیا یہاں کسی آزادی کی جدوجہد یا مکتی فوج کا وجود ہونا تھا؟ ان گورکھ دھندوں کے جوابات صرف مستقبل کے مؤرخین ہی تلاش کر سکیں گے۔ ہم نے کرنل عثمانی کی بات سننا جاری رکھا۔

''لیکن میں اس بات کا قائل ہوں کہ روایتی گوریلا جنگ کے ذریعے آزادی کے حصول میں بہت زیادہ وقت لگے گا اور اس طریقے میں نقصان بھی زیادہ سے زیادہ ہوگا۔ ہمارا سب سے بڑا ذریعہ ہمارے عوام ہیں۔ وہ تباہ ہو جائیں گے۔'' کرنل عثمانی کی گفتگو سے متوسط طبقے کی مخصوص موقع پرستی عیاں ہو رہی تھی۔ میری نظر میں دنیا میں کوئی ایسی قوم نہ تھی، جس نے ایک طاقتور فوج کے ساتھ جنگ میں بغیر نا قابل تلافی نقصانات کے مختصر سے عرصہ میں آزادی حاصل کر لی ہو۔ وہ جنہوں نے اپنی آزادی بغیر کسی قربانی کے حاصل کی ان کی آزادی بار آور نہ ہو سکی بلکہ ایک فریب ثابت ہوئی۔ ایسی آزادی ابتدا ہی سے گھناؤنی سازشوں کا شکار ہو جاتی ہے۔ ایسی چند مثالیں موجود ہیں کہ جغرافیائی آزادی تو حاصل کر لی گئی لیکن حقیقی آزادی ایک

خواب ہی رہی۔ ان ممالک میں لیڈرشپ ہمیشہ اپنے آقاؤں کی خوشنودی حاصل کرنے اور ان کے ساتھ اپنی وفاداری کو ثابت کرنے میں مصروف رہتی ہے۔

ہم کرنل عثمانی کی باتوں پر پوری توجہ دے رہے تھے۔ انہوں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا: ''وقت کو مختصر کرنے اور ایک آسان فتح حاصل کرنے کے لیے ایک منصوبہ تیار کیا گیا ہے۔ ایک بہت بڑی گوریلا فوج تشکیل دینا پڑے گی جو دشمن پر چاروں طرف سے حملے کر کے اسے کمزور کرنے کی کوشش کرے گی۔ اس کے ساتھ ساتھ باقاعدہ فوج کے رسالے کمپنی یا پلاٹون کی قوت کے ساتھ کارروائیاں کریں گے تاکہ دشمن کے ٹھکانوں کو ایک دوسرے سے کاٹ کر تنہا پاکٹوں میں تبدیل کر دیا جائے۔ اس منصوبے میں مواصلات کے ذرائع اور رسد کے راستوں کو منقطع کرنے، ریڈیو اور ٹیلی فون کی تنصیبات کو تباہ کرنے میں گوریلا افواج اہم کردار ادا کریں گی۔ اور آخر میں باقاعدہ حملہ آور بریگیڈز، جو روایتی فوج کی طرح قائم کی جائیں گی، ان تنہا کیے گئے ٹھکانوں کو تباہ کر دیں گی۔ میں اپنا منصوبہ وزیراعظم اور اپنے ہندوستانی ساتھیوں کے سامنے پیش کر چکا ہوں۔

میں نے اس رپورٹ میں کہا ہے کہ اس قسم کی گوریلا فوج کو ''گونو باہنی'' کہا جائے گا اور باقاعدہ فوج کو نیومیتو باہنی کہا جائے گا اور ان کی تعداد بالترتیب 50 سے 60 ہزار اور 20 سے 25 ہزار کے لگ بھگ ہونی چاہیے۔ اگر ہم حقیقتاً آزادی چاہتے ہیں تو آزادی کی جنگ لڑنے والے ان مجاہدین کے علاوہ جو مختلف مقامات پر سرحدوں کے ساتھ کمانڈروں کے تحت اب لڑ رہے ہیں، اضافی افواج قائم کرنا ہوں گی۔ ہمیں مزید وقت ضائع کیے بغیر ان افواج کو قائم کرنے کی اجازت حاصل کرنا ہوگی۔ اس وقت آزادی کی جنگ لڑنے والے مجاہدین میں یونیفارم والے سابقہ فوجیوں کو ''نیومیٹو باہنی'' اور ان کو جو سویلین آبادی سے شامل کیے گئے ہیں ''نیومیتو باہنی'' کا نام دیا گیا ہے۔ ہندوستانی حکام ان کو ''ایف ایف'' (فریڈم فائٹرز) کہتے ہیں۔ میں آزادی کے ان مجاہدین میں سے کم از کم تین باقاعدہ انفنٹری بریگیڈز قائم کرنا چاہتا ہوں۔ باقی ماندہ سیکٹر ٹروپس کے طور پر اپنے متعلقہ کمانڈروں کے تحت جنگ جاری رکھیں گے۔ ان کا اہم کام گوریلوں کی تربیت اور ملک کے اندر ان کے مراکز کو محفوظ رکھنا ہوگا جب تک تربیت یافتہ گوریلے ان کو سنبھال نہیں لیتے۔ سیکٹر ٹروپس بھی بنگلہ دیش کے اندر گوریلا کارروائیوں میں تعاون کریں گے۔ سیکٹر کمانڈروں کے ساتھ گوریلا مشیروں کا تقرر عمل میں لایا جائے گا۔ میں نے سارے میدان جنگ کو 11 سیکٹرز میں تقسیم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ہر سیکٹر کی کمانڈ سیکٹر ہیڈ کوارٹر میں مقرر کیے گئے سیکٹر کمانڈر کے ہاتھ میں ہوگی۔ یہ ہیڈ کوارٹرز آزاد کرائے گئے علاقوں میں قائم کیے جائیں گے۔ یہ سیکٹر گوریلا جنگ کے لیے مرکزی اڈوں کا کردار ادا کریں گے۔ سیکٹر کمانڈروں کو اپنے طور پر فیصلے کرنے اور کارروائیاں کرنے کا اختیار ہوگا۔ وسائل کی کمی کی وجہ سے کمانڈر انچیف اس قدر وسیع علاقے میں پھیلی ہوئی گوریلا جنگ کے روزمرہ معاملات کی نگرانی نہیں کر سکتا۔ تمام سیکٹر ہیڈ کوارٹرز کمانڈر انچیف سیکریٹریٹ کے ساتھ ایک ڈھیلے ڈھالے رابطے میں ہوں گے جس کا زیادہ تر تعلق پالیسی

معاملات کے ساتھ ہوگا۔ کمانڈرز کو اپنے منصوبے اور فیصلوں کے بارے میں بریفنگ دینے اور عبوری حکومت اور ہندوستانی حکومت کے سیاسی اور فوجی معاملات سے آگاہ کرنے میں مذاکرات اور پیچیدگیوں پر تبادلہ خیال کے لیے میں کمانڈروں کا ایک فوری اجلاس طلب کرنے کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ اس اجلاس میں ہم ہر چیز اور ہر تفصیل پر غور کریں گے۔ پالیسی کے رہنما اصول تشکیل دینا میرے سیکریٹریٹ کی ذمہ داری ہوگی اور کمانڈرز ان پالیسیوں کا میدان جنگ میں نفاذ کریں گے۔ میرے سیکریٹریٹ میں رابطہ آفیسرز ہوں گے جو سیکٹروں سے رابطہ رکھیں گے۔ آزادی کے مجاہدین کو بھی معلومات اکٹھا کرنے کے لیے استعمال کیا جائے گا۔ میں اپنے ہیڈ کوارٹرز میں ایک انٹیلی جینس سیل قائم کروں گا اور گاہے بہ گاہے ذاتی طور پر مختلف سیکٹروں کا دورہ کیا کروں گا۔"

ہم نے ان کے ہر ایک لفظ کو بڑے غور سے سنا۔ اگرچہ انہوں نے اپنے منصوبے اور فوجی پہلوؤں پر بہت کچھ کہا، لیکن ہماری اس جدوجہد کے سیاسی پہلو پر حقیقتاً کوئی بات نہیں کی۔ کسی بھی قومی آزادی کی تحریک کو منظم کرنے اور حتمی کامیابی کے لیے مسلح جدوجہد کو آگے بڑھانے کے لیے ایک ٹھوس نظریہ اور معقول سیاسی لیڈرشپ، دو بنیادی پیشگی ضروریات ہوتی ہیں۔ گوریلا جنگ مکمل طور پر ایک عوامی جنگ ہوتی ہے اور لوگوں کو گوریلا جنگ کی جانب صرف ایک مضبوط سیاسی نظریے کے ذریعے راغب کیا جاسکتا ہے۔ اس سیاسی نظریے میں ضروری ہے کہ لوگوں کو اپنی خواہشات اور امنگوں کا عکس نظر آتا ہو۔ اسی لیے کسی بھی قومی آزادی کی تحریک کی قیادت کے لیے قومی حکومت کی تشکیل ایک ناگزیر عمل ہے۔ صرف ایک معقول قومی حکومت کے ذریعے ہی وسیع بنیادوں پر قائم قومی اتحاد اور یک جہتی حاصل کی جاسکتی ہے۔

ایسی حکومت عام طور پر تمام محب وطن اور قوم پرست پارٹیوں کی سیاسی قیادت اور جنگ آزادی لڑنے والے گروہوں کے نمائندگان کے اشتراک سے تشکیل دی جاتی ہے۔ یہ ایک طویل عوامی جنگ کو منظم کرنے کا تقریباً ایک عالمگیر طریقہ کار ہے۔ یہ طریقہ کار قومی آزادی کی ان تحریکوں کے عمل کے ذریعے پروان چڑھا جن کی ابتدا حالیہ انسانی تاریخ میں لڑی جانے والی دو عالمی جنگوں کے بعد ہوئی۔ اس تسلیم شدہ معیار کے برخلاف یہ کس طرح ممکن تھا کہ اس لمبی جدوجہد کو ہندوستانی حکومت کی آشیرباد پر جلد بازی میں تشکیل دی گئی عوامی لیگ کی یک جماعتی حکومت کے تحت جاری رکھا جاسکتا تھا۔ آزادی کی جنگ میں تمام لوگوں نے بلاتمیز اپنے طبقے، جماعتی وابستگی اور پیشے کے خود بخود شرکت اختیار کی تھی۔ سیاسی طور پر عوامی لیگ ایک ایسی جماعت تھی جو نئے پیدا ہونے والے متوسط شہری طبقے کی نمائندگی کرتی تھی۔ ایک مخصوص طبقے کی نمائندہ جماعت ہوتے ہوئے عوامی لیگ کی عبوری حکومت کسی طرح بھی اس قومی تحریک میں ایک جائز اور مؤثر قیادت مہیا نہیں کرسکتی تھی، خاص طور پر جب کہ ایک لمبی گوریلا جدوجہد کی توقع کی جارہی تھی؟ یہ کیسی سازباز تھی۔

ہندوستان ایک جمہوری مملکت کا دعویدار ہوتے ہوئے بھی اپنے درپردہ مقاصد کے حصول کے لیے جنگ آزادی پر عوامی لیگ کی تن تنہا قیادت مسلط کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ 1970ء کے انتخابات میں عوامی

لیگ نے خود اختیاری اور صوبائی خود مختاری کا نعرہ لگا کر اور نیا آئین اسلامی اصولوں کے مطابق تشکیل دینے کے وعدے پر ووٹ لیے تھے۔ اس کے انتخابی منشور میں مسلح جدوجہد کے آغاز کا کوئی وعدہ نہیں تھا۔ کرنل عثمانی نے جو کچھ کہا تھا، اس سے ایک بات بہت واضح ہو گئی تھی کہ مسلح جدوجہد کا آغاز عوامی لیگ کی جانب سے نہیں ہوا تھا۔ سب سے پہلے آزادی کی آواز ایک نوجوان بنگالی آفیسر میجر ضیا الرحمٰن نے بلند کی تھی اور قوم اس کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے مزاحمتی تحریک میں کود پڑی تھی اور آزادی کی جنگ کو منظم کیا تھا۔ ایسٹ بنگال رجمنٹوں، ای پی آر، پولیس اور انصار کے باوردی افراد نے مسلح بغاوت کا آغاز کیا تھا اور مزاحمتی تحریک کو منظم کرنے میں ہراول دستے کا کردار ادا کرتے ہوئے پورے بنگلہ دیش میں خود اپنے طور پر مکتی باہنی کی تربیت کا انتظام کیا تھا۔

یہ خیال کرنا انتہائی مضحکہ خیز تھا کہ عوامی لیگ کی قیادت نے جنگ آزادی کے لیے آواز اٹھائی تھی جب کہ شیخ مجیب اور ان کی پارٹی سرے سے مسلح جدوجہد میں یقین ہی نہیں رکھتے تھے۔ لہٰذا ان کی مسلح بغاوت کے لیے کسی قسم کی تیاری ہی نہیں تھی۔ عوامی لیگ کا جماعتی منشور، اس کی انتخابی مہم اور بعد میں صدر جنرل یحییٰ کے ساتھ اس کی سیاسی گفت وشنید اور اس کی دیگر سیاسی سرگرمیوں سے واضح طور پر ثابت ہوتا تھا کہ عوامی لیگ کبھی بھی جنگ آزادی کی خواہاں نہ تھی۔ ان حالات کے تحت ہندوستانی حکومت کی ایما پر یک طرفہ طور پر عبوری حکومت تشکیل دیتے ہوئے وہ کس طرح آزادی کی تحریک اور جنگ آزادی کا واحد چمپئن ہونے کا دعویٰ کر رہی تھی؟ اس کو کس طرح سے جائز قرار دیا جا سکتا تھا؟

52۔ کرنل عثمانی اور نہ ہی تاج الدین ''جی ایل ایف'' تشکیل دینے کی ہندوستانی سازش کے بارے میں کچھ جانتے تھے

''عوامی لیگ کے کردار کے بارے میں نچلے طبقے اور اعلیٰ قیادت دونوں میں اختلافات پائے جاتے تھے۔ قیادت کا ایک حصہ چاہتا تھا کہ جنگ آزادی عوامی لیگ کی واحد قیادت کے تحت لڑی جانی چاہیے۔ قیادت کے اس حصے کو ہندوستانی حکومت کی حمایت اور سرپرستی حاصل تھی۔'' (روزنامہ ''انقلاب'' کو دیا جانے والا شانتی رائے کا انٹرویو)

انتہائی حیران کن طور پر کرنل عثمانی تصورات کی دنیا میں کھوئے ہوئے تھے۔ انہوں نے ایک موقع پرست قیادت کے تحت کس طرح آزادی کی جنگ لڑنے اور عوام کو نجات دلوانے کا سوچ رکھا تھا؟ وہ ایک لمبی گوریلا جنگ لڑنے کی منصوبہ بندی کر رہے تھے اور ساتھ ہی ایک فوری کامیابی کی توقع لیے ہوئے تھے۔ ہم نے اندازہ لگایا کہ ان کے خیالات اور نظریات میں ابتری کی وجہ خلوص میں کمی نہیں تھی بلکہ عوامی جنگ کے سیاسی فلسفے کے بارے میں مناسب علم کا فقدان تھا۔ حکومت بھی کسی لمبی جنگ کے حق میں نہیں تھی۔ جیسا کہ وہ پہلے ہی واضح طور پر یہ بات کر چکے تھے۔ یہ سب کیا ہو رہا تھا؟ کیا پس پردہ کوئی دوسری سازش تھی جو بنگلہ دیش

کی آزادی کی تحریک کو گھیرے ہوئے تھی؟ کیا عبوری حکومت کی تشکیل، قبل از وقت فتح کی خواہش اور آزادی کی جنگ کے فطری دورانیے کو کم کرنے کی کوششیں، سب کسی سازش یا خفیہ منصوبے کی نشاندہی کر رہی تھیں۔ کرنل عثمانی کی گفتگو نے کسی خفیہ ایجنڈے اور سازشی منصوبے کے بارے میں ہمارے ان خدشات کی تصدیق کر دی تھی جن کی موجودگی ہم نے دہلی میں محسوس کی تھی۔ تو کیا کرنل عثمانی اس منصوبے کی تکمیل میں ایک فریق کے طور پر اپنا کردار ادا کر رہے تھے؟ ہم اس بات پر یقین کرنے میں مشکل محسوس کر رہے تھے۔ ہم کرنل عثمانی کو ایک دیانت دار اور جرأت مند سپاہی اور مخلص بنگالی قوم پرست کے طور پر جانتے تھے۔ انہوں نے عوامی لیگ میں شمولیت اختیار کر لی تھی اور 1970ء کے انتخابات میں عوامی لیگ کی ٹکٹ پر منتخب ہوئے تھے۔ انسانی فطرت اور کردار میں فوراً کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوسکتی۔ پھر ان کے ساتھ یہ کیسے ہوسکتا تھا؟ ایک مرتبہ میں نے انہیں دہلی میں اپنے تجربات اور عمومی سطح پر اپنے نظریات سے آگاہ کرنے کے بارے میں سوچا۔ لیکن پھر میں نے فیصلہ کیا کہ پہلے اپنے طور پر اس بات کا یقین کرلوں کہ وہ کہاں کھڑے ہیں اور حالیہ معاملات کے بارے میں کس حد تک جانتے ہیں۔ ان کو پوری طرح سمجھے بغیر اگر ہم اپنا آپ ان پر عیاں کر دیتے ہیں تو اس کے الٹ اور نقصان دہ اثرات مرتب ہوسکتے تھے۔ ہم سب گومگو کی حالت میں تھے۔

میں ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ کرنل عثمانی نے اچانک کہا: ''میں نے تمہیں اور موتی کو سیکٹر کمانڈرز کے گوریلا مشیر مقرر کرنے کا فیصلہ کیا ہے اور نور ہیڈ کوارٹرز میں میرے اے ڈی سی اور پرسنل سٹاف آفیسر (پی ایس او) کے فرائض انجام دے گا۔'' ہم سب حیران رہ گئے۔ کتنی عجیب بات تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ کرنل عثمانی اس فیصلے سے آگاہ نہیں تھے جو ہمارے بارے عبوری حکومت اور متعلقہ ہندوستانی حکام نے پہلے سے ہی کر رکھا تھا۔ یہ ایک معمہ تھا۔ یہ صاف طور پر واضح ہو چکا تھا کہ وزیراعظم نے ہندوستانی حکام سے مشورے کے بعد ہمارے بارے میں فیصلہ کرتے ہوئے جان بوجھ کر کرنل عثمانی کو نظر انداز کر دیا تھا یا پھر تاج الدین نے کسی وجہ سے ابھی تک کرنل عثمانی کو اس فیصلے سے آگاہ نہیں کیا تھا۔ اگر پہلا مفروضہ درست تھا تو پھر کرنل عثمانی خصوصی سیاسی فوج ''بی ایل ایف'' تشکیل دینے کے فیصلے کے بارے میں بھی کچھ نہیں جانتے تھے اور اس معاملے میں ان کو اعتماد میں نہیں لیا گیا تھا۔ یہ ہمارے لیے حوصلہ افزائی کی بات تھی۔ شاید وہ بدلے ہوئے انسان نہیں تھے اور نہ ہی اس شیطانی منصوبے میں فریق تھے۔ لہٰذا ہم کھل کر ان کے سامنے اپنا مافی الضمیر بیان کر سکتے تھے۔ یہ ہمارے لیے ایک تسکین آمیز بات تھی۔ بے چارہ کرنل... ایک نیا کھیل شروع ہو چکا تھا جس سے انہیں مکمل طور پر باہر رکھا گیا تھا اور وہ اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔

''سر، مجھے اور موتی کو گوریلا مشیروں کے طور پر مقرر کرنے کا آپ کا فیصلہ بہت مستحسن ہے لیکن وزیراعظم اور ہندوستانی حکام نے ہمارے لیے کچھ اور فیصلہ کر رکھا ہے۔ کیا آپ ''بی ایل ایف'' نام کی فوج تشکیل دینے کے بارے میں کچھ جانتے ہیں؟'' میں نے سوال کیا۔

''بی ایل ایف کیا ہے؟ میں اس کے بارے میں بالکل نہیں جانتا۔ کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ کیا

ہو رہا ہے؟'' کرنل عثمانی نے بے صبر انداز میں سوال کیا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ ایک دیانت دار انسان کی حیثیت سے بہت زیادہ پریشان تھے۔

''یقیناً سر، میں آپ کو ہر بات بتاؤں گا جس کا ہمیں دہلی میں تجربہ ہوا۔ ہمیں آپ پر پورا اعتماد اور بھروسا ہے۔ ایک بارتبہ اور خوددار شخص کی حیثیت سے اور جنگ آزادی کے کمانڈر انچیف کی حیثیت سے ہم پوری طرح قائل ہیں کہ آپ ایک مطلب پرست سیاستدان کی طرح قوم کو کبھی دھوکہ نہیں دیں گے۔ ہمیں اس بات میں بھی کوئی شک نہیں کہ آپ میں قوم کے خلاف کسی بھی سازش کو کچلنے کا وصف اور جرأت موجود ہے۔ لیکن سر، ہماری آپ سے صرف ایک درخواست ہے کہ تمام تفصیلات سننے کے بعد آپ نہ تو پریشان ہوں گے اور نہ ہی جوش میں آئیں گے۔ آپ کو بڑے ٹھنڈے مزاج کے ساتھ اپنے ردِّعمل کا انتخاب کرنا ہوگا جیسا کہ یہ معاملہ حساس اور گمبھیر ہے۔ ہمارا کوئی بھی قدم ہمیں شدید مسائل سے دوچار کر سکتا ہے۔'' میری بات سننے کے بعد کرنل عثمانی کچھ دیر کے لیے بالکل خاموش رہے۔

''ٹھیک ہے، یہ سب باتیں میرے اور آپ تینوں کے درمیان رہیں گی۔ اب مجھے ہر بات تفصیل سے بتائیں۔'' ہم ان کے خلوص کو محسوس کر سکتے تھے۔ میں نے موتی اور نور سے نگاہیں ملائیں۔ انہوں نے مجھے ایک خاموش اشارہ دیا اور میں نے انہیں بتانا شروع کیا۔

''سر، دہلی میں ہمارا زیادہ تر وقت جنرل اوبان اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ گزرا ہے۔ دہلی میں گوریلا جنگ کے بارے میں ہمارے علم کو تازہ کرنے کے علاوہ ہمیں بہت زیادہ سیاسی تحریک بھی دی گئی۔ ہندوستان کی حکومت آزادی کی اس جنگ میں عوامی لیگ کی اس حکومت کی مؤثر قیادت کی صلاحیتوں کو بھی تشویش کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ اس بارے میں بہت زیادہ پریشانی پائی جاتی ہے۔ سیاسی پارٹی کی حیثیت سے عوامی لیگ میں بہت سی خلقی خامیاں پائی جاتی ہیں۔ قیادت اور ممبران کی اکثریت اس قسم کی مسلح جدوجہد کے لیے مطلوبہ نظریاتی بندھن، ذہنی میلان اور تیاری سے محروم ہے۔ انہیں اس قابل خیال نہیں کیا جاتا کہ ایک لمبی جنگ کی صورت میں اپنی قیادت کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری قربانیاں دے سکیں، ان حالات میں اگر جنگ طول پکڑتی ہے تو اس بات کا پورا امکان موجود ہے کہ قیادت کسی اور کے ہاتھوں میں چلی جائے گی۔ اس وقت دو اہم قوتیں ہیں جو عوامی لیگ کی قیادت کو چیلنج کر سکتی ہیں۔ ایک تو انقلابی نظریات کی حامل انتہائی بائیں بازو کی سیاسی قوتیں ہیں، دوسری قوت سابقہ پاکستانی فوجی ہیں جن کے گرد موجودہ مجاہدین آزادی منظم ہیں۔ اس وقت ایسٹ بنگال رجمنٹوں، ای پی آر، پولیس اور انصار کے سابقہ سپاہی بڑی مضبوط پوزیشن کے حامل ہیں اور ان کی مقبولیت میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ ایک لمبی جنگ کی صورت میں ان کی طاقت میں مزید اضافہ ہوگا اور عوامی لیگ کی طاقت میں کمی ہو سکتی ہے۔ جیسا کہ ہندوستان کی حکومت صرف عوامی لیگ کی قیادت کو مدد فراہم کرنے کی پابند ہے، اس لیے اس کی قیادت کو ہر قیمت پر یقینی بنانا اور جنگ صرف اسی کی قیادت کے تحت لڑی جانا ناگزیر ہے۔ عوامی لیگ کی قیادت کو جنگ کے دوران اور جنگ کے بعد بھی اس قسم کے کسی بھی چیلنج سے

بچانے کے لیے ایک مضبوط اور اعلیٰ تربیت یافتہ سیاسی فوج قائم کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ یہ فوج کم از کم ایک لاکھ افرادی قوت پر مشتمل ہونی چاہیے۔ اس فوج کا نام بی ایل ایف (بنگلہ دیش لبریشن فورس) ہوگا۔ عوامی لیگ کے مختلف سطحوں کے لیڈر اور اس سے وابستہ تنظیموں کے لیڈر بھرتی کے عمل میں مدد فراہم کریں گے۔ پناہ گزینوں میں سے اور یوتھ کیمپوں میں سے نوجوانوں اور طالب علموں کو بھرتی کیا جائے گا اور ہندوستان کی حکومت اپنی فوج کی سپیشلائزڈ یونٹوں کے ذریعے ان کی تربیت کا بندوبست کرے گی۔ ہندوستانی حکام ان کی دیکھ بھال، ان کے کھانے پینے اور ان کی صف بندی کی مکمل ذمہ داری اٹھائیں گے۔ اس فوج کو ہندوستانی فوج مکمل طور پر مسلح کرے گی۔ وزیراعظم اور ہم تینوں کے علاوہ اس سپیشل فوج کے بارے میں اور کسی کو بھی کوئی علم نہیں ہوگا۔ ہم تینوں وزیراعظم اور ہندوستان کے متعلقہ حکام کے درمیان رابطہ آفیسرز کی خدمات انجام دیں گے۔ اس فوج کا اصل کام آزادی کے بعد براہ راست وزیراعظم کی قیادت میں عوامی لیگ کے مفادات کا تحفظ کرنا ہوگا۔ اگرچہ اس کو بی ایل ایف کا نام دینے کا فیصلہ کیا گیا تھا، تاہم بعد میں اگر ضرورت محسوس ہوئی تو اسے "مجیب باہنی" میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ کسی قسم کے شکوک و شبہات کو رفع کرنے کے لیے ضروری پروپیگنڈا کیا جائے گا کہ اگر ضرورت محسوس ہوئی تو یہ فوج مغربی محاذ پر اپنی دوست افواج کے ساتھ مل کر لڑنے کے لیے بھیجی جائے گی تاکہ شیخ مجیب کو ان کی قید سے رہائی دلائی جا سکے۔ بھرتی کے عمل کے لیے پہلے ہی چار طالب علم رہنماؤں کا انتخاب کیا جا چکا ہے۔ وہ شیخ فضل الحق مونی، سراج عالم خان، عبدالرزاق اور طفیل احمد ہیں۔ یہ بھی بتایا گیا تھا کہ عبدالقدوس مکھن، شاہ جہان سراج اور نور عالم صدیقی بھی نوجوانوں کے اس گروپ اور طالب علم رہنماؤں کے ساتھ شامل ہو سکتے ہیں۔ (بعد میں ان میں سے چار کو بنگلہ دیش کے عوام میں "چار خلفا" کے نام سے جانا جاتا تھا)۔ اس فوج کی مجموعی ذمہ داری جنرل اوبان سنگھ کے ہاتھوں میں رہے گی جو "را" (ریسرچ اینڈ انیلیسز ونگ) کے سربراہ ہیں۔ اس فوج کو ڈیرہ دون کے قریب چکرول کیمپ میں تربیت دی جائے گی۔ بہت سے ماہر تربیت کاران کی تربیت کریں گے۔ تربیت کے عرصہ کے دوران اور بعد میں ہم ان کی تنظیم کاری کے لیے ہندوستانی ہم رتبہ آفیسرز کے ساتھ مل کر کام کریں گے اور بتدریج ہم بھی اس فوج کا حصہ بن جائیں گے۔" کرنل عثمانی میرے اس بیان کو سن کر پوری طرح بھونچکا رہ گئے۔

"بہت حیرانی کی بات ہے، میں اس بارے میں بالکل کچھ نہیں جانتا۔ میں وزیراعظم سے اس سارے معاملے اور اس میں ان کی شمولیت کے بارے میں بات کروں گا۔" کرنل عثمانی نے کہا۔

"ظاہر ہے آپ کو اس بارے میں بات کرنا چاہیے، لیکن محتاط رہتے ہوئے جیسا کہ یہ معاملہ بہت حساس نوعیت کا ہے۔ آپ کو ہر بات سوچ سمجھ کر کرنا ہوگی۔" میں نے کہا۔

"تم درست کہہ رہے ہو۔ ٹھیک ہے وزیراعظم سے بات کرنے کے بعد ہم اپنا فیصلہ کریں گے۔ چلیں اب آرام کرتے ہیں۔" انہوں نے ہمیں شب بخیر کہا اور ہم ان کے کمرے سے باہر آ گئے۔

دوسرے دن ہی کرنل عثمانی گئے اور وزیراعظم سے اس معاملے پر بات چیت کی اور انہیں پتا چلا

کہ وزیراعظم بھی اس سارے معاملے سے، جو ہم نے بیان کیا تھا، بالکل بے خبر تھے۔
''لیکن یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے؟ دہلی میں ہمیں واضح طور پر بتایا گیا تھا کہ عبوری حکومت کے وزیراعظم اس منصوبے سے پوری طرح آگاہ ہیں۔'' میں نے تردید کرتے ہوئے کہا۔
''نہیں بچو! وہ اتنے ہی اندھیرے میں ہیں جتنا کہ میں۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہے۔ تاہم وہ کسی قسم کی پردہ داری کیے بغیر ہندوستانی حکام سے اس بارے میں مزید جاننے کی کوشش کریں گے۔ آپ بھی اس معاملے میں مزید معلومات اکٹھا کرنے کی کوشش کریں اور مجھے آگاہ کریں تا کہ اسے تاج الدین تک پہنچا سکوں کیوں کہ وہ اس گھناؤنے منصوبے کے بارے میں مزید جاننے کے خواہش مند ہیں۔'' کرنل نے کہا۔ ''آپ بھی اس بارے میں سوچیں اور فیصلہ کریں کہ آپ کو کیا کرنا ہے۔'' انہوں نے مزید کہا۔

اگلے چند دن، ہم مختلف حلقوں میں گھومے پھرے اور کچھ چونکا دینے والی معلومات اکٹھی کیں۔ جن جگہوں سے ہم نے معلومات اکٹھا کرنے کا انتظام کیا، ان میں پنی کی رہائش گاہ 19 سرکس ایونیو، بنگلہ دیش مشن، پرنس سٹریٹ پر بائیں بازو کی سیاسی قوتوں کا ہیڈ کوارٹرز، شیالدہ اور بنگلہ دیش بتار پر بنگلہ دیشی نوجوانوں کے جمع ہونے کی جگہ وغیرہ شامل تھیں۔ عوامی لیگ میں بہت سے لوگ تاج الدین کو وزیراعظم کے طور پر پسند نہیں کرتے تھے۔ کچھ نوجوان اور طالب علم رہنما اپنی اس ناپسندیدگی کا اظہار بڑے برملا انداز میں ہر جگہ کرتے رہتے تھے۔ بعض مرکزی رہنما اور بہت سے منتخب ارکان بھی تاج الدین کو وزیراعظم بنانے کے اس جلد بازی کے فیصلے کے خلاف تھے اور بہ زبان خاموشی ان نوجوان رہنماؤں کی حمایت کر رہے تھے۔

ان رہنماؤں میں نمایاں طور پر شیخ فضل الحق، سراج عالم خان، عبدالرزاق، طفیل احمد، اے ایس ایم رب، شاہ جہان سراج، نور عالم صدیقی اور عبدالقدوس مکھن وغیرہ شامل تھے۔ یہ لوگ کھلم کھلا تاج الدین کو اقتدار کا بھوکا اور غاصب قرار دیتے تھے۔ انہوں نے حقیقتاً ان کی قیادت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا اور اپنے آپ کو ان کے خلاف منظم کر رہے تھے۔ کچھ دوسرے نمایاں رہنما مثلاً عبدالرب، سرنیابت، شیخ عبدالعزیز، منظور علی اور نذرالاسلام ان کی حمایت کرنے والوں میں شامل تھے۔

ایک مرتبہ جنرل اروڑا نے تاج الدین کے بارے میں کہا تھا: ''عوامی لیگ کا نوجوان طبقہ تاج الدین کو پسند نہیں کرتا۔'' (بعد میں یہ تبصرہ ان کی کتاب ''بنگلہ دیش جنگ آزادی 1971ء کی یادیں'' میں بھی شائع ہوا تھا)۔ ان میں سے اکثر نوجوان رہنما یہ خیال کرتے تھے کہ شیخ مجیب اب زندہ نہیں ہیں اور ان کی غیر موجودگی میں تاج الدین ان پر اپنا تسلط جمانا چاہتے ہیں اور یہ ان کے لیے کسی طور پر قابل قبول نہ تھا۔ اگر مجیب وہاں ہوتے تو پھر یہ رہنما آسانی کے ساتھ واقعات اور حالات پر اثر انداز ہو سکتے تھے اور اپنی آراء منوا سکتے تھے۔ لیکن تاج الدین وزیراعظم بننے کے بعد ان کے اثر و رسوخ کو کچلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ انہوں نے ان کے ہاتھوں مہرہ بننے سے انکار کر دیا تھا اور ان کو جس طرح وہ چاہتے تھے معاملات طے کرنے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ حقیقت میں عبوری حکومت کے معاملات چلاتے ہوئے ان رہنماؤں کو

نظر انداز کر رہے تھے۔ ان رہنماؤں کی نظر میں وہ ایک مغرور اور ڈھیٹ شخص تھے۔ اگر وہ اقتدار میں رہتے ہیں تو ان کی مراعات اور اثر ورسوخ بہت جلد ختم ہو جائے گا۔ وہ شیخ مجیب کے رشتہ داروں اور ان نزدیکی دوستوں کو بھی مناسب اہمیت نہیں دے رہے تھے جن سے بے وفائی دراصل شیخ مجیب کے ساتھ بے وفائی کے مترادف تھی۔ اسے (تاج الدین کو) اس کی اوقات میں رکھنے کی ضرورت تھی۔

ان رہنماؤں نے دوسروں کے ساتھ مل کر اقتدار کے لیے جدوجہد شروع کر دی۔ اپنے منصوبے کے ایک حصے کے طور پر شیخ فضل الحق مونی اور سراج عالم خان نوجوانوں اور طالب علموں کے ایک وفد کے ساتھ دہلی گئے۔ وہاں انہوں نے اندرا گاندھی سے ملاقات کی۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ انہیں شک ہے کہ تاج الدین کا شیخ مجیب کی گرفتاری میں ہاتھ تھا۔ انہوں نے کہا شیخ مجیب نے اپنی گرفتاری سے قبل خود اس جانب اشارہ کیا تھا اور انہیں ہندوستان کی حکومت سے مدد لینے اور ان کے خواب کو حقیقت کا روپ دینے تک جدوجہد جاری رکھنے کی ہدایت کی تھی۔ انہوں نے تاج الدین پر کبھی اعتماد نہیں کیا تھا کیوں کہ وہ بہت نمود پسند شخص ہے۔ منتخب نمائندگان کی اکثریت بھی تاج الدین پر اعتماد نہیں رکھتی۔ ان حالات میں ان کو وزیر اعظم بنانا غلطی ہے جیسا کہ ان کی وفاداری مشکوک ہے۔ اُن کو مطلوبہ حمایت حاصل نہیں، انہیں وزیر اعظم بننے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ جو کچھ انہوں نے کہا تھا، اس کے جواز میں انہوں نے شیخ مجیب کے ایک رشتہ دار، عبدالرب سرنیابت کا ایک خط بھی پیش کیا جو اندرا گاندھی کے نام لکھا ہوا تھا اور شیخ مجیب کے سب سے بڑے بیٹے شیخ کمال کو بھی پیش کیا۔ انہوں نے اندرا گاندھی کو متنبہ بھی کیا کہ اگر تاج الدین وزیر اعظم رہے تو ہندوستان کے مفادات کو بھی نقصان پہنچ سکتا ہے کیوں کہ تاج الدین کا اپنا ایجنڈا ہے اور وہ شیخ مجیب یا کسی بھی دوسرے شخص کا پروگرام نہیں چلنے دیں گے۔ انہوں نے مجیب سے وفادار اشخاص کو اُن کی نگرانی اور مشترکہ قیادت کے تحت منظم کرنے اور تربیت دینے کے لیے اندرا گاندھی سے مدد کے لیے اصرار کیا۔ انہوں نے مزید کہا کہ صرف ایک ایسی فوج تشکیل دینے سے ہی اس وقت اور آزادی کے بعد بنگلہ دیش میں بنگلہ دیش اور دوست ملک ہندوستان کے طویل المدتی مقاصد کے حصول کو یقینی بنایا جا سکتا ہے۔ انہوں نے متنبہ کیا کہ بہ صورت دیگر عوامی لیگ کی حکومت مستقبل میں ہندوستان دشمن قوتوں کا شکار ہو جائے گی۔

اندرا گاندھی نے اُن کی درخواست کو بڑے دھیان سے اور بہت زیادہ دلچسپی کے ساتھ سنا۔ ہندوستانی منصوبے کے مطابق طویل المدتی مفادات کو پیش نظر رکھتے ہوئے بنگلہ دیش لبریشن فورس (بی ایل ایف) جسے بعد میں مجیب باہنی کا نام دیا گیا، تشکیل دینے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ یہ ''تقسیم کرو اور حکومت کرو'' والی پالیسی کا ایک مثالی اظہار تھا اور ساتھ ہی مستقبل میں ایک دوسرے محاذ کے قیام کی ایک کوشش بھی تھی۔ اس طرح سے ''بی ایل ایف'' یا مجیب باہنی قائم کی گئی تھی۔

ہم نے ان تمام حقائق سے کرنل عثمانی کو آگاہ کیا اور انہوں نے راز داری کے ساتھ اس سارے معاملے کے بارے میں وزیر اعظم تاج الدین کو بھی آگاہ کر دیا۔ بعد میں تاج الدین نے یہ معاملہ دہلی میں

موجود ہندوستانی حکام کے سامنے اٹھایا اور اپنی ناراضی کا اظہار بھی کیا۔ لیکن پی این ہکسر، ڈی پی دھر، ''را'' کے رام ناتھ راؤ اور جنرل اوبان نے بڑے آرام سے سارا معاملہ ٹال دیا اور تاج الدین کی شکایات پر خاموشی اور لاتعلقی کا مظاہرہ کیا۔ تاج الدین دہلی سے مایوس اور ناکام واپس آ گئے۔ بعد میں کرنل عثمانی نے ہمیں بتایا کہ تاج الدین ہندوستان کے اس فیصلے کو تبدیل کرنے میں مکمل ناکام رہے ہیں۔ انہوں نے ان کے احتجاج پر بالکل کان نہیں دھرے۔ تاہم بعد میں کرنل عثمانی اور تاج الدین اس مخصوص باہنی کو مجیب نگر حکومت کے تحت لانے کی سرتوڑ کوششیں کیں لیکن مکمل ناکام رہے۔ آخرکار کرنل عثمانی اور تاج الدین دونوں کو ہندوستانی منصوبے کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا پڑا۔ یہاں جنرل اروڑا کے اس بیان کا ذکر کرنا اہم ہوگا، جو انہوں نے بی ایل ایف یا مجیب باہنی کی تخلیق کے بارے میں اور اس میں ''را'' کی شمولیت کے حوالے سے دیا تھا۔ ان کا کہنا تھا:

''مجیب باہنی، جو مکتی باہنی سے مکمل طور پر مختلف فوج تھی، میں اس فوج کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ نوجوان طلبا کے ایک گروپ نے، جس نے 1971ء کے انتخابات میں شیخ مجیب الرحمٰن کے ساتھ بہت نزدیک رہتے ہوئے کام کیا تھا، ہماری انٹیلی جینس ''را'' کو بتایا کہ وہ شیخ مجیب کے حقیقی حمایتی ہیں۔ ان کی وفاداری شک وشبہ سے بالاتر ہے اور شیخ مجیب ان پر مکمل اعتماد رکھتے تھے۔ اگر ان کو مناسب مدد مہیا کی جائے تو وہ مکتی فوج کی نسبت ایک زیادہ وفادار اور مخلص فوج تشکیل دے سکتے ہیں۔ مجھے اس ساری بات کا علم بہت بعد میں ہوا جب اس فوج کا آزادی کے مجاہدین کے ساتھ تصادم شروع ہو گیا۔ ایک دن وزیراعظم تاج الدین میرے پاس آئے اور اس فوج کے بارے میں استفسار کیا۔ میں نے چیف جنرل مانک شا سے رابطہ کیا اور اس فوج کے بارے میں جاننے کی کوشش کی۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ یہ فوج ہماری انٹیلی جینس ایجنسی ''را'' نے قائم کی ہے۔ جب مجیب باہنی اور آزادی کے مجاہدین کے درمیان اختلاف میں مزید اضافہ ہو گیا تو ڈی پی دھر (درگا پرشاد دھر، جو کہ بنگلہ دیش کے معاملات پر اندرا گاندھی کے خصوصی مشیر تھے) نے مجھے بتایا کہ موجودہ صورتِ حال کے پیشِ نظر یہ معاملہ خفیہ رکھا گیا تھا، لیکن مناسب وقت پر عبوری حکومت کو اس بارے میں آگاہ کر دیا جائے گا۔ (جنرل اروڑا کا ایک صحافی چکراورتی کو دیا گیا انٹرویو جو ''بنگلہ دیش جنگ آزادی 1971ء'' میں شائع ہوا)۔

جنرل اروڑا کا یہ بیان اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ ابتدا میں ہندوستان کی حکومت اور ''را'' نے اس ''باہنی'' کی تشکیل کے بارے میں تاج الدین کو بھی اندھیرے میں رکھا تھا۔

53۔ ایک اہم فیصلہ

ہم نے کرنل عثمانی کو اپنے درج ذیل فیصلے سے آگاہ کر دیا: ''ہم ہندوستان کے منصوبے میں براہ راست ملوث نہیں ہونا چاہتے۔ یہ منصوبہ جو بھی ہے ہم اس کے فریق نہیں بننا چاہتے۔ ہم مجاہدین آزادی کے

ساتھ مل کر جنگ آزادی لڑنے کے لیے فرار ہوئے تھے۔ ہم مکتی باہنی میں شامل ہونا چاہتے ہیں نہ کہ "بی ایل ایف" میں۔"

تاہم ہم نے کرنل عثمانی کے اس فیصلے کو تسلیم کر لیا کہ ہمارا تقرر سیکٹر کمانڈرز کے گوریلا مشیروں کے طور پر کر دیا جائے۔ لیفٹیننٹ نوران کے سٹاف آفیسر کے طور پر کام نہیں کرنا چاہتا تھا اور سیکٹر میں جانا چاہتا تھا۔ لیکن پھر وہ ہندوستانی حکام کو کیا بتائیں گے؟ ہوسکتا تھا کہ وہ اس فیصلے کو موافق انداز میں نہ لیں۔ کرنل عثمانی نے اس کا جواب سوچ لیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ وہ ہندوستانی حکام کو بتائیں گے کہ انہوں نے اور تاج الدین نے مل کر یہ فیصلہ کیا ہے کیوں کہ ہم دونوں یہ سمجھتے ہیں کہ ان تینوں افراد کی سیاسی تربیت اور وابستگی اس درجہ کی نہیں ہے کہ انہیں بی ایل ایف جیسی ایک سیاسی فوج کی تشکیل کی ذمہ داری سونپی جاسکے، اور اس قسم کا فرض ان افراد کو سونپنا چاہیے جو خلوصِ دل سے سیاسی وابستگی رکھتے ہوں۔ لہٰذا اس قسم کی انتہائی سیاسی بنیادوں پر قائم فوج کے لیے زیادہ سیاسی شعور رکھنے والے آفیسرز کا انتخاب کیا جانا چاہیے۔ ہندوستانی حکام نے اس بات کو قبول کر لیا اور آخر کار بی ایل ایف کی تشکیل کا کام ہندوستانی فوج کی مدد سے صرف طلبا اور نوجوان رہنماؤں کو سونپ دیا گیا۔ ہم نے اپنے آپ کو اس سازشی منصوبے سے نکال لیا۔ مجھے 8، 9 اور 4 نمبر سیکٹروں کے سیکٹر کمانڈرز کا گوریلا ایڈوائزر مقرر کیا گیا، اور موتی کو سیکٹر نمبر 10 اور 11 پر یہی ذمہ داری سونپی گئی۔ کرنل عثمانی نے ہمارے تمام تر دلائل کو رد کرتے ہوئے لیفٹیننٹ نور کو اپنا اے ڈی سی اور پرسنل سٹاف آفیسر رکھنے کا فیصلہ کیا۔

54۔ 58 بالی گنج سے 8 تھیٹر روڈ پر

ابتدا ہی سے اندر اور باہر موجود مختلف قوتیں متعدد قسم کی سازشوں میں مصروف تھیں۔ ان تمام سازشوں کا موجب دراصل عوامی لیگ کے اندر جاری اقتدار کی جدوجہد اور کشمکش تھی۔ دو راتیں ہم نے کرنل عثمانی کے کمرے والی منزل میں بسر کیں۔ پھر ہمیں پارک سرکس میں ایک خالی سکول کی عمارت میں بھیج دیا گیا جو کہ کچھ عرصہ کے لیے ہماری عارضی رہائش گاہ رہی۔ ہر روز صبح سویرے ہم 58 بالی گنج پہنچ جایا کرتے تھے اور رات گئے واپس آتے تھے۔ ہمارے کھانے پینے کا انتظام بالی گنج کے میس میں تھا۔

ایک دن کرنل عثمانی نے کہا، "ہندوستان کی حکومت نے ہمارے ہیڈکوارٹرز کے لیے ایک جگہ کا انتخاب کیا ہے، آؤ اور اس جگہ کا معائنہ کر کے آتے ہیں۔ یہ جگہ بہت چھوٹی اور ہر وقت لوگوں سے بھری رہتی ہے۔ حتیٰ کہ مناسب حفاظتی انتظامات بھی نہیں کیے جاسکتے۔"

حقیقت میں یہاں چوبیس گھنٹے ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں آتے جاتے لوگوں کا ایک ہجوم یہاں منڈلاتا رہتا تھا۔ ان میں کچھ عوامی لیگ کے منتخب ارکان تھے، کچھ رہنما تھے، کچھ با اثر بیوروکریٹس تھے اور کچھ عوامی لیگ کے بڑے رہنماؤں کے خوشامدی تھے۔ یہ تمام لوگ اپنے اپنے حلقوں میں بہت زیادہ اثر و رسوخ کے حامل تھے۔ انہیں کچھ بھی نہیں کہا جاسکتا تھا۔

سکیورٹی کے ذمہ دار افراد بے بسی کے عالم میں انہیں اپنی مرضی سے ادھر ادھر گھومتے ہوئے دیکھتے رہتے تھے۔ اگر گیٹ پر موجود سنتری ان سے کوئی بات پوچھ لیتے تو وہ غصے میں آ جاتے تھے اور چیختے چلاتے ہوئے بہت فساد کھڑا کر دیتے تھے۔ ان پر قابو پانا ناممکن تھا۔ ان میں سے اکثر خیال کرتے تھے کہ وہ بہت اہم شخصیات ہیں۔ انہوں نے بڑے عمدہ لباس پہن رکھے ہوتے تھے، جن میں جدید ترین فیشن کی کوئی کمی نہ ہوتی تھی۔ اگر ان میں سے کسی کو آپ ملتے یا آپ کے سامنے آ جاتا تو وہ ایک بڑی سی مسکراہٹ کے ساتھ بڑے مغرور انداز میں اپنی اہمیت کو بڑھا چڑھا کر اپنا تعارف کرواتے تھے۔ اگر وہ محسوس کرتے کہ آپ ان سے متاثر ہو چکے ہیں تو پھر اس وقت تک آپ کے لیے جان چھڑوانا مشکل ہو جاتا تھا جب تک وہ اپنی شان اور عظمت کے تمام پہلوؤں سے آپ کو آگاہ نہیں کر لیتے تھے۔

میس بالکل لنگر کے انداز میں چلایا جا رہا تھا۔ چاول، دال اور گوشت تقریباً سارا دن چوبیس گھنٹے پکتے رہتے تھے اور یہ سارے نام نہاد وی آئی پی پیٹ بھر بھر کر کھاتے رہتے۔ پوری طرح شکم سیری کرنے کے بعد وہ یہاں پر ہی میزوں پر، بنچوں پر اور کرسیوں پر دراز ہو کر قیلولہ فرمانے لگتے تھے۔ سارا ماحول انتہائی نفرت انگیز تھا۔ ان میں سے کچھ وی آئی پیز نے یہاں رات بسر کرنے کے لیے بھی عارضی انتظامات کر رکھے تھے۔ ہر ایک کے پاس ہاتھ میں ایک بریف کیس یا کندھوں سے لٹکتا ہوا بیگ دیکھا جا سکتا تھا جو بہت قیمتی ملکیت نظر آتے تھے جنہیں وہ حوائج ضروریہ کے لیے باتھ روم میں جاتے ہوئے بھی اپنے ساتھ رکھتے۔ یہ راز میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کچھ دن بعد موتی نے مجھے اس راز سے آگاہ کیا۔

''سر، سرحد عبور کر کے ہندوستان آئے ہوئے مقامی منتظمین اور سیاسی رہنماؤں نے خزانوں اور بینکوں کو لوٹ لیا تھا۔ اس لوٹ سے حاصل ہونے والے اپنے اپنے حصے کی رقم وہ ان بیگوں میں اٹھائے پھر رہے ہیں۔''

''نہیں یار!'' میں نے حیرانی سے کہا۔

''آپ مجھ پر یقین نہیں کر رہے، ٹھیک ہے۔ میں یہ ثابت کر دوں گا۔'' موتی نے کہا۔

ایک دن ایک ایسا ہی وی آئی پی دوپہر کے وقت اپنی معمول کی نیند لے رہا تھا۔ اس نے اپنے بیگ کو تکیے کے طور پر اپنے سر کے نیچے رکھا ہوا تھا۔ سوتے ہوئے جب اس نے اپنا سر ہلایا تو بیگ ایک جانب کھسک گیا۔ موتی نے خاموشی سے بیگ اٹھایا اور اسے کھولا تو وہ نوٹوں سے بھرا ہوا تھا۔ ناقابل یقین! وہاں کوئی اور شخص موجود نہ تھا۔ ہم بیگ لے کر اپنے کمرے میں آ گئے۔ تھوڑی دیر بعد اس کی آنکھ کھلی تو اس نے اپنا بیگ غائب پایا۔

اس نے ایک طوفان کھڑا کر دیا اور پاگلوں کی طرح ہر جگہ اپنا بیگ تلاش کرنے لگا۔ ہم نے آفس بوائے کے ذریعے اس آدمی کو اپنے پاس بلایا۔ جب وہ آیا تو ہم نے پوچھا کیا ہوا ہے؟ اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ اس نے بتایا کہ وہ بوگرا سے عوامی لیگ کا منتخب نمائندہ ہے اور جب وہ سو رہا تھا، کسی نے

اس کا بیگ چرالیا۔

''آپ کے بیگ میں کیا تھا؟''میں نے پوچھا۔

''کچھ اہم کاغذات اور ذاتی کپڑے۔''اس نے جواب دیا۔ وہ کافی ہوشیار آدمی تھا، اس نے رقم کا ذکر نہیں کیا تھا۔ اس دوران میں نور اور میں سارا معاملہ کرنل عثمانی کو بتا چکے تھے۔ تمام بات سننے کے بعد وہ ہمارے کمرے میں آ گئے۔ انہوں نے اس آدمی سے بات چیت کی لیکن اپنی ساری گفتگو میں اس نے رقم کے بارے میں کوئی بات نہ کی۔ پھر کرنل عثمانی نے نور کو بیگ واپس کرنے کا حکم دیا۔ نور گیا اور بیگ لے کر آیا اور اس کے مالک کو واپس کر دیا۔ وہ اپنا بیگ حاصل کر کے بہت خوش تھا۔ اس نے جلدی سے بیگ کھولا اور اس کے اندر جھانک کر دیکھا سوائے رقم کے اس کی ہر چیز موجود تھی۔ نور نے اس میں موجود چھے لاکھ روپے پہلے ہی نکال لیے تھے۔ وہ آدمی بری طرح سے بدحواس اور پریشان ہو گیا۔ لیکن صورتِ حال کو سمجھتے ہوئے اس نے ہمارا شکر ادا کیا اور واقعتاً بھاگ کر کمرے سے نکل گیا۔ یہ رقم بعد میں وزیر اعظم کے فنڈ میں جمع کروا دی گئی۔ وزیر اعظم کو بھی ساری بات سے آگاہ کر دیا گیا۔

میں نے یہاں اس واقعہ کا ذکر اس لیے مناسب خیال کیا ہے تا کہ قارئین کو مجیب نگر حکومت کے مرکز میں موجود ماحول کا علم ہو سکے جو اس انقلابی حکومت کا انعکاس تھا جس کی قیادت میں قوم آزادی کی جنگ لڑ رہی تھی۔ 58 بالی گنج میں جن لوگوں کا ہجوم رہتا تھا، ان کو دیکھ کر یہ تصور کرنا ناممکن تھا کہ قوم حالتِ جنگ میں ہے۔ یہ لوگ قوم کی تحریک آزادی کی قیادت کرنے والے رہنماؤں کی بجائے کسی شادی کی تقریب میں شامل براتیوں کی طرح نظر آتے تھے۔ یہ سب صحت منداور خوش باش نظر آتے تھے گویا کہ وہ وہاں چھٹیاں گزارنے آئے ہوں۔

کرنل عثمانی، لیفٹیننٹ نور، بریگیڈیئر گپتا، کرنل چیٹر جی، موتی اور میں 8 تھیٹر روڈ کا معائنہ کرنے کے لیے گئے۔ اس کا رقبہ بالی گنج کی نسبت بڑا تھا اور عمارت بھی بہت بڑی اور وسیع تھی جس کی چاروں جانب کھلا صحن تھا۔ عمارت کی چاروں طرف اونچی دیوار تھی۔ یہ نو آبادیاتی طرز کی عمارت تھی۔ اس کی ایک جانب دو بڑی بیرکیں تھیں۔ کھلی جگہ پر بھی عارضی چھپر یا خیمے نصب کیے جا سکتے تھے۔ اس میں بہت بڑے بڑے درخت تھے جو بڑا ٹھنڈا سایہ مہیا کر رہے تھے۔ باہر سے اس کے اندر دیکھنا ناممکن تھا۔

ہم سب نے اس جگہ کو بہت پسند اور مجیب نگر حکومت کے ہیڈ کوارٹرز کے لیے بہت موزوں خیال کیا۔ ہم اپنے سامان کے ساتھ 8 تھیٹر روڈ پر منتقل ہو گئے۔ کرنل عثمانی نے حفاظتی وجوہات کی بنا پر یہاں غیر ضروری افراد کے داخلے کو روکنے کے لیے مناسب انتظامات کرنے کا حکم دیا۔ باقاعدہ عملے کے لیے مستقل شناختی کارڈ جاری کرنے اور مہمانوں کے لیے نور کے دفتر سے عارضی پاس جاری کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس طرح غیر ضروری افراد کے داخلے کو روکا جا سکتا تھا۔ بی ایس ایف کے سنتریوں کو احکامات پر سختی سے عمل کرنے کا حکم دیا گیا۔ ہم اُس سکول سے تھیٹر روڈ پر منتقل ہو گئے جو چھٹیوں کے بعد اب کھلنے والا تھا۔ بڑی عمارت کے

ایک کمرے میں کرنل عثمانی نے رہائش کر لی اور اس کے ساتھ والا کمرہ نور کو رہائش کے لیے دے دیا گیا۔ دو کمروں کو وزیر اعظم کے لیے مختص کر دیا گیا۔ بیرکوں میں سے ایک بیرک میں گروپ کیپٹن کھنڈکر، کیپٹن چوہدری، کیپٹن صلاح الدین، لیفٹیننٹ موتی اور میں نے رہائش اختیار کر لی۔ چیف آف سٹاف کرنل رب نے بھی ہمارے ساتھ بیرک میں رہنے کا فیصلہ کیا۔ باقی ماندہ کمروں کو گورنمنٹ سیکریٹریٹ میں تبدیل کر دیا گیا۔ میس میں صرف وہاں مستقل مقیم عملے کے ارکان کے کھانے پینے کا بندوبست کیا گیا۔ سی این سی کے سیکریٹریٹ سے اس بارے میں ایک سرکولر جاری کر دیا گیا۔ آنے والے مہمانوں کے کھانے کے لیے اگر ضروری خیال کیا جائے تو پیشگی اجازت لینا ضروری قرار دیا گیا۔

اس قسم کی پابندیوں پر بہت سے لوگوں نے ناخوشی اور ناراضی کا اظہار کیا لیکن اس کی وجہ سے ماحول میں مجموعی طور پر سنجیدگی نظر آنے لگی۔ بتدریج لوگ اس کے عادی ہو گئے۔ اس کے نتیجے میں لوگوں کا ہجوم 19 سرکس ایونیو میں منتقل ہو گیا۔ حسین علی اور ان کی انتظامیہ اس قسم کی پابندیاں لاگو کرنے میں ناکام ہو گئی تھی، لہٰذا وہ جگہ چوبیس گھنٹے ایک پاگل خانے کا منظر پیش کر رہی ہوتی تھی۔ یہ ایک بہت ستم ظریفانہ اور طنزیہ پہلو تھا کہ بنگلہ دیش کی عبوری حکومت کے دونوں مقام تھیٹر روڈ اور سرکس ایونیو پر واقع تھے، لیکن یقیناً ہم سب کے سب سرکس یا تھیٹر کے مسخرے یا اداکار نہ تھے۔

55۔ کرنل عثمانی خود مجھے نمبر 8 سیکٹر لے کر گئے اور موتی شمال مغربی سیکٹروں کی جانب روانہ ہو گیا

ایک دن کرنل عثمانی نے مجھے اور نور کو ساتھ لیا اور ہم ''بون گاؤں'' میں سیکٹر 8 کے ہیڈکوارٹرز کی جانب روانہ ہو گئے۔ بون گاؤں کلکتہ سے تقریباً 70 یا 75 میل کے فاصلے پر جیسور کی سرحد پر واقع تھا۔ انہوں نے سیکٹر کمانڈر میجر عثمان اور سیکٹر 9 کے کمانڈر کیپٹن جلیل سے میرا تعارف کروایا اور ان دونوں کو میرے فرائض کے بارے میں بتایا۔ وہاں کیپٹن حفیظ، لیفٹیننٹ حلیم، کیپٹن ہدیٰ، کیپٹن صلاح الدین، پولیس اے ایس پی محبوب، اور سی ایس پی آفیسرز کمال صدیقی اور طفیل الٰہی چوہدری سے بھی میری ملاقات ہوئی۔ ان کے علاوہ کیپٹن محفوظ، لیفٹیننٹ ضیا الدین، لیفٹیننٹ شاہ جہان عمر اور لیفٹیننٹ محبوب سے بھی میرا تعارف ہوا۔ ان میں سے کچھ کو میں پہلے سے جانتا تھا۔ ان سب نے بڑے پُرجوش انداز میں مجھے خوش آمدید کہا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد کرنل عثمانی، نور کے ساتھ واپس ہیڈکوارٹرز چلے گئے۔ میں وہیں رہا۔ روانگی سے پہلے انہوں نے کہا کہ وہ بہت جلد کلکتہ میں مکتی فوج کے تمام کمانڈرز کا ایک اجلاس طلب کر رہے ہیں۔ اس اجلاس میں جدوجہد کی تازہ ترین صورتِ حال، مستقبل کی حکمت عملی اور دوسرے متعلقہ امور پر بات چیت کی جائے گی اور مستقبل کے لائحہ عمل کے بارے میں فیصلے کیے جائیں گے۔ میں نام نہاد مجیب نگر ہیڈکوارٹرز سے دُور حقیقی مجاہدین آزادی میں پہنچ کر بہت خوشی محسوس کر رہا تھا۔ میرے وہاں سے روانہ ہونے کے فوراً بعد لیفٹیننٹ موتی بھی

فوری طور پر شمالی مغربی سیکٹرز کی جانب روانہ ہو گیا تھا۔

اس طرح کھلنا جیسور سیکٹر میں ایک نئی زندگی کا آغاز ہوا۔ فوج سے بھاگے ہوئے کچھ افراد، ای پی آر کے سپاہیوں، انصار اور مجاہد کور کے ارکان اور پولیس سے بھاگے ہوئے افراد نے مل کر میجر عثمان کی قیادت میں، جنہوں نے ای پی آر کے ریجنل کمانڈر کے طور پر بغاوت کی تھی یہ سیکٹر تشکیل دیا تھا۔ نوریئل کے ایس ڈی او کمال صدیقی، مگورا کے ایس ڈی او ولی الرحمٰن اور مہر پور کے ایس ڈی او طفیل الٰہی چوہدری نے اپنے عملہ کے ساتھ بعد میں شمولیت اختیار کی تھی۔ مقامی سیاسی رہنماؤں اور طلبا نے بھی ان کی قیادت میں مزاحمتی تحریک میں شمولیت اختیار کر لی تھی۔ میجر عثمان نے ان تمام افراد کی مدد سے سات کمپنیاں قائم کی تھیں اور سرحد کے ساتھ ان کی صف بندی کر رکھی تھی۔ پہلی کمپنی شمال میں مہیش گند وبی او پی پر لیفٹیننٹ جہانگیر، دوسری کمپنی جنوب میں عیسیٰ کھلی بی او پی پر کیپٹن اعظم چوہدری، تیسری کمپنی مزید جنوب میں جیون نگر بی او پی کے ارد گرد کمانڈر کیپٹن مستفیض الرحمٰن، چوتھی کمپنی قاسم پور، مکندر پور بوبرا کے علاقہ میں کیپٹن کھنڈکر نجم الہدیٰ اور پانچویں کمپنی بیناپول کسٹم چیک پوائنٹ کے نزدیک لیفٹیننٹ حلیم کی زیرِ قیادت تعینات کی گئیں۔ پانچویں کمپنی بعد میں کیپٹن توفیق الٰہی چوہدری کی قیادت میں دے دی گئی۔ چھٹی کمپنی کیپٹن شفیع اللہ کی قیادت میں مزید جنوب میں بکشا، کاکڈانگا کے مقام پر اور ساتویں کمپنی بھومارا اور گوجاڈانگا کے مقام پر کیپٹن صلاح الدین کی زیر قیادت تعینات تھی۔ بعد میں کیپٹن صلاح الدین کو اپنی پوسٹ چھوڑ کر 8 تھیٹر روڈ پر سی این سی کے انٹیلی جنس نیٹ ورک قائم کرنے کے لیے ہیڈ کوارٹرز جانا پڑ گیا تو اس کمپنی کو اے ایس پی محبوب کی قیادت میں دے دیا گیا۔ مئی کے آخر میں سابقہ فلائٹ لیفٹیننٹ جمال الدین ایم پی، کیپٹن وہاب اور لیفٹیننٹ انعام الحق بھی سیکٹر 8 میں شامل ہو گئے۔ فلائٹ لیفٹیننٹ جمال الدین کو سیکٹر ہیڈ کوارٹرز میں سٹاف آفیسر کی ذمہ داری سونپی گئی۔

جیسور سیکٹر میں سب سے اہم واقعہ فرسٹ ایسٹ بنگال رجمنٹ کی کیپٹن حفیظ الدین احمد کی قیادت میں بغاوت تھا۔ فرسٹ ایسٹ بنگال رجمنٹ نے جیسور کینٹ میں پاک آرمی کے خلاف بغاوت کی تھی اور حملہ آور پاک آرمی کا گھیرا توڑ کر جواں مردی سے لڑتے ہوئے میجر عثمان کے سیکٹر میں شمولیت کے لیے سرحد عبور کر کے پہنچی تھی۔ جرأت مند اور نوجوان کیپٹن حفیظ صرف 188 زندہ سپاہیوں کے ساتھ سرحد تک پہنچنے میں کامیاب ہوا تھا۔ ''سینئر ٹائیگر'' کے اکثر سپاہی جنگ میں شہید ہو گئے تھے۔ کیپٹن حفیظ نے ''بون گاؤں'' کے سیکٹر ہیڈ کوارٹرز کے قریب اپنا کیمپ قائم کیا۔ بون گاؤں، بی او پی کے نزدیک ایک چھوٹا سا آزاد علاقہ قائم کیا گیا تھا جہاں آخر تک بنگلہ دیش کا جھنڈا لہراتا رہا اور حفیظ اور اس کے سپاہیوں نے بڑی دلیری اور جرأت کے ساتھ اس کی حفاظت کی۔ کیپٹن حفیظ میرا بہت اچھا دوست تھا، اس لیے میں نے اس کے کیمپ میں رہنے کا فیصلہ کیا۔ اسی طرح 25 مارچ کی رات کی کارروائی کے بعد اور ریڈیو پر میجر ضیاالرحمٰن کے اعلان کے بعد کیپٹن جلیل نے باریسال اور کھلنا میں مزاحمتی تحریک کو منظم کرنے کا پہلا قدم اٹھایا۔ لیفٹیننٹ ضیاالدین، لیفٹیننٹ مہدی، لیفٹیننٹ ناصر بھی ان کے ساتھ شامل ہو گئے۔ کیپٹن جلیل نچلے عہدوں سے ترقی کر کے اوپر آئے تھے

اور بعد میں ''آرمرڈ کور'' میں ایک آفیسر بن گئے۔ کیپٹن ہدیٰ، لیفٹیننٹ شاہ جہان عمر اور لیفٹیننٹ خورشید نے، جو مشہور اگرتلہ سازش کیس میں ملزم تھے، بھی ان کی مدد کی۔ بعد میں ایک نوجوان جس کا نام ایم اے بیگ تھا، بھی سیکٹر 9 میں شامل ہو گیا۔ اس نے پاکستان میں چھاتا بردار ٹروپس اور زیر آب غوطہ خور جنگ کی تربیت حاصل کر رکھی تھی، اور نیوی میں ''مڈشپ مین'' کے طور پر خدمات انجام دی ہوئی تھیں۔ سیکٹر 9 کھلنا کے ایک حصے، فرید پور کے ایک حصے اور پورے باریسال اور پٹوا کھلی پر مشتمل تھا۔ کیپٹن جلیل سیکٹر کمانڈر تھے۔

جنگ آزادی کے پہلے مرحلے میں باریسال اور پٹوا کھلی میں کیپٹن مہدی، کھولا، سندر بن میں لیفٹیننٹ ضیاالدین اور سرحدی علاقے میں کیپٹن ہدیٰ بڑی جرأت اور دلیری کے ساتھ پاک فوج سے نبرد آزما ہوئے۔ جولائی کے مہینے میں سیکٹر 9 کی تنظیم نو کی گئی۔ باریسال کو کیپٹن شاہ جہان عمر کی کمانڈ میں رکھا گیا۔ وہ بھی پاکستان سے فرار ہو کر یہاں پہنچے تھے۔ پٹوا کھلی کی ذمہ داریاں کیپٹن مہدی کو سونپی گئیں، کھولا اور سندر بن کا علاقہ لیفٹیننٹ ضیاالدین کے سپرد کیا گیا۔ صوبے دار تاج الاسلام کو پیروج پور باگرہات کی ذمہ داریاں سونپی گئی تھیں۔ کیپٹن ہدیٰ سرحدی علاقوں کے انچارج تھے۔ سیکٹر ہیڈکوارٹرز پہلے حسن آباد میں قائم کیا گیا تھا لیکن بعد میں تقی منتقل کر دیا گیا۔ کیپٹن جلیل ہیڈکوارٹرز میں ہی قیام رکھتے تھے۔ فلائٹ لیفٹیننٹ فضل الحق اور حفیظ ان کے سٹاف کے آفیسر کے طور پر خدمات انجام دے رہے تھے۔ ایک سٹاف آفیسر کیپٹن عارفین تھے۔ بڑا تربیتی کیمپ تقی پور میں تھا۔ صوبیدار مسٹر غلام اعظم کیمپ انچارج تھے۔ چیف پیٹی آفیسر ایم یو عالم نوال یونٹ کے انچارج تھے جو کہ سیکٹر 9 کے اندر تشکیل دیا گیا تھا۔ کیپٹن ضیاالدین کے بااعتماد معاون قلمیا اور مدھو تھے۔ مکتی باہنی کے ابتدائی کیمپ تقی، حسن آباد، ڈھنگل گنج اور شمشیر نگر میں قائم کیے گئے۔ بعد میں ڈھنگل گنج کے کیمپ کو ''اوکشا'' تک وسعت دے دی گئی۔

جنگ بتدریج پورے باریسال اور کھلنا میں پھیل گئی۔ کیپٹن جلیل اور ان کے کمانڈران محدود ہتھیاروں کے ساتھ جو انہیں دستیاب تھے، نمٹنے میں مشکل محسوس کر رہے تھے۔ 24 اپریل کو باریسال سے ایک منتخب نمائندہ منجو کسی طرح سندر بن سے گزرتا ہو سرحد عبور کر کے ہندوستان پہنچنے میں کامیاب ہو گیا اور بی ایس ایف میں کچھ جان پہچان والے آفیسروں کی مدد سے اس نے کچھ چھوٹے ہتھیار اور گولہ بارود جمع کر کے کیپٹن جلیل کو پہنچا دیا۔ اس نے کیپٹن جلیل کو یہ بھی بتایا کہ اگر وہ خود ہندوستان جائیں اور ہندوستانی حکام کو بات چیت کے ذریعے قائل کر لیں تو وہ اسلحہ اور گولہ بارود کی ایک بڑی مقدار حاصل کر سکتے ہیں۔ منجو کے دوست متعلقہ ہندوستانی حکام سے ملاقات کا بندوبست کر سکتے ہیں۔ یہ بات سننے کے بعد کیپٹن جلیل، منجو اور کیپٹن ہدیٰ کے ساتھ ہندوستان گئے۔ سرحد کے پار بی ایس ایف کے انسپکٹر پی کے گھوس نے ان کا استقبال کیا۔ سرحد سے انہیں ڈھنگل گنج لے جایا گیا۔ یہاں وہ کمانڈنگ آفیسر پانڈے سے ملے۔ وہاں سے انہیں حسن آباد سے گزار کر باراک پور لے جایا گیا۔ بی ایس ایف کی فرسٹ بٹالین کے کمانڈنگ آفیسر مکھرجی وہاں ان سے ملاقات کے لیے منتظر تھے۔ حسن آباد میں انہوں نے منجو کے ایک دوست کیپٹن بسرام سنگھ سے بھی ملاقات کی۔ 72

بٹالین کے ایجوٹنٹ کیپٹن سرکار نے بی ایس ایف آفیسرز میس میں ان کی رہائش کا بندوبست کیا۔ مکھرجی انہیں لے کر کلکتہ گئے اور ان کا تعارف اپنے اعلیٰ کمانڈر بی ایس ایف کے ڈپٹی انسپکٹر جنرل موجمدار سے کروایا۔

کیپٹن جلیل نے موجمدار کو بتایا کہ اگر انہیں کچھ مزید اسلحہ اور گولہ بارود مل جائے تو سیکٹر کے کمانڈر کے طور پر وہ بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ جس ساز وسامان کی انہیں ضرورت تھی اس کی ایک فہرست انہیں پیش کی گئی۔ اسی شام کو آسام ہاؤس میں بی ایس ایف کے چیف رستم جی سے ان کی ملاقات کا بندوبست کیا گیا۔ وہاں سے مکھرجی ان کو مشرقی کمانڈ کے ہیڈ کوارٹرز فورٹ ولیم میں لے کر گئے۔ وہاں فوج کی انٹیلی جینس برانچ کے کرنل کھیرا نے ان سے پوچھ گچھ کی۔ یہ پوچھ گچھ ایک مکمل تفتیش کی صورت میں تھی۔ ان کی اپنی ذات کے بارے میں اور آزادی کی جدوجہد کے بارے میں بڑی تفصیل سے سوالات کیے گئے۔ کرنل کھیرا نے پورا اطمینان کرنے کے بعد مشرقی کمانڈ کے کمانڈر جنرل اروڑا سے ان کی ملاقات کا بندوبست کیا۔ کیپٹن جلیل نے جنرل اروڑا کو تفصیل کے ساتھ اپنی صف بندی اور آپریشنل منصوبے کے بارے میں بتایا۔ ہر بات سننے کے بعد جنرل اروڑا، کیپٹن جلیل کو اسلحہ اور گولہ بارود دینے پر رضامند ہو گئے۔ وہ 5 مئی تک کلکتہ میں ہی رہے۔ اس دوران میں باریسال پر پاکستان آرمی نے قبضہ کر لیا۔ منجو، کیپٹن ہدیٰ اور ناصر کو فوری طور پر اپنے بیوی بچوں کو حسن آباد لانے کے لیے واپس جانا پڑ گیا۔ اپنے خاندانوں کو حسن آباد چھوڑ کر کیپٹن ہدیٰ، ناصر اور کیپٹن جلیل ہندوستانی اسلحہ کے ساتھ دو لانچوں میں باریسال کی جانب روانہ ہو گئے۔ ان کی غلط عسکری چال کی وجہ سے وہ راستے میں گھات لگا کر بیٹھی ہوئی پاکستانی فوج کے ہاتھ لگ گئے۔ اس گھات میں بہت سے مجاہدین آزادی شہید ہو گئے۔ کیپٹن جلیل اور کچھ دوسرے لوگ بہ مشکل اپنی جانیں بچا کر حسن آباد واپس پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔

کرنل عثمانی اور عبوری حکومت نے اس واقعہ پر اپنے شدید تحفظات کا اظہار کیا۔ وہ نہ صرف پریشان تھے بلکہ کیپٹن جلیل اور دوسرے افراد پر شدید ناراض بھی تھے کہ انہوں نے مجیب نگر ہیڈ کوارٹرز کو نظر انداز کرتے ہوئے ہندوستانی انٹیلی جینس اور مشرقی کمانڈ سے براہِ راست تعلق قائم کرنے کی کوشش کی تھی۔ جس طور پر کیپٹن جلیل نے اسلحہ اور بارود بنگلہ دیش کے اندر لے جانے کی کوشش کی تھی، اس پر کرنل عثمانی خاص طور پر شدید ناراض تھے۔ ان کے خیال میں یہ قدم انتہائی بے پروائی اور مکمل غلط منصوبہ بندی کے تحت اٹھایا گیا تھا۔ کیپٹن جلیل کو سیکٹر کمانڈر کے عہدے سے ہٹانے کا فیصلہ کر لیا گیا تھا۔ لیکن تقریباً تمام کمانڈروں نے کرنل عثمانی سے کیپٹن جلیل جیسے ایک مقبول کمانڈر کو اس کے عہدے سے ہٹانے جیسا سخت ترین قدم نہ اٹھانے کی درخواست کی۔ انہوں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ اس قسم کا فیصلہ مجاہدین کے جذبوں اور حوصلوں پر منفی اثرات مرتب کر سکتا ہے۔ ہم سب کے دباؤ کے نتیجے میں کرنل عثمانی نے آخر کار اپنا فیصلہ تبدیل کر دیا لیکن کیپٹن جلیل کی اس ناکام مہم پر ان کی شدید سرزنش کی گئی۔ عوامی لیگ کی عبوری حکومت کا ایک حصہ اور ہندوستانی حکام فیصلے میں اس تبدیلی پر بہت ناخوش تھے۔

56۔ مصروف ترین وقت اور سیکٹر میں ایک منفرد تجربہ

میں اپنے کام کا چارج لے چکا تھا اور کرشن نگر اور تقی کے درمیان ایک بگولے کی مانند چکر لگا رہا تھا۔ میری ذمہ داری نوجوانوں اور پناہ گزین کیمپوں سے بھرتی لینا اور ان کی تربیت کے لیے بندوبست کرنا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ مجھے سیکٹر اور سب سیکٹر کے کمانڈروں کو ان کے مجاہدین آزادی کی گوریلا جنگ اور طور طریقوں میں تربیت کے لیے مدد فراہم کرنا ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ میں فرسٹ ایسٹ بنگال رجمنٹ کی تنظیم نو میں کیپٹن حفیظ کی مدد بھی کر رہا تھا۔ جون کے وسط تک میں نے دس ہزار گوریلے بھرتی کر لیے۔ انہیں 200 سے 500 کے دستوں میں چکولیا تربیت کے لیے بھجوا دیا گیا۔ ان کی تربیت کا دورانیہ چھے سے آٹھ ہفتے کا تھا۔ ہم نے اپنے مقامی وسائل کے اندر رہتے ہوئے سیکٹروں میں بھی چند تربیتی کیمپ قائم کر دیے تھے۔ ان کے لیے انسٹرکٹرز سابقہ باقاعدہ یونٹوں کے ارکان میں سے بھرتی کیے گئے۔ وہ گوریلوں کو چھوٹے ہتھیاروں کے استعمال، گرنیڈوں، تباہ کن حملوں، اچانک حملوں، گھات لگانے، نہتے مقابلوں، نقشے پڑھنے، آبادیوں اور جنگلوں میں جنگ کے طریقوں اور دشمن کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کرنے کی تربیت دیتے تھے۔ عارضی فائرنگ رینج میں فائرنگ کی تربیت بھی دی جاتی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ گوریلوں میں تحریک پیدا کرنے کے لیے خصوصی کلاسوں کا اجرا بھی کیا گیا۔

میرے خیال میں یہاں اپنے کچھ غیر معمولی تجربات کو بیان کرنا بے جا نہ ہوگا۔ جنگ کے کل دورانیے میں تقریباً ایک لاکھ گوریلوں کو تربیت دی گئی۔ پناہ گزینوں کے کیمپوں میں پناہ لینے والوں میں زیادہ تر کا تعلق ہندو اقلیت سے تھا۔ ان میں سے بہت ہی کم تعداد نے تربیت حاصل کرنے اور جنگ میں حصہ لینے کے لیے دلچسپی کا اظہار کیا۔ پناہ حاصل کرنے کے لیے سرحد عبور کر کے آنے والوں میں زیادہ تر خاندانوں کی صورت میں آئے تھے اور کیمپوں میں اکٹھے رہ رہے تھے۔ ان کو ان کیمپوں میں دو وقت پیٹ بھر کر روٹی مل جاتی تھی۔ اکثریت ایسے لوگوں کی تھی جن کا اب بنگلہ دیش میں ایسا کوئی بھی نہ تھا جس کی انہیں فکر ہوتی۔ وہ ان پناہ گزین کیمپوں میں بالکل محفوظ تھے۔ انہیں جنگ سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ مزید برآں انہیں یہ جاننے میں بھی کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ محاذِ جنگ پر کیا ہو رہا ہے، فتح کس طرح حاصل کی جائے گی اور آزادی کی اس جنگ میں انہیں کیسی مدد یا قربانیاں دینی چاہئیں۔ شاید اکثریت کی سوچ یہ تھی کہ یہ گندا کام کسی اور کو کرنے دیا جائے اور انہیں اپنے گھروں میں واپس جانے کے لیے اُس وقت کا انتظار کرنا چاہیے جب یہ سب کچھ ختم ہو جائے گا اور آزادی حاصل کر لی جائے گی۔ ان میں سے اکثر پناہ گزینوں کے مغربی بنگال اور ہندوستان کے دوسرے حصوں میں رشتہ دار پہلے سے موجود تھے جو اچھے خاصے خوش حال تھے۔ بوڑھے افراد نے اپنے نوجوان بچوں کو سرحد سے دور اپنے رشتہ داروں کے ہاں بھجوا دیا تھا تاکہ انہیں بھرتی کے لیے طلب نہ کیا جا سکے۔ وہ اپنے رشتہ داروں کی مدد سے ان کے لیے کسی چھوٹے موٹے کاروبار یا ملازمتوں کی تلاش کو ترجیح دیتے تھے۔ اس قسم کی

موقع پرستی ان پناہ گزینوں میں عام تھی، جو اپنی جانیں بچانے کے لیے سرحد عبور کر کے آئے تھے۔نو جوان جو کیمپوں میں رہ رہے تھے، وہ مجبوری کے تحت ایسا کرنے کو تیار ہوتے تھے، ان کا اپنا انتخاب نہیں ہوتا تھا۔ آزادی کی جدوجہد میں ان کا حصہ برائے نام ہی تھا۔ پناہ گزین کیمپوں میں بمشکل ہی کوئی اہل نو جوان نظر آتا تھا۔ یہ زیادہ تر بوڑھے افراد اور چھوٹے بچوں سے بھرے ہوئے تھے۔

یوتھ کیمپوں میں منظر نامہ بالکل مختلف تھا جو طلبا اور ہر طبقہ زندگی سے تعلق رکھنے والے نو جوان آدمیوں سے بھرے ہوئے تھے۔ وہاں یہ ہزار ہا تعداد میں تھے۔ بہت سے نو جوانوں کو واپس جانا پڑا کیوں کہ انہیں کیمپوں میں داخل ہونے سے روک دیا جاتا تھا۔ اکثر نو جوان اپنے خاندان، اپنے پیاروں، اور رشتہ داروں کو پیچھے چھوڑ کر گوریلوں کے طور پر بھرتی ہونے کے لیے آتے تھے۔ وہ جرأت، اعلیٰ جذبات اور حب الوطنی کے جذبے سے سرشار ہوتے تھے۔ وہ تمام تر خطرات مول لے کر محض مجاہدین آزادی کے طور پر بھرتی ہونے کے لیے آتے تھے تا کہ بنیادی تربیت حاصل کرنے کے بعد اسلحہ کے ساتھ واپس جا کر اپنی مادرِ وطن کو قابض قوتوں کے چنگل سے آزاد کروا سکیں۔ وہ ہر قسم کے مصائب جھیلتے تھے اور محض بھرتی ہونے کی توقع لیے ہوئے کئی کئی دن بھوکے پیاسے، بغیر کسی سائبان اور خوراک کے گزار دیتے تھے۔ ان کے حوصلے ان تمام غیر انسانی مصائب کے سامنے پست نہیں ہوئے تھے۔ میں ان کی چمکتی ہوئی آنکھوں میں انتقام کے لیے ایک عزم اور ان کی گفتگو میں مقصد کے ساتھ وابستگی کو محسوس کر سکتا تھا۔ میں یہ کہنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتا کہ آزادی کی جدوجہد میں ان لوگوں کا حصہ اور قربانیاں، جو تمام تر دھمکیوں، خوف اور بے یقینی کا سامنا کرتے ہوئے بنگلہ دیش کے اندر رہے، کسی طور پر بھی کم نہیں تھیں بلکہ یہ ان لوگوں سے کئی گنا زیادہ تھیں جو وہاں سے بھاگ کر پناہ گزیں کیمپوں کی محفوظ جنت میں پہنچے تھے۔ ان میں سے کئی ایک نے درحقیقت عظیم قربانیاں دی تھیں۔

57۔ بھارتی حکومت اور ایجنسیوں کا کھیل

مشرقی کمانڈ اور انٹیلی جنس ایجنسیوں کے ساتھ کیپٹن جلیل کے خفیہ تعلق سے ایک بات واضح ہو چکی تھی کہ ہندوستانی حکام نہ صرف محض عبوری حکومت کے ذریعے کام کر رہے تھے بلکہ بڑی ہوشیاری کے ساتھ مجاہدین آزادی کے نچلے طبقات میں بھی گھسنے کی کوششیں کر رہے تھے تا کہ وہ ''تقسیم کرو اور حکومت کرو'' کی صدیوں پرانی حکمت عملی کو استعمال کرتے ہوئے عبوری حکومت پر دباؤ ڈال سکیں۔ دوسری جانب وہ تاج الدین احمد اور کرنل عثمانی کے درمیان غلط فہمیاں پیدا کرنے کی بھی کوششیں جاری رکھے ہوئے تھے تا کہ مؤخرالذکر کی کمانڈر انچیف کے طور پر حیثیت کو ضعف پہنچایا جا سکے۔ مزید برآں ہندوستانی انٹیلی جنس کی جانب سے کامیاب اور مقبول کمانڈروں کے ساتھ براہ راست تعلق استوار کرنے کی کوششیں بھی کی جا رہی تھیں تا کہ ان کو اپنا فرماں بردار بنایا جا سکے۔ جیسے جیسے یہ طرزِ عمل افشا ہونا شروع ہوا، کرنل عثمانی اس شیطانی سازش کو بہتر طور پر

سمجھنے لگے۔ اس کے نتیجے میں انہوں نے اپنی پوری طاقت کے ساتھ قوم دشمن اقدامات کی مزاحمت کرنا شروع کر دی۔ بہت سے مواقع پر جب کچھ اہم فیصلے کیے جانے ہوتے تو ہندوستانی حکام اور عوامی لیگ کی حکومت انہیں نظر انداز کر دیتی تھی۔ یہ سب کچھ تھا، جو پوری جنگ آزادی کے دوران تسلسل سے جاری رہا۔

کرنل عثمانی کی پوزیشن بڑی واضح تھی۔ ہندوستان کی حکومت خود اپنے بیان کے مطابق بنگالیوں کی انسانی بنیادوں پر مدد کر رہی تھی، للہذا انہیں ہمیشہ شکر گزار رہنا ہوگا۔ لیکن آزادی کی جدوجہد یقیناً آٹھ کروڑ بنگالیوں کی اپنی جدوجہد تھی۔ یہ ان پر چھوڑ دینا چاہیے کہ وہ اپنے طور پر منظم ہوں، لڑیں اور خود اپنی قربانیوں کے ذریعے آزادی حاصل کریں۔ یعنی جنگ کی تمام تر ذمہ داری صرف مکتی فوج کی کمانڈ اور عبوری حکومت کے کندھوں پر تھی۔ کرنل عثمانی نے اس اصول پر کبھی سمجھوتہ نہیں کیا تھا۔ عبوری حکومت کے رہنماؤں سے ان کے بہت سے تلخ جھگڑے بھی ہوئے۔ بدقسمتی سے عوامی لیگ کے اکثر رہنماؤں اور منتخب نمائندوں نے ان کے مؤقف کی کبھی حمایت نہیں کی تھی۔ وہ اپنا اپنا حلقہ اثر مضبوط کرنے میں مصروف تھے، ان کے درمیان ایک عجیب مقابلہ جاری تھا۔ نہ صرف سیاستدان بلکہ بہت سے بیوروکریٹس اور کچھ جنگ آزادی لڑنے والے کمانڈروں کا بھی یہی مسئلہ تھا۔ جب مزاحمت کی تحریک شروع ہوگئی تو پورے مشرقی پاکستان سے مفاد پرستوں کی ایک کثیر تعداد نے بے شمار دولت لوٹی اور سرحد پار کر کے ہندوستان کی محفوظ جنت میں پہنچ گئے۔ ان نام نہاد رہنماؤں کی اکثریت جنگ میں عملی حصہ لینے میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتی تھی اور نہ ہی وہ اس جنگ میں قیادت مہیا کرنے کے قابل تھے۔ وہ کسی قسم کا خطرہ مول لینے یا کوئی قربانی دینے پر ہرگز تیار نہ تھے۔ جنگ آزادی کے ایک سپاہی کی حیثیت سے مجھے ان نام نہاد رہنماؤں کے اصل چہرے دکھاتے ہوئے افسوس ہوتا ہے۔ معروف دانشور اور اعلیٰ حکومتی عہدیدار جو سرحد عبور کر کے ہندوستان پہنچے تھے، وہ جنگ آزادی کے بارے میں کھلم کھلا شکوک وشبہات کا اظہار کر رہے تھے۔ وہ آزدی کی جدوجہد اور ان قربانیوں کے بارے میں، جو ہمارے دلیر مجاہدین آزادی پیش کر رہے تھے، شرم ناک طور پر منفی نقطہ نظر اور رویہ رکھتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ بنگالی مجاہدین آزادی کبھی بھی پاکستان کی فوج کو شکست نہیں دے سکتے اور نہ ہی آزادی حاصل کر سکتے ہیں۔

یہ وہ لوگ تھے جو ہماری جدوجہد میں ہندوستانی فوج کی براہ راست مداخلت کے حق میں دلائل دیتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ہندوستانی فوج کو براہ راست شامل ہونا چاہیے اور بنگلہ دیش کو آزاد کرانا چاہیے تاکہ وہ ہندوستان میں اپنے ''حج'' کے بعد مختصر ترین ممکنہ وقت میں اپنا اقتدار بحال کر سکیں اور اس دولت سے مستفید ہو سکیں، جو انہوں نے لوٹ مار کے ذریعے اکٹھی کی تھی۔

''حاجیوں'' کے طور پر آزاد بنگلہ دیش میں اپنی حیثیت کو دوبارہ بحال کرنے کے بارے میں وہ بہت پرامید تھے۔ اپنی اس سوچ کے مطابق انہوں نے ابتدا ہی سے ہندوستانی اقتدار کی غلام گردشوں میں اور مختلف حلقوں میں ایک منظم مہم کا آغاز کر دیا تھا۔ اعلیٰ قیادت کی سطح پر صرف دو شخص کرنل عثمانی اور کھنڈکر مشتاق احمد ایسے تھے جنہوں نے ہر سطح پر پورے عزم کے ساتھ اس شیطانی مہم کی مخالفت کی۔ ان دونوں کے علاوہ

باقی تمام لوگ جلد یا بدیر ہندوستان کی براہِ راست مداخلت کے حق میں وکالت کر رہے تھے۔ یہ وہ افراد تھے جو بڑی حد تک بنگلہ دیش کی آپریشن کے ذریعے وقت سے پہلے پیدائش کے ذمہ دار تھے۔ تاہم مجاہدین آزادی کی اکثریت اور سول سروس کا نوجوان طبقہ اور باضمیر محبِ وطن افراد ایسی کسی بھی آزادی کے خلاف تھے جو بھیک میں ملے۔ اس مسئلے پر محبِ وطن افراد اور مفاد پرست عناصر کے درمیان اختلافِ رائے روز بہ روز بڑھتا چلا جا رہا تھا۔

58۔ ایک آفت ناگہانی

اس دوران، آخر کار کرنل عثمانی نے 8 جولائی کو تھیٹر روڈ پر کمانڈروں کا اجلاس طلب کر لیا۔ اس اجلاس سے تھوڑا پہلے ایک نہایت اہم واقعہ وقوع پذیر ہوا۔ ایک دن کابینہ کے اجلاس میں کرنل عثمانی پھٹ پڑے۔ انہوں نے وزیراعظم کو صاف صاف الفاظ میں بتایا کہ اگر ہندوستانی حکام، فوج اور انٹیلی جنیس ایجنسیوں نے جنگ آزادی میں اپنی غیر واجب مداخلت جاری رکھی تو وہ دکھلاوے کا کمانڈر انچیف رہنے سے انکار کر دیں گے اور اپنے عہدے سے مستعفی ہونے کا سوچیں گے۔

انہوں نے وزیراعظم سے براہِ راست سوال کیا، ''یہ کس کی جنگ ہے؟ اگر یہ ہندوستان کی جنگ ہے تو پھر ہماری حیثیت ان کے ہاتھوں میں محض مہروں جیسی ہے، جو آئندہ کے بنگلہ دیش کا دارالحکومت اسلام آباد سے نیو دہلی منتقل کرنے میں ان کی مدد کر رہے ہیں۔'' اس طرح پھٹ پڑنے کے بعد انہوں نے وزیر اعظم کو اپنا استعفیٰ پیش کیا اور باہر نکل گئے۔ وہاں موجود ہر آدمی ان کے اس اچانک قدم پر بھونچکا رہ گیا۔ وزیراعظم اور ان کے دوسرے ساتھی گھبراہٹ کا شکار ہو گئے۔ پورے تھیٹر روڈ میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی۔ ہم سب، جو وہاں موجود تھے، جوش میں آ چکے تھے۔ ماحول کی گرمی کو محسوس کرتے ہوئے چند منٹوں کے اندر اندر تمام وزرا اور رہنما خدشات کے پیش نظر تھیٹر روڈ سے نکل گئے۔

ان مجاہدین آزادی کی طرف سے جو وہاں ہیڈ کوارٹرز میں موجود تھے میں اور نور وزیراعظم کے پاس اپنے جذبات پہنچانے کے لیے گئے۔ ہم نے انہیں بتایا: ''سر، وزیراعظم کے طور پر آپ کسی بھی طریقے سے کرنل عثمانی کو اپنا استعفیٰ واپس لینے پر راضی کریں۔ اگر آپ ایسا کرنے میں ناکام رہتے ہیں تو پھر عن قریب ہونے والے کمانڈوروں کے اجلاس کا نتیجہ خود بھی اچھی طرح جانتے ہیں۔ ہم آپ کو صرف اتنا بتانا چاہتے ہیں کہ جب تک آخری مجاہدِ آزادی بھی زندہ ہے، کسی بھی شخص کو کرنل عثمانی کو نیچا دکھانے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ یہ کسی بھی صورت میں برداشت نہیں کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ ان کا نقطہ نظر درست ہے۔ آپ خود کہہ چکے ہیں کہ آپ بی ایل ایف (مجیب باہنی) کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ اس سے پہلے آپ یہ بھی کہہ چکے ہیں کہ آپ نے اس فیصلے کو واپس لینے کی سرتوڑ کوشش کی تھی لیکن ناکام رہے تھے اور اس لیے آپ کے پاس فیصلے کو تسلیم کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔ آپ کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ اپنے شیطانی منصوبے

کے جال کو بتدریج مزید پھیلاتے جا رہے ہیں۔ ہم مجاہدین آزادی ہندوستانی تسلط میں ایک دم گھٹا ہوا ایک بیمار بنگلہ دیش حاصل کرنے کے حق میں نہیں ہیں۔ ہم نے حقیقی آزادی حاصل کرنے کا عہد کر رکھا ہے۔ اگر دنیا کی دوسری اقوام اپنی آزادی حاصل کرنے کے لیے دس پندرہ اور بیس سال تک لڑ سکتی ہیں اور قربانیاں پیش کر سکتی ہیں تو پھر کیوں ہم خود لڑنے اور قربانیاں دینے پر تیار نہیں ہیں۔ بہت سی دوسری اقوام نے بھی اپنی جدوجہد کے لیے دوست ممالک سے مدد اور حمایت حاصل کی ہے لیکن انہوں نے اپنے آپ کو بیچا نہیں۔ وزیراعظم کے طور پر آپ کی ذمہ داری ہے کہ ہر معاملہ کا احتیاط کے ساتھ جائزہ لیں اور قومی مفادات کے تحفظ کے لیے مناسب اقدامات کریں۔ آپ کو اس قدر بے لوث اور جرأت مند ہونا چاہیے کہ ہر قیمت پر قومی مفاد کو بلند رکھ سکیں۔ اگر آپ دیانت داری، خلوص اور پختگی سے آگے بڑھنے کا فیصلہ کرتے ہیں تو پھر سر آپ یقین کر سکتے ہیں کہ اس جدوجہد میں تنہا نہیں ہوں گے، ہم جیسے بے شمار لوگ آپ کے گرد ہوں گے۔"

وزیراعظم نے ہماری بات بڑے غور سے سنی اور آخر میں کہا: "میں ایسا ہی کروں گا جیسا کہ آپ نے مشورہ دیا ہے۔"

ہم نے انہیں یہ یقین بھی دلایا کہ کرنل کو ٹھنڈا کرنے میں جو کچھ ہم سے ممکن ہو سکا ہم کریں گے۔ جب ہم وزیراعظم کے کمرے سے باہر نکلے تو ایک بڑی پکی افواہ پہلے ہی پھیل چکی تھی کہ کرنل عثمانی اور مجیب نگر حکومت کے درمیان بڑا شدید اختلاف رائے پیدا ہو چکا تھا۔ یہ افواہ بھی پھیلی ہوئی تھی کہ کرنل عثمانی نے مکتی فوج کے سی این سی کے طور پر وزیراعظم سمیت جن کو پہلے ہی حراست میں لے لیا گیا تھا، پوری کابینہ کو گرفتار کرنے کا حکم دے دیا تھا اور یہ کہ کابینہ کے کچھ ممبران کسی نہ کسی طرح تھیٹر روڈ سے فرار ہو چکے تھے۔ ایسی افواہیں پھیلا کر عوامی لیگ محض اپنی کمزوریاں عیاں کر رہی تھی۔

اجلاس کا وقت تیزی سے نزدیک آ رہا تھا۔ بہت سے کمانڈر پہلے ہی کلکتہ پہنچ چکے تھے۔ ہم اب بھی کرنل عثمانی پر اپنا استعفیٰ واپس لینے کے لیے اصرار کر رہے تھے۔ وہ تمام لوگ جو ان کو اچھی طرح جانتے تھے، کہہ رہے تھے کہ وہ انتہائی پختہ اصولوں والے انسان ہیں اور اُن کو قائل کرنا بہت مشکل کام ہے۔ وہ خوددار اور غیرت مند انسان تھے۔ کوئی بھی شخص ان کو اصولوں پر سمجھوتہ کرنے پر تیار نہیں کر سکتا تھا۔ بہر طور وہ نور اور میرے ساتھ بہت محبت رکھتے تھے، اس لیے ہم ان کے ساتھ بے تکلفانہ بات کر سکتے تھے۔ جواباً بعض اوقات ہمیں اُن سے بزرگانہ ڈانٹ ڈپٹ بھی سننی پڑ جاتی تھی۔ اس جگہ میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ ان کے آخری دنوں تک جو محبت اور عقیدت میں ان کے لیے رکھتا تھا، وہ الفاظ میں بیان نہیں کی جا سکتی۔ میں ان کی محبت بھری یادوں کو، جب تک میں زندہ ہوں، بہت عزت و احترام کے ساتھ اپنے دل میں محفوظ رکھوں گا۔ جب تک میں ملازمت میں رہا، اور ملازمت کے بعد بھی میں اور نور بہت سے ذاتی اور قومی معاملات پر ان کے ساتھ بڑے کھلے اور بے دھڑک انداز میں تبادلہ خیال کرتے رہتے تھے۔ ان کے اور ہمارے درمیان مکمل اعتماد کی فضا پائی جاتی تھی۔ میں جب ان کی محبت بھری اور پرشفقت نصیحتوں کو یاد کرتا ہوں جو انہوں نے گاہے بہ گاہے مختلف

معاملات بشمول میرے ذاتی معاملات پر مجھے دیں تو میرا دل بوجھل سا ہو جاتا ہے۔ بہر طور کرنل عثمانی ایک عظیم ہیرو اور کٹر قوم پرست انسان تھے، وہ اب ہمارے ساتھ نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی روح کو جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ مجھے فخر ہے کہ مجھے دھرتی کے اس عظیم سپوت کو نہ صرف ظاہری طور پر بلکہ دل کی گہرائیوں سے جاننے کا موقع ملا۔ اپنی ظاہری صورت میں وہ ایک مغرور اور اکھڑ انسان نظر آتے تھے لیکن اندر سے وہ منکسر المزاج اور شفیق انسان تھے۔

کرنل عثمانی واضح طور پر کچھ بھی نہیں کہہ رہے تھے کہ آیا وہ اپنا استعفیٰ واپس لیں گے یا نہیں۔ ہم سب بہت پریشانی کے عالم میں تھے۔ اس قسم کی غیر یقینی صورتِ حال میں 11 جولائی 1971ء کو تھیٹر روڈ پر اعلیٰ سطح کی کمانڈرز کانفرنس شروع ہو گئی۔ میں بویراسب سیکٹر میں ایک کارروائی کے دوران پہلی مرتبہ زخمی ہوا تھا۔ دشمن کی ایک گولی نے میرے دائیں ہاتھ کی درمیانی انگلی کو زخمی کر دیا تھا۔ میں اس کارروائی میں محض اللہ تعالیٰ کی رحمت کی وجہ سے موت کے بہت قریب سے گزر کر بچ نکلا تھا۔ میں نے بندھے ہوئے بازو کے ساتھ سیکٹر میں آگے پیچھے جاتے ہوئے اپنا معمول کا کام جاری رکھا تھا۔ زخم کی مکمل احتیاط نہیں کی جا سکی تھی، اس لیے یہ بہت خراب ہو گیا تھا۔ کچھ دوسری بھاری ذمہ داریوں اور اس بے موقع زخم کی وجہ سے میں چند دن کے لیے تھیٹر روڈ پر نہیں جا سکا تھا، لیکن میں نے نور کے ساتھ قریبی رابطہ رکھا ہوا تھا۔ اگرچہ اس وقت تک سی این سی ہیڈ کوارٹرز اور سیکٹروں کے درمیان مواصلات کے انتظامات معیار کے مطابق نہیں تھے، تاہم میں نے ایک وائرلیس سیٹ کا انتظام کر لیا تھا جس نے مجھے سیکٹروں، سب سیکٹروں اور 8 تھیٹر روڈ کے ساتھ رابطے میں رکھا ہوا تھا۔

تمام کمانڈرز اجلاس میں شرکت کے لیے بروقت پہنچ چکے تھے۔ گیارہ کی صبح کو اچانک لیفٹیننٹ نور آیا اور مجھے بتایا کہ کرنل عثمانی اجلاس میں شریک نہیں ہوئے کیوں کہ ابھی تک انہیں وزیر اعظم کی طرف سے کوئی مناسب جواب نہیں ملا تھا۔ ان حالات میں انہوں نے اجلاس میں شرکت کو توہین آمیز خیال کیا تھا۔ اس کے علاوہ وہاں آنے والے کمانڈرز ان سے ان کے استعفیٰ کے بارے میں سوال کر سکتے تھے جس کا ایک واضح جواب ضروری تھا۔ اس نے مزید بتایا کہ کرنل عثمانی اپنا آخری قدم اٹھانے سے پہلے وزیر اعظم کے حتمی ردِ عمل کا انتظار کر رہے ہیں۔ لیفٹیننٹ نور نے مجھے یہ بات اپنے تک ہی محدود رکھنے کی درخواست کی۔ ہم وزیر اعظم کے دوغلے پن کے بارے میں شک میں مبتلا ہو گئے۔ وہ کسی مقصد کے پیچھے تھے۔ ہمیں ان کے کھیل کو سمجھنے کے لیے انتظار کرنے کی ضرورت تھی۔

59۔ کمانڈرز کے اجلاس میں کرنل عثمانی کی غیر موجودگی

اجلاس مقررہ وقت پر شروع ہو گیا۔ ہم سب وہاں حاضر تھے۔ تاج الدین وزیر اعظم کی حیثیت سے آئے تھے۔ انہیں مہمانِ خصوصی کے طور پر بلایا گیا تھا اور کرنل عثمانی نے سی این سی کی حیثیت سے افتتاحی خطاب کرنا تھا لیکن وہ وہاں موجود نہیں تھے۔ انہوں نے پیغام بھجوایا تھا کہ بعض وجوہات کی بنا پر وہ اجلاس میں

شامل ہونے سے قاصر ہیں۔ یہ خبر ہم پر ایک بم کی طرح گری تھی۔ مکتی باہنی کے کمانڈر انچیف کے طور پر اور اس اجلاس کے کنوینئر کی حیثیت سے ان کی شمولیت لازمی تھی۔ اس پیغام نے اجلاس میں ایک بے چینی اور اضطراب کی کیفیت پیدا کر دی۔ تاہم وزیراعظم نے صورتِ حال کو قابو کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اپنی تقریر شروع کر دی، جس میں انہوں نے کہا کہ کرنل عثمانی نے استعفیٰ دے دیا ہے کیوں کہ کمانڈروں نے ان پر عدم اعتماد کا اظہار کیا تھا۔ وہاں موجود ہر شخص کو وزیراعظم کے اس بیان پر ایک جھٹکا سا محسوس ہوا۔ اگلے ہی لمحے وہاں ایک جذباتی طوفان اور ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ کچھ نے یہاں تک کہہ دیا کہ یہ ساری بات ناقابلِ یقین ہے، جو مجیب نگر کی عوامی لیگ حکومت اور ہندوستانی حکام نے مکتی فوج کے کمانڈر انچیف کی حیثیت سے کرنل عثمانی سے پیچھا چھڑوانے کے لیے گھڑی ہے۔ بہت سے کمانڈروں نے مطالبہ کیا کہ وزیراعظم کو لازمی بتانا ہو گا کہ انہیں کیسے پتا چلا ہے کہ سی این سی کے طور پر کمانڈرز کرنل عثمانی پر اعتماد نہیں کرتے۔ اس قسم کے مضطرب اور پر جوش ماحول میں وزیراعظم نے چند الفاظ بولے اور اپنے آپ کو مزید پریشانی سے بچانے کے لیے فوری طور پر ہال سے باہر نکل گئے۔ اس کے بعد اجلاس کی کارروائی کو یہیں روک دینے کا فیصلہ کیا گیا۔

60۔ ٹائیں ٹائیں فش کے بعد اجلاس دوبارہ شروع ہو گیا

کرنل عثمانی کی تمام لوگ عزت کرتے تھے، پھر اس صورتِ حال میں وزیراعظم کیسے ایسی بات کر سکتے تھے۔ جب تک اس راز سے پردہ نہیں اٹھایا جاتا اور ان کمانڈروں کے نام نہیں بتائے جاتے جنہوں نے وزیراعظم اور حکومت کو یہ بتایا تھا کہ وہ کرنل عثمانی پر اعتماد نہیں رکھتے، اجلاس التوا میں رکھنے کا فیصلہ کیا گیا۔ پورا تھیٹر روڈ جذباتی جوش اور تناؤ کا شکار تھا۔ لیفٹیننٹ نور اور میں نے میجر ضیا الرحمٰن، کیپٹن جلیل، میجر خالد مشرف، ونگ کمانڈر بشیر، کیپٹن طاہر اور چند دوسرے افراد کو کرنل عثمانی کے استعفیٰ کے بارے میں حقائق سے آگاہ کیا۔ یہ بات سب پر واضح ہو چکی تھی کہ مجیب نگر کی حکومت اور ہندوستانی حکام کرنل عثمانی کو اپنے راستے میں ایک رکاوٹ خیال کرتے تھے، لہٰذا وہ بڑی ہوشیاری کے ساتھ ان کے استعفیٰ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ہم نے انہیں دہلی میں اپنے تجربات اور بی ایل ایف (مجیب باہنی) کے قیام کے بارے میں بھی پوری طرح آگاہ کیا۔ ہم نے ان پر واضح کیا کہ ہمیں ہر صورت میں کرنل عثمانی کو سی این سی کے طور پر بحال رکھنا ہو گا ورنہ اس "شیطانی منصوبے کے خلاف مزاحمت تقریباً ناممکن ہو جائے گی اور قوم کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ وہ تمام اس بات پر متفق ہو گئے اور تمام کمانڈروں کی جانب سے کرنل عثمانی سے ملاقات کرنے اور انہیں استعفیٰ واپس لینے کی درخواست کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ انہیں یہ بھی یقین دلانے کا پروگرام بنایا گیا کہ ایسے تمام ضروری انتظامات کیے جائیں گے تاکہ وہ باعزت طور پر اپنا استعفیٰ واپس لے سکیں۔

ایک ملاقات کا انتظام کیا گیا جس میں کرنل عثمانی نے وہی بات دہرائی جس کا اظہار وہ پہلے بھی کر

چکے تھے۔ان کے الفاظ نے سازش کواور بھی زیادہ واضح کردیا۔ان کی تمام باتیں سننے کے بعد کمانڈروں نے ان پر اپنے عہدے پر برقرار رہنے کے لیے زور دیا تا کہ ایسے سازشی اقدامات کے برخلاف قومی مفاد کا تحفظ کیا جاسکے۔انہوں نے تمام مجاہدین آزادی کی جانب سے اُن کی مکمل فرماں برداری کا یقین دلایا اور درخواست کی کہ صرف وہی مکتی فوج کو متحد رکھ سکتے ہیں اور چٹان جیسے اتحاد کے بغیر سازشیوں کا راستہ روکنا ناممکن ہوگا۔اس قسم کے اصرار کے بعد آخر کار کرنل عثمانی اپنا استعفیٰ واپس لینے پر رضامند ہو گئے۔کرنل عثمانی سے ملاقات کے بعد ہم سب سیدھے تاج الدین اور نورالاسلام کے پاس پہنچ گئے۔ان دونوں نے اکٹھے ہم سے ملاقات کی۔

وہ ہمارا سامنا کرتے ہوئے پریشانی محسوس کر رہے تھے، تاج الدین صبح کے وقت جنگ آزادی لڑنے والے کمانڈروں کا ناراضی سے بھرپور ردِّعمل دیکھ کر پہلے ہی پریشان تھے۔ہم جاننا چاہتے تھے کہ کن بنیادوں پر وزیراعظم نے یہ کہا تھا کہ کمانڈرز، کرنل عثمانی پر اعتماد نہیں رکھتے۔

تاج الدین الفاظ تلاش کرتے رہے اور پھر کہنے لگے،" مجھے اپنے ذاتی ذرائع سے معلوم ہوا تھا کہ کچھ کمانڈر سی این سی کے طور پر کرنل عثمانی سے خوش نہیں ہیں۔"

میجر ضیاالرحمٰن نے وزیراعظم کو جواب دیا،" جناب وزیراعظم، ہم تمام کمانڈروں اور مکتی باہنی کی جانب سے آپ کو واضح الفاظ میں بتانا چاہتے ہیں کہ نہ صرف یہ کہ ہم سی این سی کے طور پر کرنل عثمانی پر مکمل اعتماد رکھتے ہیں بلکہ وہ مکتی باہنی کی تمام صفوں میں بہت زیادہ عزت واحترام سے دیکھے جاتے ہیں۔اگر آپ ان کو سی این سی کے عہدے سے ہٹانے اور ان کی جگہ کسی اور کا تقرر کرنے کا سوچ رہے ہیں تو پھر میں بلا کسی شک وشبہ کے یہ بات آپ کے گوش گزار کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کا ایسا کوئی بھی انتخاب مجاہدین آزادی کی بھاری اکثریت کو قبول نہ ہوگا۔عبوری حکومت کے سربراہ کے طور پر آپ کو کسی بھی شخص کو سی این سی نامزد کرنے کا اختیار حاصل ہے۔لیکن برائے مہربانی کوئی بھی فیصلہ کرنے سے قبل احتیاط کے ساتھ سوچ سمجھ کر فیصلہ کریں۔"

میجر ضیا کی اس سیدھی اور صاف گفتگو نے تاج الدین اور نذرالاسلام دونوں کو پریشان کردیا تھا۔ تاج الدین نے تھوڑی دیر تک سوچا اور پھر کہا:" ٹھیک ہے، کرنل عثمانی نے خود استعفیٰ دیا تھا اگر وہ اسے واپس لیتے ہیں تو حکومت کو کوئی اعتراض نہ ہوگا۔"

جب وزیراعظم نے بات ختم کی تو میجر ضیاالرحمٰن نے دوبارہ کہا،" یہ درست ہے کہ انہوں نے خود استعفیٰ دیا تھا۔لیکن صبح 9 بجے جو وجوہات بیان کی گئی تھیں، ہم سمجھتے ہیں کہ وہ درست نہیں تھیں۔تاہم ہم ان سے بھی پوچھیں گے کہ انہوں نے استعفیٰ کیوں دیا تھا؟ لیکن، سر ہم آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ برائے مہربانی کل کے اجلاس میں اعلان فرمائیں کہ عدم اعتماد کے بارے میں جو اطلاعات آپ تک پہنچی تھیں، وہ بعد میں بے بنیاد اور غلط ثابت ہوئیں۔نہ صرف یہ بلکہ جیسا کہ آپ جانتے ہیں، تمام کمانڈرز اور مجاہدین آزادی کسی اور کو نہیں صرف کرنل عثمانی کو اپنا سی این سی دیکھنا چاہتے ہیں، للہذا آپ کو وزیراعظم کی حیثیت سے کرنل

عثمانی کو ہماری جانب سے استعفیٰ واپس لینے کی درخواست کرنا ہوگی۔ اس بند گلی سے نکلنے کا یہ سب سے بہتر طریقہ ہے۔ ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ اگر اس قسم کی رسائی اختیار کی جائے تو وہ اپنا استعفیٰ واپس لے لیں گے۔"

ہماری اس ساری گفتگو سے تاج الدین ایک ذہین شخص ہونے کے ناتے لازمی طور پر سمجھ چکے تھے کہ ہمیں پہلے ہی تمام تفصیلات کا علم ہو چکا ہے۔ وہ یہ بھی سمجھ گئے تھے کہ اس مسئلے پر ہم پس پردہ کھیل سے پوری طرح آگاہ ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا وہ مسئلے پر مزید اڑا رہنا نہیں چاہتے تھے اور جو کچھ ہم نے کہا تھا، اس پر عمل کرنے کو تیار ہو گئے۔ اس ساری ملاقات کے دوران قائم مقام صدر نذر الاسلام خاموش تماشائی کی طرح بیٹھے رہے۔ اس ملاقات کی پوری تفصیل لیفٹیننٹ نور کے ذریعے کرنل عثمانی کو پہنچا دی گئی تھی۔ اگلے دن وزیر اعظم نے اپنے الفاظ پر عمل کیا اور کرنل عثمانی نے تالیوں اور نعرہ ہائے تحسین کی گونج میں اپنا استعفیٰ واپس لے لیا اور اجلاس کی صدارت کرنے کا فیصلہ کیا۔ ہم سب نے تہ دل سے ان کا شکریہ ادا کیا اور مبارک باد پیش کی۔ ہم نے چانکیوں کی شیطانی سازش کو کامیابی سے ناکام بنا دیا تھا۔ انہیں اپنے محبوب سی این سی کے طور پر قائم رکھنے میں کامیاب رہے تھے اور ان کے فخر کو سرفراز رکھا، جس کے وہ حق دار تھے۔

اس مقابلے سے عوامی لیگ کی حکومت سمجھ گئی تھی کہ جرأت مند مجاہدین آزادی کسی بھی ناجائز اور قوم دشمن چال کو خاموشی سے قبول نہیں کریں گے۔ اجلاس میں جنگ کے مختلف پہلوؤں، مسائل اور ان کے حل، مستقبل کی حکمت عملی اور جنگی چالوں کے بارے میں بحث ہوئی۔ ہم کرنل عثمانی کے خیالات سے پہلے ہی آگاہ تھے۔ بحث ان کے نظریات اور منصوبوں کو مدنظر رکھ کر کی گئی۔ اس کانفرنس میں لیفٹیننٹ کرنل ایم اے رب اور گروپ کیپٹن اے کے کھنڈکر کو بالترتیب چیف آف سٹاف اور ڈپٹی چیف آف سٹاف مقرر کیا گیا۔

دو اہم فیصلے جو کیے گئے وہ یہ تھے:

1۔ سیکٹروں کی حد بندیاں

2۔ آئندہ کی پالیسی اور گوریلا جنگ کی حکمت عملی کے بارے میں درج ذیل فیصلے کیے گئے:

(الف) سیکٹروں میں تربیت دینے کے بعد 5 سے 10 گوریلوں کے گروپ واضح ذمہ داریوں کے ساتھ ملک کے اندر بھیجے جائیں گے۔

(ب) گوریلوں کی مندرجہ ذیل درجہ بندیاں کی جائیں گی۔

ایکشن گروپ: یہ گوریلے دشمن پر براہِ راست حملے کریں گے اور 50 سے 100 فی صد مسلح ہوں گے۔

انٹیلی جینس گروپ: یہ گروپس مجیب نگر میں سی این سی سیکریٹریٹ کی انٹیلی جینس کمانڈ کے تحت کام کریں گے۔ ان میں سے کوئی گروپ بھی دشمن سے براہِ راست متصادم نہیں ہوگا۔ ان کا کام صرف دشمن کے بارے میں معلومات اکٹھا کرنا ہوگا۔ یہ 30 سے 50 فی صد سے زائد ہتھیار اپنے ساتھ نہیں رکھیں گے۔

گوریلا مراکز: ہر مرکز کے قیام اور انتظام و انصرام کی ذمہ داری سیکٹر ٹروپس کے ذمہ ہوگی۔ قیام اور طعام کی

سہولتیں مرکز میں مہیا ہوں گی۔ بنیادی طبی امداد مہیا کرنے کے لیے ہر مرکز میں ایک میڈیکل ٹیم ہوگی۔ ہر سیکٹر میں سیاسی ترغیب وتحریک پیدا کرنے کے لیے ایک کومیسر (وہ افسر جس کے ذمہ نظریاتی تربیت کرنا ہو) مقرر کیا جائے گا۔ جو انہیں ایسے طور طریقے سکھائے گا جس سے دشمن کے حوصلے کو پست کیا جا سکے اور انہیں نفسیاتی طور پر کمزور کیا جا سکے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ کومیسر گوریلوں کے حوصلوں کو بلند رکھے گا اور ان میں خود اعتمادی کو فروغ دے گا۔ مراکز میں اضافی فوج کو رکھنے کے لیے بھی بندوبست ہونا چاہیے جو کسی خاص کارروائی کے لیے بھیجی جا سکتی ہے۔ کومیسروں کی تقرری مجیب نگر حکومت کی ذمہ داری خیال کی گئی تھی، لیکن جنگ کے خاتمے تک حکومت کی جانب سے کوئی بھی کومیسر نہیں بھیجا گیا تھا۔ سیکٹر اور سب سیکٹر کمانڈروں کو یہ خلا خود پورا کرنا پڑا تھا۔

3۔ باقاعدہ افواج کے ممبران کو بٹالینوں اور سیکٹر دستوں میں منظم کیا جائے گا۔

4۔ گوریلا جنگ کے اہداف:

(الف) دشمن کے ساتھ تمام سمتوں سے لڑنے کے لیے بنگلہ دیش کے اندر انتہائی موزوں طریقوں اور راستوں سے گوریلوں کی ایک بڑی تعداد کو داخل کرنے کے انتظامات کرنا ہوں گے۔

(ب) کسی بھی صنعت کو چلنے نہیں دیا جائے گا۔ پاور سٹیشنوں، سب سٹیشنوں اور برقی تنصیبات کو تباہ کرنا ہوگا۔

(ج) کسی بھی قسم کے خام مال یا تیار شدہ اشیاء کی برآمد کو مکمل طور پر روکنا ہوگا۔ تمام گوداموں کو تباہ کرنا ہوگا۔

(د) تمام قسم کے ذرائع مواصلات اور ذرائع آمدورفت مثلاً سڑکیں، ریلوے لائنیں، دریائی ذرائع آمدورفت اور ریل وغیرہ تباہ کرنا ہوں گے تاکہ دشمن رسد کی لائن کو قائم نہ رکھ سکے۔

(ہ) جنگی حکمت عملی کو اس طرح سے ترتیب دیا جانا چاہیے کہ دشمن مختلف علاقوں میں گھر کر رہ جائے۔

(و) گوریلا دستوں کو لوگوں میں اس طرح سے گھل مل کر رہنے کی تربیت دی جائے جس طرح مچھلی پانی میں رہتی ہے، اور دشمن کو نیست ونابود کرنے کے لیے ہر طرف سے اس پر حملے کیے جانے چاہئیں۔

(ز) پورے میدانِ جنگ کو گیارہ سیکٹروں میں تقسیم کیا گیا تھا اور ہر سیکٹر کو مزید سب سیکٹروں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ ہر سیکٹر میں ایک سیکٹر کمانڈر اور سیکٹر ہیڈ کوارٹرز تھا۔

سیکٹر نمبر 1: یہ سیکٹر چٹاگانگ، پہاڑی علاقوں اور دریائے فین کے مشرقی کنارے تک نواکھلی کے کچھ حصے پر مشتمل تھا۔ اس سیکٹر کو 5 سب سیکٹرز میں تقسیم کیا گیا۔ میجر ضیاالرحمٰن کو سیکٹر کمانڈر مقرر کیا گیا تھا۔ بعد میں جب میجر ضیا کو زیڈ فورس کا کمانڈر بنا دیا گیا تو سیکٹر کمانڈ کیپٹن رفیق کو سونپ دی گئی۔ فوجیوں کی کل تعداد 2100 تھی۔ ان میں 1500 ای پی آر، 200 پولیس، 300 فوج سے اور 100 ایئر فورس اور نیوی سے تھے۔ گوریلوں کی کل تعداد بیس ہزار تھی۔ ان میں سے 8 ہزار کو ایکشن گروپس میں منظم کیا گیا تھا۔ ان گروپس میں سے 35

فیصد مسلح تھے۔

سیکٹر نمبر 2: یہ سیکٹر کومیلا، فرید پور، نواکھلی اور ڈھاکہ کے کچھ حصے پر مشتمل تھا۔ سیکٹر کمانڈر خالد مشرف تھے۔ یہ سیکٹر 6 سب سیکٹروں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ فوجیوں کی تعداد تقریباً 4 ہزار تھی۔ گوریلا فورس تقریباً 30 ہزار تھی بعد میں جب میجر خالد مشرف ''K فورس'' کے کمانڈر کے طور پر شدید زخمی ہو گئے تو کیپٹن حیدر نے سیکٹر کمانڈر کے فرائض سنبھال لیے۔

سیکٹر نمبر 3: یہ سیکٹر مولوی بازار، برہمن باڑیا، نارائن گنج اور کیرانی گنج پر مشتمل تھا۔ اس سیکٹر کو 10 سب سیکٹروں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ گوریلوں کی تعداد دس ہزار تھی، اور سیکٹر کمانڈر میجر شفیع اللہ تھے۔ بعد میں میجر شفیع اللہ کو ''ایس فورس'' کا کمانڈر بنا دیا گیا تو میجر نذرالزمان سیکٹر کمانڈر مقرر ہوئے۔

سیکٹر نمبر 4: اس سیکٹر کی حدود شمال میں سلہٹ صدر اور جنوب میں ہوبی گنج تھیں۔ مشرقی سرحد کی جانب پتھاریا رینج بھی اس میں شامل تھی۔ اس کے سیکٹر کمانڈر میجر چِتا رنجن دتا تھے۔ یہ سیکٹر 6 سب سیکٹروں میں تقسیم کیا گیا۔ باقاعدہ فوج کی تعداد تین ہزار اور گوریلا فورس 12 ہزار تھی۔

سیکٹر نمبر 5: یہ سیکٹر سلہٹ ضلع کے شمالی حصوں پر مشتمل تھا۔ سیکٹر کمانڈر میجر شوکت علی تھے۔ باقاعدہ فوجیوں کی تعداد 8 سو تھی اور گوریلے پانچ ہزار تھے۔ یہ سیکٹر 6 سب سیکٹروں میں تقسیم کیا گیا۔

سیکٹر نمبر 6: یہ سیکٹر رنگ پور اور دیناج پور اضلاع پر مشتمل تھا۔ ونگ کموڈور ایم کے بشر سیکٹر کمانڈر تھے۔ یہ سیکٹر پانچ سب سیکٹروں میں منقسم تھا۔ باقاعدہ فوجیوں کی تعداد بارہ سو اور گوریلے چھ ہزار تھے۔

سیکٹر نمبر 7: یہ سیکٹر راج شاہی، پبنہ، بوگرا اور دیناج پور کے ایک حصے پر مشتمل تھا۔ سیکٹر کمانڈر میجر ناظم الحق تھے۔ وہ ایک ٹریفک حادثے میں جاں بحق ہو گئے اور میجر کیو این زمان نے ان کی جگہ کمانڈر کے فرائض سنبھال لیے۔ یہ سیکٹر 8 سب سیکٹروں میں تقسیم تھا۔ باقاعدہ فوجیوں کی تعداد 8 ہزار تھی اور گوریلے چار ہزار تھے۔

سیکٹر نمبر 8: یہ سیکٹر کشتیا، جیسور اور کھلنا کے ایک حصے پر مشتمل تھا۔ 15 جولائی تک سیکٹر کمانڈر میجر ایم اے عثمان چوہدری تھے۔ جب میجر منظور پاکستان سے فرار ہو کر آ گئے اور جنگ میں شرکت اختیار کی تو ان کو سیکٹر 8 کا کمانڈر بنا دیا گیا۔ بعد میں میجر عثمان کو سی این سی کے ہیڈکوارٹرز کے ساتھ منسلک کر دیا گیا۔ باقاعدہ فوج کی تعداد 3 ہزار اور گوریلوں کی تعداد 8 ہزار تھی۔ اسے 7 سب سیکٹروں میں تقسیم کیا گیا تھا۔

سیکٹر نمبر 9: باریسال، پٹواکھلی، اور کھلنا، فرید پور اور سندر بن کا ایک حصہ اس سیکٹر میں شامل تھے۔ سیکٹر کمانڈر کیپٹن ایم اے جلیل تھے۔ اس کے آٹھ سب سیکٹر تھے۔ باقاعدہ فوج پندرہ سو تھی اور گوریلا فورس 15 ہزار تھی۔

سیکٹر نمبر 10: اس سیکٹر کی کوئی جغرافیائی حدود نہیں تھیں۔ نیول کمانڈرز اس سیکٹر کے تحت تھے۔ انہیں ضرورت کے مطابق مختلف سیکٹروں میں دشمن کی بحری طاقت اور بحری جہازوں کو تباہ کرنے کے لیے گروپس کی صورت میں بھیجا جاتا تھا۔ یہ سیکٹر کمانڈروں کے تحت کارروائی کرتے تھے اور اپنے مخصوص مشن پورے کرنے کے بعد سیکٹر 10 میں واپس چلے جاتے تھے۔

سیکٹر نمبر 11: یہ بنگلہ دیش کے شمالی مغربی علاقوں پر مشتمل تھا۔ تورا اور گارو کی پہاڑیاں اس سیکٹر کو تشکیل دیتی تھیں۔ اس کے کمانڈر میجر ابو طاہر تھے۔ یہ مغربی پاکستان سے فرار ہو کر آئے تھے، جنہوں نے مصنف کے ساتھ کوئٹہ سے فرار ہونے کا منصوبہ تیار کیا تھا۔ 15 نومبر کو ایک کارروائی کے دوران وہ شدید زخمی ہو گئے اور ان کی دائیں ٹانگ ضائع ہو گئی۔ اس کے سب سیکٹروں کی تعداد 8 تھی اور گوریلا فورس 25 ہزار افراد پر مشتمل تھی۔

مجاہدین آزادی کو مندرجہ ذیل درجوں میں از سر نو منظم کرنے کا فیصلہ بھی کیا گیا تھا:

باقاعدہ فوجی: 25 اور 26 مارچ کی رات کی کارروائی کے بعد فوج، ای پی آر، پولیس، انصار، مجاہد کور کے تمام افراد، جنہوں نے بغاوت کر کے مزاحمتی جدوجہد میں شمولیت اختیار کی، انہیں باقاعدہ فوجیوں یا ''نیومیتو باہنی'' کا نام دیا گیا تھا۔

فوجی بٹالین اور زیڈ، ایس اور کے فورسز کی تشکیل: پانچ باقاعدہ ایسٹ بنگال رجمنٹوں کی دستیابی کے ساتھ بنگلہ دیش کی مرکزی فوج کے قیام کا بھی فیصلہ کیا گیا۔ ان میں سے اکثر بٹالین تعداد کی کمی کا شکار تھیں۔ لہٰذا ان رجمنٹوں کی افرادی قوت کو پورا کرنے کے لیے اور ساتھ ہی نئی انفنٹری بٹالینز کے قیام کے لیے مجاہدین آزادی میں سے اضافی بھرتی شروع کر دی گئی۔ پھر انہیں بریگیڈ گروپس زیڈ، ایس اور کے فورسز میں تقسیم کر دیا گیا۔

سیکٹر دستے: باقاعدہ فوجی جو سیکٹر میں رہتے اور لڑتے تھے، انہیں سیکٹر دستوں کا نام دیا گیا تھا۔ یہ زیادہ تر سب سیکٹر کمانڈروں، گوریلا کمانڈروں یا انسٹرکٹروں کے طور پر فرائض انجام دیتے تھے۔ اگرچہ مجیب نگر حکومت نے معمولی سے گزارا الاؤنس کا انتظام کیا تھا، تنخواہوں کا باقاعدہ اہتمام نہیں تھا۔ تاہم اکثر مجاہدین آزادی نے ایسے کسی بھی الاؤنس کو لینے سے انکار کر دیا تھا اور اس کی بجائے یہ رقوم وزیر اعظم کے ریلیف فنڈ میں عطیہ کر دی جاتی تھیں۔

بے ضابطہ دستے: نوجوان افراد جنہیں بھرتی کرنے کے بعد دشمن سے لڑنے کے لیے گوریلا تربیت دی گئی تھی، انہیں بے ضابطہ دستوں یا ''گونو باہنی'' کا نام دیا گیا تھا۔ ابتدا میں اس فوج میں ڈسپلن کی کمی تھی، لیکن ہمیں یقین تھا کہ مناسب تحریک اور گوریلا زندگی کی سختیاں ان کو ڈسپلنڈ اور مستعد بنا دیں گی۔ ان گوریلوں کو کچھ ''تقرری کی رقم'' دی جاتی تھی۔ بنگلہ دیش کے اندر انہیں اپنی گزر اوقات خود کرنی ہوتی تھی۔

کمانڈروں کو سی این سی سیکریٹریٹ کی جانب سے اپنی ضروریات کی فہرستیں تیار کرنے کو کہا گیا۔ ان فہرستوں میں ہتھیار، گولہ بارود، وائرلیس سیٹ، ٹیلی کمیونی کیشن کا ساز و سامان، قطب نما، دوربینیں، دھماکا خیز مواد اور دوسری ضروری اشیاء شامل تھیں۔ انہیں سی این سی سیکریٹریٹ میں مرتب کیا جاتا تھا اور عبوری حکومت کے توسط سے ان کی فراہمی کے انتظامات کے لیے ہندوستانی حکام کو پیش کر دیا جاتا تھا۔ اگرچہ ضروریات کے بارے میں بڑی باقاعدگی سے پوچھا جاتا تھا لیکن ان کی فراہمی کی صورتِ حال ہمیشہ افسوس ناک رہتی اور ضروریات کے مطابق کبھی نہیں ہوتی تھی۔ یہ کبھی بھی وقت پر نہیں ملتی تھیں اور ان کا معیار بھی گھٹیا ہوتا تھا۔ اس غیر یقینی صورتِ حال کے نتیجے میں ابتدا میں مجاہدین آزادی کو میدان جنگ میں بہت زیادہ

نقصان کا سامنا کرنا پڑا۔ جیسے جیسے افواج منظم ہو رہی تھیں کمانڈروں کو اپنے طور پر فراہمی کو یقینی بنانے کے لیے سخت محنت کرنا پڑتی تھی۔ فراہمی کا بڑا ذریعہ میدان جنگ سے ہاتھ لگنے والا ساز وسامان، ہتھیار اور گولہ بارود تھا۔ لہٰذا ہمیں قسم قسم کے ہتھیاروں اور ساز وسامان سے کام نکالنا پڑتا تھا۔ یہ اپنی جگہ ایک بڑا مسئلہ تھا۔ ٹرانسپورٹ کی نایابی ایک مسلسل مسئلہ تھا۔ ہماری زیادہ تر گاڑیاں بنگلہ دیش نے پکڑی ہوئی تھیں۔ ان گاڑیوں کی دیکھ بھال شروع میں ایک بہت بڑا مسئلہ تھا کیوں کہ ان کے سپیئر پارٹس میسر نہ تھے۔ تاہم بعد میں رسد کی فراہمی میں سیکٹروں اور سب سیکٹروں کے تحت کارروائی کرنے والے گوریلوں کے ذریعے قدرے بہتر ہو گئی۔ طبی سہولیات بہت کم تھیں۔ ہندوستانی حکومت کے اکثر ہسپتال میدان جنگ اور مراکز سے بہت دُور واقع تھے۔ مزید برآں پناہ گزینوں نے وہاں رش ڈال رکھا تھا۔

چنانچہ مجاہدین آزادی کے لیے مختلف مقامات پر چند فیلڈ ہسپتال قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ کمانڈروں نے اپنے اپنے آپریشنل علاقوں میں میڈیکل سینٹر بھی قائم کیے۔ سب سے بڑا فیلڈ ہسپتال سیکٹر 2 میں بسرام گنج میں قائم کیا گیا۔ ڈاکٹر ظفر اللہ، ڈاکٹر مبین اور ان کے چند ساتھی لندن سے آئے اور سیکٹر دستوں، میڈیکل طالب علموں اور کچھ دوسرے مقامی طور پر تربیت یافتہ ڈاکٹروں کی مدد سے یہ فیلڈ ہسپتال قائم کیا۔ ان کی کوششیں بہت شاندار تھیں۔ انہوں نے چند غیر ملکی خیراتی تنظیموں کے اور مختلف حلقوں سے مدد حاصل کرنے کا بندوبست کیا۔ بسرام گنج ہسپتال بہت جلد ایک بے لوث خدمت کی علامت بن گیا اور تمام لوگوں، خاص طور پر مجاہدین آزادی کے لیے اس ہسپتال نے شاندار خدمات انجام دیں۔

کمانڈرز مجیب نگر حکومت کو اپنی مشکلات اور مسائل سے آگاہ کرتے رہتے تھے۔ لیکن اکثر مسائل کو حل کرنے میں حکومت مکمل طور پر بے بس نظر آتی تھی اس لیے کمانڈروں کو اپنے مسائل خود حل کرنے کے لیے متبادل ذرائع تلاش کرنے پڑتے تھے۔ حکومت کم از کم ضروریات زندگی مثلاً خوراک، کپڑے اور رہائش مہیا کرنے میں بھی ناکام ہو چکی تھی۔ مجاہدین آزادی کو اپنی جدوجہد تھوڑی، بہت خوراک اور کم از کم ساز وسامان کے ساتھ جاری رکھنا پڑ رہی تھی۔ وہ بغیر کسی پشیمانی یا شکایت کے دشمن کے ساتھ ایک محاذ سے دوسرے محاذ پر شدید ترین صورتِ حال کا سامنا کرتے ہوئے لڑتے رہے۔ انہوں نے یہ تمام سختیاں برداشت کیں، اپنی زندگیاں نثار کیں اور زخمی افراد نے درد اور تکلیف کو برداشت کیا۔ وہ صرف ایک خوش حال اور خوددار آزاد بنگلہ دیش میں اپنی آزادی کی خاطر یہ سب کچھ برداشت کر رہے تھے۔

اجلاس میں کرنل عثمانی نے بتایا کہ بہت سے بنگالی آفیسر پاکستان اور دوسرے ممالک سے آزادی کی جنگ میں شامل ہونے کے لیے فرار ہونے کی کوششیں کر رہے ہیں۔ انہوں نے رسمی طور پر لیفٹیننٹ نور چوہدری، لیفٹیننٹ مطیع الرحمٰن اور میر امغربی پاکستان سے فرار ہو کر آزادی کی جنگ میں شریک ہونے والے آفیسرز کے پہلے بیج کے طور پر تعارف کروایا۔ ہمیں شرکا کی طرف سے زبردست خراجِ تحسین پیش کیا گیا۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ سیکریٹریٹ کی جانب سے فرار ہو کر جنگ میں شمولیت کے لیے فوج کے

دوسرے ممبران کی حوصلہ افزائی کی جا رہی ہے۔

مختلف پیش رفتوں کے بارے میں جان کر شرکائے اجلاس بہت خوش تھے اور انہوں نے کرنل عثمانی کا ان کے دلیرانہ اقدامات پر شکریہ ادا کیا۔ جولائی میں میجر منظور اور ان کا خاندان، کیپٹن طاہر، کیپٹن ضیاالدین، کیپٹن پٹواری اور دو دوسرے سپاہی فرار ہو کر آئے۔ انہوں نے سیالکوٹ بارڈر سے سرحد کو پار کیا تھا۔ ان کے بعد کیپٹن خیر الانعام، کیپٹن عبدالعزیز پاشا، کیپٹن شہریار راشد خان، لیفٹیننٹ بزل الہدیٰ، لیفٹیننٹ ساجد، کیپٹن فاروق الرحمٰن، کیپٹن عبدالرشید، کیپٹن جہانگیر، فلائٹ لیفٹیننٹ قادر اور بہت سے دوسرے لوگ آئے۔

61۔ ہم خیال کمانڈروں کے درمیان جدوجہد کے مختلف پہلوؤں اور ہندوستانی منصوبے کے بارے میں الگ الگ گفتگو ہوئی

اجلاس کے دوران ہمیں ہم خیال کمانڈروں اور کامریڈوں کے ساتھ اپنے اپنے تجربات اور ہندوستانی منصوبے کے بارے میں تبادلہ خیال کے مواقع میسر آئے۔ ہم نے میجر ضیا الرحمٰن، میجر خالد مشرف، کیپٹن طاہر، کیپٹن ضیاالدین، کیپٹن جلیل اور ونگ کموڈور بشر، لیفٹیننٹ بزل الہدیٰ، کیپٹن صلاح الدین، کیپٹن جہانگیر، کیپٹن حفیظ، میجر منظور، کیپٹن پاشا، کیپٹن شہریار، لیفٹیننٹ محبوب اور دیگر شرکا کے ساتھ طویل المدتی نتائج اور شیطانی منصوبے کے اثرات پر تبادلہ خیال کیا۔

تفصیلی بحث مباحثہ، جنگ کے مختلف پہلوؤں، عبوری حکومت کے رویے، پس پردہ ہندوستانی حکومت اور ایجنسیوں کی کارروائیوں اور ان کے در پردہ مقاصد کے باریک بین تجزیے کے بعد ہم اپنے مستقبل کے لائحہ عمل کے بارے میں ایک اتفاقِ رائے قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ ابتدائی مرحلے میں ہمیں ہندوستانی ساز باز اور مجیب نگر حکومت کی نااہلی کے بارے میں زیادہ باتیں نہیں کرنی چاہئیں، اس کی بجائے ہمیں ان کی سرگرمیوں کے بارے میں ہوشیار رہنا چاہیے اور جب ضروری ہو اپنی اطلاعات کا تبادلہ کرنا چاہیے۔ اس کے ساتھ ہی میں نے مجاہدین کی تنظیم نو کے دوران انہیں قوم پرستی کے نظریے کے تحت متحرک کرنے کا منصوبہ بنایا اور انہیں قوم کو غلامی کے شکنجے میں جکڑنے کے مکروہ منصوبے کے مختلف پہلوؤں سے آگاہ کرتے ہوئے اس کے خلاف جدوجہد کے لیے تیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ ہم نے انہیں یہ بتانا تھا کہ اس منصوبے کو ناکامی سے دوچار کرنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ ہم بغیر کسی بیرونی مداخلت کے محض اپنی ذاتی جدوجہد اور قربانیوں کے ذریعے آزادی حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ ہم محض دارالحکومت کو اسلام آباد سے دہلی منتقل کرنے کے لیے نہیں لڑ رہے۔ پاکستان کی قابض افواج کے ساتھ جنگ کرتے ہوئے مجاہدین آزادی کو کسی بھی قسم کی ہندوستانی بالادستی یا توسیع پرستی کے خلاف بھی لڑنے کے لیے تیار رہنا ہوگا۔ ہم آٹھ کروڑ بنگالیوں کے وطن عزیز کے لیے جنگ کر رہے ہیں جہاں ہم حقیقی سیاسی اور معاشی آزادی سے مستفید ہو سکیں۔

ہم ایک طفیلی ریاست کی حیثیت کو کبھی بھی قبول نہیں کر سکتے۔

اس لیے ہر کمانڈر کو اپنی اہلیت، شجاعت اور دلیری، تنظیمی ہنر، ذات کی قربانی، سیاسی دیانت داری، حب الوطنی، جنگی وابستگی، وقار اور اخلاقیات کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجاہدین آزادی اور آزاد کرائے گئے علاقوں کے عوام کے درمیان عزت واحترام کے حصول کے لیے جدو جہد کرنا چاہیے۔ ہم میں سے ہر ایک کو اپنے آپ کو ایک مثالی شخصیت کے طور پر پیش کرنا ہوگا۔ صرف یہی ایک طریقہ ہے جس کے ذریعے ہم مجاہدین آزادی اور عوام کے درمیان جنگ کے دوران اور جنگ کے بعد بھی ایک فطری رہنما کا مقام حاصل کر سکتے ہیں جو کہ کسی بھی منصوبے کے خلاف مزاحمت کے لیے ضروری ہے۔ ہمیں عوام کا اعتماد اور بھروسا حاصل کرنے کے لیے کام کرنا ہوگا۔ یہی ایک راستہ ہے جس پر چلتے ہوئے ہم عوام میں اپنی بنیادوں کو مضبوط بنا سکتے ہیں۔ اگر ہم کامیاب ہو جاتے ہیں تو پھر ہم مستقبل میں عوام کو کسی بھی ایسی قوت کے خلاف جدو جہد کے لیے تیار کر سکتے ہیں جو ہماری خودمختاری اور آزادی کو اور ہمارے قومی مفاد کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتی ہے۔ اس طرح سے منظم کیے گئے مجاہدین آزادی آئندہ مفاد پرست اور بدعنوان سیاستدانوں اور حکمران اشرافیہ کے خلاف بھی، اگر وہ قوم سے غداری کی کوشش کرتے ہیں، خلاف بھی ایک مؤثر قوت ثابت ہو سکتے ہیں۔

62۔ کمانڈرز اور مجاہدین آزادی کو خود ان پر چھوڑ دیا گیا تھا جیسا کہ ان پر مکمل اعتبار نہیں کیا جا رہا تھا

ایک چیز جس نے جنگ کے دوران مجھے حیرت میں ڈالے رکھا، وہ مجاہدین آزادی کا جذبہ تھا۔ میں نے ہزاروں نوجوانوں کو دیکھا جو ابھرتے ہوئے سورج کی کرنوں کی طرح، لمبی لمبی قطاروں میں، مجاہدین آزادی کے طور پر بھرتی ہونے کے لیے کئی کئی گھنٹے پورے عزم اور اعتماد کے ساتھ اپنی باری کے انتظار میں کھڑے رہتے۔ اکثر نوجوانوں کو ہمارے محدود وسائل اور مجبوری کی وجہ سے مایوس لوٹنا پڑتا لیکن وہ دوسرے دن دوبارہ پھر وہیں کھڑے ہوتے تھے۔ وہ یوتھ کیمپوں میں رضاکارانہ طور پر اعلیٰ ترین قربانیاں پیش کرنے کے لیے کئی کئی دن بڑے صبر کے ساتھ انتظار کرتے رہتے۔

جب کبھی میں وہاں جاتا وہ میرے گرد جمع ہو جاتے، وہ ایک ہی سوال کرتے کہ انہیں کب بھرتی ہونے اور تربیت حاصل کرنے کا موقع ملے گا اور وہ کب مجاہدین آزادی کے طور پر جنگ میں شامل ہو سکیں گے۔ قوم کی خاطر قربانی دینے کا ان کا جذبہ اور اشتیاق قابل فخر تھا۔ ان کے قربانی، عزم اور لگن کے جذبے کو دیکھ کر میں قائل ہو چکا تھا کہ بنگلہ دیش ضرور آزادی حاصل کر لے گا۔ ان کی یہ قربانیاں اللہ سبحانہٗ تعالیٰ رائیگاں نہیں جانے دے گا۔ کوئی بھی طاقت یا سازش اس نوجوان خون کو آزادی حاصل کرنے سے روکنے کے قابل نہیں ہو سکتی۔ آزادی کی جنگ میں شمولیت کی یہ خواہش اور جذبہ قوموں کی تاریخ میں شاذ ہی کہیں نظر آتا ہے۔ عوامی جمہوریہ چین، روس، انڈونیشیا، مشرقی یورپ کوئی بھی قوم اس قسم کے حیران کن اور بے لوث

جذبے کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ ان میں سے اکثر ممالک میں آزادی کی جنگ محتاط سیاسی اور فوجی تیاریوں کے بعد بڑی جنگوں کے ایک حصے کے طور پر لڑی گئی۔ لیکن بنگلہ دیش کے عوام خود بخود بغیر کسی قیادت یا تیاریوں کے مزاحمتی تحریک میں کود پڑے تھے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

اس منفرد تاریخ کو رقم کرنے میں مجاہدین آزادی کے علاوہ اور کوئی ہستی شامل نہ تھی۔ اگر کوئی طبقہ، پارٹی یا گروپ جنگ آزادی کا واحد چمپئن ہونے کا دعویٰ کرتا ہے تو یہ ایک سفید جھوٹ اور ایک ناجائز اور اشتعال انگیز جسارت ہوگی۔ ایک لمبے عرصے کے مسلسل سماجی، معاشی اور سیاسی استحصال نے بنگالی قوم کے قومی جذبات کو مہمیز دی تھی، جس نے آخر کار ایک نازک وقت میں انہیں جنگ آزادی کے آغاز کی جانب دھکیل دیا۔ قومی جبر واستبداد کے بندھنوں سے اپنے آپ کو آزاد کرنے کی خواہش اور جذبے نے نوجوانوں کو ہتھیار اٹھانے کی جرأت سے نوازا۔ اس کا سہرا مجموعی طور پر پوری قوم اور خاص طور پر مجاہدین آزادی کے سر ہے۔

اس وقت میں سیکٹر 4 میں گوریلا مشیر کے طور پر خدمات انجام دے رہا تھا۔ میں سیکٹر 8 اور سیکٹر 9 میں اپنی ذمہ داریاں نبھا کر ابھی یہاں پہنچا ہی تھا۔ گوریلا مشیر کے طور پر میری ذمہ داریوں میں سب سیکٹر اور سیکٹر کمانڈروں کے قریبی تعاون کے ساتھ گوریلوں کو بھرتی کرنا، تربیت دینا اور میدانِ جنگ میں ان کو فرائض سونپنا شامل تھا۔ یہ سارے انتہائی مشکل چیلنج تھے۔ مجھے دوران تربیت ان کی خوراک، رہائش اور دوسرے نقل وحمل کے مسائل بھی حل کرنا ہوتے تھے۔ ان کو متحرک کرنے، ازسرنو گروپ بندی کرنے اور ان کے مشن کے بارے میں ہدایات دینے کے لیے مجھے بعض اوقات ان کے نظریاتی رہنما کے فرائض بھی انجام دینا پڑتے تھے۔ مجھے ان کو مسلح کرنے اور ان کے لیے رقوم کی فراہمی کا بھی بندوبست کرنا پڑتا تھا۔ ہمیں ان گوریلا جنگجوؤں کو میدان جنگ میں بھیجنے سے پہلے دشمن کی تازہ ترین پوزیشن کو جاننے کے لیے اپنے انٹیلی جینس نیٹ ورک کو استعمال کرنا پڑتا تھا۔ گوریلوں کو ان کے مقررہ مقامات تک پہنچانے کے لیے تجربہ کار گائیڈوں کی تربیت کی گئی تھی۔ یہ گائیڈز زیادہ تر سمگلر تھے۔ وہ سرحد پار تک سمگلنگ کے تمام راستوں سے اپنی ہتھیلیوں کی لکیروں کی طرح آگاہ تھے۔ یہ گائیڈز گوریلوں کی اپنے مراکز تک محفوظ رسائی یقینی بناتے تھے۔ ہر ٹیم لیڈر گوریلا جتھے کا مجموعی انچارج ہوتا تھا۔ یہ ان کی سرگرمیوں کی مکمل تفصیلات تیار کرتا تھا جو سیکٹر ہیڈ کوارٹرز کو باقاعدگی سے پیغام بروں کے ذریعے پہنچائی جاتی تھیں۔ انہیں ''سچویشن رپورٹس'' کہا جاتا تھا۔

ہم بنگلہ دیش کے اندر واقع مراکز اور گوریلوں کے ساتھ وائرلیس یا پیغام رسانوں کے ذریعے مسلسل رابطے میں رہتے تھے۔ مشیر کے طور پر مجھے ان کی منصوبہ سازی اور ان کی اہم کارروائیوں میں رہنمائی مہیا کرنا ہوتی تھی۔ پیغامات خفیہ تحریر میں بھیجے جاتے تھے۔ بہت سے رضا کاروں، امن کمیٹی کے ممبران اور چیئرمینوں نے مواصلاتی نیٹ ورک قائم کرنے میں ہماری مدد کی۔ بہت سے لوگوں نے بلاواسطہ یا بالواسطہ گوریلا کارروائیوں میں مدد فراہم کی اور بہت سے لوگوں نے گوریلوں کو کھانے پینے، رہائش اور مالی امداد مہیا

کرنے میں تعاون کیا۔ لہٰذا یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ ان کمیٹیوں کے تمام چیئرمین، رضا کار اور پاکستان حکومت کے ساتھ کام کرنے والے افراد مجاہدین آزادی کے مخالف تھے۔ ان میں اکثر اپنی قابل قدر خدمات کی وجہ سے ستائش اور قدر افزائی کے حق دار ہیں۔

اس طرح ہماری سرگرمیاں روز بہ روز آگے سے آگے بڑھتی چلی جا رہی تھیں۔ جنگیں چوبیس گھنٹے لڑی جا رہی تھیں۔ یہ ایک بہت بڑا کام تھا، کسی بھی پہلو سے کسی بھی قسم کی کوتاہی انتہائی مہلک ثابت ہوسکتی تھی۔ اگرچہ مجیب نگر کا ہیڈکوارٹر اور عبوری حکومت ہماری ضروریات کو پورا کرنے کے ہمیشہ وعدہ کرتے لیکن مجاہدین آزادی کو حقیقی نتائج سے ہمیشہ مایوسی کا سامنا ہوتا تھا۔ عملاً اس کے برعکس کمانڈروں کو حکومت کی جانب سے محاذِ جنگ پر کارروائیوں میں شدت پیدا کرنے کے لیے دباؤ کا سامنا رہتا تھا۔ وہ مجیب نگر حکومت سے کسی قسم کی توقع رکھے بغیر محض اپنے ہی وسائل پر انحصار کرتے ہوئے یہ جنگ لڑ رہے تھے۔ ہر روز دُشمن کے بیسیوں فوجی ہلاک یا زخمی ہو رہے تھے۔ اُن کی فیکٹریاں تباہ ہو چکی تھیں، بجلی بند ہوگئی تھی اور مواصلاتی رابطے منقطع ہو چکے تھے۔ گوریلا کارروائیوں کے ذریعے ان کے ذرائع اور طاقت کمزور کرتے ہوئے انہیں بھاری نقصان پہنچایا جا رہا تھا۔ لیکن انتہائی افسوس ناک پہلو یہ تھا کہ مجیب نگر میں قابض نام نہاد قیادت ان مجاہدین آزادی کی کامیابیوں اور قربانیوں کی کسی قسم کی قدر افزائی نہیں کر رہی تھی بلکہ اس کی بجائے ان کی کامیابیوں کو ناپید کرنے کے لیے ناقابل بیان کوششیں کی جا رہی تھیں۔ اس وجہ سے مجاہدین آزادی ہیڈکوارٹرز اور حکومت کی جانب سردمہری کا مظاہرہ کرنے لگے۔ وہ لوگ جو تمام تر خطرات مول لیتے ہوئے دشوار گزار پہاڑیوں، جنگلات اور دُشمن کے دفاعی حصاروں کو عبور کر کے جنگ لڑ رہے تھے، بعض پہلوؤں سے حکومت کی نظروں میں مشکوک تصور کیے جا رہے تھے۔ وہ یوتھ کیمپوں میں بغیر کسی سائبان کے دنوں اور مہینوں سے بھوکے پیاسے پڑے تھے اور ان کا کوئی پرسان حال نہ تھا۔ بہت سے افراد وباؤں اور دوسری بیماریوں کے ہاتھوں زندگی کی بازی ہار رہے تھے اور اپنے حسین خوابوں کی تعبیر کو دیکھنے کے لیے زندگی کے ناتے کو جوڑے رکھنا ان کے لیے محال ہو رہا تھا۔ ان میں سے اکثر لوگوں کی قربانیوں کو آج کے دن تک بھی تسلیم نہیں کیا گیا اور انہیں گمنامی کے سایوں میں دفن کر دیا گیا ہے۔ مجیب نگر حکومت سے جڑے ہوئے وی آئی پیز وزارتوں اور سیکریٹریٹ میں میدانِ جنگ سے سینکڑوں میل کی دوری پر اپنے اہم منصب ہندوستانیوں کو خوش کرنے میں مصروف تھے۔ ان کی جدوجہد محض اپنی حیثیتوں اور مستقبل کے فوائد سمیٹنے کی منصوبہ بندی تک محدود تھی۔ ان میں سے اکثر اپنی توانائیاں ہندوستانی حکام کی چاپلوسی اور خوشامد میں صرف کر رہے تھے کیوں کہ اُن میں اعتماد کا فقدان تھا اور وہ پوری طرح اس بات کے قائل تھے کہ مجاہدین آزادی ہندوستانی فوج کی مداخلت کے بغیر کبھی آزادی حاصل نہیں کر سکتے۔

اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑی مارنے والے اس رویے نے محلاتی سازشوں میں مزید اضافہ کر دیا۔ اس قسم کے غیر یقینی حالات میں کمانڈروں نے کبھی بھی اپنے حوصلے پست نہیں ہونے دیئے اور پورے استحکام اور استقلال کے ساتھ جنگ لڑتے رہے۔ وہ اپنے مقصد اور اپنے مجاہدین آزادی کے ساتھ مخلص تھے، لہٰذا وہ اپنے

فرائض سے کسی صورت بھی پہلوتہی نہیں کر سکتے تھے۔ مجیب نگر کے رہنما اپنی ذمہ داریوں سے کنارہ کشی کر سکتے تھے لیکن کمانڈرز ایسا نہیں کر سکتے تھے۔ انہوں نے جنگ کو جاری رکھنے کے لیے مجاہدین آزادی کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے اپنے طور پر تمام ممکنہ ذرائع کو استعمال میں لانے کی کوششیں جاری رکھیں۔ ان کے اس خلوص اور لگن نے انہیں مجاہدین آزادی اور اپنے زیر انتظام آزاد علاقوں کے عوام کا ایک فطری قائد بنا دیا تھا۔ جنگجو ان کے ایک حکم پر بغیر کسی پشیمانی یا پچھتاوے کے ہر قسم کی قربانی دینے کے لیے تیار ہوتے تھے۔ آج بھی مجھے بہت تکلیف ہوتی ہے اور میرا دل خون کے آنسو روتا ہے جب میں دیکھتا ہوں کہ اس قدر جرأت اور دلیری سے لڑنے والے شہیدوں اور آزادی کے متوالوں کے خوابوں کو عملی شکل دینے کے لیے آج تک کچھ بھی نہیں کیا گیا۔ بنگلہ دیش جوان کے خون کی قیمت پر وجود میں آیا، اب بھی ایک تباہ حال قوم ہے۔ وہ قوم جو اپنے شہیدوں کا احترام نہیں کرتی کبھی بھی خوش حال نہیں ہو سکتی۔ ایسی قوم ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے غضب کا نشانہ بنتی ہے کیوں کہ وہ سب سے بڑا منصف ہے۔ اگر ہم اپنے آپ کو موجودہ صورتِ حال سے نجات دلوانا چاہتے ہیں تو پھر ہمیں ایمان دار، صاف گو اور باخبر ہونا پڑے گا۔ ہمیں سچائی کو سچائی کے طور پر تسلیم کرنا ہوگا۔ ہر ایک کو وہی کچھ ملتا ہے جس کا وہ حق دار ہوتا ہے۔ ہر شخص کو اس کی جائز عزت واحترام اور حق ملنا چاہیے۔ صرف اور صرف شہیدوں کے خوابوں اور جنگ آزادی کی روح کی تکمیل ہی اس قوم کو اس کی منزل عزیز تک پہنچا سکتی ہے۔

63۔ بھارتی فوج کی جانب سے ہم منصب افراد کی تقرری

ہندوستانی فوج نے پروان چڑھتے ہوئے حالات پر نظر رکھنے اور ان پر اپنا کنٹرول قائم کرنے کے لیے ہر سیکٹر کمانڈر کے ساتھ اپنے ہم منصب آفیسروں کی تقرری کر دی تھی۔ ان میں سے اکثر آفیسر بغاوت، بغاوت کچلنے اور انٹیلی جینس کے کاموں میں بہت زیادہ تجربہ کار اور اعلیٰ تربیت یافتہ تھے۔ وہ بڑی باریک بینی سے سیکٹروں کے انتظام، تربیتی کاموں، میدان جنگ میں تقرر کے طریقہ کار، مجاہدین کے شوق اور جذبے، وفاداریوں اور سب سے بڑھ کر کمانڈروں کی کارکردگی اور ان کی مقبولیت کا مشاہدہ کرتے تھے۔ وہ بھرتی کے بارے میں بہت حساس تھے۔ وہ غیر معمولی طور پر چوکنا تھے کہ کوئی نکسل بادی یا بائیں بازو کا رجحان رکھنے والا لڑکا گوریلوں میں شامل نہ ہو پائے۔ ہم میں سے اکثر انہیں جل دے کر بہت سے بائیں بازو کے اور ترقی پسند عناصر کو اپنے کیمپوں میں داخل کر لیتے تھے جن کو مناسب تربیت دینے کے بعد مسلح کر دیا جاتا تھا تاکہ وہ بھی مادرِ وطن کی آزادی کے لیے جنگ میں اپنا حصہ ڈالنے کے برابر کے مواقع حاصل کر سکیں۔ لیکن ہمیں اپنے اس بہت زیادہ خطرناک اور حساس مقصد کے حصول کے لیے بہت زیادہ محتاط رہنا پڑتا تھا۔

ہندوستانی حکام، فوج اور مختلف انٹیلی جینس ایجنسیاں بڑی محتاط تھیں اور تمام احتیاطی تدابیر ملحوظ خاطر رکھتی تھیں کہ ان کی اپنی قوم پرست تحریکیں، خاص طور پر نکسل بادی ہماری جنگ آزادی سے کسی قسم کی مدد یا فائدہ حاصل نہ کر سکیں۔ اس کے باوجود ہماری جنگ آزادی نے مغربی بنگال، ناگالینڈ، میزورام، منی پور، کشمیر

اور خالصتان کی قوم پرست تحریکوں اور جنوب میں تامل ناڈو تحریک پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ یہ بھی ایک بہت بڑی وجہ تھی، جس کے نتیجے میں ہماری تحریک آزادی کا ایک فوری خاتمہ عمل میں لایا گیا۔ ان علاقوں کے عوام ایک لمبے عرصے سے خود مختاری یا آزادی کے حصول کی جدوجہد کر رہے تھے۔ لہٰذا یہ قدرتی امر تھا کہ ہماری آزادی کی جدوجہد نے ان کی خواہشات اور تحریکوں کے لیے مہمیز کا کام دیا۔

بہت سے آفیسر جو ہندوستان کی جانب سے ہمارے ساتھ وابستہ تھے، انہوں نے بعد میں اپنی قوم پرست تحریکوں میں شمولیت اختیار کر لی۔ بہت سے آفیسرز نے اپنی زندگیاں بھی قربان کر دیں۔ خاص طور پر ان میں سے اکثر خالصتان تحریک میں شامل ہو گئے تھے۔ جنرل سبک سنگھ اور کرنل سوراج سنگھ جیسے افسروں نے آزاد خالصتان کے جذبہ سے سرشار ہوتے ہوئے اپنی زندگیوں کے نذرانے پیش کیے تھے۔ ان میں سے کچھ تحریکیں آج تک پورے زور شور سے جاری ہیں۔ بنگلہ دیش کے دلیر اور شجاع مجاہدین آزادی نے ان کے دلوں میں ایک ایسی آگ روشن کر دی تھی جو ہمیشہ ان کی آزادی کے راستے پر ایک مینارۂ نور کی طرح روشن رہے گی۔

64۔ عبوری حکومت کا وزارتوں اور سیکریٹریٹ کی تشکیل میں انہماک

اس دوران مختلف وزارتیں، سیکریٹریٹس اور دیگر بیوروکریٹ ادارے مجیب نگر میں تھے، جو مفرور ہونے والے سول ملازمین پر مشتمل تھے۔ مجیب نگر میں حکومتی مرکز ایسے افسروں سے بھرا ہوا تھا۔ ہندوستانی حکام نے تمام دفاتر میں اپنے لوگ تعینات کر رکھے تھے۔ ہم ان کی سرگرمیوں سے زیادہ آگاہ نہیں تھے، نہ ہی کوئی اندازہ لگا سکتے تھے کیوں کہ ہم محاذِ جنگ پر تھے۔ بعض اوقات کوئی گرم خبر یا افواہ ہم تک پہنچ جایا کرتی تھی۔ حقائق کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ فیصلہ کرنا تاریخ دانوں کا کام ہے کہ عسکری جدوجہد میں ان دفاتر نے کیا حصہ ادا کیا تھا۔ لیکن اس قسم کی سرگرمیوں کو مکمل طور پر بے کار اور الٹے اثرات کا حامل خیال کرتے ہوئے کچھ نوجوان بیوروکریٹس نے بغاوت کر دی اور حکومت میں شامل ہونے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کی بجائے وہ مجاہدین آزادی کے شانہ بہ شانہ جنگ میں حصہ لینے کے لیے سیکٹروں میں شمولیت کے خواہاں تھے۔ ان کے نقطہ نظر کے مطابق حکومت کا مرکز آزاد کرائے گئے علاقوں میں ہونا چاہیے تھا تا کہ وہ ہر حال میں مجاہدین آزادی کے بوجھ کو بانٹ سکے۔ وہ میدانِ جنگ سے دُور محفوظ اور آرام دہ ماحول میں اس قسم کے سفید ہاتھی کی تشکیل کی مخالفت کر رہے تھے۔ مختلف گروپوں اور ان میں پائی جانے والی اقتدار کی کشمکش نے تھیٹر روڈ اور سرکس ایونیو کو سازشوں کی آماج گاہ اور حبس زدہ کر دیا تھا۔ تمام ماحول مفاد پرستوں کی وجہ سے پوری طرح آلودہ ہو چکا تھا۔

65۔ مشتاق کھنڈکر ہندوستانی حکومت کی آنکھوں کا کانٹا

ایک مرحلے پر وزیر خارجہ کھنڈکر مشتاق احمد نے تھیٹر روڈ سے نکل جانے اور اپنی وزارت اور

سیکریٹریٹ 19 سرکس ایونیو منتقل کر لینے کا فیصلہ کیا۔ اس دن سے بنگلہ دیش مشن وزارتِ خارجہ کا بھی مرکز بن گیا۔ سیکریٹری خارجہ محبوب عالم چشتی تھے اور کمال صدیقی کو ان کا پرائیویٹ سیکریٹری مقرر کیا گیا تھا۔ وزیر خارجہ کی منظوری کے ساتھ مودود احمد اور طاہر الدین ٹھاکر نے ایک ''عوامی مواصلاتی مرکز'' قائم کرنے کا ارادہ کیا، جس کا مقصد بیرونی دنیا، بیرونی ذرائع ابلاغ اور غیر ملکی اور مقامی صحافیوں سے رابطہ قائم کرنا تھا۔ اگرچہ مودود احمد ایک نوجوان وکیل اور اگرتلہ سازش کیس میں ایک بڑے سرگرم دفاعی وکیل کے طور پر جانے جاتے تھے لیکن وہ اس مقصد کے لیے عوامی لیگ حکومت کا اختیاراتی حکم حاصل کرنے میں ناکام رہے جو کہ اس کی مؤثر کارکردگی کے لیے ایک پیشگی شرط تھی۔ آخرکار انہوں نے وزیراعظم کو اس کام کے لیے رسمی منظوری دینے اور ان کی سرکاری حیثیت کو تسلیم کرنے کے لیے درخواست دی لیکن وزیراعظم نے ان کی درخواست پر کوئی توجہ نہ دی۔ نہ صرف یہ کہ ان کی درخواست کو کوئی اہمیت نہ دی گئی بلکہ اس کے برعکس بعض نامعلوم وجوہات کی بنا پر ایک مذموم پروپیگنڈا شروع کر دیا گیا جس میں مودود احمد کو ایک موقع پرست اور مفاد پرست شخص کے طور پر پیش کیا جانے لگا۔ وہ اس قسم کے مذموم پروپیگنڈا اور حکومت کے منفی رویے سے بہت زیادہ مایوس اور رنجیدہ ہوئے۔ لیکن اس وقت وہ اس بارے میں کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔

جلد ہی وزیراعظم سیکریٹریٹ اور وزارتِ خارجہ میں افتراق پیدا ہو گیا۔ پالیسی معاملات میں تاج الدین احمد اور وزیر خارجہ ایک دوسرے میں اختلاف کرنے لگے۔ یہ اختلاف ہر گزرتے دن کے ساتھ بڑھتا چلا گیا۔ بعض وجوہات کی بنا پر ہندوستان کی حکومت بھی کھنڈکر مشتاق احمد کے خلاف ہو گئی تھی، ان کے بارے ایک افواہ جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی کہ وہ مجیب نگر کی حکومت کو جان بوجھ کر نظر انداز کرتے ہوئے سی آئی اے کے ذریعے امریکی حکومت سے خفیہ رابطے قائم کر رہے تھے۔ الزام یہ لگایا گیا تھا کہ امریکہ کی مدد سے وہ شیخ مجیب الرحمٰن اور پاکستان حکومت سے تجدید تعلقات اور بحران کا سیاسی حل تلاش کرنے کے لیے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ عوامی لیگ میں دائیں بازو کا ایک کافی بڑا اور بااثر حلقہ ان کی حمایت میں تھا۔ جیسے ہی یہ افواہ پھیلی، اتفاقاً اس کے ساتھ ہی جنرل یحییٰ خان نے بھی عام معافی کا اعلان کر دیا۔ اس اعلان نے عوامی لیگ اور اس کے رہنماؤں کے درمیان دُوررس اثرات مرتب کیے۔ بہت سے رہنما جو یہ خیال کرتے تھے کہ بنگلہ دیش کو مسلح جدوجہد کے ذریعے کبھی بھی آزاد نہیں کرایا جا سکتا، انہوں نے صدر یحییٰ خان کی عام معافی کو قبول کرتے ہوئے واپس جانے کا بھی سوچنا شروع کر دیا۔ اگرچہ ان میں سے اکثر کلکتہ کی محفوظ جنت میں بہت آرام دہ زندگی بسر کر رہے تھے۔ لیکن جیسا کہ وقت کے ساتھ ساتھ ان کی لوٹ مار کی داستانیں طشت از بام ہونے لگی تھیں، وہ بے چین اور خوف زدہ ہو گئے تھے۔ ان اطلاعات نے قوم پرستوں اور مجاہدین آزادی کو یکساں طور پر برہم کر دیا تھا۔ تاہم یہ بدعنوان طبقہ عوام اور خاص طور پر مجاہدین آزادی کے غیظ و غضب سے بچنے کے لیے اوّلین موقع پر واپس جانے کے لیے بے تاب تھا۔

66۔لوٹ مار اور غارت گری

جب مجاہدین آزادی سخت ترین حالات میں بھوکے پیاسے اور پھٹے پرانے کپڑوں میں آزادی کی جنگ لڑ رہے تھے، اس وقت بددیانت اور بدعنوان سیاسی رہنما اور ان کے پٹھوانپی حد سے متجاوز شرم ناک حد تک فضول خرچیوں کی وجہ سے قوم کے نام کو بدنام کر رہے تھے۔یہ ایک بہت بڑی ذلت تھی جو مجاہدین آزادی کے لیے ناقابل برداشت تھی۔کروڑوں روپے لوٹے گئے تھے۔صرف بوگرا اسٹیٹ بینک سے 56 کروڑ روپے لوٹے گئے تھے۔زیادہ تر سیاست دان مقامی انتظامیہ کے بیوروکریٹس کی درپردہ اعانت سے لوٹ مار اور غارت گری میں ملوث تھے۔چند استثنائی صورتوں میں مسلح افواج کے کچھ ممبران بھی اس قسم کی سرگرمیوں میں ملوث تھے۔

عوامی لیگ کی حکومت نے جلاوطنی کے دَور میں اور نہ ہی آزاد بنگلہ دیش میں کبھی یہ تکلیف گوارا کی کہ عوامی مفادات کے پیش نظر ان لیٹروں اور ان کی اشتعال انگیز پُرتعیش طرزِ زندگی کے حوالے سے کسی احتسابی عمل کا آغاز کیا جائے۔

تاہم من گھڑت کہانیوں کے ذریعے سچائی کو کبھی بھی چھپایا نہیں جاسکتا۔عوام خود دیکھ سکتے تھے کہ جنگ کے بعد کچھ سیاسی رہنما اور ان کے پٹھو اور کچھ بیوروکریٹس کس طرح رات بھر میں کروڑ پتی بن گئے تھے۔وہ مکانوں، کاروں، جائیدادوں اور بڑے بڑے بینک اکاؤنٹس کے مالک بن گئے تھے۔جدوجہد کے دَور میں ایک مرحلے پر مجاہدین آزادی نے قیادت کے تمام طبقات سے ان بدعنوان عناصر کو ختم کرنے اور لوٹی ہوئی رقم نکلوا کر جنگی ضروریات پر صرف کرنے کے بارے میں سوچا تھا۔

یہ معاملہ کرنل عثمانی کے سامنے بھی اٹھایا گیا۔انہیں کہا گیا کہ ہم اس قسم کے بدعنوان طبقے کو مسند قیادت پر براجمان نہیں رہنے دیں گے جو ہماری جدوجہد کو ملک کے اندر اور باہر، ہر طرف بدنام کرنے کا باعث بن رہے ہیں۔اس قسم کے رہنماؤں کے لالچ اور کمزوریوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دلچسپی رکھنے والے حلقے کسی بھی وقت آسانی کے ساتھ پوری قوم کو بلیک میل کر سکتے ہیں۔انہوں نے ہماری درخواست کو معقول قرار دیا۔لیکن ان کا خیال تھا کہ اگر ہم غیر ملکی سرزمین پر آپس میں لڑنا شروع کر دیں گے تو ہم اپنے اصل ہدف سے ہٹ سکتے ہیں اور اس طرح ہمارا مقصد بھی متاثر ہوسکتا ہے۔یقیناً اس بددیانت اور بدعنوان طبقے کی سختی سے باز پرس ہونا چاہیے، لیکن یہ کام آزادی حاصل کرنے کے بعد ہونا چاہیے۔ہمیں صبر اور تحمل سے کام لینے کے لیے کہا گیا۔لیکن ان بددیانت مجرموں نے اقتدار کے ایوانوں میں موجود اکثر اہم اور بااثر افراد کو خرید لیا اور یوں بدقسمتی سے کسی بھی مجرم کو احتساب کے کٹہرے میں نہ لایا جاسکا۔جب محافظ ہی غاصب بن جائیں تو صورتِ حال مایوس کن ہوجاتی ہے۔اور بالکل یہی کچھ نئے نئے آزاد ہونے والے بنگلہ دیش میں ہوا۔نہ صرف یہ بلکہ قومی دولت کی لوٹ مار اور غارت گری میں مزید شدت پیدا ہوئی اور وہ تمام حدود کو پار کر گئی۔اس طرح کرنل عثمانی کی

باتیں آزادی کے بعد کے بنگلہ دیش میں حسرت بھری سوچ اور ایک خواب سے زیادہ کچھ بھی ثابت نہ ہوئیں۔ ابتدا ہی سے عوام کو حکومت کی جانب سے کوئی انصاف نہ مل سکا۔ انہیں صرف ناانصافی، جانب داری، استبداد، تشدد، محرومی اور دھوکے کا سامنا ہوا۔ اب میں کچھ ایسے واقعات بیان کرتا ہوں جن سے پتا چل سکے گا کہ کس طرح مجاہدین آزادی اور عوام کے تاثر کو لیڈروں نے داغ دار کیا۔

اس وقت کلکتہ کے پوش علاقے پارک سٹریٹ میں واقع تمام ریستورانوں، کلبوں، شراب خانوں اور ہوٹلوں میں ان لیڈروں کو ان کے مبالغہ آمیز اور شاہانہ فضول خرچیوں کی وجہ سے ''جے بنگلہ کے سیٹھ'' کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ وہ جہاں کہیں بھی جاتے، دولت کو پانی کی طرح بہاتے تھے۔ وہ انتہائی مہنگے ہوٹلوں یا پوش فلیٹوں میں رہتے تھے۔ شام کے وقت ہوٹل گرینڈ، پرنس، میگز، ٹرنکاس، بلیوفاکس اور دوسرے شراب خانے ''جے بنگلہ'' سے آئے ہوئے ان سیٹھوں سے بھر جاتے تھے۔ وہ غیر ملکی مشروبات، قیمتی کھانوں، بینڈ میوزک اور لائیو شوز (live shows) کے بہت شائق تھے۔ ویٹر اور ویٹرس بڑے شوق سے ان کا انتظار کرتے اور ان مہمانوں کا بڑی خوش دلی اور محبت کے ساتھ استقبال کرتے تھے کیوں کہ ہر مرتبہ وہ اندر اور باہر جاتے ہوئے بڑی بڑی ٹپس دیتے تھے۔ ایسا ہی ایک سیٹھ اپنے دوستوں اور حواریوں کے ساتھ ہوٹل گرینڈ کے شراب خانے کا مستقل گاہک تھا۔ اس نے کسی طرح سے بوگرا اسٹیٹ بینک سے لوٹی گئی رقم کا بڑا حصہ حاصل کر لیا تھا۔ اس کے پاس تقریباً چار پانچ کروڑ روپیہ تھا۔ ایک روز تقریباً آدھی رات کے وقت وہ وہاں گیا اور بار مین کو شراب پلانے کا حکم دیا۔ بار مین نے معذرت خواہانہ انداز میں عرض کیا کہ وہ اس وقت ان کی خدمت نہیں کر سکتا کیوں کہ بار بند ہو چکی تھی۔

بنگالی سیٹھ یہ جواب سن کر آگ بگولا ہو گیا اور پوری آواز کے ساتھ چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ ظاہر ہے وہ نشے میں بدمست تھا۔ تمام قسم کی بکواس کرتے ہوئے اس نے بار مین سے منیجر کو بلانے کے لیے کہا۔ چوں کہ یہ ایک اہم گاہک تھا، بار مین اس کی بکواس کو برداشت کرتے ہوئے منیجر کو بلا لایا۔

سیٹھ نے منیجر سے پوچھا، ''تمہاری اس بار کی روزانہ کی سیل کتنی ہے؟''

منیجر نے اسے ایک اندازاً کچھ رقم بتائی۔ تب سیٹھ نے منیجر سے کہا کہ کل سے یہ بار اس کے اور اس کے ساتھیوں کے سوا کسی اور کو بھی شراب فروخت نہیں کرے گی، اور وہ یہ ساری رقم ادا کرے گا۔ اس نے مزید حکم دیا کہ اگر وہ اور اس کے ساتھی اس رقم کی ساری شراب نہ پی سکیں تو باقی ماندہ شراب اس کے باتھ ٹب میں انڈیل دی جائے۔ منیجر اور بار مین اس شرم ناک اور اخلاق سوز مطالبے پر حیران رہ گئے۔ بہر حال وہ اپنے محترم گاہک کی حالت کے پیش نظر وہاں سے چلے گئے۔

''جے بنگلہ'' سے تعلق رکھنے والے ایک اور سیٹھ نے اپنے بیٹے کے جوتے پہننے کی تقریب کے لیے بلیوفاکس میں ایک بہت بڑی پارٹی کا اہتمام کیا جس میں تقریباً 100 مہمانوں کو مدعو کیا گیا تھا۔ ایسے بہت سے لیڈروں نے کلکتہ، ممبئی اور دہلی میں جائیدادیں بھی خریدیں۔ کچھ نے بالی وڈ کی پرکشش فلم انڈسٹری میں

بڑی بڑی رقموں کی سرمایہ کاری بھی کی۔ شہید ضیا الرحمٰن نے مجیب نگر کی اشرافیہ اور وہاں ان کے طرزِ زندگی پر ایک ڈاکومینٹری بھی تیار کی تھی۔ ان کی اس جرأت پر بہت سے لوگ ناخوش تھے۔ کچھ لوگ اس کو ایک اشتعال انگیز کام خیال کرتے تھے اور آزادی کے فوراً بعد ان کے پُر اسرار اور غیر انسانی طور پر لاپتہ ہو جانے کی ایک اہم وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے۔ ایک ایسے ہی سیٹھ نے اپنی پسندیدہ ہیروئین کی سالگرہ پر اسے 9 لاکھ کا ہیروں کا گلوبند بھی تحفے میں پیش کیا تھا۔

اس وقت کابینہ کے اکثر وزرا اور عبوری حکومت کی اہم شخصیات کے خاندان درگاہ روڈ پر مقیم تھے۔ ایک بشو بابو (بچھو بابو) کے اس روڈ پر بہت سے گھر تھے۔ لوہے کے کالے صندوق رقموں سے بھرے ہوئے بشو بابو کے ان گھروں میں تھے اور 3 سہروردی روڈ پر تیسری منزل پر واقع دو کمرے ان کالے رنگ کے صندوقوں سے بھرے ہوئے تھے۔ سیکریٹری فنانس مسٹر اسد الزمان خان اور ان کا خاندان، اور مس رفیع اختر ڈولی وہاں رہتے تھے۔ یہ رقم باڑہ بازار کی بلیک مارکیٹ میں مارواڑیوں کے ذریعے تبدیل کروائی جاتی تھی۔ بہت سے لوگ محض رقم تبدیل کروانے کی دلالی میں ہی رات بھر میں کروڑوں پتی بن گئے تھے۔ لیکن مجاہدین آزادی میں بھی کچھ کالی بھیڑیں موجود تھیں۔ ایک ایسا ہی کمانڈر اپنے لالچ پر قابو نہ رکھ سکا اور ایک غیر بنگالی سی ایس پی آفیسر کی حاملہ بیوی کو بے دردی سے قتل کرتے ہوئے اس کے سونے کے زیورات اتار لیے۔ کرنل عثمانی نے اس بے شرم کمانڈر کو سزا کے طور پر کمانڈ سے ہٹا دیا تھا۔ ایسے عناصر غداروں اور مجاہدین آزادی کے نام پر بدنامی کے دھبوں کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھے۔ تاہم اس قسم کی کالی بھیڑوں کی وجہ سے مجاہدین آزادی کی نیک نامی بھی کسی حد تک ضرور متاثر ہوئی۔ یوتھ اور پناہ گزین کیمپوں میں امدادی سامان اور رقوم کی ترسیل میں بھی خرد برد کے بہت سے سکینڈل سامنے آئے۔

تقریباً ایک کروڑ پناہ گزینوں نے ہندوستان میں پناہ لی تھی۔ ہندوستانی حکومت کو پوری دنیا سے سامان اور نقدی کی صورت میں بہت بڑی بڑی امدادی رقوم ملیں لیکن اس امداد کا محض ایک چھوٹا سا حصہ ہی ضرورت مند پناہ گزینوں تک پہنچ سکا۔ اس کا بڑا حصہ ہندوستانی اور عبوری بنگلہ دیش حکومت کے حکام نے، جن کے ذمہ اس کی تقسیم اور ترسیل تھی، خرد برد کر لیا۔ بوگرا اسٹیٹ بینک کے علاوہ چٹا گانگ اور پبنہ کے سرکاری خزانوں سے بھی بہت بڑی بڑی رقمیں لوٹی گئیں۔

67۔ عوامی لیگ کے علاوہ دیگر پارٹیوں یا گروہوں کی حالت زار

میں یہاں مناسب خیال کرتا ہوں کہ عوامی لیگ اور اس کے اتحادیوں کی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ دوسری سیاسی پارٹیوں کے رہنماؤں اور کارکنوں کی سرگرمیوں کے بارے میں بھی تفصیلات بیان کی جائیں۔ پسماندہ اور مظلوم طبقات کے رہنما مولانا بھاشانی نے جب سے آسام کی سرحد پار کی تھی، وہ مسلسل ہندوستانی حکام کی حفاظتی تحویل میں تھے۔ ہندوستانی حکومت مولانا کے بارے میں بہت شک وشبہ اور تشویش

میں مبتلا تھی۔ بڑی احتیاط کے ساتھ ایسے انتظامات کیے گئے تھے کہ مولانا آزادی کی اس جنگ پر اثر انداز نہ ہو سکیں۔ ہندوستان کی حکومت اور عوامی لیگ کی حکومت مولانا بھاشانی پر کبھی بھی اعتماد نہ کر سکتی تھیں۔ ان کی پارٹی کے رہنماؤں اور کارکنوں اور اس روحانی اور افسانوی رہنما کے مریدوں کو ان نو ماہ کے دوران ان سے کسی بھی قسم کا رابطہ قائم کرنے کی اجازت نہ دی گئی۔ بھاشانی، این اے پی کی مرکزی قیادت اور طلبا محاذ بہت پہلے ہی یہ بات سمجھ چکے تھے کہ ہندوستانی حکومت اور عوامی لیگ نے گٹھ جوڑ کر کے اپنے منصوبے پر عمل کیا تھا۔ دوسری جانب عوامی لیگ کی عبوری حکومت نے پورا عرصہ مولانا بھاشانی کو اپنے سیاسی مفاد کے لیے استعمال کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ دوسرے الفاظ میں ان تمام نے جب بھی ضرورت محسوس کی، مولانا بھاشانی کا استحصال کرنے کی کوشش کی۔ لیکن مولانا کبھی بھی ان کے جال میں نہ آئے۔ مسٹر مسیح الرحمٰن جو بھاشانی نیپ کے سینئر رہنماؤں میں سے تھے، جنگ کے دوران ایک مرتبہ کلکتہ آئے تھے۔ لیکن وہ اپنی پارٹی کے قائد سے ملاقات کرنے میں ناکام رہے اور نوجوانوں اور طلبا رہنماؤں سے ہی ملاقات کر سکے۔ ان سے گفتگو کرنے کے بعد وہ سمجھ گئے تھے کہ وہ اور نہ ہی ان کی پارٹی کے کارکن ہندوستانی سرزمین پر رہتے ہوئے آزادی کی جنگ میں کوئی معنیٰ خیز حصہ ڈال سکتے ہیں کیوں کہ ہندوستانی حکومت کی جانب سے انہیں کسی قسم کی مدد یا حمایت حاصل نہیں ہو سکے گی۔ اس لیے مولانا بھاشانی کے کارکنوں نے واپس بنگلہ دیش جانے اور وہاں اندر سے گوریلا جنگ منظم کرنے کا فیصلہ کیا۔ مسٹر رحمٰن کو مسلسل نگرانی میں رکھا جا رہا تھا اور عوامی لیگ کی حکومت بھی انہیں مشکوک انداز سے دیکھتی تھی۔

ان کے جانے کے بعد مینن، حیدر اکبر خان رانو اور قاضی ظفر احمد جیسے طلبا رہنماؤں نے اپنے طور پر اپنے مقلدین کو جنگ آزادی لڑنے کے لیے منظم کرنے کی کوشش کی۔ بہت سے سیکٹر اور سب سیکٹر کمانڈروں نے ان قوم پرست رہنماؤں کی اس کوشش میں ان کی مدد کی۔ تاہم بائیں بازو کی اکثر پارٹیاں خاص طور پر چین کی حامی پارٹیاں صورت حال کا درست ادراک کرنے میں ناکام رہیں۔ انہوں نے اس جنگ کو "دو کتوں" کے درمیان لڑائی قرار دیا اور قومی آزادی کے مسئلے کو نقصان پہنچایا اور طبقاتی جدوجہد کے راستے کو اختیار کیا، جس نے انہیں عوام سے کاٹ کر رکھ دیا۔ ان پارٹیوں کے بعض رہنماؤں نے بعد میں اپنی غلطی کو محسوس کر لیا اور بنگلہ دیش کے اندر سے پاکستانی فوج کے خلاف لڑنا شروع کر دیا۔ 1969ء کی عوامی بغاوت سے لے کر بائیں بازو کی قوتیں اس بات کو سمجھنے میں بری طرح ناکام رہیں کہ قومی آزادی کی تحریک قومی جمہوری انقلاب کی جانب ایک قدم تھا اور یوں وہ اپنا مطلوبہ حصہ ڈالنے میں ناکام رہیں۔ بعد میں ان میں سے اکثر نے اعلانیہ طور پر اپنی غلطی کو تسلیم بھی کر لیا تھا۔ تاہم ترقی پسند اور قوم پرست قوتوں کی اپنی غلطیوں کے سبب بنگلہ دیش میں قومی آزادی آج بھی ایک دُور کی بات ہے۔ ماسکو کی حامی بائیں بازو کی جماعتوں نے بھی کوئی بہتر کارکردگی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ ماسکو سے ملنے والی ہدایات پر انہوں نے اپنے آپ کو عوامی لیگ کی ٹیم میں اننگز کے آخر میں کھیلنے والے کھلاڑیوں میں تبدیل کر لیا تھا اور سی پی آئی کی طرح غیر مشروط حمایت مہیا کی جو کہ اس وقت ت

دل سے انڈین نیشنل کانگرس کی حمایت کر رہی تھی۔ یہ دونوں قوتیں ایک ہی آقا کی ڈوریوں سے بندھی ایک ہی انداز میں رقص کر رہی تھیں۔ محض بین الاقوامی اعتماد حاصل کرنے کے لیے عوامی لیگ کی عبوری حکومت نے آٹھ افراد پر مشتمل ایک ''ایڈوائزری کمیٹی'' تشکیل دے دی جس میں ہندوستان اور روس کی اتحادی پانچ سیاسی جماعتوں کے ارکان کو بھی شامل کیا گیا تھا۔

68۔عوامی لیگ کے لیے تشویش کی وجہ

جنگ آزادی پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کے لیے عوامی لیگ کی حکومت نے بہت سے اجلاسوں اور کانفرنسوں کے بعد آزاد کروائے گئے علاقوں میں سول انتظامیہ کو چلانے کے لیے پارٹی کے نام نہاد منتخب نمائندوں کو زونل ایڈمنسٹریٹر مقرر کرنے کا فیصلہ کیا۔ مجیب نگر سے منتخب بیوروکریٹس کو ان نمائندگان کی مدد کے لیے مقرر کیا جانا تھا، لیکن اسے حقیقت کا روپ نہ دیا جا سکا۔ صوبائی اسمبلی اور قومی اسمبلی کے اکثر ممبران اور بیوروکریٹس نے بھی اس قسم کا خطرہ مول لینے سے انکار کر دیا تھا اور اس طرح سیکٹر کمانڈرز اور سب سیکٹر کمانڈرز یہ ذمہ داریاں خود سنبھالنے پر مجبور ہو گئے۔ عبوری حکومت اور اس کے مشیروں کو یہ بات بھلی معلوم نہ ہوتی تھی۔ گاہے بہ گاہے ان ''ناگزیر'' رہنماؤں میں سے کچھ مکتی باہنی کیمپوں میں جذباتی خطاب کرنے کے لیے آتے رہتے تھے۔ لیکن ایسے دوروں میں وہ مجاہدین آزادی کے ساتھ آمنے سامنے کی ملاقاتوں میں بہت گھبراہٹ اور بوکھلاہٹ کا شکار رہتے۔ وہ مجاہدین آزادی کا سامنا کرنے کی طاقت نہیں رکھتے تھے۔ اکثر اوقات مجاہدین ان رہنماؤں کی یہ کہتے ہوئے تردید کر دیتے کہ ''یہ الفاظ سے مرصع تقاریر کرنے یا پارٹی پروپیگنڈا کرنے کا وقت نہیں۔ ہم اس وقت حالت جنگ میں ہیں اور اپنی جانوں کو خطرے میں ڈال کر جنگ لڑ رہے ہیں۔ ہم صرف یہ جاننا چاہتے ہیں کہ حکومت نے مزید ہتھیار، ساز وسامان اور اشیائے رسد مہیا کرنے کے کیا انتظامات کیے ہیں۔ ہم مسائل کے سمندر کے درمیان کھڑے ہیں۔ اگر آپ ان مسائل کو حل کرانے میں مددگار نہیں ہو سکتے تو پھر کم از کم اتنا ہی کریں کہ مجیب نگر کو چھوڑ کر یہاں ہمارے ساتھ شامل ہو جائیں اور ہمارے مصائب اور سختیوں کو بانٹیں۔ اگر یہ بھی ممکن نہیں ہے تو پھر برائے مہربانی کھوکھلی تقاریر کرنے اور تصویریں کھنچوانے کے لیے محض ہمارا وقت ضائع کرنے کے لیے یہاں تشریف نہ لایا کریں۔ یہ بہتر ہوگا کہ آپ مجیب نگر میں قیام پذیر رہیں اور آزادی کے لیے انتظار کریں، جب ملک آزاد ہو جائے گا پھر تشریف لائیں اور ہم سے ملیں۔'' مجاہدین آزادی کے اس قسم کے ردعمل پر عوامی لیگ کی عبوری حکومت اور ہندوستانی حکومت دونوں خوف زدہ اور تشویش میں مبتلا ہو گئی تھیں۔ وہ کمانڈروں اور مجاہدین دونوں کی وفاداریوں کے بارے میں شکوک وشبہات کا شکار تھیں۔

69۔میں دوسری مرتبہ زخمی ہوا اور بی بی سی نے میرا انٹرویو کیا

جنگ جاری تھی۔ جولائی کے مہینے میں لاٹھی ٹیلا پر ایک کارروائی کے دوران میں دوسری مرتبہ

شدید زخمی ہوگیا۔ مارٹر گولے کے ٹکڑے اور مشین گن کی گولیاں مجھے لگیں اور مجھے علاج کے لیے ہندوستانی فوج کے سی ایم ایچ ماسم پور جایا گیا۔ تاہم ہسپتال میں اپنے بستر پر سے بھی میں نے گوریلوں کو سپروائز کرنے کا عمل جاری رکھا۔ میرا کیبن ایک چھوٹے او پی ایس روم میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اس کام میں مجھے بریگیڈیئر وڈ کے، کرنل باگچی، میجر داس گپتا اور کیپٹن چترجی کی مدد اور حوصلہ افزائی حاصل تھی۔ یہ تمام آفیسر نمبر 4 سیکٹر سے وابستہ تھے۔

جب میں ہسپتال میں تھا تو بی بی سی سے صحافیوں کا ایک گروپ آیا۔ وہ بنگلہ دیش تحریک کے بارے میں براہ راست معلومات اکٹھا کر رہے تھے۔ وہ مجھ سے بات کرنا چاہتے تھے۔ میں راضی ہوگیا اور وہ ایک دن ہسپتال آ گئے جہاں میں ابھی تک بستر پر پڑا تھا۔

سلام دعا کے بعد ایک صحافی نے میرے کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا: ''یہ کمانڈ پوسٹ کی طرح نظر آ رہا ہے، اس قدر شدید زخمی ہونے کے بعد آپ یہ سب کچھ کیسے کر رہے ہیں؟''

''میں زخمی ہوگیا ہوں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ جنگ ختم ہوگئی ہے۔ یہ جاری ہے اور جاری رہے گی۔ میں محض وہ کچھ ہی کر رہا ہوں جو ممکن ہے، اور اپنی موجودہ مجبوریوں کے باوجود اپنی ذمہ داریاں نبھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

ایک دوسرے صحافی نے سوال کیا، ''ہمیں بتایا گیا ہے کہ آپ مغربی پاکستان سے دو دوسرے آفیسرز کے ساتھ اوّلین مفروروں میں سے ہیں۔ آپ کے رشتہ دار اور عزیز و اقارب ابھی تک مشرقی پاکستان میں ہیں۔ وہ پاکستانی فوج کی انتقامی کارروائی کا نشانہ بن سکتے ہیں۔ اس بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟''

''ہماری جنگ ایک قومی جدوجہد ہے۔ ہم اس نیک مقصد میں شامل ہونے کے لیے فرار ہوئے تھے۔ آج اکثر بنگالی خاندانوں کے افراد اس جدوجہد میں شمولیت اختیار کر چکے ہیں۔ وہ اپنے خاندانوں، عزیز و اقارب کے بارے میں سوچے بغیر اس جدوجہد میں کود رہے ہیں۔ میرا خاندان اور عزیز و اقارب بھی انہی نتائج کا سامنا کریں گے جن کا دوسرے کر رہے ہوں گے۔ وہاں کوئی استثنیٰ نہیں ہوگا۔ لہٰذا مجھے ان کے بارے میں کچھ علیحدہ سے سوچنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ان کو بے رحمانہ انتقام سے بچانے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے کہ ہم اپنی آزادی کی جنگ جیت جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم موت اور زندگی کی اس جدوجہد میں مصروف ہیں۔ ہم اپنی سرزمین کو جس قدر جلد ممکن ہو سکے، دشمن کے قبضے سے آزاد کروانا چاہتے ہیں۔ آزادی کے سوال پر کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکتا۔ انشاء اللہ ہم اپنی آزادی حاصل کرلیں گے۔'' میں نے جواب دیا۔

ان میں سے ایک نے میرا جواب سننے کے بعد کہا، ''جب آپ کے وطن کی مٹی نے آپ جیسے سپوتوں کو جنم دیا ہے تو پھر خدا کی اس دھرتی پر کوئی طاقت آپ کی آزادی کو روک نہیں سکتی۔''

مجھے آج بھی اس کے یہ الفاظ واضح طور پر یاد ہیں، جنہوں نے میرے دل میں بنگلہ دیش کے مستقبل کے بارے میں حب الوطنی کے جذبے اور عظیم امید کی شمع روشن کر دی تھی۔ بارہ کروڑ جاگتے ہوئے

بنگالی یقیناً غلامی کی زنجیروں کو پاش پاش کر دیں گے۔ وہ تمام سازشی منصوبوں کو شکست دیتے ہوئے اقوامِ عالم میں ایک باعزت اور باوقار قوم کی طرح اپنے سر فخر سے بلند کرتے ہوئے کھڑے ہوں گے۔ یہ انٹرویو بعد میں بی بی سی سے نشر کیا گیا۔ میرے خاندان کے ارکان اور عزیز و اقارب کو میرے فرار اور آزادی کی جنگ میں شمولیت کے بارے میں پہلی مرتبہ بی بی سی کے اس نشریے سے علم ہوا تھا۔

70۔ ایک خوشگوار حیرت

کچھ عرصہ سے میں کلکتہ سے کٹا ہوا تھا۔ میں نے اپنے زخمی ہونے کے بارے میں بھی جان بوجھ کر نمی کو آگاہ نہیں کیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ یہ خبر سن کر بری طرح پریشان ہو جائے گی۔ اگرچہ میں نے اسے اطلاع نہیں دی تھی لیکن وہ 8 تھیٹر روڈ سے تمام خبریں آسانی سے حاصل کر سکتی تھی۔ میں اپنے بستر پر آرام کرتے ہوئے خیالات میں ڈوبا ہوا تھا جب لیفٹیننٹ قادر، بابو عتیق اور میرے دو کمانڈر مجھے ملنے کے لیے آئے۔ ہم بڑی دیر تک آپریشنل معلومات اور انتظامی تفصیلات کے بارے میں تبادلہ خیال کرتے رہے جس کے بعد وہ چلے گئے۔

میں شاید ہی تنہا ہوتا تھا۔ مجھے ملنے کوئی نہ کوئی آتا رہتا تھا۔ ان میں اکثریت مجاہدین آزادی کی ہوتی تھی، جو اپنے مسائل پر بات چیت کرنے کے لیے آتے تھے۔ اس طرح میرا دن خاصا مصروف گزرتا تھا، بعض اوقات بہت زیادہ مصروفیت کے لمحات بھی آجاتے تھے۔ ایسے میں شفیق ڈاکٹرز اور نرسیں ملاقاتیوں کے دھارے سے پریشان ہو جاتے تھے اور مجھے نیند لینے اور آرام کرنے کی تلقین کرتے تھے، جو ان کے خیال میں میری جلد صحت یابی کے لیے ضروری تھا۔ لیکن میرے لیے یہ کام مشکل تھا اور میں اکثر ان کی اس شفقت کا مسکرا کر جواب دے دیتا تھا۔

مسز وڈ کے ہر روز میرا کھانا اپنے گھر سے بھجواتی تھیں۔ میں ان کی اور دوسرے افراد کی محبت اور شفقت کا ہمیشہ مرہونِ منت رہوں گا جو مجھے اپنے عزیز و اقارب سے دُور اس اجنبی سرزمین پر ان لوگوں سے ملی۔

کچھ دیر کے لیے میں نے اپنے آپ کو بہت تنہا اور اکیلا محسوس کیا۔ میری عزیز ترین یادیں میرے ذہن میں گھوم رہی تھیں اور میری سوچوں میں بار بار نمی کا چہرہ ابھر کر سامنے آ رہا تھا۔ میں ایک مرتبہ پھر ماضی میں کھو گیا۔ اچانک میری سوچیں درہم برہم ہو گئیں اور مجھے دروازے پر تین چہرے نظر آئے۔ ان میں سے دو، محبوب اور فاروق، میرے پسندیدہ گوریلا کمانڈر تھے۔ لیکن ان کے ساتھی پر نظر پڑتے ہی میں بھونچکا رہ گیا تھا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ جیسے ہی وہ اندر آئے ہر چیز واضح ہو گئی۔ ہاں، وہ نمی ہی تھا۔

''تم یہاں کیسے پہنچ گئے؟'' میں نے حیرت سے چیختے ہوئے پوچھا اور بستر پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

''نہیں یار، لیٹے رہو آرام کرو۔'' نمی نے حکم دیا۔ وہ آگے بڑھا اور مجھے زور سے گلے لگا لیا۔ ہم اس طرح اچانک ملاقات پر خوشی اور حیرت سے مغلوب کچھ دیر خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔

محبوب نے نمی کے لیے ایک کرسی کھینچ کر بستر کے قریب کردی۔ ''تم یہاں کیسے پہنچ گئے؟ اب بتاؤ یہ کیسے ہوا؟ تم نے اس جگہ کو کیسے تلاش کرلیا؟ تمہیں کس نے بتایا تھا کہ میں یہاں ہوں؟'' میں نے ایک ہی سانس میں یہ سب سوالات کر ڈالے۔

''سب سے پہلے آپ تم یہ بتاؤ کہ تم نے اپنے زخمی ہونے کے بارے میں ہمیں کیوں اطلاع نہیں دی؟'' جواب میں نمی نے الٹا مجھ سے سوال کر دیا۔

''کیا تم خود نہیں جانتے کہ میں نے اپنے زخمی ہونے کی اطلاع کیوں نہیں دی؟'' میں نے اس سوال کو کاٹ کر جواب دیا۔

''ہاں یہ درست ہے کہ ہم سب اور خاص طور پر نمی کے لیے یہ انتہائی پریشانی کا باعث ہوتی۔ لیکن اس کے باوجود تمہیں اطلاع دینی چاہیے تھی۔'' نمی نے کہا۔ میں نے اس کی دلیل کو تسلیم کرلیا۔

''چلو اب بتاؤ کہ تم یہاں کیوں آئے ہو؟''

''نور بھائی اور صلاح الدین دونوں ہمارے گھر آئے تھے اور ہمیں تمہارے زخمی ہونے کی اطلاع دی۔ تاہم انہوں نے نمی کو یقین دلانے کی پوری کوشش کی تھی کہ ساری صورتِ حال اب قابو میں ہے اور تم تیزی سے صحت یاب ہو رہے ہو اور بالکل ٹھیک ہو، پریشان ہونے والی کوئی بات نہیں۔ لیکن نمی پوری طرح قائل نہیں ہوئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ لیفٹیننٹ نور اور کیپٹن صلاح الدین تمہارے قریبی دوست ہونے کی وجہ سے اصل حقائق چھپا رہے ہیں اور اسے مکمل حقیقت نہیں بتا رہے۔ ان کے جانے کے بعد اس نے رو رو کر ایک قیامت برپا کردی اور یہاں تک کہ کھانا پینا چھوڑ دیا۔'' نمی نے بتایا۔

اس نے مزید کہا، ''میں اس کی بے بسی پر بہت پریشان ہو گیا اور مجھے الٹا اس کی صحت کے بارے میں تشویش پیدا ہو گئی۔ میں نے اسے کہا کہ ٹھیک ہے میں خود ''شلیچر'' جا کر تمہاری خیریت کی اطلاع لے آؤں گا۔ لیکن بابا اور ماں اجازت نہیں دے رہے تھے کیوں کہ میرے اور نمی کے کینیڈا جانے کے انتظامات مکمل ہو چکے تھے۔ ہماری خواہشات کے برخلاف بابا نے مجھے اور نمی کو گاموکا کو کے پاس کینیڈا بھجوانے کا انتظام کرلیا ہوا تھا۔ ماں نے قسم اٹھائی تھی کہ اگر ہم نے کینیڈا جانے سے انکار کیا تو وہ خودکشی کرلے گی۔ تم جانتے ہو کہ وہ کس قدر ضدی خاتون ہیں۔ دوسری جانب نمی نے بھی کینیڈا جانے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ بھی اپنے فیصلے کی اتنی ہی پکی ہے۔ گھر میں ایک سرد جنگ چل رہی تھی۔ بابا اور ماں، دونوں نمی سے بہت ناراض تھے۔ وہ بہت زیادہ دباؤ میں تھی اور کئی دفعہ اسے بے رحمی سے مارا پیٹا بھی گیا اور شدید سرزنش بھی کی گئی۔ بے چاری لڑکی حقیقت میں ایک دوزخ سے گزر رہی تھی۔ شدید مایوسی کے عالم میں وہ کوئی غلط قدم بھی اٹھا سکتی تھی۔ پورا ماحول بہت زیادہ جذباتی اور ناقابل برداشت ہو چکا تھا۔ میں اس صورتِ حال کو مزید برداشت نہیں کر پا رہا تھا۔ لہٰذا میں نے بابا اور ماں کے سامنے کھڑے ہو کر صاف الفاظ میں انہیں بتایا کہ کینیڈا جانے سے پہلے میں دالیم سے ضرور ملاقات کروں گا۔ اگر مجھے اجازت نہ دی گئی تو میں بھی کینیڈا جانے سے انکار کر دوں گا اور جنگ میں شامل ہو

جاؤں گا۔'' میری اس بات نے معجزہ دکھایا۔ وہ شاید میری سنجیدگی کو بھانپ گئے تھے، لہٰذا بابا نے کہا، ''ٹھیک ہے تم جا سکتے ہو، لیکن یہ وعدہ کرو کہ واپس آؤ گے۔'' میں نے وعدہ کر لیا اور اب میں یہاں ہوں۔ جب مجھے آنے کی اجازت ملی تو ممی بہت حد تک مطمئن ہو گئی۔ میں نے یہاں آنے سے پہلے ممی سے وعدہ کیا تھا کہ جس چیز کی بھی ضرورت ہوئی، وہ سب میں کروں گا اور ضروری محسوس ہوا تو تم کو بہتر علاج کے لیے کلکتہ بھی لے کر آؤں گا۔ اس طرح گوہاٹی تک میں ہوائی جہاز سے آیا اور پھر بذریعہ ریل گاڑی ماسم پور پہنچا۔

میں نے مکتی فوج کا ہیڈ کوارٹر آسانی سے ڈھونڈ لیا۔ وہاں سے محبوب اور فاروق کو میرے ساتھ یہاں تک بھیجا گیا۔ لیکن جس بات کی مجھے سب سے زیادہ حیرانی ہوئی وہ یہ تھی کہ جس لمحے میں نے ماسم پور میں قدم رکھا تو مجھے پتا چلا کہ مجاہدین آزادی کے لیے ''نپی'' کا نام جانا پہچانا تھا۔''

''یہ ٹھیک ہے۔ محبوب اور فاروق دونوں میرے بہت قریبی دوست ہیں۔ میں ان کو بہت زیادہ چاہتا ہوں۔ بہت سے دوسرے لوگ بھی تمہارے بارے میں سب کچھ جانتے ہیں۔'' میں نے کہا۔ اس دوران میری تیمار دار نرس ہمارے لیے کھانے پینے کی کچھ اشیاء لے کر آ گئی۔ اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ نپی کوئی خاص مہمان ہے۔

''میرے بائیں بازو پر بھاری پٹی سے خوف زدہ نہ ہو جانا۔ اس کے مقابلے میں زخم بہت چھوٹا ہے۔ ہلکی مشین گن کی صرف تین گولیاں بائیں کندھے میں لگی ہیں اور ہتھیلی پر مارٹر کا ایک ٹکڑا لگا تھا۔ بس یہی زخم ہیں۔'' میں نے اس کی پریشانی دُور کرنے کی کوشش کی۔ میں نے اسے مزید بتایا کہ ''ڈاکٹر نے مجھے بتایا تھا کہ مسلسل خون بہنے اور 90 میل کا سفر کرنے کے بعد بھی میں زندہ ہوں، لہٰذا پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ تم یہ دیکھ رہے ہو نا کہ میں نے کس طرح یہاں ایک چھوٹا سا ''او پی روم'' قائم کر رکھا ہے؟ میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' میں نے اسے تسلی دینے کے لیے کہا کیوں کہ مجھے اس کی آنکھوں میں آنسو نظر آ رہے تھے۔ میں نہیں جانتا تھا کہ میں اس سے زیادہ اسے اپنی دلیری اور جرأت کا کیسے قائل کر سکتا تھا۔

نپی نے سیدھا میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا، ''ٹھیک ہے، میں سمجھتا ہوں کہ میں تمہیں اس چھوٹے سے فیلڈ ہسپتال میں مزید گلنے سڑنے کے لیے نہیں چھوڑ سکتا۔ میں تمہیں بہتر علاج کے لیے اپنے ساتھ کلکتہ لے کر جاؤں گا۔''

''تم بالکل درست کہہ رہے ہو، نپی بھیا۔ ڈاکٹروں کی بھی یہی رائے ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ بہتر علاج کے لیے کلکتہ جانا ضروری ہے۔ لیکن حق بھائی سیکٹر چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ یہ درست ہے کہ ان کی غیر حاضری سے یہاں بہت فرق پڑ سکتا ہے۔ لیکن ہم سب چاہتے ہیں کہ وہ بہتر علاج کے لیے کلکتہ چلے جائیں تاکہ وہ مکمل طور پر تندرست حالت میں دوبارہ ہمارے درمیان موجود ہوں۔ جب وہ واپس آ جائیں گے تو ان کی غیر موجودگی میں ہونے والے نقصان کو ہم سب مل کر بہت جلد پورا کر لیں گے۔ یہ یقینی بات ہے۔'' محبوب نے پرجوش انداز میں نپی کی تجویز کی حمایت کرتے ہوئے کہا۔

فاروق نے بھی محبوب کی تائید کرتے ہوئے کہا،''آپ جیسے تیسے بھی ہوسکے حق بھائی کو کلکتہ اپنے ساتھ لے جائیں۔ان کی حالت مزید بگڑ سکتی ہے کیوں کہ اس ہسپتال میں ان کے علاج کے لیے مکمل سہولیات میسر نہیں ہیں۔ہم چاہتے ہیں کہ وہ مکمل تندرست ہوکر دوبارہ ہمارے درمیان آ جائیں،اس کام کے لیے انہیں کچھ عرصہ کے لیے کلکتہ جانا ہی پڑے گا۔''

پئی کے اصرار نے جس کے ساتھ میرے پیارے مجاہدین آزادی کی مضبوط حمایت شامل تھی آخر کار مجھے ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا۔اس طرح ہم ایک خوشگوار صبح کو ضروری تیاری کر کے کلکتہ کے لیے روانہ ہو گئے۔ہمیں گوہاٹی تک بذریعہ سڑک آنا پڑا۔میرے سب سے زیادہ پسندیدہ گوریلا کمانڈرز مجھے گوہاٹی تک چھوڑنے کے لیے آئے۔گوہاٹی سے ہم نے کلکتہ کے لیے پرواز پکڑ لی۔میں ان سب کو چھوڑ کر بہت اداسی محسوس کر رہا تھا۔انہوں نے بھی بوجھل دل کے ساتھ ہمیں خدا حافظ کیا۔

میں نے انہیں کہا،''میں واپس آؤں گا۔''

71۔تھیٹر روڈ پر تبدیلیاں

میں نے کلکتہ میں بہت سی تبدیلیاں دیکھیں۔کیپٹن صلاح الدین انٹیلی جنس سیل کی قیادت کر رہے تھے جو سی این سی ہیڈ کوارٹر میں قائم کیا گیا تھا۔کیپٹن نور الحق شیشو کو صحت کی بنیاد پر سیکٹر سے واپس بلا کر سٹاف آفیسر مقرر کر دیا گیا تھا۔اسے سیکٹر میں''اعصابی اضمحلال''جیسے مسائل کا سامنا تھا۔وہ سیکٹر کی زندگی سے ہم آہنگی نہیں کر پا رہا تھا۔میجر اسلام کو کمانڈ سے ہٹا دیا گیا تھا۔اسے اس کی بزدلی اور قیادت میں نااہلی کی بنا پر واپس بلا کر ہیڈ کوارٹرز میں تعینات کر دیا گیا تھا۔

جنگ کے دوران کلکتہ کے چند مقامی خاندانوں کے ساتھ ہمارے تعلقات استوار ہو گئے تھے۔وہ کئی ایک طریقوں سے ہمارے مقصد کی حمایت کر رہے تھے۔ڈاکٹر غنی اور ان کا خاندان،اروپ دا اور پاروییتا باؤدی،مسٹر سید ایوب اور ان کی بیوی گاوری دی،پریتیش نندی اور ان کی بیوی رینا،اندرا،موئتری ماشیما اور چند دوسرے لوگوں سے ہمارے بڑے قریبی تعلقات قائم ہو گئے تھے۔وہ ہمیشہ جنگ کے بارے میں اور میدان جنگ میں ہماری پیش قدمیوں کے بارے میں سننے کو بے تاب رہتے تھے۔

جب بھی ہم کلکتہ میں ہوتے ہم فرصت کے اوقات میں ان خاندانوں سے ملنے جایا کرتے تھے۔یہ سارے بنگالی قوم پرستی کے جذبے سے سرشار تھے۔لیکن بہت حیران کن طور پر جب کبھی ہم بحث کے دوران کہتے کہ مغربی بنگال کے بنگالیوں کے لیے یہ ایک قیمتی موقع ہے کہ وہ اپنے آپ کو آزاد کرانے اور متحد بنگال کے خواب کو تعبیر دینے کی مسلح جدوجہد میں ہمارے ساتھ شریک ہو جائیں تو وہ پریشانی محسوس کرتے تھے۔وہ ہمیشہ اس موضوع پر گفتگو سے احتراز کرتے اور موضوع کو بدلنے کی کوشش کرتے تھے اور پراسرار طور پر خاموش رہنے کو ترجیح دیتے تھے۔ان کا یہ ردعمل خیال آفرین اور قابل غور تھا۔تاہم کیوں کہ وہ اس نازک مسئلے پر حقیقتاً

بہت زیادہ گھبراہٹ اور پریشانی محسوس کرتے تھے، اس لیے ہم اس موضوع پر زیادہ بات نہ کرتے تھے۔ لیکن ہم یہ کہتے رہتے تھے کہ ہماری جنگ آزادی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کانگرس (آئی) کی حکومت مشرقی بنگال اور ملحقہ علاقے بہار میں سی آر پی (سینٹرل ریزرو پولیس) اور بی ایس ایف (بارڈر سکیورٹی فورس) کے ذریعے بے شمار ترقی پسند افراد، سیاسی کارکنوں، فعالیت پسند نوجوانوں اور طالب علموں کو عملی طور پر نیست و نابود کر رہی ہے۔ اس واضح سچائی کو جھٹلانا ان کے لیے ممکن نہ تھا۔ وہ یہ کڑوی گولی خاموشی اور بھولپن کے ساتھ نگل لیتے۔ میں اب بھی بعض اوقات اس پراسرار خاموشی کے بارے میں غور کرتا ہوں۔

میرے لیے تھیٹر روڈ پر ٹھہرنے کے انتظامات کیے گئے تھے۔ پارو بیتا باؤدی نے اس دوران پہلے ہی میرے علاج کے لیے پروفیسر مُرلی مکھرجی سے بات کر لی تھی جو ایک معروف آرتھوپیڈک اور پلاسٹک سرجن تھے۔ میری ان کے ساتھ طویل گفتگو ہوئی۔ میرے زخموں کا معائنہ کرنے کے بعد انہوں نے دیکھا کہ میرے زخموں میں انفیکشن بُری طرح پھیل چکی ہے۔ یہ گولی اور گن پاؤڈر سے لگنے والے زخموں کے لیے بہت عام بات تھی۔ اگر انفیکشن کو جلد قابو نہ کیا جا سکا تو یہ گینگرین میں بھی بدل سکتی تھی۔

انہوں نے مزید کہا، ''سب سے پہلے ہم انفیکشن کا علاج کریں گے اور آپریشن کی تیاری کریں گے۔'' میں کچھ گھبرا گیا۔ لیکن ہم ان کی نصیحت پر عمل کرنے کے علاوہ کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ مجھے تلخ حقائق کا سامنا ہر حال میں کرنا تھا۔ انہوں نے ایک ہفتے کے لیے ادویات اور انجیکشن لکھ کر دیئے۔ باؤدی بہت محبت کرنے والی خاتون تھیں، میرے حوصلہ بڑھانے کے لیے انہوں نے کہا، ''فکر مت کرو سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

72۔ غیر معمولی حالات میں شادی

میں اپنا زیادہ وقت بستر پر لیٹے ہوئے گزارتا تھا۔ بعض اوقات نمی، ہبی کے ساتھ مجھے ملنے کے لیے آ جاتی تھی۔ اس کے لیے ہر روز مجھ سے ملنا ممکن نہ تھا۔ جب بھی ممکن ہوتا وہ مجھے فون کر لیتی تھی۔ ایک دن ہبی آیا تو وہ غیر معمولی طور پر سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ گھر میں کچھ غلط ہو گیا تھا۔ بالکل یہی معاملہ تھا۔ ان دونوں کے کینیڈا جانے کے بارے میں ایک طوفان مچا ہوا تھا۔ سخت الفاظ کے تبادلے کے ساتھ شدید مار کٹائی بھی ہوئی تھی۔

''صورتِ حال حقیقتاً بہت تشویش ناک ہو گئی ہے۔ کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا۔ ورنہ نمی کوئی غلط قدم اٹھانے پر مجبور ہو سکتی ہے۔ نمی جیسی نرم دل ہستی اپنے مؤقف پر ڈٹ گئی ہے۔ بابا اور ماں اسے کینیڈا بھجوانے کی اپنی کوششوں میں کبھی بھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ جسمانی اور ذہنی دباؤ کی وجہ سے اس کی حالت تیزی سے بگڑتی چلی جا رہی ہے۔ وہ حقیقت میں بیمار ہو گئی ہے۔ ایسی حالت میں بابا اور ماں کے دباؤ کو کہاں تک برداشت کر سکے گی؟'' ہبی نے یہ ساری بات مجھے بتا دی۔

میں بہت پریشان تھا کہ اس مسئلے کو کیسے سلجھایا جائے؟ مجھے کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے

خیال کیا کہ اس معاملے میں نور اور صلاح الدین سے بات چیت کی جانی چاہیے۔ کافی سوچ بچار کے بعد دونوں نے کہا کہ اس کا حل صرف شادی ہے۔ ''اگر تم اس سے شادی کر لیتے ہو تو پھر اسے کینیڈا بھجوانے کا معاملہ خود بخود ختم ہو سکتا ہے اور وہ جیسا کہ چاہتی ہے، تمہارے نزدیک رہ سکے گی۔'' نور نے کہا۔ میں نے اس بارے میں سنجیدگی سے غور کیا اور آخر کار شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن ایسی صورتِ حال میں اس کے والدین شادی کے لیے تیار بھی ہوں گے یا نہیں؟ یہ ایک دوسرا سوال تھا۔

ایک دن نور اور صلاح الدین میری جانب سے شادی کا پیغام لے کر اُن کے گھر گئے۔ چاچا اور خالہ ماں اس تجویز سے بالکل متفق نہیں تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اس وقت شادی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جب ہر چیز اس قدر غیر یقینی ہے، وہ اپنی بیٹی کی شادی کا کیسے سوچ سکتے ہیں؟ اس کے والدین کسی بھی دلیل کو سننے کے لیے تیار نہیں تھے۔ لیفٹیننٹ نور اور کیپٹن صلاح الدین دل برداشتہ واپس آ گئے۔

شادی کا پیغام بھجوانے کے اس واقعہ کے بعد صورتِ حال مزید سنگین ہو گئی۔ نمی نے مجھے لکھا کہ کسی بھی طریقے سے، جو بھی ممکن ہو سکے، میں اسے ہر صورت میں اس ناقابل برداشت صورتِ حال سے نجات دلواؤں، ورنہ وہ خودکشی کر لے گی اور مجھے اس حالت میں چھوڑ کر کبھی بھی کینیڈا نہیں جائے گی۔ میں جانتا تھا کہ اپنی عزتِ نفس اور وقار کو قائم رکھنے کے لیے وہ کچھ بھی کر سکتی تھی۔ اس کا حل کسی نہ کسی طور پر فوری شادی کر لینا ہی تھا۔ نور اور صلاح الدین بھی میرے اس فیصلے سے متفق تھے۔ ہم نے اس معاملہ پر غنی نانا، گاؤری دی اور مسز زمان سے بات کی اور ان کی رائے طلب کی۔ ان کا خیال بھی یہی تھا کہ اس کا واحد حل شادی ہی ہے۔ اس فیصلے کے مطابق میں نے اسے لکھا کہ ہم مسئلے کو حل کرنے کے لیے، بہت جلد کچھ کرنے کی منصوبہ بندی کر رہے ہیں، اور اس سے منصوبے پر عمل درآمد کے لیے ذہنی و جسمانی طور پر اپنے آپ کو مجتمع رکھنے کو کہا۔

اب شادی تو ہر حال میں کرنا تھی، لیکن نمی کو 3 سہروردی ایونیو سے باہر کیسے نکالا جائے؟ اصل مسئلہ یہی تھا۔ یہ گھر اونچی چار دیواری میں گھرا ہوا تھا اور تقریباً تیس چالیس پولیس گارڈ گھر کی چوبیس گھنٹے نگرانی کر رہے تھے۔ نمی پر کڑی نگاہیں رکھی جا رہی تھیں، اسے گھر سے باہر نکلنے کی بالکل اجازت نہ تھی۔ اس کے علاوہ وہ جسمانی طور پر بہت زیادہ کمزور ہو چکی تھی۔ لہٰذا ہم سب مل کر بیٹھے اور اسے وہاں سے نکالنے کا ایک منصوبہ تیار کیا۔

فیصلہ یہ کیا گیا کہ مسز زمان، نائلہ، لبنیٰ اور گاؤری ماسی ان کے گھر جائیں گی۔ نائلہ اور لبنیٰ نمی کی دوست تھیں۔ خالہ ماں یعنی مسز آر آئی چوہدری مسز زمان کو جانتی تھیں۔ مسز زمان، نائلہ اور لبنیٰ اس وقت جلاوطنی میں بنگلہ دیش کا ثقافتی طائفہ تشکیل دینے کی کوشش کر رہی تھیں۔ یہ بات سب کے علم میں تھی۔ منصوبہ بنایا گیا کہ جب مسز زمان اور گاؤری ماسی خالہ ماں سے باتیں کر رہی ہوں گی تو نائلہ اور لبنیٰ کسی طرح نمی کو باہر لے کر آ جائیں گی۔ گیٹ سے باہر نور اور دوسرے افراد جیپ میں بیٹھے انتظار کر رہے ہوں گے، وہاں سے وہ سیدھے مونٹی ماسی کے گھر پہنچیں گے اور وہاں شادی ہو جائے گی۔

غنی نانا، قاضی اور نکاح رجسٹرار کا انتظام کریں گے۔ کیپٹن صلاح الدین کو دوسرے ضروری انتظامات کی ذمہ داری سونپی گئی۔

تھیٹر روڈ ہیڈ کوارٹر میں صرف کیپٹن چوہدری کو اس کارروائی سے آگاہ کیا گیا تھا۔ پیچیدگیوں سے بچنے کے لیے تمام انتظامات بڑے رازدارانہ انداز میں کیے گئے تھے۔ شادی کی تاریخ 16 اگست 1971ء طے کی گئی۔ مقررہ دن مسز زمان اور دیگر خواتین تقریباً 10 بجے صبح 3 سہروردی روڈ پر پہنچ گئیں وہاں جب تمام خواتین بات چیت میں مصروف ہو گئیں تو نائلہ اور لبنیٰ موقع پا کر نمی کے کمرے میں چلی گئیں۔ اندر داخل ہوتے ہی نائلہ نے بے تابی سے کہا، "فوراً ہمارے ساتھ آؤ۔ آج تمہاری شادی کا دن ہے۔"

نمی پہلے تو تھوڑا گھبرائی اور اگلے ہی لمحے ساری بات سمجھ گئی۔ وہ جرأت کا ثبوت دیتے ہوئے انہی کپڑوں میں، جو اس نے پہن رکھے تھے، اٹھی اور نائلہ اور لبنیٰ کے ساتھ گھر سے باہر آنے کے لیے تیار ہو گئی۔ کسی بھی غیر شادی شدہ لڑکی کے لیے فوری طور پر ایسا فیصلہ کر لینا کوئی آسان بات نہیں ہوتی۔ اس کی محبت کی گہرائی اور خود اعتمادی نے اس وقت اسے اس قسم کا دلیرانہ فیصلہ لینے کا حوصلہ بخشا اور اس طرح چند سیکنڈ میں ایک ناممکن بات ممکن میں بدل گئی۔ جسمانی اور ذہنی طور پر کمزور ہونے کی وجہ سے وہ صحیح طرح چل بھی نہ پا رہی تھی، نائلہ اور لبنیٰ نے عملی طور پر اسے تقریباً اٹھا کر گھر سے باہر نکالا اور گیٹ پر لے آئیں۔

وہاں سے وہ سب موٹری ماسی کے گھر پہنچ گئے۔ ہم سب وہاں ان کا انتظار کر رہے تھے۔ سارے انتظامات کر لیے گئے تھے۔ صلاح الدین دو ساڑھیاں لے آئے تھے جو تقریباً 20 سے 25 روپے کی تھیں اور دس روپے مالیت کا میرے لیے ایک کرتہ بھی لے کر آئے تھے۔ یہ نئے کپڑے پہننے کے بعد ہم شادی کے بندھن میں بندھ گئے۔ کیپٹن صلاح الدین نمی کے "ولی" بن گئے۔ گواہان میں غنی نانا، گاڈری دی، نور اور مسز زمان شامل تھیں۔ تقریب کے اختتام پر موٹری ماسی اور وہاں موجود دوسرے بزرگان نے ہمیں اپنی دعاؤں سے نوازا۔

نکاح رجسٹرار کو دستاویزات کی تیاری کے لیے دو یا تین روز درکار تھے۔ ان چند دن کے دوران ہمیں کہیں چھپ کر وقت گزارنا تھا کیوں کہ ہمارے اس طرح سے نکل کر شادی کرنے کے جو نتائج برآمد ہونا تھے، ان کا سامنا کرنے کے لیے ہمیں ان قانونی دستاویزات کی ضرورت تھی۔ گاڈری دی نے ہمارے لیے ایک چھوٹے سے فلیٹ کا انتظام کر دیا جو کہ ان کے ایک دوست کی ملکیت تھا، جو ایک دولت مند کاروباری شخص تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا خوب صورت اور آرام دہ فلیٹ تھا۔ اگلے چند دن ہم نے یہیں چھپ کر بسر کرنا تھے۔ اور اسی فلیٹ میں رہتے ہوئے ہم نے اپنا ہنی مون بھی منانا تھا۔ جو لوگ براہِ راست اس شادی میں ملوث تھے، ان کے علاوہ کسی کو بھی ہمارے اتے پتے کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا۔ ہم اسی شام سورج غروب ہونے کے بعد اپنی پناہ گاہ میں پہنچ گئے۔ غنی نانا، گاڈری دی، صلاح الدین اور نور فلیٹ تک ہمارے ساتھ آئے۔ نائلہ اور لبنیٰ نے ہمارے بیڈ روم کو بڑی خوب صورتی سے پھولوں کے ساتھ سجا دیا تھا۔

جب وہ سب چلے گئے تو ہمیں اچانک بہت تنہائی کا احساس ہوا۔ یہ سارا معاملہ اس قدر عجلت میں طے ہوا تھا کہ ہمیں سوچنے کا موقع ہی نہ ملا تھا۔ فلیٹ میں تنہائی پاتے ہی نمی نے اس واقعہ کی، جو ہو چکا تھا، سنجیدگی اور سنگینی کے بارے میں سوچتے ہوئے رونا شروع کر دیا۔ یہ ایک فطری ردِ عمل تھا۔ میں نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی اور کہا: ''رومت، سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا، ہمیں صبر سے کام لینا ہوگا۔ وقت سب سے بڑا مرہم ہے۔'' بے چاری نمی... میری تسلی کی باتیں اس کے رخساروں پر بہتے ہوئے آنسوؤں کو نہ روک سکیں۔ تاہم تھوڑی دیر بعد دن بھر کی تھکاوٹ اور ذہنی دباؤ کی وجہ سے اسے نیند آ گئی۔ جب میں سونے کے لیے لیٹا تو اپنے انجام کے حوالے سے گہری سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا۔

دوسری صبح نور آیا اور اس نے بتایا کہ معاملہ کچھ زیادہ ہی آگے نکل گیا ہے۔ نمی کے والد نے وزیرِ اعظم تاج الدین کے پاس شکایت درج کروادی کہ میں نے ان کی بیٹی کو اغوا کر لیا ہے۔ وزیرِ اعظم نے انٹیلی جینس کے سربراہ کیپٹن صلاح الدین کو بلایا اور انہیں حکم دیا کہ ہمیں کسی بھی طریقہ سے تلاش کیا جائے اور اگر ضروری محسوس ہو تو اغوا کرنے والے آفیسر کے ہاتھوں سے نمی کو برآمد کرنے کے لیے ہندوستانی پولیس اور انٹیلی جینس ایجنسیوں کی مدد بھی حاصل کی جائے۔ لیکن اس وقت کسی کو بھی کچھ نہیں بتایا جا سکتا تھا، جب تک شادی کا سرٹیفکیٹ ہمارے ہاتھ میں نہ آ جائے۔ کرنل عثمانی بھی اتنے ہی غصے میں تھے۔ ایک آفیسر جو فوج کے ڈسپلن کو توڑ کر کسی کی بیٹی کو اغوا کر سکتا ہے، اس کا ہر صورت میں مواخذہ ہونا چاہیے۔

وہ بہت زیادہ پریشان بھی تھے۔ انہوں نے نور سے کہا: ''دالیم جیسا آفیسر یہ کام کیسے کر سکتا ہے؟ میری سمجھ میں یہ بات بالکل نہیں آ رہی۔''

دوسری جانب نور نے ہمیں متنبہ کیا: ''سر، جب تک دستاویزات آپ کے ہاتھ میں نہیں آ جاتیں، فلیٹ سے باہر بالکل قدم نہ رکھیں۔'' غنی نانا اپنے تعلقات کے بنا پر جس قدر جلدی ہو سکے کاغذات تیار کروانے کی کوشش کر رہے تھے۔ جب یہ موصول ہو جائیں گے تو پھر متاثرہ فریقین کے ساتھ سمجھوتہ کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ پہلے میں نے سوچا تھا کہ پنی کو فون کروں اور اسے بتا دوں کے ہم بالکل خیریت سے ہیں۔ لیکن جو کچھ مجھے نور کی زبانی معلوم ہوا، میں نے ایسا نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ 19 کو دستاویزات ہمارے ہاتھ میں تھیں۔ اسی دن کیپٹن صلاح الدین، لیفٹیننٹ نور، گروپ کیپٹن کھنڈکر اور کیپٹن چودھری نے تاج الدین اور کرنل عثمانی کو تمام تفصیلات سے آگاہ کر دیا۔ انہوں نے تاج الدین سے مسٹر آر آئی چوہدری کو ٹھنڈا کرنے اور تمام متعلقہ افراد کے ساتھ سمجھوتہ کروانے کی درخواست بھی کی۔

تاج الدین نے مسٹر آر آئی چوہدری اور ہم دونوں کو ایک ہی شام تھیٹر روڈ بلایا۔ ہم مسٹر چوہدری سے پہلے وہاں پہنچ گئے اور تاج الدین اور کرنل عثمانی کو آداب عرض کیا۔ انہوں نے جواب میں ہمیں دعا دی۔

تاج الدین نے کہا: ''میں نے مسٹر چوہدری کو یہاں بلایا ہے۔ جو بھی ہونا تھا ہو چکا ہے، اب اس کے بارے میں مت سوچو۔ لیکن جب وہ یہاں پہنچتے ہیں تو تم دونوں ان سے معافی مانگو۔ اگرچہ مسٹر چوہدری

بظاہر ایک سخت مزاج آفیسر نظر آتے ہیں لیکن دل میں وہ کسی بچے کی طرح نرم اور سادہ ہیں۔“

کچھ دیر بعد مسٹر چوہدری اور نمی پہنچ گئے۔ نور نے انہیں خوش آمدید کہا اور تاج الدین کے کمرے میں لے آیا، کرنل عثمانی بھی وہاں موجود تھے۔ ہمیں اندر بلایا گیا۔ جیسے ہی ہم اندر داخل ہوئے تاج الدین گرجے، ”تم نے یہ کیا کیا ہے؟ اس قسم کا اخلاق سوز عمل کرنے کی تم کو کیسے جرأت ہوئی؟ مجھے تمہارے اس نامناسب رویے سے بہت صدمہ پہنچا ہے۔ شادی بچوں کا کھیل نہیں ہوتا۔ اپنے بزرگوں کی دعاؤں کے بغیر کوئی بھی خوش نہیں رہ سکتا۔ اب تم دونوں فوراً مسٹر چوہدری سے معافی مانگو۔ مسٹر چوہدری یہ آپ کے بچے ہیں۔ ناسمجھی میں انہوں نے بہت بڑی غلطی کی ہے۔ اب میں درخواست کرتا ہوں کہ برائے مہربانی انہیں معاف کردیں اور اپنی دعاؤں سے نوازیں۔“

جیسے ہی تاج الدین نے اپنی بات مکمل کی، ہم دونوں مسٹر چوہدری کے قدموں میں گر گئے۔ نمی نے رونا شروع کردیا اور چاچا یعنی مسٹر چوہدری موم کی طرح پگھل گئے۔ انہوں نے ہمیں اٹھایا اور دونوں کو گلے لگا کر خود رونے لگے۔ نور اور صلاح الدین پاس کھڑے تھے، ویٹر مٹھائی لے کر آ گئے۔ تھیٹر روڈ کا سارا ماحول خوشی اور مسرت میں ڈھل گیا۔ چاچا نے ہمیں بتایا کہ ماں کو بہت صدمہ ہوا ہے کہ نمی اس طرح گھر سے نکل کر شادی کر سکتی ہے۔ وہ ایک خوددار اور جذباتی اور شدید انا رکھنے والی خاتون ہیں۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ جب تک وہ ٹھنڈی نہیں پڑ جاتیں، ہم دونوں کو ان سے ملاقات نہیں کرنی چاہیے۔

لہٰذا فیصلہ کیا گیا کہ جب تک 3 سہروردی روڈ پر سب کچھ معمول پر نہیں آ جاتا، کچھ دن مزید گیسٹ ہاؤس میں قیام رکھنا چاہیے۔ نمی ہم سب سے بہت ناراض تھا کیوں کہ اسے شادی کے اس سارے معاملے سے باہر رکھا گیا تھا۔ تاج الدین نے کہا، ”تم نے ایک دوسرے سے شادی کا فیصلہ اپنے طور پر کیا ہے۔ یاد رکھو کہ آج کے بعد تمہیں اچھے دوستوں کی طرح رہنا ہوگا اور ایک دوسرے کا مددگار ہونا ہوگا۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے، وقت کے ساتھ بہت کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ میری دعا ہے کہ آپ دونوں ایک لمبی اور خوشگوار شادی شدہ زندگی گزاریں۔“

جیسے ہی ہم نے تاج الدین صاحب سے رخصت طلب کی اور باہر آئے، نور، نمی، صلاح الدین اور دوسرے لوگوں نے ہمیں گھیر لیا۔ کرنل عثمانی بھی ہم میں شامل ہو گئے۔ وہ نئے شادی شدہ جوڑے سے ہر طرح کا مذاق کر رہے تھے۔ کرنل عثمانی کی جانب سے اس رات میس میں ایک شان دار دعوت کا انتظام کیا گیا۔ اپنی زندگی کے اس اہم موڑ پر ہمیں تاج الدین، کرنل عثمانی، گروپ کیپٹن کھنڈکر، کیپٹن چوہدری، کیپٹن صلاح الدین، لیفٹیننٹ نور، موٹری ماسی، پاریتا باؤدی، اروپ دا، گاؤری دی، غنی نانا، مسز زمان، نائلہ، لینٹی کی جانب سے جو محبت، خلوص، پیار اور شفقت نصیب ہوئی، وہ ہمیشہ کے لیے ہماری خوشگوار یادوں میں زندہ رہے گی اور ہم ان تمام لوگوں کے عمر بھر ممنون رہیں گے۔

میں ان تمام مصروفیات اور تناؤ کے دنوں میں دوائی لینا بھول گیا اور انجکشن بھی نہ لگوا سکا، نہ ہی

پٹی تبدیل کروا سکا۔ اس لیے اچانک درد میں اضافہ ہو گیا اور مجھے حرارت بھی ہو گئی۔ زخم بری طرح گلنا سڑنا شروع ہو گیا تھا۔ میں دوبارہ فوراً ڈاکٹر مکھر جی کے پاس گیا۔ زخموں کا معائنہ کرنے کے بعد وہ بہت پریشان ہو گئے۔ محض لاپروائی کی وجہ سے گینگرین کی ابتدا ہو گئی تھی۔ میرا بازو بچانے کے لیے فوری طور پر آپریشن کی ضرورت تھی۔ ہم سب بہت پریشان ہو گئے۔ اگر میں ہسپتال میں داخل ہو گیا تو نمی فلیٹ میں تنہا کیسے رہے گی؟ میرے لیے یہ بہت بڑی پریشانی تھی۔ مجھے حقیقت میں سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ میں کیا کروں۔ غنی نانا دوبارہ میری مدد کے لیے آگے آئے۔

''نمی میری بیٹی ہے۔ یہ ہمارے ساتھ رہے گی۔ تمہیں اس کے بارے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم فوراً ہسپتال میں داخل ہو جاؤ۔''

مجھے بہت زیادہ اطمینان حاصل ہوا اور میں نے اور نمی نے غنی نانا کی اس شفقت بھری پیشکش پر اُن کا شکریہ ادا کیا۔ جواب میں انہوں نے کہا، ''تمہیں شکریہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تم دونوں سے پیار کرتا ہوں اور پیار ذمہ داریوں کو بانٹنے کا تقاضا کرتا ہے۔''

پاروتی باؤدی نے مجھے پی جی ہسپتال میں داخل کرانے کے تمام انتظامات مکمل کر لیے تھے۔ ڈاکٹر مکھر جی نے گینگرین کو مزید پھیلنے سے روکنے کے لیے میرا آپریشن کیا، میری بائیں ہتھیلی کا کچھ حصہ کاٹ دیا گیا۔ آپریشن کے بعد ڈاکٹر مکھر جی نے کہا کہ اگر ہم ایک یا دو دن مزید دیر کر دیتے تو پھر میرا پورا بازو کاٹنا پڑ سکتا تھا۔

جن مصائب سے نمی گزر رہی تھی، وہ میرے لیے بہت تکلیف دہ تھے۔ جب سے ہم نے شادی کی تھی، میرے اندر ایک احساسِ جرم جیسی کیفیت پیدا ہو رہی تھی جس کا میں کھل کر اظہار نہیں کرتا تھا۔ اسے غیر یقینی صورتِ حال میں کھینچ لانے اور اس کی قسمت کو اپنے ساتھ باندھ لینے پر میں اپنے آپ کو موردِ الزام ٹھہراتا تھا۔ لیکن بہرحال ایک مسلمان کی حیثیت سے میرا ایمان تھا کہ شادی ایک ایسا عمل ہے جو آسمان پر طے پاتا ہے۔ تاہم میں بخوبی سمجھ سکتا تھا کہ اس کے اندرونی جذبات کیا تھے۔ وہ اپنے خاندان کے افراد، خاص طور پر خالہ ماں کے بارے میں سوچتے ہوئے ایک جہنم سے گزرتی ہو گی۔ وہ دونوں اچھے دوستوں کی طرح ایک دوسرے کے بہت قریب تھیں۔ اگرچہ ہر چیز موجود تھی اور ہر کوئی آس پاس ہی تھا، پھر بھی اس وقت وہ ایک انتہائی تنہا ہستی تھی۔ وہ محض پناہ کی خاطر در بدر گھوم رہی تھی۔ سب سے بڑھ کر وہ میری صحت کے بارے میں بہت فکر مند تھی۔

نبی سے ہمیں پتا چلا تھا کہ چاچا مکمل طور پر بکھر چکے تھے۔ وہ ہمیں فوراً واپس گھر لانا چاہتے تھے۔ لیکن خالہ ماں کا ردِعمل دیکھتے ہوئے وہ یہ تجویز پیش نہیں کر سکتے تھے۔ خالہ ماں بھی اتنی ہی شفیق تھیں۔ ان کا فوری ردِعمل بالکل جائز تھا۔ وہ نمی کے بارے میں خاص جذبات رکھتی تھیں اور اس کی جانب سے انہیں یہ شدید جھٹکا لگا تھا۔ شاید یہی بات تھی جس پر سمجھوتہ کرنا وہ مشکل محسوس کر رہی تھیں۔ ان سب چیزوں نے مل کر

صورتِ حال کو بہت پیچیدہ بنا دیا تھا اور یہ سارے زخم نمی کو سہنے پڑ رہے تھے۔ وہ اندر سے مکمل ٹوٹ چکی تھی لیکن اپنے مصائب سے مجھے پریشان نہ کرنے کے خیال سے کسی بات کا اظہار نہیں کرتی تھی۔ ہر بات کو خاموشی سے برداشت کرتے ہوئے وہ بالکل مکمل طور پر معمول کے مطابق نظر آنے کی کوشش کرتی تھی۔ اس کی قربانی، برداشت اور شرافت کے سامنے میں اُپنے آپ کو بہت چھوٹا محسوس کرتا تھا۔ جس ناگوار صورتِ حال سے وہ گزر رہی تھی، میں اپنے آپ کو مکمل طور پر اس کا ذمہ دار خیال کرتا تھا اور ہر وہ قربانی دینے کے لیے تیار تھا، جس سے وہ اس تکلیف دہ صورتِ حال سے باہر نکل سکے۔

مجھے ہسپتال میں تقریباً ایک ہفتہ رہنا پڑا۔ وہاں سے آنے کے بعد ایک دن میں نے اسے اپنے ساتھ لیا اور سیدھا 3 سہروردی ایونیو جا پہنچا۔ چاچا، پپی اور مانو سب ہمیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور ہمیں محبت کے ساتھ گلے لگایا۔ میں نے پپی سے پوچھا، ''خالہ ماں کہاں ہیں؟''

پپی نے جواب دیا، ''وہ اپنا زیادہ وقت اپنے بیڈروم میں ہی بسر کرتی ہیں۔ ان دنوں وہ بمشکل ہی کسی سے بات کرتی ہیں۔''

میں سیدھا ان کے کمرے میں چلا گیا۔ وہ اپنے بستر پر لیٹی ہوئی تھیں۔ وہ مجھے دیکھ کر بہت زیادہ حیران ہوئیں۔ وہ مجھے یوں دیکھ رہی تھیں جیسے کوئی بھوت دیکھ لیا ہو۔ وہ بستر سے اٹھیں۔

اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتیں، میں نے انہیں ایک ہاتھ تھام کر اٹھا لیا اور کہا، ''خالہ ماں خدارا ہمیں معاف کر دیں۔ آپ کو معاف کرنا ہی پڑے گا۔''

اس غیر متوقع رویے سے مکمل طور پر حیران ہوتے ہوئے انہوں نے جواب دیا، ''دیکھو، سر پھرے لڑکے، تم کیا کر رہے ہو؟ تم اپنے آپ کو زخمی کر لو گے۔ مجھے نیچے کھڑا رہنے دو۔''

''میں آپ کو اس وقت تک نہیں چھوڑوں گا، جب تک آپ ہمیں معاف نہیں کر دیتیں۔''

میری التجا کی شدت نے آخر کار اس برفانی تودے کو پگھلا دیا۔ انہوں نے مجھے ماؤں جیسی شفقت کے ساتھ گلے لگا لیا۔ اب وہ اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکیں اور آنسو ان کے رخساروں پر بہنے لگے۔ میں اس قدر جذباتی ہو گیا تھا کہ میں اپنے بازو کے بارے میں بھی بھول گیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد انہوں نے اپنے آپ پر قابو پایا اور پوچھا، ''نمی کہاں ہے؟''

''وہ ڈرائنگ روم میں چاچا، پپی اور مانو کے ساتھ ہے۔'' میں نے بتایا۔

''مجھے وہاں لے جاؤ۔'' وہ ابھی تک گھبرائی ہوئی تھیں۔

میں نے انہیں اپنے بازوؤں میں اٹھا لیا اور ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ وہاں ہر کوئی حیران تھا۔ شاید وہ اس قسم کی ڈرامائی تبدیلی کی توقع نہیں رکھتے تھے اور حیران تھے کہ یہ سب کیسے ہو گیا۔ میں نے ان کی سوالیہ نگاہوں میں یہ سب کچھ پڑھ لیا تھا۔ نمی دوڑتی ہوئی خالہ ماں کے پاس آئی اور آنسو بھری آنکھوں سے انہیں اپنے ساتھ چمٹا لیا۔ سارا غصہ اور غلط فہمی، محبت اور شفقت کے دھارے میں بہ گئی۔ وہ دل کھول کر رو رہی

تھی۔ہم سب خاموش کھڑے تھے اور ماں اور بیٹی کے خوشگوار ملاپ سے لطف اٹھا رہے تھے۔ اسی دن ہمیں غنی نانا کی رہائش گاہ کو چھوڑنا پڑ گیا۔ چاچا اور خالہ ماں دونوں ہمارے ساتھ غنی نانا اور ان کے خاندان کا شکریہ ادا کرنے گئے اور ہمیں 3 سہروری ایونیو لانے کی اجازت طلب کی۔ میں خالہ ماں کی دیکھ بھال کے نتیجے میں توقع سے جلدی صحت یاب ہونے لگا۔

73۔مشتاق احمد کو اقوام متحدہ اور یورپ کے دورے پر جانے نہ دیا گیا

عوامی لیگ کے بہت سے منتخب نمائندے جنرل یحییٰ کی عام معافی کی پیشکش سے فائدہ اٹھانے کے لیے بے تاب تھے۔ وہ ڈگمگا رہے تھے کیوں کہ وہ آزاد بنگلہ دیش کے مستقبل کے بارے میں غیر یقینی کیفیت کا شکار تھے۔ ان کا ایک حصہ ہندوستانی منصوبے کی بو سونگھ رہا تھا اور خوف زدہ ہو گیا تھا۔ لیکن جو لوگ واپس جانا چاہتے تھے، اندرا حکومت ان کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔ ہندوستان کی حکومت نہیں چاہتی تھی کہ عبوری حکومت یحییٰ حکومت کے ساتھ کوئی سودا یا سمجھوتہ کرے۔ ہندوستانی دباؤ میں مجیب نگر کی حکومت کو بیان دینا پڑا کہ عبوری حکومت عام معافی کی پیشکش کو مسترد کرتی ہے اور صدر یحییٰ خان اور اس کی حکومت کے ساتھ کسی قسم کی گفت وشنید نہیں کرے گی۔ اس مرحلے پر مجاہدین آزادی بھی اس قسم کی کسی بھی تجدید تعلقات کے خلاف تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ کسی بھی سمجھوتے کے لیے اب بہت دیر ہو چکی تھی اور وہ مکمل آزادی کے خواہاں تھے۔

74۔عبوری حکومت کی ہندوستان سے اُسے فوری طور پر تسلیم کرنے کی درخواست اور اندرا گاندھی کا ردّعمل

کھنڈکر مشتاق احمد کے ناکام منصوبے کے بعد عوامی لیگ کی قیادت کے اندرونی جھگڑے کھل کر سامنے آ گئے تھے۔ ہندوستان کی حکومت گھبراہٹ کا شکار ہو گئی اور بنگلہ دیش کے مسئلے کا جلد کوئی حل تلاش کرنے میں سرگرم ہو گئی۔ ہندوستان کو خطرہ تھا کہ اگر جدوجہد طویل ہو گئی تو فوجی اور سیاسی صورتِ حال عبوری حکومت کے قابو سے باہر ہو سکتی ہے، اور اس سے ان کا اپنا مفاد اور ''عظیم سازشی منصوبہ'' خطرے میں پڑ سکتا ہے۔ ان خدشات کے پیش نظر تاج الدین احمد نے ہندوستانی حکام کو اس بات پر قائل کرنے کی کوشش کی کہ وہ بنگلہ دیش کی عبوری حکومت کو تسلیم کرنے پر غور کریں اور پھر براہِ راست فوجی مداخلت کے ذریعے خود جنگ میں شریک ہو جائیں۔ یہ سب سے بہترین حل خیال کیا جا رہا تھا۔ ہندوستانی حکام نے تاج الدین احمد کے مشورے کو معقول قرار دیا لیکن عبوری حکومت کو فوراً تسلیم کرنے اور جنگ میں براہِ راست ملوث ہونے کے مشورے کو ہوش مندانہ خیال نہ کیا گیا بلکہ اندرا گاندھی نے فیصلہ کیا کہ وہ دنیا کے ممتاز رہنماؤں، خاص طور پر دو بڑی طاقتوں کے ساتھ صلاح مشورہ کے بعد ہی اس بارے میں کوئی قدم اٹھائیں گی۔ انہوں نے

امریکہ، روس اور چند یورپی ممالک کا ایک طوفانی دورہ کیا۔ اس دورے کا اہم مقصد بنگلہ دیش کے مسئلے پر عالمی رہنماؤں سے بات چیت اور ان کے خیالات جاننے کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی پوزیشن کے بارے میں وضاحت کرنی تھی۔

امریکہ اور مغربی یورپ کے ممالک نے اگرچہ ہندوستان کی تشویش اور انسانی بنیادوں پر پناہ گزینوں کی مدد کرنے کے عمل کی تعریف کی لیکن مشرقی پاکستان میں موجود بحران کو پاکستان کا اندرونی معاملہ قرار دیا۔ تاہم انہوں نے اندرا گاندھی کو انسانی بنیادوں پر رقوم اور اشیاء کی صورت میں بڑی مقدار میں امداد دینے کا وعدہ کیا تاکہ پناہ گزینوں کی مشکلات اور ہندوستان پر پڑنے والے اس معاشی بوجھ میں کچھ کمی کی جاسکے۔ ان امدادی رقوم اور اشیا میں سے کتنی مقدار پناہ گزینوں تک حقیقت میں پہنچ سکی؟ عمومی تاثر یہی پایا جاتا ہے کہ اس کا ایک بہت ہی معمولی سا حصہ پناہ گزینوں تک پہنچ سکا۔ امدادی اشیاء اور رقوم کا ایک بڑا حصہ مجیب نگر تک بھی نہیں پہنچ پایا تھا۔

اپنے اس دورے کے بعد اندرا گاندھی سمجھ گئیں کہ امریکہ اور مغربی یورپ کے ممالک کسی فوجی مداخلت کے لیے ہندوستان کی حمایت نہیں کریں گے کیوں کہ ان کے نزدیک ابھی تک یہ پاکستان کا اندرونی معاملہ تھا۔ دوسری جانب ایشیا کی ایک اور طاقت عوامی جمہوریہ چین اپنے دوست ملک پاکستان کی مدد کرنے کے لیے ہندوستان کے خلاف عملی طور پر بھی کارروائی کرسکتا تھا۔ ان حالات کے تحت انہوں نے اپنے اتحادی ملک روس سے ''ہندروس امن، دوستی اور تعاون معاہدے'' پر دستخط کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں نہیں جانتا کہ اس معاہدے سے ہندوستان کے عوام کو کس حد تک فائدہ حاصل ہوا۔ لیکن مسز اندرا گاندھی اور ہندوستان کی حکمران اشرافیہ اس کے سائے میں براہِ راست فوجی مداخلت کے ذریعے پاکستان کو توڑ کر کمزور کرنے کی اپنی دیرینہ خواہش کی تکمیل میں کامیابی کے ساتھ ساتھ نئے آزاد ہونے والے بنگلہ دیش میں ایک کٹھ پتلی حکومت قائم کرنے میں ضرور کامیاب ہوگئیں۔ ہندوستان کے لیے پاکستان کے حصے بخرے ہونے سے نہ صرف ان کا دشمن کمزور ہوا بلکہ یہ پاکستان کے بنیادی جواز پر ایک شدید ضرب بھی تھی۔ وہ اس ٹوٹ پھوٹ کو اپنے ''اکھنڈ بھارت'' کے دیرینہ خواب کی تعبیر کی جانب ایک قدم بھی خیال کرتے تھے۔ ہندوستان کو اپنے سب سے بڑے دشمن پاکستان کا استحصال کرنے کا موقع مہیا کرنے میں دو اہم عوامل مددگار ثابت ہوئے جو اگرچہ نوعیت کے اعتبار سے علیحدہ علیحدہ تھے لیکن ان کا آپس میں گہرا تعلق تھا۔ یہ دو عوامل تھے:

1- غیر مساوی ترقی اور اس کے نتیجے میں ایک دوسرے کے مقابلے میں جنم لینے والی محرومیاں۔
2- بنگالی ثقافت اور زبان کے خلاف مستبدانہ اقدامات، جو کہ بنیادی طور پر نسلی طرزِ زندگی کی عفونت کا نتیجہ تھا۔

75- بنگلہ دیش کا قیام ''دوقومی نظریے'' کی نفی نہیں

بہت سے لوگ خیال کرتے ہیں کہ بنگلہ دیش کا قیام ''دوقومی نظریے'' کی نفی کرتا ہے۔ لیکن

میرے نزدیک بنگلہ دیش کے قیام نے ایک دفعہ پھر ثابت کر دیا ہے کہ جنوبی ایشیا بہت سی اقوام پر مشتمل ہے اور اس طرح ''اکھنڈ بھارت'' کی تاریخی داستان کی نفی کرتا ہے۔

76۔ 25 سالہ معاہدہ قومی غداری تھا

روس کے ساتھ معاہدے پر دستخط کرنے کے بعد ہندوستان نے بنگلہ دیش کی جلاوطن عبوری حکومت کو رسمی طور پر تسلیم کر لیا۔ اس کے جواب میں بنگلہ دیش کی عبوری حکومت نے ہندوستان کے ساتھ ایک قومیت دشمن اور انتہائی قابل نفرت 25 سالہ ''ہند بنگلہ دیش تعاون، دوستی اور امن معاہدہ'' پر دستخط کر دیئے۔ اس معاہدے کے تحت ہماری قومی آزادی اور خودمختاری کو عملی طور پر گروی رکھ دیا گیا تھا۔ عبوری حکومت سے لے کر اب تک آنے والی کسی بھی حکومت نے اس معاہدے کے نکات سے عوام کو آگاہ کرنے کی جرأت نہیں کی۔ ہر حکومت نے اس معاہدے کو ایک ''ملکی راز'' کے طور پر رکھا ہے اور عوام کے پرزور مطالبے کے باوجود اسے ظاہر نہیں کیا گیا۔ عوامی لیگ کی تمام کابینہ اور بھی منتخب نمائندوں نے اس کی تصدیق اور حمایت کی تھی۔ صرف دو افراد نے اس کی مخالفت کی تھی اور یہ کرنل عثمانی اور کھنڈکر مشتاق احمد تھے۔ لیکن تمام مخالفت کو ایک جانب رکھتے ہوئے تاج الدین نے اس غیر مساویانہ معاہدے کے ذریعے بنگلہ دیش کے مستقبل کو غلامی میں دے دیا جو کہ ایک نئے قائم ہونے والے ملک کی تاریخ کا سیاہ باب ثابت ہوا۔ اس معاہدے پر دستخط کرنے کے بعد یہ بات یقینی ہو گئی تھی کہ ہندوستان اب مشرقی پاکستان میں براہِ راست فوجی مداخلت کرے گا اور یوں ایک دوسری پاک ہند جنگ ناگزیر ہو چکی تھی۔ مجاہدین آزادی کا محبِ وطن حصہ جنگ آزادی میں ہندوستانی فوج کی براہِ راست مداخلت کے سراسر خلاف تھا۔ وہ اپنے خون اور پسینے سے اور ایک لمبی جنگ لڑ کر آزادی حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اگر ایسا ہونے کی اجازت دی جاتی تو دو انتہائی اہم نتائج حاصل کیے جا سکتے تھے۔ لمبی جدوجہد کے بعد ایک پرکھی ہوئی قیادت ابھر کر سامنے آئی تھی اور جنگ کی آگ اور قربانیوں میں پوری قوم کی صفائی ہو سکتی تھی۔ لیکن اس سازش کے معماروں نے بڑی ہوشیاری سے بنگالی قوم کو ان دو اہم فوائد سے محروم رکھا۔ مجیب نگر حکومت نے ہندوستان کو براہِ راست مداخلت کی دعوت دیتے ہوئے راستہ صاف کر دیا۔

مجاہدین آزادی واضح طور پر سمجھ چکے تھے کہ اب سے ان کی جدوجہد دو طرفہ ہو گی۔ ایک محاذ پر انہیں جارحین کے خلاف لڑنا ہو گا اور دوسرے محاذ پر انہیں ہندوستان کی قابض افواج کے خلاف مزاحمت کے لیے تیار ہونا ہو گا۔ انہیں اپنی قوم کو غلام بنانے کے منصوبے کو ناکام بنانے کے لیے لڑنا ہو گا۔ معاہدے پر دستخط کرنے اور عبوری حکومت کے تسلیم کیے جانے کے بعد عوامی لیگ حکومت نے ہندوستانی مداخلت اور بنگلہ دیش کو آزاد کروا کر انہی کے سپرد کیے جانے کے عمل کے لیے دن گننے شروع کر دیئے۔ وہ سب واپس جانے اور ملک پر اپنا اقتدار مسلط کرنے کے لیے بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ محض اپنے آپ کو تسلیم کروائے جانے

کے عوض عبوری حکومت اس بات پر متفق ہو چکی تھی کہ آزادی کے بعد بنگلہ دیش اپنے آئین کی تشکیل میں ہندوستانی آئین کے چار اصولوں کو ستون کے طور پر اختیار کرے گا۔

77۔ بنگلہ دیش کے استحکام کے بارے میں ہندوستانی نقطہ نظر

جلاوطنی کے دوران لوگ بعض اوقات دانشورانہ سرگرمیوں میں پناہ تلاش کر لیتے ہیں۔ یہ وقت گزاری کا ایک اچھا ذریعہ ثابت ہوتا ہے۔ بنگلہ دیش کی خارجہ پالیسی، معیشت، انتظامیہ وغیرہ ان کے موضوعات ہوا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ اسی قسم کی ایک بحث میں عبوری حکومت کے ایک معاشی مشیر نے رائے دی کہ ''بنگلہ دیش ایک قائم رہنے والی اپنی آزاد معیشت استوار نہیں کر سکتا۔'' اس کی اس رائے نے وہاں پر موجود بہت سارے لوگوں کو حیران کر دیا۔

اس سے پوچھا گیا، ''اگر بنگلہ دیش معاشی طور پر مستحکم نہیں ہو سکتا تو پھر آپ نے چھے نکات کیوں تشکیل دیئے اور لوگوں کو کیوں اکسایا؟ آپ نے اور آپ کے رہنماؤں نے لوگوں کو کیوں کہا کہ اگر مغربی پاکستان کے استحصالی شکنجے سے آزادی حاصل کر لی جائے تو بنگلہ دیش ''سنار بنگلہ'' میں تبدیل ہو سکتا ہے۔ کیا آپ کی بات کا یہ مطلب ہے کہ آپ کے تمام تر پروپیگنڈا کا مقصد لوگوں کو بے وقوف بنانے کے لیے ایک جھانسے اور پاکستان کو حصوں بخروں میں تقسیم کرنے کے علاوہ اور کچھ نہ تھا؟'' اس شریف انسان کے پاس ان سوالات کا کوئی جواب نہ تھا اور انتہائی شرم سار ہوتے ہوئے وہ اٹھ کر باہر نکل گیا۔ اسی طرح کی ایک اور غیر رسمی مجلس میں کچھ بنگلہ دیشی دانشوروں اور نوجوان ماہرین معاشیات نے ڈی پی دھر سے بنگلہ دیش کے بارے میں ان کے نظریات کے حوالے سے سوال کیا۔ وہ خاص طور پر آزاد بنگلہ دیش کے معاشی استحکام کے بارے میں ان کے خیالات جاننا چاہتے تھے۔ دوسری باتوں کے علاوہ جب انہوں نے معاشی اور صنعتی پالیسیوں کے بارے میں سوال کیا تو مسٹر دھر نے ایک بھونڈا سا لیکن دلچسپ جواب دیا اگرچہ یہ رسمی نہ تھا، ''آپ کو اس سارے معاملے کے بارے میں سوچنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ کو صرف چاول پیدا کرنا ہوں گے، باقی ہر چیز کا ہم خود خیال کر لیں گے۔''

اس بیان سے یہ بات واضح ہو رہی تھی کہ ہندوستان کا منصوبہ بنگلہ دیش کو معاشی طور پر ہندوستان کا محتاج بنانے اور اسے اپنی منڈی اور قدرتی وسائل اور خام مال کے لیے داخلی علاقے میں تبدیل کرنے کا تھا۔

78۔ واپس محاذِ جنگ پر

میرے زخم کافی جلد مندمل ہو گئے تھے۔ اگرچہ میں پوری طرح صحت یاب نہیں ہوا تھا لیکن میں نے ستمبر کے آخر میں واپس سیکٹر میں جانے کا فیصلہ کر لیا۔ میرے بائیں بازو پر ابھی تک پٹی بندھی ہوئی تھی۔

جنگ پہلے ہی پورے بنگلہ دیش میں پھیل چکی تھی۔ قابض افواج نقصان اٹھا رہی تھیں کیوں کہ مکتی باہنی اور گوریلے ان پر تمام اطراف سے حملے کر رہے تھے۔ ان کا حوصلہ مکمل طور پر ٹوٹ چکا تھا۔ اس قسم کے شدید حملوں کے نتیجے میں دشمن دیہاتی علاقوں سے پسپا ہونے اور بڑے قصبوں اور شہروں میں دفاعی پوزیشن اختیار کرنے پر مجبور ہوگیا۔ شہروں کے علاوہ باقی ماندہ بنگلہ دیش مکتی باہنی کے کنٹرول میں وسیع وعریض آزاد علاقہ بن چکا تھا۔ گوریلوں اور مکتی باہنی کی کامیابیوں کی وجہ سے آزادی اب محض تھوڑے وقت کا معاملہ رہ گئی تھی۔ یہ اب ناگزیر ہو چکی تھی۔ مجاہدین آزادی میں زیادہ اعتماد پیدا ہو رہا تھا اور اپنی ہر کامیابی کے ساتھ ان کے حوصلے اور تنظیمی قوت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ گوریلے ڈھاکہ سمیت قصبوں اور شہروں میں بھی بشمول ڈھاکہ کے رات کے پردے میں اور دن کے وقت بھی اپنی کارروائیاں جاری رکھے ہوئے تھے۔ دوسری جانب کے سپاہی مکتی باہنی سے بہت زیادہ خوف زدہ تھے۔ پورے بنگلہ دیش میں اور حتیٰ کہ ڈھاکہ شہر میں بھی گوریلوں کی کامیاب کارروائیوں کی داستانیں بیرونی پریس اور ذرائع ابلاغ میں ہر روز شائع ہوتی تھیں۔ ہم سب کے حوصلے بہت بلند تھے۔

اس دوران میں بی ایل ایف کے سپاہی بھی ڈیرہ دون میں تربیت دیئے جانے کے بعد بنگلہ دیش کے اندر مختلف مقامات پر تعینات کیے جا رہے تھے۔ وہ مکتی باہنی کی نسبت بہتر مسلح تھے۔ لیکن وہ دشمن کے خلاف نہیں لڑ رہے تھے۔ وہ عوام دشمن سرگرمیوں میں مصروف تھے، جن میں جبر و استبداد، تشدد، لوٹ مار اور آبرو ریزی جیسے قبیح فعل شامل تھے۔ اس قسم کی سرگرمیوں کے نتیجے میں کئی ایک مقامات پر بی ایل ایف اور ایف ایف کے درمیان بھی جھڑپیں ہوئیں۔ جب جنگ آزادی میں اس قسم کے عناصر سرایت کر رہے تھے تو ایک بہت دلچسپ پیش رفت دیکھنے میں آئی۔ اچانک ہندوستانی ذرائع ابلاغ اور پریس نے قادر صدیقی نامی ایک مجاہد آزادی کو غیر معمولی طور پر اجاگر کرنا شروع کر دیا۔ کسی ساز باز کے انداز میں اسے بہت بڑھا چڑھا کر پیش کیا جا رہا تھا۔ ہم سب بہت حیران تھے۔ قادر صدیقی فرسٹ ایسٹ بنگال رجمنٹ میں نائیک تھا۔ اسے انضباطی بنیادوں پر ملازمت سے سبکدوش کیا گیا تھا۔ یہ حقیقت میں پریشان کن بات تھی کہ ہندوستان قادر صدیقی جیسے شخص کی اس قسم کی تشہیر کیوں کر رہا ہے جو کسی طور پر بھی کوئی غیر معمولی شخصیت نہیں تھا اور نہ ہی اس پروپیگنڈا سے پہلے کوئی جانا پہچانا نام تھا۔ یہ راز 15 اگست 1975ء کی سیاسی تبدیلی کے بعد کھلا۔ اس تاریخی انقلابی تبدیلی کے بعد قادر صدیقی نے تانگیل سے ایک ٹیلی گرام اس وقت کے صدر کھنڈ کر مشتاق احمد کو بھیجا۔ جب اس ٹیلی گرام کا کوئی جواب نہ آیا تو صدیقی نے ہندوستان بھاگ جانے کا فیصلہ کیا اور بعد میں ہندوستانی حکام اور ایجنسیوں کی مدد سے وہ سرحد پار ملک دشمن سرگرمیوں میں مصروف ہوگیا۔ اس کی مذموم سرگرمیوں کے نتیجے میں بنگلہ دیش فوج کے ایک آفیسر اور دو سپاہیوں نے ایک جھڑپ میں اپنی زندگیاں بھی گنوائیں۔ صدر ضیاء الرحمٰن کے دور میں اس کی غیر حاضری میں اس پر مقدمہ چلایا گیا اور سزا سنائی گئی۔ اُس وقت سے وہ ہندوستان میں سیاسی پناہ حاصل کرنے کے بعد وہیں رہ رہا ہے۔

ہندوستانی ذرائع ابلاغ اور پریس، میجر خالد مشرف کو بھی اجاگر کرنے کی کوششوں میں مصروف تھا۔ دوسری جانب میجر ضیاالرحمٰن کو ہمیشہ نظرانداز کیا جاتا رہا اور وہ کبھی بھی اپنا جائز حق حاصل نہ کر سکے۔ عبوری حکومت انہیں ہمیشہ شک کی نگاہ سے دیکھتی رہی۔ عوامی لیگ کے کچھ رہنما تو ان کے تاریخی اعلان کی وجہ سے ان سے شدید نفرت رکھتے تھے۔ عوامی لیگ اتنی عالی ظرف نہیں تھی کہ اس حقیقت کو تسلیم کر سکتی کہ میجر ضیاالرحمٰن کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے قوم مزاحمت کی تحریک میں کودی تھی۔ بہت بعد تک بھی محض اپنے محدود جماعتی مفاد کی خاطر اس سچ چھپانے کی ہر ممکن کوشش کی گئی۔ اگر وہ اس حقیقت کو تسلیم کر لیتے تو پھر وہ جنگ آزادی کے واحد چمپئن ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتے تھے، جس کو وہ اپنا قطعی حق سمجھتے تھے۔ یہ ایک بہت بڑا مسئلہ تھا۔

بہت سے حقیقی مجاہدینِ آزادی کی طرح میجر ضیاالرحمٰن پختہ یقین رکھتے تھے کہ جنگ آزادی کا مقصد ڈھاکہ میں ایک کٹھ پتلی حکومت کے قیام کے ذریعے محض دارالحکومت کو اسلام آباد سے نیو دہلی منتقل کرنا نہیں ہونا چاہیے۔ وہ اس بات پر بھی یقین رکھتے تھے کہ ہمیں اپنی آزادی کے حصول کے لیے متحد ہو کر لڑنا ہوگا، صرف وہی آزادی حقیقی ہو سکتی ہے جو قربانیوں کے ذریعے حاصل کی جائے۔ لوگ صرف اس قسم کی آزادی کی قدر و قیمت کو سمجھ سکتے ہیں۔ ایک لمبی جنگ کے دوران ہر خاندان بتدریج مختلف طریقوں سے اس میں شامل ہوتا چلا جائے گا اور قربانیوں اور مصائب سے ان کی باطنی قوت میں اضافہ ہوگا۔ یہ ہمارے ملک کی بنیادوں کو ٹھوس اور مضبوط بنانے کا باعث بنے گا۔ جدوجہد کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لیے انہوں نے مجاہدین آزادی کی طرف سے کرنل عثمانی کو ایک وسیع البنیاد قومی حکومت کے قیام کا مشورہ دیا جو کہ انہوں نے عبوری حکومت کی خدمت میں پیش کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی میجر ضیاء الرحمٰن نے فیصلہ سازی کے عمل میں مجاہدین آزادی کی شمولیت کو یقینی بنانے کے لیے نیشنل سکیورٹی کونسل تشکیل دینے کا مشورہ بھی دیا۔ مجیب نگر کی حکومت میجر ضیاالرحمٰن کو پسند نہیں کرتی تھی۔ لیکن اس موقع پر وہ اس بارے میں کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی، حکومت کے لیے ایک مقبول کمانڈر کے بارے میں کسی قسم کی ناراضی کا اظہار ممکن نہیں تھا کیوں کہ اسے شدید خدشہ تھا کہ مجاہدین آزادی اس قسم کے کسی بھی عمل یا سلوک کو برداشت نہیں کریں گے۔

79۔ مجھے غیر متوقع طور پر شپن اور قاضی کے بارے میں اطلاع ملی

ایک خوشگوار صبح کو مجھے اپنے پرانے دوست کیپٹن خیرالانعام کا ایک پیغام ملا جو اس وقت دھرم نگر میں قیام پذیر تھا۔ انہوں نے مجھے اطلاع دی کہ میرا چھوٹا بھائی شپن اور میرا بچپن کا دوست قاضی کمال الدین اپنے آفیسر ٹریننگ کورس کے لیے مورتی جاتے ہوئے دھرم نگر پہنچے ہیں اور وہ میرے بارے میں پوچھ رہے ہیں۔ میں نے انعام سے کہا کہ انہیں میرے پاس بھیج دو۔ آخر کار وہ دونوں پہنچ گئے۔ میں شپن کو اس انداز سے ملا گویا مجھے یقین نہ آ رہا ہو۔ میں ان سے مل کر اور گھر کے اور دوستوں کے بارے میں ساری معلومات حاصل کر کے قدرتی طور پر بہت خوش تھا۔ مجھے ڈھاکہ میں ان کی دلیرانہ گوریلا کارروائیوں کے بارے میں

بھی علم ہوا۔ میں ان کی رونگٹے کھڑے کر دینے والی داستانوں کے بارے میں علیحدہ سے لکھنا چاہتا ہوں۔

آزادی کی جدوجہد شروع ہوتے ہی شپن، بڈی، قاضی، جیول، رومی، عالم، چلو، بادل، فتح، پچو، سید، بلو اور محفوظ میلہ گھر سے سرحد پار کر کے اگرتلہ آئے جو سیکٹر 2 کے تحت تھا اور گوریلا جنگ کی بنیادی تربیت حاصل کر کے اسلحہ کے ساتھ واپس ڈھاکہ چلے گئے۔ بعد میں فضل، ضیا، طیب علی، الفت محمد، حارث اور مختار بھی ان کے گروپ میں شامل ہو گئے۔ ان کی ذمہ داری ڈھاکہ شہر کے اندر گوریلا کارروائیاں جاری رکھنا تھی تاکہ گوریلوں کی خبریں بین الاقوامی پریس میں شائع ہوں اور دنیا کی رائے جدوجہد کے حق میں موڑی جا سکے۔ اس کے علاوہ اس قسم کی کارروائیوں سے پاکستانی فوج کے اس دعوئی کی قلعی بھی کھل جاتی تھی کہ پورے مشرقی پاکستان پر اس کا مکمل کنٹرول ہے۔ گوریلوں کے گروپس نے زورین، گل باغ، گرین روڈ، شید ھیر گنج پاور اسٹیشن، دھولائی کھل، جاترا باڑی، انٹر کانٹی نینٹل اور فارم گیٹ وغیرہ میں اپنی شان دار کامیاب کارروائیوں سے پاک فوج کے لیے قیامت برپا کر دی تھی۔ فوجی حکومت نے ان میں سے ہر ایک کے سر کا 20,000 روپے انعام مقرر کر رکھا تھا۔ لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ وہ پاک فوج کی آنکھوں میں دھول جھونکتے ہوئے دن دیہاڑے ڈھاکہ میں کارروائیاں کرتے تھے اور پھر ان کی آنکھوں کے سامنے گھومتے رہتے تھے لیکن پکڑے نہیں جاتے تھے۔ انہوں نے حقیقت میں قابض افواج کے لیے ایک دہشت کی فضا قائم کر دی تھی۔ ''مکتی'' کا نام ان کے لیے ایک موت کی علامت بن چکا تھا۔

ڈھاکہ کے لوگوں کو گوریلوں کی ان کارروائیوں میں امید کی کرن نظر آتی تھی۔ اکثر لوگ ان کے لیے دعائیں کرتے تھے۔ لیکن بنگالیوں میں ہر دَور میں میر جعفر بھی موجود رہے ہیں۔ ایسے ہی ایک میر جعفر کی غداری ان کے لیے بلائے ناگہانی ثابت ہوئی۔ اس غداری کی اہمیت بھی پلاسی کی جنگ میں میر جعفر کی غداری سے کسی طور پر کم نہ تھی۔ 29 اگست کو ان کا ایک ساتھی بڈی 28 دھان منڈی روڈ پر اپنے ایک مشترکہ دوست فرید کو پہلے سے طے شدہ پروگرام کے تحت ملنے کے لیے گیا۔ فرید، عوامی لیگ کے ایک اہم رہنما ضیا الرحمٰن کا سالا یعنی مسز ایوی رحمٰن کا بھائی تھا۔ تقریباً 12 بجے دوپہر کو بڈی کے وہاں پہنچنے کے تھوڑی دیر بعد فوج نے گھر پر حملہ کر دیا اور اسے گرفتار کر لیا گیا۔ یہ بے وفائی اور غداری کی ایک واضح واردات تھی۔

اس کے بعد گرفتاریوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا، اسی سہ پہر کو حمید کو 4 بجے کے قریب پکڑ لیا گیا۔ آزاد کے گھر پر آدھی رات 12 بجے کے قریب چھاپہ مارا گیا۔ اس رات اس کے گھر سے جیول، قاضی، بشیر، آزاد، اس کا ایک کزن، اس کا سالہ اور چند دوسرے مرد ارکان گرفتار کیے گئے۔ ان سب میں سے صرف قاضی نے جان پر کھیل کر فرار ہونے کی کوشش کی۔ اس نے اچانک ایک آفیسر سے سٹین گن چھین لی اور فائرنگ کرتے ہوئے بھاگ نکلا۔ یہ واقعہ اتنا اچانک اور غیر متوقع ہوا تھا کہ پیشتر اس کے کہ کسی کو کچھ سمجھ آتی وہ گولیوں کی بوچھاڑ میں بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ آزاد کے گھر کے نزدیک ہی عالم کے گھر پر صبح 2 بجے چھاپہ مارا گیا۔ قاضی کسی نہ کسی طرح بالکل برہنہ حالت میں عالم کے گھر پہنچ گیا۔ عالم کی چھوٹی بہن نے اسے

ایک لنگی دی اور اسے وہاں سے بھاگ جانے کو کہا۔ قاضی کے جانے کے فوراً بعد عالم کے گھر پر بھی چھاپہ مارا گیا۔ عالم کے چچا مسٹر عبدالرزاق اور ان کے بیٹے میزان الرحمٰن کو گرفتار کرلیا گیا۔ عالم اس رات وہاں موجود نہیں تھا اس لیے بچ گیا۔

ہٹ کوٹھا میں بچو کے گھر سے اس کے سالے ولایت چوہدری کو تقریباً صبح 3 بجے گرفتار کیا گیا۔ فتح اور بچو دونوں بھائی خوش قسمتی سے اس رات گھر پر موجود نہیں تھے، وہ بچ گئے۔ چلو کے بڑے بھائی ایم اے صادق ایک اعلیٰ رتبے کے سی ایس پی آفیسر تھے، تقریباً رات ساڑھے بارہ بجے ان کی سرکاری رہائش گاہ ''بیرامنٹ ہاؤس'' نمبر 1 ایلیفینٹ روڈ پر چھاپا مارا گیا اور چلو کو گرفتار کرلیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی آدھی رات کو رومی کے گھر پر بھی چھاپا مارا گیا اور رومی، رومی کے والد مسٹر شریف جو ایک اعلیٰ سرکاری آفیسر تھے، رومی کے چھوٹے چھوٹے بھائیوں جامی، معصوم اور حافظ کو گرفتار کرلیا گیا۔ مالی باغ میں ہمارے گھر پر ایک کیپٹن قیوم کی قیادت میں رات ڈیڑھ بجے کے قریب چھاپا مارا گیا۔

چلو کو ایلیفینٹ روڈ سے گرفتار کرنے کے بعد آنکھوں پر پٹی باندھ کر ایک جیپ میں بٹھا کر ساتھ لایا گیا تھا۔ پہلے اسے پتا نہ چل سکا کہ یہ کون سی جگہ ہے۔ اچانک اس نے فوجی کو کہتے سنا، ''شپن بھاگ گیا ہے۔''

اس نے میرے والد کی آواز بھی سنی۔ اس نے لڑکیوں کو روتے چلاتے سنا۔ وہ اندازہ لگا سکتا تھا کہ میری تمام بہنیں مہوا، کیا، سنگیتا رو رہی تھیں۔ میرے والد ایک سینئر گورنمنٹ آفیسر مسٹر شمس الحق، میرے چچا مسٹر شفیق، ہاشم، شامو اور دو گھریلو ملازموں کو حراست میں لے لیا گیا تھا۔ صبح پانچ بجے کے قریب الطاف محمود کے گھر پر چھاپا مارا گیا۔ اس وقت ایک مجاہد آزادی علوی گھر میں موجود تھا۔ لیکن جب اسے گرفتار کیا گیا تو اس نے اپنی شناخت ظاہر نہ ہونے دی۔ اس کی بجائے اس نے بتایا کہ اس کا نام بارک ہے۔ صمد جس کو پہلے گرفتار کیا گیا تھا اور آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئیں تھی، الطاف محمود کے گھر پر چھاپے کے وقت ساتھ ہی تھا۔ مسٹر الطاف محمود اور اس کے تین سالے علوی (بارک)، رسول اور ناصر کو گرفتار کرلیا گیا۔ بعد میں علوی کو اس کے جعلی نام کی وجہ سے رہا کر دیا گیا۔ اس طرح ایک بہت کامیاب گوریلا جتھہ، جس نے دارالحکومت ڈھاکہ میں قیامت برپا کردی تھی، ''1971ء کے میر جعفر'' فرید کی وجہ سے تباہ کر دیا گیا۔

دونوں مفرور شپن اور قاضی دھولائی کھل بیس کیمپ میں ملے۔ وہاں سے وہ میلہ گھر گئے جہاں انہیں دوسرے 118 مجاہدین آزادی کے ساتھ آفیسر ٹریننگ کورس کے لیے منتخب کرلیا گیا۔ لیکن یہ دونوں کورس میں شامل ہونے کے لیے آمادہ نہ تھے اور انہوں نے کیپٹن خالد مشرف اور کیپٹن حیدر سے اسلحہ کے ساتھ انہیں واپس بھیجنے کی درخواست کی۔

وہ اپنے ساتھیوں کو قید سے رہائی دلانا اور اپنے آپ کو دوبارہ منظم کرنا چاہتے تھے۔ اگر وہ میجر خالد کے خاندان اور کیپٹن نورالاسلام شیشو کے خاندان کو بچا سکتے تھے تو پھر وہ بڈی، رومی اور دوسرے ساتھیوں

کو کیوں نہیں بچا سکیں گے؟ ان کے جذبات اور احساسات سے میجر خالد بہت متاثر ہوئے لیکن انہوں نے درست طور پر فیصلہ کیا کہ اس وقت ان کو واپس بھیجنا ایک نا قابل عمل اور بے کار فعل ہوگا۔ لہٰذا انہوں نے انہیں آفیسر ٹریننگ کورس کے لیے بھیجنا مناسب خیال کیا۔ میں نے بھی انہی خطوط پر سوچا اور انہیں آفیسر ٹریننگ کورس میں شمولیت کا مشورہ دیا۔

80۔ جنگ کی شدت میں اضافہ

نومبر میں جنگ کی شدت میں اضافہ ہوگیا۔ تمام سیکٹروں سے بڑی بڑی جھڑپوں کی زیادہ سے زیادہ خبریں آرہی تھیں۔ ہندوستان کی حکومت پہلے ہی ضرورت پڑنے پر مکتی باہنی کی مدد کے لیے بنگلہ دیش کے اندر داخل ہونے کی ہدایات اپنی فوج کو دے چکی تھی۔ مکتی فوج اور ہندوستانی فوج کی مشترکہ کمانڈ تشکیل دے دی گئی تھی۔ اس مشترکہ کمانڈ میں کرنل عثمانی اور ان کی کمانڈ کا ڈھانچا حقیقت میں ہندوستان کی بہت بڑی فوج کے زیر اثر غیر متعلقہ اور بے اثر ہو چکا تھا۔ ہندوستانی فوج کی اعلیٰ کمانڈ تمام مشترکہ کارروائیوں کے لیے تقریباً یک طرفہ طور پر منصوبے تیار کرتی تھی اور کرنل عثمانی کو صرف رسمی ضروریات پوری کرنے کے لیے اپنی نام نہاد منظوری دینی پڑتی تھی۔

جنگ کا خطرہ محسوس کرتے ہوئے صدر جنرل یحییٰ خان نے بھٹو کو اپنے خصوصی ایلچی کے طور پر ہندوستان کے ساتھ کسی قسم کی جھڑپ یا جنگ کی صورت میں چین کی مدد حاصل کرنے کے لیے بھجوایا۔ لیکن بیجنگ میں چینی قیادت نے بھٹو کو واضح الفاظ میں بتایا کہ چین، مشرقی پاکستان میں موجود مسئلے کو پاکستان کا داخلی معاملہ خیال کرتا ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ پاکستان کے داخلی معاملات میں ہندوستان کی مداخلت پاکستان کو توڑنے کی ایک مذموم سازش کا حصہ ہے اور اگر جنگ شروع ہوتی ہے تو عوامی جمہوریہ چین، پاکستان کے ساتھ کھڑا ہوگا۔ تاہم اس کے ساتھ ہی چینی قیادت نے بھٹو کے ذریعے پاکستانی حکمرانوں کو اپنی سوچی سمجھی رائے پہنچانے کی کوشش کی کہ حکومت پاکستان کو اس بحران کا بنگالیوں کی خواہشات کے مطابق کوئی سیاسی حل تلاش کرنا چاہیے۔ ان کے نزدیک وہی ایک واحد راستہ تھا جس پر چل کر پاکستان کی سالمیت کو بچایا جا سکتا تھا کیوں کہ اس بحران کو فوجی طریقے سے حل نہیں کیا جا سکتا تھا۔ چین کے اس مؤقف نے ایک بات واضح کر دی تھی۔ ایک طرف انہوں نے فوجی ٹولے کو بنگالی عوام کی خواہشات کو مدنظر رکھتے ہوئے سیاسی حل تلاش کرنے کا دوستانہ مشورہ دیا تھا اور دوسری جانب اپنے دوستوں کو توسیع پسند ہندوستان کے پاکستان کو توڑنے کے مذموم منصوبے سے متنبہ بھی کر دیا تھا۔ لیکن بھٹو نے اپنی واپسی پر چینی رہنماؤں کے دوستانہ مشورے کو توڑ مروڑ کر پیش کیا اور صدر جنرل یحییٰ خان کو بتایا کہ ہندوستان کے ساتھ کسی مسلح تصادم کی صورت میں چین، پاکستان کے ساتھ کھڑا ہوگا اور اگر ضرورت محسوس ہوئی تو پاکستان کے شانہ بہ شانہ جنگ میں شریک بھی ہو جائے گا۔ اس قسم کی غلط ترجمانی نے فوجی ٹولے کے جنگجوؤں میں جنگ کا جنون اور زیادہ بڑھا دیا۔

ہندوستان اپنے طور پر سمجھ گیا تھا کہ عوامی جمہوریہ چین صرف بحران کے قابل قبول سیاسی حل کے حق میں ہے۔ ہندوستان کو یقین تھا کہ اگر ہندوستان پاکستان کے خلاف جنگ کا آغاز کرتا ہے تو ''انڈو سوویت ٹریٹی آف سیکیورٹی اینڈ فرینڈ شپ'' کے پیش نظر چین کے لیے پاکستان کے حق میں عملی طور پر جنگ میں شرکت مشکل ہوگی۔ ان حالات میں ہندوستان نے مشرقی پاکستان پر برق رفتاری سے حملہ کرتے ہوئے تھوڑے سے عرصے میں بنگلہ دیش کو آزاد کروالینا انتہائی قابل عمل خیال کیا۔ ہندوستان کی حکومت نے ضروری سیاسی، سفارتی اور فوجی تیاری کے بعد یہ فیصلہ کیا تھا۔ اس جنگ کا سیاق وسباق پچھلی دو جنگوں سے بالکل مختلف تھا۔ اس مرتبہ عالمی رائے عامہ فوجی ٹولے کی وحشیانہ نسل کشی کے خلاف تھی۔ ہندوستان کا مؤقف مضبوط تھا کیوں کہ وہ ایک جائز مقصد کی حمایت کر رہا تھا۔ امریکہ یا چین کی جانب سے کسی فوجی ردّعمل کی پیش بندی کے لیے اس نے روس کے ساتھ معاہدہ کر کے اپنی پوزیشن پہلے سے ہی مضبوط کر لی تھی۔

اس وقت تمام کی تمام بنگالی قوم پاکستان کے خلاف تھی۔ گوریلوں اور مجاہدین نے پاکستانی فوج کو کافی حد تک کمزور کر دیا تھا۔ ہندوستانی فوج کے پاس مقبوضہ فوج کے بارے میں تمام تر ضروری انٹیلی جینس رپورٹس انتہائی تفصیل کے ساتھ موجود تھیں جو مکتی باہنی نے اکٹھی کر رکھی تھیں۔ مکتی باہنی نے نہ صرف دشمن کو کمزور کر دیا تھا بلکہ پاک فوج کے حوصلے اور جنگ کے جذبے کو بھی پست کر دیا تھا۔ عوام کی جانب سے مکمل عدم تعاون اور مخالفت نے بھی ان کی موجودگی کو ناجائز اور زبردستی قبضے کی صورت میں تبدیل کر دیا تھا۔ دشمن جسمانی اور ذہنی طور پر تھک اور ٹوٹ پھوٹ چکا تھا۔ بس ایک آخری دھکے کی ضرورت تھی۔ اور یہ موقع بھی جلد ہی آ گیا۔

81۔ آخرکار پاک بھارت جنگ شروع ہوگئی

3 دسمبر کو تقریباً شام پانچ بج کر اڑتالیس منٹ پر پاکستان ایئر فورس نے ہندوستانی علاقوں میں سرحدوں کے نزدیک چند ہوائی اڈوں پر اچانک حملہ کر دیا۔ بہ یک وقت سری نگر، اونتی پور، پٹھان کوٹ، اترلائی، جودھپور، انبالہ اور آگرہ پر بھی ہوائی حملے کیے گئے۔ اس وقت وزیراعظم اندرا گاندھی، کلکتہ میں ایک عوامی جلسہ سے خطاب کر رہی تھیں۔ جیسے ہی انہیں ہوائی حملوں کی خبر ملی، وہیں جلسے کے اندر ہی انہوں نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پاکستان کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ اس سے پہلے کہ اندرا گاندھی کلکتہ سے دہلی کو روانہ ہوتیں، مشرقی کمان کے کمانڈروں کو مشرقی پاکستان پر مکمل حملے کا حکم دے دیا گیا۔

مشرقی کمان میں جنرل اروڑا کی کمانڈ میں تین آرمی کور (4، 2 اور 33 کور) موجود تھیں۔ وہاں اپنے ہیڈ کوارٹرز کے ساتھ ''کمیونیکیشن زون'' کے نام کے ساتھ ایک موبائل یونٹ بھی موجود تھی۔ اس کے علاوہ دو کور کے تحت وہاں ایک اضافی آمرڈ رجمنٹ، ایک لائٹ آرمرڈ رجمنٹ بھی موجود تھی۔ سیکنڈ کور کے کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل ٹی این رینا تھے جن کا ہیڈ کوارٹرز کرشنا نگر میں تھا۔ ایک میڈیم آرٹلری رجمنٹ اور ایک

انجینئرنگ برجنگ یونٹ بھی سیکنڈ کور کی کمان میں دے دی گئی تھیں، 38 کور کے کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل ایم ایل تھاپا تھے جن کا ہیڈ کوارٹرز شیلی گوری میں تھا۔ 33 کور کی کمان میں ایک اضافی آرمرڈ رجمنٹ ایک میڈیم رجمنٹ اور ایک انجینئرنگ برجنگ یونٹ بھی رکھی گئی تھی۔ 101 کمیونیکیشن زون کے کمانڈر ابتدا میں لیفٹیننٹ جنرل گل تھے، بعد میں اس کی کمانڈ گوہاٹی ہیڈ کوارٹرز میں لیفٹیننٹ جنرل ناگرا کے سپرد کر دی گئی، اضافی طور پر ایک انفنٹری بریگیڈ بھی ان کی کمان میں دے دی گئی۔ 4 کور کا ہیڈ کوارٹرز اگرتلہ میں لیفٹیننٹ کرنل سکھ سنگھ کے تحت تھا۔ اضافی طور پر ایک میڈیم آرٹلری رجمنٹ اور دو لائٹ آرمرڈ رجمنٹیں 4 کور کی کمان میں تھیں۔

مشرقی محاذ پر ہندوستانی فوجیوں کی کل تعداد پانچ لاکھ تھی اور انہیں دو لاکھ مجاہدین آزادی کی اضافی مدد حاصل تھی۔ مطلوبہ ہوائی اور سمندری مدد بھی مہیا کی گئی تھی۔ حملہ تمام سیکٹروں میں بہ یک وقت کیا گیا۔ تمام سیکٹروں میں مجاہدین آزادی ہندوستانی پیش قدمی کے لیے "برج ہیڈز" (دشمن کے علاقے میں حاصل کردہ علاقے) قائم کر رہے تھے۔ ہندوستانی فوج نے ان تمام "برج ہیڈز" سے اپنے حملے کا آغاز کیا اور تمام اطراف سے ڈھاکہ کی جانب پیش قدمی شروع کر دی۔ ہندوستانی حکمت عملی سرحدوں پر کمزور دفاعی علاقوں سے اندر جا کر دشمن فوج کی پسپائی کے راستوں کو بند کر کے اس کو تنہا علاقوں میں قید کر دینا اور ڈھاکہ پر کم سے کم ممکنہ وقت میں قبضہ کرنا تھی۔ تقریباً ایک لاکھ پاکستانی فوج، ہندوستانی فوج اور مکتی باہنی کے چاروں جانب سے مشترکہ حملے کی مزاحمت جاری نہ رکھ سکی۔ ان کی مشترکہ قوت پاکستانی فوج کی نسبت چھ سے سات گنا زیادہ تھی۔ بارہویں دن مشرقی پاکستان میں پاک فوج کو غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا گیا۔

82۔ ہندوستانی فوج نے مجاہدین آزادی کی لاشوں پر اپنی فتح کا اعلان کیا

مقامی لوگوں کے عدم تعاون نے پاکستانی سپاہیوں کے حوصلے پست اور ان میں لڑنے کے جذبے کو ماند کر دیا تھا۔ ان کے فوری طور پر ہتھیار ڈالنے کی سب سے بڑی وجہ یہی تھی۔ اس طرح 16 دسمبر کو پاکستان فوج کے ہتھیار ڈالنے کے ساتھ بنگلہ دیش نے آزادی حاصل کر لی۔ اُسی دن ڈھاکہ ریس کورس میں ہتھیار ڈالنے کی تقریب کے انتظامات مکمل کر لیے گئے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ کرنل عثمانی، مکتی باہنی کے کمانڈر انچیف اور مشترکہ کمانڈ کے اعلیٰ ترین کمانڈروں میں ہونے کے ناتے جنرل اروڑا کو ڈھاکہ آنے اور ہتھیار ڈالنے کی تقریب میں شمولیت کی اور ہتھیار ڈالنے کی دستاویزات پر مشترکہ دستخط کرنے کی دعوت دیتے، جو منطقی طریقہ کار تھا۔ لیکن ستم ظریفانہ طور پر اس کے برعکس عمل ہوا۔ یہ جنرل اروڑا اکیلے تھے جنہوں نے مشترکہ کمانڈ کی جانب سے ہتھیار ڈالنے کی دستاویزات پر دستخط کیے۔ نہ صرف یہ بلکہ بعض وجوہات کی بنا پر جن کی وضاحت نہیں کی گئی تھی، مکتی باہنی کے کمانڈر انچیف اور مشترکہ کمانڈ کے سربراہ کرنل عثمانی کو 16 دسمبر 1971ء کو ریس کورس میدان میں ہونے والی ہتھیار ڈالنے کی تقریب میں شمولیت کا موقع ہی نہ دیا گیا۔ کرنل عثمانی کو اس تاریخی

موقع پر ان کے جائز حق سے کیوں محروم رکھا گیا؟ اس کے برعکس کیوں جنرل اروڑا کو قوم اور پوری دنیا کے سامنے شکست خوردہ افواج پر واحد فاتح کی حیثیت سے پیش کیا گیا؟ یہ ایسے راز ہیں جن سے بنگلہ دیش کے عوام کو آگاہ کرنا ابھی تک باقی ہے۔

کرنل عثمانی کو مکتی باہنی کے کمانڈر انچیف کے طور پر جنرل اروڑا کو بنگلہ دیش حکومت کی جانب سے ڈھاکہ مدعو کرنا اور خوش آمدید کہنا چاہتے تھے۔ اس سے یہ حقیقت ثابت ہو جاتی کہ بنگلہ دیش کی آزادی خود بنگالیوں نے اپنی جنگ آزادی لڑ کر حاصل کی ہے۔ ہندوستان کی فوج نے اس جدوجہد میں محض دوست فوج کے طور پر مدد فراہم کی تھی۔ لیکن یہ تجویز ہندوستان کی حکومت کے لیے قابل قبول نہیں تھی۔ ان کا مطالبہ تھا کہ ہتھیار ڈالنے کی دستاویز پر ہندوستانی فوج کے کمانڈر کے دستخط ہونے چاہئیں۔ اس کے پس پشت نیت بہت واضح تھی وہ دنیا کو بتانا چاہتے تھے کہ بنگلہ دیش، ہندوستانی فوج کی پاکستان پر فتح کا نتیجہ ہے اور یہ ہندوستان کی جانب سے ایک تحفہ ہے۔ بے ہمت اور بزدل عبوری حکومت ہندوستان کے مطالبے کے سامنے جھک گئی۔ مفاہمت نہ کرنے والے ''بنگا بیر'' (شیر بنگال) کرنل عثمانی کو آسانی کے ساتھ ایک طرف کر دیا گیا تھا۔

16 دسمبر کو ڈھاکہ کے عوام نے ہندوستانی فوجیوں کو فاتحین کے طور پر دیکھا۔ مجیب باہنی اور ''سولہ ڈویژن'' نے کھمبیوں کی طرح کہیں سے اچانک نمودار ہو کر انہیں گھیر لیا تھا۔ یہ حقیقی مجاہدین آزادی نہیں تھے کیوں کہ انہیں تو ڈھاکہ اور دوسرے بڑے شہروں اور قصبوں میں داخل ہونے کی اجازت ہی نہ دی گئی تھی۔ اصل پالیسی یہ تھی کہ ہندوستانی فوج کو آزادی دلوانے والوں کے طور پر پیش کیا جائے۔

اس کے نتیجے میں مجاہدین آزادی اپنے تقدم سے محروم ہو گئے اور ہندوستانی فوج کی بڑی تعداد میں موجودگی سے وہ مکمل طور پر ماند پڑ گئے۔ ان کی جرأت اور شجاعت کی داستانیں، قربانیاں اور جواں مردیاں، دوست فوج کے سیاہ سائے تلے دب کر نظروں سے اوجھل ہو گئیں۔ جنگ آزادی کے جذبے کو ایک فوری جھٹکا لگا۔ قومی نجات کا خواب ہندوستان کی براہِ راست مداخلت سے بکھر گیا تھا۔ قوم کو اپنے آپ کو پاک صاف کرنے اور نئی صورتِ حال کے لیے تیاری کرنے کا وقت ہی نہیں دیا گیا تھا۔ قومیت کا جذبہ پروان نہیں چڑھ سکا تھا۔ اس کے برعکس اگر جنگ آزادی کو اپنا فطری راستہ اختیار کرنے دیا جاتا تو پھر بتدریج ہر گھرانا ایک مثبت تبدیلی سے گزرتا، ہر خاندان کو کسی نہ کسی رنگ میں قربانی دینی پڑتی۔ اس طرح سے حاصل کردہ آزادی ہر ایک کے لیے عزیز ہو سکتی تھی۔ اس صورت میں قوم کو بیچنے کی کسی بھی سازش کو نڈر مجاہدین آزادی اور عوام مل کر ابتدائی مراحل میں ہی ناکام بنا سکتے تھے۔ تاہم یہ بہت بڑی بدقسمتی تھی کہ سیاسی قیادت کی غداری اور مشیروں کے ذاتی مفادات نے قوم کو یہ موقع فراہم نہ کیا۔

1972ء میں لندن میں معروف صحافی معید الحسن اور ائیر وائس مارشل کھنڈکر کے درمیان چار گھنٹے طویل بات چیت ہوئی۔ میں مناسب خیال کرتا ہوں کہ یہاں ان کی اس گفتگو کا خلاصہ بیان کر دیا جائے تاکہ

قارئین محبت اور نفرت کے اس تعلق کو بہتر طور پر سمجھ سکیں جو پوری جنگ کے دوران مکتی باہنی اور ہندوستانی حکام کے درمیان پایا جاتا تھا۔

جنگ کے دوران ایئر وائس مارشل کھنڈ کر مجیب نگر ہیڈ کوارٹرز میں ڈپٹی چیف آف سٹاف تھے۔ مسٹر معید الحسن اس وقت عبوری حکومت کے وزیر اعظم کے پالیسی معاملات کے مشیر تھے۔ ان کی گفتگو سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ہندوستانی حکام اکثر اوقات کرنل عثمانی کو نظر انداز کر دیتے تھے اور اس کی بجائے ایر وائس مارشل کھنڈ کر اور تاج الدین کے ساتھ نزدیکی روابط رکھتے تھے۔ جنگ سے متعلق اکثر معاملات پر وہ ایئر وائس مارشل کھنڈ کر سے بات چیت کرتے تھے۔ ہندوستان کی جانب سے ان کے اہم ہم منصب جنرل جگجیت سنگھ اروڑا، بریگیڈیئر جیکب اور بریگیڈیئر گپتا تھے۔ ہندوستان اس جدوجہد کی ابتدا سے ہی کسی بھی ایسے قدم کو تسلیم کرنے پر راضی نہ تھا جو مجاہدین آزادی اپنی جنگ آزادی کو منظم کرنے کے لیے اپنے طور پر اٹھاتے تھے۔ اگرچہ کرنل عثمانی کو سی این سی مقرر کیا گیا تھا اور ان کا ہیڈ کوارٹرز بھی 8 تھیٹر روڈ پر قائم کر دیا گیا تھا، لیکن ان کے اختیارات کو محدود رکھا گیا تھا۔ جولائی تک سیکٹر کمانڈروں کو جنگ جاری رکھنے کے لیے ہیڈ کوارٹرز سے کوئی زیادہ مدد مہیا نہیں کی جاتی تھی۔ اکثر کمانڈروں کو ان ذرائع پر انحصار کرنا پڑتا تھا جو وہ خود اپنے طور پر اکٹھا کرتے تھے۔

ایئر وائس مارشل کھنڈ کر نے اس بارے میں بات کرتے ہوئے کہا، ''جب میں کلکتہ پہنچا تو مجھے پتا چلا کہ اس وقت تک سیکٹروں اور سب سیکٹروں کے مجیب نگر ہیڈ کوارٹرز کے ساتھ زیادہ روابط نہیں تھے۔ ہندوستان کوئی معنی خیز مدد فراہم نہیں کر رہا تھا۔ ہماری جنگ آزادی کے بارے میں کوئی واضح سوجھ بوجھ نہ رکھنے کی وجہ سے ہماری جدوجہد کے بارے میں ہندوستان کوئی ٹھوس پالیسی تشکیل نہیں دے سکا تھا۔ لیکن وہ چاہتے تھے کہ آزادی کی تحریک کو ایک مسئلے کے طور پر زندہ رکھا جائے۔ ہندوستانی پالیسی ساز کوئی بھی مضبوط پالیسی تشکیل دینے سے پہلے جنگ اور مجاہدین آزادی کو زمینی حقائق کے مطابق پوری طرح پرکھنا چاہتے تھے۔ اس وقت تک وہ تمام معاملات کو اپنے کنٹرول میں رکھنے کے بہت زیادہ خواہش مند تھے۔ ہندوستانی حکام اور ہندوستانی فوج کے اس رویے کی وجہ سے مکتی باہنی اور ہندوستانی فوج اور حکومت کے درمیان ایک غلط فہمی اور نفرت پروان چڑھی۔ لہٰذا آزادی کے بعد بنگلہ دیش کی مجاہدین آزادی پر مشتمل مسلح افواج میں پائے جانے والے ہندوستان مخالف جذبات جنگ آزادی کے دنوں میں تشکیل پائے تھے۔''

انہوں نے مزید کہا، ''مکتی فوج اور ہندوستانی افواج کے درمیان اختلاف ہماری جدوجہد کے ابتدائی دنوں ہی سے پروان چڑھنا شروع ہو گئے تھے۔ یہ احساس وقت کے ساتھ بہت سے واقعات، مایوسیوں اور حساس فیصلوں کے باہمی عمل سے مزید بڑھتا چلا گیا۔'' جنگ میں ہندوستانی مدد و تعاون کے بارے میں بات کرتے ہوئے ایئر وائس مارشل کھنڈ کر نے کہا، ''جولائی اور اگست تک ہندوستان کی شمولیت انتہائی برائے نام تھی۔ تھوڑی بہت مدد جو مل رہی تھی وہ چھوٹے ہتھیاروں، ہلکے ساز و سامان اور کچھ قیام و رسد

کی سہولتوں تک محدود تھی، اس سے زیادہ کچھ بھی نہ تھا۔ مجاہدین آزادی کے کمانڈروں نے اپنی جنگ اُن ہتھیاروں، اسلحے اور دوسرے ساز وسامان کے ساتھ جاری رکھی ہوئی تھی جو وہ دشمن افواج سے چھینتے تھے۔"

یہاں میں ایک مرتبہ پھر قارئین کو جولائی میں ہونے والے کمانڈروں کا اجلاس یاد دلانا چاہتا ہوں جس میں دو لاکھ گوریلا فوج تیار کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ انہیں تربیت کے بعد بنگلہ دیش کے اندر بھیجا جانا تھا۔ اس حوالے سے ائیر وائس مارشل کھنڈکر کا مشاہدہ قابل توجہ ہے۔ انہوں نے کہا، "کمانڈروں کے اجلاس کے بعد ایک دن جنرل اروڑا ہمارے ہیڈکوارٹرز آئے۔ کرنل عثمانی اور جنرل اروڑا کے درمیان ایک ملاقات ہوئی، میں بھی اس ملاقات میں موجود تھا۔ اس ملاقات میں اہم موضوع گوریلوں کا تھا، کتنے گوریلوں کو تربیت دی جائے گی، کس قسم کی تربیت دی جائے گی، انہیں کہاں تربیت دی جائے گی، ان کی بھرتی کی حکمت عملی، اس کی تربیت کا دورانیہ وغیرہ۔ جنرل اروڑا نے مشورہ دیا کہ پانچ ہزار گوریلے کافی ہوں گے۔ میں اچانک پھٹ پڑا، اتنی تھوڑی تعداد کے ساتھ ہم کیا کریں گے؟ جنرل اروڑا نے جواب دیا کہ یہ لوگ اندر جائیں گے اور دشمن کو زخمی کریں گے اور ایسے ہی دوسرے کام کریں گے۔ کرنل عثمانی نے واضح الفاظ میں جنرل اروڑا کو مطلع کیا کہ وہ دو لاکھ گوریلوں کو تربیت دینا چاہتے ہیں جیسا کہ یہ حال ہی میں ہونے والے کمانڈروں کے اجلاس میں طے ہو چکا تھا۔ تربیت کا آغاز کر دیا گیا۔ گوریلے تربیت حاصل کرنے کے بعد واپس آنے لگے۔ لیکن ایک بہت بڑا مسئلہ کھڑا ہو گیا جو مکمل طور پر ہندوستانی حکومت کا پیدا کردہ تھا۔ ہندوستانی فوج تربیت یافتہ گوریلوں پر مکمل کنٹرول رکھنا چاہتی تھی جس نے ایک الٹے ردعمل کو جنم دیا۔ گوریلے مختلف سیکٹروں سے بھرتی کیے گئے تھے اور تربیت حاصل کرنے کے بعد وہ اپنے پسندیدہ کمانڈروں کے تحت لڑنے کے لیے اپنے متعلقہ سیکٹروں میں واپس جانا چاہتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے ہندوستانی کمانڈروں کے تحت لڑنے سے انکار کر دیا۔

ہندوستانی فوج ان گوریلوں کو یک طرفہ طور پر اپنی کمانڈ کے تحت بنگلہ دیش کے اندر متعین کرنا چاہتی تھی۔ اس بارے میں ہمارے ہیڈکوارٹرز سے بھی کسی قسم کا رابطہ یا بات چیت نہیں کی گئی تھی۔ بعض مقامات پر ہندوستانی فوج نے گوریلوں کو لوٹ مار کرنے کے لیے زبردستی بھجوایا بھی، انہوں نے اس کی منطق یہ پیش کی کہ جنگ لڑنے کے لیے رقم کی ضرورت ہوگی۔ ایسے مجاہدین آزادی نے ہندوستانی کمانڈروں کے احکامات ماننے سے انکار کر دیا اور بھاگ کر اپنے متعلقہ سیکٹروں میں پہنچ گئے۔ بعد میں اس کا مجموعی ردِعمل اور نتائج بہت بُرے نکلے کیوں کہ مجاہدین آزادی اُسے پسند نہیں کرتے تھے جس طرح ہندوستانی فوج انہیں استعمال کرنا چاہتی تھی۔ جلد ہی تمام سیکٹروں میں ایک تلخی پھیل گئی۔ اس طرح مجاہدین آزادی اور ہندوستانی فوج کے درمیان بداعتمادی پیدا ہو گئی۔ جب سارے معاملات پوری طرح سامنے آگئے تو ہم نے کمانڈروں کے مطالبے پر عبوری حکومت اور ہندوستانی حکام پر دباؤ ڈالا کہ اگر گوریلوں کو بنگلہ دیشی کمانڈروں کے تحت نہ رکھا گیا تو بھی ایک تباہی آ جائے گی۔ تجویز پیش کی گئی تھی کہ گوریلوں کو مکتی باہنی کے کمانڈروں کے تحت رکھا

جائے۔ اگرچہ ہندوستانی فوج کی اعلیٰ کمانڈ پہلے دن سے اس بارے میں لیت ولعل سے کام لے رہی تھی۔ سیاسی قیادت نے کوئی متبادل نہ دیکھتے ہوئے بادل نخواستہ ہمارے مطالبے کو تسلیم کرلیا۔ تاہم بعد میں ہندوستانی انٹیلی جینس ''را'' نے مجاہدین آزادی کے توڑ کی خاطر ''بی ایل ایف'' کے قیام کا فیصلہ کرلیا۔ یہ ایک الگ داستان ہے۔

ہندوستانی قیادت کے اس قسم کے رویے کی دو وجوہات ہوسکتی تھیں۔

1۔ فیلڈ کمانڈروں اور مجاہدین آزادی پر ہندوستانی قیادت نے کبھی بھی مکمل اعتماد نہیں کیا تھا۔ وہ ہمیشہ مکتی باہنی کو ناقابل اعتبار خیال کرتے تھے۔

2۔ انہوں نے پہلے سے ہی یہ منصوبہ بنا رکھا تھا۔ بنگلہ دیش صرف ان کی براہِ راست مداخلت کے ذریعے آزاد کرایا جائے گا۔ اس لیے مکتی باہنی اور گوریلوں کو محدود مقاصد اور اہداف کے حصول کے لیے ان کے کنٹرول میں ہونا چاہیے۔

لیکن مکتی باہنی ملک کو صرف اپنے بل بوتے پر اگر ضروری محسوس ہو تو ایک لمبی جنگ لڑکر آزاد کرانا چاہتی تھی۔ میرے خیال میں یہ نکتہ تھا جس پر دونوں فریقین یعنی مکتی باہنی اور ہندوستانی حکام اور ہندوستانی فوج کے درمیان اعتماد کا فقدان پایا جاتا تھا۔ ہماری فوجی قیادت کا مؤقف بڑا واضح تھا کہ ہمیں اپنے وطن کو خود آزاد کرانا چاہیے۔ اگر ہندوستان اس جدوجہد میں ہماری مدد کے لیے ہاتھ بڑھاتا ہے تو ہمیں اسے خوش آمدید کہنا چاہیے۔ لیکن جیسا کہ یہ ہماری اپنی جدوجہد ہے، ہمیں خود لڑنا چاہیے۔ اور اگر مدد لینا ہے تو پھر ہندوستان اکیلا کیوں؟ ہم ہر اس ملک اور قوم کو خوش آمدید کہیں گے جو ہماری مدد کے لیے آگے آئے گی۔ مختصراً جنگ آزادی کے حوالے سے کوئی مشترکہ نقطہ نظر یا باہمی اعتماد موجود نہ تھا اور نہ ہی ان کی مجموعی پالیسی کی وجہ سے یہ پیدا ہوسکتا تھا۔ یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ ہندوستانی کمانڈروں کی بہت سی سرگرمیوں نے مجاہدین آزادی کے ذہنوں میں شکوک پیدا کردیئے تھے اور بہت سی غلط فہمیاں بھی پائی جاتی تھیں۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ 9 اگست کو جب تک ہندروس معاہدے پر دستخط نہیں ہوئے تھے، مکتی باہنی اکیلے ہی آزادی کی جنگ لڑ رہی تھی۔ 9 اگست کے بعد ہی ہندوستانی فوج نے جنگ میں شامل ہونے کے لیے سنجیدہ تیاریاں شروع کی تھیں۔''

مسٹر معید الحسن نے ائیر وائس مارشل کھنڈکر سے سوال کیا، ''اگر ہندوستانی فوج خود عملی طور پر مداخلت نہ کرتی تو بنگلہ دیش آزاد نہ ہوتا، آپ کیا کہتے ہیں؟''

مسٹر کھنڈکر نے مسٹر معید الحسن سے اختلاف کیا اور کہا، ''اگرچہ یہ درست ہے کہ مجیب نگر میں موجود بہت سے لوگ حتیٰ کہ کابینہ کے افراد بھی کسی نہ کسی قسم کی مایوسی کا شکار تھے۔ بہت سے لوگوں نے تو یحییٰ خان کے عام معافی کے اعلان سے فائدہ اٹھاتے ہوئے واپس جانے کا بھی سوچنا شروع کردیا تھا۔ ان میں سے اکثریت کو مکتی باہنی کی جنگ جیتنے کی اہلیت پر بھروسا نہیں تھا۔ یہی ان کی مایوسی کی اصل وجہ تھی۔ وہ لمبی

جنگ کی بات سن کر بہت خوف زدہ ہو جایا کرتے تھے۔ وہ خیال کرتے تھے کہ انہیں کبھی بھی واپس جانے کا موقع نہیں ملے گا۔ اس صورتِ حال کے پیش نظر میں بھی پختہ یقین رکھتا تھا کہ وہ لوگ مکمل طور پر غلط ہیں جو یہ منطق پیش کرنے کی کوشش کرر ہے ہیں کہ اگر مجاہدین آزادی کی سرگرمیاں شدت اختیار کر گئیں تو پھر پاکستان کو ہندوستان کے ساتھ اعلانِ جنگ کرنے کا جواز مل جائے گا اور اس کے نتیجے میں مجاہدین آزادی کی سرگرمیوں پر قابو پایا جاسکے گا۔ شاید ان لوگوں کے کچھ در پردہ مفادات تھے۔ اس کے برعکس اگر ہم ابتدا ہی سے اپنی سرگرمیوں میں شدت پیدا کر سکتے تو پھر پاک فوج کو بہت جلد ہمارے مجاہدین آزادی کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑ جانے تھے۔ وہ مکتی فوج کے شدید حملوں کا سامنا کرنے کی طاقت نہیں رکھتی تھی۔ پاکستانی فوج کے پاس لڑنے کا کوئی مقصد نہ تھا۔ ان کا حوصلہ پہلے ہی مکمل طور پر پست ہو چکا تھا اور متوقع نقصانات ان کے لیے ناقابل قبول ہونے تھے۔''

مسٹر معید الحسن نے جواب دیا،''آپ کی سوچ میں وزن معلوم ہوتا ہے لیکن ہندوستانی اس کے برعکس سوچتے تھے۔'' (روزنامہ سنگ باد، 26 مارچ 1972ء)

حقیقت میں ہندوستان کے کچھ اپنے ہی اہداف اور ایجنڈا تھا۔ وہ مکتی باہنی کو اجاگر نہیں ہونے دینا چاہتے تھے۔ وہ دنیا کو باور کرانا چاہتے تھے کہ بنگلہ دیش پاک و ہند جنگ کا نتیجہ ہے۔ اس کے ذریعہ ہندوستان ایک پتھر سے دو پرندے شکار کرنا چاہتا تھا۔ اوّل، وہ 1965ء کی جنگ کا انتقام لیتے ہوئے اپنے آپ کو خطے میں سپر پاور کے طور پر مستحکم کرنا چاہتا تھا اور دوئم، وہ بنگلہ دیش پر کنٹرول کا جواز مہیا کرنا چاہتا تھا۔
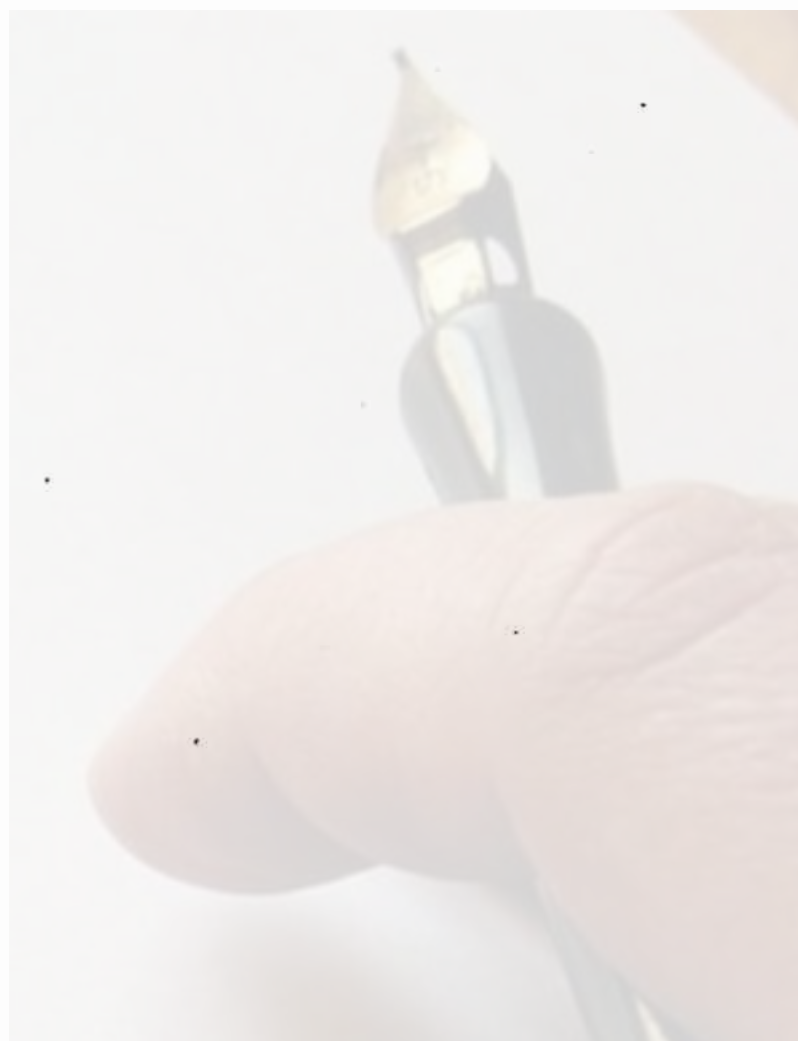
حصہ چہارم
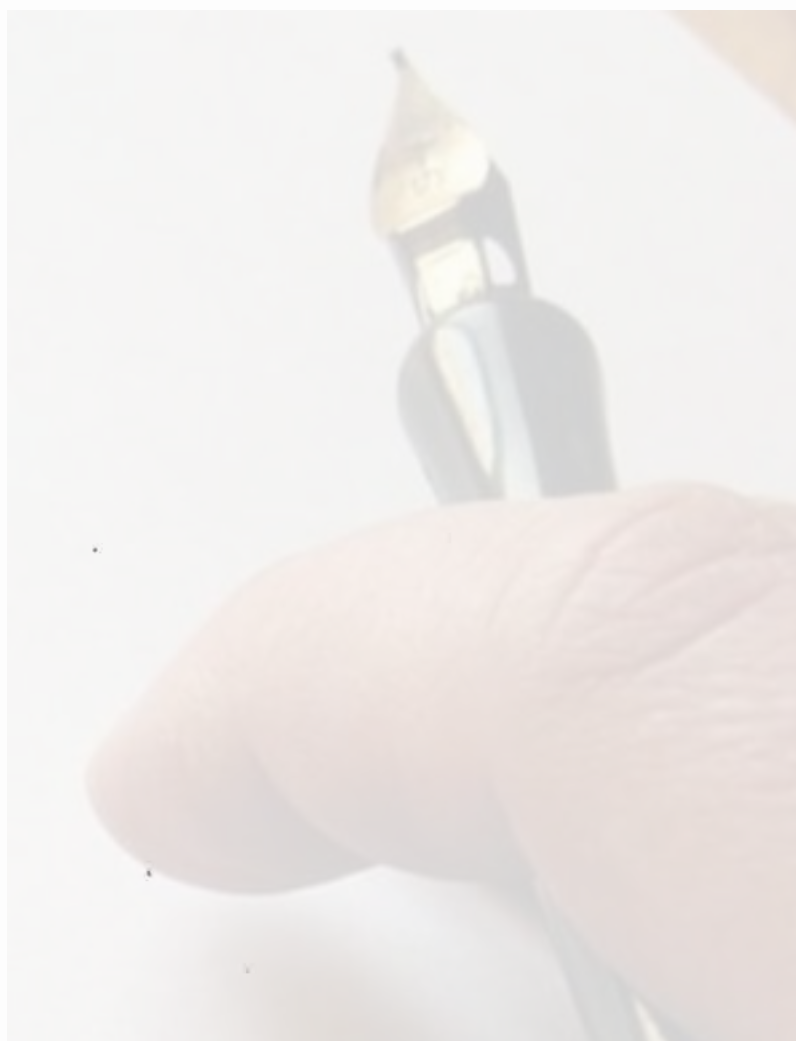
آزادی کے بعد کا بنگلہ دیش
عوامی یکسال حکومت

83۔تاج الدین اوران کی کابینہ کی نظریاتی دیوالیہ پن کے ساتھ بنگلہ دیش واپسی

اگر چہ پاک فوج کے ہتھیار ڈالنے کے بعد 16 دسمبر کو ملک آزاد ہو گیا تھا، عبوری صدر نذرالاسلام، وزیراعظم تاج الدین اور کابینہ کے دوسرے ارکان کے ساتھ 25 دسمبر کوڈھاکہ پہنچے۔ڈھاکہ پہنچنے پر تاج الدین نے بڑے فخر سے اپنی حکومت کو ایک انقلابی حکومت قرار دیا۔ان کا ہدف بنگلہ دیش میں سوشلزم کا قیام تھا۔لیکن حکومت متوسط طبقے کے بنگالی شہریوں یعنی بورژوا طبقے پر مشتمل تھی جنہوں غیر بنگالیوں کی جگہ لی تھی۔یہ یقیناً بورژوائی طبقے کی حکومت تھی۔انہوں نے فوری طور پر اپنے سے پہلے پاکستانی حکمران اشرفیہ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اپنے ذاتی مفادات کوتحفظ فراہم کرنا شروع کردیا۔

پاکستان جا چکا تھا، لیکن اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ ایک دشمن کی ضرورت تھی، یہ کون ہونا چاہیے؟ دشمن عوام تھے۔بنگلہ دیش کی نئی حکومت کے بانیوں نے عوام دوست اور قوم پرست قوتوں کے خاتمے کے لیے اپنی براہ راست کارروائی کا آغاز کردیا۔انہوں نے عام آدمی کوڈرادھمکا کر اپنی راہ پرلانے کے لیے ریاستی دہشت گردی کا استعمال شروع کردیا۔لیکن لوگوں نے آزادی حاصل کرنے کے لیے بہت بڑی قربانیاں دی تھیں اور وہ زندگی بسر کرنے کے لیے سیاسی اور بنیادی حقوق کا مطالبہ کررہے تھے۔اس وجہ سے محض ان کو دھوکا دینے کے لیے حکومت نے سوشلزم کے نفاذ کا اعلان کیا۔اگر چہ عوامی لیگ نے 1970ء کے انتخابی منشور میں کہیں بھی سوشلزم کا ذکر نہیں کیا تھا۔بنگلہ دیش کے عوام حقیقت میں اپنے آپ کو سوشلزم کی زنجیروں میں جکڑنا نہیں چاہتے تھے۔ان کا مطالبہ صرف معاشی آزادی اور سماجی انصاف تھا۔

اس لیے محبّ وطن اور قوم پرست قوتوں اور جماعتوں نے وزیراعظم کے اس اعلان کو محض اشک شوئی قرار دیا۔17 جنوری 1972ء کو بنگلہ دیش کریشک سرامک سماج وادی دَل نے دوسروں کے ساتھ مل کر سوال اٹھایا کہ''عوامی لیگ حکومت انقلابی حکومت نہیں ہوسکتی۔اگر آزادی کی جنگ ایک انقلاب تھا تو پھر یہ انقلاب محض اکیلی عوامی لیگ کی کوششوں کا نتیجہ نہیں تھا، یہ آٹھ کروڑ عوام کی ایک اجتماعی کوشش تھی۔لہٰذا آزاد بنگلہ

دیش میں ایک قومی حکومت قائم ہونی چاہیے تھی۔'' یہ مطالبہ معقول تھا۔ لیکن عوامی لیگ نے اکیلے چلنے کی پالیسی پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا جیسا کہ انہوں نے ہندوستانی حکام کی مدد سے آزادی کی تحریک کے دوران کیا تھا۔ ماسکو سے تعلق رکھنے والوں اور مونی سنگھ اینڈ کمپنی نے اقتدار میں شرکت کے بغیر ابتدا ہی سے اپنے آقاؤں کی ہدایت پر ان کے پیروکاروں کی طرح شرم ناک طور پر عوامی لیگ کی حمایت جاری رکھی۔

جو کردار سی پی آئی (کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا) نے ہندوستان کی سیاست میں ادا کیا تھا بالکل وہی کردار بنگلہ دیش کی آزادی کے بعد کے دَور کی سیاست میں مظفر نیپ (نیشنل عوامی پارٹی) اور مونی سنگھ کی کمیونسٹ پارٹی نے ادا کیا۔ بنگلہ دیش ایک قومی ریاست بن چکا تھا لیکن حکمران جماعت کے کردار میں قوم پرستی کا جذبہ پروان چڑھنے میں ناکام رہا۔ کردار کے حوالے سے وہ مفاد پرست اور پٹھو تھے۔ امریکہ نے ہماری جنگ آزادی کی مخالفت کی تھی لہٰذا بنگلہ دیش کی تعمیر نو کے لیے اس سے کسی قسم کی مدد یا تعاون حاصل نہیں کیا جائے گا۔ مجیب نگر میں حکومت نے اس حوالے سے ایک بیان جاری کیا۔ لیکن مجیب الرحمٰن نے اپنی پہلی پریس کانفرنس میں اس بیان کے خلاف فیصلہ دیا اور اعلان کیا کہ امریکی امداد کو خوش آمدید کہا جائے گا۔ ذی اثر افراد جو کبھی کٹر ہندوستان مخالف ہوتے تھے رات بھر میں بالکل بدل گئے۔ مارواڑیوں کے ساتھ تعلقات استوار کرنے کی ایک ناشائستہ دوڑ شروع ہو چکی تھی تاکہ سمگلنگ کے ذریعے کم سے کم وقت میں دولت سمیٹی جا سکے۔ یہ عوامی لیگ کی قیادت کی موقع پرستی کی انتہا تھی۔ یہ ایک ایسی جماعت تھی جو ہمیشہ سے امریکہ کی حمایتی جماعت کے طور پر جانی جاتی تھی، یہاں تک کہ ''کاگ ماری'' کے تاریخی جلسے میں سہروردی اور شیخ مجیب الرحمٰن، مولانا بھاشانی سے علیحدہ ہوئے تھے، اور پھر محض اقتدار کے حصول کے لیے اسی عوامی لیگ نے ہندوستان کے ساتھ ''بنگلہ دیش معاہدہ برائے تعاون، دوستی اور امن'' کے نام سے غلامی کی دستاویز پر دستخط کرتے ہوئے اپنے آپ کو ہندوستان اور روسی بلاک کے ساتھ جوڑنے میں ہچکچاہٹ محسوس نہ کی۔

عوامی لیگ نے سوشلزم کا نعرہ محض قومیانے کی پالیسی کے ذریعے قومی معیشت اور تمام ذرائع پیداوار پر پارٹی کنٹرول حاصل کرنے کے لیے لگایا تھا۔ انہوں نے غیر بنگالیوں کی چھوڑی ہوئی تمام صنعتوں اور کاروبار پر قبضہ کر لیا اور اپنی پارٹی کے ارکان اور پٹھوؤں کی منتظمین کے طور پر تقرریاں کر دیں۔ کاروباری لائسنس اور پرمٹ لوٹ کے مال کی طرح پارٹی کے دلالوں اور غیر تجربہ کار افراد میں تقسیم کیے گئے۔ اس کے نتیجے میں ایسے بہت سے نو دولتیے پیدا ہوئے جنہیں قومی مفادات سے کوئی سروکار نہ تھا۔ لہٰذا وہ ملک جو پہلے غیر بنگالیوں کی لوٹ مار کا نشانہ بنا ہوا تھا، اب آزادی کے بعد نام نہاد سوشلزم کے لبادے میں نئے حکمرانوں کے ہاتھوں میں لوٹ مار اور غارت گری کی جنت بن گیا۔ بنگالی من حیث القوم مزید غریب ہو چکے تھے۔ ملک کی معیشت کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ اپنے نئے اتحادیوں کے کہنے پر سوشلزم کو ریاستی قانون کے طور پر اختیار کرتے ہوئے عوامی لیگ نے حقیقت میں سوشلزم کو بدنام کیا۔

اس دوران میں وزیراعظم تاج الدین یہ کہتے پھر رہے تھے کہ بنگلہ دیش میں سائنٹفک سوشلزم کا

نفاذ کیا جائے گا۔ ان کی اس قسم کی باتوں اور اس قسم کی تشہیر سے عوامی لیگ کے اندرونی اختلاف عوام پر عیاں ہو رہے تھے۔ مسلسل بڑھتے ہوئے سماجی معاشی مسائل سے نمٹنے کی کوشش میں عوامی لیگ سے وابستہ مظفر نیپ کے صدر مظفر احمد قومی حکومت کا مطالبہ کرنے کے لیے مجبور ہو گئے۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے، ''را'' نے عوامی لیگ کے مفادات کو تحفظ دینے کے لیے بی ایل ایف تشکیل دی تھی۔ لیگ (عوامی لیگ کا طلبا محاذ) کے چار رہنماؤں طفیل احمد، عبدالرزاق، شیخ فضل الحق مونی اور عبدالقدوس مکھن، جن کو عوام میں ''چار خلفا'' کے نام سے جانا جاتا تھا، کو استعمال کیا گیا۔ سراج العالم خان نے پس منظر میں رہنے کو ترجیح دی۔

17 فروری 1972ء کو ''چار خلفا'' میں سے ایک طفیل احمد نے اعلان کیا، ''بنگلہ دیش میں مجیب واد قائم کیا جائے گا۔ مجیب واد کے چار اصول، قوم پرستی، جمہوریت، سوشلزم اور سیکولرازم ریاست کے اصول ہوں گے۔'' مجیب واد کی تشریح کرتے ہوئے انہوں نے کہا، ''عظیم امریکی رہنما ابراہم لنکن نے امریکہ کو جمہوریت اور آزادی دلوائی لیکن وہ انہیں سوشلزم نہ دے سکے۔ کارل مارکس سوشلزم کا بانی تھا لیکن اس کا فلسفہ جمہوریت اور آزادی سے خالی تھا۔ مجیب واد جمہوریت اور سوشلزم دونوں کا حامل ہے۔ اس لیے مجیب واد تیسری دنیا کا سیاسی فلسفہ ہوگا۔'' انہوں نے مزید کہا، ''مجیب واد کے قیام سے جو سرمایہ داری اور سوشلزم کے درمیان ایک منفرد اختراع ہے، ہم اپنی مادرِ وطن کو ''سنہرے بنگال'' میں بدل دیں گے۔'' انہوں نے مجیب واد کے لیے تحریک کو ''دوسرا انقلاب'' قرار دیا اور لوگوں کو اس میں شمولیت کا کہا۔

تاج الدین کو کمزور کرنے کے لیے عوامی لیگ کے اندر ان کے مخالفین نے اسی طرح طفیل احمد کے ذریعے مندرجہ بالا انتہائی غیر معمولی اور بے نظیر مجیب واد یا مجیب ازم کا نظریہ پیش کیا۔ 3 جنوری 1972ء کو حکومت پاکستان نے اعلان کیا کہ شیخ مجیب الرحمٰن کو رہا کیا جا رہا ہے۔ ذوالفقار علی بھٹو نے یحییٰ خان سے اقتدار حاصل کرنے کے فوراً بعد یہ فیصلہ کیا تھا۔ وہ واضح طور پر سمجھتے تھے کہ اگر انہوں نے مجیب الرحمٰن کو رِہا نہ کیا تو وہ ہندوستان میں قید نوے ہزار قیدیوں میں سے ایک قیدی کو بھی نہیں چھڑوا سکیں گے، جس کے لیے وہ اپنے عوام اور بالعموم دنیا کی جانب سے شدید سیاسی دباؤ کا شکار تھے۔ انہوں نے شیخ مجیب الرحمٰن کو رِہا کرنے سے قبل اندرا گاندھی کے ساتھ پس پردہ بات چیت کی تھی۔

شیخ مجیب الرحمٰن کی رہائی کے بارے میں ''نیویارک ٹائمز'' نے 3 جنوری 1972ء کی اشاعت میں تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا: ''سب کی دلچسپی اسی میں ہے کہ شیخ مجیب الرحمٰن جس قدر جلدی ہو سکے ڈھاکہ پہنچ جائیں۔'' جیسے ہی بھٹو نے اندرا گاندھی سے معاملہ طے کر لیا، 8 جنوری 1972ء کی صبح کو شیخ مجیب الرحمٰن کو رِہا کر دیا گیا اور وہ بذریعہ ہوائی جہاز لندن پہنچ گئے۔ ان کے لندن پہنچنے کے بعد بیگم مجیب نے فون پر انہیں سیدھا بنگلہ دیش آنے کا کہا۔ لیکن شیخ مجیب نے ہندوستان کے راستے بنگلہ دیش پہنچنے کا فیصلہ کیا۔ بعض وجوہات کی بنا پر وہ ڈھاکہ پہنچنے سے پہلے دہلی میں اندرا گاندھی سے ملاقات کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے لندن سے اندرا گاندھی کو فون کیا اور کہا: ''مادام وزیر اعظم میں آپ کا شکر گزار ہوں۔'' مسز گاندھی نے جواب دیا: ''تاریخ کا

دھارا بدلتے ہوئے 25 سال کی تلخی کو ختم کرنے پر میری جانب سے مبارک باد اور شکریہ قبول فرمائیں۔''
(''ریٹائرڈ سفیر ریاض الحق کی یادداشتیں''۔ ریاض الحق ان لوگوں میں سے تھے جنھوں نے شیخ مجیب الرحمٰن کی پاکستان سے آمد پر ہیتھرو کے ہوائی اڈے پر استقبال کیا تھا)۔

عام طور پر لوگ شیخ مجیب کی رہائی کے بارے میں سن کر بہت خوش تھے۔ اکثر لوگ خیال کرتے تھے کہ جب وہ واپس آ جائیں گے تو ہر معاملہ درست ہو جائے گا، اور ان جیسا قومی رہنما عوامی لیگ کی عوام دشمن پالیسیوں اور ہندوستان کی اطاعت گزاری کو پسند نہیں کرے گا۔ عام طور پر یہ سمجھا جا رہا تھا کہ وہ نہ صرف عوامی خواہشات کے مطابق ہندوستان کے ساتھ پالیسی میں تبدیلی لائیں گے بلکہ آزادی اور خود مختاری کے سوال پر کوئی سمجھوتہ بھی نہیں کریں گے۔ ان سے توقع کی جارہی تھی کہ وہ پارٹی کے چھوٹے چھوٹے مفادات پر قومی مفادات کو زیادہ اہمیت دیں گے اور ''سنار بنگلہ'' کے اپنے خواب کو پورا کرنے کے لیے قومی اتحاد کو مزید فروغ دیں گے۔ لیکن لندن سے سیدھا ڈھاکہ آنے کی بجائے اندرا گاندھی سے ملاقات کے لیے دہلی جانے کے شیخ مجیب کے فیصلے نے نہ صرف پوری قوم کو حیران کر دیا بلکہ ان کے جذبوں کو بھی ماند کر دیا۔ مجیب وہاں صرف اندرا گاندھی کا شکریہ ادا کرنے نہیں گئے تھے۔ یہ کام وہ فون پر پہلے ہی کر چکے تھے۔ انہوں نے اندرا گاندھی کو یہ یقین دلانے کے لیے دہلی جانے کا فیصلہ کیا تھا کہ ان کی عدم موجودگی میں عبوری حکومت اور ہندوستان کے درمیان طے پانے والے تمام سمجھوتوں اور اس معاہدے کی، جس پر دستخط کیے گئے تھے، وہ مکمل توثیق کرتے ہیں۔ وہ دہلی میں اندرا گاندھی کو اطمینان دلانے کے بعد ڈھاکہ آئے تھے۔ عوام کو واضح طور پر یہ پیغام مل گیا تھا کہ شیخ مجیب الرحمٰن نے اپنی پارٹی اور اپنے اقتدار کے لیے قومی مفادات کو قربان کر دیا ہے۔ اس طرح انہوں نے اپنے آپ کو محض پارٹی لیڈر کی سطح تک محدود کر دیا تھا جبکہ قوم انہیں قومی لیڈر کے طور پر دیکھنا چاہتی تھی۔ اس طرح ستم ظریفانہ طور پر شیخ مجیب الرحمٰن جیسے غیر متنازع عوامی لیڈر نے نئے آزاد ہونے والے بنگلہ دیش کے عوام کی امیدوں اور خواہشات پر پانی پھیر دیا۔

6 جون کو سہروردی اُدّن میں ایک بہت بڑے عوامی جلسے میں خود شیخ مجیب الرحمٰن نے اعلان کیا:
''بنگلہ دیش میں سائنٹیفک سوشلزم کا نفاذ کیا جائے گا لیکن اس کی بنیادیں مقامی حالات کے مطابق استوار کی جائیں گی۔'' اس کے بعد عوامی لیگ کے وزرا، وزرائے مملکت، نائب وزرا، پارٹی رہنماؤں اور پیروکاروں نے نام نہاد مجیب ازم یا مجیب واد کے قیام کے لیے ایک انتہائی قبیح مہم کا آغاز کر دیا۔ وہ تمام گلے پھاڑ پھاڑ کر نعرے لگا رہے تھے۔ ''مجیب واد قائم کرو''، ''جو بھی اس کی مخالفت کرے گا اسے کچل دیا جائے گا۔'' اس طرح انہوں نے ملک میں دہشت اور خوف کا راج قائم کر دیا۔ 9 اپریل 1972ء کو عوامی لیگ کے ایک سینئر رہنما اور حاضر سروس وزیر قمر الزمان نے اعلان کیا کہ ''مجیب واد کے بارے میں تعلیم دینے کے لیے ہر تھانے میں تربیتی کیمپ قائم کیے جائیں گے۔'' اس وقت کے وزیر اطلاعات میزان الرحمٰن چوہدری نے جولائی کے مہینے میں بیان دیا ''مجیب ازم بنگلہ دیش کے عوام کی خواہشات کا مظہر ہے۔'' مجیب ازم کے قیام کے لیے پارٹی

کے پیروکاروں پر مشتمل ''شیچھا شیبک باہنی''، ''جیئے بنگلہ باہنی''، ''لال باہنی'' جیسی مسلح خون آشام باہنیاں یکے بعد دیگرے تشکیل دی جانے لگیں۔ ان باہنیوں کے علاوہ اکثر بااثر رہنماؤں نے اپنی نجی غنڈہ باہنیاں قائم کر لیں۔

84۔عوامی لیگ کے طلبا اور مزدور محاذ میں اختلافات

1972ء کی ابتدا میں ہی چترا لیگ (عوامی لیگ کا طلبا بازو) کے اندر اختلاف رائے پروان چڑھنا شروع ہو گیا تھا۔ بتدریج شدید اختلاف رائے اور عدم اتحاد سامنے آنے لگا۔ 11 مئی 1972ء چار طالب علم رہنما دو حصوں میں بٹ گئے۔ اے ایس ایم رب اور شاہجہان سراج نے اعلان کر دیا کہ وہ مجیب واد پر یقین نہیں رکھتے۔ انہوں نے کہا کہ صرف سائنٹفک سوشلزم ہی عوام کو مکمل آزادی دلوا سکتا ہے۔ دوسری جانب عبدالقدوس مکھن اور نور عالم صدیقی نے اعلان کیا، ''مجیب واد ہر قیمت پر قائم کرنا ہوگا۔'' مختصر سے وقت میں یہ بحران پورے بنگلہ دیش میں پھیل گیا۔ ڈھاکہ یونیورسٹی کے بعض ہالوں میں مجیب واد کے حامیوں اور مجیب باد کے مخالفین میں مسلح جھڑپیں بھی ہوئیں۔ بحران اس وقت شدت اختیار کر گیا جب ان دونوں گروہوں نے بہت بڑے بڑے جلسے منظم کیے۔ شیخ مجیب الرحمٰن کو لازماً عبدالقدوس مکھن اینڈ کمپنی کے جلسے کا افتتاح کرنا پڑا۔ چترا لیگ میں دراڑ پڑنے سے بحران سرامک لیگ (عوامی لیگ کا مزدور محاذ) کے نچلے طبقے میں بھی سرایت کر گیا۔

جلد ہی سرامک لیگ بھی دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ مجیب واد مخالف چترا لیگ اور سرامک لیگ سے ٹوٹ کر الگ ہونے والے گروہ نے عوامی لیگ کی حکومت کے خاتمے اور ایک انقلابی حکومت کے قیام کا مطالبہ کر دیا۔ اس دوران ملک میں سیاسی ماحول میں گرمی پیدا ہونے لگی تھی۔ ایک جانب مجیب واد تھا اور دوسری جانب سائنٹفک سوشلزم تھا۔

3 مارچ 1972ء کو رب نے ایک تقریر میں کہا، ''جب قوم انفراسٹرکچر میں بنیادی تیاری کر رہی تھی عین اس وقت کچھ بیوروکریٹس، صنعت کار، کاروباری افراد اور چند سیاسی پارٹیاں بشمول حکمران عوامی لیگ کے ان کوششوں کے خلاف سازش کر رہی تھیں اور ''دوسرے انقلاب'' کے نام پر شدومد کے ساتھ ایک عوام دشمن پروپیگنڈے کا آغاز کر دیا گیا۔'' 8 مارچ کو جہانگیر نگر یونیورسٹی میں خطاب کرتے ہوئے اس نے مزید کہا: ''آزادی محض قومی پرچم کو تبدیل کرنے سے حاصل نہیں کی جا سکتی۔ اس کے لیے ایک سوشلسٹ پروگرام کی ضرورت ہے۔''

اس کے جواب میں 5 مئی 1972ء کو ایک مجیب باد رہنما نور عالم صدیقی نے کہا، ''مجیب نگر کے خلاف کوئی بھی دھمکی دراصل انقلاب دشمنوں کی جانب سے سوشلزم کو دھمکی ہے۔'' 23 مارچ 1972ء کو عوامی لیگ کے آرگنائزنگ سیکریٹری اور شیچھا شیبک باہنی کے سربراہ عبدالرزاق نے اعلان کیا، ''7 جون کو مجیب واد

کے قیام کے لیے قومی سطح پر مہم کا آغاز کر دیا جائے گا۔'' 13 جون کو مکھن صدیقی گروپ نے مطالبہ کیا: ''قومی آئین مجیب واد کے چار ستون پر مبنی ہونا چاہیے۔'' 6 جولائی کو وزیراعظم کے سیاسی سیکریٹری طفیل احمد نے کومیلا میں ایک عوامی جلسے سے خطاب کرتے ہوئے کہا: ''وہ لوگ جو بیرونی نظریات کا پرچار کر رہے ہیں، وہ عوام کے دوست نہیں ہیں۔ وہ تمام کے تمام عوام کے دشمن ہیں۔ تمام مسائل کا حل صرف مجیب واد کے قیام سے ممکن ہوسکتا ہے اور مجیب واد ملک میں ایک نئے دَور کا آغاز ہوگا۔'' اسی عوامی جلسے میں عبدالرزاق نے کہا: ''ہم دنیا کو دکھا دیں گے کہ کس طرح جمہوریت اور سوشلزم مل کر چل سکتے ہیں۔'' 16 جولائی کو عوامی لیگ کے لیڈر ظفر الرحمٰن نے کہا: ''استحصال سے پاک معاشرے کا قیام صرف مجیب واد کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ مجیب واد کروڑوں عوام کی خواہشات کا حقیقی مظہر ہے۔ مجیب واد کے قیام میں عوام کی مکمل آزادی پوشیدہ ہے۔'' اسی دن ڈھاکہ میں چترا لیگ کے ایک اجلاس میں مکھن صدیقی گروپ نے ایک قرارداد پاس کی جس میں انہوں نے کہا: ''ماؤ حمایتی قوتوں کے تحت، سی آئی اے کے ایجنٹس نام نہاد چترا لیگ کے نام پر، جن کو نکالا گیا تھا، البدر، الشمس اور رضا کار، شانتی کمیٹی کے ممبران، مسلم لیگ، جماعت (اسلامی)، نظام (اسلام پارٹی)، جمعیت العلماء اسلام، پی ڈی پی اور دوسری تنظیمیں مجیب واد کے قیام کی تحریک کی مخالفت میں متحد ہو رہی ہیں۔''

24 جولائی 1972ء کو بیت المکرّم کے سامنے چترا لیگ کے متحارب گروہوں میں بندوقوں سے ایک شدید جھڑپ ہوئی۔ 21 جولائی کو سہروردی اُدّن میں چترا لیگ کے مجیب واد کے حامیوں نے ایک جلسہ منعقد کیا، جس میں مجیب الرحمٰن کی موجودگی میں مجیب واد قائم کرنے کا حلف اٹھایا گیا۔ اُسی دن اور اُسی وقت چترا لیگ کے ایک مخالف دھڑے نے جو سائنٹفک سوشلزم پر یقین رکھتا تھا، پلٹن میدان میں ایک ریلی نکالی جہاں اے ایس ایم رب نے اعلان کیا، ''کارل مارکس کے بعد کوئی شخص بھی سوشلزم کی کوئی نئی تشریح نہیں کر سکتا۔ سوشلزم پر اس کا نظریہ حتمی ہے، اور بنگلہ دیش میں صرف وہی سوشلزم نافذ کیا جائے گا۔'' اس نے سختی سے کہا، ''نام نہاد مجیب بادیوں کے پیش کردہ ملغوبہ کو سوشلزم نہیں کہا جا سکتا۔'' اس دوران مجیب بادیوں کا مہلک ہتھیاروں سے مسلح ایک جتھہ ایک جلوس کی شکل میں گیا اور رب پر حملہ کر دیا اور جلسے کو درہم برہم کر دیا۔ اس کے نتیجے میں رب کے علاوہ تقریباً ایک سو طلبا زخمی ہوئے۔ ان میں سے ایک زخمی بعد میں ہسپتال میں دم توڑ گیا۔

1972ء میں روس نے بنگلہ دیش حکومت کو ایک سو سکالرشپس دیئے۔ وزارتِ تعلیم نے اہلیت کی بنیاد 100 طلبا کا انتخاب کیا۔ 8 جولائی کو وزیراعظم کی ہدایت پر منتخب شدہ فہرست میں سے 41 طلبا کو خارج کر دیا گیا اور ان کی جگہ 41 ناموں پر مشتمل ایک نئی فہرست پیش کی گئی۔ اس کی وجہ یہ بیان کی گئی کہ وہ 41 طالب علم مجیب واد میں یقین نہیں رکھتے تھے۔ لیکن چوں کہ ملک میں مجیب واد کے نعروں کا ایک طوفان اٹھا ہوا تھا، عوامی لیگ کی اعلیٰ قیادت کے اندر اس انوکھے نظریے کے حوالے سے کچھ بے چینی پیدا ہوگئی۔ یہ بے چینی اور

اندرونی اختلاف رہنماؤں کی تقاریر اور بیانات میں واضح نظر آنے لگا تھا۔

18 جولائی کو اس وقت کے صدر جسٹس ابوسعید چوہدری نے چٹاگانگ میں ایک جلسے سے خطاب کرتے ہوئے کہا، ''ملک کو جمہوریت کے نظریے اور اصولوں کے مطابق چلایا جائے گا۔'' اس سے محض ایک دن پہلے عوامی لیگ کے ایک ممتاز رہنما ظہور احمد چوہدری نے ٹھاکر گاؤں میں ایک جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے کہا، ''ملک کو مجیب واد کے چار اصولوں کے مطابق چلایا جائے گا۔'' چند دن بعد 31 جولائی آرگنائزیشن کمیٹی کے ایک جلسے میں ایک قرارداد پاس کی گئی جس میں کہا گیا کہ ''تمام مذموم سازشوں'' کو کچلتے ہوئے مجیب واد کا قیام عمل میں لایا جائے گا۔ 12 اگست کو وزیر مالیات تاج الدین احمد نے بہاول میں ایک جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے کہا، ''اگر سوشلزم کو خطرہ ہوا تو پھر ہم جمہوریت کو مسترد کریں گے۔'' 20 اگست کو عوامی لیگ کے ایک اور ممتاز رہنما عبدالرزاق نے کہا، ''سائنٹفک سوشلزم ایک مستعار لیا گیا نظریہ ہے اور ماؤ پرستوں کی ایک سازش ہے۔''

جمہوریہ کا صدر اعلان کرتا ہے کہ جمہوریت قائم کی جائے گی، وزرا کہہ رہے ہیں کہ اگر ضروری محسوس ہوا تو سوشلزم کی خاطر جمہوریت کو قربان کر دیا جائے گا جب کہ مقدم ترین رہنما شیخ مجیب کا کہنا تھا کہ مجیب واد قائم کیا جائے گا۔ ان سب نے مل کر قومی سیاست میں ایک شدید نظریاتی انتشار پیدا کر دیا تھا اور اس کے نتیجے میں نہ صرف حکمران جماعت عوامی لیگ بلکہ پوری قوم تقسیم ہو چکی تھی۔

85۔ مجیب باد کے متناقض اصول

اقتدار میں آنے کے بعد عوامی لیگ کے رہنماؤں نے ملک کو ہندوستانی آئین کے برخود متناقض چار اصولوں یعنی قوم پرستی، جمہوریت، سوشلزم اور سیکولرازم پر چلانے کے جوکھم کا بیڑا اٹھایا۔ مجیب واد کا نظریہ قوم پر ٹھونس دیا گیا۔ متناقض اصولوں کے ایک مجموعے یعنی مجیب واد کے تحت ملک کو چلانے کی ان کی اس کوشش کی اہمیت کو واضح کرنے کے لیے میں مناسب خیال کرتا ہوں کہ یہاں ان اصولوں کا ایک تفصیلی جائزہ پیش کیا جائے۔ طفیل احمد کے اس انتہائی شرمناک اعلان پر کہ ''جمہوریت اور سوشلزم کے مشترکہ نفاذ کے ساتھ مجیب واد ایک تیسرے عالمی نظریے کے طور پر قائم کیا جائے گا''، کہا جا سکتا ہے کہ جمہوریت اور سوشلزم دو مکمل طور پر ایک دوسرے کے مخالف اصول ہیں۔ جمہوریت کی بنیاد انفرادیت، بنیادی حقوق اور آزادی ہے۔ ''انسان آزاد پیدا ہوا ہے اور آزاد ہی مرے گا''، یہ جمہوریت کا بنیادی نکتہ ہے۔ سیاست میں یہ ریاست کا اعلیٰ ترین ڈھانچا ہے اور ہر فرد کو مکمل شخصی آزادی کی ضمانت دیتا ہے۔ دوسرے میدانوں میں بھی انہیں مکمل آزادی حاصل ہوتی ہے۔ انہیں اپنی ذہانت اور صلاحیتوں سے بھرپور فائدہ اٹھانے کے یکساں مواقع فراہم کیے جاتے ہیں۔ انہیں مذہبی اور ثقافتی آزادی ہوتی ہے۔ سرمایہ دارانہ مغربی تہذیبیں، ثقافتیں اور ورثے انہی اصولوں کے تحت پروان چڑھے ہیں۔

اس سرمایہ دارانہ فلسفے کی ضد میں کارل مارکس نے سوشلزم اور کمیونزم کا یہ فلسفہ ایجاد کیا تھا۔ سرمایہ دارانہ نظام سے کمیونزم کی جانب تبدیلی کے دَور کو سوشلزم کی حالت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ سوشلزم کے نفاذ کے لیے شخصی آزادی چھین لی جاتی ہے۔ ایک مخصوص طبقے کی آمریت پورے معاشرے پر مسلط کر دی جاتی ہے۔ قومیانے کے نام پر پارٹی کے وفادار تمام ذرائع پیداوار کو کنٹرول کرتے ہیں۔ پیداواری قوتوں کے فروغ کے قدرتی راستوں کو بند کر دیا جاتا ہے۔ غیر فطری طور پر انسانوں کو مشین بنانے کی کوششیں کی جاتی ہیں۔ مشینی طرزِ زندگی کے بوجھ تلے لوگوں کے جذبے اور تخلیقی صلاحیتیں ماند پڑ جاتی ہیں۔ پارٹی کے رہنما اور حکومتی ملازمین یعنی ریاستی انتظامیہ میں متعین بیوروکریٹس عوام کی محنت کے ثمرات سے فیض یاب ہوتے ہیں۔ بتدریج عام لوگوں کا معیارِ زندگی پست ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس سے معاشرتی بے چینی جنم لیتی ہے۔ پھر ایک وقت آتا ہے کہ ریاستی ڈھانچا اور معاشرہ زمین بوس ہو جاتا ہے۔ اس طرح اچھے خاصے مستحکم سوویت یونین (روس) اور دوسرے سوشلسٹ ممالک منہدم ہو گئے تھے۔ ان تمام ناکام سوشلسٹ ممالک کی قیادت نے اس وقت نہ صرف یہ کہ سوشلزم کے نظریے کو مسترد کر دیا ہے بلکہ انہوں نے سرمایہ دارانہ نظام اور جمہوریت کو گلے لگا لیا ہے۔ ان واقعات سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ جمہوریت کی خاطر سوشلزم کو مسترد کرنا ضروری ہے۔ یہ عملی طور پر ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے۔

ہر انسان کو انفرادی خصوصیات سے نوازا گیا ہے اور کوئی سے بھی دو فرد ایک جیسے نہیں ہو سکتے۔ اس قدرتی مظہر اور شخصی آزادی کے گرد جمہوریت پروان چڑھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کے دن تک یہ انسانوں کے لیے کشش رکھتی ہے۔ دوسری جانب انسانوں کو مشین میں تبدیل کرنے کا نظریہ بالکل غیر فطری طور پر انہیں برابری کی سطح پر ظاہر کرتا ہے اور کسی قسم کی مقبولیت حاصل نہیں کر سکتا، اس لیے لوگوں نے آخر کار سوشلزم کو مسترد کر دیا ہے۔ انہی وجوہات کی بنیاد پر بنگلہ دیش کے عوام نے بھی سوشلزم کے مسلط کیے جانے کو قبول نہیں کیا تھا۔ وہ مجیب واد کے ملغوبہ فلسفے پر یقین نہیں رکھتے تھے اور پہلے دن ہی سے ان کی دھونس کو قبول کرنے سے انکاری تھے۔

اب ہم سیکولرازم پر بات کریں گے۔ میں آج کے دن تک سیکولرازم کے لغوی معنی سمجھنے سے قاصر رہا ہوں۔ اگر اس کا مطلب تمام عقائد اور مذاہب سے دوری ہے تو پھر اس کا مطلب بے اعتقادی ہے۔ لیکن آج کی جدید دنیا میں بھی ہر فرد کسی نہ کسی قسم کے عقیدے یا مذہب کے تحت زندگی بسر کر رہا ہے۔ اور یہی عقیدہ یا ایمان زندہ رہنے پر اکساتا ہے۔ کیا کوئی شخص کسی قسم کے عقیدے یا مذہب کے بغیر رہ سکتا ہے۔ میرے خیال میں کوئی بھی ایسا شخص نہیں ہے۔ عقیدہ کئی قسم کا ہو سکتا ہے۔ مثلاً مذہبی عقیدہ، انسان دوستی، الحاد، روحیت یا بت پرستی وغیرہ۔

ہر شخص جس بھی عقیدے پر یقین رکھتا ہے وہ اس کا ذاتی انتخاب ہوتا ہے۔ لیکن زندگی بسر کرنے کے لیے کسی نہ کسی عقیدے یا مذہب پر یقین رکھنا ضروری ہے۔ ریاستی اصول کے طور پر سیکولرازم کا نفاذ

درحقیقت لوگوں کے مذہبی حق کو چھیننے کی ایک بے کار کوشش تھی، جسے جائز طور پر مسترد کر دیا گیا۔ سیکولرازم کا نفاذ کر کے عوامی لیگ نے اکثریت اور اقلیت دونوں کے مذہبی جذبات کو یکساں طور پر مجروح کیا تھا۔ خدا کا خوف رکھنے والے بنگلہ دیش کے مذہبی عوام نے حکومت کے اس ناجائز قدم کو قبول نہیں کیا تھا۔ اپنے مذہب پر عمل کرنے کا حق انسانوں کے بنیادی حقوق کا حصہ ہے۔ اگر اس کا مقصد فرقہ واریت کو کچلنا ہے تو پھر اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ بنگلہ دیش کے عوام غیر فرقہ واریت اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کا ایک قابل تعریف ورثہ رکھتے ہیں۔ برصغیر کے دوسرے حصوں میں خاص طور پر ہندوستان میں بہت سے مذہبی فسادات ہو چکے ہیں۔ لیکن بنگلہ دیش میں مختلف مذاہب اور عقیدوں سے تعلق رکھنے والے لوگ صدیوں سے امن اور شانتی سے رہتے چلے آ رہے ہیں۔ یہ ایک تاریخی سچائی اور قومی فخر کی بات ہے۔ بہت سے لوگوں نے اس ورثہ کو نقصان پہنچانے اور مذہب کو سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کرنے کی کوشش کی ہے لیکن ان کی تمام کوششیں ناکام رہی ہیں۔ اس ہم آہنگی کو قائم رکھنے میں بڑا حصہ مسلمان اکثریت کا رہا ہے۔

بنگالی مسلمانوں کے لیے مذہب صرف روحانی معاملہ نہیں ہے یہ ایک طرزِ زندگی ہے۔ وہ شدید مذہبی لوگ ہیں لیکن جنونی نہیں۔ اسلام میں اقلیتوں کے حقوق کی ضمانت دی گئی ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ اسلامی ریاست میں اقلیتوں کے بارے میں حکومت کے فرائض اور ذمہ داریوں کی قرآن اور سنت میں مکمل وضاحت کی گئی ہے۔ اسلام اس حوالے سے دنیا کے بڑے مذاہب میں منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ لہٰذا محض ماننے والوں اور ایمان رکھنے والوں کو سزائیں دینے کے لیے آئین میں سیکولرازم کی شمولیت ضروری نہیں تھی۔ آئین لوگوں کے طرزِ زندگی اور ان کے عقائد سے ہم آہنگ ہونا چاہیے۔ لیکن حکومت کو لوگوں کے جذبات کی کوئی پروا نہ تھی۔

اب ہم قوم پرستی کا جائزہ لیتے ہیں۔ اقتدار سنبھالنے کے فوراً بعد عوامی لیگ نے بعض وجوہات کی بنا پر جو وہ خود ہی بہتر طور پر جانتے ہیں، بنگلہ دیش میں بنگالی قومیت کے حوالے سے قومی سطح پر ایک بے تکا پروپیگنڈا شروع کر دیا۔ لیکن انہوں نے ان بنیادوں اور جڑوں کے بارے میں ایک لفظ بھی نہ کہا جن پر تاریخ میں ہزاروں سال پہلے اس علاقے کے لوگ ایک قوم کی صورت میں پروان چڑھے۔ بنگلہ دیش کی آزادی کے بعد ان کے کچھ رہنماؤں نے راگ الاپنا شروع کر دیا کہ دو قومی نظریہ غلط ثابت ہو چکا ہے۔ دوسرے الفاظ میں وہ اس بات کی وکالت کر رہے تھے کہ 1947ء میں ہندوستان کی تقسیم غلط ہوئی تھی۔ تاہم بنگلہ دیش کے عوام نے جب اس شور و غوغے میں لغو اور بے سروپا "اکھنڈ بھارت" کی گونج کو محسوس کیا تو وہ بدگمان اور خوف زدہ ہو گئے۔

لیکن میرے نزدیک بنگلہ دیش کے قیام نے اس تاریخی حقیقت کی ایک مرتبہ پھر تصدیق کر دی تھی کہ برصغیر میں ایک یا دو قومیں نہیں بلکہ بہت سی اقوام آباد ہیں۔ بنگلہ دیش دو قومی نظریہ سے ایک قدم اور آگے برصغیر میں بسنے والی ان اقوام کے لیے ایک تحریک کا باعث ہے جو اپنی قومی شناخت اور آزادی کے حصول کے

لیے لڑ رہی ہیں۔

مذہب اور زبان دو اہم عناصر ہیں۔ لیکن یہ دونوں واحد عناصر نہیں ہیں جن کے گرد قومیت پروان چڑھتی ہے۔ جغرافیائی اور علاقائی حدود، نسل، تہذیب اور تاریخی ورثہ بھی اہم فیصلہ کن عناصر ہیں جو کسی بھی قوم کے ارتقائی عمل پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ جب لوگ قطع نظر اپنے مذہبی عقائد، زبان، رنگ، گروہ، ذات، فرقے، نسل کے کسی مشترکہ مقصد کے جذبے سے متحد ہوتے ہیں تو قومیت جنم لیتی ہے۔ قومیت بنیادی طور پر ایک احساس، ایک ذہنیت، ایک طرزِ زیست ہے جو کسی قوم کے تاریخی تجربے سے پروان چڑھتی ہے۔ شان دار ماضی کے بارے میں فخر، موجود کامیابیاں اور محرومیاں، اور روشن مستقبل کی تمنائیں قومی جذبات کو تحریک بخشتی ہیں۔ جب لوگ اس جذبے کے ساتھ متحد ہوتے ہیں تو وہ ایک ناقابلِ تسخیر معاشرتی اور سیاسی قوت بن جاتے ہیں جو ہر سطح پر اور ہر قوت کے چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہوتی ہے۔ قومیت کے سوال پر بنگلہ دیش میں ابھی تک غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ سیاستدانوں نے اپنی ذاتی اغراض کے لیے اس مسئلے کو مزید پیچیدہ بنا دیا ہے۔ اس ابہام کو دُور کرنے کے لیے دانشوروں کو اپنا کردار ادا کرنے کی اشد ضرورت ہے جو بدقسمتی سے کہیں بھی نظر نہیں آ رہے۔ ہمیں سچ جاننے کی ضرورت ہے، ہماری قومیت کیا ہے؟ بنگلہ دیشی یا بنگالی؟

برصغیر کی قدیم تاریخی دستاویزات ایسے ثبوتوں اور شہادتوں سے بھری پڑی ہیں، جو اس بات کی تصدیق کرتی ہیں کہ قدیم بنگا اور اس پر مشتمل گنگا طاس کے ساحلی علاقے 1400 سے 1000 سال قبل مسیح میں بھی اپنی تمام تر خوش حالی کے ساتھ ایک آزاد علاقے کے طور پر آباد اور شاد تھے۔ بنگا کا ذکر ''اوتاریوارانک'' میں موجود ہے۔ بنگا کا حوالہ مہابھارت اور ہری بنگش میں بھی ملتا ہے۔ لہٰذا بنگا کو موجودہ دَور کا مظہر بیان کرنے کی گنجائش موجود نہیں ہے۔ بنگا کا رامائن اور مشہور معاشی اصولوں پر مبنی کوٹلیہ کی کتاب ارتھ شاستر میں ذکر موجود ہے۔ اس میں بنگا کو ''مشرقی وطن'' (ڈرا کا جنا پتھ) کے نام سے بیان کیا گیا ہے جو اپنے عمدہ کپڑے دُکل اور ''پوتھرون'' کی وجہ سے مشہور تھا۔

مشہور قدیم تاریخ دان Biraha Mihir (550-500 عیسوی) اپنی مشہور کتاب Brihath Sanghita میں مشرقی علاقوں (پوربا دیش) کا ذکر کیا ہے جو اب بنگلہ دیش ہے۔ وہ ''ہری کل'' گاوَرک، پروندا، بنگا، بردوان، تمرالیپتا، شماتات، اور اپابنگا تھے۔ ستیش چندر مترا نے جیسور اور کھلنا کے جنوبی حصوں کو اُپا بنگا قرار دیا ہے۔ موجودہ بنگلہ دیش کے لیے ایک اور قدیمی علاقے کا نام ''شمورا'' بھی بیان کیا گیا ہے۔ موجودہ مینتھلا اور کاوَلنگا جو موجودہ اڑیسہ کے حصے ہیں، وہ بھی بنگالہ دیش یا بنگلہ دیش میں شامل تھے۔

برفانی دَور کے بعد آج تک بنگلہ دیش اپنے رہائشیوں سے کبھی بھی محروم نہیں رہا۔ دنیا کی دوسری بہت سی تہذیبوں کی طرح کرۂ ارض کے اس حصے میں بھی جسے بنگلہ دیش کے نام سے جانا جاتا ہے، قبل از تاریخ انسانی تہذیب ارتقا پا چکی تھی۔ یہاں سے قبل از تاریخ پتھر کے زمانے اور تانبے کے زمانے کے آثار باقیات اور ہتھیار بھی دریافت ہو چکے ہیں۔ قدیم بنگلہ دیش کے مختلف علاقوں میں جو لوگ آباد تھے، ان میں

پودھ، باوری، وِل، مُنڈا، سنتال، سابر، کول، پولندھ، ہاری، ڈوم، چنڈال اور راج بنگشی جیسے نسلی گروہ شامل تھے۔ یہ بنگلہ دیش کے لوگوں کے آباواجداد تھے۔ زبان اور شکل وصورت کی یکسانیت کی وجہ سے جنہیں مخصوص اور گروہوں کے لوگوں میں شمار کیا جاتا تھا جو آسٹریلیا کے باشندوں کے ایک گروہ سے مشابہت رکھتے تھے، اسی لیے انہیں آسٹروایشیاٹک یا آسٹریک بھی کہا جاتا ہے۔

بنگلہ دیش کی سرحد پر راج محل پہاڑیاں ہیں۔ قدیم باشندے جو ان پہاڑی جنگلوں میں رہتے تھے، وہ چھوٹے قد، پچکے ناکوں اور گہری سیاہ رنگت کے حامل تھے۔ وید میں لوگوں کے جس گروہ کو نشد کے نام سے لکھا گیا ہے۔ ان کا حلیہ راج محل پہاڑیوں میں رہنے والے لوگوں سے ملتا تھا جیسا کہ یہ سری لنکا کے ویدد لوگوں کی طرح نظر آتے تھے۔ ان کا بشریاتی نام بھی ویدد ہی پڑ گیا۔ بعض قدیم تحریروں میں یہ نشد کے نام سے بھی جانے جاتے ہیں۔ بنگلہ دیش میں یہ لوگ مختلف موسموں اور ماحول میں بکھرے ہوئے گروہوں کی صورت میں رہتے تھے۔ بعد میں ان میں باہر سے آنے والے لوگوں کا خون بھی شامل ہوتا چلا گیا۔ خون کی اس آمیزش اور مختلف طرزِ زندگی کے نتیجے میں ان کی شکل وشباہت اور رہن سہن میں رنگا رنگی پیدا ہوگئی۔ ان کی سائیکی، لہجے اور دوسرے تہذیبی پہلوؤں میں اس رنگا رنگی کی جھلک آسانی سے دیکھی جاسکتی ہے۔ ان بنگالی خصوصیات کی رنگا رنگی میں اتحاد کی جڑیں بنگلہ دیش کی زمین، ہوا اور پانی میں اور دوسری اجنبی نسلوں کے ساتھ باہمی تعامل میں پیوست ہیں۔

بنگلہ دیش کے قدیم باشندے آریوں کی نسل نہیں تھے۔ محققین بنگلہ زبان پر تحقیق کے بعد اسی نتیجے پر پہنچے ہیں۔ مزید برآں دراوڑی اور آریہ کسی انسانی نسل کا نام نہیں بلکہ لسانی گروہ ہیں۔ لہٰذا محض زبان کی وجہ سے کسی انسانی نسل کا تعین کرنا درست نہیں ہے۔ ہمارے قطعہ زمین کو جو ہمالیہ کی ترائیوں سے لے کر خلیج بنگال تک پھیلا ہوا ہے۔ بنگا دیش یا بنگلہ دیش کہا جاتا ہے۔ پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بنگالا یا بنگالی کی اصطلاحات کہاں سے آئیں؟ ان اصطلاحات کی تاریخ ان لوگوں کی نسبت جن سے یہ متعلق ہیں، بہت بعد کی ہے۔

ایک معروف محقق ابوالفضل نے اپنی کتاب ''آئین اکبری'' میں بنگلہ، بنگالا اور بنگالی اصطلاحات کے وجود میں آنے کے بارے میں کچھ روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ سلطان شمس الدین الیاس پہلا حکمران تھا جس نے قدیم لفظ بنگا کے ساتھ ''آل'' کا اضافہ کیا اور بنگالا، بانگلہ اور بنگالی کے الفاظ اختراع کیے۔ ''آل'' کا مطلب پانی کے بہاؤ کو روکنے والی رکاوٹ ہے۔ دوسری جانب شوگو مارسین کی رائے میں مسلمان حکمرانوں کے دور میں قدیم لفظ بنگا سے بنگالا یا بنگلہ کے الفاظ وضع کیے گئے جو صوتی لحاظ سے فارسی کے الفاظ ہیں۔ پرتگیزیوں نے اسے بنگولا بنا دیا اور پھر سب سے آخر میں برطانویوں نے بنگال کا نام دیا اور یہاں بسنے والے لوگوں کو بنگالی کہا جانے لگا۔ موجودہ بنگلہ دیش اسی وسیع علاقے پر مشتمل ہے جو زمانہ قدیم میں بنگا کہلاتا تھا۔

قدیم بنگا کی حدود یوں بیان کی گئی ہیں، شمال میں ہمالیہ کا سلسلہ نیپال، سکم اور بھوٹان، شمال مشرق میں دریائے برہمپتر اور اس کا ڈیلٹا، شمال مغرب میں دار گنگا، دریائے بھاگرتھی کے شمال میں میدانوں کے

متوازی، مشرق میں برما کے پہاڑی سلسلوں تک، مغرب میں مغربی بنگال کے راج محل، سنتھل پرگنہ، چھوٹا ناگ پور، مرشد آباد، مالدہ کے علاقے اور بہار کے بیر بھم، خان بھم، دھال بھم، کیونجور، اور مایور بھانجا کی سطح مرتفع اور جنوب میں خلیج بنگال ہے۔ قدیم بنگا یا بنگلہ دیش کی ان علاقائی حدود کے اندر بنگلہ دیشیوں یا بنگا بھاشیوں نے گاورا، پندرا، براندرا، راہرا، شمورا، تمرالیپتا، شماتات، بنگا، بنگال، ہری کل جیسے علاقے آباد کیے۔ کول، ول، سابر، پلند، ہاری، ڈوم، چندال، سنتھل، موندا، اوراو، وہمز، باگدی، باوری، مالا پہاڑی، جیسے نسلی گروہوں نے باہر سے آنے والے اجنبیوں کے ساتھ باہمی تعامل سے بنگا باشی یا بنگلہ دیشی قوم کو جنم دیا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ باہر سے آنے والے حکمرانوں نے اپنے ذاتی مفادات کی خاطر بنگا باشیوں کی سرزمین کو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا۔ اس قسم کی علاقائی تقسیم میں آج بھی قوم منقسم کھڑی ہے۔ تاہم ریاست کی حدود مستقل نہیں ہوتیں۔ ہمارے عظیم آبا و اجداد نے مشہور شہر آباد کیے، علاقے بسائے، ایک ثقافت اور تہذیب کو جنم دیا اور ہمارے لیے ایک صنعتی ورثہ چھوڑا۔ یہ سب چیزیں ہمارے قومی تفاخر کی علامات ہیں۔ ہماری ریاستی حدود اور قومیت کے حوالے سے مفاد پرست افراد اور حریف عناصر ابہام پھیلانے اور الجھاؤ پیدا کرنے کے لیے جو بھی کوششیں کر رہے ہیں، وہ زیادہ عرصہ تک نہیں چل سکیں گی۔ لوگوں کو بے وقوف بنانے کی کوئی بھی کوشش کامیاب نہیں ہوگی۔ قوم تاریخی حقائق کی روشنی میں دیکھے گی اور انشاء اللہ ایک دن اپنے جائز مطالبات منوانے میں کامیاب ہوگی اور ناانصافی کے تمام گزشتہ سالوں کی تلافی کر سکے گی۔

1971ء میں قومی حدود کو بگاڑنے کی پہلی سازش قومی پرچم کی تیاری کے وقت سامنے آئی۔ اس کے ڈیزائن کرنے میں کچھ درپردہ محرکات کارفرما تھے۔ سبز رنگ کے پس منظر پر ایک سرخ رنگ کا سورج اور اس میں پیلے رنگ کا اس وقت کے مشرقی پاکستان کا نقشہ رکھا گیا تھا۔ لیکن مجاہدین آزادی اور باضمیر لوگوں نے سازشوں کے اس منصوبے کو ناکام بنا دیا۔ انہوں نے قومی پرچم میں سے نقشے کو نکالنے کا مطالبہ کیا اور مجیب نگر کی حکومت کو اس پُرزور عوامی مطالبہ کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑے۔ سبز رنگ بنگلہ دیش کے زرخیز سونا اگلتے میدانوں کو ظاہر کرتا ہے اور سرخ دائرہ ابھرتے ہوئے سورج کی علامت ہے۔ چڑھتا ہوا سورج ایک مکمل صورت اختیار کر لے گا اور اس کی چمک سے تمام دھند صاف ہو جائے گی اور دنیا مکمل بنگلہ دیش، بنگا یا بنگال دیکھ سکے گی۔ یہ محض مصنف کا ایک مقدس خواب نہیں ہے بلکہ ایک حقیقت ہے جو تاریخ کے فطری قوانین کے تحت تعبیر پائے گی۔

86۔ مولانا بھاشانی کے ساتھ آخری ملاقات

نچلے طبقے کے عظیم چمپئن اور بنگلہ دیشی عوام کے محبوب رہنما مرحوم مولانا بھاشانی نے میرے ساتھ اپنی آخری ملاقات میں بنگلہ دیش اور بنگلہ دیشیوں کے مسئلے پر بات چیت کرتے ہوئے ایک انتہائی اہم بات کی تھی۔ میں اس عظیم رہنما کی بصیرت اور سیاسی دانش کی گہرائی کو بیان کرنے کے لیے اس ملاقات کا مختصر سا حال بیان کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

اگست 1976ء میں وہ ایک آپریشن کے لیے لندن گئے تھے۔ اس وقت میں بھی لندن میں موجود تھا۔ انہیں کسی طرح میری وہاں موجودگی کا علم ہو گیا اور انہوں نے مجھے میرے ایک قریبی دوست معروف صحافی غازی الحسن کے ذریعے ملاقات کے لیے بلایا۔ غازی اور میں ''ویسٹ اینڈ'' میں ان کے فلیٹ پر پہنچ گئے۔ یہ تقریباً صبح 10 بجے کا وقت تھا۔ بنگلہ دیش ہائی کمیشن نے مولانا کے لیے اس فلیٹ کا بندوبست کیا تھا۔ ان کا آپریشن ہو چکا تھا۔ ہم جیسے ہی اندر گئے میں نے ان کے بیٹے ناصر بھاشانی کو کمرے میں موجود پایا۔ حضور مولانا بھاشانی آدھی آنکھیں بند کیے بستر پر لیٹے ہوئے تھے۔ زخم ابھی تک مکمل مندمل نہیں ہوا تھا۔ ان کی خوراک پرہیزی اور ہلنے جلنے پر پابندی تھی۔ ہم نزدیک پہنچے تو انہوں نے مجھے بستر پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں نے ان کے حکم کی تعمیل کی اور بستر پر ان کے نزدیک بیٹھ گیا۔ غازی نے ایک کرسی کھینچ لی۔ علیک سلیک کے بعد انہوں نے مجھے پوچھا کہ میں نے ناشتہ کر چکا ہوں یا نہیں۔

''جی ہاں حضور! ہم نے ناشتہ کر لیا ہے۔'' میں نے جواب دیا

''ٹھیک ہے۔ پھر مجھے کھلاؤ۔ میں انڈے کھانا پسند کروں گا۔'' انہوں نے حکم دیا۔ میں نے مسٹر ناصر بھاشانی کی جانب دیکھا۔ اس نے ان کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے میرے کان میں کہا، ''ڈاکٹر سے پوچھے بغیر ان کے لیے انڈے کھانا درست نہیں ہوگا۔'' مولانا غصے میں تھے اور بضد تھے۔ ''میں نے آج انڈے ہی کھانے ہیں۔'' لہٰذا ہمیں ان کی بات ماننا پڑی۔ ناصر بھاشانی دو تلے ہوئے انڈے کر آیا۔ مولانا نے مجھے پلیٹ پکڑنے کا حکم دیا اور اپنے بیٹے کو کمرے سے نکل جانے کو کہا۔ ناصر بھاشانی باہر چلا گیا، غازی خاموشی سے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔

''ٹھیک ہے مجھے اپنے ہاتھ سے کھلاؤ۔'' مولانا نے خواہش ظاہر کی۔ میں نے بہت زیادہ احتیاط کے ساتھ انہیں انڈے کھلانا شروع کر دیا۔ انڈے کھاتے ہوئے وہ آہستہ آہستہ کمزور سی آواز میں باتیں کر رہے تھے۔ انہوں نے میرے ذاتی معاملات کے بارے میں سوال کیے۔ میں کب لندن آیا تھا؟ کیوں آیا تھا؟ میرے بچے کہاں ہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔ یہ مولانا کا مخصوص انداز تھا۔ وہ بات چیت کا آغاز ہمیشہ اس انداز سے کیا کرتے تھے۔ جس میں شفقت اور ذاتی لگاؤ کا احساس ہوتا تھا۔ جب انہوں نے انڈے کھا لیے، میں نے انہیں دوائی دی جو انہیں ناشتے کے بعد دی جانی تھی۔ ناشتے کے بعد وہ مطمئن محسوس کر رہے تھے۔ لیکن جلد ہی وہ خیالات میں کھو گئے۔ کچھ دیر بعد انہوں نے اچانک کہنا شروع کیا۔

''بابا اب میں 97 سال کا ہو چکا ہوں۔ کسے معلوم ہے کہ میں کتنا زندہ رہتا ہوں؟ لیکن میں تمہیں کچھ بتانا چاہتا ہوں۔ تم نے اور تمہارے ساتھیوں نے وہ کام کیا ہے، جو یہ بوڑھا آدمی کرنے کے قابل نہیں تھا۔ تم نے دس کروڑ افراد کو ظلم اور غلامی سے نجات دلوائی ہے۔ میں ایک مرتبہ پھر تم کو دعا دیتا ہوں، اللہ تعالیٰ تمہاری عمر دراز کرے۔''

یہ کہتے ہوئے انہوں نے دوبارہ اپنی آنکھیں بند کر لیں اور اپنا پتلا دبلا بازو میرے جسم پر پھیرتے

ہوئے کچھ قرآنی آیات کا ورد کرتے ہوئے میرے سینے پر پھونک ماری۔ اگرچہ میں ان کے کافی نزدیک بیٹھا ہوا تھا، میں سن نہ پایا کہ انہوں نے کون سی آیات کا ورد کیا تھا۔ سارا ماحول اچانک بہت جذباتی ہوگیا۔ میں بہت زیادہ متاثر ہوا اور خاموشی سے بیٹھا رہا۔ ان کی شفقت اور محبت نے میرے دل پر ایسا اثر ڈالا کہ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ کچھ دیر بعد انہوں نے اپنی آنکھیں کھولیں اور بات چیت جاری رکھی۔ ''بابا لندن آپ کا مقام نہیں۔ تمہیں واپس جانا ہوگا۔''

مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ حضور کو کیا جواب دوں۔ ان دنوں جنرل ضیاالرحمٰن کے ساتھ ہمارے تعلقات کسی حد تک کشیدہ تھے کیوں کہ ہم ان کی بعض پالیسیوں اور فیصلوں سے اختلاف رکھتے تھے۔ جب میں یہ سوچ رہا تھا کہ کیا انہیں ان سارے معاملات کے بارے میں بتاؤں یا نہیں کہ وہ خود ہی کہنے لگے، ''مجھے علم ہے کہ تمہیں جنرل ضیا سے کچھ اختلافات ہیں۔ وہ غلط ہے۔ میں واپسی پر اسے سمجھاؤں گا۔ اگر وہ میری بات سن لیتا ہے تو اچھی بات ہے، ورنہ میں جانتا ہوں کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ تم تیار رہو۔ لیکن بابا جان اس بوڑھے آدمی کی بات غور سے سنو، جس کام کی ابتدا تم نے کی ہے، یہ ایک لمبا کام ہے۔ اگر تم اپنی قوم کے لیے کچھ بامعنی کام کرنا چاہتے ہو تو تمہیں شترمرغ کی طرح اپنی نگاہ کو بنگلہ دیش کی موجودہ حدود تک محدود نہیں رکھنا چاہیے۔ تمہیں اس کی حدود کے پار دیکھنا ہوگا۔ جو کچھ میں نے ابھی ابھی کہا، اس کے بارے میں سنجیدگی سے غور کرو۔''

وہ قدرے تھک چکے تھے۔ انہیں پسینہ بھی آ گیا تھا۔ میں نے ان کا پسینہ پونچھتے ہوئے عرض کیا، ''حضور میرے لیے دعا کریں کہ میں اپنے ایمان پر پختہ رہ سکوں۔ اللہ پاک ہمیں ہمت اور استقلال سے نوازے تاکہ ہم اپنے آپ کو مجاہدین کے طور پر قوم کی آزادی کے لیے لڑنے کے لیے وقف کر سکیں۔''

میری بات سننے کے بعد انہوں نے مجھے اپنے سینے سے لگایا۔ ان کی گرم جوشی اور اخلاص نے میرے دل کو ایسی خوشی اور اطمینان سے بھر دیا جو میں بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ اس دوران ڈاکٹر معمول کے معائنے کے لیے آ گیا۔ ہمارا وقت ختم ہو چکا تھا۔ لہٰذا ہم نے اجازت طلب کی اور اس عظیم رہنما کے سنہری الفاظ اور قیمتی مشورے کے ساتھ، جس کی میں دل کی گہرائیوں سے عزت و تکریم کرتا ہوں، کمرے سے باہر آ گئے۔ یہ ہماری آخری ملاقات تھی۔ اس سے پہلے بھی میں مولانا بھاشانی سے کئی مرتبہ ملاقات کر چکا تھا لیکن یہ ملاقات بہت مختلف اور غیر معمولی تھی۔ چند ماہ بعد وہ وفات پا گئے (اِنَّ لِلّٰہِ وَ اِنَّ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ) ان کی غم ناک وفات سے ہم بہ حیثیت قوم ایک شفیق، تجربہ کار اور والد جیسے سرپرست اور ایک قابل اور دُور اندیش سیاست دان سے محروم ہو گئے۔

87۔ عوامی بدنظمی اور ظلم و استبداد

1972ء کی ابتدا میں ملک کی مجموعی صورتِ حال مزید انتشار کا شکار ہو چکی تھی۔ قتل، لوٹ مار،

ڈاکے، منافع خوری، اور تہذیب سوزی عروج پر تھی۔ جنگ آزادی کے دوران کچھ طالب علم رہنماؤں نے اپنی ذاتی اغراض کی خاطر بنگلہ دیش کو ہندوستان کی طفیلی ریاست میں تبدیل کرنے کے ہندوستانی منصوبے کی راہ ہموار کرنے کے لیے ہندوستانی حکومت اور ''را'' سے گٹھ جوڑ کر رکھا تھا۔ یہ غداری ہماری طلبا تحریک کی روشن تاریخ کا ایک سیاہ باب ہے۔

22 دسمبر کو ڈھاکہ منتقل ہونے کے فوراً بعد حکومت نے ہر ایک کو ہتھیار حکومت کے حوالے کرنے کا حکم دیا تھا۔ لیکن طالب علم اور نوجوان رہنماؤں مثلاً شیخ فضل الحق مونی، طفیل احمد، عبدالرزاق، نور عالم صدیقی، عبدالقدوس مکھن، اور سراج العالم خان نے اس حکم پر عمل کرنے سے انکار کر دیا۔ ان سب کا تعلق عوامی لیگ سے تھا۔ 26 دسمبر کو لوگوں کی ایک بڑی تعداد نے جن میں کچھ مجرم بھی شامل تھے، مجیب باہنی میں شمولیت اختیار کر لی اور راتوں رات مجاہدین آزادی بن گئے۔ ان رضا کاروں میں البدر اور الشمس جیسی سابقہ مغضوب قوتوں کے ارکان بھی شامل تھے۔ ان تمام نوجوان طالب علم رہنماؤں نے ان کو اپنی ذاتی قوت میں اضافہ کے لیے بھرتی کر لیا۔ عوام ان کو بدنام ''16 ڈویژن'' کے نام سے جانتے تھے۔ بنگلہ دیش واپس آنے کے بعد انہوں نے شیخ خاندان کی حمایت جیتنے کے لیے ایک مرتبہ پھر تاج الدین کے خلاف معاندانہ مہم کا آغاز کر دیا۔ انہوں نے الزام لگایا کہ وہ (تاج الدین احمد) شیخ مجیب الرحمٰن کے لیے عزت و توقیر کے جذبات یا وفاداری نہیں رکھتے اور جنگ آزادی کے چمپئن بننا چاہتے ہیں۔ انہوں نے ان پر مزید الزام لگایا کہ وہ شیخ مجیب الرحمٰن کو آزادی کا اعلان کرنے والا بھی تسلیم نہیں کرتے۔ انہوں نے اپنے اس دعویٰ کو درست ثابت کرنے کے لیے کہ تاج الدین شیخ مجیب الرحمٰن کو نظر انداز کرنا چاہتے تھے، یہ مثال پیش کی کہ بجائے شیخ مجیب الرحمٰن کو وزیر اعظم قرار دینے کے وہ جلاوطن عبوری حکومت کے خود وزیر اعظم بن گئے۔ شیخ مجیب الرحمٰن کو محض رسمی مقاصد کے لیے صدر بنا دیا۔ اگر وہ مخلص ہوتے تو وہ شیخ مجیب الرحمٰن کو وزیر اعظم اور مجیب نگر حکومت کو چلانے اور جنگ آزادی کو جاری رکھنے کے لیے خود نائب وزیر اعظم بن سکتے تھے۔ اس طرح انہوں نے شیخ مجیب الرحمٰن کے کانوں میں زہر گھولا۔ ان سب کارروائیوں کے پس پشت شیخ مونی نے اہم کردار ادا کیا۔

جب شیخ مجیب الرحمٰن واپس آ گئے تو یہ ابھارنے والے افراد شیخ مونی کی سربراہی میں تاج الدین کے خلاف مہم چلانے میں اور بھی زیادہ جوش وخروش سے کام کرنے لگے۔ انہوں نے شیخ مجیب الرحمٰن کے سامنے آنسو بہاتے ہوئے ڈراما رچایا اور روتے ہوئے کہا، ''ہم آپ کی غیر موجودگی میں محض آپ کی قیادت اور تاثر کو بلند کرنے کے جرم کی وجہ سے تاج الدین احمد کی آنکھوں کے کانٹے بن چکے تھے۔ آخری 9 ماہ کے دوران ہمیں مختلف طریقوں سے سزائیں دی گئیں۔ حتیٰ کہ انہوں نے ہمیں پھانسی گھاٹ تک پہنچانے کی دھمکیاں بھی دیں۔ انہوں نے شیخ کمال کی جان کو خطرے میں ڈالتے ہوئے انہیں میدانِ جنگ میں بھجوانے کی کوششیں بھی کیں۔ ہم نے انہیں مجبور کیا کہ وہ شیخ کمال کو مجیب نگر میں کرنل عثمانی کے اے ڈی سی کے طور پر رکھیں۔

اقتدار کے بھوکے اس بدمعاش ٹولے نے شیخ مجیب الرحمٰن کو اور بھی بہت سی من گھڑت اور جھوٹی کہانیاں سنائیں اور آخرکار انہیں اپنے نقطہ نظر کا قائل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ شیخ مجیب الرحمٰن نے ان الزامات کی تصدیق کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی کیوں کہ خود ان کے اپنے خاندان نے بھی زہرآلود انداز میں تاج الدین احمد کے خلاف اپنی شکایات کا اظہار کیا تھا۔ اس کے نتیجے میں انہوں نے اپنی واپسی کے دوسرے دن ہی اپنے لمبے عرصے سے آزمائے ہوئے بااعتماد ساتھی کو وزارت عظمٰی سے ہٹا دیا اور خود وزیراعظم بن گئے۔ اگرچہ تاج الدین احمد کو کابینہ سے خارج نہیں کیا گیا تھا لیکن تمام اہم معاملات میں شیخ مجیب الرحمٰن نے تاج الدین احمد کو مکمل طور پر نظرانداز کرنا شروع کر دیا۔ اور ایک مرتبہ پھر اپنی انتظامیہ کو چلانے کے لیے نوجوان اور طالب علم رہنماؤں کے محتاج بن گئے۔ اس طرح ان رہنماؤں کو قومی معاملات میں اثرانداز ہونے کی مکمل آزادی حاصل ہو گئی۔ عوامی لیگ کے کچھ بزرگ رہنما اس قسم کی پیش رفتوں پر نالاں تھے اور ان جاہ طلب اور بددیانت نوجوانوں کے معاملات میں ان کی ناجائز چشم پوشی کو پسند نہیں کرتے تھے۔

1972ء کے وسط سے مخالف سیاسی پارٹیوں کے خلاف بےرحمانہ اور وحشیانہ سزاؤں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ مخالفت کو کچلنے کے لیے نہ صرف حکومت کے منظور شدہ مسلح گروہوں کو استعمال کیا جا رہا تھا بلکہ بااثر رہنماؤں کی ذاتی باہنیوں کو کھلی چھٹی دے دی گئی تھی۔ چیئرمین عوامی نیشنل پارٹی عبدالحمید خان بھاشانی ایسی ظالمانہ کارروائیوں کے خلاف بہت گرجے اور برسے۔ انہوں نے اور قاضی ظفر احمد نے اور چترا لیگ کے رب سراج گروپ نے عوامی لیگ کے دہشت گردوں کے خلاف لوگوں سے مزاحمت کی اپیل کی۔ انہوں نے عوامی جلسوں اور پریس کانفرنسوں میں متنبہ کیا، ''حکومت نے اپنی طاقت کو قائم کرنے اور عوام اور طلبا کی طاقت کو کچلنے کے لیے پولیس آپریشن کا آغاز کر دیا ہے۔ یہ اُنہی رہنماؤں کا ٹولہ ہے جو نو ماہ قبل پولیس اور فوج کی مدد سے حکومت کی جانب سے ڈھائے جانے والے ظلم و ستم کے خلاف واویلا مچاتا تھا۔ اور اب اقتدار میں آنے کے بعد صرف گزشتہ ماہ کے دوران انہوں نے عوام اور طلبا کے احتجاجی جلسوں پر بیسیوں مرتبہ بلااختیار گولیاں چلانے کا حکم دیا ہے۔ اس عمل کو ناکافی خیال کرتے ہوئے حکومت نے نجی باہنیوں کی جانب سے انتظامیہ پر ناجائز دباؤ ڈالتے ہوئے بہت سے مخالف رہنماؤں، جماعتی کارکنوں اور حقیقی مجاہدین آزادی کے خلاف ناجائز اور جھوٹے الزامات کے تحت مقدمات درج کروائے ہیں۔ حکمران جماعت کے سیاسی رہنما اعلیٰ سطح سے ملنے والی آشیرباد کے ذریعے مقامی انتظامیہ کی مدد سے اپنے سیاسی مخالفین کو ہر سطح پر مسلسل ہراساں کرنے میں مصروف ہیں۔''

31 اکتوبر 1972ء کو ایک نئی پارٹی تشکیل دی گئی جس کے کنوینئرز میں میجر (ریٹائرڈ) ایم اے جلیل اور اے ایس ایم رب شامل تھے۔ اس نئی پارٹی کا نام ''جاتیو سماج تنترک دل (جے ایس ڈی) تھا۔ اس کے پس منظر میں اصل نظریہ ساز سراج عالم خان تھا۔ کہا جاتا تھا کہ جدوجہد آزادی کے دور میں اس نے ایک پرانے ہندوستانی سیاست دان جے پرکاش نارائن سے قریبی تعلقات استوار کر لیے تھے۔ بنگلہ دیشی اسے

ایک ظالم اور بدنام ''ہندوتنترک'' کا پالک کے نام سے بھی جانتے تھے جو ایک مشہور بنگالی ناول کا کردار ہے۔ اس نئی سیاسی پارٹی کی تشکیل سے چند روز قبل اس کی ادارت میں ایک اخبار ''گانوکنتھا'' نے اپنی اشاعت کا آغاز کیا تھا۔ اگرچہ یہ اخبار شیخ مجیب الرحمٰن کی آشیر باد سے شروع کیا گیا تھا، اس نے ابتدا سے ہی سائنٹیفک سوشلزم کی تبلیغ شروع کردی تھی۔ بعد میں ''گانوکنتھا'' جاتیو سماج تنترک دَل کا پارٹی اخبار بن گیا، جس نے شیخ مجیب کو بہت برہم کردیا۔ 21 جولائی 1972ء کو مجیب نے چترا لیگ کے، جو مجیب کی ہی حامی تھی، افتتاحی اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے مجیب مخالف رب گروپ اور گانوکنتھا پر شدید تنقید کی اور کہا: ''70 من بڑا گوشت اور 70 من چھوٹا گوشت، رقم کہاں سے آئی ہے۔ اپنی 30 سالہ سیاسی زندگی میں ایک بھی اخبار نہیں نکال سکا اور ایک انچ کا اشتہار بھی کہیں سے حاصل نہیں کرسکا۔ کیا ہم اس بات کو سمجھتے نہیں؟'' ستم ظریفی یہ تھی کہ ''گانوکنتھا'' کوئی اشتہار حاصل نہ کرسکا کیوں کہ اس کی پالیسی سائنٹفک سوشلزم کا پرچار تھی۔ رب اور سراج عالم خان 1969ء کی تحریک میں مقبول طالب علم رہنما بن گئے تھے، میجر جلیل مشہور جنگ آزادی کے کمانڈر تھے جو اپنی مسلمہ حب الوطنی کی وجہ سے جانے جاتے تھے۔ وہ ایک نڈر اور نہ جھکنے والے انسان تھے۔

پاکستانی فوج کے ہتھیار ڈالنے کے بعد ہندوستانی فوج نے تمام اسلحہ جات، عسکری ساز وسامان، گولہ بارود، حتیٰ کہ ملوں اور فیکٹریوں سے مشینری بھی مال غنیمت کے طور پر سمیٹنا شروع کردی۔ میجر جلیل ان محب وطن مجاہدین آزادی میں سے تھے جنہوں نے اپنے زیر کمانڈ علاقے میں ہندوستانی فوج کی اس قسم کی غیر قانونی اور غیر اخلاقی سرگرمیوں کی مزاحمت کی تھی۔ ان کے اس قدم نے مختلف سیکٹروں کے مجاہدین آزادی میں بھی دوست افواج کی اس لوٹ مار اور غارت گری کے خلاف مزاحمت کی ایک تحریک جنم دینے میں مدد کی۔ فروری 1972ء میں انہیں اسی قسم کی سرگرمیوں کی بنا پر گرفتار کرلیا گیا۔ ان کی گرفتاری کے خلاف پوری قوم سراپا احتجاج بن گئی۔ 11 مارچ کو باریسال میں عوام اور مجاہدین آزادی نے ایک بہت بڑا احتجاجی جلوس نکالا جس میں ان کی فوری رہائی کا مطالبہ کیا گیا۔ فوج کی جانب سے بھی ان کی فوری اور غیر مشروط رہائی کے لیے وزیر اعظم کو ایک شدید احتجاجی مراسلہ بھیجا گیا۔ اس کے جواب میں حکومت نے ایک بیان جاری کیا: ''ان کے خلاف سنجیدہ الزامات ہیں۔ ان پر فوجی قوانین کے تحت مقدمہ چلایا جائے گا۔ اس بیان پر احتجاج مزید شدت اختیار کرگیا۔ فوج مجاہدین آزادی اور عوام سب مشتعل ہوگئے۔ شدید دباؤ کے نتیجے میں آخر کار حکومت کو پسپائی اختیار کرنا پڑی اور وہ میجر جلیل کو رہا کرنے پر مجبور ہوگئی۔

سیاسی محاذ پر بھی باہنیوں کی معاندانہ کارروائیاں پورے ملک میں شدت اختیار کرگئیں۔ 9 ستمبر 1972ء کو سنگا سیوک باہنی کے چیف عبدالرزاق نے اعلان کیا، ''عوامی سنگا سیوک باہنی مجیب واد کے پرچار کے لیے ہر ممکن ذرائع اختیار کرے گی۔ ریجنل، ڈسٹرکٹ اور سب ڈویژنل سطح کے لیڈروں کے اجلاس میں باہمی رابطوں اور تربیت کے لیے اہم فیصلے کیے جائیں گے۔ ہر یونین میں ممبران کو بانس کی لاٹھیوں کی مدد سے عسکری تربیت دی جائے گی۔'' اس اجلاس کے بعد جیسا کہ کہا گیا تھا تربیت کا کام شروع کردیا گیا۔ عوامی

سرامک لیگ کے لیڈر عبدالمنان نے ایک لاکھ پر مشتمل اپنی مضبوط لال باہنی منظم کی۔ یکم مئی 1972ء کو لال باہنی کے لیڈروں نے اپنے پیروکاروں کے متشدد اجلاس میں اعلان کیا: ''وہ سماج دشمن عناصر کے خلاف 9 جون سے کارروائی کا آغاز کریں گے۔'' اپنی کارروائیوں کی کامیابی کے لیے انہوں نے حکومت سے لوگوں کو گرفتار کرنے، تلاشی لینے، پوچھ گچھ کرنے اور سزائیں دینے کی اجازت دینے کا مطالبہ کیا۔ اس طرح وہ قانون کو اپنے ہاتھوں میں لینا چاہتے تھے۔ ایک عوامی جلسے میں وزیراعظم شیخ مجیب الرحمٰن نے اپنے ناقدین کو نخوت کے انداز میں متنبہ کرتے ہوئے کہا: ''میں ملک دشمن شرپسندوں کو متنبہ کرتا ہوں کہ اگر ضروری ہوا تو میں اپنا ''لال گھوڑا'' کھول دوں گا۔'' یہ نجی باہنیوں کی جانب اشارہ تھا۔

اس کے سات دن بعد کارروائی کا آغاز کر دیا گیا۔ کھلنا میں لال باہنی کے ارکان اور پولیس کے درمیان ایک جھڑپ ہوئی۔ ملک کے دوسرے حصوں سے بھی اس قسم کی جھڑپوں کی اطلاعات موصول ہونے لگیں۔ امن وامان کی صورتِ حال تیزی سے بگڑنے لگی۔ ان طاقت وَر عناصر نے بغیر کسی رُو رعایت کے معصوم عوام پر اپنا ظلم واستبداد جاری رکھا۔ صورتِ حال اس قدر تشویش ناک ہوگئی کہ مظفر نیپ نے بھی جو کہ عوامی لیگ کی بی ٹیم خیال کی جاتی تھی ان ظالمانہ کارروائیوں کے خلاف احتجاج کیا۔ 20 جولائی کو مظفر احمد نے اخبارات کو ایک بیان جاری کیا جس میں پارٹی کی باہنیوں کی اس قسم کی غیر قانونی سرگرمیوں کو فوری طور پر روکنے کا مطالبہ کیا گیا۔ انہوں نے کہا: ''بنگا سیوک اور ایک مخصوص سیاسی پارٹی کی دوسری باہنیاں غیر قانونی اور سفاکانہ سرگرمیوں میں مصروف ہیں۔ حکمران جماعت سے وابستہ باہنیاں اور اس کی طلبا اور مزدور تنظیمیں اپنی سرگرمیاں اپنی تنظیمی حدود میں نہیں رکھ رہیں۔ وہ مقامی انتظامیہ کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے طور پر مختلف علاقوں میں کرفیو نافذ کرتی ہیں۔ تلاشیاں لیتی ہیں اور لوگوں کو گرفتار کر کے اپنی بنائی ہوئی عدالتوں میں ان پر مقدمات چلاتی ہیں۔ اس طرح سے انصاف کا تمسخر اڑاتے ہوئے لوگوں کو تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا ہے، ہراساں کیا جا رہا ہے اور سزائیں دی جا رہی ہیں۔ حکومت، انتظامیہ اور پولیس ایسی سرگرمیوں پر پراسرار خاموشی کا مظاہرہ کر رہی ہے۔ انہوں نے اس قسم کی ناقابل برداشت سرگرمیوں کے خلاف متحدہ عوامی مزاحمت پیدا کرنے کی اپیل کی۔

88- پہلا آئین

ادھر مجیب باد قائم کرنے کی کوشش جاری تھیں اُدھر عوامی لیگ حکومت نے آئین کا ایک مسوّدہ تیار کیا۔ اس وقت قومی روزنامے خفیہ قتل وغارت لوٹ کھسوٹ، ڈاکوں، اغوا، گروہی تشدد کی خبروں سے تقریباً بھرے ہوئے ہوتے تھے۔ حکومتی اعداد وشمار کے مطابق، جنوری 1972ء سے جون 1973ء کے درمیان 2035 خفیہ اموات، 4925 قتل، 337 اغوا کی وارداتیں، 190 عصمت دری کے واقعات، 4907 ڈکیتیاں ہوئیں۔ 1973ء کے پانچ ماہ کے دوران نامعلوم افراد نے ساٹھ پولیس سٹیشن لوٹے اور وہاں سے اسلحہ اور گولہ بارود اٹھا

کر لے گئے۔لوگوں کا عام طور پر یہ خیال تھا کہ جنگ آزادی کی لہروں میں تمام قسم کی تنگ نظری بہ کر صاف ہو گئی ہے۔ ہر ایک یہ توقع رکھے ہوئے تھا کہ اب قوم مضبوط بنیادوں پر استوار ہوگی۔لیکن آزادی کے بعد ایک ماہ کے اندر ہی یہ بات واضح ہوگئی تھی کہ بہتری کی خواہش، جنگ کے مصائب اور خون اور پسینے کی اعلیٰ ترین قربانیوں کے باوجود بھی حکمران اشرافیہ کے روایتی کردار میں ذرّہ برابر تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ سیاست اور سماجی کردار میں کٹھورپن اور گھٹیا خودغرضی قطعی عناصر کے طور پر سامنے آچکے تھے اور آئندہ بھی کسی تبدیلی کی کوئی امید نظر نہیں آرہی تھی۔

آزادی کے محض دو سالوں کے اندر اندر جب ڈھاکہ کی گلیاں لاشوں سے اٹی پڑی تھیں، غریب بھوک کے ہاتھوں دم توڑ رہے تھے اور لوگ پھٹی آنکھوں کے ساتھ نو دولتیوں کے طمطراق اور شان وشوکت کے مظاہرے دیکھ رہے تھے۔غیر ملکی ٹیلی ویژن مردہ لاشوں کے ڈھیروں اور زندہ ڈھانچوں کے ساتھ پرتعیش اور مسرفانہ شادیوں کی تقریبات دکھا رہے تھے۔

ان اَن گنت اموات کی ذمہ دار انسانی کٹھورپن اور درندگی تھی۔ انفرادی، گروہی اور پارٹی مفادات پر مبنی شہری فسادات اور جھگڑے کھڑے کر دیئے گئے تھے اور وہ لوگ جو کبھی ایک دوسرے کے ساتھی اور ہم جولی تھے اب ایک دوسرے سے دست وگریبان تھے۔ یہ ایک انتہائی افسوس ناک صورتِ حال تھی۔اس کٹھورپن اور ظلم واستبداد کی جڑیں دولت سمیٹنے کی خواہش اور اقتدار اور جاہ وحشمت کی ہوس میں پیوست تھیں۔ سیاسی رہنما اور کارکن یکساں طور پر اس حقیقت کو سمجھنے میں ناکام ہو چکے تھے کہ کسی بھی تنظیم کے قیام کی اصل روح محنت کش طبقے کے مصائب کو بانٹنے میں پوشیدہ ہے نہ کہ خوب صورت اور دلکش نعروں میں۔وہ اس مشہور قول پر عمل کرنے میں بری طرح ناکام ہو چکے تھے کہ اصل جمہوری حکومت وہ ہے جو لوگوں کی، لوگوں کے ذریعے اور لوگوں کے لیے ہو۔ یہی وجہ تھی کہ جدوجہد اور قربانیوں کی ایک تاب ناک تاریخ کے باوجود لوگ ابھی تک اپنی حقیقی منزل کو حاصل نہیں کر سکے تھے اور ان کی تمام قربانیاں قیادت کی غداری کی وجہ سے بند گلی میں کھو گئی تھیں۔

10 اپریل 1972ء کو قومی اسمبلی کا پہلا اجلاس منعقد ہوا۔ستم ظریفی دیکھئے کہ یہ اسمبلی اُن ممبران پارلیمنٹ پر مشتمل تھی جو آئین پاکستان اور جنرل یحییٰ خان کے ایل ایف او کے تحت 1970ء کے انتخابات میں ممبران صوبائی اسمبلی منتخب ہوئے تھے۔

12 اکتوبر 1972ء کو اس وقت کے قانون اور پارلیمانی امور کے وزیر کمال حسین کا پیش کردہ آئین کا مسودہ پارلیمنٹ نے پاس کر دیا۔اگرچہ اس میں مجیب واد کا براہ راست کوئی ذکر نہیں تھا لیکن آئین مجیب واد کی بنیادوں پر تیار کیا گیا تھا جو عبوری حکومت کو اندرا گاندھی کی دی گئی ہدایات کے مطابق تھا اور بعد میں شیخ مجیب الرحمٰن نے عوامی منظوری کے بغیر ہی اسے آئین سے منسلک کر دیا۔ آئین کے دیباچے میں کہا گیا تھا: ''ہم یہاں عہد کرتے ہیں کہ قوم پرستی، جمہوریت، سوشلزم اور سیکولرازم کے وہ تمام عظیم اصول جنھوں نے ہمارے

بہادر عوام کو جنگ آزادی میں شمولیت اور عظیم قربانیاں پیش کرنے کی تحریک دی، ہمارے آئین کے ستون ہوں گے۔ ہم مزید اعلان کرتے ہیں کہ ہماری ریاست کا بنیادی ہدف سوشلزم کے ذریعے جمہوری طریقے سے استحصال سے پاک معاشرے کا قیام ہوگا جہاں قانون کی حکمرانی اور ہر شہری کے بنیادی حقوق کے تحفظ کو یقینی بنایا جائے گا۔'' لیکن آئین کی مختلف دفعات میں ان تمام اصولوں کی خود تردیدی بڑی واضح نظر آتی تھی۔

آیئے آئین کی کچھ متضاد دفعات کا جائزہ لیتے ہیں۔ آئین کی دفعہ 10 کہتی ہے، ''انسان کے ہاتھوں انسان کے استحصال کے خاتمے اور انصاف اور مساوات پر قائم معاشرے کے لیے سوشلسٹ معیشت قائم کی جائے گی۔ لیکن آئین میں کہیں بھی یہ ذکر نہیں کیا گیا کہ نجی ملکیت رکھنے پر پابندی ہوگی جو کہ سوشلزم کے بالکل متضاد بات ہے۔ اسی طرح آئین کی دفعہ 13 میں کہا گیا ہے کہ تمام پیداوار اور پیداواری نظام عوام کی ملکیت ہوگا اور اس حوالے سے ملکیت درج ذیل طور پر ہوگی:

(الف) ریاستی ملکیت: اس کا مطلب قومی معیشت کے اہم سیکٹروں پر مشتمل ایک مضبوط قومی اور ملکی سیکٹر کا قیام ہے۔

(ب) کوآپریشن ملکیت: مجوزہ حدود کے اندر رہتے ہوئے منظور شدہ کوآپریشنوں کی ملکیت کو قانونی تحفظ فراہم کیا جائے گا۔

(ج) نجی ملکیت: مجوزہ حدود کے اندر رہتے ہوئے نجی ملکیت کو قانونی تحفظ حاصل ہوگا۔

دفعہ 42 میں مزید وضاحت کی گئی تھی کہ موجودہ قوانین، ضابطوں اور ریگولیشنز کے تحت لوگوں کو اپنی جائیدادیں، حاصل کرنے، رکھنے اور منتقل کرنے کا حق حاصل ہوگا۔ قانون کے خلاف کوئی بھی جائیداد قبضے میں یا قومی ملکیت میں نہیں لی جائے گی۔

3 ستمبر 1972ء کو ایک مشہور مارکسسٹ دانشور بدرالدین عمر نے عوامی طرز کے اس سوشلزم کے بارے میں ہفت روزہ ''سادھیکا'' میں لکھا: موجودہ حکومت کی قومیانے کی پالیسی سوشلزم کے قیام کی حقیقی روح سے مطابقت نہیں رکھتی۔ محض صنعتوں، بینکوں اور انشورنس کمپنیوں کو قومی تحویل میں لینے کا مطلب سوشلزم نہیں ہوتا۔ جب تک طبقاتی استحصال کا خاتمہ کرتے ہوئے ریاست کو محنت کش طبقے کی قیادت کے تحت نہیں لایا جاتا، سوشلزم کے بارے میں بات کرنا فصیح و بلیغ لفاظی اور کھوکھلے وعدوں کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ شہری متوسط طبقے پر مشتمل سیاسی پارٹی ''عوامی لیگ'' کی قیادت میں قومیانے کی پالیسی ہرگز سوشلزم کی جانب قدم نہیں ہے۔ حقیقت میں یہ محنت کش طبقے کو اپنی قیادت کے تحت ریاست کے قیام کی جدوجہد سے دُور رکھنے کے لیے ایک قدم ہے، جو سوشلزم کی جانب تبدیلی کے دَور میں ایک ضروری شرط ہے۔ موجودہ وقت میں عوامی طرز کے سوشلزم کی پالیسی کے نام پر معیشت میں جو پراگندگی پیدا کی گئی ہے، وہ کوئی زیادہ حیران کن بات نہیں بلکہ ایک فطری عمل ہے کیوں کہ جو ریاست صنعتوں، کاروباروں، بینکوں اور دوسرے تجارتی اداروں کو قومیا رہی ہے وہ محنت کش طبقے کی قیادت میں نہیں ہے۔ یہ شہری متوسط طبقے اور جاگیرداری کی باقیات پر مشتمل قیادت ہے، جو

اس وقت ریاست پر مسلط ہے۔ اس لیے ان کی دیگر پالیسیوں کی طرح قومیانے کی یہ پالیسی بھی صرف ان کے طبقے کے مفادات کا تحفظ کر رہی ہے۔ اُن کے اپنی قسم کے اس سوشلزم اور قومیانے کی پالیسی سے عام آدمی کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ رہا بلکہ لوگوں کے مفادات کے خلاف حکمران جماعت اور اس کے حواری قومیانے کی پالیسی کے تحت قومیائے گئے اداروں کی لوٹ مار سے صرف خود اپنے لیے دولت سمیٹ رہے ہیں۔

ان کے وضع کردہ سوشلسٹ اصولوں کے مطابق زمین کے بارے میں اُن کی پالیسی بھی مکمل طور پر ناکام ہو چکی ہے۔ ہمارے زرعی مسائل کے موجودہ سیاق وسباق میں 25 بیگھے زمین پر ٹیکس کی چھوٹ سے ہمارے کسانوں کی اکثریت فیض یاب نہیں ہو سکتی جو یا تو بے زمین ہیں یا پھر بہت کم پیداوار دینے والی زمینوں کے مالک ہیں۔ انہیں فائدہ صرف اس صورت میں ہو سکتا ہے اگر حکومت کی زمینیں بے زمین کسانوں میں بانٹ دی جائیں۔ لیکن فی خاندان 100 بیگھے زمین رکھنے کے حکومتی فیصلے کے پیش نظر حکومت کے لیے کسی قسم کی زمین کا حصول مشکل ہو گیا ہے۔ اس پالیسی کے نتیجے میں بااثر لوگ مجوزہ حد سے بہت زیادہ زمین اپنے قبضے میں رکھنے کے راستے نکال سکتے ہیں اور اس کے ساتھ بٹائی کے نظام کے تحت وہ اپنا جاگیردارانہ استحصال قائم رکھنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ سود خوروں کا استحصال بھی جاری رہے گا۔ اس طرح بٹائی اور سود خوری کے ذریعہ طبقاتی دشمن بنگلہ دیش کے غریب کسانوں کی ایک بڑی اکثریت پر اپنی برتری قائم رکھیں گے اور روایتی طریقوں سے اپنے معاشی اور سیاسی استحصال کو قائم رکھنے میں کامیاب رہیں گے جس کے نتیجے میں پیداوار بدستور کم رہے گی۔ ان حالات میں ایک طرف غذائی ضروریات میں خود کفالت حاصل کرنا ممکن نہیں ہوگا اور دوسری جانب صنعتی فروغ کے لیے بیرونی امداد پر انحصار کو کم کرنے کے لیے ضرورت سے زائد پیداوار حاصل کرنا ممکن نہیں ہو سکے گا۔ جب زمین کی پالیسی پر حکومت کا دیوالیہ پن کھل کر سامنے آ گیا تو تمام مخالف سیاسی پارٹیاں بشمول عوامی لیگ کی حامی پارٹیوں مثلاً بنگلہ دیش کیمونسٹ پارٹی (مونی سنگھ) اور نیپ (مظفر) بھی حکومت پر تنقید کرنے پر مجبور ہو گئیں۔ بنیادی حقوق کے حوالے سے آئین کی مندرجہ ذیل تین دفعات 35، 37 اور 39 سے ظاہر ہوتا ہے کہ عوامی لیگ نے کس طرح مکاری کے ساتھ لوگوں کے حقوق غصب کیے۔

35-(1) جو شخص جرم کرتے ہوئے ملکی قوانین کی خلاف ورزی کرے گا اس کو صرف اس مخصوص قانون کے تحت سزا دی جا سکتی ہے، کوئی دوسرا قانون لاگو نہیں ہوگا۔

2۔ ایک جرم میں کسی شخص پر ایک سے زائد مرتبہ فردِ جرم عائد نہیں کی جا سکتی۔

3۔ فوجداری جرم کے ملزم کو حق حاصل ہوگا کہ فوری فیصلے کے لیے اس پر آزاد اور کھلی عدالت میں مقدمہ چلایا جائے۔ تاہم پارلیمنٹ کو حق حاصل ہوگا کہ کسی خاص معاملے میں عوامی تحفظ یا اخلاقی وجوہات کی بنا پر یا کسی دوسری معقول وجہ پر بند کمرے میں مقدمے کی سماعت کا قانون پاس کر سکے۔

4۔ کسی بھی ملزم پر اعترافی بیان کے لیے دباؤ اور دھونس کا استعمال نہیں کیا جائے گا۔

5۔ کسی بھی ملزم کو ذہنی یا جسمانی تشدد کا نشانہ نہیں بنایا جا سکتا اور اسے ظالمانہ اور غیر انسانی کارروائیوں کے ذریعے ڈرایا، دھمکایا نہیں جا سکتا۔

6۔ عوامی تحفظ کے ایکٹ کے تحت ہر شہری کو آزادانہ گھومنے پھرنے، بنگلہ دیش میں کہیں بھی قیام کرنے یا رہنے کی آزادی ہوگی اور ملک کے اندر اور باہر اپنی مرضی سے سفر کر سکے گا۔

37۔ ہر شہری کو عوامی جلسوں، تعزیتی اجتماعات میں پرامن طور پر عوامی تحفظ، امن و امان اور عوامی صحت کے لیے وضع کردہ قوانین کے تحت شمولیت کا حق ہوگا۔

آئین میں موجود ان تمام دفعات کے باوجود لوگوں کے حقوق محض کاغذات تک محدود رہے۔ دفعہ 35 میں اگرچہ اس بات کا ذکر کیا گیا ہے کہ لوگوں کو کھلی اور غیر جانبدارانہ سماعت کا حق حاصل ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی ذکر کیا گیا تھا کہ عوامی تحفظ اور اخلاقی بنیادوں پر یا دوسری معقول وجوہات کی بنا پر پارلیمنٹ کو حق حاصل ہوگا کہ وہ کسی مخصوص مقدمے میں بند کمرے کی سماعت کا بل پاس کر سکے۔ لیکن کیا یہ معقول وجوہات جائز ہیں یا نہیں یہ پرکھنے کی ذمہ داری کسی کو نہیں سونپی گئی تھی جس کے نتیجے میں یہ اختیار حکومت کے پاس رہا۔ اس طرح بڑی عیاری کے ساتھ ''معقول وجوہات'' کے الفاظ شامل کر کے لوگوں کے بنیادی حقوق غصب کر لیے گئے تھے۔

اظہارِ خیال اور آزادیِ تقریر کے حق کے حوالے سے دفعہ 39 میں بیان کیا گیا ہے:

(39)1۔ سوچ اور ضمیر کی آزادی کی ضمانت دی جاتی ہے۔

2۔ قومی سکیورٹی، بیرونی ممالک سے دوستانہ تعلقات، عوامی نظم وضبط، شائستگی، اخلاقیات اور سالمیت سے متعلق قوانین اور ضابطوں کے علاوہ:

(الف) ہر شہری کو اظہارِ خیال اور تقریر کی آزادی حاصل ہوگی۔

(ب) اخبارات اور نیوز میڈیا کی آزادی بھی دی جاتی ہے۔

اس دفعہ کے تحت کوئی بھی اخبار یا نیوز میڈیا کسی دوست ملک کے بارے میں کچھ بھی شائع یا کوئی پراپیگنڈا نہیں کر سکتا۔ دوسرے الفاظ میں کسی بھی ایسے ملک کے بارے میں جسے حکومت دوست تصور کرتی ہو، کوئی بات کہی یا شائع نہیں کی جا سکتی۔

دفعہ (3)63 میں کہا گیا تھا: ''قوم اور عوام کے تحفظ کے لیے کسی جارحیت، جنگ یا مسلح بغاوت کی صورت میں اگر پارلیمنٹ کوئی قانون پاس کرتی ہے تو یہ قانون آئین کے تحت کسی بھی عدالت میں چیلنج نہیں کیا جا سکے گا۔'' جارحیت اور جنگ کے ساتھ بڑی مہارت سے ''مسلح بغاوت'' کے الفاظ کو شامل کر دیا گیا اور اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے عوامی لیگ نے ان دفعات کو اپنی مخالفت کو کچلنے کے لیے بے رحمانہ طور پر استعمال کیا۔ انہوں نے ایوب حکومت کی طرح ''عوامی تحفظ'' کا واویلا مچایا اور ناجائز طور پر بہت سے بنگلہ دیشیوں کی شہریت کو غصب کر لیا۔ پاکستان کی آمرانہ حکومت کی طرح عوامی لیگ حکومت نے بھی آئین میں دفعہ (3)63

کو شامل کرتے ہوئے اپنے مخالفین کو غیر انسانی سزاؤں کا نشانہ بنانے کے لیے ایک راستہ کھلا رکھا۔

بھاشانی نیپ کے اس وقت کے وائس چیئرمین ڈاکٹر علیم الرازی نے آئین کی غیر جمہوری دفعات کو دیکھتے ہوئے کہا: ''جلد بازی میں آئین کی تشکیل کوئی بڑا کام نہیں ہے۔ اگر نیپ اقتدار میں آ گئی تو پھر آئین کو ردی کے موسمی گالے کی طرح اڑا دیا جائے گا۔''

8 اکتوبر 1972ء کو کریشک سرامک سماج وادی دَل نے ایک بیان دیا: ''یہ آئین محض چھوڑی ہوئی تو میائی گئی جائیدادوں پر قبضے کے لیے ''سوشلسٹ آئین'' ہے۔''

ہڑتالوں پر پابندی اور لوگوں کو بغیر مقدمے کے حراست میں رکھنے کے ضابطوں کو جوں کا توں رہنے دیا گیا۔ حتیٰ کہ مظفر نیپ نے، جو کہ عوامی لیگ کی ''بی ٹیم'' کے طور پر جانی جاتی تھی، بھی عوام کے جذبات کا احساس کرتے ہوئے آئین کی بعض دفعات کو عوام دشمن اور غیر جمہوری قرار دے دیا۔ کمیونسٹ پارٹی (لینن وادی) کے امول سین نے بھی کہا: ''یہ آئین کسی طور پر بھی سوشلسٹ آئین نہیں ہے بلکہ یہ ان بنیادی جمہوری حقوق سے بھی خالی ہے جو عام طور پر بورژوا جمہوری آئین میں دیئے گئے ہوتے ہیں۔'' مظفر نیپ نے آئین پر ریفرنڈم کروانے کا مطالبہ کر دیا۔ جاتیو سماج تنترک دَل کے رہنما اے ایس ایم رب نے کہا: ''آئین میں عوام کی امنگوں کا کہیں بھی کوئی عکس نظر نہیں آتا۔'' عوامی لیگ کے دو نیشنل اسمبلی کے ممبران نے آئین پر اعتراضات اٹھائے۔ انہوں نے نجی ملکیت سے متعلق دفعات پر اعتراض کیا تھا۔ عوامی لیگ کے پارلیمانی ممبران بھی دفعہ 70 پر تقسیم ہو گئے۔ پارلیمنٹ کے چار ممبران نے احتجاج کرتے ہوئے کہا، ''یہ دفعہ تمام جمہوری اقدار کے خلاف ہے۔ اس نے رائے دہندگان اور ان کے ووٹوں کو بے توقیر کر دیا ہے۔ یہ جمہوری حقوق غصب کرنے کے مترادف ہے۔'' دفعہ 70 میں کہا گیا ہے: ''اگر کوئی ممبر پارٹی ٹکٹ پر منتخب ہوتا ہے اور بعد میں پارٹی سے نکال دیا جاتا ہے یا استعفیٰ دے دیتا ہے تو پارلیمنٹ میں اس کی رکنیت بھی ختم ہو جائے گی۔''

مولانا بھاشانی نے عوامی لیگ کے آئین مرتب کرنے کے اختیار کو چیلنج کیا اور کہا، ''موجودہ پارلیمنٹ ایل ایف او اور 1970ء کے انتخابات کے تحت منتخب ہونے والے نمائندگان پر مشتمل ہے۔ صدر یحییٰ خان کے ایل ایف او کے تحت منتخب ہونے والی پارلیمنٹ پاکستان کا آئین تشکیل دینے کی ذمہ دار تھی۔ عوامی لیگ نے ایک سیاسی جماعت کے طور پر چھے نکاتی پروگرام کی بنیاد پر ووٹ حاصل کیے تھے۔ چھے نکاتی پروگرام کا مطالبہ پاکستان کے اتحاد کو قائم رکھتے ہوئے صوبائی خودمختاری کا تھا۔ لہٰذا انہیں آزاد بنگلہ دیش کا آئین بنانے کا کوئی قانونی حق حاصل نہیں ہے۔'' انہوں نے آئین تشکیل دینے کے لیے تمام پارٹیوں کے قومی کنونشن کا مطالبہ کیا۔ ''قومی کنونشن صرف سیاسی پارٹیوں پر مشتمل نہیں ہونا چاہیے۔ ان تمام گروپوں کے نمائندے بھی شامل کیے جانے چاہیں جنہوں نے جنگ آزادی میں حصہ لیا ہے۔ اس طرح کے قومی کنونشن کے تیار کردہ آئین کی ریفرنڈم کے ذریعے توثیق کروائی جائے۔'' اگر ایسا نہیں کیا جاتا تو پھر وہ اور ان کی پارٹی ایسے ''یک حزبی آئین'' کو تسلیم نہیں کرے گی۔

عبدالبشر ''بنگلہ کمیونسٹ پارٹی'' کے جنرل سیکریٹری نے مولانا بھاشانی کے مطالبے کی حمایت کی۔ انہوں نے مزید کہا: ''عوامی لیگ کا پیش کردہ آئین جمہوری ہے اور نہ ہی سوشلسٹ ہے۔ یہ لوگوں کی بنیادی ضروریات یعنی خوراک، لباس، رہائش، تعلیم اور طبی دیکھ بھال کی ضمانت نہیں دیتا۔'' ان کی پارٹی کے مطابق یہ آئین اس قدر بھی جمہوری اور انسانی حقوق عطا نہیں کرتا جتنا کہ صدر ایوب خان کے آئین میں دیئے گئے تھے۔ بھاشانی نیپ، بنگلار چترا یونین، بپلوبی چترا یونین، جاتیو سماج تنترک دَل، سرامک کریشک سماج وادی دَل اور دوسری ترقی پسند اور قومی قوتوں اور گروہوں نے اس عوام دشمن آئین کے خلاف متحدہ تحریک منظم کرنے کی اپیل کی۔ عوامی لیگ کے رہنما منصور علی نے مخالفین کی تنقید کے جواب میں کہا، ''آئین میں جمہوریت اور سوشلزم کا مجموعہ پیش کیا گیا ہے۔'' 1972ء کے آئین میں کہا گیا تھا کہ حکومت جمہوری طور پر چلائی جائے گی۔ تاہم 4 نومبر 1972ء کو پارلیمنٹ کے اجلاس میں آئین کو رسمی طور پر دو گھنٹے سے بھی کم وقت میں پاس کر دیا گیا۔

مندرجہ بالا تبصرے قارئین کو ریاست کے ان چار بنیادی اصولوں کے درمیان پائے جانے والے خودتردیدی اور مخاصم خلقی تضادات سے آگاہ کرنے کے لیے دیئے گئے ہیں جو کہ مجیب واد کے بھی اصول تھے اور جن کو عوامی لیگ نے بنگلہ دیش پر حکومت کرنے اور اس کو ''سنار بنگلہ'' میں تبدیل کرنے کے لیے رہنما اصولوں کے طور پر اپنایا تھا۔ ایک سیاسی فلسفے کے طور پر مجیب واد کے کھوکھلے پن کو بہتر طور پر سمجھنے کے لیے اس مسئلے کا تفصیلی تجزیہ پیش کیا جا سکتا ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ سیاسی دانشور اور آئینی ماہرین وقت کے ساتھ ساتھ اپنی اس ذمہ داری کو بھی نبھائیں گے۔ کسی بھی ملک پر کچھ اصولوں اور رہنما عوامل یا نظریے کی بنیاد پر حکومت کی جاتی ہے۔ لہٰذا اس بات کو سمجھنا انتہائی ضروری ہے کہ ان اصولوں کو کیوں اپنایا گیا اور عوام نے ان کی مخالفت کیوں کی؟ اور ان اصولوں پر اس وقت کی حکومت کے اصرار کی وجہ سے قوم کو کتنا نقصان اٹھانا پڑا اور اس حقیقت سے ان کا کس حد تک تعلق ہے کہ دو عشرے گزر جانے کے بعد بھی ہم من حیث القوم اپنی معاشرتی زندگی کے ہر میدان میں مطلوبہ نتائج حاصل کرنے میں ابھی تک ناکام رہے ہیں۔ حال ماضی پر استوار ہوتا ہے اور اسی طرح مستقبل کا انحصار حال پر ہوتا ہے۔

اگر آپ 1972ء کا کوئی بھی اخبار اٹھا لیں تو اس میں قتل، ڈکیتی، اغوا، اشیائے ضرورت کی قیمتوں میں ہوش رُبا اضافے کے علاوہ کوئی خبر نظر نہیں آئے گی۔ ہر روز شہروں میں دن دیہاڑے قتل، اغوا اور ڈکیتیوں کی وارداتیں سرعام ہو رہی تھیں۔ بنگلہ دیش کے دیہاتی علاقوں میں مکمل طور پر دہشت کا راج تھا۔ عام آدمی اس حبس زدہ ماحول میں رہنے پر مجبور تھا۔ جب لوگوں کو بمشکل تن ڈھانپنے کے لیے کپڑے میسر تھے، سوتی دھاگہ ملک سے باہر سمگل کیا جا رہا تھا۔ جب لوگ فاقوں سے مر رہے تھے، لاکھوں ٹن غذائی اجناس جو [illegible] سے امداد کے طور پر آتی تھیں ملک سے باہر سمگل کر دی جاتی تھیں۔ اس وقت بھی یہ مولانا بھاشانی ہی تھے جنہوں نے اس بے روک ٹوک سمگلنگ کے خلاف آواز بلند کی۔ انہوں نے معاشرتی سامراجیت اور ہندوستانی وسعت پسندی کے خلاف بھی آواز اٹھائی۔

اس کے ردِعمل میں عوامی لیگ حکومت نے انہیں عوامی جمہوریہ چین اور پاکستان کا ایجنٹ اور امریکہ کا مسخرہ قرار دیا۔ لیکن تاریخ میں یہ حقیقت محفوظ ہے کہ 1969-1968ء کی وہ بے نظیر تحریک جس نے آئس برگ کو توڑا تھا، اس کی قیادت سوائے مولانا عبدالحمید خان بھاشانی کے کسی کو سنبھالنے کی جرأت نہ ہوئی تھی۔ یہ ان ہی کی تاریخی اپیل تھی جس کے نتیجے میں طالب علموں نے اپنا گیارہ نکاتی پروگرام پیش کیا تھا اور یہ مولانا بھاشانی کی واحد ذات تھی جس نے ایک عوامی تحریک کی رہنمائی کرتے ہوئے اسے عوام کے بحرِ تلاطم خیز میں تبدیل کر دیا جس کے نتیجے میں شیخ مجیب الرحمٰن کو حراست سے رہائی نصیب ہوئی۔ بنگلہ دیش کا یہ شیر گرجا تھا، ''اگر ضروری ہوا تو فرانسیسی انقلاب کی طرح ہم جیل توڑ کر شیخ مجیب کو باہر نکال لیں گے۔'' لیکن بد قسمتی سے حکمران جماعت اس آزاد اور تجربہ کار بزرگ رہنما کو فرقہ وارانہ جذبات ابھارنے والا قرار دینے سے بھی نہ ہچکچائی۔

عوامی لیگ کے نوجوان رہنماؤں کے ساتھ ساتھ بزرگ رہنما بھی کردار کشی کی اس مہم میں برابر کے شریک تھے۔ مارچ کے مہینے سے لوگ مختلف جگہوں پر بھوک سے مر رہے تھے۔ بوگرا، رنگ پور، دیناج پور اور ٹنگائیل قحط کے دہانے پر کھڑے تھے۔ مختلف مقامات پر لوگوں نے غذائی اجناس اور دوسری اشیائے ضروریہ میں ہوش رُبا مہنگائی کے خلاف جلوس نکالے۔ یہ وہ وقت تھا جب ڈھاکہ میں ہندوستانی ہائی کمیشن کو بھی تسلیم کرنا پڑا کہ سمگلنگ میں کئی گنا اضافہ ہوگیا ہے۔ لیکن اس نے یہ بھی کہا کہ یہ اس وقت بند ہو جائے گی جب بنگلہ دیش اور ہندوستان کے درمیان سرحدی تجارت کے معاہدے پر دستخط ہو جائیں گے۔ یہ بیان 23 فروری 1972ء کو دیا گیا تھا۔ بدعنوانی اور رشوت ستانی ملک کے کونے کونے میں ہر سطح پر پھیل چکی تھی۔

27 فروری 1972ء کو شیخ مجیب الرحمٰن نے اپنے ارکانِ پارلیمنٹ کے لیے ایک ہدایت نامہ جاری کیا جس میں کہا گیا تھا: ''کوئی شخص بھی حکومتی ملازمت، تقرری، تبدیلی یا ترقی کے لیے درخواست نہیں کرے گا۔ انتظامیہ کو کام کرنے دیا جائے۔'' 11 مارچ 1972ء کو ''دَینک بنگلہ'' اخبار میں ایک دلچسپ کہانی شائع ہوئی۔ اس کہانی کے مطابق ''بنگلہ دیش ٹوبیکو کمپنی'' نے 25 ڈسٹری بیوٹر مقرر کرنے کا فیصلہ کیا۔ انتظامیہ کو 3000 درخواستیں موصول ہوئیں۔ ہر درخواست کے ساتھ طاقت ور اور بااثر افراد کی سفارش بھی شامل تھی۔ انتظامیہ گومگو کی کیفیت میں تھی کہ کس کی تقرری کی جائے اور کس کو چھوڑ دیا جائے۔ 26 جون 1972ء کو ''دَینک بنگلہ'' کے ایک رپورٹر نے سرحد پار سمگلنگ کی ایک جنت سلہٹ سے لکھا کہ ''مجرم جو قانون نافذ کرنے والی ایجنسیاں اور بارڈر سیکیورٹی فورس پکڑتی ہے انہیں ڈھاکہ میں موجود بااثر سیاسی شخصیات کے دباؤ میں آ کر چھوڑ دیا جاتا ہے۔''

اسی طرح کمرشل سیکٹر میں بھی حکومت کے متعارف کروائے گئے پرمٹ سسٹم کی وجہ سے انارکی کی سی صورت حال پیدا ہو چکی تھی۔ وہ لوگ جنہیں دھاگے کی درآمد کے پرمٹ جاری کیے گئے تھے ان کی کوئی لومز (کھڈیاں) نہ تھیں۔ جن لوگوں کو مٹی کے تیل کے پرمٹ جاری کیے گئے تھے وہ اصل ڈیلر نہیں تھے۔ پرمٹ

اور لائسنس حقیقی تاجروں نہیں بلکہ پارٹی کے پٹھوؤں اور حمایتیوں کو جاری کیے جا رہے تھے جس کا خمیازہ عام صارفین کو بھگتنا پڑ رہا تھا کیوں کہ دلالوں کے اندر گھس آنے کی وجہ سے اشیاء کی قیمتیں کئی گنا بڑھ جاتی تھیں۔ خواتین دن کے وقت اپنے گھروں سے باہر نہیں نکل سکتی تھیں کیوں کہ ان کے پاس تن ڈھانپنے کے لیے مناسب کپڑے نہیں ہوتے تھے۔ ماں اور بیٹی کو ایک ہی ساڑھی باری باری استعمال کرنی پڑتی تھی۔ اس طرح کی داستانیں اخبارات میں روزانہ شائع ہو رہی تھیں۔ اس بحران سے نمٹنے کے لیے حکومت نے ٹی سی بی (ٹریڈنگ کارپوریشن آف بنگلہ دیش) کے ذریعے ہندوستان سے سندری ساڑھیاں درآمد کیں۔ جب ان کی کھیپ بنگلہ دیش پہنچی تو پتا چلا کہ ان کا سائز چھوٹا تھا اور یہ جسم کو بمشکل گھٹنوں تک ڈھانپ پاتی تھیں۔ یہ پردوں کے لیے بھی استعمال نہیں کی جا سکتی تھی۔ جب یہ معاملہ ہندوستانی ہائی کمیشن کے سامنے پیش کیا گیا تو انہوں نے کہا، ''حکومت کی ایجنسی نے ضروری معائنے کے بعد کھیپ روانہ کی ہے۔'' حکومت کے پاس اور نہ ہی ٹی سی بی کے پاس اس کا کوئی جواب تھا۔

ان حالات میں جب پوری قوم حکومت کی بدعنوانی اور اقربا نوازی کے خلاف احتجاج کر رہی تھی، عوامی لیگ، مظفر نیپ اور سی پی بی نے سہ پارٹی اتحاد تشکیل دیا جسے ''ٹرائی دلیواویکوجوٹ'' کا نام دیا گیا۔ لیکن بہت تھوڑے وقت میں اس اتحاد میں دراڑیں پڑنے لگیں۔ شروع میں مظفر اور موتیا چوہدری نے اعلان کیا، ''ہماری منزل سائنٹفک سوشلزم کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔'' کیپٹن (ریٹائرڈ) عبدالحلیم چوہدری نیپ کی سینٹرل کمیٹی کے ممبر اور مجاہد آزادی نے کہا، ''آزادی کسی فرد واحد نے نہیں دلائی، لہٰذا کسی کو بھی آزادی کے ثمرات سے تنہا بہرہ ور ہونے کا حق نہیں ہے۔'' (''ڈینک بنگلہ'' 23 مارچ 1972) لیکن 20 مئی 1972ء کو نیپ مظفر کی کونسل میٹنگ میں جمہوریت اور آزاد عدلیہ کے حق میں فیصلہ کیا گیا۔ 21 مئی 1972ء کو ایک عوامی جلسے میں خود مظفر احمد نے اعلان کیا، ''فاقوں کی وجہ سے لوگ سوبھی نہیں سکتے۔ بدعنوانی، امدادی سامان میں خرد برد، کچھ ممبرانِ پارلیمنٹ کی بددیانتی پر مبنی سرگرمیوں، مسلسل لوٹ مار اور غارت گری، سمگلروں کی عیاریوں اور جبر و استبداد نے عوام کی زندگیاں ناقابل برداشت بنا دی ہیں۔''

89۔ سزائیں اور مزاحمت

اس دوران مخالفین پر تشدد اور سزاؤں کا سلسلہ پورے ملک میں زور پکڑ گیا۔ حتیٰ کہ مظفر نیپ کے کارکنوں کو بھی نہیں بخشا جا رہا تھا۔ 8 جولائی کو مظفر نیپ کے سیکریٹری جنرل پنکج بھٹاچاریہ نے ایک بیان جاری کیا کہ نیپ کے کارکن حکومتی سزاؤں اور تشدد کا نشانہ بنائے جا رہے ہیں جب کہ انہوں نے دلیرانہ اور قابل تعریف انداز میں بدعنوانیوں اور انارکی کے خلاف اور مختلف مقامات پر بدمعاشوں کا مقابلہ کیا ہے۔ مفاد پرست حلقوں نے نیپ کے دفاتر پر حملے کیے ہیں اور نیپ کے کارکنوں کو جان سے مار دینے کی دھمکیاں دی ہیں۔ 31 جولائی 1972ء کو مظفر احمد بہت زیادہ طیش میں آ گئے اور کہا، ''ملک میں نیپ مظفر اور مونی سنگھ کی

کمیونسٹ پارٹی کے علاوہ بائیں بازو کی کوئی دوسری پارٹی نہیں ہے۔'' 16 اگست 1972ء کو ایک یادداشت جمع کرواتے ہوئے نیپ مظفر نے کہا، ''حکومت نے اپنے کسی بھی وعدے کو پورا نہیں کیا۔ آزادی سے لے کر آج تک حکومت نے سرکاری افسروں کی بے روک ٹوک بدعنوانیوں اور عوام دشمن سرگرمیوں کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھایا بلکہ اس کے برعکس عوام نے اس سلسلے میں ان کی شرم ناک چشم پوشی اور اشتعال انگیز شراکت کا مشاہدہ کیا ہے۔''

27 اگست 1972ء کو پلٹن میدان میں ایک جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے مظفر احمد نے وزیراعظم شیخ مجیب الرحمٰن کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: ''اگر آپ عوام کو کھانے کے لیے کچھ نہیں دے سکتے تو پھر حکومت کرنے کا دعویٰ کیوں کر کر سکتے ہیں؟ آپ دیکھ کیوں نہیں سکتے؟ آپ سن کیوں نہیں سکتے؟ بدعنوان ممبران پارلیمنٹ، ذخیرہ اندوزوں، منافع خوروں، دلالوں، بدعنوان افسروں کو سزائیں نہیں دی جاتیں، کیوں؟ چند شیریں الفاظ اور کھوکھلے وعدوں کے علاوہ عوام کو کیا ملا ہے؟'' اسی جلسے میں موتیا چوہدری نے کہا: ''22 خاندانوں کی جگہ 22 سو خاندان پیدا کر دیئے گئے ہیں۔''

ان تمام پیش رفتوں کے باوجود نیپ مظفر اور سی پی بی (مونی سنگھ) کسی نہ کسی طرح عوامی لیگ سے چمٹے رہے۔ انہوں نے عوامی لیگ کے ساتھ شامل ہو کر مولانا بھاشانی اور جے ایس ڈی کے خلاف اپنی زہریلی مہم جاری رکھی۔ بعض اوقات ان کی یہ مہم عوامی لیگ سے بھی بازی لے جاتی۔

1975ء کی تاریخی سیاسی تبدیلی کے نتیجے میں نیپ مظفر کئی حصوں میں بٹ گئی۔ کبھی یہ عوامی لیگ کی پٹھو ہوتی کبھی اس کی مخالفت کر رہی ہوتی اور اگلے دن ''بکسال'' میں شامل ہو جاتی اور پھر دوبارہ عوامی لیگ کے ساتھ کھڑی نظر آتی۔ ایک سیاسی پارٹی کے طور پر نیپ مظفر کی یہی تاریخ رہی تھی۔

یکم جنوری 1973ء بنگلہ دیش کی تاریخ میں ایک اہم دن ہے۔ اس دن ویت نام پر امریکی حملے کے خلاف ماسکو کی حامی چھترا یونین نے دارالحکومت میں ایک جلوس نکالا۔ یہ جلوس جب پریس کلب کے سامنے ایس آئی ایس کی عمارت کے پاس پہنچا تو پُرتشدد ہو گیا۔ پولیس نے کسی پیشگی انتباہ کے بغیر فائر کھول دیا۔ یہ ایک بلا اشتعال فعل تھا۔ فائرنگ کے نتیجے میں ڈھاکہ یونیورسٹی کا فلاسفی آنرز کا تیسرے سال کا طالب علم مطیع الاسلام اور ایک دوسرا طالب علم مرزا قادر الاسلام ہلاک ہو گئے۔ دوسرے دن تقریباً تمام اخباروں نے آزاد بنگلہ دیش کی سڑک پر دن دیہاڑے ان ہلاکتوں کے سانحہ کی خبر شائع کی۔ قوم نے پولیس کی اس کارروائی کی بھرپور مذمت کی۔ آزادی کے محض ایک سال بعد حکومتی ادارے کے ہاتھوں اس بے رحمانہ قتل پر پوری قوم سکتہ میں آ گئی۔ لوگ خوف زدہ اور تشویش کا شکار ہو گئے۔ جو صحافی اس وقت پریس کلب میں موجود تھے انہوں نے اس ساری بربریت کا خاموشی اور پریشانی کے عالم میں مشاہدہ کیا۔ اس دن رپورٹروں اور پریس فوٹو گرافروں کو بھی معاف نہ کیا گیا۔ کیمرے چھین کر توڑ دیئے گئے۔ تانگیل سے تعلق رکھنے والے وزیر داخلہ عبدالمنان نے اس واقعہ پر کوئی بیان دینا بھی ضروری خیال نہ کیا۔

جیسے ہی فائرنگ کی خبر شہر میں پھیلی تمام کاروبار اور دکانیں بند کر دی گئیں اور ٹرانسپورٹ جامد ہو گئی۔ ہزاروں کی تعداد میں لوگ اس خون آلود جگہ کو دیکھنے کے لیے پہنچ گئے جہاں طالب علموں کو گولیاں مار کر ہلاک کیا گیا تھا۔ پورے شہر میں حکومت کی اس بربریت کے خلاف احتجاجی جلوس نکالے گئے اور تعزیتی اجلاس منعقد کیے گئے۔ اس قتل کے خلاف پورے شہر میں خود بخود مکمل ہڑتال ہو گئی۔ مظفر احمد نے اعلان کیا: ''عوامی لیگ کا یہ قتل یحییٰ خان جیسے فاشزم کا نمونہ ہے۔ ہم عوام کے ساتھ بہ یک آواز ہو کر شیخ مجیب کی قیادت میں عوامی لیگ کی اس حکومت سے فوراً استعفیٰ کا مطالبہ کرتے ہیں۔'' اس نے مزید کہا: ''شیخ مجیب اور اس کی حکومت کو نور الامین کی حکومت جیسے نتائج کا سامنا کرنا پڑے گا۔''

2 جنوری 1973ء کو شیخ مجیب کے بھتیجے شیخ فضل الحق مونی نے کہا: ''عوامی لیگ، چترا لیگ، جبو لیگ اور دوسرے محبِ وطن گروپس یکساں طور پر پولیس کی سفاکانہ کارروائی کی مذمت کرتے ہیں لیکن ہمارے علم میں یہ بات بھی آئی ہے کہ جب قوم اس حادثے پر حکومت کے فوری تحقیقاتی اقدامات کو خوش آمدید کہہ رہی ہے تو اس مخصوص وقت پر کچھ خودسر عناصر، سرمایہ داروں کے ایجنٹس اور سابقہ البدر اور الشمس کے ارکان لوگوں کو پریشان کرنے کے لیے انارکی پھیلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وہ اپنے درپردہ مقاصد کے حصول کے لیے امن و امان کی صورت حال کو بھی تباہ کرنے کی کوشش میں ہیں۔ یہ عناصر مخالف جماعتوں کے روپ میں کام کر رہے ہیں۔ ان کی سرگرمیاں اشتعال انگیز ہیں اور یہ ملک کا امن درہم برہم کرنا چاہتے ہیں۔''
ان عناصر نے تمام جمہوری اقدار کو پامال کرتے ہوئے عوامی لیگ کے کارکنوں کو نہ صرف زخمی کیا بلکہ ایک کارکن کو جان سے بھی مار ڈالا۔ انہوں نے پریس کی ایک گاڑی بھی تباہ کر دی۔ انہوں نے مظفر نیپ کے دفتر کے سامنے چترا لیگ کے ایک جلوس پر بھی حملہ کیا۔ وہ اسلحہ کے ساتھ انڈسٹریل علاقے اور ڈھاکش واڑی کاٹن مل میں داخل ہو گئے تھے۔ حتیٰ کہ نیپ مظفر کے چیئرمین مظفر احمد جیسے شخص نے ایک اخبار کے دفتر پر ایک حملے کی خود قیادت کی۔

90۔ مجیب کے القابات کی واپسی

3 جنوری 1973ء کو پلٹن میدان میں چترا یونین نے ایک جلسے کا انعقاد کیا، جہاں چترا یونین کے ایک رہنما مجاہد الاسلام سلیم نے کہا: ''اگر ضرورت محسوس ہوئی تو ہم مزید خون دیں گے لیکن سامراجیت کی اس کاسہ لیس حکومت کو ختم اور سوشلزم قائم کریں گے۔'' اسی جلسے میں ڈھاکہ یونیورسٹی سٹوڈنٹس یونین کے نائب صدر سلیم نے ڈھاکہ یونیورسٹی سٹوڈنٹس یونین سے شیخ مجیب کی زندگی بھر کی ممبر شپ کو منسوخ کرنے کا اعلان کیا۔ اس نے سرعام ممبر شپ کی کتاب سے وہ صفحہ پھاڑ دیا جس پر شیخ مجیب الرحمٰن کا نام درج تھا۔ ستم ظریفی یہ تھی کہ یہ وہی لیڈر تھا جس نے 6 مئی 1972ء کو شیخ مجیب کو عمر بھر کے لیے ممبر شپ عطا کی تھی۔ اس نے انہیں اس سے پہلے دیا گیا ''بنگلہ بندھو'' کا خطاب بھی واپس لے لیا اور کہا: ''اخبارات میں اور قومی میڈیا میں شیخ مجیب

کے نام سے پہلے ''بابائے قوم'' اور ''بنگلہ بندھو'' کے خطابات استعمال نہیں کیے جائیں گے۔'' اس نے تمام عوامی مقامات، دفاتر اور عدالتوں سے ان کی تصاویر ہٹانے کا مطالبہ بھی کیا۔ اسی دن سی پی بی کے رہنما مونی سنگھ نے کہا: ''موجودہ حکومت مکمل ناکام حکومت ہے۔''

3 جنوری کو ایک روزنامہ اخبار ''بنگلہ ربانی'' نے جس کی ادارت جبولیگ کے چیئرمین شیخ فضل الحق مونی کرتے تھے، ایک اداریہ تحریر کیا: ''2 جنوری کو ہڑتال کے نام پر نیپ مظفر، نیپ بھاشانی، جے ایس ڈی، موتیا، مینن اور چترا لیگ سے نکالے گئے فاشسٹ گینگ چترا یونین کے محبوب اللہ گروپ نے میر پور، محمد پور اور چوک بازار میں چترا لیگ اور عوامی لیگ پر حملہ کیا۔ چترا لیگ کے ریجنل کلچرل سیکریٹری میر جہان کو چتوا تلی سے اغوا کیا گیا اور نیپ مظفر کے ٹھگوں نے انہیں قتل کر دیا۔'' اگلے دن مجیب نواز چترا لیگ نے دارالحکومت میں ایک پر تشدد جلوس نکالا۔

91۔ جبر و استبداد کے خلاف جدوجہد جاری رہی

3 جنوری کو شہید مینار پر مجیب نواز چترا لیگ نے ایک جلسہ منعقد کیا۔ چترا لیگ کے صدر شیخ شاہد الاسلام (شیخ مجیب الرحمٰن کا ایک اور رشتہ دار) نے نیپ مظفر، جے ایس ڈی، اور چترا یونین کے رہنماؤں کو متنبہ کیا اور مطالبہ کیا کہ ''بنگلہ بندھو'' کے خلاف ذلت آمیز رائے زنی پر وہ 7 جنوری تک عوام کے سامنے معافی مانگیں اور کہا: ''اگر معافی نہیں مانگی جاتی تو پھر 7 جنوری کے بعد نیپ مظفر، نیپ بھاشانی اور جے ایس ڈی کو بنگلہ دیش کی سرزمین پر کسی عوامی جلسے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔'' انہوں نے مزید کہا: ''وہ لوگ جو وزیر بننے کے لیے قومی حکومت کا مطالبہ کر رہے ہیں اُن کے زیر سایہ موجودہ جمہوری ماحول سے فائدہ اٹھاتے ہوئے چترا یونین ''بنگلہ بندھو'' پر تنقید کی جسارت کر رہی ہے۔'' انہوں نے اعلان کیا: ''آج کے دن سے یعنی 4 جنوری سے بنگلہ دیش کے عوام صرف ان اخبارات کو اشاعت کی اجازت دیں گے جو ''بنگلہ بندھو'' کو جائز عزت کا مقام دیں گے۔'' انہوں نے یہ بھی کہا: ''بنگلہ بندھو کو ''ڈھاکہ یونیورسٹی سٹوڈنٹس یونین'' کی عمر بھر کی ممبرشپ عبدالقدوس مکھن نے عطا کی تھی لہٰذا کسی دوسرے شخص کو اس میں مداخلت کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ اس وقت ''ڈھاکہ یونیورسٹی سٹوڈنٹس یونین'' طلبا کی رضا اور خواہشات کے خلاف عمل کر رہی ہے اور اس طرح ان کے بھروسے اور اعتماد سے محروم ہو چکی ہے۔ لہٰذا یہ ادارہ عملاً ختم ہو چکا ہے۔'' طالب علم رہنماؤں نے اس بیان کو ''ڈھاکہ یونیورسٹی سٹوڈنٹس یونین'' کے آنے والے انتخابات کے خلاف ایک سازش قرار دیا۔ چند روز بعد ''ڈھاکہ یونیورسٹی سٹوڈنٹس یونین'' کے دفتر کو مسمار کر دیا گیا۔

اسی دن ''بنگلار بانی'' اخبار میں ایک خبر شائع ہوئی کہ ایک شخص جس نے شیخ مجیب کی تصویر اتار پھینکی تھی، اس کے کان کاٹ دیئے گئے تھے۔ دوسرے دن اسی اخبار نے خبر دی کہ اسی جرم کی پاداش میں دو اشخاص کو مار مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ 5 جنوری کو پلٹن میدان میں چترا لیگ کے ایک جلسے میں طلبا نے نعرے

لگائے: ''بنگلہ دیش کے تین میر جعفر... رب، بھاشانی، مظفر۔''

6 جنوری کو گوپال گنج میں ایک عوامی جلسے سے خطاب کرتے ہوئے شیخ مجیب الرحمٰن نے کہا:

''در پردہ مفادات کے حامل طبقے انتخابات سے قبل بین الاقوامی برادری کی نگاہوں میں میرا اور بنگلہ دیش کا تاثر خراب کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اپنے ذاتی مفادات کی خاطر عوام میں بے چینی پیدا کرنا چاہتے ہیں تاکہ بنگلہ دیش کو ترقی کے لیے بیرونی سرمایہ کاری اور مدد حاصل نہ ہو سکے۔''

6 جنوری کو مظفر احمد نے بھی پریس کانفرنس کی اور کہا کہ موجودہ صورتِ حال میں وہ خطرہ محسوس کر رہے ہیں اور 7 جنوری کے جلسے کو منسوخ کرنے کا اعلان کر دیا۔ انہوں نے ویت نام کے ذکر، حکومت کے استعفیٰ حتیٰ کہ دو طالب علموں کے قتل کے مقدمے کے ذکر سے بھی اجتناب کیا۔ 8 جنوری کو ڈرامائی طور پر انہوں نے شیخ مجیب الرحمٰن کے دعویٰ کو مزید تقویت دیتے ہوئے کہا: ''بعض لوگ آنے والے انتخابات کو خطرے میں ڈالنا چاہتے ہیں۔'' اسی دن بارن دَتا المعروف عبدالسلام سی پی بی (مونی سنگھ گروپ) کے جنرل سیکریٹری نے ایک پریس کانفرنس میں کہا: ''امریکی سامراجیت، عوامی جمہوریہ چین اور پاکستان کے ایجنٹ ملک میں عدم استحکام پیدا کرنے اور محبِ وطن سیاسی قوتوں کے درمیان افراتفری پھیلانے کے لیے سرگرم ہیں۔'' انہوں نے محبِ وطن سیاسی پارٹیوں سے قوم کی ترقی اور خوشحالی کے لیے متحد ہو کر اس چیلنج کا مقابلہ کرنے کی اپیل کی۔ جب چند صحافیوں نے ان سے سوالات کرنے کی کوشش کی تو انہوں نے جھڑک دیا: ''کوئی سوال نہ کریں، صرف سنیں۔'' اس طرح انہوں نے سوالات کی اجازت دیئے بغیر اپنی پریس کانفرنس ختم کر دی۔

اس کے بعد ان دونوں پارٹیوں نے عوامی لیگ سے بہتر تعلقات استوار کرنے کے لیے مختلف حلقوں کے ساتھ لابنگ شروع کر دی۔ 22 جنوری کو مظفر احمد کو شیخ مجیب الرحمٰن سے ملاقات کا موقع ملا۔ اس ملاقات میں انہوں نے حکومت کے خلاف اور مجیب کے خلاف اپنے بیانات پر معافی مانگی۔ اسی دن مونی سنگھ نے عوامی لیگ کے رہنما ظل الرحمٰن کے ساتھ تجدید تعلقات کے لیے ایک ملاقات کی اور بعد میں ان دونوں پارٹیوں نے بکسال (بنگلہ دیش کریشک سرامک عوامی لیگ) میں شمولیت اختیار کر لی۔ لیکن شہید مطیع اور قادر کی تحقیقاتی رپورٹ 15 اگست 1975ء تک شائع نہ ہو سکی۔ کہا جاتا ہے کہ باہمی گفت و شنید کے بعد ان رہنماؤں نے حکومت کو یقین دلایا تھا کہ وہ ان ہلاکتوں کے مقدمے کا مطالبہ نہیں کریں گے۔ تاہم تحقیقات کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی جس کے ذمہ صرف ان حالات کی نشاندہی کرنا تھا جن کے تحت پولیس کو گولی چلانا پڑی، لیکن مجرموں کا تعین کرنا اس کی ذمہ داری نہ تھی۔ اس طرح ان شہدا کے خاندانوں کو انصاف سے محروم رکھا گیا۔

1973-92 کے عام انتخابات

1972ء کے اختتام پر پارلیمنٹ کے ایک اجلاس میں اعلان کیا گیا کہ عام انتخابات 9 مارچ 1973ء کو ہوں گے۔ 11 نومبر 1972ء کو مجیب واد کے قیام کے پختہ عہد کے ساتھ شیخ مجیب الرحمٰن کے ایک بھتیجے

فضل الحق مونی کی قیادت میں ایک نئی تنظیم ''عوامی جبو لیگ'' کے نام سے تشکیل دی گئی۔ نور عالم صدیقی بھی اس کے ساتھ تھا۔ انتخابی مہم جاری رہی۔ نیپ مظفر اور سی پی بی (مونی سنگھ) اپنی بہترین کوششوں کے باوجود عوامی لیگ کے ساتھ اپنا اتحاد قائم کرنے میں ناکام رہیں۔ عوامی لیگ اور اس کے اتحادیوں نے یہ بات پھیلانا شروع کر دی کہ جو لوگ یکم مارچ کی ہلاکتوں کے خلاف ہڑتالوں اور جلوسوں کے ذریعے احتجاج کرنے کی کوشش کر رہے ہیں در حقیقت انتخابات کے انعقاد کو خطرے میں ڈالنے کی کوشش میں ہیں۔ عوامی لیگ کے رہنماؤں نے کہنا شروع کر دیا: ''یہ انتخابات مجیب واد کے قیام کے لیے عوامی رائے کا اظہار ہوں گے۔'' 2 فروری 1973ء کو ظل الرحمٰن نے کہا: ''انتخابات کے ذریعے عوامی لیگ عوام سے مجیب واد کے قیام کا اختیار طلب کرے گی۔'' اپنے 20 فروری کو شائع ہونے والے انتخابی منشور میں وہ عوام سے مجیب واد کے بارے میں اُن کا فیصلہ چاہتے تھے۔

تاہم 21 نومبر کو مظفر احمد نے مطالبہ کیا کہ انتخابات سے قبل حکومت کو مستعفی ہو جانا چاہیے۔ اس کے جواب میں 22 نومبر کو عوامی لیگ کے ایک اعلیٰ رہنما قمر الزمان نے کہا: ''کابینہ انتخابات سے پہلے مستعفی نہیں ہو گی کیوں کہ اس کی کی کوئی وجہ نہیں ہے۔'' کاغذات نامزدگی جمع کروانے کے بارے میں بہت سی شکایات موصول ہوئیں۔ 5 فروری 1973ء کو جے ایس ڈی نے شکایت کی کہ اس کے امیدواروں کو کاغذاتِ نامزدگی داخل کروانے کی اجازت نہیں دی گئی۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ الیکشن کمیشن کو صورت حال کے ازالہ کے لیے فوری مداخلت کرنا چاہیے۔ ظل الرحمٰن نے کہا کہ یہ انتخابات کا بائیکاٹ کرنے کا ایک بہانہ ہے۔

جیسے جیسے انتخابات قریب آ رہے تھے ہر جگہ سے سیاسی قتلوں کی خبریں آنے لگیں۔ 4 مارچ کو مختلف مخالف سیاسی پارٹیوں نے الزامات لگائے کہ حکمران جماعت عوامی لیگ اپنے دُم چھلوں کے ساتھ مل کر دہشت گردی کے ہتھکنڈوں کو استعمال کرتے ہوئے یک حزبی آمریت قائم کرنا چاہتی ہے۔

نیپ کے موتیا چوہدری نے 3 مارچ کو ڈھاکہ میں ایک عوامی جلسے میں کہا کہ عوامی لیگ پچھلے سال کی لوٹ مار اور غارت گری کے طوفان اور امدادی سامان میں شرم ناک ریکارڈ توڑ خرد برد کے بعد اب اپنے واحد اثاثے ''بنگلہ بندھو'' کو سامنے رکھتے ہوئے ووٹ مانگ رہی ہے۔ ایک جانب وہ جمہورت کی بات کر رہے ہیں جب کہ دوسری جانب عوامی لیگ کے ٹھگ یہ نعرہ لگا کر عوام کو خوف زدہ کر رہے ہیں: ''بنگو بندھو ہمیں اگلی صف میں لڑنے کے لیے ہتھیار دو۔'' یہ کس قسم کی جمہوریت ہے۔

5 مارچ کو روزنامہ سنگ باد میں رپورٹ شائع ہوئی: ''شکست کے خدشے کے پیش نظر مجیب بادیوں نے 4 مارچ کی شام کو ایک مرتبہ پھر ترابو بازار میں نیپ کے انتخابی جلوس پر فائرنگ کی۔ انہوں نے ہجوم کو منتشر کرنے کے لیے ہلکی مشین گنوں، چھوٹی مشین گنوں اور پستولوں سے بلا امتیاز فائرنگ کی۔ انہوں نے نیپ اور چترا یونین کے مقامی دفاتر کو لوٹا، دستاویزات، پوسٹر اور فرنیچر کو ایک جگہ ڈھیر کر کے آگ لگا دی۔ مجیب بادیوں نے مارکیٹ میں نیپ کے حامیوں کی دکانیں بھی لوٹ لیں۔''

تاہم 7 مارچ 1973ء کو بغیر کسی مقابلے کے یک طرفہ انتخابات کا ناٹک رچایا گیا۔ انتخابات کے حوالے سے سنگ باد، اور گانو کنٹھا نے دہشت، غنڈہ گردی، تشدد، بیلٹ بکسوں کی چوری، پولنگ ایجنٹوں کے اغوا اور قتل وغیرہ کی داستانیں شائع کیں۔ 8 مارچ 1973ء کو سنگ باد کے صفحہ اوّل پر شائع ہونے والی خبروں کی سرخیاں درج ذیل تھیں۔ ''سلہٹ میں بیلٹ بکس چھین لے گئے۔'' ''چوا کھلی میں بیلٹ بکس چوری ہو گئے۔'' ''چٹاگانگ میں دو افراد کو گرفتار کیا گیا دونوں کے پاس اکتیس اکتیس بیلٹ پیپرز (ووٹوں کی پرچیاں) تھے۔'' ''راکھی باہنی نے دھمرائی کو دہشت زدہ کر دیا۔'' ''ڈھاکہ سمیت بہت سے انتخابی مراکز پر عجیب واقعات دیکھنے میں آئے۔'' ''انتخابات بہت زیادہ منصفانہ نہ تھے، کوئی بھی جتنے چاہتا ووٹ ڈال سکتا تھا۔'' ''مسلح ٹھگوں نے جے ایس ڈی کے دو کارکنوں کو اغوا کر لیا۔'' ''دارالحکومت کے ایک پولنگ سینٹر پر خوف وہراس اور فائرنگ۔'' ''کومیلا پولنگ دہشت گردی کی نذر۔'' ''کالی گنج میں دہشت گردی کا راج۔'' راج شاہی میں بے قابو دہشت گردی کی وجہ سے وونگ ایک ڈھونگ بن گئی۔''

9 مارچ کو مظفر احمد اور پنکج بھٹا چاریہ نے ایک مشترکہ بیان میں دعویٰ کیا: ''نیپ اور دوسری مخالف جماعتوں کے دو جیتے ہوئے امیدواروں کو زبردستی ناکام قرار دیا گیا۔ حکومتی جماعت کے کارکنوں نے بیلٹ بکس چرا لیے، پولنگ ایجنٹوں کو اغوا کیا، ووٹروں کو خوف زدہ کیا اور ڈرایا دھمکایا، اور جعلی ووٹوں سے بیلٹ بکسوں کو بھر دیا۔ انہوں نے حکومتی ذرائع، مشینری اور ٹرانسپورٹ کو بھی ناجائز طور پر اپنے مفاد کے لیے استعمال کیا۔ ان کی غیر جمہوری اور ناجائز کارروائیوں کے نتیجے میں انتخابات ایک معذرت کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھے۔''

9 مارچ کو جے ایس ڈی کے صدر میجر (ریٹائرڈ) جلیل نے کہا، ''شیخ مجیب الرحمٰن اور ان کی یک حزبی حکومت کے قیام کے لیے جس طرح تمام جمہوری اقدار اور اصولوں کو پامال کرتے ہوئے انتخابات کا انعقاد کروایا گیا ہے۔ میں انہیں ''بابائے قوم'' کہنے سے شدید نفرت کرتا ہوں۔'' انہوں نے مزید کہا کہ ''انتخاب والے دن جنا بھوَن میں ایک کنٹرول روم قائم کیا گیا تھا اور وزیر اعظم خود نتائج کو کنٹرول کر رہے تھے۔ جب مخالف امیدوار ووٹوں کی گنتی میں سبقت لے جا رہے ہوتے تو ان کی ہدایت پر ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر نشریات روک دی جاتی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد ان کی مرضی کے مطابق تیار کیے گئے نتائج ٹی وی اور ریڈیو پر نشر کیے جاتے جس میں عوامی لیگ کے امیدواروں کو کامیاب دکھایا گیا ہوتا تھا۔'' انہوں نے عوامی لیگ کی نئی منتخب حکومت کو سامراجیت اور نئے نو آبادیاتی نظام کا چیلا قرار دیا اور ان کی انتخابی کامیابی کا ہٹلر، مسولینی اور چیانگ کائی شیک کی کامیابیوں سے موازنہ کیا۔

9 جولائی کو نیپ بھاشانی کے وائس چیئرمین عالم الرازی نے کہا، ''حکمران جماعت نے دہشت گردی، جعلی ووٹوں، ڈرانے دھمکانے، دولت کی طاقت، ٹی وی، ریڈیو، اخبارات اور ابلاغ کے دوسرے ذرائع کے ناجائز استعمال اور انتخابی بددیانتی جیسے ناجائز حربے استعمال کرتے ہوئے انتخابات کو ایک ڈھونگ میں تبدیل کر دیا تھا۔ جس کا مقصد محض یک حزبی حکومت کا قیام تھا۔ حکمران جماعت نے ووٹروں کو ہراساں

کرنے اور ووٹنگ سے روکنے کے لیے جاتیو راکھی باہنی اور دیگر مسلح غیر قانونی باہنیوں کی خدمات بھی حاصل کی تھیں۔ انہوں نے ان کے ذریعے مخالف جماعتوں کے کارکنوں کو دہشت زدہ کیا۔ یہ انتخابات ریاستی دہشت گردی کی ایک بے نظیر مثال تھے۔'' دن دیہاڑے سڑک پر دو طالب علموں کے قتل کا ذکر کرتے ہوئے رازی نے کہا، ''جس قسم کی دہشت گردی کا مظاہرہ اس دن کیا گیا ہماری تاریخ کے گزشتہ 200 سالوں میں اس کی مثال نہیں ملتی۔'' انہوں نے قوم کو خبردار کیا کہ ''بنگلہ دیش میں جمہوریت کا مستقبل تاریک ہے۔ لوگوں کے بنیادی اور جمہوری حقوق غصب کرنے کے لیے منصوبے پر عمل درآمد شروع کر دیا گیا ہے۔''

پہلے سے طے شدہ انتخاب کے نتیجے میں عوامی لیگ 300 میں سے 291 سیٹوں پر جیت گئی۔ چٹا گانگ سے نیپ کے مشتاق احمد کو پہلے کامیاب قرار دیا گیا لیکن بعد میں نتیجہ تبدیل کر دیا گیا اور اسے ناکام قرار دے دیا گیا۔ تمام سیاسی جماعتوں نے اس بات پر تنقید کی۔ مشتاق احمد نے اس نتیجے کے خلاف رِٹ دائر کی، لیکن ساری عدلیہ حکومتی کنٹرول میں تھی اور عدالت سے انہیں کوئی انصاف نہ مل سکا۔

10 مارچ کو جاتیو لیگ کے رہنما اور پرانے سیاست دان عطاالرحمٰن خان نے اپنے حلقہ انتخاب دھمرائی میں انتخابات سے پہلے اور بعد میں حکمران جماعت، راکھی باہنی، اور دوسری باہنیوں چترا لیگ اور جبو لیگ کے ذریعے توڑے جانے والے ظلم و ستم کو ایک ڈراؤنے خواب سے تعبیر کیا۔

11 مارچ کو نور عالم صدیقی نے خبردار کیا کہ ''7 مارچ کے انتخابات میں جنہوں نے عوامی لیگ کو ووٹ نہیں ڈالے تھے، رضا کار اور البدر کے لوگ تھے۔ ان تمام آزادی دشمن قوتوں اور بیرونی قوتوں کے ایجنٹوں کو مجیب واد (مجیب ازم) کے بیلچے سے جڑوں سے اکھاڑ کر پھینک دیا جائے گا۔'' اگلے دن شیخ فضل الحق مونی نے بیت المکرم میں مجیب باد مخالف قوتوں کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیا۔ اس کے بعد 15 اگست 1975ء تک معصوم لوگوں، محب وطنوں، مخالف جماعتوں کے سیاسی کارکنوں، دانشوروں، صحافیوں، مزدور رہنماؤں، طالب علموں، حتیٰ کہ فوج اور قانون نافذ کرنے والی ایجنسیوں کے ارکان کو بھی اس علانیہ جنگ کی دہشت اور بربریت کا نشانہ بنایا جاتا رہا۔ اس ظلم و بربریت کا نشانہ بننے والوں میں سے صرف ایک مخالف جماعت جے ایس ڈی کے دعویٰ کے مطابق، اس کے 30 ہزار سے زائد کارکنوں اور عہدیداروں کو حکمران جماعت اور حکومت کی بے رحمانہ سزاؤں کے ذریعے ختم کیا گیا تھا۔

جو کوئی بھی آمریت کی کسی بھی جگہ مخالفت کرتا یا ناانصافی کے خلاف بات کرتا اسے وحشیانہ طور پر قتل کر دیا جاتا یا غیر انسانی تشدد کا نشانہ بنایا جاتا تھا۔ 1973ء میں برصغیر کے ایک معروف سیاست دان، صحافی، لکھاری اور کالم نویس نے روزنامہ اتفاق میں کئی اہم مضامین لکھ کر غیر معمولی جرأت کا ثبوت دیا۔ ایک مضمون جس کا عنوان تھا، ''ہمیں دلوں کے تبادلے نہیں، دلوں کی تبدیلی کی ضرورت ہے۔'' وہ لکھتے ہیں، ''بالکل انسانی دل کی طرح ہماری سیاست کے بھی ہر میدان میں چار خانے ہیں۔ سب سے پہلے ہمارا آئین، جمہوریت، سوشلزم، نیشنلزم اور سیکولرازم کے چار ٹھوس علیحدہ علیحدہ ستونوں پر کھڑا ہے۔ میں نے انہیں علیحدہ علیحدہ قرار دیا

ہے کیوں کہ کچھ قانون ساز سمجھتے ہیں کہ ایک کمرے کے چار ستون نہیں ہو سکتے۔ اصولوں اور ستونوں کے طور پر وہ ایک دوسرے سے ہم آہنگ نہیں ہیں۔ یہاں ناقدین شاید یہ کہنا چاہتے ہیں انسانی دل کے خانوں کی طرح ان چار ستونوں کے درمیان کوئی رابطہ والو موجود نہیں ہیں۔ لہٰذا آئین کے معاملے میں بھی ہم نے انتظامی ڈھانچے کو چار حدود کے اندر دھکیل دھکال کر رکھا ہوا ہے۔ کسی بھی جمہوری ملک کی طرح ہم نے عدلیہ، مقننہ اور انتظامیہ وغیرہ جیسی اصطلاحات بڑی کامیابی سے تشکیل دے رکھی ہیں۔ لیکن انتہائی اہم آلہ کار یا ریاستی ہتھیار، جو کسی بھی سوشلسٹ حکومت کے لیے ضروری ہوتا ہے، اسے کسی بھی جمہوری آئین کے تحت قانونی شکل نہیں دی جا سکتی، اسے بھی آئین کو نظر انداز کرتے ہوئے پیدا کر لیا گیا ہے جو ''جاتیو راکھی باہنی'' ہے۔ اس طرح ہم نے ریاست کے چار بہت طاقت ور ستون تخلیق کیے۔ قارئین کو ان چار ستونوں کو چار بنیادی اصولوں کے ساتھ خلط ملط نہیں کرنا چاہیے۔''

اس لمبے مضمون میں انہوں نے ملوں، فیکٹریوں اور صنعتوں کے بارے میں بھی بات کی گئی تھی۔

''دل کے چار خانوں کی مانند ہم نے اپنی زندگیوں کو بھی چار حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ قومی زندگی، جماعتی زندگی، حکومتی زندگی اور سماجی زندگی۔ اس قسم کی تقسیم کو معاشی زندگی میں بھی متعارف کروایا گیا ہے۔ ذرائع پیداوار کو پہلے ہی ملکیت کی تین اقسام میں بانٹ دیا گیا ہے۔ آئین کے مطابق تمام منافع بخش پیداواری ذرائع کو نجی، مشترکہ اور ریاستی ملکیت میں بانٹ دیا گیا ہے۔ نجی ملکیت میں صرف غیر پیداواری ذرائع کو رکھا گیا ہے۔ اس طرح دل کے چار خانوں کے ساتھ مماثلت کو قائم رکھا گیا ہے۔ تاکہ کوئی بھی شخص اس ترتیب کو ہڑتال کے ذریعے خراب نہ کر سکے۔ ہڑتال کے حق کو بھی قومیا لیا گیا ہے۔''

حکومت اور عوام کے تعلقات کے حوالے سے وہ لکھتے ہیں: ''غیر ملکی دوست دل کے چار خانوں کے ساتھ ہمارے ہمہ گیر لگاؤ سے حیران ہو سکتے ہیں۔ لیکن ان کی حیرانی اپنے عروج پر پہنچ جائے گی جب انہیں علم ہو گا کہ ہمارے سب سے بڑے رہنما کا اپنے عوام کے ساتھ رویہ بھی صرف دل پر مبنی ہے۔ ہمارا رہنما ایک عاشق ہے۔ وہ اپنے عوام سے محبت کرتا ہے اور عوام بھی اس سے محبت کرتے ہیں۔ اس ملک میں واحد رشتہ جو رہنما اور عوام کے درمیان پایا جاتا ہے، وہ محبت کا ہے، اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ سارا معاملہ دل کے گرد گھومتا ہے۔ دل کی نقل کرتے ہوئے ہم نے اپنی ذاتی، قومی، معاشرتی اور معاشی زندگیوں میں بھی دو خانے اوپر والے اور دو نیچے والے قائم کر رکھے ہیں۔ ونٹریکلز (دل کے وہ خانے جو شریانوں میں خون پمپ کرتے ہیں) کی طرح ہمارے پاس بھی دونوں اطراف میں بائیں اور دائیں گروپس موجود ہیں۔ بنیادی طور پر یہ رہنماؤں کی محبت ہے جو ہمیں چار خانوں کی جانب کھینچ کے لے گئی ہے، لیکن اس کی چند اور وجوہات بھی موجود ہیں۔

اگرچہ ہماری ریاست ایک سیکولر ریاست ہے لیکن ہم خود مذہب دشمن نہیں ہیں۔ ہم میں اکثریت مسلمانوں کی ہے۔ ہم مسلمانوں نے اپنا ایمان ترک نہیں کیا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ہم ''چار خانوں'' سے نہیں نکل سکے۔ ہماری چار کتابیں ہیں، چار کلمے ہیں، چار فرشتے ہیں، چار فرقے ہیں، چار خلفا اور چار امام ہیں اور

اس لیے ریاست کے چار بنیادی اصول ہیں۔ ہندو چار کے ہندسے سے بہت زیادہ متاثر ہیں۔ ان کی چار ویدیں ہیں، چار ذاتیں، چار یگ اور چار یوگا ہیں۔ اس طرح ہم سب چار کے گورکھ دھندے میں الجھے ہوئے ہیں۔ حکومت کے دفاتر میں چار سطحوں کے آفیسرز ہیں۔ ہم نے مارکیٹ میں چار قسم کے کاروبار متعارف کروائے ہیں۔ بلیک مارکیٹنگ، منافع خوری، ذخیرہ اندوزی اور سمگلنگ۔ ہم چار سے اپنی اس محبت اور لگاؤ کی وجہ سے ان کو چھوڑ نہیں سکتے۔

دل کے نظام کے ان چار خانوں کا سب سے بڑا مسئلہ بابائے قوم اور ان کے بیٹوں کے درمیان تعلق کا ہے۔ باپ اپنے بچوں سے محبت کرتا ہے اور بچے بھی اس سے محبت کرتے ہیں۔ وہ تمام ایک دوسرے سے دل کی گہرائیوں سے محبت کرتے ہیں۔ یہ محبت اس قدر ہے کہ بعض اوقات یہ شدید رقابت کی صورت اختیار کر لیتی ہے جس کے نتیجے میں خون کی ہولی کھیلی جاتی ہے اور زندگیوں کی قربانیاں پیش کی جاتی ہیں۔ بابائے قوم پہلے اپنے بچوں کو خون کی اس ہولی کو بند کرنے کی درخواست کرتے ہیں، پھر حکم دیتے ہیں اور آخر میں سختی سے تنبیہ کرتے ہیں۔ لیکن ان کے بچے ان کی بات پر کان نہیں دھرتے۔ باپ اس سے آگے کسی قسم کی سختی کرنے کے قابل نہیں ہے۔ اس کی وجہ بھی دل ہی ہے اور خاص طور پر اس کے چار خانے۔ قوم کا باپ جتنا زیادہ دل کی تبدیلی کے لیے چیختا ہے، بچے اتنا ہی سٹین گن کے ساتھ دل کے تبادلے کی جانب قدم اٹھاتے ہیں۔ اگر یہ صورتِ حال لمبے عرصے تک جاری رکھی گئی تو ہم سب کے دل رُک جائیں گے۔''

اس مضمون کی اشاعت کے بعد منصور کو حکومت اور عوامی لیگ کے غیظ و غضب کا نشانہ بننا پڑا۔

93۔ ''بکسال'' ابتدائی مراحل میں

بکسال (بنگلہ دیش کریشک سرامک عوامی لیگ) کی یک حزبی حکومت کے بیج 7 مارچ 1972ء کے جاتیو راکھی باہنی کے آرڈیننس کے اعلان کے ساتھ بو دیئے گئے تھے۔ صدارتی آرڈیننس نمبر 9 اور نمبر 50 (72) اپریل 1972 کے آخر میں کسی وقت جاری کیے گئے۔ آخر کار 1974ء میں تمام سیاسی پارٹیوں پر پابندی لگا دی گئی اور بکسال تشکیل دی گئی۔ مونی سنگھ کی کمیونسٹ پارٹی، نیپ مظفر اور عطاالرحمٰن کی جاتیو لیگ بکسال میں شامل ہو گئیں۔ جب تک بکسال تشکیل نہیں دی گئی تھی عوامی لیگ نے کُھلے طور پر یک حزبی حکومت کے بارے میں کبھی کچھ نہیں کہا تھا۔ اس کی بجائے وہ پارلیمانی جمہوریت، پارلیمنٹ کی خودمختاری، بنیادی حقوق کے تحفظ، پریس کی آزادی، قانون کی حکمرانی کے بارے میں بات کرتے تھے۔ لیکن مولانا بھاشانی، عطاالرحمٰن خان، اولی احد حتیٰ کہ مظفر احمد جیسے رہنما عوامی لیگ کے خفیہ ایجنڈے کو بھانپ گئے تھے اور انہوں نے عوام کو متنبہ کیا کہ عوامی لیگ یک حزبی حکومت قائم کرنے کی تیاریاں کر رہی ہے۔ مولانا بھاشانی حکومت کی عوام دشمن سرگرمیوں، مثلاً ظلم و استبداد بدعنوانیوں اور بدنظمی پر شدید تنقید کرتے رہے۔ عطاالرحمٰن خان نے چوتھی ترمیم کے نفاذ تک حکومت مخالف کردار ادا کیا۔ مظفر احمد اور ان کی نیپ عملی طور پر 1973ء سے عوامی لیگ کی ذیلی

جماعت کی حیثیت اختیار کر چکے تھے اگر چہ ان کے کونسل اجلاس میں جمہوریت کے حق میں فیصلہ کیا گیا تھا۔

30 اپریل 1973ء کو بھاشانی نیپ کے ڈاکٹر عالم الرازی نے پلٹن میدان میں ایک جلسے میں کہا:

''حکومت جبر و استبداد سے کام لے رہی ہے، حکمران لوگوں کو بغیر کسی وارنٹ کے گرفتار کر لیتے ہیں اور انہیں بغیر کسی مقدمے کے قید میں رکھتے ہیں۔'' انہوں نے تمام سیاسی قیدیوں کی رہائی کا مطالبہ کیا۔ جاتیو لیگ کے اولی احد نے بھی یہی مطالبہ کیا۔

اس عرصہ کے دوران 15 مئی 1973ء کو مولانا بھاشانی نے قیمتوں میں اضافے، بدعنوانیوں، اقربا پروری اور حکومتی ظلم کے خلاف بھوک ہڑتال کر دی۔ 17 مئی کو مجیب بادی چتر الیگ اور ماسکو حامی چترا یونین نے متحدہ سینٹرل ایکشن کمیٹی تشکیل دی۔ یہ اس جانب پہلا اشارہ تھا کہ ماسکو کی حامی قوتوں کو عوامی لیگ میں مدغم کیا جا رہا تھا۔ جہاں تک مولانا کی بھوک ہڑتال کا تعلق تھا طفیل احمد، عبدالرزاق، وزرا، نائب وزرا اور عوامی لیگ کے دوسرے رہنماؤں نے مولانا بھاشانی کو سامراجیت اور رضا کاروں کا ایجنٹ قرار دیتے ہوئے الزامات کی ایک اور بوچھاڑ کر دی۔ حتیٰ کہ انہوں نے ان پر یہاں تک الزام لگایا کہ وہ ملک کی آزادی کو تباہ کرنا چاہتے ہیں۔ 21 مئی کو مولانا بھاشانی کی اپیل پر پورے بنگلہ دیش میں ہڑتال کی گئی۔ اس وقت کے بھاشانی نیپ کے رہنما قاضی ظفر احمد کے مطابق حکومت نے شہروں اور قصبوں میں متعین مسلح ٹھگوں کے ذریعے اس ہڑتال کو ناکام بنانے کی سرتوڑ کوشش کی تھی۔

جب مولانا بھاشانی سیاسی اور معاشی حقوق کے لیے بھوک ہڑتال کیے ہوئے تھے، 22 مئی 1973ء کو ''گرینڈ الائنس'' کا پہلا اجلاس منعقد کیا گیا۔ اس ''گرینڈ الائنس'' کے جلسے میں عوامی لیگ، نیپ مظفر، سی پی جی مونی سنگھ، جبو لیگ، چترا لیگ (مجیب نواز)، سرامک لیگ، کریشک لیگ، ماسکو نواز ٹریڈ یونینوں، اور ماسکو نواز چترا یونین نے شرکت کی۔ اس بابت کے ذکر کی یہاں ضرورت نہیں کہ یہ تمام تنظیمیں بعد میں بکسال میں مدغم کر دی گئیں اور اس طرح ان کا اپنا وجود ختم ہو گیا۔ بیت المکرم میں ہونے والے اس اجلاس میں الائنس نے عہد کیا کہ امریکہ، پاکستان اور چین کے نام نہاد ایجنٹوں کا خاتمہ کر دیا جائے گا، ان پر ملک کی آزادی اور خود مختاری کے خلاف سازشوں کا الزام لگایا گیا تھا۔ اس اجلاس میں مقررین نے یہ دعویٰ بھی کیا کہ ''مولانا بھاشانی کی بھوک ہڑتال کو استعمال کرتے ہوئے ملک دشمن عناصر نے اپنی مذموم سرگرمیوں کا آغاز کر دیا ہے۔'' مظفر احمد نے کہا: ''بہت سے لوگ پاکستان توڑنے کا الزام لگاتے ہوئے حکومت کی مخالفت کر رہے ہیں۔ کچھ لوگ حکومت کی قومیانے کی پالیسی کی بھی مخالفت کر رہے ہیں۔ ہماری رائے یہ نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ہم اس قسم کی جمہوریت کو بھی مسترد کرتے ہیں، جو خود مختاری پر سمجھوتہ کرتی ہے اور محنت کش عوام کو آزادی دلانے میں ناکام رہتی ہے۔'' مونی سنگھ نے کہا: ''مولانا کی بھوک ہڑتال خوراک کی کمی کے خلاف نہیں بلکہ ملک میں افراتفری پیدا کرنے کے لیے ہے۔''

اس دوران جاتیو راکھی باہنی کی دہشت گردی میں شدت پیدا ہو گئی۔ لوگ مختلف مقامات پر ان

سے متصادم ہو رہے تھے۔ 8 جون 1973ء کو میجدی نواکھلی میں راکھی باہنی اور عوام کے درمیان ایک پر تشدد تصادم ہوا۔ قصبہ کے عوام نے معصوم عوام پر جاتیو راکھی باہنی کے حملوں کے بارے میں عدالتی تحقیقات کا مطالبہ کیا۔ 9 جون کو میجدی میں مکمل ہڑتال ہوئی۔ جو احتجاج کیا گیا اس میں کوئی سیاسی عنصر شامل نہ تھا، لہٰذا وزیر داخلہ کو مجبوراً تحقیقات کے لیے میجدی جانا پڑا۔ 10 جون کو وزیر داخلہ ملک عقیل نے اعلان کیا، ''میجدی کے واقعہ میں ملوث افراد کے خلاف کارروائی کی جائے گی۔'' لیکن لوگوں کو کبھی بھی آگاہ نہ کیا گیا کہ حکومت نے کیا کارروائی کی، نہ ہی کبھی کوئی حکومتی بیان جاری ہوا۔ اسی دن مونی سنگھ نے بیت المکرم میں ایک پارٹی اجلاس میں کہا:

''امریکی سامراجیت، چین کی ماؤ نواز قیادت اور ان کے مقامی ایجنٹ نیپ بھاشانی، انتہا پسند جے ایس ڈی، مسلم لیگ اور جماعت اسلامی کے پیروکار آزادی کے خلاف سازش کر رہے ہیں۔''

اس کے بعد 19 جون 1973ء کو حکام نے اعلان کیا کہ آج کے بعد پی اے (پبلک ایڈریسنگ) کا ساز و سامان بغیر پیشگی اجازت کے کسی جلوس یا عوامی جلسے میں استعمال نہیں کیا جا سکے گا۔ اس حکومتی فرمان کا مقصد مخالف سرگرمیوں پر پابندیاں لگانا تھا۔ نیپ مظفر نے اور نہ ہی سی پی بی مونی سنگھ نے کوئی احتجاج کیا نہ ہی آواز اٹھائی بلکہ 24 جون کو مظفر احمد نے کہا: ''موجود حقائق کے پیش نظر وہ اور ان کی پارٹی سستی شہرت کی خاطر تنقید برائے تنقید پر یقین نہیں رکھتی۔'' انہوں نے ایک مرتبہ پھر مولانا بھاشانی کو سامراجیت کا ایجنٹ قرار دیا۔

مسلسل جاری ذخیرہ اندوزی، سمگلنگ اور بدعنوانیوں نے قوم کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ بے رحم استبداد اور جے آر بی کی خفیہ وحشیانہ قتل وغارت نے عوام کو خوف زدہ کر رکھا تھا۔ 27 جون 1973ء کو منصوبہ بندی کمیشن نے ایک رپورٹ شائع کی جس میں کہا گیا کہ روزمرہ کی اشیائے ضرورت کی قیمتیں 1972ء کی نسبت 400 گنا بڑھ چکی ہیں۔ اس عرصے میں چٹاگانگ میں ایک سنسنی خیز واقعہ رونما ہوا۔ جے آر بی کی ایک بس پر فائرنگ سے جس میں ایسٹرن ریفائنری کے ملازمین سوار تھے، ایک آدمی ہلاک اور دو شدید زخمی ہو گئے۔ فائرنگ کی وجہ بہت معمولی تھی۔ ریفائنری کی بس جے آر بی کی گاڑی کے آگے سے گزر گئی تھی جس میں راکھی باہنی کے افراد سوار تھے۔ انہوں نے ایک ریلوے کراسنگ پر بس کو روک لیا اور اندھا دھند فائر کھول دیا۔ اس طرح انہوں نے آزاد بنگلہ دیش کی سرزمین پر اپنی مرضی سے لوگوں کو ہلاک کرنا شروع کر دیا۔ اس وقت انتخابات کے فوراً بعد ''دَینک بنگلہ'' کے اسسٹنٹ ایڈیٹر نرمل سین نے ایک مضمون ''میں قدرتی موت کی ضمانت چاہتا ہوں'' لکھا۔ اس مضمون میں انہوں نے ایک ہفتے کے اندر قتل کی 13 سفاکانہ وارداتوں کا ذکر کیا اور لکھا: ''ان کی میڈیا میں کوئی خبر شائع نہیں ہوئی۔ ایسے واقعات کبھی بھی نیوز ڈیسک تک نہیں پہنچتے اور نہ ہی پولیس اسٹیشنوں تک پہنچ پاتے ہیں۔ دور دراز کے علاقوں سے کون اور کس طرح اطلاع دے گا؟ اس کے علاوہ اعلیٰ سیاسی شخصیات کی فون کالوں اور دباؤ کے نتیجے میں ملزموں کی نشاندہی کرنے والے کی زندگی بھی ہمیشہ خطرے میں ہوتی ہے۔ یہ بات کس حد تک درست ہے؟ یہ بااثر لوگ کون ہیں جو فون کرتے ہیں؟''

انہوں نے مزید لکھا: ''اس بات کا پتا لگانے کی ضرورت ہے کہ کن لوگوں کے سائے میں یہ مجرم

پروان چڑھے ہیں؟ یہ ایک عجیب بات ہے کہ اخبارات میں اس قسم کے بہت سے واقعات شائع ہوتے ہیں لیکن لوگ کبھی بھی مجرموں کو ملنے والی سزاؤں کے بارے میں نہیں سنتے۔'' یہ صرف نرمل سین کے سوالات ہی نہیں تھے، پوری قوم ایسے ہی سوالات کر رہی تھی۔ حکومت کے پاس ان کا کوئی جواب نہ تھا۔ ایسٹرن ریفائنری کی بس پر اندھا دھند فائرنگ کی واردات میں راکھی باہنی کے کسی ایک فرد کو بھی پکڑا نہیں گیا۔ اس کے برعکس صدارتی فرمان 50 کے تحت انہیں مزید اختیارات دے دیئے گئے۔ اس فرمان کے تحت جے آر بی کے ڈپٹی لیڈر کے عہدے سے اوپر کے کسی بھی افسر کو اختیار دے دیا گیا تھا کہ وہ کسی بھی شخص کو محض شک کی بنا پر بغیر کسی وارنٹ کے گرفتار کر سکتا ہے۔

20 جولائی 1973ء کو بھاشانی نیپ کے ڈاکٹر عالم الرازی نے حکومت پر زور دیا کہ اس ڈریکولائی فرمان 50 کو فوری طور پر منسوخ کیا جائے۔ انہوں نے کہا کہ اس فرمان کے تحت حزب مخالف کے ارکان کو بلاوجہ گرفتار کیا جا رہا ہے۔ 15 اگست 1973 کو ''بنگلہ دیش فیڈرل جرنلسٹ یونین'' کے صدر نے اس فرمان کی شدید مذمت کی۔ حتیٰ کہ اتفاق گروپ کے بورڈ آف ایڈیٹرز کے چیئرمین اور عوامی لیگ کے ایک منتخب رکن بیرسٹر معین الحسین نے بھی 18 اکتوبر 1973ء کو ایک پریس کانفرنس میں صدارتی فرمان 50 کے خلاف ایک احتجاجی بیان دیا۔ انہوں نے کہا: ''یہ فرمان گرفتاری کی اجازت دیتا ہے لیکن اس میں ضمانت کی کوئی شق شامل نہیں۔ لہٰذا لوگ قانون کی حکمرانی سے انکاری ہو رہے ہیں اور بہت سے لوگ مجرمانہ سرگرمیوں کی جانب لوٹ رہے ہیں۔'' انہوں نے مزید کہا کہ اس فرمان کو بددیانتی سے استعمال کیا جا رہا ہے۔ انہوں نے اس فرمان کو منسوخ کرنے کا مطالبہ کیا۔ لیکن مظفر احمد اور ان کی نیپ اور مونی سنگھ اور ان کی سی پی بی کا رویہ انتہائی حیران کن تھا۔ انہوں نے اس بارے میں ایک لفظ بھی نہ کہا۔ اس قسم کے کالے قوانین، قیمتوں میں ہوش ربا اضافے اور ظلم و استبداد کے خلاف 29 اگست کو مولانا بھاشانی نے ہڑتال کی اپیل کی۔ عقیل احمد اور عبدالرزاق نے اس ہڑتال کے خلاف مہم کا آغاز کر دیا۔ سہ جماعتی اتحاد کے ایک جلسے میں ہڑتال کے بارے میں ایک سخت رویہ اپنایا گیا۔ پنچ بھٹہ چاریہ نے کہا: ''نیپ بھاشانی اور جے ایس ڈی بنگلہ دیش کو امریکی تسلط کے تحت لانا چاہتے ہیں۔'' حکومت اور اس حواریوں کی تمام تر کوششوں کے باوجود ہڑتال کامیاب رہی۔ اتحاد کے مسلح کارکنوں نے مختلف مقامات پر ہڑتال کے خلاف لوگوں کو باہر لانے کی کوشش کی۔ دوسرے دن کچھ اخبارات نے رپورٹیں شائع کیں۔ اس طریقے سے جمہوریت کو لحظہ بہ لحظہ دفن کرنے کا عمل جاری تھا۔

94۔ ڈریکولائی ''سپیشل پاور ایکٹ''

15 ستمبر 1973ء کو پارلیمنٹ کے سرما کے اجلاس کا آغاز ہو گیا۔ 20 ستمبر 1973ء کو ایک ڈریکولائی ''سپیشل پاور ایکٹ'' پاس کیا گیا۔ اس ایکٹ کے تحت صدر کو ہنگامی حالت کے اعلان کا اختیار دے دیا گیا تھا۔ پارلیمنٹ کے تمام اپوزیشن ارکان اور آزاد ارکان احتجاج کے طور پر واک آؤٹ کر گئے۔ 29 ستمبر

1973ء کوملک عقیل نے کہا،''ہر تھانے میں فسادیوں اور بدمعاشوں کی فہرستیں تیار کی جارہی ہیں۔انہیں پورے ملک سے جڑوں سے اکھاڑ کر پھینک دیا جائے گا۔'' جب کہ پوری قوم عوامی لیگ کے کچھ ارکان سمیت کہہ رہی تھی کہ صدارتی فرمان 50 کے تحت بہت سے معصوم لوگوں کو ہراساں اور گرفتار کیا جارہا ہے۔4 اکتوبر 1973ء کو وزیرداخلہ ملک عقیل نے امن وامان کی صورتِ حال پر تبصرہ کرتے ہوئے پارلیمنٹ میں کہا:''کسی بھی شخص کو سیاسی وجوہات کی بنا پر گرفتار نہیں کیا گیا۔'' چند دن بعد 12 اکتوبر 1973ء کو مخالف سیاسی جماعتوں نے دعویٰ کیا:''جے آر بی ہر تھانے کی سطح پر مخالف سیاسی جماعتوں کے کارکنوں اور رہنماؤں کو سیاسی عتاب کا نشانہ بنانے کے لیے باقاعدہ ایک مہم چلارہی ہے۔''

14 اکتوبر 1973ء کو سہ جماعتی اتحاد کے ایک بیان میں کہا گیا:''چار ریاستی اصولوں کی بنیاد پر ملک کی تعمیر نو اور قومی خودمختاری اور آزادی کے تحفظ کے لیے فسادیوں، سمگلروں، منافع خوروں، ذخیرہ اندوزوں، اور سامراجیت کے ایجنٹوں کے خلاف جنگ کرنے اور ملک دشمن عناصر کی سرکوبی کا فیصلہ کیا گیا ہے۔'' یہ بھی کہا گیا کہ اتحاد کی مرکزی کمیٹی میں 11 ممبر عوامی لیگ سے، 5 نیپ مظفر سے اور تین سی پی بی سے شامل کیے جائیں گے۔15 اکتوبر 1973ء کو مظفر احمد نے ڈھاکہ میں بنگلہ دیش اور ہندوستان کے درمیان تعلقات کو مزید مضبوط بنانے پر زور دیا۔21 اکتوبر 1973ء کو اتحاد کی مرکزی کمیٹی تشکیل دے دی گئی۔ظل الرحمٰن کو کنوینر مقرر کیا گیا۔مظفر احمد اور مونی سنگھ ممبر بن گئے۔

95۔راکھی باہنی کا اخلاق سوز ظلم وستم اور ہٹلر کی''براؤن شرٹس''

18 اکتوبر 1973ء کو جاتیو لیگ کے سربراہ عطاالرحمٰن نے ایک بیان میں کہا کہ''پولیس اور جے آر بی مخالف جماعتوں کے ارکان کو فسادی قرار دیتے ہوئے گرفتار کررہی ہیں اور سزائیں دے رہی ہیں۔حکومت بھی اپنے جماعتی کارکنوں اور اپنے سے وابستہ دوسری تنظیموں کے کارکنوں کو مسلح کررہی ہے۔یہ قدم بہت خطرناک ہے۔یہ ملک کو تباہی کی جانب دھکیل دے گا۔''

جاتیو سماج تنترک دَل (جے ایس ڈی) نے 21 اکتوبر 1973ء کو ایک اخباری بیان میں شکایت کی کہ جے آر بی راج باڑی ضلع میں ان کے پارٹی سیکریٹری کو گرفتار کرکے غیر انسانی مار پیٹ اور تشدد کا نشانہ بناتے ہوئے بے ہوش کردیا۔24 اکتوبر کو اس نے دعویٰ کیا کہ جے آر بی نے ان کے بھاگ ماڑی کے ایک رہنما کو قتل کردیا ہے۔اتحاد میں شامل مظفر احمد نے بھی اسی قسم کے بیانات دیئے۔16 اکتوبر 1973ء کو پبنہ کی ضلعی کمیٹی نے نیپ کے مقامی سیکریٹری کی گرفتاری پر ایک پُرزور مذمتی بیان جاری کیا۔2 اکتوبر 1973ء کو نیپ کے جنرل سیکریٹری پنچ بھٹہ چاریہ نے شکایت کی:''راکھی باہنی ہمارے پارٹی کارکنوں کو ایسے تشدد، ہلاکتوں، گرفتاریوں اور دھمکیوں کا نشانہ بنارہی ہے جس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔'' یکم نومبر 1973ء کو جے بی آر نے شنان گنج سب ڈویژن میں نیپ کے رہنما بینکو داس کو انتہائی سفاکانہ طور پر قتل کردیا۔نیپ کے کارکنان پر

انتہائی بے رحمی کے ساتھ تشدد کیا گیا۔ 31 اکتوبر 1973ء کو جے آر بی نے نٹور سے نیپ کے ایک کارکن کو اغوا کر لیا۔ انہوں نے متنبہ کیا، ''نیپ کے کارکنوں کو اس قسم کی کارروائیوں کا نشانہ بنانا محض سوشلزم کے دشمنوں کو مضبوط کرے گا۔''

25 اکتوبر 1973ء کو وزیر داخلہ ملک عقیل نے اعلان کیا: ''ایک دیہی دفاعی فورس تشکیل دینے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ اس فوج کے ہر ممبر کو ایک بندوق مہیا کی جائے گی۔ جب ہتھیار استعمال میں نہیں ہوں گے تو انہیں مقامی تھانے میں رکھا جائے گا۔ ادسی کو مقامی ممبران اسمبلی اور دوسرے اہم اور بااثر افراد کے ساتھ مشورہ کر کے اس فوج کے قیام کے لیے ہدایات دے دی گئی ہیں۔'' 29 نومبر 1973ء کو ہتھیاروں کے سلسلے میں ایک حکومتی حکم نامے کے تحت کہا گیا کہ صدر، وزیر اعظم، سپریم کورٹ کا چیف جسٹس، چیف الیکشن کمشنر، وزرائے مملکت، نائب وزرا اور پارلیمنٹ کے ارکان کسی بھی صلاحیت کا ہتھیار بغیر لائسنس کے رکھ سکتے ہیں۔ اس قسم کے حکم کے جواز سے قطع نظر، یہ ملک میں موجود اس وقت کی امن وامان کی صورتِ حال کی بھی غمازی کرتا ہے۔

12 نومبر 1973ء کو بنگلہ دیش کمیونسٹ پارٹی (مونی سنگھ) کی کانگرس میٹنگ کا افتتاح خود شیخ مجیب الرحمٰن نے کیا اور کہا، ''اگر ہم کامیابی سے لڑ سکتے ہیں، دشمن (بھاشانی نیپ اور جے ایس ڈی) کو پہچان سکتے ہیں، تو یہ ملک میں انقلاب کو منظم کرنے کی جانب ایک بڑا اقدم ہوگا۔ اب یہ ہماری ایک تاریخی ذمہ داری ہے۔'' 7 دسمبر 1973ء کو اتحاد کے ایک مشترکہ بیان میں کہا گیا: ''تمام عوام دشمن اور ملک دشمن عناصر کا قلع قمع کرتے ہوئے سوشلزم کی جانب راستہ صاف ہوگا۔ حکومتی پالیسیوں کا نفاذ ہر محبِ وطن کا مقدس فرض ہے۔''

اس دوران امن وامان کی صورت حال مزید بگڑ چکی تھی۔ انتظامیہ کی بدعنوانیوں کی رپورٹیں ہر روز اخبارات میں شائع ہو رہی تھیں۔ بلا روک ٹوک لوٹ مار اور غارت گری کے خلاف لوگ احتجاج کر رہے تھے۔ آسمان کو چھوتی ہوئی قیمتیں عوام کی پہنچ سے دُور ہو رہی تھیں۔ ہر جگہ لاقانونیت کا راج نظر آتا تھا۔ اس قسم کی انارکی پرمبنی صورت حال میں ڈھاکہ میں بینک لوٹنے کی ایک سنسنی خیز کوشش کی گئی۔ ایک ڈرامائی تعاقب اور گولیوں کے تبادلے کے بعد چھ مجرموں کو گرفتار کر لیا گیا۔ ان میں سے ایک وزیر اعظم کا سب سے بڑا بیٹا شیخ کمال بھی تھا۔ ان میں سے کچھ مجرم زخمی بھی ہوئے تھے۔ تاہم پولیس نے بعد میں ایک بیان جاری کیا: ''جب مجرموں کا تعاقب کیا جا رہا تھا تو کمال اور دوسرے چند لوگ بھی زخمی ہو گئے۔'' 12 دسمبر 1973ء کو حکومت نے ریلوے، جیوٹ ملوں، بجلی پیدا کرنے والے شعبے، بی آر ٹی سی، صحت عامہ کے محکموں دریائی مواصلات اور حمل ونقل کے شعبے میں ہڑتالوں پر پابندی لگا دی۔ اس دَور میں پٹ سن کے گوداموں میں آتش زدگی کے واقعات عام ہو گئے تھے۔ کروڑوں روپے کی پٹ سن سازش کے تحت جلا دی جاتی۔ سرامک لیگ کے صدر اور عوامی لیگ کے ایم پی اے منان نے کہا، ''مالکان سوشلزم کو ناکام بنانے کے لیے پٹ سن جلا رہے ہیں۔''

ان حالات میں 24 دسمبر 1972ء کو صدر جسٹس ابوسید چوہدری کو صدارت چھوڑنا پڑی۔ انہیں استعفیٰ پیش کرنے کو کہا گیا جو قانون کے مطابق سپیکر کی بجائے خود وزیر اعظم کو پیش کیا گیا۔ اپنے استعفیٰ میں

انہوں نے تحریر کیا، ''آپ کے ساتھ بات چیت کرنے کے بعد اور انتہائی اہم قومی مفادات کے پیش نظر میں جمہوریہ کے صدر کے عہدے سے استعفیٰ پیش کرتا ہوں۔'' ان کی جگہ محمود اللہ سپیکر نے سنبھال لی۔ 1973ء کے اختتام پر اس وقت کے وزیر داخلہ نے کمالا پور میں ایک جلسے سے خطاب کرتے ہوئے کہا، ''امن و امان کو یقینی بنانے کے لیے اگر ضروری محسوس کیا گیا تو عوامی سپچھا سیوک باہنی کو مسلح کیا جائے گا۔'' عوام نہیں جانتے کہ اس طرح کتنے ہتھیار تقسیم کیے گئے۔ تاہم ان سرکاری اور غیر سرکاری لیٹروں کے ہاتھوں ہزاروں افراد موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔

بکسال کا منصوبہ 1973ء میں تیار کیا گیا تھا۔ 1974ء میں اس کے قیام کے لیے بڑے پیمانے پر تیاریاں شروع کر دی گئیں۔ 13 جنوری 1974ء کو جے ایس ڈی نے 20 جنوری 1974ء کو پلٹن میدان میں ایک عوامی جلسے کے انعقاد کا اعلان کیا۔ اس جلسے کو ناکام بنانے کے لیے عوامی لیگ نے بھی اُسی دن اور اُسی جگہ پر جلسے کا اعلان کر دیا۔ اس سے ایک شدید تناؤ کی صورتِ حال پیدا ہوگئی۔ کسی قسم کے ناخوشگوار حادثے سے بچنے کے لیے ڈھاکہ کے ایڈیشنل ڈپٹی مجسٹریٹ نے ڈھاکہ اور نارائن گنج کے علاقوں میں 14 جنوری سے 3 فروری تک دفعہ 144 کا نفاذ کر دیا، جسے بعد میں تاحکم ثانی مزید توسیع دے دی گئی۔ 20 جنوری 1974ء کو راج شاہی کے علاقے میں بھی اسی طرح دفعہ 144 نافذ کر دی گئی۔ 14 جنوری 1974ء کو جے ایس ڈی نے دفعہ 144 کے نفاذ پر شدید تنقید کی اور فوری طور پر اس کے خاتمے کا مطالبہ کیا۔ 16 جنوری 1974ء کو جے ایس ڈی نے دفعہ 144 کو توڑتے ہوئے احتجاجی جلوس نکالا۔ پولیس نے ربڑ کی گولیاں، آنسو گیس کے بموں کا استعمال کیا اور بہت سے رہنماؤں اور کارکنوں کو گرفتار کر لیا۔

20 جنوری 1974ء کو جے ایس ڈی کی اپیل پر پورے ملک میں ہڑتال کی گئی۔ اس روز شام کو انہوں نے دارالحکومت میں ایک بہت بڑا مشعل بردار جلوس نکالا۔ اس دن صبح سے ہی جے آر بی کو پورے شہر میں متعین کر دیا گیا تھا۔ جس نے جلوس پر سنگ دلانہ حملہ کیا، لیکن حکومت نے بعد میں ایک اخباری بیان میں کہا، ''جے ایس ڈی کے جلوس کے دوران میں کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا۔'' تاہم روزنامہ اتفاق نے اس سلسلے میں خبریں اور تصاویر شائع کیں۔ روزنامہ اتفاق کے مطابق 50 سے زائد افراد زخمی ہوئے جن میں سے دو کی حالت خطرناک تھی۔ تصاویر میں نظر آ رہا تھا کہ جے آر بی کے افراد مظاہرین کا بیت المکرّم مسجد کے اندر بھی تعاقب کر رہے تھے۔ جے ایس ڈی کے دعویٰ کے مطابق اس دن اس کے ایک ہزار سے زائد کارکنوں کو گرفتار کیا گیا۔ 2 فروری 1974ء کو جے ایس ڈی کے وائس چیئرمین کو نامعلوم حملہ آوروں نے گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ اس سے پہلے 15 جنوری 1974ء کو قومی پارلیمنٹ کا اجلاس ہو چکا تھا، عبدالملک عقیل کو سپیکر مقرر کیا گیا تھا۔ اس اجلاس میں محمود اللہ کی بنگلہ دیش کے صدر کے طور پر توثیق کر دی گئی۔ 28 فروری 1974ء کو اُن کی سپیکر شپ میں پہلا بل جو پاس کیا گیا وہ ''جاتیو راکھی باہنی آرڈیننس'' تھا۔ جے آر بی کو بغیر وارنٹ کے تلاشی اور گرفتاری کے اختیارات دے دیئے گئے تھے۔ حزب مخالف کے اراکین نے احتجاج کے طور پر واک آؤٹ

کیا۔ یہ بل اس وقت کے وزیر مملکت برائے اطلاعات طاہر الدین ٹھاکر نے پیش کیا تھا۔

1973ء کے اوائل میں ہی راکھی باہنی دیہاتی علاقوں میں اپنی دہشت کا راج قائم کر چکی تھی۔ ایک زیرزمین کمیونسٹ رہنما شانتی سین کی بیوی ارونا سین نے عوامی حکومت کے دوران جاری بربریت اور ظلم و سفاکی کی شہادت ایک دستاویز کی صورت میں پیش کی تھی۔ راکھی باہنی نے فرید پور ضلع کی سب ڈویژن مداری پور کے ایک گاؤں رام رادھا پور سے ارونا سین، رانی سہنا اور حنفہ بیگم کو گرفتار کیا۔ لیکن ان پر کوئی الزام لگایا گیا تھا نہ ہی انہیں کسی عدالت کے سامنے پیش کیا گیا۔ میڈیا نے اس قسم کی غیر قانونی حراستوں کے بارے میں ایک مہم کا آغاز کر دیا تھا۔ آخر کار ایک رٹ کے نتیجے میں سپریم کورٹ نے انتظامیہ کو زیر حراست خواتین کو عدالت میں پیش کرنے کا حکم دیا۔ سپریم کورٹ کی جانب سے اس حکم پر انہیں ضمانت کے لیے عدالت میں پیش کیا گیا۔ چوں کہ حکومت ان کے خلاف کوئی الزام ثابت کرنے میں ناکام رہی تھی، اس لیے عدالت نے ان کی رہائی کا حکم جاری کر دیا۔ ارونا سین اور دیگر خواتین کے دفاعی وکیل کے طور پر بیرسٹر مودود احمد اور بیرسٹر مسٹر ضمیر الدین پیش ہوئے تھے۔

رہائی کے بعد انہوں نے پریس کانفرنس میں اپنے ایک لمبے بیان میں اس ظلم و ستم کی تفصیلات بیان کیں جس کا حراست کے دوران انہیں نشانہ بنایا گیا تھا۔ ''پچھلی 17 اسون (بنگلہ قمری سال) کو راکھی باہنی نے ہمارے گاؤں پر حملہ کیا۔ یہ درگا پوجا کا دوسرا دن تھا۔ صبح سویرے مجھے گرفتار کر لیا گیا۔ انہوں نے بہت سے نوجوان لوگوں کو گھیر کر اکٹھا کیا اور انہیں انتہائی بے دردی سے مارا پیٹا۔ کالج کے ایک طالب علم لکشمن اور مجھے نار یہ راکھی باہنی کیمپ لے جایا گیا۔ وہاں مجھ سے پوچھا گیا کہ میرا خاوند شانتی سین اور بیٹا چنچل سین کہاں ہیں؟ وہ ملک دشمن عناصر ہیں، اُن کی گرفتاری میں مدد کرو۔ سارے دن کی تفتیش کے بعد شام کو مجھے چھوڑ دیا گیا۔ لکشمن کو رات وہیں رکھا گیا اور اگلے دن چھوڑا گیا۔ جب وہ گھر پہنچا تو میں نے اسے خوف ناک حد تک بُری حالت میں پایا۔ شدید تشدد اور مار کٹائی کی وجہ سے وہ بہت کمزور نظر آ رہا تھا۔ اس کے سارے بدن پر زخموں کے نشانات تھے۔ چار پانچ دن کے بعد انہوں نے پھر ہمارے گاؤں کو گھیرے میں لے لیا اور گھر گھر تلاشی کا عمل شروع کر دیا۔ بہت سے لوگوں کو مارا پیٹا گیا۔ دونو جوانوں کرشنا اور فضلو کو بہت بے رحمی سے غیر انسانی انداز میں مارا پیٹا گیا اور ساتھ لے گئے۔ وہ ابھی تک گھروں میں واپس نہیں آئے۔ جب ان کے خاندان کے افراد راکھی باہنی کے کیمپ میں گئے اور ان کے بارے میں پوچھا تو انہیں بتایا گیا کہ وہ وہاں نہیں ہیں۔ زیادہ امکان یہ ہے کہ انہیں مار دیا گیا ہے۔ اس کے بعد وہ اکثر نوجوان لوگوں کو تلاش کرنے گاؤں کے چکر لگاتے رہتے تھے۔ 3 فروری 1974ء کو جے آر بی دوبارہ آئی اور رات کے وقت پورے گاؤں کو گھیرے میں لے لیا۔ مجھے گرفتار کر لیا گیا اور صبح کے وقت دریا کے کنارے لے جایا گیا۔ میں نے وہاں گاؤں کے تقریباً تمام صحت مند افراد کو دیکھا، حتیٰ کہ لڑکوں کو بھی وہاں پہنچا دیا گیا تھا۔ عوامی لیگ کا تھانہ سیکریٹری حسین خان ہر چیز کی نگرانی کر رہا تھا۔ راکھی باہنی نے میرے سامنے ان تمام کو مارنا پیٹنا شروع کر دیا۔ بعض کے ساتھ وہ فحش

طریقے استعمال کر رہے تھے۔ مجھے معلوم ہوا کہ مردوں کو گرفتار کرتے ہوئے انہوں نے خواتین کو بھی مارا پیٹا تھا۔انہوں نے ان کے ساتھ بدسلوکی بھی کی۔ مجھے راکھی باہنی کے کمانڈر نے پانی میں اترنے کو کہا۔ مجھے وہاں گولی ماری جانی تھی۔ میں خود ہی خاموشی سے پانی میں اتر گئی۔ انہوں نے اپنی بندوقیں اٹھائیں اور گولی چلانے کے لیے میرا نشانہ لیا۔لیکن بعض وجوہات کی بنا پر فائر نہ کیا۔ مجھے پانی میں ہی کھڑا رہنے دیا گیا۔کمانڈر نے گرفتار شدہ افراد کو علیحدہ علیحدہ قطاریں بنانے کو کہا، مسلمان ایک طرف اور ہندو دوسری طرف۔اس نے مسلمانوں کو لیکچر دیا، ''ملعون ہمارے دشمن ہیں۔ان کو بخشا نہیں جائے گا۔تم مسلمانوں کو ملعونوں کے ساتھ دوستی نہیں رکھنی چاہیے۔اس مرتبہ تم سب کو معاف کر دیا گیا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے کمانڈر نے انہیں مارنا شروع کر دیا اور انہیں اپنی جانیں بچا کر بھاگ جانے کو کہا۔تمام لوگوں کو جانے دیا گیا لیکن دو نوجوان آدمیوں مصطفےٰ اور کلیم الدین کو رِہا نہ کیا گیا۔اس قسم کے مناظر نے مجھے پاک فوج کی یاد دلا دی۔ انہوں نے لوگوں کو تقسیم کرنے کے لیے فرقہ وارانہ جذبات کو بھی استعمال کیا۔فرق صرف یہ تھا کہ وہ مذہب کے نام پر فرقہ واریت کا استعمال کرتے تھے، یہ لوگ بے شرمی کے ساتھ وہی کام جعلی سیکولرازم کے نام پر کر رہے تھے۔آخر میں انہوں نے مجھے چھوڑ دیا اور کلیم الدین اور مصطفےٰ کے ساتھ تمام ہندوؤں کو راکھی باہنی کے کیمپ میں لے گئے۔سوائے تین افراد کے تمام غریب ماہی گیر تھے۔وہ دریا سے مچھلیاں پکڑ کر بمشکل اپنی زندگیاں بسر کر رہے تھے۔ان کے خاندان کے افراد ان کی رہائی کے لیے چیختے اور چلاتے رہے۔یہ ایک انتہائی دل گداز منظر تھا۔شام کو کلیم الدین، مصطفےٰ، گوبندہ ناگ اور ہری پدو گھوش کے علاوہ تمام لوگ کسی نہ کسی طرح واپس آ گئے۔ میں انہیں دیکھنے گئی اور ان میں سے اکثر کو چلنے پھرنے سے بھی لاچار پایا۔ان کے جسم سوجے ہوئے تھے اور زخموں کے نشانات سے بھرے ہوئے تھے۔انہوں نے بتایا کہ انہیں سارا دن تشدد کا نشانہ بنایا جاتا رہا تھا۔ان کی گردنیں ٹانگوں کے ساتھ باندھ کر گاہے بہ گاہے پانی میں پھینک دیا جاتا تھا۔ان کے جسموں پر لوگوں کو کھڑا کیا گیا۔ان میں سے اکثر کو اٹھا کر لانا پڑا تھا۔ میں یہ سب کچھ دیکھ کر بہت دُکھی ہوئی۔ میں حیران تھی کہ کس طرح کوئی شخص ان لوگوں کو جن کو دو وقت کی روٹی بہ مشکل نصیب ہوتی ہے، اس قسم کے تشدد کا نشانہ بنا سکتا ہے۔یہ وحشیانہ ظلم و استبداد کب بند ہو گا۔حکومت کو لوگوں پر اس قسم کا تشدد کرنے کا کیا حق حاصل ہے جب کہ وہ انہیں خوراک اور لباس تک مہیا نہیں کر سکتی اور نہ ہی ڈکیتیوں، چوریوں، لوٹ مار اور استحصال پر قابو پا سکتی ہے۔

آخر کار میں بھی ان کے وحشیانہ پن کا شکار ہو گئی۔6 فروری 1974ء کو راکھی باہنی نے میرے گھر پر چھاپا مارا اور مجھے صبح سویرے نیند کی حالت میں اٹھایا گیا۔وہ مجھے کمرے سے باہر صحن میں لے آئے جہاں میں نے رانی کو بھی کھڑے پایا۔وہ ہمیں بھید ورگنج راکھی باہنی کیمپ میں لے گئے، جو دو میل کی مسافت پر تھا۔راستے میں وہ رانی پر فحش فقرے کستے رہے۔ میں نے کیمپ میں کلیم الدین، مصطفےٰ، گوبندہ ناگ اور ہری پدو گھوش کو دیکھا، مجھے نظر آ رہا تھا کہ انہیں بدترین تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا۔خاص طور پر کلیم الدین اور مصطفےٰ کی حالت بہت زیادہ خراب تھی۔کلیم الدین اور مصطفےٰ بھائی تھے اور ان کے خاندان میں کوئی دوسرا کمانے والا موجود نہ

تھا۔ وہ کھیت مزدور تھے اور دونوں شادی شدہ تھے اور ان کے چھوٹے چھوٹے بچے تھے۔

جیسے ہی ہم کیمپ میں داخل ہوئے، راکھی باہنی کے سپاہی ہمارے گرد جمع ہو گئے۔ کچھ گندے فقرے کس رہے تھے اور کچھ ہمارے بال کھینچ رہے تھے۔ کچھ ہمیں تھپڑ مار رہے تھے اور کچھ ڈنڈوں سے ہمیں کچوکے لگا رہے تھے۔ کچھ دیر یہ کارروائی جاری رہی، پھر ہمیں باہر کھلی جگہ پر تپتے ہوئے سورج کے نیچے چھوڑ دیا گیا۔ جب رات ہوگئی تو ہمیں کمرے میں لے جایا گیا، بعد میں وہ رانی کو اوپر والی منزل میں لے گئے۔ تھوڑی دیر بعد مجھے اس کی تکلیف دہ چیخوں کی آواز سنائی دینے لگی۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد اس نے چیخنا بند کر دیا۔ میں صرف ڈنڈوں اور کراہنے کی آوازیں سن سکتی تھی۔ جب اسے میرے کمرے میں واپس لایا گیا (اس لمحے مجھے وقت کا اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا) تو وہ بے ہوش تھی اور اس کے جسم سے خون بہ رہا تھا۔ ہوش میں آنے پر اس نے پانی مانگا۔ میں نے اسے تھوڑا سا پانی پینے میں اس کی مدد کی، اور پھر اس نے بہت آہستہ آہستہ باتیں کرنا شروع کر دیں۔ اس وقت سپیدہ سحر نمودار ہو رہا تھا۔ مجھے رانی سے معلوم ہوا کہ دموڈیا اور بھید ورگنج عوامی لیگ کے دونوں سیکریٹری اور راکھی باہنی کے کیمپ کمانڈرز اوپر موجود تھے۔ وہ شانتی سین اور چنچل کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ انہوں نے یہ بھی پوچھا کہ ہتھیار کہاں چھپا رکھے ہیں؟ جب اس نے کہا کہ اسے کچھ معلوم نہیں تو انہوں نے اسے ایسی گندی گالیاں دینا شروع کر دیں جن کی کسی ہوش مند آدمی سے توقع نہیں کی جا سکتی۔ کچھ دیر بعد جب وہ اس سے کچھ اگلوا نہ سکے تو بھید ورگنج کا کمانڈر ڈنڈا لے کر اس پر پل پڑا اور مارنا شروع کر دیا۔ اس نے اس پر تین بید توڑ ڈالے۔ انہوں نے دوبارہ پھر پوچھا کہ شانتی اور چنچل کہاں ہیں؟ رانی کا وہی جواب تھا، وہ بہت برہم ہو گئے اور اسے چھت کے ساتھ باندھ کر دوبارہ ڈنڈوں سے مارنا شروع کر دیا۔ وہ یہ سب کچھ برداشت نہیں کر پا رہی تھی، اس نے کہا کہ ''مجھے اس طرح نہ مارو بلکہ گولی مار کر ختم کر دو۔'' جس پر ان میں سے ایک نے جواب دیا، ''تمہیں پتا ہے کہ ایک گولی کی کتنی قیمت ہوتی ہے۔ ہم تم پر گولی ضائع نہیں کریں گے۔ ہم سات دن کے اندر اندر تمہیں مار مار کر ہلاک کر دیں گے۔ اتنی جلدی کیا ہے؟'' رانی ناقابل برداشت درد کی وجہ سے بے ہوش ہوگئی۔ جب اسے دوبارہ ہوش آیا تو اس نے اپنے آپ کو فرش پر لیٹے ہوئے پایا۔ اس نے پینے کے لیے پانی مانگا تو انہوں نے انکار کر دیا۔ پھر انہوں نے اسے دوبارہ مارنا پیٹنا شروع کر دیا اور وہ دوبارہ بے ہوش ہوگئی تو اسے اٹھا کر نیچے لے آئے۔

8 فروری 1974ء کو پہلے مجھے پھر رانی کو اوپر لے جایا گیا۔ عوامی لیگ دموڈیا کا سیکریٹری فضلو میاں اور بھید ورگنج کا سیکریٹری حسین خان بھی وہاں موجود تھے۔ وہ کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے مجھے کہا، ''اپنے خاوند اور بیٹے کو گرفتار کروا دو، انہوں نے اسلحہ کہاں چھپا کر رکھا ہوا ہے؟ وہ ڈاکو ہیں اور یہ اسلحہ ڈکیتیوں کے لیے استعمال کرتے ہیں۔'' میں نے جواب دیا، ''وہ ڈاکو نہیں ہیں۔ وہ دیانت دار، مخلص محب وطن ہیں۔ میرا خاوند ایک سیاستدان ہے، کون نہیں جانتا؟ عوام اس کی عزت کرتے ہیں اور اس سے پیار کرتے ہیں۔'' رانی سے بھی یہی سوال پوچھے گئے۔ جب اس نے کہا کہ وہ ان کے بارے میں اور ہتھیاروں کے بارے میں

کچھ بھی نہیں جانتی تو وہ برہم ہو گئے۔ دموڑیا کیمپ کے جے آر بی کمانڈر کریم علی اور بھیدور گنج کے کمانڈر فضل الرحمٰن دونوں نے ہمیں گالیاں دینا شروع کر دیں۔ انہوں نے ہم دونوں کو چھت سے الٹا لٹکا دیا۔ انہوں نے رانی کے کپڑے اتار دیئے اور ہمیں دونوں جانب سے مارنا شروع کر دیا۔ ہم دونوں بے ہوش ہو گئیں۔ جب ہم دوبارہ ہوش میں آئیں تو ہم نے اپنے آپ کو فرش پر لیٹے ہوئے پایا۔ رانی کے جسم کے ہر حصے سے خون بہ رہا تھا کیوں کہ میرے کپڑے اتارے نہیں گئے تھے اس لیے میرے زخم قدرے کم نوعیت کے تھے۔ ہمیں شدید قسم کی دردیں ہو رہی تھیں اور پیاس لگ رہی تھی۔ ہم میں ہلنے جلنے کی طاقت بھی نہیں رہ گئی تھی۔ وہ شیطانی مسکراہٹوں کے ساتھ ہمیں دیکھ کر لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ان کے حکم پر دو سپاہیوں نے مجھے کھینچ کر اوپر اٹھایا کیوں کہ میں بہ مشکل کھڑی ہو پا رہی تھی۔ رانی سے کھڑا ابھی نہیں ہوا جا رہا تھا۔ دو راکھیوں نے اسے اٹھایا اور اس کے عریاں جسم کے گرد اس کے کپڑے لپیٹ دیئے۔ پھر ہمیں کھینچ کر نیچے لے جایا گیا۔ ایک کمانڈر نے پیچھے سے چلا کر کہا، ''اسے ٹھیک طور پر چلاؤ ورنہ یہ مر جائے گی۔'' دوسرے روز کمانڈر کچھ سپاہیوں کے ساتھ آیا وہ رانی کو لے کر گاڑی کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس نے کہا، ''کیوں کہ اب تم زیادہ دیر زندہ نہیں رہ سکو گی لہٰذا آؤ تمہیں تمہاری ماں سے ملا کر لاتے ہیں۔'' رانی کا سارا جسم کالے اور نیلے دھبوں کے ساتھ سوج چکا تھا۔ وہ ایک قدم اٹھانے کی سکت بھی نہیں رکھتی تھی۔ اسے اسی حالت میں راکھی باہنی دو میل تک کھینچ کر گاؤں لے گئے۔ رانی کی ماں اپنی بیٹی کی حالت دیکھ کر بے ہوش ہو گئی۔ جے آر بی کمانڈر نے رانی کی ماں کے سر پر پانی ڈالنے کو کہا۔ ہوش میں آنے کے بعد اس نے رانی سے پوچھا، ''تمہیں کیا ہوا ہے؟'' کمانڈر نے جواب دیا، ''کچھ نہیں وہ محض پھسل گئی تھی اور گر گئی تھی۔'' ماں نے کمانڈر سے التجا کی کہ اسے چھوڑ دیا جائے۔ جواب میں کمانڈر نے کہا، ''اگر تم ہمارے لیے مزے دار دعوت کرو تو ہم اسے چھوڑ دیں گے۔'' اس کے بعد اسے دوبارہ دو میل گھسیٹ کر واپس کیمپ میں لایا گیا۔

9 فروری 1974ء کو رام بہادراپور کے ایک نوجوان کسان کریم کو بھی گرفتار کر کے یہاں لایا گیا۔ اسے بُری طرح مارا پیٹا گیا تھا اور اس کی حالت بہت نازک تھی۔ ناریا سے ایک سکول کے استاد اور دو طالب علموں کو بھی لایا گیا تھا۔ ایک نوجوان لڑکا جس کا نام بہلوب تھا، بے رحمانہ تشدد کی وجہ سے راستے میں ہی مر گیا تھا۔ میں نے یہ معلومات راکھیوں کی گفتگو سے اکٹھا کی تھیں۔ ایک وحشی نے فخریہ انداز میں کہا، ''دیکھو! میرے ہاتھوں پر ابھی تک داغ موجود ہیں۔'' راکھیوں نے ایک دوسرے لڑکے موتی کو بھی مار مار کر ہلاک کر دیا۔ ہماری گرفتاری سے دو دن پہلے کرشی بینک کے ایک چپڑاسی کو پہلے مارا پیٹا گیا اور پھر اسے باندھ کر چھت سے نیچے پھینک کر ہلاک کر دیا گیا۔

اسی دن سہ پہر کو انہوں نے مجھے، رانی اور حلقہ کو لیا اور تالاب کے کنارے لے گئے۔ ہمیں پہلے مارا پیٹا گیا اور پھر پانی میں گھسنے کو کہا گیا۔ انہوں نے ہمیں تیرنے کا حکم دیا۔ جب ہم تھک گئیں اور مزید تیرنے کی ہمت نہ رہی تو ہمیں کھینچ کر باہر نکالا گیا اور دوبارہ مارا پیٹا گیا۔ اس دوران کریم مر چکا تھا۔ ایک نوجوان

لڑکے کو اتنی دیر پانی میں ڈبوئے رکھا گیا کہ وہ بے ہوش ہو گیا، پھر اسے باہر کھینچ کر تالاب کے کنارے پر چھوڑ دیا گیا۔ میں نے اسے اپنے کپڑوں سے خشک کرنے کی کوشش کی۔ اس نے اپنی آنکھیں کھولیں اور کہا، ''ماں! آپ کون ہیں؟'' راکھی اسے چھین کر لے گئے اور بعد میں وہ لڑکا بھی مر گیا۔

شام کو ہمیں کیمپ میں واپس لایا گیا اور ہمیں گیلے کپڑوں میں ہی رکھا گیا۔ ہم سب سردی سے کانپ رہی تھیں اور ہمیں بخار ہو گیا۔ ہمیں اس حالت میں ساری رات باہر کھلی جگہ پر رکھا گیا۔ اگلے دن رات کو رانی کو پھر اوپر لے جایا گیا۔ وہی خوف ناک تشدد ایک مرتبہ پھر شروع کر دیا گیا۔ تھوڑی دیر بعد ہم نے کچھ راکھیوں کو کہتے سنا، ''رانی مر گئی ہے۔'' تاہم ایک ڈاکٹر کو بلایا گیا اور رانی کی جان بچ گئی۔ راکھیوں نے ایک مرتبہ پھر رانی اور حنفہ سے کہا کہ ''تم دونوں کو مار دیا جائے گا۔ لیکن اس سے پہلے ہر رات تم سے پانچ مرد لطف اندوز ہوا کریں گے۔'' لیکن میں نے چند راکھیوں میں انسانی پہلو بھی دیکھے۔ ایک مرتبہ میں نے اُن میں سے ایک سے پوچھا، ''تم کتنا پڑھے ہوئے ہو؟'' اس نے جواب دیا، ''بنگلہ دیش میں تم پڑھ کر کیا کرلو گے؟ ہم وحشی ہیں۔ وحشیوں کے لیے پڑھائی کیا معنی رکھتی ہے؟'' وہ بھاگ گیا۔ ہمیں ان کی باتوں سے پتا چلا کہ حنفہ اور مجھے کہیں اور لے جایا جا رہا تھا۔ لیکن ہم رانی کو پیچھے چھوڑ کر نہیں جانا چاہتی تھیں۔ ہم نے احتجاج کیا اور مطالبہ کیا کہ ہم رانی کے بغیر کہیں نہیں جائیں گی۔ ہمارے اصرار پر کیمپ کمانڈر نے دوسرے لوگوں کے ساتھ مشورہ کرنے کے بعد ہمیں کہیں بھیجنے کا فیصلہ واپس لے لیا۔ 19 فروری 1974ء کو آدھی رات کو وہ ہم تینوں کو لے کر کسی نامعلوم منزل کی جانب روانہ ہو گئے۔ سمت راکھی باہنی کے دموڈیا کیمپ کی جانب تھی۔ کلیم الدین، مصطفیٰ اور گووندہ کو وہیں چھوڑ دیا گیا۔ ہمارے ساتھی لوگوں نے ہمیں بتایا کہ انہیں مار ڈالا جائے گا۔ جیسے ہی ہم روانہ ہوئے ہم نے فائر کی آواز سنی، شاید انہیں ہلاک کر دیا گیا تھا۔ ہم سب بہت غمگین ہو گئیں۔

ہمارے لیے چلنا بھی دشوار ہو رہا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ اپنے نئے ٹھکانے پر ہم محفوظ ہوں۔ یہ امید ہمیں چلائے جا رہی تھی۔ ہم بہت رات گئے دموڈیا کے راکھی کیمپ میں پہنچے۔ کچھ دیر بعد ہماری آنکھوں پر پٹیاں باندھ دی گئیں اور ایک تیز رفتار کشتی میں سوار کر دیا گیا۔ ہمیں کشتی میں اسی حالت میں رکھا گیا اور اگلے دن تک ہمیں کھانے پینے کے لیے کچھ نہ دیا گیا۔ دن کے وقت کمبل کے نیچے گرمی کی وجہ سے ہمارے لیے سانس لینا بھی دوبھر ہو رہا تھا۔ رات کو ہمیں ایک جیپ میں بٹھا کر ڈھاکہ کی جانب روانہ کر دیا گیا۔ سارے سفر میں ہمیں اسی حالت میں رکھا گیا۔ سب سے پہلے ہمیں جے آر بی ہیڈ کوارٹر میں جے آر بی کے ڈائریکٹر کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس نے اپنے پند و نصائح اور گالیوں کے ساتھ ہمارا استقبال کیا۔ وہاں سے ہمیں تیج گاؤں پولیس سٹیشن لے جایا گیا اور وہاں سے لال باغ پولیس سٹیشن پہنچا دیا گیا۔ ہم نے رات لال باغ کی حوالات میں بسر کی اور دوسرے دن ہمیں سینٹرل جیل بھیج دیا گیا۔ پانچ دن کے بعد ہمیں تیج گاؤں میں انٹیلی جنس ایجنسی کے تفتیشی سیل کے سامنے پیش کیا گیا۔ پانچ دن تک ہماری شدید تفتیش کی گئی اور پھر ہمیں واپس تیسرے درجے کے قید خانے میں بھیج دیا گیا۔

ہمیں اپنے دن اور راتیں اسی کوٹھڑی کے اندر بسر کرنا پڑتی تھیں۔ ہر روز ایک ہی قسم کا کھانا دیا جاتا تھا۔ وہاں کچھ اور بھی سیاسی قیدی تھے۔ ان میں جے ایس ڈی کی ممتاز بیگم بھی تھیں۔ وہ 17 مارچ 1974ء کو گرفتار کیے جانے والے افراد میں سے ایک تھیں۔ وہاں پروین بھی تھی جسے اسلحہ ایکٹ میں سزا دی گئی تھی اور ایک اور خاتون روما بھی تھی۔ ان سب کو تیسرے درجے کے جیل خانے میں رکھا گیا تھا۔ انہیں دوسرے عام قیدیوں کی طرح جسمانی مشقت بھی کرنا پڑتی تھی۔ اس کے علاوہ جیل دارنیاں (مقرر کی گئی قیدی عورتیں) ان سے سینے، کپڑے دھونے اور کمرے کی صفائی جیسے ذاتی کام بھی کرواتی تھیں۔ سیاسی قیدیوں کو بھی نہیں بخشا جاتا تھا۔ ان کے ساتھ بھی عام مجرموں جیسا سلوک کیا جاتا تھا۔''

عوامی لیگ کے دورِ حکومت میں ایسی اور بھی بہت سی غم ناک داستانیں تھیں۔ بہت سی کہانیاں بیان ہی نہیں کی جاسکیں اور بہت سی شائع نہ ہوسکیں۔

آیئے پبنہ ضلع میں بجت پور کے ایک گاؤں ایکوباتیا میں وقوع پذیر ہونے والے ایک دل فگار واقعے کا ذکر کرتے ہیں جس سے راکھی باہنی کی بربریت اور وحشیانہ پن کا پتا چلتا ہے۔ یہ ایک کسان عبدالعلی کے بیٹے رشید کے قتل کی داستان ہے۔ ایک اخبار میں شائع ہونے والے اس کے انٹرویو کے مطابق:

''میرے بیٹے کو میرے سامنے گولی مار کر قتل کیا گیا اور مجھے ایک کلہاڑی دی گئی اور انہوں نے مجھے اس کا سر کاٹ کر دینے کو کہا تاکہ وہ اس کے ساتھ فٹ بال کھیل سکیں۔ میں یہ کیسے کرسکتا تھا؟ میں اس کا باپ ہوں۔ لیکن میں ان کے غیر انسانی تشدد کو کتنی دیر تک برداشت کرسکتا تھا؟ ان کے تشدد کو برداشت کرنے کی مزید سکت نہ رکھتے ہوئے آخرکار میں نے اپنے ہاتھوں سے اس کا سر کاٹ کر انہیں دیا۔ انہوں نے الزام لگایا تھا کہ رشید سیاست میں ملوث ہے۔ میں اس بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔ ایک دن متو اور شاہ جہان آئے اور اسے لے گئے۔ ساری رات اسے عوامی لیگ کے دفتر میں مارا پیٹا گیا۔ دن کو انہوں نے اس کی رہائی کے لیے ایک ہزار روپے طلب کیے۔ رشید یہ رقم دینے کے لیے تیار ہوگیا۔ اس نے مجھے پیسوں کے لیے پوچھا۔ میں ایک غریب دیہاڑی دار مزدور ہوں۔ میں اتنی بڑی رقم کہاں سے لاسکتا تھا؟ میں نے اسے سلہٹ کی جانب بھاگ جانے کو کہا۔

رشید چلا گیا، لیکن تقریباً 10، 12 روز کے بعد وہ واپس آ گیا۔ اسے شدید ٹائیفائڈ بخار تھا۔ ایک دن اس کی طبیعت قدرے بہتر تھی، اس نے چاول کھانے کی خواہش کی۔ اس کی ماں نے اس کے لیے شوال مچھلی کا خاص سالن تیار کیا۔ اسی دن عوامی لیگ کے لٹیرے راکھی باہنی کے لوگوں کے ساتھ ہمارے گھر آئے۔ رشید کمزور تھا لیکن اپنی جان بچانے کے لیے کھیتوں کی جانب بھاگ گیا۔ راکھیوں نے اسے راستے میں دبوچ لیا اور پکڑ کر لے آئے۔ بے چارہ رشید عوامی لیگ کے مقامی رہنما سراج کی ٹانگوں سے لپٹ گیا اور اس سے رحم کی بھیک مانگی لیکن اس کو معاف نہ کیا گیا۔ مجھے بھی اس کے ساتھ لے گئے۔ انہوں نے ہمیں باندھ دیا اور مارنا شروع کردیا۔ تھوڑی دیر کے بعد متو نے میری آنکھوں کے سامنے میرے بیٹے رشید کو گولی مار کر ہلاک

کر دیا۔ میں گنگ ہو گیا اور انہوں نے ہنسنا شروع کر دیا۔ جب میں نے کسی کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ ''آؤ اس کا سر اتار کر فٹ بال کھیلیں''، تو اچانک میں اپنے حواس میں آ گیا۔ متو نے کہا، ''بالکل، یہ ایک اچھا خیال ہے۔ لیکن اس کا سر ہم نہیں کاٹیں گے۔ اس کا باپ ہمارے لیے یہ کام کرے گا۔'' اس نے مجھے ایک کلہاڑی دی اور رشید کا سر کاٹ کر دینے کے لیے کہا۔ مجھے اس ساری صورتِ حال پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ کوئی شخص اتنا ظالم بھی ہو سکتا ہے؟ میں نے سوچا۔ میں خاموش کھڑا تھا۔ انہوں نے دوبارہ مجھے بے رحمی کے ساتھ مارنا شروع کر دیا۔ بوڑھا آدمی ہونے کی وجہ سے میں یہ سب کچھ برداشت نہ کر سکا۔ اس دوران سراج آگے بڑھا اور اپنی بندوق مجھ پر تان کر کہنے لگا، ''تمہیں جو حکم دیا گیا ہے اس کے مطابق عمل کرو ورنہ تمہیں بھی مار دیا جائے گا۔'' آخر کار مجھے ان کے حکم کے مطابق عمل کرنا پڑا۔ وہ رشید کے سر کے ساتھ چلے گئے۔ کیا اللہ تعالیٰ ایسے عمل کو برداشت کر لے گا؟''

5 فروری 1975ء کو سپیکر عبدالملک عقیل کی زیرِ صدارت پارلیمنٹ کے اجلاس میں سپیشل پاورز ایکٹ منظور کیا گیا۔ جارحانہ گرفتاریاں، پریس پر سنسر شپ، سیاسی پارٹیوں اور تنظیموں کی تشکیل پر تحدیدات اور ایسی تنظیموں پر پابندی عائد کیے جانے کے اختیارات، سبھی کچھ اس قانون میں شامل تھا۔ حزبِ مخالف کے اراکین نے اس ایکٹ کو کالا قانون قرار دیا اور احتجاجاً پارلیمنٹ سے واک آؤٹ کیا۔ عطاء الرحمٰن خان نے کہا، ''ہمارے ملک کی تاریخ میں عوام کے لیے یہ ایک سیاہ دن اور یہ قانون ایک کالا قانون ہے۔ یہ اخبار نویسوں پر پابندیاں لگانے کا شکنجہ بھی ہے۔ لوگوں نے عوامی لیگ کو ایسے قوانین بنانے کے لیے ووٹ نہیں دیئے۔ اگر ایسا سمجھا جاتا ہے تو نئے انتخابات کروائے جائیں۔'' انہوں نے مزید کہا، ''پاکستانی دور میں خود شیخ مجیب الرحمٰن اور تاج الدین کو ریاست مخالف قرار دے کر ایسے کالے قوانین کا ہی نشانہ بنایا جاتا تھا۔ موجودہ حالات میں یکے بعد دیگرے ایسے کالے قوانین کے نفاذ کی کوشش سے عوامی لیگ کی حکومت کو آخر کار کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو گا۔''

روزمرہ کی اشیائے ضرورت کی قیمتیں ہر روز بڑھتی چلی جا رہی تھیں اور یہ مارکیٹ میں آسانی سے دستیاب بھی نہ تھیں۔ نمک جو چار آنے فی کلو تھا، 60 ٹکے فی کلو تک پہنچ گیا تھا۔ خشک مرچیں جو عام طور پر پانچ ٹکے فی کلو تھیں، وہ 8 ٹکے فی چھٹانک فروخت کی جا رہی تھیں۔ ''بہت جلد ملک میں نمک بالکل دستیاب نہیں ہو گا۔'' یہ بات ''بانگ سامتی'' کے اس وقت کے صدر کھنڈکر عبدالستار نے ایک اخباری بیان میں کہی تھی جس پر اسے 27 جولائی 1974ء کو گرفتار کر لیا گیا۔ حکومت نے نمک کے سکینڈل سے متعلق یہ بیان شائع کرنے پر روزنامہ ''پوربادیش'' کو بند کر دیا اور اس اخبار کے دو رپورٹروں کی شدید باز پرس کی گئی۔ بنگلہ دیش کی اس بدنظمی کی طرح کی مثال باقی ماندہ ہم عصر دنیا میں نہیں ملتی تھی۔

17 مارچ 1974ء کو جے ایس ڈی نے پلٹن میدان میں ایک جلسہ عام کا انعقاد کیا اور جلسے کے بعد انہوں نے حکومتی ظلم و ستم کے خلاف ایک جلوس نکالا اور وزیر داخلہ کی رہائش گاہ کا محاصرہ کر لیا۔ پولیس نے فائر

کھول دیا۔ حکومتی پریس ریلیز کے مطابق 6 افراد موقع پر ہی ہلاک ہو گئے اور 100 سے زائد زخمی ہوئے جب کہ جے ایس ڈی نے 50 سے زائد ہلاکتوں کا دعویٰ کیا۔ ان میں زخمی ہونے والوں کی زیادہ تعداد جے ایس ڈی کے سرکردہ رہنماؤں کی تھی۔ اے ایس ایم رب بھی زخمی ہوئے اور گرفتار کر لیے گئے۔ جے آر بی کی وحشیانہ فائرنگ کی خبریں دوسرے دن روزنامہ ''اتفاق'' میں شائع ہوئیں۔ حکومت نے اس روز جے ایس ڈی کے اخبار ''گانا کنتھا'' کے ایڈیٹر اور چند دوسرے افراد کو بھی نیشنل سیکیورٹی ایکٹ کے تحت گرفتار کر لیا۔ اس کے نتیجے میں دوسرے دن ''گانا کنتھا'' شائع نہ ہو سکا۔ نیپ مظفر نے جے ایس ڈی کے اس احتجاجی جلوس کو ایک بچگانہ اور غیر ذمہ دارانہ حرکت قرار دیا اور اس پر شدید تنقید کی۔ سی پی بی مونی سنگھ نے کہا، ''جے ایس ڈی ملک میں لاقانونیت پھیلانا چاہتی ہے۔'' اس نے لوگوں کو محتاط رہنے کا مشورہ دیا۔ 4 اپریل 1974ء کو عوامی لیگ اور جبو لیگ کے ایک اندرونی جھگڑے کے نتیجے میں ڈھاکہ یونیورسٹی کے محسن ہال میں سات طالب علموں کو قتل کر دیا گیا۔

96۔ ''کمیٹی برائے تحفظ بنیادی حقوق وقانونی معاونت'' کی تشکیل

ان حالات میں 31 مارچ 1974ء کو ڈھاکہ پریس کلب کے ایک اجلاس میں ''کمیٹی برائے تحفظ بنیادی حقوق وقانونی معاونت'' کی تشکیل کا فیصلہ کیا گیا۔ اس اجلاس کی صدارت ڈاکٹر احمد شریف نے کی۔ معروف شاعر ابوظفر کو اس کمیٹی کا چیئرمین مقرر کیا گیا۔ منتخب عہدیداروں میں مرزا غلام حفیظ قانونی معاملات کی سب کمیٹی کے سربراہ، ڈاکٹر احمد شریف نشر واشاعت کی سب کمیٹی کے سربراہ، ونود داس گپتا سب کمیٹی برائے اطلاعات کے سربراہ اور عبدالحق سب کمیٹی برائے قانونی معاونت کے سربراہ شامل تھے۔ دوسرے ممبران میں عنایت اللہ خان خزانچی، مودود احمد جنرل سیکریٹری اور ظفر احمد اسسٹنٹ سیکریٹری شامل تھے۔

کمیٹی 33 ارکان پر مشتمل تھی۔ اس اجلاس میں انسانی حقوق اور ملک کی موجودہ سماجی اور سیاسی صورتِ حال کے حوالے سے بعض فیصلے بھی کیے گئے۔ اس کمیٹی کے بنیادی مقصد اور اہداف کے بارے میں درج ذیل بیان میں وضاحت کی گئی تھی:

''آئین میں جمہوریت کو ایک مقدس اصول کے طور پر شامل کیا گیا ہے۔ آئین کی دفعات 31، 32 اور 33 کے تحت زندگی اور فرد کی آزادی کے تحفظ کی ضمانت دی گئی ہے۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ ہر شہری کو گرفتاری اور حراست کے خلاف اپنا قانونی دفاع کرنے کا حق حاصل ہوگا۔ ایسے قوانین کی موجودگی کے باوجود لوگوں کے ان حقوق کی بڑے پیمانے پر خلاف ورزیاں ہو رہی ہیں جیسا کہ روزانہ اخباروں میں شائع ہونے والی مختلف رپورٹوں سے یہ بات سامنے آئی ہے۔ ان رپورٹوں میں بتایا جاتا ہے کہ لوگوں کو غیر قانونی طور پر گرفتار کیا جا رہا ہے اور حراست یا قید کے دوران میں انہیں تشدد اور ہلاکتوں کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ قانون نافذ کرنے والی ایجنسیوں کے ہاتھوں بہت سے لوگوں کے لاپتہ ہونے کی اطلاعات ہیں۔ لہٰذا ذمہ دار

شہریوں کی آرا کو جو قانون کی حکمرانی پر یقین رکھتے ہیں منظم کرنے کی ضرورت ہے اور ایسا کرتے ہوئے بنیادی حقوق کی خلاف ورزیوں کو لوگوں کے علم میں لانا چاہیے۔ اس قسم کی خلاف ورزیوں کے خلاف ایک رائے تشکیل دینا ضروری ہے تا کہ آئین کے خلاف کسی بھی قسم کی ناجائز اور غیر قانونی سرگرمیوں کے خلاف مزاحمت پیدا کی جاسکے۔

اس کے ساتھ ساتھ ایک دوسری قسم کی ذمہ داری کو بھی قبول کرنا ہوگا۔ بہت سے لوگوں کو بغیر کسی مقدمے کے حراست میں رکھا جاتا ہے اور بہت سے لوگوں کو قانونی تحفظ فراہم نہیں کیا جاتا۔ ضرورت مند لوگوں کو قانونی مدد فراہم کرنے کے لیے مناسب تنظیمیں تشکیل دیئے جانے کی ضرورت ہے۔ بغیر مالی مدد کے اس قسم کی ذمہ داری نبھانا ممکن نہیں ہے۔ ان ذمہ داریوں سے نمٹنے کے لیے فنڈ قائم کرنے کے لیے اقدامات اٹھانے کی ضرورت ہے۔ کمیٹی اپنا کام صرف ڈھاکہ تک محدود نہیں رکھ سکتی۔ تمام ملک میں عوام کو قانونی تحفظ کی فراہمی کو یقینی بنانے کے لیے کمیٹی کو ضلعی سطح پر اور اس سے بھی نچلی سطح پر اپنی شاخیں قائم کرنی ہوں گی۔ یہ کمیٹی دنیا کے دوسرے ممالک میں قائم اس قسم کی تنظیموں کے ساتھ بھی تعلقات قائم کرے گی۔"

اس اجلاس میں مندرجہ ذیل قراردادیں بھی پاس کی گئیں:

1۔ ایسی اطلاعات ملتی رہتی ہیں کہ قانون نافذ کرنے والی ایجنسیاں اور انتظامیہ بڑے پیمانے پر اُن بنیادی حقوق کی خلاف ورزیاں کر رہی ہے جو آئین کی دفعات 31، 32 اور 33 کے تحت لوگوں کو عطا کیے گئے ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ بہت سے نئے قوانین کے نفاذ سے بنیادی حقوق محض کاغذی کارروائی کے طور پر باقی رہ گئے ہیں۔ کمیٹی مطالبہ کرتی ہے کہ ایسے تمام قوانین فوری طور پر ختم کیے جائیں اور بنیادی حقوق، پریس کی آزادی اور رائے کی آزادی کے راستے میں رکاوٹیں ڈالنے کے عمل کو فوری طور پر بند کیا جائے۔

2۔ "سپیشل پاورز ایکٹ" کے تحت کسی بھی شخص کو غیر معینہ مدت کے لیے حراست میں رکھنے، اخبارات کو بند کرنے اور بنیادی حقوق کی خلاف ورزیوں پر کمیٹی شدید تنقید کرتی ہے۔ کمیٹی "سپیشل پاور ایکٹ" کو ایک غیر جمہوری قانون تصور کرتی ہے جو آئین کے خلاف ہے لہٰذا اس کے فوری طور پر خاتمے کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔

3۔ ایک نئی قائم کی گئی سیاسی فوج کو "جاتیو راکھی باہنی ایکٹ" کے نفاذ کے ذریعے سونپے گئے پولیس کے اختیارات کو حکومت کے ناقدین اور مخالفین کے خلاف استعمال کیا جا رہا ہے۔ پورے ملک سے ملنے والی اطلاعات ایسی شکایات کی تصدیق کرتی ہیں۔ کمیٹی راکھی باہنی کی اس قسم کی سرگرمیوں، استبداد اور تشدد کی پرزور مذمت کرتی ہے اور راکھی باہنی ایکٹ کے خاتمے کا مطالبہ کرتی ہے۔

4۔ اس وقت حکومت نے پورے ملک سے بہت سے لوگوں کو گرفتار کر رکھا ہے اور بغیر کسی مقدمے کے حراست میں رکھا ہوا ہے۔ کمیٹی ایسی کارروائیوں کی مذمت کرتی ہے اور حکومت سے ایسے تمام افراد کی رہائی کا مطالبہ کرتی ہے جنہیں بغیر کسی الزام کے قید میں رکھا گیا ہے۔

5۔ آئین کے مطابق اظہار رائے کی آزادی عوام کا بنیادی حق ہے۔ پریس کی آزادی کا اظہار رائے کی

آزادی کے ساتھ قریبی تعلق ہے۔لیکن آج بہت سے اخبارات اور صحافیوں کو جو حکومت پر تنقید کرتے ہیں، سزائیں دی جارہی ہیں، ہراساں کیا جارہا ہے اور تشدد کا نشانہ بنایا جارہا ہے۔ کمیٹی اپنے ایک ممبر المحمود روزنامہ گانو کنتھا کے ایڈیٹر کی فوری رہائی کا مطالبہ کرتی ہے اور حکام سے پریس اور اس کے ملازمین کے خلاف ایسی کارروائیوں کے خاتمے کا مطالبہ کرتی ہے جو آئینی حقوق کی خلاف ورزیوں میں شمار ہوتی ہیں۔

''کمیٹی برائے تحفظ بنیادی حقوق و قانونی معاونت'' نے حکومت کے خلاف بہت سے کیس لڑے۔ جے ایس ڈی کے شاہ جہان سراج کا کیس بھی ایسے کیسوں میں سے ایک تھا۔اس دوران سمگلنگ کو روکنے اور غیر قانونی اسلحہ برآمد کرنے کے لیے سول حکام کی مدد کے لیے فوج کو بھی طلب کر لیا گیا۔ملک کے مختلف حصوں میں کامیاب کارروئیاں کی گئیں اور بہت بڑی تعداد میں غیر قانونی اسلحہ برآمد کیا گیا۔فوجی کارروائی جاری تھی کہ مئی 1974ء میں عوامی لیگ کی کونسل کا اجلاس شروع ہو گیا۔اسی وقت کومیلا سے عوامی لیگ کی ایم پی ممتاز بیگم کی کہانی خبروں کی زینت بن گئی۔فوج نے اس کے گھر چھاپا مارا۔اس کے گھر سے بہت بڑی مقدار میں اسلحہ برآمد ہوا۔امدادی اشیاء اور بچوں کے خشک دودھ کے ڈبے بھی بڑی تعداد میں برآمد ہوئے۔فوج اور عوام کے دباؤ میں عوامی لیگ کو وقتی طور پر اسے پارٹی سے نکالنا پڑا۔بعد میں پارٹی سے اخراج کے معاملے پر غور کرنے کے لیے دو افراد پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دے دی گئی۔اس کمیٹی کی سرگرمیوں کے بارے میں مزید کچھ بھی سننے میں نہ آیا۔لیکن جب اس کا نام بکسال کی فہرست میں دیکھا گیا تو یہ واضح ہو گیا کہ یہ غیر قانونی اسلحہ اور امدادی اشیا کی یہ کھیپ اس کے گھر میں پارٹی کی اعلیٰ قیادت کے علم کے بغیر نہیں رکھی گئی تھی۔

97۔ بھاشانی اور دوسرے رہنماؤں کی گرفتاری

جب فوجی کارروائیوں کے نتیجے میں بہت سے اعلیٰ رتبے کے رہنما ننگے ہونے شروع ہو گئے تو مولانا بھاشانی نے 14 مئی 1974ء کو کہا، ''فوجی کارروائی کو روکنے کے لیے ایک سازش تیار کی جارہی ہے۔'' چند روز کے بعد عوامی لیگ کی حکومت نے حقیقت میں فوجی کارروائی کو روک دیا۔فوج واپس بیرکوں میں چلی گئی۔عوام سخت مایوسی کا شکار ہو گئے۔حکومت کے اس فیصلے کے فوراً بعد قیمتیں ایک مرتبہ پھر آسمان کو چھونے لگیں۔ سمگلروں، ذخیرہ اندوزوں، دلالوں اور منافع خوروں نے پوری شدت سے اپنی سرگرمیاں دوبارہ شروع کر دیں۔مجموعی صورت حال ناقابل برداشت ہو گئی۔29 جون 1974ء کو مولانا کو گھر میں نظر بند کر دیا گیا جب کہ وہ ایک احتجاجی جلسے کے انعقاد کا پروگرام بنارہے تھے۔اس کے ساتھ ہی اولی احد، مسیح الرحمٰن اور بہت سے دیگر مخالف رہنماؤں کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔

بجٹ اجلاس کے دوران پوسٹ کارڈ، چائے، چینی، سیمنٹ، نالی دار ٹین، پینٹس، ریڈیو، ٹی وی کی قیمتوں میں اضافہ ہو گیا۔ ریل گاڑی کے کرائے بھی بڑھا دیے گئے۔اسی اجلاس میں 2 جولائی 1974ء کو عطاالرحمٰن نے کہا، ''پارلیمانی جمہوریت کے دن گنے جا چکے ہیں۔منتخب ہونے کے بعد پارلیمنٹ کے ممبران

راتوں رات کروڑوں پتی ہو گئے ہیں۔ ملک کو 3000 کروڑ ٹکوں کی امداد مل چکی ہے، یہ رقم کہاں چلی گئی؟ اطلاع کے مطابق جنگ کی وجہ سے ملک کو 1000 کروڑ ٹکوں کا نقصان برداشت کرنا پڑا تھا۔ تو پھر حکومت ملک کی موجودہ صورت حال کا کیا جواز پیش کرتی ہے؟''

22 جولائی 1974ء کو اس وقت کے وزیر داخلہ منصور علی نے بھاشانی کی گرفتاری کے بارے میں بیان دیتے ہوئے کہا،''بھاشانی اپنے تحفظ کے لیے پولیس کی حفاظت چاہتے تھے۔ کوئی بھی شخص سنتوش جا سکتا ہے اور دیکھ سکتا ہے کہ انہیں گھر میں نظر بند نہیں رکھا گیا۔'' اگلے روز روزنامہ اتفاق نے بھاشانی کے دستخطوں سے ایک کھلا خط شائع کیا۔ دوسری باتوں کے علاوہ اس میں لکھا گیا تھا،''29 جون کی رات کو تقریباً ڈھائی بجے رات کو پولیس نے مجھے مسیح الرحمٰن کے گھر سے گرفتار کیا۔ پولیس کے ایک اعلیٰ عہدے دار نے اے ڈی سی ڈھاکہ کا جاری کردہ ایک حکم نامہ دکھایا جس میں مجھے 30 دن کے لیے سینٹرل جیل میں بند رکھنے کا حکم دیا گیا تھا۔ لیکن وہ مجھے اس کی بجائے سنتوش لے گئے اور مجھے گھر میں نظر بند کر دیا گیا۔ یہ حقیقتاً ایک ستم ظریفی ہے کہ مجھے اس حکومت نے ایک مرتبہ پھر گرفتار کر لیا ہے اور وہ بھی آزاد بنگلہ دیش میں۔'' اسی دن جب یہ خط شائع ہوا کچھ صحافی ان سے ملاقات کے لیے سنتوش پہنچ گئے۔ لیکن پولیس نے انہیں مولانا سے ملاقات کی اجازت نہ دی۔ پریس فوٹوگرافروں کو گھر کی، جس کے گرد پولیس کی بھاری نفری تعینات کی گئی تھی، تصاویر بھی نہ بنانے دی گئیں۔

98۔امدادی سامان کی بے رحمانہ لوٹ مار

اگست کے مہینے میں ملک کو سیلاب نے نگل لیا اور امدادی سامان کی بہت بڑی مقدار وصول کی گئی۔ ان امدادی اشیاء کی عدیم المثال لوٹ مار اور غارت گری کی کہانیاں اس وقت کے اخبارات میں واضح طور پر نظر آتی ہیں۔ حکومت اور حکمران جماعت نے بڑی سنگ دلی کے ساتھ کھانے پینے کی اشیاء، ادویات، عمارتی ساز و سامان اور کپڑوں وغیرہ کو لوٹا اور اپنے گھروں میں بھر لیا۔ دوسری جانب ہر روز بھوک کی وجہ سے سینکڑوں افراد لقمہ اجل بن رہے تھے۔ لوگ سیلاب سے اپنی جانیں بچانے کے لیے جدوجہد کر رہے تھے۔ اخبارات کے صفحات اموات، بھوک اور افلاس کی دردناک داستانوں اور تصاویر سے بھرے ہوئے تھے۔ ہزاروں افراد بے گھر اور قلاش ہو چکے تھے۔ ان لاکھوں افراد کے لیے جو شہروں اور قصبوں کا رخ کر رہے تھے کسی قسم کی خوراک، پناہ گاہوں اور اوڑھنے بچھونے کا کوئی انتظام نہ تھا۔

ایسے وقت میں کچھ بددیانت رہنما لاکھوں کی امدادی اشیاء کی خرد برد اور سمگلنگ سے دولت بنانے میں مصروف تھے۔ 3 اگست 1974ء کو روزنامہ اتفاق نے ایک تصویر شائع کی جس میں کتے اور انسان سڑک کے کنارے گلے کوڑے دانوں سے خوراک کی تلاش میں ایک دوسرے سے مقابلے میں اترے ہوئے تھے۔ دینک بنگلہ نے خبر شائع کی کہ کئی مقامات پر لوگ قے سے خوراک کے ٹکڑے اٹھا کر کھا رہے ہیں۔

اخبارات میں بنگلہ دیش ریڈ کراس کے خلاف سینکڑوں الزامات شائع کیے گئے۔ خاص طور پر ریڈ کراس کے سربراہ غازی غلام مصطفےٰ پر بے شمار الزامات لگائے گئے جو بنگلہ دیش میں ''کمبل چور'' کے نام سے مشہور تھے۔ ان کی بے مثال بد دیانتی، اقربا پروری اور امدادی اشیا میں خرد برد نے ان کے نام کو بنگلہ دیش میں تہمت بنا دیا تھا۔ اس دور میں اس شخص کے بارے میں لوگوں نے بہت سی پیروڈیاں بنا رکھی تھیں۔ عطا الرحمٰن خان نے بنگلہ دیش ریڈ کراس کی بدعنوانیوں کے خلاف آواز بلند کی، 10 اگست کو ان کا بیان روزنامہ اتفاق میں شائع ہوا۔ رپورٹ میں کہا گیا تھا کہ لوگ زندہ رہنے کے لیے درختوں کے پتے اور چھال کھا رہے ہیں۔ عطا الرحمٰن خان نے اپنے بیان میں شکایت کی کہ پولیس امدادی کارروائیوں میں کارکنوں کے خلاف رکاوٹیں پیدا کر رہی ہے۔ انہوں نے 11 اگست کو اپنے بیان میں کہا، ''دنیا میں کہیں بھی ایسی مثال نہیں ملتی کہ کسی مخصوص پارٹی کے رہنما یا ممبر کو ریڈ کراس کا چیئرمین بنا دیا گیا ہو۔ یہ تحریص پیدا کرنے والا عہدہ ہمیشہ عدلیہ یا تعلیم کے شعبے سے تعلق رکھنے والے کسی غیر متنازع شخص کو سونپا جاتا ہے۔'' انہوں نے ریڈ کراس کے چیئرمین کو فوری طور پر تبدیل کرنے کا مطالبہ کیا۔

تباہ حال لوگوں کی آمد سے نمٹنے کے لیے صرف ڈھاکہ شہر میں 135 امدادی کیمپ قائم کیے گئے تھے۔ 12 اگست 1974ء کو جاترا باڑی میں ایک کیمپ کے پناہ گزینوں نے شکایت کی، انہیں تین دن سے کھانے پینے کے لیے کچھ بھی مہیا نہیں کیا گیا۔ 16 اگست کو آئی سی آر سی کے ایک آفیسر مسٹر ایلون نے آدم جی نگر کے امدادی کیمپ کا معائنہ کیا، پناہ گزینوں نے ریلیف کمیٹی کے چیئرمین کے خلاف بدعنوانیوں اور اقربا نوازی کی شکایات کیں۔ مسٹر ایلون کے جانے کے بعد چیئرمین اپنی غنڈہ باہنی کے ساتھ شکایات کرنے والوں کو سبق سکھانے کے لیے ان پر ٹوٹ پڑا۔ دو افراد شدید زخمی ہوئے اور انہیں ہسپتال داخل کروانا پڑا۔ گلی سڑی خوراک تقسیم کرنے کے نتیجے میں اکثر کیمپوں میں ہیضے اور اسہال کی وبائیں پھوٹ پڑیں۔ لوگ بھیڑ بکریوں کی طرح ہلاک ہوتے رہے۔ انسانی زندگیوں کو حقارت اور تذلیل کا نشانہ بنایا گیا۔ ان دنوں کے اخبارات 1974ء کے قحط کی رونگٹے کھڑے کر دینے والی داستانوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ یہ سیلاب نہیں بلکہ انسانوں کا پیدا کردہ قحط تھا جس نے لاکھوں افراد کی زندگیاں چھین لی تھیں۔ بہت سے صحت مند کسان ہزاروں کی تعداد میں بھکاری بن گئے۔ بہت سے لوگ جو خیرات حاصل کر پانے میں ناکام رہتے تھے، وہ لاشوں میں تبدیل ہوتے رہے۔ ایک مسلم خیراتی تنظیم مفید الاسلام صرف ڈھاکہ کی گلیوں سے روزانہ تیس سے چالیس لاوارث لاشیں اٹھاتی تھی۔ یہ تمام خبریں تصاویر کے ساتھ اخبارات میں شائع ہوتی تھیں۔ ڈھاکہ شہر میں بھی ہر گھنٹے میں تین سے چار آدمی بھوک سے مر رہے تھے۔ ایک مرحلے میں ایسی خبریں اور تصاویر شائع کرنے پر پابندی عائد کر دی گئی۔ اگست سے دسمبر تک دیہاتی علاقوں سے روزانہ سینکڑوں افراد کے مرنے کی خبریں آتی رہیں۔ 10 اپریل 1974ء کو روزنامہ اتفاق اور ایک دوسرے اخبار نے ایک خبر کے ساتھ ایک تصویر شائع کی جس میں ایک نوجوان عورت اپنے آپ کو مچھلیاں پکڑنے والے جال سے ڈھانپنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ایک اور

ماں اپنے بچے کو بازوؤں میں اٹھائے خوراک کے لیے آوارہ کتوں سے لڑ رہی تھی۔ گھریلو خواتین صرف چاول کے چند لقموں کے لیے اپنے جسم بیچنے کو تیار ہوتی تھیں۔

ہر روز امدادی سامان میں خرد برد کی کہانیاں شائع ہو رہی تھیں لیکن کسی کے خلاف کوئی کارروائی عمل میں نہ لائی گئی۔ زمین اونے پونے بیچی جا رہی تھی۔ کم پیداواری زمینوں کے مالک اور چھوٹے کسان راتوں رات بے زمین ہو گئے اور بھکاری بن گئے۔ 22 ستمبر 1974ء کو تقریباً 200 بھوکے اور نیم برہنہ مرد و خواتین نے ڈھاکہ کی سڑکوں پر خوراک اور کپڑوں کا مطالبہ کرتے ہوئے جلوس نکالا۔ لاکھوں افراد کی ماتمی آہ و بکا بھی سنگدل عوامی لیگیوں کو متاثر نہ کر سکی۔ بڑی بے شرمی اور ڈھٹائی کے ساتھ انہوں نے ''گانو بھوَن'' میں شیخ مجیب الرحمٰن کی 55ویں سالگرہ منائی جس کے لیے 55 کلو کا کیک تیار کیا گیا۔ شیخ مجیب الرحمٰن نے خود کیک کاٹا۔ 23 ستمبر 1974ء کو حکومت نے ملک بھر میں 4300 لنگر خانے کھولنے کا اعلان کیا۔ ان لنگر خانوں کی داستان بھی بہت دردناک اور رسوا کن تھی۔ 24 ستمبر 1974ء کو نوگاؤں سے عوامی لیگ کے ایم پی نے ایک بیان میں کہا، ''ضلع کے لوگ پچھلے تین چار دن سے حقیقتاً بغیر کسی خوراک کے ہیں۔ چاولوں کی قیمت سات ٹکہ فی سیر ہے۔'' 16 اکتوبر 1974ء کو اتفاق نے ایک خبر شائع کی کہ ''حکومت ہر ماہ 21 لاکھ ٹکوں کی شراب اور سگریٹ درآمد کرتی ہے۔'' اسی دن وزیر خوراک نے ایک بیان میں کہا، ''آج کے دن تک کتنے لوگ بھوک کی وجہ سے مر چکے ہیں، حکومت کے علم میں نہیں ہے؟ رپورٹیں جو شائع کی جا رہی ہیں مبالغہ آمیز ہیں۔ کچھ سمگلنگ ہوئی تھی۔''

8 اکتوبر کو پروفیسر فضل (جو بعد میں صدر ضیا الرحمٰن کی ایڈوائزری کونسل کے ممبر بنے) اور چٹاگانگ یونیورسٹی کے 84 اساتذہ نے ایک بیان جاری کیا: ''قدرتی آفات کا مقابلہ کرنے کے لیے قومی زندگی میں اس قسم کی بے حسی، ایسی کوتاہی اور لاپروائی ماضی میں کہیں بھی دیکھنے میں نہیں آئی ہے۔ جب قوم میں خود اعتمادی ختم ہو جائے تو وہ ایک مردہ ڈھیر کے علاوہ کچھ نہیں رہتی۔ موجودہ بنگلہ دیش اس کی ایک روشن مثال ہے۔ قومی معاملات کے ذمہ دار مٹھی بھر افراد کی نااہلی، غلط فیصلوں، انتظامی بے عملی اور بدعنوانی کی نہ ختم ہونے والی لہر کے ہاتھوں قومی اتحاد، قوت برداشت اور قربانی کا جذبہ، سب کچھ خس و خاشاک کی طرح بہ گیا ہے۔ ہم اس نازک موڑ پر حکومتی رہنماؤں سے التماس کرتے ہیں کہ ہمیں اپنے اندر خود اعتمادی کو بحال کرنے کا موقع فراہم کریں۔''

8 اکتوبر 1974ء کو سرا مک لیگ کے منان نے کہا کہ ''نمک کے موجودہ بحران کے حوالے سے تمام معلومات حاصل کرنے کے بعد یہ حتمی بات سامنے آئی ہے کہ نمک پیدا کرنے والوں سے تاجر دو ٹکا فی من کے حساب سے نمک خریدتے ہیں۔ حکومت تاجروں اور سٹاکسٹوں کو غیر صاف شدہ اور صاف شدہ نمک پر 15 ٹکے اور 55 ٹکے فی من ادا کرتی ہے۔ سٹاکسٹ کہتے ہیں کہ اگر حکومت غیر صاف شدہ نمک کی قیمت 40 ٹکے فی من کر دے تو پھر مارکیٹ میں نمک کی کوئی کمی نہیں رہے گی۔ اس ساری ساز باز کے پس پردہ ہمارے اپنے کچھ ممبرانِ پارلیمنٹ شامل تھے۔'' 13 اکتوبر 1974ء کو اخبارات نے لکھا کہ ڈھاکہ کی گلیوں میں روزانہ تقریباً 84 لاوارث

لاشیں اٹھائی جا رہی ہیں۔ 27 اکتوبر 1974ء کو اخبارات نے دعویٰ کیا کہ جمال پور میں ہر روز 100 سے زائد افراد بھوک سے مر رہے ہیں۔ حکومت نے تسلیم کیا کہ کچھ اموات خوراک کی کمی کی وجہ سے ہوئی ہیں۔

25 اکتوبر 1974ء کو خبریں شائع ہوئیں کہ ملک سے چاولوں کے ٹرک بھر بھر کر سمگل کیے جا رہے ہیں۔ دیناج پور میں ایک سیر چاولوں کی قیمت 8 ٹکے تک پہنچ گئی تھی۔ مانک گنج میں سات افراد کے ایک کنبے نے ناقابل برداشت بھوک سے تنگ آ کر خودکشی کر لی۔ اس وقت عوامی لیگ کے صدر قمر الزمان نے کہا، ''موجودہ قوانین سمگلنگ کو روکنے کے لیے ناکافی ہیں اور جماعت کے اندر سے کسی تنقید کو برداشت نہیں کیا جائے گا۔'' ان کا بیان قدرے حیران کن تھا۔ ان کے اس بیان سے چند روز قبل ہی پارلیمنٹ نے سمگلنگ کے جرم پر سزائے موت کا قانون پاس کیا تھا۔ تاہم ان کے اس بیان کے بعد عوامی لیگ کی اندرونی کشمکش ظاہری سطح پر آنا شروع ہو گئی تھی۔

26 اکتوبر 1974ء کو وزیر اعظم کے حکم پر تاج الدین احمد کو وزارت سے نکال دیا گیا۔ اپنے اخراج کے بارے میں بات کرتے ہوئے انہوں نے پریس کو بتایا، ''میں عظیم تر قومی مفاد میں تنازعات کو ہوا نہیں دینا چاہتا۔'' ڈھاکہ کے واقف حال حلقوں اور مقامی اور غیر ملکی صحافیوں کے مطابق شیخ مجیب الرحمٰن، تاج الدین کے اس تاثر کو پسند نہیں کرتے تھے، جو جنگ آزادی کے دوران قائم ہوا تھا، جس وقت شیخ مجیب پاکستانی قید میں تھے۔ اس کے علاوہ شیخ مجیب کے اپنے خاندان کے افراد، خاص طور پر بیگم مجیب تاج الدین کو برداشت نہیں کر سکتی تھیں۔ وہ سمجھتی تھیں کہ جنگ آزادی کے دوران جلاوطن حکومت کے وزیر اعظم کے طور پر انہوں نے شیخ مجیب کو ہمیشہ نیچے رکھنے کی کوشش کی تھی۔ شیخ مجیب نے انہیں قومی معیشت کی تباہی کا ذمہ دار قرار دیا۔ انہیں بکسال کی مرکزی کمیٹی سے بھی نکال دیا گیا۔ 29 اکتوبر 1974ء کو حکومت نے ہڑتالوں پر مکمل پابندی کا اعلان کر دیا۔ اسی دن حکمران عوامی لیگ کے ایک ممبر پارلیمنٹ کو ذخیرہ اندوزی اور سمگلنگ کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔ 30 اکتوبر 1974ء کو حکمران جماعت کے ممبر پارلیمنٹ شمس الدین احمد کو نمک کی ذخیرہ اندوزی کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔

99۔ ''کمیٹی برائے تحفظ بنیادی حقوق و قانونی معاونت'' کا اجلاس

یکم نومبر 1974ء کو ''کمیٹی برائے تحفظ بنیادی حقوق و قانونی معاونت'' نے بیت المکرم میں ایک اجلاس کا انعقاد کیا جس میں موجودہ بحران اور قحط سے نمٹنے کے لیے تمام پیشہ وارانہ شعبوں مثلاً اساتذہ، وکلا، ڈاکٹروں، مصنفین، صحافیوں، فن کاروں، ثقافتی کارکنان، فلمی اداکاروں، اداکاراؤں اور طلبا کو شرکت کی دعوت دی گئی۔ آزادی سے لے کر اب تک پیشہ ور افراد کا اتنا بڑا اجتماع دیکھنے میں نہ آیا تھا۔ اجلاس کی صدارت سکندر ابوظفر نے کی، جو دو گھنٹے تک جاری رہا۔ مقررین میں ایڈووکیٹ مرزا غلام حفیظ، ڈاکٹر احمد شریف، زین العابدین، بیرسٹر مودود احمد، عنایت اللہ خان، قمر النہر لالی، نظام الدین احمد، محی الدین عالمگیر، محمد ذکریا اور بدر الدین عمر شامل تھے۔ اجلاس میں قحط اور بنیادی حقوق کی پامالی کے حوالے سے 17 نکاتی قرارداد

پاس کی گئی۔ اجلاس کے بعد ایک جلوس نکالا گیا جو شہید مینار پر ختم ہوا۔

دیگر باتوں کے علاوہ قرارداد میں کہا گیا تھا:

''یکم نومبر 1974ء کو پاس کی گئی اس متفقہ قرارداد میں اس بات پر اتفاق کیا گیا کہ موجودہ قحط کی شدت 1943ء کے قحط کی حدود کو پار کر گئی ہے۔ اور یہ قحط سیلاب اور نہ ہی کسی دوسری قدرتی تباہی کا نتیجہ ہے بلکہ یہ حکمران ٹولے اور اس کے حواریوں کی عوام دشمن سرگرمیوں کا نتیجہ ہے۔ اس وقت ملک میں قحط کی صورتِ حال ہے۔ کمیٹی مطالبہ کرتی ہے کہ حکومت اس بات کا اعلان کرے۔ کمیٹی یہ بھی مطالبہ کرتی ہے کہ حکومت امدادی کارروائیوں پر ایک قرطاس ابیض شائع کرے۔ اور سمگلنگ روکنے کے لیے فوری اقدامات اٹھائے۔ کمیٹی ایک کل جماعتی امدادی کمیٹی تشکیل نہ دینے پر حکومت پر تنقید کرتی ہے اور مطالبہ کرتی ہے کہ حکومت کو اپنی پوزیشن تبدیل کرنی چاہیے اور فوری طور پر کل جماعتی امدادی کمیٹی تشکیل دینی چاہیے۔ مخالف سیاسی جماعتوں سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ اس حوالے سے مناسب اقدامات اٹھائیں۔ کمیٹی حکومت پر زور دیتی ہے کہ وہ راشننگ کے علاقوں میں توسیع کرے اور فوری طور پر ریاستی امدادی کارروائیوں کا آغاز کرے۔ کمیٹی لنگر خانوں کی تعداد میں اضافہ کا اور ان لنگر خانوں میں خرد برد اور زیادتیوں کو روکنے کا مطالبہ بھی کرتی ہے۔ کمیٹی مزید مطالبہ کرتی ہے کہ ریڈ کراس کے نااہل چیئرمین کو ہٹا کر اس کی جگہ سپریم کورٹ کے جج کی تعیناتی کی جائے اور سیاسی بنیادوں پر دی جانے والی سزاؤں، غیر قانونی گرفتاریوں اور خوف و ہراس کی حکمرانی کے خلاف شدید احتجاج کرتی ہے اور تمام سیاسی نظر بندوں، سیاسی قیدیوں کی فوری رہائی کا مطالبہ کرتی ہے، جن کو بغیر کسی الزام کے جیلوں میں بند کر رکھا گیا ہے۔''

100۔ اہم سیاسی پیش رفت

اس دوران سیاسی میدان میں بعض اہم تبدیلیاں دیکھنے میں آئیں۔ نیپ مظفر کے ایک رہنما اور ایک معروف مجاہد آزادی کیپٹن (ریٹائرڈ) عبدالحکیم نے 15 نومبر 1974ء کو نیپ سے اپنے تعلقات ختم کر لیے اور پریس میں ایک بیان دیا۔ انہوں نے کہا، ''اس وقت ماسکو کے حکم پر نیپ عوامی لیگ کا دم چھلا بن چکی ہے۔'' 17 نومبر 1974ء کو سی پی بی کے رہنما مونی سنگھ نے بیت المکرّم میں ایک عوامی جلسے سے خطاب کرتے ہوئے انتہائی بے شرمی سے کہا، ''ہم مزدوروں اور کسانوں کی جمہوریت کے لیے لڑیں گے۔ ہم حکومت کے ہر اس قدم کی حمایت کریں گے جو سیاسی اور انتظامی تبدیلیوں کے لیے اٹھایا جائے گا۔'' نیپ مظفر نے بھی 28 نومبر 1974ء کو ایک ایسا ہی بیان جاری کیا۔

2 فروری 1974ء کو ایک سپیشل پاور ایمرجینسی آرڈیننس پاس کیا گیا اور آئین کی کچھ دفعات کو معطل کرتے ہوئے اس کا نفاذ کر دیا گیا۔ نیز قومی ہنگامی صورت حال کا اعلان بھی کر دیا گیا۔ 3 جنوری 1975ء کو سپیشل پاور ایمرجینسی ایکٹ آرڈیننس جاری کیا گیا۔ تمام اجلاس اور جلوسوں پر پابندی لگا دی گئی۔ 6 جنوری

1975ء کوایک اعلان کیا گیا کہ حکومت کے ملازمین سوائے کوآپریٹو کے کسی بھی تنظیم میں شمولیت اختیار نہیں کر سکیں گے۔ دیواروں پر لگے ہوئے تمام اشتہارات کو 48 گھنٹوں کے اندر اندر اتارنے کا حکم دیا گیا۔ اس کے بعد 20 جنوری 1975ء کو ہماری جمہوری تاریخ کا سب سے زیادہ ذلت آمیز پارلیمنٹ کا اجلاس منعقد ہوا، اور 25 جنوری 1975ء کو پارلیمنٹ سے چوتھی ترمیم منظور کروا کر جمہوریت کو حتمی طور پر دفن کر دیا گیا۔

ملک عقیل اس وقت سپیکر تھے جنہوں نے محض تین ماہ پہلے 16 اکتوبر 1974ء کو پارلیمنٹ کی عمارت میں پارلیمانی جمہوریت کے موضوع پر منعقد ہونے والے ایک سیمینار سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا، ''پارلیمانی جمہوریت لوگوں کے لیے سب سے زیادہ موزوں ثابت ہوئی ہے۔'' ستم ظریفی ملاحظہ کیجیے کہ انہی کی سپیکر شپ کے تحت ملک میں صدارتی طرزِ حکومت متعارف کروا دیا گیا۔ یہ وہی تھے جنہوں نے تمام سیاسی جماعتوں پر پابندی لگائی اور صدر کو تمام اختیارات دیتے ہوئے آمرانہ یک حزبی حکومت کا بل پاس کرایا۔ دوبارہ پھر یہ ملک عقیل ہی تھے جنہوں نے حلف برداری کی تقریب میں شیخ مجیب سے جمہوریہ کے صدر کے طور پر حلف لیا۔ چوتھی ترمیم میں کہا گیا تھا کہ صدر کو کابینہ کے تمام وزرا بشمول وزیراعظم مقرر کرنے کا اختیار ہوگا۔ وزیراعظم اور کابینہ کے دوسرے وزرا جو پارلیمنٹ کے منتخب رکن نہیں ہوں گے، انہیں ووٹ دینے کا حق نہیں ہو گا۔ نائب اور وزرائے مملکت پارلیمنٹ سے باہر سے بھی نامزد کیے جا سکتے ہیں۔ کابینہ صدر کو مشورہ دے سکتی ہے لیکن صدر اس مشورے پر عمل کرتا ہے یا نہیں، اسے کسی بھی عدالت میں چیلنج نہیں کیا جا سکے گا۔

اس اجلاس میں ''سپیشل پاور ایمرجنسی ایکٹ'' کے بل کو بھی بغیر بحث کے قانون میں تبدیل کر دیا گیا۔ 25 جنوری 1975ء دوپہر ایک بج کر پندرہ منٹ پر ایک مختصر سے اجلاس میں چوتھی ترمیم کا نفاذ کر دیا گیا، جس میں کہا گیا تھا، ''اس سے پہلے کہ اس قانون کا نفاذ کیا جائے جو شخص صدر تھا وہ صدر نہیں رہے گا اور صدارت کا عہدہ خالی تصور کیا جائے گا۔ شیخ مجیب الرحمٰن عوامی جمہوریہ بنگلہ دیش کے صدر ہوں گے اور ایگزیکٹو صدر کے طور پر اختیارات سنبھال لیں گے اور اس آئینی ترمیم کے تحت بدستور قانونی صدر کے طور پر فرائض انجام دیں گے۔ آئین کے مطابق جمہوریہ کا ایک صدر ہوگا اور ایک نائب صدر ہوگا۔ صدر کا انتخاب عوام براہِ راست کریں گے۔ صدر، نائب صدر کو نامزد کرے گا۔ صدر اور نائب صدر کی مدت پانچ سال ہوگی۔ صدر کو جمہوریہ کا نظم ونسق چلانے کے لیے تمام ایگزیکٹو اختیارات حاصل ہوں گے۔ وہ یا تو براہ راست یا پھر اپنے نامزد کردہ افراد کے ذریعے ان اختیارات کو استعمال کر سکے گا۔ نائب صدر اپنے اختیارات کا استعمال صدارتی احکام کے تحت کر سکے گا۔ صدر کی مدد اور مشورے کے لیے ایک کابینہ تشکیل دی جائے گی۔ صدر کو پارلیمنٹ کے ممبران میں سے یا پارلیمنٹ سے باہر سے ایسے افراد کو وزیراعظم، وزرا، نائب وزرا اور وزرائے مملکت نامزد کرنے کا اختیار حاصل ہو گا جو پارلیمنٹ کے ممبر بننے کی اہلیت رکھتے ہوں۔ ہر وزیر پارلیمنٹ میں تقریر کر سکے گا اور پارلیمنٹ کی دیگر سرگرمیوں میں حصہ لے سکے گا۔ لیکن اگر وہ پارلیمنٹ کا منتخب شدہ رکن نہیں ہے تو ووٹنگ میں حصہ نہیں لے سکے گا۔ صدر کابینہ کے اجلاسوں کی صدارت کریں گے۔ ان کے حکم پر نائب صدر یا وزیراعظم بھی اجلاس کی صدارت کر

سکے گا۔ وزرا اتنی دیر تک اپنے عہدے پر قائم رہ سکیں گے جب تک صدر چاہیں گے۔

اس ترمیمی بل کے تحت صدر کو ایک سیاسی پارٹی تشکیل دینے کا اختیار حاصل ہوگا۔ یہ پارٹی قومی پارٹی ہوگی۔ ترمیم کے مطابق صدر کے خلاف کسی بھی عدالت میں کوئی قانونی کارروائی نہیں کی جاسکے گی اور کوئی بھی عدالت صدر کے خلاف کسی قسم کے وارنٹ گرفتاری یا حراست کے احکام جاری نہیں کرسکے گی۔ کسی بھی شہری کو سوائے قومی سیاسی پارٹی کے کوئی سیاسی پارٹی تشکیل دینے یا کسی بھی سیاسی سرگرمی میں شامل ہونے کی اجازت نہیں ہوگی۔ صدر مسلح افواج کا کمانڈر ان چیف بھی ہوگا۔''

کل 294 ممبران نے ترمیم کے حق میں ووٹ دیا۔ کسی نے بھی مخالفت میں ووٹ نہ ڈالا۔ اجلاس 2 گھنٹے 5 منٹ تک جاری رہا۔ تین مخالف ممبران اور ایک آزاد ممبر احتجاج کے طور پر واک آؤٹ کر گئے۔ ان میں عبداللہ سرکار، عبدالستار، معین الدین احمد۔ جے ایس ڈی کے تھے اور منا بندرا نارائن لارما آزاد ممبر تھے۔ جب بل پیش کیا گیا تو حکمران جماعت کے چیف وہپ نے ممبران سے بنیادی حقوق کے التوا کے قانون کے تحت بل کے بارے میں کوئی تحریک پیش نہ کرنے کو کہا۔ اس نکتے پر جاتیو لیگ کے رہنما عطاالرحمٰن نے قانونی جواز کا سوال اٹھایا اور سپیکر سے اس مسئلہ پر بحث کے لیے وقت دینے کی درخواست کی لیکن سپیکر نے ان کی تجویز کو قبول نہ کیا۔ بعد میں چیف وہپ کی تجویز کو ممبران کی آواز کے ذریعے رائے کے نتیجہ میں منظور کرلیا گیا اور مسٹر خان احتجاج کے طور پر اجلاس سے چلے گئے۔ اس کے بعد اس وقت کے وزیر قانون منورنجن دھرنے سپیشل پاور ایمرجنسی ایکٹ 1975ء پیش کیا۔ چیف وہپ نے بنیادی حقوق کو معطل کیے جانے کے قانون کی بات کی اور اس کی تجویز کو حسب سابق منظور کرلیا گیا۔

یہاں ایک بات قابل غور ہے۔ اگرچہ بل پارلیمنٹ میں بغیر کسی مخالفت کے پاس ہوگیا تھا، جمہوریت کو ایک شخص کی آمریت میں تبدیل کرنے میں عوامی لیگ کے اندر بھی اختلافِ رائے پایا جاتا تھا۔ 18 جنوری 1975ء کو عوامی لیگ پارلیمانی پارٹی کا ایک اہم اجلاس ہوا۔ اس اجلاس میں شیخ مجیب الرحمٰن نے نئے نظام کے تحت ایک پارٹی بکسال تشکیل دینے کی تجویز پیش کی۔ لیکن ان کے بہت سے ساتھی اس مسئلے پر متفق نہیں تھے۔ وہ لوگ جنھوں نے اس یک حزبی آمرانہ حکومت کے خلاف احتجاج کیا ان میں مسٹر مشتاق احمد، بنگا بیر جنرل عطاء الغنی عثمانی، بیرسٹر معین الحسن، طاہر الدین ٹھاکر، شاہ معظم حسین، عبیدالرحمٰن، نورالاسلام منجو اور نور عالم صدیقی شامل تھے۔ جنرل عثمانی اور نور عالم صدیقی نے یک حزبی حکومت کے قیام کے خلاف بڑا سخت بیان دیا۔ جنرل عثمانی نے اپنی تقریر میں دیگر باتوں کے علاوہ کہا: ''ہم ایوب خان اور یحیٰی خان کو دیکھ چکے ہیں۔ ہم بنگلہ بندھو شیخ مجیب الرحمٰن کو مجیب الرحمٰن خان کے طور پر نہیں دیکھنا چاہتے۔''

101۔ شیخ مجیب الرحمٰن کے ہاتھوں جمہوریت کا قتل

24 فروری 1975ء کو صدر شیخ مجیب الرحمٰن نے ایک حکم کے تحت ملک میں ایک ہی سیاسی پارٹی بنگلہ

دیش کریشک سرامک عوامی لیگ یا ''بکسال'' کی تشکیل کا اعلان کردیا۔ انہوں نے اپنے آپ کو بکسال کا چیئرمین بھی مقرر کیا۔ اس اعلان کے تیسرے آرٹیکل میں کہا گیا تھا، ''صدر کی جانب سے کسی مزید حکم تک کالعدم عوامی لیگ کے تمام ممبران پارلیمنٹ، کابینہ کے وزرا، نائب وزرا اور وزرائے مملکت بکسال کے ممبر تصور کیے جائیں گے۔ بنگا بیر جنرل عثمانی اور بیرسٹر معین الحسین نے اس حکم کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا اور بکسال میں شامل نہ ہونے کا فیصلہ کیا۔ ان دونوں نے پارلیمنٹ کی ممبرشپ سے استعفیٰ دے دیا۔ سی پی بی کے جنرل سیکرٹری محمد فرہاد اور مظفر نیپ نے ملک میں یک حزبی حکومت کے قیام کے شیخ مجیب کے فیصلے کو خوش آمدید کہا۔ نام نہاد ''قومی پارٹی'' کے اعلان کے نتیجہ میں باقی تمام سیاسی پارٹیاں ختم کردی گئیں۔ حزب مخالف کے آٹھ ممبران میں سے چار نے بکسال میں شمولیت اختیار کرلی۔ جاتیولیگ کے بزرگ سیاست دان عطاالرحمٰن خان نے بے مثال موقع پرستی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پوری طرح بکسال میں شمولیت اختیار کرلی۔

2 جون 1975ء کو روزنامہ اخباروں کے نو ایڈیٹروں نے شیخ مجیب الرحمٰن سے بکسال میں شمولیت کی درخواست کی۔ ان میں عبیدالحق ایڈیٹر بنگلہ دیش آبزور، نورالاسلام پٹواری ایڈیٹران چیف دَینک سنگ باد، بزل الرحمٰن ایڈیٹر مارننگ نیوز، شمس الہدیٰ چیف ایڈیٹر بی ایس ایس، جوادالکریم ایڈیٹر بنگلہ دیش ٹائمز، شاہدالحق ایگزیکٹو ایڈیٹر بنگلہ ربانی، انور حسین منجو ایڈیٹر روزنامہ اتفاق اور میزان الرحمٰن ایڈیٹر بی پی آئی شامل تھے۔ 6 جون 1975ء کو بکسال کے تنظیمی ڈھانچے اور آئین کا اعلان کیا گیا۔ اس کے مطابق منصور علی کو پارٹی کا سیکرٹری جنرل مقرر کیا گیا تھا۔ سیکرٹریوں میں ظل الرحمٰن، شیخ فضل الحق مونی اور عبدالرزاق شامل تھے۔ اسی روز مرکزی کمیٹی کے 115 ممبران کے ناموں کا اعلان کیا گیا جن میں نائب وزیراعظم، سپیکر، ڈپٹی سپیکر، وزرا، نائب وزرا، وزرائے مملکت، بری، بحریہ اور فضائی فوج کے تین چیف، ڈائریکٹر جنرل بی ڈی آر، ڈائریکٹر جنرل جے آر بی اور تمام وزارتوں کے سیکریٹری شامل تھے۔

بکسال کی ایگزیکٹو کمیٹی مندرجہ ذیل ممبران پر مشتمل تھی:

1۔ شیخ مجیب الرحمٰن

2۔ سیّد نذرالاسلام	3۔ منصور علی	4۔ کھنڈکر مشتاق احمد
5۔ عبدالحسنات محمد الزمان	6۔ عبدالمالک عقیل	7۔ پروفیسر یوسف علی
8۔ منورنجن دھر	9۔ محی الدین احمد	10۔ غازی غلام مصطفےٰ
11۔ ظل الرحمٰن	12۔ شیخ فضل الحق مونی	13۔ عبدالرزاق

بکسال کی ایگزیکٹو کمیٹی کے ممبران کی فہرست:

1۔ شیخ مجیب الرحمٰن	2۔ سیّد نذرالاسلام	3۔ منصور علی

4- عبدالمالک عقیل
5- کھنڈکر مشتاق احمد
6- اے ایچ ایم قمرالزمان
7- محموداللہ
8- عبدالصمد آزاد
9- یوسف علی
10- پھنی بھوشن موجمدار
11- ڈاکٹر کمال حسین
12- سہراب حسین
13- عبدالمنان
14- عبدالرب شیر نیابت
15- منورنجن دھر
16- عبدالمتین
17- اسدالزمان
18- قربان علی
19- ڈاکٹر عزیزالرحمٰن ملک
20- ڈاکٹر مظفر احمد چوہدری
21- طفیل احمد
22- شاہ معظم حسین
23- عبدالمومن تعلقہ دار
24- دیوان فرید غازی
25- پروفیسر نورالاسلام چوہدری
26- طاہرالدین ٹھاکر
27- مسلم الدین خان
28- ایم ڈی نورالسلام منجو
29- اے کے ایم عبیدالرحمٰن
30- ڈاکٹر کھیتش چندرا موندل
31- ریاض الدین احمد
32- ایم بیت اللہ
33- روح القدس (سیکرٹری)
34- ظل الرحمٰن
35- محی الدین احمد ایم پی
36- شیخ فضل الحق مونی
37- عبدالرزاق
38- شیخ شاہدالاسلام
39- انور چوہدری
40- ساجدہ چوہدری
41- تسلیمہ عابد
42- عبدالرحیم
43- عبدالاوّل
44- لطف الرحمٰن
45- اے کے مجیب الرحمٰن
46- ڈاکٹر مفیض چوہدری
47- ڈاکٹر علاؤالدین
48- ڈاکٹر احسان الحق
49- روشن علی
50- عزیزالرحمٰن عکاس
51- شیخ عبدالعزیز
52- صلاح الدین یوسف
53- مائیکل سوشیل ادھیکاری
54- قاضی عبدالحکیم
55- ملا جلال الدین
56- شمس الدین ملا
57- گور چندرا بالا
58- غازی غلام مصطفٰے
59- شمس الحق
60- شمس الضحیٰ
61- رفیق الدین بھوانیا
62- سیّد احمد
63- شمس الرحمٰن خان
64- نورالحق
65- قاضی ظہورالقیوم
66- کیپٹن (ر) شجاعت علی
67- ایم آر صدیقی
68- ایم اے وہاب
69- چتارنجن سوتر
70- سیدہ رضیہ بانو
71- عطاالرحمٰن خان
72- کھنڈکر محمد الیاس
73- مونگ پروسائرے
74- پروفیسر مظفر احمد
75- عطاالرحمٰن
76- پیر حبیب الرحمٰن
77- سیّد الطاف حسین
78- محمد فرہاد
79- موتیا چوہدری
80- حاجی دانش
81- توفیق امام (سیکریٹری)
82- نورالاسلام (سیکریٹری)
83- فیض الدین (سیکریٹری)
84- محبوب الرحمٰن (سیکریٹری)
85- عبدالخالق
86- مجیب الحق (سیکریٹری)
87- عبدالرحیم (سیکریٹری)

88۔معین السلام (سیکریٹری) 89۔سعید الزمان (سیکریٹری) 90۔انیس الزمان (سیکریٹری)
91۔ڈاکٹر اے ستار (سیکریٹری) 92۔ایم اے صمد (سیکریٹری) 93۔ابوطاہر (سیکریٹری)
94۔ الحسینی (سیکریٹری) 95۔ڈاکٹر تاج الحسین (سیکریٹری) 96۔مطیع الرحمٰن (چیئرمین ٹی سی بی)
97۔میجر جنرل کے ایم شفیع اللہ 98۔ایئر وائس مارشل کھنڈکر 99۔کموڈور ایم ایچ خان
100۔میجر جنرل خلیل الرحمٰن 101۔اے کے نذیرالدین 102۔ڈاکٹر عبدالمتین چوہدری
103۔ڈاکٹر مظہر الاسلام 104۔ڈاکٹر سرام الحق 105۔اے ٹی ایم سیّد حسین
106۔نورالاسلام 107۔ڈاکٹر نیلما ابراہیم 108۔ڈاکٹر نورالاسلام (پی جی ہسپتال)
109۔عبیدالحق (ایڈیٹر آبزرور) 110۔انوارالحسین (ایڈیٹر اتفاق) 111۔میزان الرحمٰن بی پی آئی
112۔منورالاسلام 113۔بریگیڈئر اے ایم ایس نورالزمان 114۔قمرالزمان ٹیچرز ایسوسی ایشن
115۔ڈاکٹر مظہر علی خان، ڈی جی جاتیو راکھی باہنی

اسی اعلامیہ میں بکسال کی پانچ جڑواں تنظیمیں بھی تشکیل دی گئیں:

جنرل سیکریٹریز

1۔جاتیو کریشک لیگ	پھنی بھوشن موجمدار
2۔جاتیو سرامک لیگ	پروفیسر یوسف علی
3۔جاتیو مہیلا لیگ	ساجدہ چوہدری
4۔جاتیو جبو لیگ	طفیل احمد
5۔جاتیو چترا لیگ	شیخ شہید الاسلام

جن لوگوں کو جنرل سیکریٹری نامزد کیا گیا وہ شیخ مجیب الرحمٰن کے انتہائی بااعتماد اور قابل بھروسا افراد تھے۔ان تنظیموں کے مرکزی کمیٹی کے ممبران سی پی بی، نیپ مظفر اور عطاالرحمٰن کی جاتیو لیگ سے لیے گئے تھے۔بکسال کی تشکیل کے مطابق 16 جون 1975ء کو اخبارات کی بندش کا ایکٹ نافذ کر دیا گیا۔اس ایکٹ کے تحت چند ہفتہ وار اخبارات کے ساتھ صرف چار قومیائے گئے روزانہ اخبارات کو اشاعت کی اجازت دی گئی تھی۔باقی تمام اخبار بند کر دیئے گئے۔اس طرح جمہوریت کو مکمل طور پر دفن کرتے ہوئے پورے ملک کو دہشت کی عدیم المثال حکمرانی کے سپرد کر دیا گیا۔بکسال کی آمرانہ حکومت کے تحت لوگ ذاتی تحفظ کی عدم موجودگی میں اپنے ملک کے اندر ہی یرغمال بن چکے تھے۔

102۔آزادی تقریر کے حق پر پابندی اور پریس کا گلا گھونٹ دیا گیا تھا

1947ء سے آزادی تقریر کے حوالے سے لوگوں کو خالی وعدوں پر ٹرخایا جاتا رہا۔ہر حکومت نے پریس کی آزادی کے کھوکھلے وعدے کیے اور جمہوری اور بنیادی حقوق کے بلند بانگ دعوے کیے۔لیکن 1947ء

سے 1971ء تک اقتدار میں آنے والی ہر حکومت عوام کے ان بنیادی حقوق کو پامال کرتی رہی۔ آزادی کی جنگ اس قسم کی نامعقول حکمرانی، کالے قوانین اور ظالمانہ استبداد کے خلاف ایک احتجاج تھا۔ جنگ کے بعد جب عوامی لیگ نے اقتدار سنبھالا تو لوگ ایک حقیقی جامع آزادی کی توقع رکھتے تھے۔ لیکن اس حکومت کا پہلا حملہ پریس پر ہی تھا اور ایوب خان کے انتہائی نفرت انگیز ''پریس اینڈ پبلی کیشن آرڈیننس'' کی جگہ ''پرنٹنگ پریس اینڈ پبلی کیشن ایکٹ'' کا نفاذ کیا گیا۔ یہ ایکٹ ایوب حکومت کے آرڈیننس سے بھی زیادہ ظالمانہ ثابت ہوا۔ عوامی بکسال حکومت کے دوران اخبارات کے دفاتر پر چھاپے روزانہ کا معمول بن گئے تھے۔

وزیر مواصلات منصور علی نے 30 جنوری 1972ء کو اعلان کیا: ''حکومت میڈیا کی مکمل آزادی پر یقین رکھتی ہے۔'' حتیٰ کہ سپیشل پاور ایکٹ 1974ء کے نفاذ کے بعد بھی اس وقت کے وزیر اطلاعات نے کہا: ''حکومت پریس کی آزادی کو یقینی بنانا چاہتی ہے۔'' لیکن ان تمام اعلانات کے برعکس جون 1975ء میں تمام اخبارات کو بند کرنے کے بعد بکسال کے اس وقت کے وزیر اطلاعات قربان علی وضاحتاً نے کہا: ''ایک نئے معاشرے کے قیام کے لیے اخبارات کو بند کیا گیا ہے۔ کسی بھی اخبار کی اشاعت کے لیے نیا اجازت نامہ جاری نہیں کیا جائے گا۔'' یہ تھا بنگلہ دیش میں پریس کی آزادی کا آغاز اور اختتام۔ اگرچہ عوامی بکسال حکومت کی کابینہ کے اکثر وزرا بہت بڑھ چڑھ کر آزادی پریس کی باتیں کر رہے تھے، پریس کی آزادی ہمیشہ ایک فریب نظر ہی رہی۔

30 فروری 1972ء کو اس وقت کے قانون اور پارلیمانی امور کے وزیر ڈاکٹر کمال حسین نے صحافیوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا، ''صرف حکومت کی تعریف میں رطب اللسان نہ رہیں، حکومت کی غلطیوں کی نشان دہی بھی کریں۔'' 5 مارچ 1972ء کو نور عالم صدیقی نے دعویٰ کیا تھا کہ ''اگر حکومت نے کبھی پریس کی آزادی کو کچلنے کی کوشش کی تو ایسے کسی بھی قسم کے اقدامات کے خلاف طلبا ملک گیر تحریک چلائیں گے۔'' لیکن ستم ظریفانہ طور پر جب فروری 1975ء میں آزادی پریس کا گلا گھونٹا گیا تو نور عالم صدیقی سمیت ان تمام رہنماؤں نے جو پارلیمنٹ میں موجود تھے، اس کے خلاف ایک لفظ بھی نہ کہا۔ حقیقت میں جب 19 ستمبر 1973ء کو ''پرنٹنگ پریس اینڈ پبلی کیشن ایکٹ'' پاس کیا گیا تو جھوٹے دعوے داروں کے اس گروہ نے نہ صرف یہ کہ اس کے خلاف کسی قسم کی مزاحمت نہ دکھائی بلکہ اس کے حق میں ووٹ بھی دیئے۔

7 مارچ 1972ء کو اس وقت کے سوشل سیکریٹری عوامی لیگ عبیدالرحمٰن نے کہا، ''اخبارات کی جانب سے تنقید جمہوریت کا ایک اہم جز و اور جمہوریت کے فروغ کے لیے انتہائی ضروری ہے۔'' 15 اپریل 1972ء کو اس وقت کے وزیر اطلاعات میزان الرحمٰن چوہدری نے کہا، ''حکومت آزادی پریس کو یقینی بنانے کا پختہ تہیہ کیے ہوئے ہے۔'' 4 مئی 1972ء کو پارلیمنٹ کے سپیکر محمود اللہ نے کہا، ''جمہوری کلچر کو فروغ دینے کے لیے پریس کی آزادی انتہائی ضروری ہے۔'' انہوں نے مزید کہا، ''حقائق خواہ حکومت کے حق میں ہوں یا خلاف، پریس کو انہیں منظر عام پر لانا چاہیے۔'' لیکن اپنی ان باتوں کے بالکل برعکس 22 مئی 1972ء کو ست کھیرا میں ایک صحافی کو

مقامی ایم پی کے ساتھ اختلاف رائے کی بنا پر گرفتار کر لیا گیا۔

29 مئی 1972ء کو عبدالرزاق نے ایک بیان میں کہا، ''کچھ عرصہ سے ہم انتہائی تکلیف کے عالم میں یہ دیکھ رہے ہیں کہ ایک اخبار ''گانوشکتی'' جس کے ایڈیٹر سمیو وادی دَل کے کامریڈ طہٰ ہیں، ابھی تک ملک کے لیے ''پوربو بنگلہ'' کے الفاظ استعمال کر رہا ہے۔ اس کے علاوہ ہالیڈے، حق کتھا اور چارم پترا تینوں اخبار جھوٹی اور بدباطنی پر مبنی خبریں شائع کر رہے ہیں جس سے بنگلہ دیش اور دوسرے دوست ممالک کے درمیان دوستانہ تعلقات میں دراڑیں پیدا ہو رہی ہیں۔ یہ بنگلہ دیش کو تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ یہ ایڈیٹر کتنی آسانی سے اُن ممالک کی وہ خدمات بھول گئے ہیں جو انہوں نے محض ایک سال پہلے جنگ آزادی کے دوران انجام دی تھیں؟ یہ اخبارات کس طرح ساڑھے چار ماہ کے اندر اس قدر احسان فراموش بن گئے ہیں؟ کیا وہ اس جمہوری رویے کی وجہ سے اس قدر بے باک ہو رہے ہیں جس کا مظاہرہ بڑی فراخ دلی کے ساتھ بنگو بندھو کر رہے ہیں؟ میں انہیں متنبہ کرنا چاہتا ہوں کہ اس قسم کی جسارت جو کہ عوام کے مفاد کے خلاف کی جارہی ہے قابل برداشت نہ ہو گی کیوں کہ ایسی سرگرمیاں ہمارے غیر ملکی دوستوں اور خود ہمارے خلاف ایک سازش کا حصہ ہیں۔ ہم ان اخبارات کے خلاف حکومت کی جانب سے فوری کارروائی کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اگر حکومت کوئی ایکشن لینے میں ناکام رہتی ہے تو پھر عوام خود کسی مناسب کارروائی کے بارے میں غور کرنے پر مجبور ہوں گے۔''

اسی عبدالرزاق نے 19 ستمبر 1974ء کو ''ڈینک بنگلہ'' میں اپنے ایک انٹرویو میں دوبارہ پریس کی آزادی کی ضرورت پر زور دیا۔ بعد میں اس کا یہ انتباہ ایذا رسانی میں تبدیل ہو گیا۔ احتجاج کے طور پر 20 جون کو ڈھاکہ سنگ بادک یونین نے ایک بیان جاری کیا جس میں کہا گیا، ''پریس عوام کو حقائق سے آگاہ کرنے کے حوالے سے کسی انتباہ یا دباؤ کو قبول نہیں کرے گا۔ ایسی صورت حال پیدا کر دی گئی ہے کہ کچھ لوگ میڈیا کے افراد کو دھمکانے کے لیے اخبارات کو استعمال کر رہے ہیں۔ ماضی میں یونین نے ایسے بیانات شائع کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ ہم ایسے اعلانات کی تکرار نہیں چاہتے۔'' تمام متعلقہ لوگوں کو کسی بھی حلقہ کی جانب سے کسی بھی صورت حال میں ایسے اعلانات شائع نہ کرنے کی درخواست کی گئی۔ حکومت نے ان تمام پیش رفتوں کی جانب کوئی توجہ نہ دی۔ 21 جون 1972ء کو ''حق کتھا'' کے ایڈیٹر کو گرفتار کر لیا گیا تھا۔ 17 جون 1972ء کو ڈھاکہ سنگ بادک یونین کے سالانہ جلسے میں شیخ مجیب الرحمٰن نے یقین دہانی کرائی کہ حکومت آزادیِ پریس میں مداخلت نہیں کرے گی۔ انہوں نے کہا، ''نام نہاد ترقی پسندوں نے حکومت پر تنقید کرنا شروع کر دی ہے۔ اس قسم کی تنقید بنگلہ دیش کی بنیادوں کو نقصان پہنچا رہی ہے۔ کوئی بھی حکومت اس قسم کی آزادانہ تنقید کو برداشت نہیں کر سکتی۔'' اس کے بعد قربان علی نے ''ڈینک بنگلہ'' کو ایک انٹرویو میں کہا، ''اخبارات کو مکمل آزادی نہیں دی جا سکتی۔'' 6 ستمبر 1972ء کو ہفت روزہ مکھ پترا کے ایڈیٹر فیض الرحمٰن کو سپیشل پاورز ایکٹ کے تحت گرفتار کر لیا گیا۔ 7 ستمبر 1972ء کو چٹاگانگ میں دیش بنگلہ کے دفتر کو آگ لگا دی گئی۔ میڈیا اور اخبارات کے خلاف دھمکیوں اور دباؤ میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اس پس منظر میں ڈھاکہ سنگ بادک یونین نے ایک بیان میں مطالبہ کیا، ''عدالتی حکم کے

بغیر کسی بھی اخبار یا پبلی کیشن کو بند نہیں کیا جا سکتا۔ وہ اخبارات جنہیں پہلے ہی بند کیا جا چکا ہے انہیں عدالت میں جانے کی اجازت ہونی چاہیے۔ پرنٹنگ پریس اینڈ پبلی کیشن ایکٹ کو فوری طور پر ختم کر دینا چاہیے۔"

میڈیا کو تنبیہات اور دھمکیوں کے ساتھ ساتھ حکومت نے اکتوبر 1972ء کو ایک حکم نامہ جاری کیا جس میں کہا گیا تھا، "حکومتی اور نیم حکومتی اداروں، خودمختار تنظیموں، قومیائے گئے شعبوں، ریڈیو اور ٹی وی کے ملازمین کو متعلقہ حکام کی پیشگی اجازت کے بغیر عوام میں اپنے خیالات اور نظریات کا پرچار نہیں کرنا چاہیے اور ان کو تحریری طور پر کوئی چیز شائع کرنے کی اجازت بھی نہیں ہوگی۔" 26 اکتوبر 1972ء کو ڈاکٹر احمد شریف نے 54 دیگر دانشوروں کے ہمراہ اس حکومتی حکم کے خلاف احتجاج کیا۔ اس دَور میں آئین کا اعلان کیا گیا، لیکن "پرنٹنگ پریس اینڈ پبلی کیشن ایکٹ" میں کوئی تبدیلی نہ کی گئی۔ اسے آئین میں جوں کا توں رکھا گیا۔ ایک معروف دانشور اور سیاست دان نے آئین پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا، "عوام کو اظہار خیال اور پریس کی آزادی سے روک دیا گیا ہے۔ ملک کو قانون کی حکمرانی سے محروم رکھا گیا ہے۔"

پھر یکم جنوری 1973ء کا دن آیا جب پریس کلب کے مقابل یو ایس آئی ایس کی عمارت کے سامنے پولیس نے دو طالب علم مظاہرین کو ہلاک کر دیا۔ دَینک بنگلہ نے شام کے ٹیلیگرام میں اس واقعہ کی رپورٹ شائع کی۔ اس کی پاداش میں دَینک بنگلہ کے ایڈیٹوریل بورڈ کے چیئرمین حسن حفیظ الرحمٰن اور سیکریٹری نواب خان کو ملازمتوں سے برطرف کر دیا گیا۔ 4 جنوری 1973ء کو دَینک بنگلہ کے کارکنوں اور ملازمین نے وزیراعظم سے ان کی بحالی کا مطالبہ کیا۔ وفد سے ملاقات کرتے وقت شیخ مجیب الرحمٰن نے 2 جنوری کی ٹیلی گرام کی کاپی ہاتھ میں پکڑے ہوئے کہا، "میرے اخبار میں یہ کس قسم کی خبر ہے؟ اگر یہ اصولی معاملہ ہے تو پھر اسے پریس کلب کی حدود میں رکھیں۔ اپنے جذبات کا اظہار اپنے ڈرائنگ روموں میں کریں میرے اخبار میں نہیں۔" اس بیان سے قوم کو علم ہوا کہ قومیائے گئے اخبارات شیخ مجیب الرحمٰن کی نجی ملکیت تھے۔ ستم ظریفانہ طور پر اس واقعہ سے محض 9 دن پہلے 22 دسمبر 1972ء کو اس وقت کے وزیر اطلاعات میزان الرحمٰن چوہدری نے اعلان کیا تھا، "حکومت قومیائے گئے اخبارات کے معاملات میں ذرّہ بھر بھی مداخلت نہیں کرے گی۔ عوامی لیگ اور بنگلہ بندھو ایک لمبے عرصے تک پریس کی آزادی کے لیے جدوجہد کرتے رہے ہیں۔"

تمام تر ممکنہ کوششوں کے باوجود اُن دو صحافیوں کو بحال نہ کروایا جا سکا۔ نیپ مظفر اور ماسکو نواز چھترا یونین نے احتجاجی مارچ کا اعلان کر دیا۔ 5 جنوری 1973ء کو چھترا لیگ کے رہنما نے پلٹن میدان میں ایک جلسے سے خطاب کرتے ہوئے کہا، "دَینک بنگلہ سے دو پاکستانی ایجنٹوں کو نکال دیا گیا ہے۔ دوسرے اخبارات میں بھی ایسے ایجنٹ موجود ہیں۔ 15 مارچ سے چھترا لیگ ایسے تمام پاکستانی ایجنٹوں کے خلاف تحریک کا اعلان کرے گی۔" انہوں نے صحافیوں کو دوبارہ خبردار کیا کہ "وزیراعظم کے نام کے ساتھ "بابائے قوم" یا "بنگلہ بندھو" کا لقب استعمال کیا جائے ورنہ انہیں سنگین نتائج بھگتنا پڑیں گے۔" اس کے بعد بھی ایم آر صدیقی اور عبدالعزیز نے یہ راگ الاپنا جاری رکھا کہ حکومت آزادیٔ پریس کے تحفظ کا عزم کیے ہوئے ہے۔ اس قسم کے متضاد

بیانات کچھ دوسرے رہنماؤں کی جانب سے بھی سنے جا رہے تھے۔ عوامی لیگ کے قدآور رہنماؤں میں آزادیٔ پریس کے بارے میں اس اختلاف رائے کے باوجود میڈیا اور اس کے کارکنوں کو دبانے کا عمل بے روک ٹوک جاری رہا۔

جے ایس ڈی کا نقیب ''گانو کنتھا'' ایک قومیائے گئے ادارے ''جنتا پرنٹنگ اینڈ پیکجز'' سے شائع ہوتا تھا۔ 29 مارچ 1973ء کو حکومت نے اس ادارے کے لیے ایک نئے ایڈمنسٹریٹر کا تقرر کیا۔ اس نے ''گانو کنتھا'' سے ہمدردی رکھنے والے تمام ملازمین کو ملازمتوں سے برخاست کر دیا۔ ڈھاکہ سنگ بادک یونین نے ایک احتجاجی جلسے کا انعقاد کیا اور نشانہ بنائے جانے والے ملازمین کے ساتھ یک جہتی کے اظہار کے لیے ہڑتال کر دی۔ 13 مئی 1973ء کو ''ڈینک سوادش'' حکومت کے حکم پر بند کر دیا گیا۔ 18 جون 1973ء کو پرنٹنگ پریس اینڈ پبلی کیشن ایکٹ کے تحت ''نیا جگ'' کے ایڈیٹر کو گرفتار کر لیا گیا۔ حق کوتھا پترا، مکھو پترا، سپوکس مین، لال پوتا کا، گونوشکتی کو بھی اس ڈریکولائی ایکٹ کے تحت بند کر دیا گیا۔

29 جون کو سنگ بادک یونین نے وزیر صنعت کی جانب سے ایک صحافی کے خلاف نازیبا الفاظ استعمال کرنے پر احتجاج کرتے ہوئے دعویٰ کیا، ''سچ بولنا خطرناک ہو چکا ہے۔ ہم دھمکیوں کے تحت ایک محدود دائرے میں رہتے ہوئے کام کر رہے ہیں۔'' 5 جولائی 1973ء کو وزیر اطلاعات نے دوبارہ پارلیمنٹ میں بے شرمی کے ساتھ یہ بیان دیا، ''ملک میں پریس کو مکمل آزادی حاصل ہے۔'' اس کے فوراً بعد 12 اگست 1973ء کو چٹاگانگ کے ''دیش بنگلہ'' کو بغیر کسی پیشگی نوٹس کے بند کر دیا گیا اور اس کے ایڈیٹر کو صدارتی آرڈر 50 کے تحت گرفتار کر لیا گیا۔ اس کے صرف ایک دن بعد 14 اگست 1973ء کو عوامی لیگ کے وزیر اطلاعات نے کہا، ''پریس کی آزادی موجودہ حکومت کے ایمان کا حصہ ہے۔'' عوامی لیگ کے اس مکروہ اور شرمناک کردار کے سامنے نوآبادیاتی برطانوی حکومت یا پاکستانی فوجی ٹولے کا دورِ حکومت بھی ماند پڑ گیا تھا۔ 23 نومبر 1973ء کو ''ویکلی ویوز'' کو بھی ایک عدالتی حکم نامے کے تحت بند کر دیا گیا۔

''دیش بنگلہ'' کے خلاف حکومتی کارروائی کے خلاف سنگ بادک یونین نے سخت مؤقف اختیار کیا۔ انہوں نے حکومتی ظلم و ستم کے خلاف تحریک چلانے کا فیصلہ کیا۔ 27 اگست 1973ء کو بنگلہ دیش فیڈرل سنگ بادک یونین کے صدر مسٹر نرل سین نے کہا، ''صدارتی آرڈر نمبر 50 سمگلروں کو پکڑنے کے لیے استعمال نہیں کیا جا رہا بلکہ اس کے تحت صحافیوں کو گرفتار کیا جا رہا ہے۔ سچ بیان کرنا حقیقتاً بہت خطرناک ہو چکا ہے۔'' 28 اگست 1973ء کو عوامی لیگ کی حکومت نے ایوب دورِ حکومت کے ''پریس اینڈ پبلی کیشن آرڈیننس'' کو ''پرنٹنگ پریس اینڈ پبلی کیشن (رجسٹریشن اینڈ ڈیکلریشن) ایکٹ 73'' کے ساتھ تبدیل کر دیا۔ 19 ستمبر 1973ء کو یہ ایکٹ پارلیمنٹ سے پاس کروالیا گیا۔ سپیکر عبدالمالک عقیل نے اس ایکٹ پر بحث کرتے ہوئے پارلیمنٹ میں کہا، ''کوئی بھی ملک دشمن پبلی کیشن برداشت نہیں کی جائے گی۔ اس بل کے پاس کیے جانے کا مقصد پریس کی آزادی کو سلب کرنا ہرگز نہیں ہے۔ بلکہ دوسرے ممالک کی طرح مناسب حدود کا تعین کرنا ہے۔''

اس بل پر جے ایس ڈی کے عبداللہ سرکار نے کہا،''یہ بل ایوب خان کے بل سے بھی بدتر ہے۔ اس قانون کے تحت حکومت کی تعریف کے علاوہ اور کچھ کہنا ممکن ہی نہیں ہے۔'' انہوں نے مزید کہا،''اگر کوئی اخبار ملک کے خلاف کچھ لکھتا ہے تو لوگ خود ہی وہ اخبار نہیں خریدیں گے، لہٰذا ایسے قانون کی کیا ضرورت ہے؟'' جواب میں عقیل نے کہا،''کسی کو بھی مسلمہ شائستگی اور اخلاقی اقدار کے خلاف لکھنے یا بولنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔''''ویکلی ہالیڈے'' کے خلاف تبصرہ کرتے ہوئے انہوں نے عنایت اللہ خان کو حرامی کہا۔ انہوں نے انہیں مزید قابل اعتراض گالیوں سے بھی نوازا۔ قومی پارلیمنٹ میں اس قسم کی گفتگو کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ انہوں نے یہ دعویٰ بھی کیا کہ اس بل کے بارے میں صحافیوں اور میڈیا کے افراد سے پیشگی مشاورت کی گئی تھی۔ بی ایف یو جے نے 23 ستمبر 1973ء کو ان کے اس دعویٰ کی ایک بیان میں نفی کرتے ہوئے کہا،''قابل احترام سپیکر کے دعویٰ کے برعکس کسی سے بھی مشاورت نہیں کی گئی تھی۔ اس کے علاوہ لفظ''حرامی'' انتہائی قابل مذمت ہے۔ یہ تہذیب کی تاریخ کا ایک سیاہ باب ہے۔ یہ قابل اعتراض، قابل نفرت اور غیر مہذب ہے۔'' عنایت اللہ خان نے مزید کہا،''ہالیڈے کو بند کرنے کی سازش کی جا رہی ہے۔''

ان دنوں میں حکومت کی ہندوستان کے لیے محبت عروج پر تھی۔ وزیر اعظم سے لے کر وزرا اور ہر سطح کے رہنماؤں نے خبردار کیا تھا کہ''دوست ممالک کے بارے میں کسی قسم کی تنقید کو برداشت نہیں کیا جائے گا۔'' انہی دنوں کلکتہ کے اخبار''آنندو بازار پتریکا'' نے ایک مضمون شائع کیا جس میں کہا گیا تھا کہ ''ہندوستان بنگلہ دیش کا نجات دہندہ ہے۔'' اسی اخبار میں مولانا بھاشانی پر''مولانا کا جہادی جگر'' کے عنوان کے تحت شدید تنقید کی گئی۔ مولانا کی قابل اعتراض الفاظ کے ذریعے سرزنش کی گئی۔

5 اگست 1973ء کو ڈھاکہ سنگ بادک یونین نے ایک بیان میں کہا،''یہ بات کہ ہندوستان بنگلہ دیش کا نجات دہندہ ہے، ہماری جنگ آزادی اور ہمارے بہادر مجاہدین آزادی کی شدید توہین ہے۔''آنندوا بازار پتریکا کے اس قسم کے گستاخانہ دعویٰ پر پوری قوم برہم تھی۔ لیکن عوامی لیگ، سی پی بی اور نیپ مظفر شرم ناک طور پر اس سارے معاملے پر مکمل طور پر خاموش رہیں۔ کیا اس کا مطلب یہ تھا کہ ہمارے مجاہدین آزادی نے بنگلہ دیش کو آزاد کرنے میں جو بھی کردار ادا کیا، عوامی لیگ اور اس کے حواری اسے تسلیم کرنے سے محترز تھے۔

اس دوران''Gano Kantha'' اور بہت سے دوسرے اخبارات کو مسلسل دھمکایا جا رہا تھا۔ 16 جنوری 1974ء کو ڈھاکہ سنگ بادک یونین نے کہا،''طاقت ور حلقوں کی جانب سے صحافیوں کو مختلف قسم کی دھمکیاں موصول ہو رہی ہیں جن میں موت کی دھمکیاں بھی شامل ہیں۔ وہ اخبارات کو جلانے کی دھمکیاں بھی دے رہے ہیں۔ ملک میں پریس کی آزادی بالکل نہیں ہے۔'' 10 جنوری 1974ء کو''بنگلہ دیش فیڈرل یونین آف جرنلسٹس'' نے ایک بیان میں کہا،''بی ایف یو جے انتہائی غم اور مایوسی کے عالم میں یہ دیکھ رہی ہے کہ پارلیمنٹ کے حالیہ اجلاس میں سپیشل پاورز ایکٹ 74 پاس کیا گیا ہے۔ یہ میڈیا اور صحافیوں کو سزائیں دینے کے لیے ایک اور قانون ہے، اگرچہ پہلے سے موجود کالے قوانین جوں کے توں موجود ہیں۔ اس قانون کے تحت

کسی بھی خبر کی اشاعت پر، جسے ناموافق خیال کیا جائے پبلشر، ایڈیٹر، ڈرافٹس مین اور رپورٹر کو طلب کیا جا سکے گا، کسی بھی نمایاں یا غیر نمایاں، سچی یا جھوٹی خبر کو ملک دشمن قرار دیا جا سکتا ہے اور متعلقہ افراد کو سزا دی جا سکتی ہے۔ بی ایف یو جے گزشتہ کالے قوانین اور موجودہ قانون کو فوری طور پر ختم کرنے کا مطالبہ کرتی ہے اور ان قوانین کو پریس کی آزادی کے لیے کیے گئے حکومتی وعدوں کے خلاف خیال کرتی ہے۔ اس قسم کی دوہرے معیار پر مبنی حکومتی پالیسی پر افسوس کا اظہار کیا جاتا ہے۔ یہ بات بھی مشاہدے میں آئی ہے کہ سپیشل پاورز ایکٹ 74 کے پاس کیے جانے سے محض ایک دن قبل حکومت نے پریس کونسل کی تشکیل کا بل بھی پاس کیا۔ یہ بات حیرانی کا باعث ہے کہ حکومت نے دو متضاد قوانین پاس کیے ہیں۔ سپیشل پاورز ایکٹ کی موجودگی میں پریس کونسل کا قیام بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ لہٰذا بی ایف یو جے حکومت سے سپیشل پاورز ایکٹ 74 کی فوری منسوخی کا مطالبہ کرتی ہے۔''

17 مارچ 1974ء کے واقعہ کے بعد دھمکیوں اور سزاؤں کے ایک نئے دَور کا آغاز ہو گیا۔ اس دن جلسے کے بعد جے ایس ڈی کے سرگرم کارکنوں نے وزیر داخلہ کے گھر کا گھیراؤ کر لیا۔ پولیس نے گولیاں چلائیں اور بہت سے لوگ مر گئے۔ ''گانوکنتھا'' کو بند کر دیا گیا۔ 18 مارچ 1974ء کو جی پی او کے سامنے ''کاسکو'' (COSCO) کے اوپر واقع جے ایس ڈی کے دفتر کو عوامی لیگ کے لیڈروں نے آگ لگا دی۔ ''گانوکنتھا'' کے ایڈیٹر اور شاعر علی محمود اور دیگر افراد کو گرفتار کر لیا گیا۔ جولائی میں مولانا بھاشانی کے اخبار ''پراکووارتا'' کے ایڈیٹر کو گرفتار کر لیا گیا۔ چٹاگانگ سے شائع ہونے والے اخبار ''ایسٹرن ایگزیمینر'' کو بھی بند کر دیا گیا۔ 16 دسمبر 1974ء کو حکومت نے ہفت روزہ ''ابھیمت'' کے خلاف سراج شیکدار اور اس کی پارٹی کی خبر شائع پر کارروائی کی گئی اور ایڈیٹر علی اشرف کے وارنٹ گرفتاری جاری کر دیئے گئے۔

6 جولائی 1974ء کو بنگلہ دیش سنگ بادک یونین کے سہ روزہ اجلاس کا آغاز ہوا۔ بی ایف ایس یو کے صدر نرمل سین کی صدارت میں ایک قرارداد پیش کی گئی جس میں کہا گیا:

''ہمارا بیان برسراقتدار پارٹی عوامی لیگ سے متعلق ہے۔ عوامی لیگ نے پاکستان کے دَور میں صحافیوں کے شانہ بہ شانہ پریس کی آزادی کے لیے تحریک کا آغاز کیا تھا اور ان کے روزگار کی جدوجہد میں ان کا ساتھ دیا تھا۔ عوامی لیگ نے صحافیوں کو دی گئی سزاؤں کے خلاف شروع ہونے والی تحریک میں بھی حصہ لیا تھا اور ایوب خان کے ''پریس اینڈ پبلی کیشن آرڈیننس'' کے خلاف میڈیا کے افراد کی تحریک کی بھی حمایت کی تھی۔ لہٰذا قدرتی طور پر یہ توقع کی جا رہی تھی کہ آزاد بنگلہ دیش میں اس کے دورِ حکومت میں پریس کی آزادی میں رخنہ سازی نہیں کی جائے گی، پریس کے خلاف جبر و استبداد کا خاتمہ ہو جائے گا اور پریس اینڈ پبلی کیشن ایکٹ کو ختم کر دیا جائے گا اور حکومت اپنے طور پر صحافیوں پر کوئی حکم مسلط کرنے کی کوشش نہیں کرے گی۔ لیکن حقیقت میں ایسا نہ ہو سکا۔ آزادی کے محض ایک سال کے بعد حکومت نے کالے قانون کے تحت بہت سے اخبارات بند کر دیئے، بہت سے ایڈیٹروں کو گرفتار کر لیا گیا۔ حکومت نے پریس اینڈ پبلی کیشن آرڈیننس کو ختم کرنے کے لیے کوئی

کارروائی نہ کی، اگرچہ یہ عوامی لیگ کے انتخابی وعدوں میں سے ایک تھا۔ حیران کن حقیقت یہ ہے کہ حکومت نے یونینوں کے ساتھ کسی بھی مسئلے پر گفت وشنید پر بھی غور نہیں کیا۔ حکومت کا ہر فیصلہ یک طرفہ تھا۔ بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی بلکہ سپیشل پاورز ایکٹ اور پرنٹنگ پریس اینڈ پبلی کیشن ایکٹ کے نفاذ سے بڑی مہارت کے ساتھ ایوب خان کے پریس اینڈ پبلی کیشن آرڈیننس کی تمام دفعات کو اس نئے قانون میں شامل کر دیا گیا ہے۔ ان حالات کے تحت ہم عوام سے سوال کرتے ہیں کہ پریس کس طرح مثبت انداز میں اپنی ذمہ داریاں پوری کر سکتا ہے؟ ان تمام معاملات میں افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ جب پریس نے سول حکام کی مدد کے لیے فوج کی تعیناتی کو خوش آمدید کہا، تو صحافیوں کو طلب کر کے حکم دیا گیا کہ پیشگی اجازت کے بغیر فوجی کارروائیوں کے بارے میں کوئی بھی خبر اخبارات میں شائع نہیں کی جا سکے گی۔ ایسی صورتِ حال میں ہم کس طرح تعاون کر سکتے ہیں؟ دیانت دارانہ صحافت کا کیا امکان باقی رہ جاتا ہے؟ وہ کارروائیاں جو مثبت بحث اور تنقید کے ذریعے زیادہ کامیابیاں حاصل کر سکتی تھیں، ان کا دروازہ بند کر دیا گیا۔ اس طرح یہ کارروائیاں یک طرفہ رپورٹنگ کے تناظر میں مطلوبہ نتائج حاصل نہیں کر سکتیں۔ یہ ملک میں پریس اور اخبارات کی عمومی حالت زار ہے۔ ان حقائق کی روشنی میں ہم عوام، اپنے حمایتیوں، حزب مخالف کی سیاسی پارٹیوں اور عوامی لیگ حکومت سے سابقہ وعدوں پر عمل کرنے اور صورتِ حال کی سنگینی کو سمجھنے کی درخواست کرتے ہیں۔ ملک کے صحافی اور میڈیا کے افراد پریس کی آزادی کو یقینی بنانے کے لیے آپ کے تعاون کے خواہش مند ہیں۔"

جولائی 1974ء میں بنیادی حقوق کے تحفظ و قانونی معاونت کمیٹی کی ورکنگ کمیٹی نے لوگوں کے بنیادی اور جمہوری حقوق کی بگڑتی ہوئی صورتِ حال کا جائزہ لیتے ہوئے بیان دیا، "اس وقت بنگلہ دیش کی حکومت اپنے مخالفین کے لیے جے آر بی کو اہم ہتھیار کے طور پر استعمال کر رہی ہے۔ جے آر بی کو سپیشل پاورز ایکٹ کے تحت سماج دشمن عناصر کی سرکوبی کے اختیارات سونپے گئے ہیں۔ لیکن حقیقت میں وہ اس اختیار کو سیاسی مخالفت کو کچلنے کے لیے استعمال کر رہی ہے۔ شہری اور دیہاتی علاقوں میں راکھی باہنی کی بڑے پیمانے پر تعیناتی کے ذریعے حکومت نے لوگوں کی سماجی اور سیاسی زندگی میں دہشت اور خوف کا راج قائم کر رکھا ہے۔ لوگوں کو سیاسی سرگرمیوں میں ملوث ہونے کے جرم میں گرفتار کیا جا رہا ہے اور اس سلسلے میں کم سے کم ضابطے کی کارروائیوں کو بھی ملحوظ نہیں رکھا جا رہا۔ وہ حراست میں لیے گئے افراد کو غیر انسانی تشدد کا نشانہ بنا رہے ہیں۔ سیاسی مخالفین پر بربریت کے یہ واقعات اخبارات میں شائع ہو رہے ہیں جن میں قومیائے گئے چند اخبارات بھی شامل ہیں۔ حکومت نہ صرف یہ کہ مخالفت کو سزاؤں اور گرفتاریوں کے ذریعے دبانے کی کوشش کر رہی ہے بلکہ اس مقصد کے لیے پورے ملک میں دفعہ 144 کا نفاذ بھی کیا گیا ہے۔ یہ سب کچھ نام نہاد "تخلیص مہم" کے نام پر کیا جا رہا تھا، جس کا آغاز دو ماہ قبل کیا گیا تھا۔ لیکن دفعہ 144 کے نفاذ کا اصل مقصد حزب اختلاف کے منظم ہونے کے بنیادی حق کو سلب کرنا ہے۔ ہم عوام کی توجہ ایک اور حقیقت کی جانب بھی مبذول کروانا چاہتے ہیں۔ افراد پر بیانات دینے اور اخبارات میں لکھنے پر لگائی جانے والی پابندیوں اور نیوز پرنٹ کی سپلائی پر

پابندی نے اخبارات اور پبلی کیشن کے میدان میں سنگین رکاوٹیں کھڑی کر دی ہیں۔ ہم حکومت سے ان شکایات کے فوری ازالے اور سیاسی قیدیوں کی رہائی کا مطالبہ کرتے ہیں۔"

لیکن 20 نومبر 1974ء کو پارلیمنٹ میں پرنٹنگ پریس اینڈ پبلی کیشن ایکٹ میں ایک نئی دفعہ کا اضافہ کر دیا گیا، جس کے مطابق: "اگر کوئی اخبار ایسا مواد شائع کرتا ہے جو عوام کو انتظامیہ کے خلاف ابھارنے یا امن وامان کی صورت حال کو خراب کرنے یا کسی کو کسی جرم کے ارتکاب پر اکسانے یا بنگلہ دیش کے کسی دوست ملک کے ساتھ تعلقات کو نقصان پہنچانے کا موجب بنتا ہے تو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو ایسے اخبار کے ڈیکلیئریشن لائسنس کو منسوخ کرنے کا اختیار ہوگا۔"

حزب مخالف کے ایم پی عبدالستار نے اس بل پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا، "اتفاق (اخبار) کو اسی قسم کے ایکٹ کے تحت بند کیا گیا تھا۔ یہ ایکٹ پٹ سن کی سمگلنگ، کھاد فیکٹریوں میں دھماکوں، وزرا اور حکومت کے بااثر حواریوں کی غیر ملکی بینکوں میں جمع کروائی گئی غیر قانونی رقوم کے بارے میں خبروں کی اشاعت کو روکتا ہے۔" وہ احتجاج کے طور پر واک آؤٹ کر گئے۔ 28 دسمبر 1974ء کو ہنگامی حالت کا نفاذ کر دیا گیا۔ 2 جنوری 1975ء کو ایک سیاسی جماعت کے چیئرمین سراج شیکدار کو حکومتی حراست میں انتہائی وحشیانہ انداز میں قتل کر دیا گیا۔ حکومتی بیان میں کہا گیا، "سراج شیکدار اپنی گرفتاری کے بعد 'سے وار' کے علاقے میں اپنے ایک زیر زمین ٹھکانے کی جانب پولیس کو لے کر جا رہا تھا۔ راستے میں اس نے فرار ہونے کی کوشش کی اور پولیس فائرنگ سے مارا گیا۔" اگر کوئی شخص بھاگتا ہوا مارا جائے تو اس صورت میں گولی اس کی پشت پر لگتی ہے۔ لیکن اس کے مردہ جسم میں سینے پر گولی لگی ہوئی تھی۔ ایوب دورِ حکومت میں اگرتلہ سازش کیس کا ایک ملزم سارجنٹ ظہور الحق بھی اسی انداز سے مارا گیا تھا۔ انتظامیہ نے ایسی ہی کہانی بیان کی تھی کہ وہ فرار ہونے کی کوشش میں مارا گیا تھا۔ اس کے جواب میں شیخ مجیب الرحمٰن نے دعویٰ کیا تھا کہ سارجنٹ ظہور الحق کو قتل کیا گیا ہے۔ لیکن اُسی شیخ مجیب الرحمٰن نے سراج شیکدار کے مارے جانے کے بعد پارلیمنٹ میں بڑے فخریہ انداز میں کہا، "آج سراج شیکدار کہاں ہے؟" یہ کسی سربراہِ مملکت یا سربراہِ حکومت کی جانب سے پارلیمنٹ میں دیئے جانے والا ایک انتہائی شرمناک بیان تھا جس کی مثال حالیہ تاریخ میں کہیں نظر نہیں آتی۔ 3 جنوری 1975ء کو سپیشل پاورز ایکٹ کا نفاذ کر دیا گیا۔ 24 جنوری 1975ء کو یکسال کی یک حزبی حکومت متعارف کروا دی گئی۔ اس کے بعد 16 جون کو "پرنٹنگ پریس اینڈ پبلی کیشن ایکٹ" نافذ کر دیا گیا۔ پورے ملک میں صرف چار قومیائے گئے اخبارات کو رہنے دیا گیا دیگر تمام اخبارات بند کر دیئے گئے اور اس طرح جمہوریت کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی گئی اور پوری قوم کا گلا گھونٹ دیا گیا، جو اس حبس زدہ فضا میں بہ مشکل سانس لے رہی تھی۔

103۔ بدعنوانی اور بے ضابطگیاں بلا روک ٹوک جاری

آزادی کے بعد عوامی لیگ نے ریاستی پالیسی کے طور پر سوشلزم اور مجیب واد (مجیب ازم) کا ایک

مخصوص ملغوبہ پیش کیا۔ ان بنیادوں پر اس وقت کے وزیر محنت نے یکم فروری 1972ء کو اعلان کیا کہ تمام صنعتی یونٹوں میں 30 فیصد حصے محنت کشوں کے لیے، 30 فیصد حصے مالکان کے لیے اور 40 فیصد ریاست کے لیے مخصوص ہوں گے۔ نور عالم صدیقی نے کہا، ''کم آمدنی والے کارکن زیادہ فوائد حاصل کریں گے۔'' عوامی لیگ کا معاشی ہدف ملی جلی معیشت کے ذریعے مجیب ازم کا قیام تھا۔ لیکن 1972ء سے 1975ء کے عرصے کے دوران اس وقت کے اخبارات سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ بدانتظامی، بدعنوانی، جانب داری اور اقربا نوازی کے نتیجے میں تمام صنعتی یونٹ دیوالیہ ہو رہے تھے جب کہ اقتدار سے منسلک لوگ لوٹ مار اور غارت گری کی دوڑ میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش میں مصروف تھے۔ شیخ مجیب الرحمٰن کی اپیل، ''میں تین سال کے لیے کچھ بھی دینے کے قابل نہیں ہوں''، پر کسی نے کان نہ دھرے۔ محنت کش طبقہ اپنے جائز مطالبات کے ساتھ آگے بڑھا۔ اس مرحلے پر عوامی لیگ نے صنعتی میدان میں ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' کی پالیسی اختیار کیے رکھی۔ 28 مئی 1972ء کو قومیائے گئے شعبے میں ایک حکومتی حکم کے تحت ہڑتالوں پر پابندی لگا دی گئی۔ جاتیو سرامک لیگ کے عبدالمنان نے بھاوانی جیوٹ مل کے بارے میں انکشاف کیا، ''مل کے کارکن کمپنی چیئرمین جو کہ عوامی لیگ کا ایک ایم پی تھا اور انتظامیہ کمیٹی پر بہت برہم ہیں۔ مقرر کی گئی انتظامیہ اور ڈائریکٹر آف انڈسٹریز مل کر کروڑوں ٹکوں کا دھاگا، فاضل پرزہ جات اور کپڑا اسمگل کر رہے ہیں۔'' 1972ء اور 1975ء کے درمیان ملکی صنعتی شعبہ میں یہی صورتِ حال تھی۔

اگست 1972ء میں آدم جی میں ایک سنگین جھگڑا ہوا جہاں بہت سے کارکن مارے گئے۔ 7 فروری 1973ء کو چٹا گانگ کی بارپ کنڈا میں جاتیو راکھی باہنی نے 100 سے زیادہ کارکنوں کو مار دیا۔ یکم جنوری 1974ء کو ایک اخبار نے رپورٹ شائع کی کہ پیپلز جیوٹ ملز میں 80 لاکھ ٹکہ سے زائد کے فاضل پرزہ جات غائب ہیں۔ جیوٹ ملوں اور گوداموں میں آتش زدگی کے واقعات روزمرہ کا معمول بن چکے تھے۔ اس تباہ کاری کی سب سے بڑی مثال گھوراشال فرٹیلائزر پلانٹ میں ہونے والا دھماکا تھا۔ گھوراشال فرٹیلائزر کا کنٹرول روم ایک دھماکے کے ذریعے اڑا دیا گیا۔ حکومت کی تحقیقاتی رپورٹ میں محض یہ کہا گیا کہ یہ تخریب کاری کی کارروائی ہے اور اس میں پچاس کروڑ ٹکہ کا نقصان ہوا ہے۔ اس کے بعد بجلی کا شدید بحران پیدا ہو گیا۔ پارلیمنٹ کے ایک اجلاس میں انکشاف کیا گیا کہ قومیائی گئی ملوں میں 25000 کارکن زائد بھرتی کیے گئے ہیں۔ یہ کس طرح سے بھرتی ہوئے؟ اس بارے میں حکومت کی کوئی وضاحت موجود نہیں، کیوں کہ یہ وہ لٹیرے تھے جو مقررہ انتظامیہ کے لیے کام کرتے تھے۔

29 مارچ 1973ء کو ڈینک بنگلہ میں ایک رپورٹ شائع ہوئی، ''قومیائی گئی ملوں اور فیکٹریوں میں فنڈز کا غلط استعمال ہو رہا ہے۔ مزدور رہنماؤں کی جانب سے دباؤ کے نتیجے میں زائد کارکن بھرتی کیے جا رہے ہیں۔ وہ اپنے پٹھوؤں کو خرید و فروخت کے لیے ایجنٹوں کے طور پر بھرتی کروا رہے ہیں۔ وہ خود کوئی کام نہیں کرتے اگرچہ باقاعدگی سے تنخواہیں وصول کر رہے ہیں۔'' یہ مزدور رہنما کون تھے؟ ان لٹیروں کے خلاف کبھی

بھی کوئی انتظامی کارروائی عمل میں نہ لائی گئی۔ آج تک بنگلہ دیش اس ورثے کے بوجھ تلے دبا ہوا ہے۔ آسمان کو چھوتی ہوئی قیمتوں کی ایک بڑی وجہ بدعنوانیاں تھیں۔ لائسنس اور پرمٹوں کے اجرا میں بھی بے شمار بدعنوانیوں کا ارتکاب کیا گیا تھا۔ حتیٰ کہ 11 مئی 1973ء کو خود وزیر صنعت قمرالزمان کو ایک بیان میں تسلیم کرنا پڑا، ''25000 لائسنس یافتہ درآمد کنندگان میں سے 15000 جعلی ہیں۔'' ستم ظریفی یہ تھی کہ یہ لائسنس خود ان کی اپنی وزارت نے جاری کیے تھے۔ یہ لائسنس حاصل کرنے والے لوگ کون تھے؟ کیا ان جعلی لائسنس یافتگان کے خلاف وزارت نے کوئی کارروائی کی؟ تاہم وزیر نے ان سوالات کا کبھی جواب نہ دیا۔ ان حقائق سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ عوامی لیگ پاکستان دور کے بائیس بدنام زمانہ خاندانوں کی جگہ 2200 اشرافیہ خاندان پیدا کرنا چاہتی تھی۔ یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح تھی کہ وہ لوگ جن کو دھاگے کی درآمد کے لائسنس جاری کیے گئے تھے، ان کے پاس لومز نہیں تھیں۔ وہ لوگ جن کو کوئی تجربہ نہ تھا اور ان کے کاروباری ایڈریس بھی نہیں تھے، انہیں ڈیلر شپ اور درآمد کے لائسنس جاری کیے گئے تھے۔ ان بے قاعدگیوں کے نتیجے میں 1974ء کے قحط میں 6 لاکھ معصوم افراد زندگیوں سے محروم ہو گئے۔ جب لوگوں کی زندگیاں اس قدر ناگفتہ بہ ہو گئیں تو عوامی لیگ حکومت کے محض دو سالوں کے دوران عوامی لیگ سے تعلق رکھنے والے بہت سے نوجوان اور طالب علم رہنماؤں پر اصل حقیقت آشکار ہونے لگی۔ ان کے ذہنوں میں بہت سے سوالات آنے لگے۔ اس طرح عوامی لیگ کے اپنے حلقوں اور اس سے وابستہ اہم تنظیموں کے درمیان ایک مخاصمت کی فضا پیدا ہونا شروع ہو گئی۔ عوامی لیگ کے اندر موجود محبِّ وطن اور قوم پرست عناصر نے آواز اٹھانا شروع کر دی۔

23 مارچ 1974ء کو چترا لیگ (مجیب وادی) نے سینئر رہنماؤں کھنڈکر مشتاق احمد اور یوسف علی کو دو یادداشتیں پیش کیں۔ انہوں نے عوامی لیگ کے ان ارکان کی فہرست شائع کرنے کا مطالبہ کیا جنہوں نے کاریں اور جائیدادیں حاصل کی تھیں اور راتوں رات دولت مند بن گئے تھے۔ چترا لیگ کے جنرل سیکریٹری شفیع العالم پردھان نے قیادت سے ان تمام لوگوں کے نام مہیا کرنے کو کہا جو قومیائی گئی صنعتوں اور کاروباروں میں لوٹ مار اور غارت گری میں ملوث تھے۔ انہوں نے کھلے الفاظ میں کہا، ''حکمران جماعت کے وزرا اور رہنما مجرم ہیں جنہوں نے ملک میں جعلی کاروباری اشخاص اور تاجروں کو جنم دیا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو باہر آتے ہیں اور عوامی جلسوں میں خطبے دیتے ہیں۔ لیکن عام لوگ ان تمام لوگوں کو جانتے ہیں جنہوں نے غیر قانونی طور پر کاروں، جائیدادوں، پرنٹنگ پریسوں وغیرہ پر قبضہ کیا ہے اور بدعنوانیوں اور ناجائز ذرائع سے نو دولتیے بن گئے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی وجہ سے ملک کو اس قدر خوفناک بحرانوں کا سامنا ہے اور معیشت مکمل تباہی کے کنارے پہنچ چکی ہے۔''

30 مارچ کو شفیع العالم پردھان نے بیت المکرّم میں ایک عوامی جلسے میں 23 سیاسی رہنماؤں، بیوروکریٹس اور بزنس مینوں کے نام پڑھ کر سنائے جن پر بدعنوانیوں، سرمائے کی غیر ممالک میں منتقلی، جائیدادوں کے حصول، بیرون ملک سرمایہ کاری، چور بازاری اور سمگلنگ کے الزامات تھے۔ چترا لیگ کے

صدر حق چوہدری نے بھی اُسی دن ایک تقریر میں شیخ فضل الحق مونی کی جبو لیگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ اس کے ارکان جعلی ناموں کے تحت لائسنسوں، پرمٹوں اور ایجنسیوں کے حصول، یا پان سگریٹ سکینڈلوں، چھوڑی گئی جائیدادوں پر قبضوں اور بینکوں سے لاکھوں اور کروڑوں ٹکوں کے اوور ڈرافٹوں کے حصول جیسی غیر قانونی سرگرمیوں میں ملوث ہیں۔ یہ لوگ دھان منڈی، گلشن اور بنانی میں عالی شان گھروں کے مالک بن گئے ہیں اور لانچوں، بسوں اور ٹرکوں کی ملکیت کے ذریعے خطیر رقوم کے بھی مالک بن چکے ہیں۔ لیکن یہی عناصر انتہائی بے شرمی کے ساتھ عوامی جلسوں میں یہ جاننا چاہتے ہیں کہ بینک ڈکیتیوں، اغوا کی وارداتوں، پٹ سن کی آتش زدگیوں، زیر زمین ہلاکتوں، بدعنوان آفیسروں اور سمگلروں کے خلاف کیا کارروائیاں کی گئی ہیں۔ انہوں نے شیخ مونی کے ایک پرنٹنگ پریس پر غیر قانونی قبضے کی طرف بھی اشارہ کیا۔ شفیع العالم پردھان نے کہا، ''دو وزرا نے حال ہی میں گلشن کے علاقے میں محل نما عمارات تعمیر کی ہیں۔ ایک سابقہ ایم پی نے بیت المکرّم میں بنگلہ بندھو شیخ مجیب الرحمٰن کے نام پر چودہ دکانوں پر قبضہ کر لیا ہے۔ جب لوگ فاقوں سے مر رہے ہیں کچھ رہنما عوام کے خون سے دولت بنانے کے لیے ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کر رہے ہیں۔''

31 مارچ کو جبو لیگ کے اس وقت کے صدر شیخ فضل الحق مونی نے پردھان کی جانب سے بدعنوان اشخاص کی فہرست شائع کرنے پر احتجاج کیا۔ اس نے کہا، ''ان دنوں چترا لیگ کے رہنماؤں کی کارروائیاں سیاسی فوائد حاصل کرنے کے لیے ہیں۔ یہ اندرونی جھگڑوں اور معمولی باتوں پر الجھنے کا نتیجہ ہے۔'' تاہم انہوں نے ان الزامات یعنی پریس پر ناجائز قبضے اور بینک سے خطیر اوور ڈرافٹ کے بارے میں کوئی بات نہ کی۔ ڈھاکہ نگر عوامی لیگ کے نائب صدر نے ان لوگوں کو جنہوں نے یہ فہرست شائع کی تھی، بنگلہ ربانی کے دشمن حلقوں کے ایجنٹ قرار دیا۔ یہاں یہ ذکر ضروری ہے کہ شیخ مونی نے غیر قانونی طور پر ستارہ پاکستان نام کے پریس پر اور اخبار بنگلا ربانی پر قبضہ کر لیا تھا۔ چترا لیگ میں اس اندرونی جھگڑے کے نتیجے میں 3 اپریل کو ڈھاکہ یونیورسٹی میں ایک پُر تشدد تصادم ہوا۔ 4 اپریل کو محسن ہال میں سات طالب علموں کو بے دردی سے قتل کر دیا گیا۔ 7 کو شفیع العالم پردھان اور منیر الحق کی قیادت میں ایک تعزیتی جلوس نکالا گیا۔ اُس دن پردھان کو اس قتل کیس میں مشتبہ ملزم کے طور پر گرفتار کر لیا گیا۔ 8 اپریل کو پردھان کی گرفتاری پر احتجاج کے طور پر یونیورسٹی کیمپس میں گرنیڈ کا ایک دھماکا ہوا۔ چترا لیگ نے عوامی لیگ پارٹی آفس کے سامنے پردھان اور دیگر افراد کی فوری رہائی کے لیے دھرنا دیا۔ انہوں نے کہا، ''اگر صدارتی اختیارات کا غلط استعمال کیا گیا تو اس کے سنگین نتائج برآمد ہوں گے۔''

10 اپریل کو چھ طالب علموں نے پردھان اور دوسرے طالب علم رہنماؤں کی رہائی کا مطالبہ کرتے ہوئے بھوک ہڑتال کر دی۔ شیخ مجیب اپنے علاج کے لیے ماسکو گئے ہوئے تھے۔ وہ 12 اپریل کو واپس آئے اور ان کی مداخلت پر ہڑتالی طالب علموں نے بھوک ہڑتال ختم کر دی۔ لیکن پردھان سلاخوں کے پیچھے

ہی رہے۔ 4 اپریل کے واقعے کے بعد شیخ فضل الحق مونی کی قیادت میں چترا لیگ نے ہنگامی اجلاس میں ایک قرارداد پاس کی، ''چترا لیگ کو طالع آزما قیادت سے آزاد کرانے کی ضرورت ہے جو تنظیم کے مفادات کے خلاف عمل کر رہی ہے۔ کارکنوں نے ان کی طفلانہ اور تخریبی سرگرمیوں کو مسترد کر دیا ہے۔ جبو لیگ اس دوست تنظیم کو اپنی قیادت کے بحران پر قابو پانے کے لیے مدد دینے کو تیار ہے۔ صرف جبو لیگ کی مخلصانہ اور پُر شفقت مدد سے ہی چترا لیگ اپنی ماضی کی شان و شوکت بحال کرنے میں کامیاب ہو سکے گی۔ سب سے اوّلین اور اہم عمل جس کی اس وقت ضرورت ہے وہ موجودہ زوال پذیر قیادت سے چھٹکارا حاصل کرنا ہے، اور جبو لیگ چترا لیگ کو تمام تر ممکنہ مدد فراہم کرنے کو تیار ہے۔'' اس طرح ایک روایتی طلبا تنظیم کو یکسال کی آمریت کے ہاتھوں میں محض ایک ہتھیار میں تبدیل کر دیا گیا۔

104۔ قوم کو دھوکا

نیا جنم لینے والا ملک بنگلہ دیش بہت سی امیدیں اور بلند تمنائیں لیے ہوئے تھا۔ رہنماؤں کے لیے یہ وقت تھا کہ ان خوابوں کو حقیقت کا روپ دیتے جن کا وعدہ عوام سے کیا گیا تھا۔ آزادی کی جنگ نے معاشرے میں تمام طبقاتی حد بندیوں کو توڑ دیا تھا۔ طبقاتی تفرقات کو ختم کرتے ہوئے قومی اتحاد کے قیام کا ایک بہت بڑا موقع پیدا ہو چکا تھا۔ عوام توقع کر رہے تھے کہ قوم کے رہنما گروہی اور جماعتی مفادات سے بلند ہو کر ان کی حب الوطنی اور پیداواری صلاحیتوں کو جنگ سے تباہ حال ملک کی تعمیر نو اور ''سنار بنگلہ'' کے خواب کو تعبیر بخشنے کے لیے استعمال کریں گے۔ اس طرح دس کروڑ بنگلہ دیشی اقوام عالم میں عزت و وقار کے ساتھ اپنے جائز مقام کے حصول کی آس لگائے بیٹھے تھے۔ تاریخی ورثہ، واضح خودشناسی، قابل قیادت کی بصیرت، درست سمت، حب الوطنی، قربانیاں، جفاکشی اور سب سے بڑھ کر قوم کی متحدہ کوششیں وقت کے ساتھ ساتھ قدم بہ قدم اس ہدف کو حاصل کر سکتی تھیں جس کی خواہش لے کر قوم آگے بڑھی تھی۔ جنگ آزادی کی روح کا حصول صرف تبھی ممکن تھا اگر ایک ترقی یافتہ اور خوش حال بنگلہ دیش کا قیام عمل میں لایا جاتا اور اس کے ثمرات ہر کس و ناکس کی دہلیز تک پہنچتے۔ آزادی کو صرف اس طریقے سے پُر معنی بنایا جا سکتا تھا۔ لیکن عوام پہلے ہی قیادت کے خلوص کے بارے میں تشویش میں مبتلا ہو چکے تھے۔

ہمارے رہنما ہمیشہ کسی حقیقی کام کی بجائے محض شیریں گفتگو کرتے رہے تھے۔ عوام ایک عرصے سے ایسی گفتگو سن رہے ہیں اور ایسے کھوکھلے نعروں کے عادی ہو چکے ہیں۔ جو بھی اقتدار میں آیا اس نے عوام کو ہمیشہ نظر انداز کیے رکھا۔ حکمرانوں نے ہمیشہ عوام کو دبائے رکھا اور اُن کے مطالبات پر کوئی توجہ نہ دی۔ عام لوگوں سے رہنماؤں کی قطع تعلقی اور اُن کے ذاتی مفادات اس بے وفائی کی اہم وجہ بنے رہے ہیں۔ ہمارے رہنما عام طور پر اپنے ہی معاشروں میں اجنبی ہیں یہی وجہ ہے کہ عوام ان سے کوئی آس یا امید نہیں رکھتے۔ جب وہ اقتدار میں آجاتے ہیں وہ اپنے غلیظ منصوبوں کی تکمیل کے لیے ہر کام کرتے ہیں۔ سیاست دان ہمیشہ

اپنے ذاتی مفادات کو قوم کے مفادات پر ترجیح دیتے ہیں۔ حتیٰ کہ بعض اوقات ملک اور عوام ان کے لالچ اور ہوس کو پورا کرنے کے لیے قربانی کے بکرے بن جاتے ہیں۔

اگر ہم سیاسی تاریخ کا جائزہ لیں تو ہمیں یہ بات واضح طور پر نظر آتی ہے کہ ماضی کی حکومتوں نے اہم مسائل کو ہمیشہ نظر انداز کیا ہے اور سیاسی ماحول میں ایک بے یقینی کی کیفیت پیدا کیے رکھی ہے۔ 1947ء میں رہنماؤں نے اسلام کا نعرہ بلند کیا۔ 1952ء میں لسانی تحریک کو مذہبی جنونیت کے خلاف ایک جدوجہد قرار دیا گیا۔ اقتدار پر قبضہ کرنے کے بعد جنرل ایوب خان نے بنیادی جمہوریت کے پردے کے پیچھے پناہ حاصل کرنے کی کوشش کی۔ تاہم لوگوں کو ان تمام تر کارروائیوں سے کچھ حاصل نہ ہو سکا بلکہ ان کے مصائب اور تکالیف میں مزید اضافہ ہوتا چلا گیا۔ معاشرتی اور معاشی بحران مزید گہرا ہوتا چلا گیا اور سیاسی دیوالیہ پن کی شکار قیادت نے قوم کو مزید پیچھے کی جانب دھکیل دیا۔ یہی وجہ تھی کہ ہم لوگوں کو یہ کہتے ہوئے سنتے ہیں، ''ہم پاکستان کے ساتھ زیادہ اچھے تھے اور برطانوی دَور میں اُس سے بھی زیادہ اچھے تھے۔'' نوماہ کی طویل خوں ریز جنگ عوامی قیادت کے کردار میں کوئی معیاری تبدیلی لانے مین ناکام رہی۔ یہی وجہ تھی کہ آزاد ملک کی سرزمین پر قدم رکھنے کے فوراً بعد بالکل اپنے پیشروؤں کی طرح عوامی لیگ مجیب واد کے مبہم نعرے کے ساتھ سامنے آئی۔

ساڑھے چار سال کے بعد جب مجیب واد ایک خالی کھوکھلا نعرہ ثابت ہوا تو شیخ مجیب الرحمٰن نے اقتدار کے بھوکے کسی بھی دوسرے آمر کی طرح چوتھی ترمیم کا نفاذ کیا اور بکسال کا یک حزبی آمرانہ اقتدار قائم کرتے ہوئے تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لیے۔ اس آئینی بغاوت کو، جس کی کہیں کوئی مثال نہیں ملتی، ''دوسرے انقلاب'' کا نام دیا گیا۔ جب انہوں نے مکمل اختیارات حاصل کر لیے تو بظاہر اور سطحی طور پر معاملات پرسکون نظر آنے لگے لیکن اس کے نیچے سیاسی اور معاشرتی صورتِ حال تیزی سے بگڑ رہی تھی۔ اس بربادی کی بڑی وجہ حکمرانوں کا یہ خیال تھا کہ اہم افراد کو نوازنے اور ان کے مفادات کا تحفظ کرنے سے ان کا اقتدار ہمیشہ قائم رہ سکے گا۔ یہ خیال دراصل ان میں سوجھ بوجھ کے فقدان کا نتیجہ تھا اور نئے آزاد ہونے والے ملک کے مسائل اور ان کا حل ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ ان میں کسی قسم کے نظریے، یقین، تجربے اور بصیرت کا مکمل فقدان تھا۔

شیخ مجیب الرحمٰن، تیسری دنیا کے دوسرے آمروں کی طرح اپنے نظریات اور خیالات کو بہترین خیال کرتے تھے۔ انہوں نے کبھی بھی سوائے اپنی ''کچن کابینہ'' کے، جو اُن کے اپنے خاندان کے افراد پر مشتمل تھی، کسی سے مشورہ لینا یا رائے لینا ضروری خیال نہیں کیا تھا۔ ان کا اپنے آپ کو ''عقلِ کل'' خیال کرنے کا رویہ بہت حد تک ان کی انتظامی ناکامی کا ذمہ دار تھا۔ وہ پارٹی اور ریاستی امور کے درمیان پائے جانے والے فرق کو سمجھ نہیں سکے تھے۔ یہ بات 57-1956ء میں بھی سامنے آ چکی تھی جب انہوں نے اس وقت کے وزیرِ اعلیٰ عطاالرحمٰن خان سے اختلاف کیا تھا جو انتظامیہ کو مکمل طور پر غیر جانب دار رکھنا چاہتے تھے۔ وہ جانتے

تھے کہ اگر انتظامیہ کو پارٹی کے کنٹرول میں دے دیا گیا تو پھر روزمرہ کے معاملات کو چلانے میں مشکل پیش آئے گی۔ لیکن شیخ مجیب الرحمٰن نے ان کی اس دلیل کو مسترد کرتے ہوئے کہا، ''انتظامیہ کو اپنی غیر جانب داری پر پارٹی کے اختیار کو تسلیم کرنا ہوگا۔ نہ صرف یہ کہ انتظامیہ کو پارٹی کی پالیسیوں کے نفاذ میں مدد اور معاونت کرنا ہوگی بلکہ عوام میں پارٹی کے اثر و رسوخ کو بڑھانے کے لیے بھی عملی کوششیں کرنا ہوں گی۔'' عطاء الرحمٰن خان کو شیخ مجیب الرحمٰن کے سامنے ہتھیار ڈالنا پڑے کیوں کہ انہیں پارٹی میں بہت طاقت ور خیال کیا جاتا تھا۔

اس دور میں شیخ مجیب الرحمٰن نے وزیر صنعت و تجارت کے طور پر بدعنوانیوں، اقربا نوازیوں اور اختیارات کے ناجائز استعمال کا ارتکاب کیا۔ انہوں نے اپنے یاروں دوستوں اور وفاداروں کو نوازنے کے لیے انہیں پرمٹ، لائسنس، بینکوں کے قرضے اور صنعتوں کے قیام کے اجازت نامے جاری کیے۔ آزاد بنگلہ دیش پر اقتدار حاصل کرنے کے بعد انہوں نے ملک پر حکومت کرنے کے لیے اپنے اسی پرانے انداز کو اپنایا اور لوگوں کی وفاداریاں اور حمایت حاصل کرنے کے لیے انہیں نقد رقوم، ناجائز ترقیوں، چھوڑے گئے کاروباری اور صنعتی اداروں میں بطور ڈائریکٹر کے تقرریوں، لائسنس، پرمٹ اور ڈیلر شپ وغیرہ سے نوازنے کا عمل شروع کر دیا۔

اس طرح سے محض ڈھائی سال کے اندر اندر معاشی میدان میں مکمل انارکی پیدا کر دی گئی۔ ان کے بہت سے بااعتماد ساتھی مارواڑیوں کے ساتھ مل کر سمگلنگ میں ملوث تھے۔ یوں عوامی حکومت کی سرپرستی میں نودولتیوں کا ایک نیا طبقہ برسات کی کھمبیوں کی طرح پروان چڑھا۔ انہوں نے قومی ذرائع سے دولت اکٹھی کی لیکن اس دولت سے قومی معیشت میں دوبارہ کوئی سرمایہ کاری نہ کی۔ ان کی ناجائز ذرائع سے حاصل کردہ رقم زیادہ تر غیر پیداواری میدانوں میں خرچ کی گئی یا پھر ملک سے باہر منتقل کر دی گئی۔ اس قسم کے افراد کے ساتھ شیخ مجیب الرحمٰن ملک میں سوشلزم قائم کرنا چاہتے تھے۔ یہ سمجھنا بہت مشکل تھا کہ حقیقت میں وہ چاہتے کیا تھے۔ کیا یہ ان کی لاعلمی تھی یا شاطرانہ چال؟ اس سلسلے میں خود وزیراعظم کے کچھ تبصرے قابل غور ہیں۔

شیخ مجیب الرحمٰن کے خاندان کے ساتھ اپنے ذاتی تعلقات کی وجہ سے میں ان کی رہائش گاہ 32 دھان منڈی میں اکثر جایا کرتا تھا۔ بعض اوقات وہ مجھے خاص طور پر مسلح افواج کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے خود بھی بلاتے تھے۔ بعض اوقات میں اپنی مرضی سے بھی وہاں جایا کرتا تھا۔ ایک ایسی ہی ملاقات میں مجموعی صورت حال پر تبادلہ خیال کرتے ہوئے میں نے انہیں کہا کہ آپ اپنی پارٹی کے افراد کی ناجائز حمایت اور انہیں فائدے پہنچاتے ہوئے اپنی ذاتی مقبولیت کھو رہے ہیں۔ اس کے جواب میں انہوں نے کہا: ''کیا میرے لوگوں نے پاک حکومت کے دوران تکالیف نہیں اٹھائیں؟ کیا انہوں نے نقصانات برداشت نہیں کیے؟ اگر آج وہ کچھ فائدے حاصل کر رہے ہیں تو اس میں کیا غلط بات ہے؟ میں ان سے لاتعلق نہیں رہ سکتا۔ اگر اس بات پر کوئی ناخوش ہے تو میں کچھ نہیں کر سکتا۔''

میں حقیقت میں اس قسم کے جواب کے لیے تیار نہ تھا۔ میں نے سوچا: ''آج انہیں قوم کا رہنما

اور ملک کا سربراہ خیال کیا جا رہا ہے۔ کیا یہ مناسب بات نہ تھی کہ وہ پارٹی کے مفاد پر قومی مفاد کو ترجیح دیتے؟ کیا قوم ان سے یہ توقع رکھتی تھی؟'' میں بہت مایوس ہوا اور اس دن بہت تکلیف دہ احساسات کے ساتھ واپس آیا۔

یہ صرف ان کی پارٹی کے لوگ ہی نہیں تھے جو اس قابو سے باہر ہوتی ہوئی بدعنوانی اور رشوت ستانی میں ملوث تھے۔ ان کے اپنے گھر کے افراد بھی اس میں برابر کے شریک تھے۔ غازی غلام مصطفیٰ، جو شیخ خاندان کا ایک قریبی با اعتماد شخص تھا، ریڈ کراس کے چیئرمین کی حیثیت سے امدادی سامان میں خرد برد اور سمگلنگ میں اس قدر کھلم کھلا ملوث رہا تھا کہ ملک بھر میں ''کمبل چور'' کے نام سے مشہور ہو گیا تھا۔ یہاں تک کہ امداد دینے والے اور بین الاقوامی امدادی ایجنسیاں بھی اس کی غلط کاریوں سے پوری طرح آگاہ ہو چکی تھیں۔ اس بااثر چور کے خلاف بین الاقوامی پریس اور میڈیا میں بہت کچھ کہا گیا تھا۔ شیخ مجیب کے اکلوتے بھائی شیخ نصیر نے نہ صرف اپنے آبائی قصبے کھلنا میں متروکہ جائیدادوں اور کاروباروں پر قبضہ کر لیا تھا بلکہ سمگلنگ کی کارروائیوں میں رِنگ لیڈر کی حیثیت رکھتا تھا۔ ان کے تمام بھتیجے شیخ مونی، عبدالحسنات اور شیخ شہید الاسلام، سیاسی طور پر بہت طاقت ور ہو چکے تھے اور ساتھ ہی شیخ مجیب الرحمٰن کی سرپرستی میں بہت زیادہ دولت حاصل کر چکے تھے۔ ان کے بیٹے، خاص طور پر شیخ کمال، بینک ڈکیتیوں جیسی غیر اخلاقی اور غیر قانونی سرگرمیوں کے ذریعے دولت اکٹھا کرنے میں ملوث پائے گئے تھے۔

مجیب دورِ حکومت کے دوران رشوت ستانی اور بدعنوانیوں کی صورت حال کے حوالے سے مشہور صحافی لارنس سولز نے ''فار ایسٹرن اکنامک ریویو'' میں 30 اگست 1974ء کو لکھا، ''رشوت ستانی اور بے ضابطگیاں کوئی نئی بات نہیں۔ لیکن ڈھاکہ کے لوگ سمجھتے ہیں کہ جس طریقے سے رشوت ستانی، بے ضابطگیوں اور لوٹ مار کا بازار شیخ مجیب کے دورِ حکومت میں گرم ہوا ہے اس کی مثال ماضی میں کہیں نہیں ملتی۔'' حقیقت میں نئے آزاد ہونے والے اور جنگ سے تباہ حال ملک میں اس قسم کی لوٹ مار اور غارت گری کی موجودگی میں حکومت کے لیے کسی قسم کی سیاسی یا معاشی ترقی حاصل کرنا ناممکن تھا۔ لٹیرے غلط ذرائع سے حاصل شدہ اپنی دولت کو قومی معیشت میں سرمایہ کاری کے لیے استعمال نہیں کرتے۔ وہ اپنی دولت کو عیاشیوں اور آسائشات پر خرچ کرتے ہیں۔ لیکن حکومت کو اس کا بھاری خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے جب کہ اس کا تاثر عوام اور دنیا کی نظر میں ماند پڑ جاتا ہے۔

اس کے نتیجے میں حکومت عوام سے کٹ چکی تھی۔ بنگلہ دیش کو ''سنار بنگلہ'' میں تبدیل کرنے کے حکمرانوں کے وعدوں کے برعکس لوٹ مار اور غارت گری نے اسے ایک بغیر پیندے کی ٹوکری میں تبدیل کر دیا تھا۔ عام لوگ جو اپنی قیادت سے مایوس اور بددل ہو چکے تھے اس ساری افسوس ناک صورتِ حال کو قومی غداری کے طور پر دیکھتے تھے۔ عوامی لیگ عوامی حمایت سے محروم ہو چکی تھی جو کسی بھی حکومت کے لیے حکومت کرنے کے لیے بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ بتدریج وہ خود حکومت کے اندر موجود بہت سے طاقت ور حلقوں کی

حمایت سے بھی محروم ہوگئی۔طلبا،نو جوانوں اور مسلح افواج میں بھی ان کی حمایت میں قابل ذکر کمی ہوگئی۔

زرعی ملک بنگلہ دیش کا قدرت کے اوپر انحصار بہت زیادہ ہے۔ایک تباہ حال ملک میں 10 کروڑ افراد کو خوراک فراہم کرنا بہت بڑا کام تھا۔امداد دینے والے ممالک اور بین الاقوامی برادری بنگلہ دیش کی تعمیر نو میں مدد کرنے کے لیے بڑی فراخ دلی سے آگے آئے۔30 دسمبر 1973ء تک بنگلہ دیش کو عطیات، امداد اور قرضے کے طور پر 1373 ملین ڈالر وصول ہو چکے تھے۔اس کے علاوہ یو این آر او بی (UNROB) کے ذریعے بھی بہت بڑی امدادی رقم مہیا کی گئی تھی۔لیکن اس سب کے باوجود پہلے دن ہی سے بنگلہ دیش کی معیشت کو مسائل کا سامنا کرنا پڑا اور شرح نمو بہت سست تھی۔اس ناکامی کی تین اہم وجوہات تھیں:

1۔ 1972ء کی عالمی سرد بازاری

2۔ بڑے قومیائے گئے اداروں میں منتظمین کے طور پر نااہل افراد کی تقرری کے نتیجے میں ان کی استعدادی پیداوار میں 9 سے 15 فیصد کمی ہوگئی۔نااہلیت، رشوت ستانی، خرد برد اور افرادی قوت کے غلط استعمال نے بہت سی صنعتوں کو معاشی طور پر غیر منافع بخش بنادیا تھا۔

3۔ ماہرین کے مطابق ہندوستان کے ساتھ سرحدی تجارت متعارف کروانے کی وجہ سے 15 فیصد پٹ سن اور چاول ملک سے باہر سمگل ہوجاتے تھے۔اس نے کسانوں پر برے اثرات مرتب کیے۔پاکستان کے دَور میں 1971ء تک 89 فی صد زرمبادلہ پٹ سن کی برآمد سے حاصل ہوتا تھا۔

اس دوران حکومت نے مارکیٹ میں نئے نوٹ جاری کر دیئے جس کی وجہ سے 1969ء کے مقابلے میں افراطِ زر میں 300 فیصد تک اضافہ ہوگیا۔اشیائے ضرورت اور دیگر اشیا کی قیمتیں آسمان کو چھونے لگیں۔1973ء میں یو این آر او بی کے بنگلہ دیش سے چلے جانے کے بعد بیرونی مدد بہت کم ہوگئی۔دوسری طرف حکومت کی آمدنی میں کافی حد تک کمی ہوگئی تھی۔جون 1974ء میں وزیر مالیات تاج الدین احمد نے کہا، ''جاری منصوبوں کو عملی جامہ پہنانا ناممکن ہو چکا ہے۔ملک کی معیشت تباہ ہو چکی ہے۔1974ء کی قیمتوں کے اشاریے میں 1969ء کی نسبت 700 سے 800 گنا اضافہ ہو چکا ہے۔قیمتیں عوام کی قوت خرید سے بہت باہر نکل چکی ہیں۔ملک کو قحط کا سامنا ہے۔اکتوبر تک ایک لاکھ افراد زندگیوں کی بازی ہار چکے ہیں۔نقدی اور اشیا کی صورت میں بین الاقوامی مدد تقریباً 400 ملین امریکی ڈالروں کے برابر وصول ہوتی ہے۔نقد امداد تقریباً 145 ملین ڈالر کے برابر ہے۔اس قدر خطیر امداد کے باوجود قحط کی صورت حال کو ختم نہیں کیا جاسکتا۔''

پاکستانی فوج کے ہتھیار ڈالنے کے بعد بنگلہ دیش حکومت کی درخواست پر ہندوستانی افواج بنگلہ دیش میں ٹھہری رہیں۔ہندوستانی فوج کروڑوں ڈالر کا فوجی ساز وسامان، اسلحہ بارود، سامان رسد اور گاڑیاں اپنے ساتھ لے گئی۔اس نے صنعتی مشینوں کا اکھاڑ کر ہندوستان بھجوا دیا، حتیٰ کہ اپنے زیر قبضہ چھاؤنی کے علاقوں سے فرنیچر اور تنصیبات تک اکھاڑ کر لے گئی۔اخبار ''انیک'' نے اپنی ایک رپورٹ میں ان اشیا کی قیمت کا تخمینہ تقریباً 1000 ملین امریکی ڈالر بتایا تھا جو ہندوستانی فوج اپنے ساتھ لے گئی۔یہ رپورٹ اس اخبار

کی دسمبر 1974ء کی ایک اشاعت میں شامل تھی۔ ایک مجاہد آزادی کمال صدیقی نے، جنہیں آزادی کے بعد کھلنا کا ڈپٹی کمشنر مقرر کیا گیا تھا، بنگلہ دیش اور ہندوستان دونوں کی حکومتوں کو باضابطہ طور پر لکھا تھا کہ ہندوستانی فوج اس کے ضلع سے لاکھوں ڈالر کی مشینری، گاڑیاں اور ساز وسامان منتقل کر رہی ہے۔ اپنے طور پر مجاہدین آزادی کی مدد سے ہندوستانی فوج کی جس قدر مزاحمت وہ کر سکتے تھے، انہوں نے کی۔

سمگلنگ، جو پاکستانی دَور میں بھی ہوتی تھی، بنگلہ دیش کی آزادی کے بعد اس کی مقدار میں بہت اضافہ ہوگیا۔ آزادی کے فوراً بعد کچھ مدت کے لیے سرحد کو مکمل طور پر کھلا رکھا گیا تھا۔ مولانا بھاشانی نے دعویٰ کیا کہ "ہندوستانی فوج اور سمگلر 6000 کروڑ ٹکوں کا سامان بنگلہ دیش سے لے گئے ہیں۔" اخبارات میں شائع ہونے والی رپورٹوں کے مطابق 1972ء سے 1975ء تک جب مجیب الرحمٰن کی حکومت کو اقتدار سے ہٹایا گیا تقریباً 2000 ملین ڈالر کا سامان ملک سے ہندوستان سمگل کیا جا چکا تھا۔ بنگلہ دیش حکومت نے 18 جنوری 1972ء کو جلاوطنی سے واپسی کے فوراً بعد پٹ سن اور پٹ سن کی مصنوعات کی ہندوستان برآمد سے تمام پابندیاں اٹھالی تھیں۔ اُسی دن انہوں نے سرحدی تجارت کے لیے سُرحدوں کو کھلا رکھنے کا فیصلہ کیا، اس طرح پٹ سن اور پٹ سن کی مصنوعات کی ہندوستان کو سمگلنگ کو آسان بنا دیا گیا۔ انہوں نے ہندوستانی روپے کے مقابلے میں ٹکے کی قیمت میں بھی کمی کر دی۔

2 جون 1972ء کو "بنگلہ دیش آبزرور" نے لکھا کہ تاجر برادری اور معاشی تجزیہ کاروں کے مطابق ہندوستان کے مفاد میں کیے جانے والے یہ تینوں فیصلے ہندوستانی دباؤ کے تحت کیے گئے ہیں۔ مزید برآں ٹکے کی قیمت کے از سرِ نو تعین اور پٹ سن اور پٹ سن مصنوعات کی نئی قیمتوں کی وجہ سے سمگلنگ زیادہ منافع بخش ہوگئی تھی۔ اس طرح زرِ مبادلہ کی آمدنی اور قومی بچت دونوں میں کمی واقع ہوئی۔

پراسرار طور پر پٹ سن کے بہت سے گوداموں کو آگ لگا دی گئی جس سے بھاری نقصانات برداشت کرنا پڑے، جن پر تبصرہ کرتے ہوئے وزیراعظم نے 1974ء میں پارلیمنٹ میں کہا، آگ کی وجہ سے 138.2 ملین ٹکہ کی خام پٹ سن تباہ ہوگئی ہے۔ پٹ سن مصنوعات کی کل مالیت کا تخمینہ نہیں لگایا جا سکا۔ ان عظیم نقصانات کی وجہ سے بی جے ایم سی اور بی جے ٹی سی کو بہت بڑی حکومتی سبسڈیز دینا پڑیں۔ آج کے دن تک تمام آنے والی حکومتوں کو پٹ سن کے شعبے کو کروڑوں ٹکوں کی سبسڈی دینا پڑ رہی ہے۔ کسی دَور میں جسے سنہری ریشہ کہا جاتا تھا، اب گردن کے گرد پھندا بن چکا ہے۔ دوسری جانب ہندوستان جو پٹ سن اور پٹ سن مصنوعات کا محض درآمد کنندہ تھا وہاں صورت حال ہماری حکومت کی مذکورہ بالا پالیسیوں کی وجہ سے یکسر بدل گئی۔ اُن کی بہت سی پٹ سن ملیں جو خام مال کی عدم دستیابی کی وجہ سے بند ہوگئی تھیں دوبارہ چالو ہوگئیں اور ہندوستان عالمی منڈی میں پٹ سن مصنوعات کا برآمد کنندہ بن گیا۔ نہ صرف یہ بلکہ 1973ء میں ہندوستان نے خام پٹ سن کی ایک ملین گانٹھیں برآمد بھی کیں۔ 1974ء تک نہ صرف ان کی پٹ سن ملیں پوری شفٹوں میں چل رہی تھیں بلکہ تری پورہ اور مغربی بنگال میں ہند بنگلہ سرحد پر چند نئی پٹ سن ملیں بھی قائم کی گئیں۔

تاہم حکومت کو عوامی دباؤ کے نتیجے میں سرحدی تجارت کے معاہدے کو ایک سال سے بھی پہلے منسوخ کرنا پڑا۔ مئی 1972ء میں بنگلہ دیش حکومت نے قرضے اور تجارت کے چار معاہدوں پر دستخط کیے۔ لیکن بعد میں ہندوستان ان معاہدوں پر عمل کرانے میں حیل و حجت سے کام لینے لگا، خاص طور پر بنگلہ دیش سے ہندوستان کو برآمد میں مسائل اور مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ اس وجہ سے تجارتی خلا ہندوستان کے حق میں بڑھنا شروع ہو گیا۔ بنگلہ دیش حکومت نے کرنسی نوٹ انڈیا سے پرنٹ کروانے کا فیصلہ کیا جس کے نتیجے میں ملک میں جعلی نوٹوں کا سیلاب آ گیا۔ اس نے بنگلہ دیش کی معیشت پر شدید منفی اثرات مرتب کیے۔ جیسے جیسے اخراجاتِ زندگی میں اضافہ ہوتا گیا، ہندوستان کے خلاف جذبات میں بھی اتنا ہی اضافہ ہوتا چلا گیا۔ عوام اپنے مصائب کا ذمہ دار ہندوستان کو خیال کرنے لگے۔ اس طرح ایک جانب حکومت اور عوام کے درمیان اور دوسری جانب بنگلہ دیش کے عوام اور ہندوستانی حکومت کے درمیان اختلافات میں تیزی آتی چلی گئی۔

جنگ کے بعد ہندوستانی فوج کے ذریعے بنگلہ دیش سے متروکہ مال اسباب اور اشیاء کی ہندوستان منتقلی، انتظامیہ میں ہندوستانی سول آفیسرز کی مداخلت، سرحدوں سے کھلم کھلا سمگلنگ، غیر مساویانہ معاہدے، بنگلہ دیشی کرنسی کی ہندستان میں پرنٹنگ، جے آر بی کی تشکیل، ٹکے کی قیمت ہندوستانی روپے سے وابستہ کرنا اور بنگلہ دیش میں ہندوستانی افواج رکھنے کے فیصلے نے بنگلہ دیشیوں کے دلوں میں گہرے شکوک پیدا کر دیئے۔ وہ ہندوستانی حکومت کے ارادوں کے بارے میں خدشات کا شکار ہو گئے تھے۔ ہندستانی حکومت کی یہ غلط فہمی کہ وہ بنگلہ دیش پر اپنی بالادستی صرف عوامی لیگ کے اقتدار میں رہتے ہوئے حاصل کر سکتی ہے، اصل بنیادی وجہ تھی جس نے لوگوں کے ذہن میں ہندوستانی غلبے کا خوف پیدا کر دیا تھا۔ دونوں حکومتوں کی سرگرمیوں نے یہ خوف ہر گزرتے دن کے ساتھ مزید گہرا کر دیا تھا۔

اس کے ساتھ لوگ یہ بھی سمجھتے تھے کہ عوامی لیگ ہر قیمت پر اقتدار سے چمٹے رہنے کی خواہش کے تحت ہندوستان کی کاسہ لیسی کر رہی ہے اور بنگلہ دیش میں اس کی لوٹ مار اور غارت گری سے آنکھیں بند کیے ہوئے ہے۔ ہندوستان اس نئے آزاد ہونے والے ملک پر ناجائز معاشی اور سیاسی دباؤ ڈال رہا تھا اور یوں اسے ایک طفیلی ریاست میں تبدیل کر چکا تھا۔ عوامی لیگ اور ہندوستان دونوں عوام کو مطمئن کرنے کی جانب کوئی توجہ نہیں دے رہے تھے۔ اس لیے عوام کے دلوں میں معاندانہ جذبات ابلتے رہے جنہوں نے دونوں ممالک کے درمیان معاشی اور سیاسی تعلقات پر دوررَس اثرات مرتب کیے۔ اس طرح دونوں حکومتوں کی سوجھ بوجھ سے عاری اور انتہائی کوتاہ بین پالیسیوں نے پہلے دن سے ہی شکوک وشبہات اور باہمی عدم اعتماد پیدا کر دیا تھا۔

اگرچہ بنگلہ دیش حکومت اس سارے عرصے میں دعویٰ کرتی رہی تھی کہ دونوں ممالک کے درمیان تعلقات دوستانہ اور پُرتپاک ہیں، حقیقت یہ تھی کہ لوگ ہندوستانی حکومت کے ارادوں کے بارے میں شکوک وشبہات کا شکار تھے۔ ان کی ابتدا اس دن سے ہی ہو گئی تھی جس دن ہندوستان نے یک طرفہ طور پر عوامی لیگ

کی قیادت کو عوام پر ٹھونسنے کا فیصلہ کیا تھا اور ہندوستانی فوج نے بنگلہ دیش سے سب کچھ مالِ غنیمت کے طور پر سمیٹ لیا تھا۔ حیران کن طور پر بنگلہ دیش حکومت نے اُن کو اس کام میں سہولت دینے کے لیے سرحدوں کو کھلا رکھنے کی پالیسی کا فیصلہ کیا تھا۔

تھوڑے ہی عرصے میں بنگلہ دیش کی سرزمین پر ہندستانی فوج کی موجودگی نے ملک کے اندر اور باہر ایک پریشانی کی کیفیت پیدا کر دی۔ بنگلہ دیش حکومت کو تنقید کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا کہ وہ خود اپنے طور پر حکومت کرنے کے قابل نہیں ہے۔ اس نے بنگلہ دیش کی آزادی اور خود مختاری پر بھی شکوک پیدا کر دیئے تھے۔ بین الاقوامی سطح پر بہت سے ممالک خیال کرتے تھے کہ بنگلہ دیش مقبوضہ افواج کے تحت ہے اور ہندوستان نے طاقت کے ذریعے پاکستان کے ایک حصے پر قبضہ کر لیا ہے۔ اپنے اس نقطہ نظر اور بنگلہ دیش میں ہندوستانی فوج کی موجودگی کی وجہ سے بہت سے ممالک بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے سے احتراز کر رہے تھے۔ شیخ مجیب الرحمٰن نے اگرچہ اپنے طور پر ہندوستانی فوج کی تعریف کی تھی لیکن اس کے ساتھ ہی وہ لوگوں کی دھڑکنوں کو بھی محسوس کر رہے تھے۔ لیکن حقیقت میں اس مرحلے پر کچھ بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ خاص طور پر شیخ مجیب الرحمٰن کے واپس آ جانے کے بعد بنگلہ دیش میں ہندوستانی فوج کی موجودگی کا کوئی جواز نہیں تھا۔ یہ ہندوستان اور بنگلہ دیش دونوں کے لیے ایک مشکل اور پریشان کن صورتِ حال تھی۔ ہندوستان کو "پنچا شیلا" اصول اور غیر جانب دار تحریک کا بانی ہونے کی حیثیت سے بین الاقوامی برادری کو ایک ایسے ملک میں جس کو کسی قسم کے بیرونی خطرے کا سامنا نہیں تھا، اپنی افواج کی موجودگی کا جواز پیش کرنے میں مشکلات کا سامنا تھا۔

حقیقت میں ہندوستان کو کئی ایک ممالک، خاص طور پر غیر جانب دار تحریک کے ممبر ممالک اور مسلم دنیا کی جانب سے سوالات اور تنقید کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ ان حالات میں دونوں ممالک بنگلہ دیش سے ہندوستانی فوج کے انخلا پر مجبور ہو گئے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی شیخ مجیب الرحمٰن نے ہند بنگلہ دیش معاہدے پر دستخط کر دیئے۔ یہ معاہدہ 25 سال کے لیے تھا اور 19 مارچ 1972ء کو اندرا گاندھی کے بنگلہ دیش کے دورے کے موقع پر اس پر دستخط کیے گئے تھے۔ اُن کے دورے کے دوران درج ذیل تین مزید اہم فیصلے بھی کیے گئے:

1۔ ٹرانزٹ اور سرحدی تجارت

2۔ باہمی تعاون میں فروغ کے لیے خارجہ معاملات، دفاع، منصوبہ بندی، صنعت و تجارت، ثقافت اور سائنس کی وزارتوں کے نمائندے متعلقہ حکومتوں کی پالیسیوں کی تشکیل کے لیے مشاورت اور تبادلہ خیال کے لیے ہر چھ ماہ بعد ملاقات کیا کریں گے۔

3۔ ایک مشترکہ دریائی کمیشن بھی تشکیل دیا گیا۔

اپنی واپسی کے فوراً بعد شیخ مجیب الرحمٰن نے بنگلہ دیش کو مشرق کا سوئٹزرلینڈ قرار دیا تھا، لیکن ستم ظریفانہ طور پر انہوں نے اس غیر مساویانہ معاہدے کی شرائط کے مطابق بنگلہ دیش کو ہندوستان کی ایک طفیلی ریاست میں تبدیل کر دیا تھا۔ انہوں نے چٹاگانگ کی بندرگاہ کی صفائی کے بہانے روس کی بحریہ کو بھی مدعو کر لیا

تھا۔ اس طرح بنگلہ دیش کو ''ہندروس'' محور میں دھکیل دیا گیا تھا۔ مشرقی محاذ پر پاکستان کی شکست کے بعد ہندوستان نے فخریہ انداز میں اعلان کیا، ''تمام بیرونی قوتوں کو جنوبی ایشیا سے نکلنا ہوگا۔'' نہ صرف یہ بلکہ ہندوستان نے ایک نئی ''منرو ڈاکٹرائن'' بھی تشکیل دی، جس کی وجہ سے اس علاقے میں موجود تمام چھوٹے ممالک ہندوستان کی توسیع پسندی اور غلبے سے خائف ہوگئے۔ انہیں شدید سیکیورٹی خطرات کا سامنا بھی تھا۔ ہندوستان کے لیے اتنا کچھ کرنے کے بعد بھی شیخ مجیب الرحمٰن پانی کے مسئلے، سرحدوں کی نشان دہی، ساحلی حد بندیوں، سمندری علاقوں، سمندر میں ابھرنے والے خشکی کے نئے قطعات کے حوالے سے ہندوستان سے بہ مشکل ہی کچھ مراعات حاصل کر سکے۔

1975ء میں جب ہندوستان نے سکم کے خلاف جارحیت کا مظاہرہ کیا اور اسے اپنے ساتھ شامل کر لیا تو اس علاقے کے لوگ خاص طور پر بنگلہ دیشی ہندوستانی تجاوزات اور توسیع پسندی کے بارے میں زیادہ چوکنے ہوگئے۔ تمام سیاسی جماعتوں نے سوائے عوامی لیگ اور اس کی طفیلی جماعتوں کے 25 سالہ معاہدے کو قومی آزادی اور خودمختاری کے خلاف ایک خطرہ قرار دیا اور فوری طور پر اس کی منسوخی کا مطالبہ کیا۔ اس مرتبہ بھی یہ دوراندیش شیر بنگال مولانا بھاشانی ہی تھے جنہوں نے سب سے پہلے یہ مطالبہ کیا۔ 23 دسمبر 1972ء کو اُن کی قیادت میں ایک سات جماعتی ایکشن کمیٹی نے حکومت کو ایک 15 نکاتی یادداشت پیش کی۔ جس کا سب سے پہلا نکتہ اس قوم دشمن معاہدے کی منسوخی تھا۔ ان تمام جماعتوں کی مشترکہ رائے تھی کہ یہ معاہدہ ہندوستان کی طویل المدتی غلامی اور بنگلہ دیش پر اس کے اثر ورسوخ کو تقویت دے گا اور ساتھ ہی جنوبی ایشیا کے علاقے میں ہندوستان کے غلبے کو دوام بخشے گا۔

اس معاہدے کا آرٹیکل 6 اہم پہلو کا حامل تھا۔ آرٹیکل 9،8 اور 10 بھی اتنے ہی اہم تھے۔ ان سب کا تعلق دونوں ممالک کے خارجہ تعلقات اور دفاع سے تھا۔ آخر ایسے کسی معاہدے کی ضرورت ہی کیا تھی کیوں کہ ہندوستان کو تو دوست ملک تصور کیا جا رہا تھا؟ بنگلہ دیش تین اطراف سے ہندوستان میں گھرا ہوا ہے۔ مشرق کی جانب اس کے ایک چھوٹے سے قطعہ زمین کی سرحد برما سے ملتی ہے۔ جنوب میں خلیج بنگال ہے۔ منطقی طور پر اس قسم کے معاہدے کا کوئی جواز نظر نہیں آتا۔ جب بنگلہ دیش کو کسی بھی ملک کی جانب سے جارحیت کا خطرہ ہی نہیں تھا تو ایسے معاہدے پر دستخط کرنے کا مطلب سوائے عسکری طور پر ہندوستان پر انحصار کرنے کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔ سب سے بڑھ کر ہندوستان سے اپنی خودمختاری اور آزادی کا تحفظ مانگنے کا مطلب اس کی غلامی کو قبول کرنا اور علاقے میں اُسے ایک غالب قوت تسلیم کرنے کے مترادف تھا۔ معاشی تعاون سے متعلق آرٹیکلز کا مطلب یہ تھا کہ ہندوستان صنعتی طور پر ایک ترقی یافتہ ملک ہونے کے ناطے تمام بھاری، درمیانی اور ہلکی صنعتی مشینری، ٹیکنالوجی، فاضل پرزہ جات، نیم عمل شدہ خام مال اور صنعتی اور زرعی انفراسٹرکچر قائم کرنے کے لیے ضروری سرمایہ مہیا کرے گا۔

ہندوستان کی اس قسم کی مداخلت کے نتیجے میں بنگلہ دیش کا ایک دست نگر ریاست اور ہندوستانی

مصنوعات کی منڈی بن جانا ہی مقدر تھا کیوں کہ ہندوستان نسبتاً ایک طاقت ور اور ترقی یافتہ ملک تھا۔ اگر یہ عمل طول پکڑتا ہے تو خطرہ تھا کہ بنگلہ دیشی معیشت محض ہندوستان کی ایک ذیلی معیشت بن کر رہ جائے گی۔ لہٰذا اگر ہندوستان ایک مرتبہ اپنے معاشی تسلط کو یقینی بنالیتا تو اس کا سیاسی تسلط خود بخود یقینی بن جاتا تھا۔ ہندوستان کی گنگا، میگھنا اور برہماپترا کے طاسوں کے پانی اور دوسرے وسائل کو بروے کار لانے کی خواہش دور رَس نتائج کی حامل تھی۔ اس جیسا کوئی بھی دوطرفہ معاہدہ ہمیشہ طاقت ور فریق کے حق میں جاتا ہے۔ اس حقیقت کے پیش نظر اس بات کا امکان موجود تھا کہ بنگلہ دیش کو ان اہم طاسوں کے آبی ذرائع سے محروم کر دیا جاتا جو کہ اس زرعی ملک کے لیے رگِ حیات کی حیثیت رکھتے تھے۔ قدرتی طور پر لوگوں کی اکثریت اور بہت سے عوامی لیگی بھی اس غیر اخلاقی اور غیر قانونی معاہدے کے مخالف تھے۔ لیکن تمام تر احتجاج کو نظر انداز کرتے ہوئے عوامی لیگ میں موجود ہندوستان نواز حلقوں کے مشورے پر شیخ مجیب الرحمٰن نے ہندوستان کے ساتھ اس خودکشی کے مترادف 25 سالہ معاہدے پر دستخط کر دیئے۔

حقیقت میں بنگلہ دیش ہندوستان کے ساتھ علاقائی خودمختاری کے حوالے سے متصادم مفادات رکھتا ہے۔ زمینی حد بندیوں کے علاوہ آبی حد بندیوں اور اقتصادی علاقوں کی نشان دہی کے بارے میں مکمل فیصلے ہونے ابھی باقی ہیں، اور ان مسائل کے حل کے لیے ابھی ایک لمبا عرصہ درکار ہے۔ 1974ء میں متنازع گزرگاہوں کے حوالے سے ایک معاہدے پر دستخط کیے گئے۔ بنگلہ دیش نے اسی سال اس معاہدے کی پارلیمنٹ سے بھی توثیق کروائی، لیکن معاہدے کے مطابق ہمیں آج تک ہمارا حق نہیں مل سکا۔ چھے ملٹی نیشنل آئل کمپنیاں، جو گیس اور تیل کی تلاش کے لیے آئی تھیں، ان کو ہندوستان کے اس احتجاج کے بعد کہ جب تک دونوں ممالک کے درمیان زمینی اور سمندری اور حد بندیوں کا فیصلہ نہیں ہو جاتا ایسا کوئی منصوبہ شروع نہیں کیا جا سکتا، اپنا کام بند کرنا پڑا۔ بنگلہ دیش حکومت کو ان کی واپسی کا حکم دینا پڑا حالاں کہ وہ منافع میں حصہ کی بنیاد پر کیے گئے معاہدوں کے تحت پہلے ہی اپنا کام شروع کر چکی تھیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ ان کمپنیوں کو ڈرا دھمکا کر نکالنے کے لیے ان کے کام کی جگہوں پر نامعلوم حلقوں کی جانب سے تخریب کاری کی کارروائیاں کی گئیں اور ان کے عملہ کے ارکان کو اغوا کیا گیا۔

خلیج بنگال میں نئے ابھرنے والے خشکی کے قطعات نے ہندوستان کے ساتھ مزید تنازعات کو جنم دیا۔ دریائے ہریا بھنگا کے سمندری دھانے میں ایک بہت بڑا قطعہ زمین ''تل پٹی'' نمودار ہوا۔ اگر چہ یہ بنگلہ دیش کے ساحل کے نزدیک تھا، ہندوستان نے اس پر دعویٰ کر دیا۔ فیصلہ کیا گیا کہ اس مسئلے کو دوطرفہ گفت و شنید کے ذریعے بین الاقوامی قوانین کے تحت حل کیا جائے گا۔ لیکن اس بین الحکومتی سمجھوتے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ایک صبح ہندوستانی بحریہ کے فوجی ''تال پٹی'' پر اُترے اور یک طرفہ طور پر ہندوستان کا جھنڈا لہرا دیا۔ سب سے سنجیدہ مسئلہ آبی وسائل کی تقسیم تھی۔ بنگلہ دیش کے تقریباً 90 فیصد لوگوں کا انحصار زراعت پر ہے اور پانی ان کے لیے زندگی کی حیثیت رکھتا ہے۔ بنگلہ دیش میں بہنے والے تقریباً تمام بڑے دریا ہمالیہ کے سلسلے

سے نکلتے ہیں۔ گنگا، برہماپترا، میگھنا، جمنا، تیستا، گومتی، مہوری، سورما، کھوائی، کشیارا، پدیوا جیسے تمام دریا شمال کی جانب ہمالیہ کے سلسلے سے نکلتے ہیں اور جنوب میں بنگلہ دیش میں سے گزرتے ہوئے خلیج بنگال میں جا گرتے ہیں۔ دریا کے یہ طاس لوگوں کے طرزِ زندگی اور قدرتی ماحول کو تشکیل دیتے ہیں۔ فرخا بیراج، جو ہندوستان نے یک طرفہ طور پر دریائے گنگا پر تعمیر کیا ہے، اس نے بنگلہ دیش کے ایک تہائی زمینی رقبے اور ایک چوتھائی آبادی کو متاثر کیا ہے۔ یہ انسانوں کی لائی ہوئی انتہائی تباہ کن لعنت ہے جس نے سینکڑوں ملین لوگوں کی زندگیوں کو متاثر کرنے کے ساتھ ساتھ قدرتی ماحولیاتی نظام کو بھی تباہ کر دیا ہے۔

بنگلہ دیش کی حکومت اپنے محدود وسائل کے ساتھ اس دہشت ناک چیلنج کا سامنا کرنے کی سکت نہیں رکھتی۔ یہ مسئلہ ہر گزرتے دن کے ساتھ مزید بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ گنگا کے آبی بحران نے دونوں ممالک کے درمیان تلخیوں کو مزید بڑھا دیا ہے۔ اگر اس کا منصفانہ اور مساویانہ حل تلاش نہیں کیا جاتا تو دونوں ممالک کے تعلقات مزید بگڑ جائیں گے۔ اس عرصے میں ہندوستان نے دریائے تیستا پر ایک اور بیراج تعمیر کر لیا ہے۔ یہ کارروائی بھی یک طرفہ طور پر بغیر کسی پیشگی مشورے کے کی گئی ہے۔ اس کے نتیجے میں دریائے تیستا میں پانی کے بہاؤ میں شدید کمی واقع ہو گئی ہے۔ یہ بنگلہ دیش کے چار شمالی اضلاع کو متاثر کر رہا ہے۔ مزید برآں ہندوستان کھوائی، گومتی اور دوسرے دریاؤں پر بھی بغیر کسی مشورے کے بین الاقوامی قوانین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے مزید بیراج تعمیر کر رہا ہے۔ اس طرح سے آبپاشی اور جہاز رانی کے لیے پانی کی مطلوبہ مقدار مہیا نہیں ہو سکے گی۔ اور ان سب سے بڑھ کر ہندوستان ایک رابطہ نہر کا منصوبہ بھی تیار کر رہا ہے جو بنگلہ دیش کے لیے مزید افلاس لے کر آئے گا۔ وہ برہماپترا سے ایک لمبی نہر نکال کر فرخا بیراج میں مزید پانی لانا چاہتا ہے، ماہرین کے مطابق یہ بات بنگلہ دیش کے لیے قابل قبول نہیں ہو سکتی۔

اگرچہ معاہدے میں کہا گیا ہے، ”ہمارے دونوں ممالک کے درمیان سرحدیں دائمی امن اور دوستی کی مثال ہوں گی“، لیکن معاشی اور دفاعی نقطہ نظر سے اس کے مختلف معنی ہو سکتے ہیں۔ عوامی لیگ نے پہلے دن سے ہی پروپیگنڈا شروع کر رکھا تھا کہ بنگلہ دیش ایک غریب اور کمزور ملک ہے، اسے ایک بڑی فوج کی نہ تو ضرورت ہے اور نہ ہی یہ اس کے اخراجات برداشت کر سکتا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ بنگلہ دیش کی حکومت کا یہ پروپیگنڈا محض ہندوستان کو اپنے منصوبوں کی تکمیل میں سہولت مہیا کرنے کے لیے تھا۔ عوامی لیگ کے مطابق دائمی امن کو یقینی بنانے کا واحد طریقہ کسی قسم کی مسلح افواج کا نہ رکھنا ہے۔ ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ اس معاہدے کے ذریعے بنگلہ دیش کو اپنی آزادی اور خود مختاری کے تحفظ کے لیے ہر قسم کے تعاون کی یقین دہانی کرا دی گئی ہے لہٰذا ایک فوج رکھنے کی کیا ضرورت ہے؟ اگرچہ انہوں نے اس پہلو پر کوئی بات نہ کی کہ اگر محافظ خود جارحیت پر اتر آئیں تو پھر کیا ہو گا؟ بہر حال عوامی لیگ حکومت نے محض رسمی مسلح افواج قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔

اس معاہدے نے معیشت پر مزید منفی اثرات مرتب کیے۔ دونوں معیشتوں کی غیر مساویانہ صورتِ حال، ترقی کی سطح اور قیمتوں کے ڈھانچے میں پایا جانے والا فرق سرحد پار سمگلنگ کی بڑی وجوہات تھیں، جو بنگلہ

دیش کے مفاد کے خلاف تھی۔ جب سمگلنگ بلا روک جاری تھی، دائمی امن کی سرحد کا مطلب دونوں جانب کسی بارڈر سیکیورٹی کا نہ ہونا تھا۔ اگر بنگلہ دیش اور ہندوستان دونوں کی معیشتیں مکمل طور پر ایک دوسرے کی تکمیل کر رہی ہوتیں یا دونوں معیشتیں ایک واحد معیشت میں مدغم ہو چکی ہوتیں تو پھر شاید ہم اس قسم کی آزاد سرحد کے متحمل ہو سکتے تھے۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی صورت موجود نہ تھی۔ لہٰذا اس صورتِ حال میں بارڈر سیکیورٹی فورسز میں تھوڑی سی کوتاہی کمزور معیشت پر تباہ کن اثرات مرتب کر سکتی ہے۔

ہمسایوں کے درمیان ہمیشہ نئے مسائل جنم لے سکتے ہیں۔ یہ کہنا کہ ایسے مسائل گفت و شنید کے ذریعے حل نہیں ہو سکتے یا ان کا حل صرف طاقت کے ذریعے ممکن ہے، دونوں باتیں ایک سی غلط ہیں۔ اگر سیاسی قائدین باہمی تعاون اور دوستی کے پرخلوص جذبے کے ساتھ ہمدردانہ، معقول اور عملی سوچ رکھتے ہوں تو ایسے اکثر مسائل پرامن ذرائع سے کسی معاہدے کے بغیر بھی حل ہو سکتے ہیں۔ اس قسم کا رویہ ایک حقیقی دوستی اور باہمی اعتماد کی فضا قائم کرنے میں مددگار رہتا ہے۔ تسلط قائم کرنے کی پالیسیاں یا یک طرفہ فیصلے کا زبردستی نفاذ کبھی بھی فائدہ مند نہیں ہو سکتے بلکہ اپنا تسلط قائم کرنے کا اس قسم کا پُرفریب رویہ یا پالیسیاں محض اختلافات کی خلیج کو مزید وسیع کرتی ہیں۔ اس کے نتیجے میں اعتماد کا فقدان، عدم بھروسا اور مخاصمت کی فضا جنم لیتی ہے اور اس کی قیمت عوام کو چکانی پڑتی ہے۔

سیاسی اور معاشی عدم استحکام کی وجہ سے ملک میں پہلے دن ہی سے ایک تکلیف دہ صورتِ حال چھائی ہوئی تھی۔ عوامی لیگ نے بنگلہ دیش میں اقتدار سنبھال لیا تھا۔ جیسا کہ عوامی لیگ پارٹی اور ریاست میں کوئی فرق روا نہیں رکھتی تھی اور پارٹی رہنماؤں کی ناجائز مداخلت کی وجہ سے انتظامیہ اپاہج اور بے اثر ہو چکی تھی، اس کے نتیجے میں امن و امان کی صورتِ حال تیزی سے تباہ ہو رہی تھی۔ حتیٰ کہ انتظامیہ کی مختلف سطحوں پر پارٹی کے اپنے افراد کی تعیناتی نے بھی کوئی زیادہ فائدہ نہیں دیا تھا بلکہ صورتِ حال کو مزید خراب کر دیا تھا۔ مجموعی طور پر انتظامیہ کو پارٹی کنٹرول میں دے دیا گیا تھا اور پارٹی کے ناتجربہ کار اور بااثر رہنماؤں نے بیوروکریٹس پر اپنی مرضی سے حکم چلانا شروع کر دیئے تھے۔ لیکن بیوروکریٹس اس قسم کی بالادستی اور دباؤ کے نیچے کام کرنے کے عادی نہ تھے لہٰذا انہوں نے لاتعلقی اختیار کر لی تھی۔ ان کے جذبے اور حوصلے مکمل طور پر پست ہو چکے تھے۔ اسی دوران صدارتی فرمان نمبر 9 کا نفاذ کر دیا گیا۔ اس فرمان کے تحت کسی کو بھی بغیر کوئی وجہ بتائے ریٹائر کیا جا سکتا تھا اور حکومت کے اس قدم کو کسی بھی عدالت میں چیلنج نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس نے سول ملازمین کے درمیان سراسیمگی پیدا کر دی۔ ان میں احساس تحفظ ختم ہو گیا تھا۔ اکثر بیوروکریٹس نے اپنی ملازمتیں بچانے کے لیے سیاسی رہنماؤں کو خوش کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس طرح سول انتظامیہ اپنی روایتی غیر جانب داری سے محروم ہو گئی اور ریاست کے ایک انتہائی اہم ادارے کو مکمل طور پر بدعنوان اور پراگندہ کر دیا گیا تھا۔

1975ء تک عدلیہ نے ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے ذریعے حکومت کے خلاف بہت سے فیصلے دیئے تھے۔ انہوں نے حکومت کی خواہشات کے خلاف بہت سے سیاسی قیدیوں کی رہائی کے احکامات بھی

جاری کیے۔ملک کے قانونی اداروں نے جاتیو راکھی باہنی کے غیر قانونی ظلم وستم پر شدید تنقید کی۔ایک ایسے ہی کیس کا فیصلہ سناتے ہوئے سپریم کورٹ نے کہا، ''راکھی باہنی ملک کے موجودہ قوانین کی کھلم کھلا خلاف ورزیاں کر رہی ہے اور بلا روک ٹوک غیر قانونی اور ظالمانہ کارروائیاں جاری رکھے ہوئے ہے۔'' اسی عدالت نے مزید کہا، ''یوں نظر آرہا ہے کہ جے آر بی قوانین کی بالکل کوئی پروانہیں کرتی۔'' یہاں قارئین کو 10 جنوری 1975ء کے ''فار ایسٹرن اکنامک ریویو'' میں شائع ہونے والا مضمون ''مجیب کی نجی فوج کے اختیارات'' پڑھنے کا مشورہ دیا جاتا ہے۔عدلیہ کے اس قسم کے رویے سے ناراض ہوتے ہوئے مجیب الرحمٰن نے صدارتی فرمان کے ذریعے عدلیہ کی خودمختار حیثیت کو سلب کرنے کا فیصلہ کر لیا۔جنوری 1975ء کو ایک صدارتی فرمان میں اعلان کیا گیا، ''آج کے بعد بشمول چیف جسٹس سپریم کورٹ کے تمام ججوں کی تقرری صدر کرے گا۔صدر کے حکم پر کسی بھی وقت کسی بھی جج کو نااہلی یا بدعملی کی بنا پر فارغ کیا جاسکتا ہے۔'' اس طرح عدلیہ بھی صدر کے ہاتھوں میں ایک مہرہ بن کر رہ گئی۔

ایک دوسری ترمیم کے ذریعے کہا گیا، ''اس اعلان کے تحت پارلیمنٹ کو حسب ضرورت سپیشل ٹربیونل، عدالتیں اور کمیشن قائم کرنے کا اختیار حاصل ہوگا۔ایسی کارروائی بنیادی اور انسانی حقوق کے تحفظ کے لیے کی جائے گی جس کی ضمانت آئین کے حصہ تین میں دی گئی ہے۔'' اس طرح بنیادی اور انسانی حقوق کے تحفظ کے بہانے عدلیہ کی آزادی کو سلب کر لیا گیا۔اس دوران ایک نعرہ تراشا گیا:

''ایک نیتا، ایک دیش.........شیخ مجیب، بنگلہ دیش''

اس قسم کا نعرہ کسی طور پر بھی جمہوری نعرہ قرار نہیں دیا جاسکتا بلکہ یہ ہٹلر کے جرمنی کے نازیوں اور مسولینی کے اٹلی کے فاشسٹوں جیسا تھا۔شخصیت پرستی ایک رہنما کو کسی فائدے کی نسبت نقصان زیادہ پہنچاتی ہے۔تاریخ ایسی مثالوں سے بھری ہوئی ہے۔

21 جون 1975ء کو ایک صدارتی فرمان کے تحت بنگلہ دیش کو 64 سیاسی اور انتظامی اضلاع میں تقسیم کر دیا گیا۔ساتھ ہی 64 گورنروں کے نام بھی شائع کر دیئے گئے تھے۔ان کو ان اضلاع میں چیف ایگزیکٹو کے اختیارات سونپے گئے تھے۔64 میں سے 46 کا تعلق عوامی لیگ سے تھا۔باقی 27 کا انتخاب پارلیمنٹ کے ممبران میں سے کیا گیا تھا۔ان مقرر کیے گئے گورنروں میں سے سات پرانے سی ایس پی آفیسرز، چھ ای پی سی ایس آفیسرز تھے۔ان کے علاوہ تانگیل سے قادر صدیقی (جنگ آزادی کے دوران خودساختہ بنگا صدیقی اور بعد میں بنگو بیر) ایک ریٹائرڈ کرنل اور چٹاگانگ کے پہاڑی علاقوں سے دو رہنما بھی شامل تھے۔ان گورنروں کے لیے ایک ہنگامی کورس کا بندوبست کیا گیا اور 15 اگست 1975ء تک ان کا کورس مکمل ہو جانا تھا اور انہوں نے اپنے اپنے اضلاع میں جا کر چارج سنبھالنا تھا۔ہر ایک کے پاس جے آر بی کی نصف بٹالین کی قوت ہونا تھی۔ان گورنروں نے براہِ راست صرف صدر کو جواب دہ ہونا تھا۔1986ء تک جے آر بی کی طاقت کو 18,000 تک بڑھانے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔تعداد میں اضافے کے ساتھ ہر گورنر کے تحت ایک بٹالین کی قوت

ہونی تھی۔ جے آر بی کو گورنروں کے تحت رکھنے کی اصل وجہ ضلع میں سے یکسال کی ممکنہ مخالفت کو ختم کرنا تھا۔ انٹیلی جینس ایجنسیوں کو بھی ناپسندیدہ اشخاص کی فہرستیں تیار کرنے میں گورنروں کی مدد کرنے کو کہا گیا تھا، یعنی ایسے افراد کی فہرستیں جو حکومت مخالف تھے اور ان کا خاتمہ ضروری تھا۔ یہ دراصل مجیب اور اس کی نسل کو دوام بخشنے کے ساتھ ساتھ آنے والے لمبے عرصے تک بنگلہ دیش کو ایک طفیلی ریاست کے طور پر قائم رکھنے کے منصوبے کا ایک حصہ تھا۔

شیخ مجیب الرحمٰن کے ہندوستان نواز مؤقف اور اُن کی بدعنوان اور نااہل حکومت، امن و امان کی طوائف الملوکانہ صورتِ حال اور معاشی ابتری، ان کے لیے عوام کا منفی رویہ سب مل کر ملک کے لیے ایک سیاہ مستقبل کی نشان دہی کر رہے تھے۔ اس مرحلے پر تمام قوم پرست سیاسی جماعتوں اور گروہوں نے آواز بلند کی اور حکومت کے خلاف پوشیدہ یا کھلم کھلا کارروائیوں کا آغاز کر دیا۔ مولانا بھاشانی نے دوبارہ ایک عمل انگیز کا کردار ادا کیا۔ انہوں نے ہمیشہ محنت کش طبقے کی مکمل آزادی کا خواب دیکھا تھا اور کبھی بھی یہ تسلیم نہیں کیا تھا کہ مارکسزم لوگوں کو سماجی اور معاشی استحصال کے بندھنوں سے آزادی دلوا سکتا ہے۔ وہ اسلامی ریاست کے تصور کی صورت میں ایک اثر آفرین اور سائنسی تبدیلی لانا چاہتے تھے جو موجودہ دَور سے مطابقت رکھتی ہو اور اس کا نفاذ ریاست کے حکومتی فلسفے کے طور پر کرنا چاہتے تھے۔ اس طرح وہ اپنے عوام کو ریاست کے استحصال اور بدنظمی سے آزادی دلوانا چاہتے تھے۔

اپنے سیاسی فلسفے کو بیان کرتے ہوئے مولانا نے ہمیشہ خالق اور اس کی مخلوق کے ''حق'' کے بارے میں بات کی تھی۔ یہ کوئی مکمل طور پر نیا نظریہ نہیں تھا۔ یہی نظریات کرسچین سوشلزم، ریڈیکل کمیونزم اور یورپین کمیونزم میں بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ انڈونیشیا کے سوئیکارنو نے مذہب، نیشنلزم اور کمیونزم کو آپس میں ملانا چاہا تھا اور ''ناساکوم'' قائم کیا تھا۔ بعد میں انہوں نے کمیونزم کی جگہ سوشلزم کو رکھ کر ''ناساسورس'' قائم کیا۔ مولانا بھاشانی مذہب اور سوشلزم کا ایک مجموعہ ''حکومتِ ربانیہ'' قائم کرنا چاہتے تھے۔

مستقبل، جس کا نقشہ مولانا نے 1971ء میں اپنی بصیرت اور پیش بینی سے کھینچا تھا، وہ بکسال کے قیام کے ساتھ درست ثابت ہو گیا اور شیخ مجیب الرحمٰن اور ان کی عوامی لیگ نے یک حزبی مستبدانہ آمریت ٹھونس دی۔ مولانا نے قوم کے مفاد یا عوام کے مفاد پر کبھی سمجھوتہ نہیں کیا تھا۔ وہ ہندوستان نواز تھے نہ ہی پاکستان نواز تھے۔ جب ضرورت ہوتی تو وہ چین کی پالیسیوں پر بھی تنقید کرتے تھے۔ وہ سوویت یونین کے شدید ناقد تھے جب کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کو بے وجود خیال کرتے تھے۔ یہ تھی وہ عظیم شخصیت جسے مولانا عبدالحمید بھاشانی شیرِ بنگال کے نام سے جانا جاتا تھا۔

105۔ شیخ مجیب کی آمرانہ حکومت کی مخالفت

یہاں ان سیاسی جماعتوں کا ذکر برمحل نظر آتا ہے جنہوں نے عوامی لیگ کی حکومت کی مخالفت کی

اور عوامی لیگ کے خلاف کھلم کھلا یا پوشیدہ تحریکوں کا آغاز کیا۔ اس طرح سے قارئین کو مختلف سیاسی جماعتوں کی پوزیشن، ان کے پس منظر، جدوجہد، اصولوں، نظریات اور ان کے کام کرنے کے طریق ہائے کار کے بارے میں آگاہی مل سکے گی۔ ان کی تحریکیں کس قدر بارآور تھیں اور آیا یہ مجیب حکومت کو گرانے کے قابل تھیں یا نہیں ان سب سوالات پر یہاں تفصیلی بحث کی جائے گی۔

اس کے علاوہ ہم یہ بھی جائزہ لیں گے کہ عوامی لیگ کی مخالف سیاسی جماعتیں ایک متحدہ تحریک کیوں منظم نہ کر سکیں؟ ان کے اتحاد میں کیا چیز مانع تھی، کیا اتحاد قائم کرنے کے لیے کوئی سنجیدہ کوششیں کی گئی تھیں؟ حکومت نے ان کو کچلنے کے لیے کیا پالیسیاں بنائیں اور حکومت کو اپنے اس منصوبے میں کس حد تک کامیابی حاصل ہوئی؟ ان تمام سوالوں کے جوابات سے 15 اگست 1975ء کے تاریخی انقلاب کا جواز بھی سامنے آ جائے گا اور قارئین پوری طرح سمجھ سکیں گے کہ مجیب الرحمٰن کے تحت بکسال کی آمرانہ حکومت کے ظلم وستم سے قوم کو نجات دلانے کے لیے ایک غیر آئینی انقلاب کیوں ضروری تھا۔

سب سے پہلے حکومت مخالف اور عوامی لیگ مخالف تحریک کا آغاز مولانا بھاشانی نے کیا۔ لیکن بعض وجوہات کی بنا پر ان کی جماعت پورے بنگلہ دیش میں اس تحریک کو پھیلانے میں ناکام رہی۔ وہ ملک بھر میں عوام کی اکثریت کو منظم بھی نہ کر سکے۔ اُن کی نظر بندی کی وجہ سے ان کی پارٹی 1971ء میں تنظیمی طور پر کمزور پڑ چکی تھی۔ مولانا اپنی بڑھاپے کی وجہ سے بیمار بھی تھے۔ لہٰذا جنگ کے بعد پارٹی کی تنظیم نو کا محنت طلب کام ان کے بس میں نہیں تھا۔

جاتیو سماج تنترک دَل نے بھی عوامی بکسال وادیوں کی مخالف کی تھی۔ یہ پارٹی عوامی لیگ کے اندر سے ہی ابھری تھی۔ ساٹھ کے عشرے کی ابتدا میں عوامی لیگ کے اندر ایک گروپ چترا لیگ اس نظریے کا حامی تھا کہ ایک آزاد سوشلسٹ بنگلہ دیش کا قیام صرف مسلح جدوجہد کے ذریعے ہی ممکن ہوسکتا ہے۔ ان کا مطالبہ تھا کہ پارٹی قیادت پاکستانی حکومت کے خلاف مسلح انقلاب کی ابتدا کرے۔ سراج العالم خان اس سیاسی فلسفے کا سب سے بڑا داعی تھا۔ سراج العالم خان، اے ایس ایم رب اور شاہ جہان سراج نے لوگوں میں اس نظریے کا پروپیگنڈا شروع کیا اور 1970ء کے انتخابات کے فوراً بعد انہیں منظم کر لیا۔

جب یحییٰ خان نے یکم مارچ 1971ء کو قومی اسمبلی کا اجلاس منسوخ کر دیا تو اس گروپ نے پہلی مرتبہ آزاد بنگلہ دیش کا مطالبہ پیش کیا۔ 2 مارچ کو ڈھاکہ یونیورسٹی میں رب نے پہلی مرتبہ آزاد بنگلہ دیش کا پرچم لہرایا۔ دوبارہ ایک عوامی جلسے میں شیخ مجیب الرحمٰن کی موجودگی میں شاہ جہان سراج نے اچانک اعلانِ آزادی پڑھا۔ رب سراج گروپ کا خیال تھا کہ مذاکرات کی وجہ سے لوگوں کا انقلابی جذبہ سرد پڑ رہا ہے۔ اس لیے انہوں نے شیخ مجیب الرحمٰن پر تمام قسم کی گفت وشنید بند کرنے کے لیے دباؤ ڈالا۔ چترا لیگ کی قرارداد، جو دوبارہ مئی 1972ء میں شائع ہوئی، اس بات کا ثبوت ہے۔ اس وقت کے چترا لیگ کے پبلسٹی سیکریٹری نے یہ قرارداد شائع کی تھی۔

جنگ کے دوران میں چترا لیگ نے جلاوطنی میں قائم ہونے والی تاج الدین احمد کی حکومت کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا اور اُن پر انقلابی حکومت کی تشکیل کے لیے دباؤ ڈالا۔ تاج الدین نے ان کا مطالبہ تسلیم کرنے سے انکار کردیا، چترا لیگ ان کے اس انکار پر برہم ہوگئی اور دونوں کے درمیان شدید اختلافات پیدا ہو گئے۔ 26 مارچ 1971ء سے پہلے یہ رہنما بہت طاقت ور تصور کیے جاتے تھے اور اس طرح شیخ مجیب الرحمٰن پر قابل ذکر اثر کے حامل تھے۔ لیکن جب تاج الدین احمد نے ان کے راستے پر چلنے سے انکار کردیا تو انہوں نے خیال کیا کہ اگروہ تاج الدین سے نبرد آزمانہ ہوئے تو وہ رونما ہونے والے واقعات پر اپنی بالادستی اور اثر ورسوخ کھودیں گے۔ اس لیے انہوں نے شیخ مونی اور شیخ کمال کے ساتھ مل کر تاج الدین کو نظر انداز کرتے ہوئے ہندوستانی حکومت اور انٹیلی جینس ایجنسیوں کی مدد سے بی ایل ایف اور بعد میں مجیب باہنی تشکیل دی۔ اس فوج کو ہندوستانیوں نے اسلحہ اور تربیت دی لیکن اُن کا اِن پر سیاسی کنٹرول نہیں تھا۔ اگر چہ عوام کا خیال تھا کہ یہ فوج شیخ مجیب الرحمٰن اور اس کی حکومت کی مدد کے لیے قائم کی گئی ہے، یہ الوالعزم رہنما کسی شخصیت پرستی میں یقین نہ رکھتے تھے اور خود اپنے ایجنڈے پر عمل پیرا تھے۔

1972ء میں آزادی کے بعد اس گروپ کے پس پشت سیاسی گرو سراج العالم خان نے اسے چترا لیگ، سرامک لیگ اور کریشک لیگ میں تقسیم کردیا۔ 31 اکتوبر 1972ء کو ان سب کے اشتراک سے ایک سیاسی جماعت جاتیو سماج تنترک دَل (جے ایس ڈی) ابھر کر سامنے آئی۔ میجر (ریٹائرڈ) جلیل اور اے ایس ایم رب بالترتیب پارٹی کے صدر اور جنرل سیکریٹری مقرر ہوئے۔ سراج العالم خان اس نئی تشکیل پانے والی پارٹی کے روحانی اور نظریاتی گرو کے طور پر پشت پر رہے۔

جے ایس ڈی کے خیال کے مطابق جب آزادی کی جنگ قومی آزادی کی جدوجہد کی صورت اختیار کررہی تھی تو اسے ایک سازش کے ذریعے فوری طور پر انجام تک پہنچادیا گیا تھا۔ جے ایس ڈی کی قیادت کا دعویٰ تھا کہ انہوں نے پہلے دن سے ہی عوامی لیگ کی قیادت کی مخالفت کی تھی۔ عوامی لیگ کے خلاف ان کا چیلنج 15 اگست 1975ء کی تاریخی سیاسی تبدیلی کے بعد اختتام کو پہنچا۔ ان کا دعویٰ تھا کہ عوامی لیگ کو صرف 8 فیصد عوام کی حمایت حاصل تھی لیکن انہوں نے اپنے ذاتی مفاد کے لیے 85 فیصد سے زائد قومی دولت لوٹی۔ (جے ایس ڈی کا اعلان 1973ء) جے ایس ڈی بنگلہ دیش کمیونسٹ لیگ (بی سی ایل) کی عوامی تنظیم تھی جو پرولتاری طبقے کے سچے نمائندوں پر مشتمل تھی۔ اُن کا دعویٰ تھا کہ بی سی ایل کی بنیاد بھی سراج العالم خان نے رکھی تھی لیکن یہ ایک زیر زمین تنظیم تھی۔

مرکزی تنظیم بی سی ایل نے جنگ آزادی کے دنوں سے لے کر جے ایس ڈی کی تشکیل تک ایک اہم سیاسی کردار ادا کیا تھا۔ بی سی ایل کا مقبول اخبار ''گانا کنتھا'' 1975ء تک، جب اسے حکومت نے بند کردیا، باقاعدگی سے شائع ہوتا رہا۔ مشہور ترقی پسند شاعر اور لکھاری المحمود اس اخبار کے ایڈیٹر تھے۔ دوسری انقلابی اور ترقی پسند سیاسی پارٹیوں کی طرح جے ایس ڈی نے بھی ملک کو درپیش مختلف سماجی ومعاشی مسائل کو اجاگر

کرنے کے لیے آواز اٹھائی۔ 73-1972ء کی سالانہ کانفرنس میں ایک دستاویز شائع کی گئی تھی جس میں اہم قومی مسائل اور مخصوص اقدامات کا ذکر کیا گیا تھا جو جدوجہد کو حتمی کامیابی تک پہنچانے کے لیے ضروری تھے۔ اس میں نامکمل قومی آزادی کی تحریک کے مختلف مراحل کے بارے میں تفصیلات دی گئی تھی۔

بنگلہ دیش کیمونسٹ لیگ نے سوشلزم کے قیام اور انقلاب کے لیے تین واضح مراحل کی نشان دہی کی تھی: ''1971ء کی جنگ آزادی نے دو مراحل مکمل کر دیئے ہیں۔ تیسرا مرحلہ عوامی لیگ اور اس کے سامراجی آقاؤں کے خلاف پرولتاریوں کی مستقبل کی خون ریز تحریک کے ذریعے کامیابی پر ختم ہوگا۔'' جمہوری سیاست ذی اثر گروہوں کے ہاتھوں میں اپنے اقتدار کو قائم رکھنے کے لیے محض ایک ہتھیار ہے۔ جاگیرداری کی باقیات، غیر حاضر زمین داروں اور دیہاتی علاقوں کے بالائی متوسط طبقے کو اس دستاویز میں دیہاتی پرولتاری طبقے کا دشمن قرار دیا گیا تھا۔ دستاویز میں مزید کہا گیا تھا کہ جب تک فتح حاصل نہیں کی جاتی بیرونی قوتیں عوام کا استحصال جاری رکھیں گی کیوں کہ عوامی لیگ بنگلہ دیش کو سامراجیوں کے زیر اثر رکھنے کی کوشش کر رہی ہے۔

ان کے نظریے کے مطابق سامراجی استحصال کی ابتدا بنیادی طور پر امریکی امداد اور معاشی تعاون سے ہوتی ہے۔ بنگلہ دیش کو سوویت یونین (روس) اور ہندوستان کی جانب سے بھی استحصال کا خطرہ تھا۔ دستاویز میں دعویٰ کیا گیا تھا کہ عوامی لیگ کی معاشی پالیسیاں اس قسم کے استحصال کو یقینی بنانے کے لیے تشکیل دی گئی ہیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے جو ایک مثال پیش کی وہ ''جیوٹ ایکسپورٹ کارپوریشن'' کا مرکزی دفتر نئی دہلی میں قائم کرنا تھا۔ ایک مرحلے پر بی سی ایل کا خیال تھا کہ عوامی جمہوریہ چین بنگلہ دیشیوں کی قومی آزادی کی تحریک سے ہمدردی رکھ سکتا ہے۔

اگرچہ بی سی ایل نے پہلے بین الاقوامی کیمونسٹ تحریک میں موجود جھگڑوں سے دُور رہنے کا فیصلہ کیا تھا، اس دستاویز میں انہوں نے قومی اور بین الاقوامی سطح پر دوسری مارکسٹ اور لیننسٹ ترقی پسند اور قوم پرست جماعتوں سے دوستانہ تعلقات رکھنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ جے ایس ڈی نے مجاہدین آزادی میں سے ممبران اور عہدیداروں کی بھرتی سے اپنی تنظیمی مہم کا آغاز کیا۔

20 جنوری 1974ء کو امریکی، روسی اور ہندوستانی بالادستی اور استحصال کے خلاف احتجاج کے طور پر جے ایس ڈی، بی سی ایل اور سرامک لیگ (جے ایس ڈی) نے متحدہ طور پر ملک گیر عام ہڑتال منظم کی۔ انہوں نے اساتذہ کی تنخواہوں اور محنت کشوں کی مزدوری میں اضافہ کا مطالبہ کیا۔ رہنماؤں نے اپنی تقاریر میں رشوت ستانی، سپیشل پاورز ایکٹ، اقربا نوازی اور عوامی لیگیوں میں لائسنسوں اور پرمٹوں کی ناجائز تقسیم کے خلاف احتجاج کیا۔ انہوں نے حکومت کو 17 مارچ تک ان مطالبات کو پورا کرنے کا الٹی میٹم دیا، بہ صورت دیگر انہوں نے ''گھیراؤ'' کی دھمکی دی۔ 17 مارچ کو جے ایس ڈی نے اس وقت کے وزیر داخلہ کی سرکاری رہائش گاہ کا گھیراؤ کر لیا۔ پولیس کی جوابی کارروائی وحشیانہ تھی۔ پولیس فائرنگ کی وجہ سے تین افراد موقع پر جاں بحق ہو گئے اور 14 افراد شدید زخمی ہوئے۔ میجر جلیل، رب اور 40 پارٹی کارکن بھی زخمی ہوئے اور گرفتار کر لیے

گیئے۔ سراج العالم خان چند دوسرے زیر زمین رہنماؤں کے ہمراہ فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ بعد میں انہوں نے دیہاتی علاقوں میں اپنی جدوجہد جاری رکھی۔ بہت سے سیاسی تجزیہ نگاروں نے جے ایس ڈی کی اس کارروائی کو ایک بے ثمر مہم قرار دیا۔

ایک مشہور ترقی پسند دانش ور سراج الاسلام چوہدری نے اپنی کتاب "سادھنتار شمر بھائی" میں جے ایس ڈی کے بارے میں لکھا، "جیسا کہ عوامی لیگ کبھی مسلم لیگ سے ٹوٹ کر الگ ہوئی تھی، جے ایس ڈی بھی اسی طریقے سے وجود میں آئی ہے۔ وہ اپنے آپ کو انقلابی انتہا پسند کہتے ہیں۔ ان کے سوشلسٹ نعروں سے متاثر ہو کر نوجوانوں اور طالب علموں کی ایک بڑی تعداد نے اس میں شمولیت اختیار کر لی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے۔ لیکن اس کے رہنما حقیقی سوشلسٹ نہیں ہیں۔ یہ سارے بنیادی طور پر عوامی لیگی ہیں۔ وہ شیخ مجیب کے ساتھ مل کر "انقلابی حکومت" قائم کرنا چاہتے تھے لیکن شیخ مجیب نے اپنے آپ کو انقلابی بنانے سے انکار کر دیا جس کے نتیجے میں انہوں نے اپنا الگ راستہ اختیار کر لیا۔ پارٹی کے نام میں "جاتیو" کی اصطلاح بلا مقصد شامل نہیں کی گئی۔ وہ قوم پرست ہیں اور ہمیشہ اپنے طبقے کے مفاد سے مخلص رہے ہیں کیوں کہ ان کے مستقبل کا انحصار اس پر ہے۔ لیکن انہوں نے طبقاتی جدوجہد کا نعرہ محض لوگوں کو متوجہ کرنے کے لیے لگایا تا کہ وہ بنگلہ دیش کی نوجوان نسل کی نگاہوں میں ہیرو بن سکیں۔ اگر مجیب پاکستان کی قید سے رہائی نہ پا سکتے تو ابھرتی ہوئی بائیں بازو کی قوتوں کے خلاف جدوجہد کے لیے انہوں نے 1971ء میں مجیب باہنی تشکیل دے رکھی تھی۔ ان پر ایک قریبی نگاہ ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ ان کا لائحہ عمل بورژوا پالیسیوں پر مبنی تھا اگرچہ انہوں نے جو فقرے اپنا رکھے تھے وہ بڑے انقلابی قسم کے تھے۔ دوسری جانب اس بات میں کسی حیرانی یا شک کی گنجائش نہیں کہ وہ قومی تعمیر نو کی اپنی تحریک کے ذریعے حکومت کو سہارا مہیا کر رہے تھے۔"

اس بات میں کسی وضاحت کی ضرورت نہیں ہے کہ اس سارے منظر نامے سے واضح طور پر نظر آتا ہے کہ ابتدا میں مجیب باہنی کے قیام سے سب سے زیادہ فائدہ ہندوستان کو ہوا تھا، اور اس کے بعد یہ جے ایس ڈی تھی جس نے چار خلیفوں میں سے کلیدی حیثیت کے حامل سراج العالم خان کی قیادت میں بہت فائدہ اٹھایا۔ سراج العالم خان نے 1971ء میں نہ صرف اندرا گاندھی اور "را" کے جنرل اوبان سنگھ کے ساتھ خصوصی تعلقات استوار کیے بلکہ ہندوستان کے ایک بزرگ سیاستدان جے پرکاش نارائن کے ساتھ بھی قریبی تعلقات قائم کر لیے۔ جب سراج العالم خان تاج الدین احمد سے اپنے اختلاف کے اظہار کے لیے نئی دہلی گئے اور "مجیب باہنی" کے نام سے ایک مخصوص فوج تیار کرنے کی تجویز پیش کی تو ہندوستان کی وزیر اعظم اور جنرل اوبان سنگھ دونوں نے دو طویل المدتی اہداف حاصل کرنے کے لیے اس خیال کی پرزور تائید کی۔ اوّل، جنگ کے بعد کے دور میں انہیں دائیں اور قوم پرست قوتوں کے خلاف استعمال کرنے کے لیے، اور دوئم ان چار خلیفوں، اور اگر ضرورت محسوس ہو تو شیخ مجیب کو بھی مکمل طور پر ہندوستانی حکومت کا دست نگر رکھنے کے لیے اسے استعمال کیا جا سکے، ہندوستان ان کو اوپر لا کر شیخ مجیب کی جگہ بھی استعمال کر سکتا تھا۔

تاریخ کے تناظر میں جے ایس ڈی کو جس طور پر دیکھا جاتا ہے اس حقیقت سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ ''سماجی اور معاشی آزادی کی خاطر جے ایس ڈی کی آواز پر شیخ مجیب الرحمٰن کی فاشسٹ حکومت کے خلاف لڑتے ہوئے سینکڑوں اور ہزاروں مخلص افراد نے اپنی جانوں کے نذارنے پیش کیے۔ رہنماؤں کے حقیقی ارادوں کا تنقیدی تجزیہ کرنا اور ان رابطوں کو تلاش کرنا جن کی مدد سے باہر بیٹھ کر ان رہنماؤں کو کنٹرول کیا جا رہا تھا، انتہائی ضروری ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ حقیقت اپنی جگہ قائم رہتی ہے کہ اپنے مقصد سے وابستہ جے ایس ڈی کے سینکڑوں اور ہزاروں کارکنوں اور حمایتیوں کی قربانیوں میں کسی قسم کے اخلاص کا فقدان نہیں تھا۔ بنگلہ دیش کی موجودہ اور مستقبل کی نسلیں ان شہیدوں کی جرأت اور دلیری کو خراج عقیدت پیش کرتی رہیں گی۔ ان کا خون جو اس دھرتی پر گرا وہ ہمیشہ تمام محبِ وطن افراد کو امن، خوش حالی اور انسانی حقوق کی بحالی کے لیے جدوجہد میں حوصلے اور جذبے سے نوازتا رہے گا۔

بنگلہ دیش کمیونسٹ پارٹی (لیننسٹ) بی سی پی ایل نے بھی عوامی بکسال حکومت کی مخالفت کی تھی۔ 1971ء کی جنگ آزادی کے دوران پانچ پیکنگ نواز کمیونسٹ گروپس نے ایک ''ریولوشنری کوآرڈینیٹنگ کمیٹی'' تشکیل دی۔ جنگ کے بعد ان پانچ گروپس میں سے چار نے مل کر ''بنگلہ دیش کمیونسٹ پارٹی لیننسٹ'' قائم کی۔ اس میں شامل ہونے والے گروپس مندرجہ ذیل تھے:

1۔ ریوولوشنری کوآرڈی نیٹنگ کمیٹی
2۔ ایسٹ پاکستان کمیونسٹ پارٹی (ایم ایل)
3۔ منصور حسین اور ڈاکٹر سیف الدھر کی زیر قیادت کھلنا سے کچھ کمیونسٹ
4۔ نسیم علی خان کی قیادت میں کچھ کمیونسٹ

اس پارٹی کا مؤقف یہ تھا کہ مشرقی بنگال کے کمیونسٹ آپس میں منقسم رہے تھے اور 1971ء کی جنگ آزادی میں قیادت مہیا نہ کر سکے تھے۔ لہٰذا انہوں نے کمیونسٹ اتحاد کی آواز بلند کی تا کہ ادھورے انقلاب کو مکمل کیا جا سکے۔ بنگلہ دیش کمیونسٹ سالڈیریٹی سینٹر نے ''اوا گو بڑا کمیونسٹ پارٹی گورے تولن'' کے عنوان سے فروری 1972ء میں شائع شدہ ایک دستاویز میں یہ اپیل کی تھی۔ پارٹی کا موقف کھلم کھلا یا پوشیدہ طور پر جدوجہد کو جاری رکھنا تھا۔ پارٹی نے ایک طالب علم محاذ بھی تشکیل دیا جس کا نام ''بنگلہ دیش بپلوبی چترا یونین'' رکھا گیا۔ مزدور محاذ پر انہوں نے ''بنگلہ سرامک فیڈریشن'' منظم کی۔ بعد میں انہوں نے ایک کھلی عوامی سیاسی پارٹی تشکیل دی جس کا نام یونائٹڈ پیپلز پارٹی (یو پی پی) رکھا گیا۔ 18 جنوری 1974ء کو نسیم علی نے اس نئی پارٹی کے قیام کا اعلان کیا۔ بی سی ایل اور بی سی پی ایل میں بہت زیادہ نظریاتی مماثلت پائی جاتی تھی۔ دونوں پارٹیوں پر قابض بورژوا یہ خیال کرتے تھے کہ 1971ء کے دوران میں بنگلہ دیش کی قومی آزادی کی تحریک قیادت کے فقدان کی وجہ سے نا تمام رہ گئی تھی۔ یہ دونوں پارٹیاں سوویت یونین (روس) کو سوشل سامراجی طاقت خیال کرتی تھیں جو بنگلہ دیش پر اپنی بالادستی قائم کرنا چاہتا تھا۔ وہ ہندوستان کو بھی توسیع پسند ملک گردانتی

تھیں۔ لیکن دونوں پارٹیاں ہندوستان کی نکسل باڑی تحریک کو ایک خطرناک مہم جوئی قرار دے کر تنقید کا نشانہ بناتی تھیں۔ (بی سی پی ایل کا 1972ء کا اعلان جسے پارٹی کے جنرل سیکریٹری ایمل سین نے تحریر کیا تھا)۔

بی سی پی ایل عوامی تنظیم اور طلبا اور مزدور محاذوں کے حوالے سے بی سی ایل کے مقابلے میں ایک کمزور گروپ تھا۔ لہٰذا ان کی آواز ملک گیر ہونے کی بجائے زیادہ تر علاقائی تھی۔

پور با بنگلا رکمیونسٹ پارٹی مارکسسٹ لیننسٹ (ایم ایل) عبدالبشر کی قیادت میں ریوولوشنری کو آرڈی نیٹنگ کمیٹی کی پانچویں شریک کار تھی، جو کوئی نظریاتی یا دوسرا اہم اختلاف تو نہیں رکھتی تھی لیکن چند معمولی نوعیت کے اختلافات کی بنا پر بی سی پی ایل میں شامل نہ ہوئی۔ اس پارٹی کا خیال تھا کہ مغربی پاکستان کے فوجی ٹولے کا استبداد جنگ آزادی کی اہم وجہ تھا۔ اِن کے نزدیک بنگلہ دیش اور ہندوستان کے درمیان پایا جانے والا مفادات کا ٹکراؤ آزاد بنگلہ دیش پر بالادستی حاصل کرنے کے ہندوستانی جنون کا نتیجہ تھا۔ اُن کا یہ بھی خیال تھا کہ آخر کار عوامی جمہوریہ چین کی کمیونسٹ پارٹی بنگلہ دیش کے عوام کی جدوجہد آزادی میں اہم کردار ادا کرے گی۔ اس پر بی سی پی ایل قدرے نرم رویہ رکھتی تھی۔ بشر سکندر گروپ کی پارٹی کو بعد میں بنگلا رکمیونسٹ پارٹی کا نام دیا گیا۔ اس پارٹی نے بھی کھلم کھلا اور پوشیدہ سرگرمیاں جاری رکھنے اور مزدور اور طلبا محاذ منظم کرنے کا فیصلہ کیا۔ حکمت عملی کے طور پر اس پارٹی نے پارلیمانی جمہوریت میں شمولیت کے حق میں فیصلہ کیا۔ بی سی ایل اور بی سی پی ایل دونوں نے معمول کے مطابق کھلی عوامی تنظیموں پر زور دیا، لیکن ساتھ ہی خفیہ پارٹی سیل بھی قائم رکھے۔

متذکرہ بالا پارٹیوں کے علاوہ چار مزید پارٹیاں بھی تھیں، جنھوں نے صرف زیرِ زمین سیل قائم کرنے کا فیصلہ کیا اور مسلح جدوجہد پر یقین رکھتی تھیں۔ ان چار پارٹیوں میں سے دو پارٹیاں ایسٹ پاکستان کمیونسٹ پارٹی (ایم ایل) سے علیحدہ ہونے والے افراد نے تشکیل دی تھیں۔ تیسری پارٹی پور با بنگلا رکمیونسٹ پارٹی سے علیحدگی اختیار کرنے والے گروہ پر مشتمل تھی۔ سکندر بشیر نے بھی پور با بنگلا رکمیونسٹ پارٹی کو چھوڑنے کے بعد بنگلا رکمیونسٹ پارٹی تشکیل دی۔

چوتھی پارٹی ان پارٹیوں کی نسبت جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، بالکل ہی مختلف طریقے سے تشکیل پائی تھی۔ اس پارٹی کا نام ''پور با بنگلہ سربہارا پارٹی'' تھا۔ ایک انقلابی رہنما کامریڈ سراج شیکدار نے ''پور با بنگلا رسرامک اندولون'' قائم کی، جس میں سے بعد میں پور با بنگلہ سربہارا پارٹی نمودار ہوئی۔ 1975ء میں شیخ مجیب الرحمٰن کی حکومت کے ہاتھوں مرنے تک سراج شیکدار اس پارٹی کے چیئرمین رہے۔ اس پارٹی کی قیادت یونیورسٹیوں کے اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقے سے ابھری تھی، اس لیے ان کی تحقیق اور پروپیگنڈا کا طریقہ کار دوسری پارٹیوں کی نسبت بہت زیادہ مختلف اور زیادہ مؤثر تھا۔ ان کی تنظیمی سرگرمیاں زیادہ اثر آفریں اور کارگر تھیں۔ پارٹی کے اخباروں ''لال جھنڈا'' اور ''سنگ باد بلٹن'' کے علاوہ مرکزی کمیٹی کے فیصلوں اور عصر حاضر کے مسائل پر مبنی بہت سی دستاویزات باقاعدگی سے شائع کیں۔ یہ دستاویزات زیادہ تر سراج شیکدار جب تک

زندہ رہے، خود لکھتے اور مدون کرتے تھے۔ مواصلات کا نظام اور پروپیگنڈا مشینری بہت زیادہ باضابطہ اور اعلیٰ معیار کی تھی۔ پارٹی کی دستاویزات ملک کے دُور دراز علاقوں میں بھی آسانی سے دستیاب تھیں۔ دوسری تمام پارٹیوں کی طرح سر بہارا پارٹی بھی سمجھتی تھی کہ 1971ء میں قومی آزادی کی تحریک ادھوری رہ گئی تھی کیوں کہ عوامی لیگ کو اقتدار میں لانے کے لیے جنگ کو جلد اختتام تک پہنچا دیا گیا تھا۔

سر بہارا پارٹی عوامی لیگ کی حکومت کو ہندوستان کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی حکومت خیال کرتی تھی۔ پارٹی کی تحریروں میں کہا جاتا تھا کہ ہندوستان کی مدد سے اقتدار حاصل کرنے کے بعد عوامی لیگ کی حکومت لوٹ مار اور غارت گری کے ذریعے ہندوستان کے عظیم منصوبے کو بنگلہ دیش پر لاگو کرنے میں مدد فراہم کر رہی ہے۔ پارٹی کا دعویٰ تھا کہ جاتیو راکھی باہنی (جے آر بی) کی شکل میں ہندوستان اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے بالواسطہ طور پر اپنی فوجی موجودگی کو قائم رکھے ہوئے ہے۔

پارٹی نے عوام کو بھی متنبہ کیا تھا کہ عوامی لیگ کی حکومت کے تحت بنگلہ دیش کو امریکی سامراجیت اور ہند روسی توسیع پسندی سے مسلسل خطرے کا سامنا ہے۔ اس نے جاتیو سماج تنترک دَل (جے ایس ڈی) کے سائنٹفک سوشلزم کے نعرے کو ٹراٹسکی کی بدنظمی سے تشبیہ دی تھی۔ اس کے نظریہ سازوں نے اس کی وجہ یہ بیان کی تھی کہ قومی انقلاب کی تکمیل سے پہلے سوشلسٹ انقلاب کی ابتدا کرنا ممکن نہیں ہوسکتا۔ پارٹی یقین رکھتی تھی جبکہ عوامی لیگ کے تحت قومی انقلاب کا حصول ممکن نہیں ہوسکتا کیوں کہ یہ قومی بورژوا طبقے کی نمائندگی نہیں کرتی۔

سر بہارا پارٹی کے مطابق چوں کہ عوامی لیگ دلالوں اور غیر ملکی تجارتی اداروں کے ایجنٹوں کی نمائندگی کرتی ہے، اس لیے جدوجہد کو قدم بہ قدم آگے کامیابی کی طرف لے جانے کے لیے پرولتاری قیادت کے قیام کی ضرورت ہے۔ اس طرح پارٹی نے کسانوں، کارکنوں، غریب عوام، استحصال زدہ اور پسے ہوئے افراد اور اقلیتی قوم پرستوں کو مختلف پرچموں تلے منظم کیا۔ اس کے نظریہ ساز یہ رائے بھی رکھتے تھے کہ کیوں کہ بنگلہ دیش چاروں طرف سے ہندوستان میں گھرا ہوا ہے، اس لیے جدوجہد کے لیے باہر سے مدد حاصل کرنا بہت مشکل ہوگا۔ لہٰذا انقلابیوں کو زیادہ تر خود اپنے وسائل پر انحصار کرنا ہوگا۔

کامریڈ سراج شیکدار کی اثر آفریں قیادت اور سر بہارا پارٹی کی انقلابی سرگرمیوں نے شیخ مجیب الرحمٰن کی حکومت میں سراسیمگی پھیلا دی۔ اس پارٹی کے مسلح گوریلوں نے یکے بعد دیگرے کارروائیاں کرتے ہوئے حکومت اور اس کی مختلف باہنیوں کو ہراساں کر دیا۔ اس کی کامیابی نے ملک میں سنسنی پھیلا دی۔ نوجوانوں میں پارٹی کا تاثر بہت بلند ہوگیا۔ اس کے نتیجے میں زندگی کے ہر طبقے سے بیسیوں نوجوان اور بوڑھے افراد ان کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے پارٹی میں شامل ہونے لگے۔ مجموعی طور پر عوام میں سر بہارا پارٹی کے ساتھ ہمدردیاں پیدا ہوگئیں۔ بنگلہ دیش کی تاریخ میں کوئی سیاسی پارٹی بھی اس قدر مختصر مدت میں اتنی زیادہ مقبولیت حاصل نہیں کر سکی تھی۔ بتدریج یہ عوام میں مقبولیت اور ہمدردی کے حوالے سے جے ایس ڈی سے

بازی لے گئی۔

2 دسمبر 1973ء کو مولانا بھاشانی نے ایک بیان میں سر بہارا پارٹی کی حمایت کرتے ہوئے کامریڈ سراج شیکدار کو مبارکباد دی۔ لیکن اس جرأت مند مجاہد آزادی اور ایک سیاسی جماعت کے سربراہ کو شیخ مجیب الرحمٰن کے حکم پر حراست کے دوران بدترین تشدد کا نشانہ بناتے ہوئے ہلاک کر دیا گیا۔ اس کی موت سے متعلق سترہ سال بعد 5 جون 1992ء کو دینک شنگرام میں ایک مضمون شائع ہوا۔ یہ مضمون ذیل میں پیش کیا جارہا ہے۔ اس مضمون سے نہ صرف اُن کے وحشیانہ قتل کی دہشت ناک تفاصیل سے آگاہی حاصل ہوتی ہے بلکہ اقتدار پر براجمان پارٹی کی سرگرمیوں اور شیخ مجیب کی قیادت میں ملک پر چھائی ہوئی مجموعی صورت حال کا بھی علم ہوتا ہے۔ اس مضمون کا عنوان درج ذیل تھا۔

106۔ بشمول رزاق، طفیل اور نسیم، سات ملزموں پر سراج شیکدار کے قتل کا مقدمہ دائر کر دیا گیا

سٹاف رپورٹر

''چیف میٹروپولیٹن مجسٹریٹ کی عدالت میں پوربا بنگلا سر بہارا پارٹی کے رہنما مسٹر سراج شیکدار کے قتل کا مقدمہ عوامی لیگ کے لیڈر شیخ مجیب الرحمٰن، عبدالرزاق، طفیل احمد اور محمد نسیم سمیت سات ملزمان کے خلاف درج کرا دیا گیا ہے۔ یہ مقدمہ سراج شیکدار پریشد کے صدر شیخ محی الدین نے درج کروایا ہے، ملزمان میں مندرجہ ذیل افراد شامل ہیں:

1۔ شیخ مجیب الرحمٰن
2۔ محبوب الدین احمد سابق سپرنٹنڈنٹ پولیس
3۔ عبدالرزاق ایم پی
4۔ طفیل احمد ایم پی
5۔ ای اے چوہدری سابق آئی جی پولیس اور موجودہ چیئرمین پوبالی بینک
6۔ کرنل (ریٹائرڈ) قاضی نورالزمان، سابقہ ڈی جی جاتیو راکھی باہنی اور سویڈن میں بنگلہ دیش کا موجودہ سفیر
7۔ محمد نسیم ایم پی

ملزمان پر دفعہ 302 اور 109 کے تحت مقدمہ درج کیا گیا ہے۔ مرحوم سراج شیکدار ایک معروف انجینئر اور آزادی پسند باشعور اور جرأت مند مجاہد آزادی تھے۔ پسے ہوئے طبقے کی آزادی کے لیے انہوں نے سب سے پہلے ایک مزدور تنظیم قائم کی اور پھر آزادی کی جنگ میں بھی حصہ لیا اور آخر میں اپنی جدوجہد کو جاری رکھنے کے لیے پوربا بنگلا سر بہارا پارٹی تشکیل دی۔ عوام کے مفاد کے لیے ان کے خلوص اور سرگرمیوں کی وجہ

سے ان کی مقبولیت وحمایت میں روز افزوں اضافہ ہو رہا تھا۔ مرحوم شیخ مجیب الرحمٰن جو اس وقت حکومت کے سربراہ تھے، حسد محسوس کرنے لگے اور خوف زدہ ہو گئے اور اپنی بڑھتی ہوئی نامقبولیت سے پریشان ہوتے ہوئے اور اقتدار سے محروم ہو جانے کے خوف کے تحت انہوں نے سربہارا پارٹی کے کارکنوں پر تشدد اور دہشت گردی کی انتہا کر دی۔ حتیٰ کہ انہوں نے پارٹی کے سربراہ سراج شیکدار کو مختلف طریقوں سے قتل کروانے کی بھی بہت سی سازشیں تیار کیں۔

رپورٹ میں بیان کیا گیا تھا کہ ملزمان کے شیخ مجیب الرحمٰن کے ساتھ قریبی تعلقات تھے اور ان کے ساتھی اور بااعتماد آفیشلز تھے اور خفیہ ملاقاتیں بھی کرتے تھے۔ جیسا کہ ملزمان نمبر 1 سے 6 اس وقت حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے، انہوں نے دوسرے شریک ملزمان کے ساتھ مل کر سراج شیکدار کو قتل کرانے کا منصوبہ تیار کرنے میں شیخ مجیب الرحمٰن کی مدد کی اور منصوبے میں حصہ لیا۔ انہوں نے اپنے منصوبے پر عمل کرنے کے لیے پارٹی کے کارکنوں کو قتل کرنے، اغوا کرنے، گرفتار کرنے اور ہراساں کرنے کی خفیہ کارروائیوں کا آغاز کر دیا۔ رپورٹ میں سراج شیکدار کی گرفتاری اور قتل کو بیان کرتے ہوئے کہا گیا تھا کہ ایک مرحلے پر شیخ مجیب الرحمٰن اور ملزمان نے سراج شیکدار کو قتل کرانے کے لیے پارٹی میں حکومتی ایجنٹوں کو داخل کرنے کا منصوبہ بھی تیار کیا تھا۔ ای اے چوہدری کے ایک قریبی رشتہ دار کو بھی حکومتی ایجنٹ کے طور پر پارٹی میں داخل کیا گیا۔

یکم جنوری 1975ء کو سراج شیکدار کو پارٹی کے ایک رکن کے ہمراہ چٹاگانگ نیو مارکیٹ کے علاقے سے گرفتار کر لیا گیا اور اسی دن ہوائی جہاز کے ذریعے انہیں ڈھاکہ پہنچا دیا گیا۔ انہیں پرانے ہوائی اڈے پر لایا گیا جہاں سے انہیں بھاری سیکیورٹی دستوں کے ساتھ مالی باغ میں سپیشل برانچ کے ہیڈ کوارٹرز لے جایا گیا۔ یہاں دونوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ کر دیا گیا۔ اور سراج شیکدار کو غیر انسانی تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ 2 جنوری کی شام کو جے آر بی کا سپیشل سکواڈ انہیں ہتھکڑیوں میں بنگا بھوَن میں شیخ مجیب الرحمٰن کے سامنے لے کر آیا۔ وہاں پر اس وقت کے وزیر داخلہ کیپٹن (ریٹائرڈ) منصور علی، تمام ملزمان، شیخ مجیب الرحمٰن کا بیٹا شیخ کمال اور ان کا بھتیجا شیخ فضل الحق مونی بھی شیخ مجیب الرحمٰن کے ساتھ موجود تھے۔

سراج شیکدار کو دیکھتے ہی مجیب الرحمٰن نے انہیں گالیاں دینا شروع کر دیں۔ جب انہوں نے احتجاج کیا تو شیخ مجیب الرحمٰن سمیت وہاں موجود تمام افراد اُن پر جھپٹ پڑے جب کہ ان پر بندوق بھی تان کر رکھی گئی تھی۔ اس وقت بھی سراج شیکدار نے شیخ مجیب الرحمٰن سے اپنے بیٹے شیخ کمال کو بینک ڈکیتیوں اور دوسرے غلط کاموں سے روکنے کا مطالبہ کیا۔ انہوں نے ہندوستان کی غلامی پر مبنی ان کی پالیسی پر بھی شدید تنقید کی۔ اس پر شیخ مجیب الرحمٰن کا غصہ عروج پر پہنچ گیا اور جب سراج شیکدار نے ملک میں پھیلی ہوئی بدعنوانیوں کے خلاف اقدامات اٹھانے کے لیے کہا تو وہ بہت زیادہ برہم ہو گئے۔ اس موقع پر ملزم نمبر 1 محبوب الدین نے اپنے ریوالور کے ساتھ اُن کے سر پر ضرب لگائی، سراج شیکدار نیچے گر گئے۔ شیخ کمال غصے سے پاگل ہو

گئے اور اپنے والد کی موجودگی میں ان پر فائر کر دیا۔ گولی بازو پر لگی۔ اس کے ساتھ ہی تمام ملزمان نے بہ یک وقت انہیں زدوکوب کرنا شروع کر دیا۔ وہ اپنے اعلیٰ رہنما کی موجودگی میں انہیں تھپڑوں اور گھونسوں سے مار رہے تھے جب کہ سراج شیکدار فرش پر لیٹے ہوئے تھے ایک موقع پر وہ بے ہوش بھی ہو گئے۔

اس کے بعد شیخ مجیب الرحمٰن، کیپٹن (ریٹائرڈ) منصور علی اور دوسرے ملزمان نے سراج شیکدار کو مار دینے کا فیصلہ کیا اور نمبر 1 ملزم کو ضروری کارروائی کرنے کا حکم دیا۔ اس پر ملزم نمبر 1 انہیں شیر بنگلا نگر میں جے آر بی کے ہیڈ کوارٹرز لے کر آ گیا۔ یہاں انہیں مزید تشدد کا نشانہ بنایا گیا اور 2 جنوری کو رات 11 بجے کے قریب انہیں گولی مار کر قتل کر دیا گیا۔ رپورٹ میں مزید کہا گیا کہ شیخ مجیب الرحمٰن نے حکومت کے سربراہ کے طور پر پارلیمنٹ میں تقریر کرتے ہوئے فخریہ انداز میں کہا، ''اب سراج شیکدار کہاں ہے؟''

یہ شیخ مجیب الرحمٰن کے انتقامی رویے کا ایک واضح مظاہرہ تھا۔ ملزم نمبر 1 اور سپیشل سکواڈ کے ارکان منصوبے کے مطابق ان کی لاش لے کر تل باغ کے راستے سیور تھانے لے کر آ گئے اور دوسرے روز ان کے مردہ جسم کو مردہ خانے منتقل کر دیا گیا۔

اس بات کی وضاحت میں کہ یہ مقدمہ اتنی دیر بعد کیوں دائر کیا گیا ہے، کہا گیا کہ ''سراج شیکدار کے قتل ہونے کے فوراً بعد ان کے مرحوم باپ عبدالرزاق ایف آئی آر درج کروانے کے لیے پولیس سٹیشن گئے تھے، لیکن جیسا کہ یہ ایک مطلق العنان حکومت تھی اور ہر طرف جے آر بی کی دہشت کا راج تھا پولیس نے ایف آئی آر کاٹنے سے انکار کر دیا تھا۔ دہشت کی فضا اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے سیاسی عدم استحکام، آمرانہ حکومت اور مختلف حلقوں کی جانب سے دباؤ کے نتیجے میں گزشتہ 12 سالوں میں مقدمہ درج کروانا ممکن نہیں رہا تھا۔ مدعی جو مرحوم سراج شیکدار کا ایک پیروکار ہے اپنی زندگی کو خطرے میں ڈالتے ہوئے انصاف کے حصول کے لیے مقدمہ درج کروانے کے لیے سامنے آیا ہے، جیسا کہ اب ملکی حالات کسی حد تک جمہوری ہیں۔ پٹیشن سننے کے بعد چیف میٹروپولیٹن مجسٹریٹ نے تیج گاؤں پولیس سٹیشن کے انچارج کو تحقیق کے لیے ضروری قانونی کارروائی کرنے کا حکم جاری کیا۔ یہ پٹیشن ایڈووکیٹ فرمان اللہ خان نے پیش کی تھی جن کی معاونت ایڈووکیٹ افضل حسین کر رہے تھے۔''

سراج شیکدار کے وحشیانہ قتل کے بعد حکومتی استبداد، قیادت کے لیے کشمکش اور اندرونی ٹوٹ پھوٹ کی وجہ سے سربہارا پارٹی کمزور ہو گئی اور حصوں بخروں میں بٹ گئی۔ اس طرح پارٹی کا تاثر اور اثر و رسوخ قابل ذکر حد تک ختم ہو گیا۔ لوگوں کی امیدیں بھی دم توڑ گئی تھیں اور وہ پارٹی کے مستقبل کے بارے میں شکوک و شبہات کا شکار ہو گئے تھے۔ اس طرح امید اور توقعات کی جو کرن عوام کے دلوں میں پیدا ہوئی تھی، وہ شیخ مجیب الرحمٰن کی آمریت کے نتیجے میں ماند پڑ گئی۔

کامریڈ ظہ اور کامریڈ شراد یندو دستی دار کی قیادت میں سماوادی دَل اپنی زیر زمین سرگرمیوں کے ذریعے شیخ مجیب الرحمٰن کی حکومت کی مخالفت کر رہی تھی۔ 1968ء میں جب بین الاقوامی کمیونسٹ تحریک بنیادی

طور پر منقسم ہوگئی تو سماوادی دَل پورا کا پورا پاکستان کمیونسٹ پارٹی سے ٹوٹ کر ایک پیکنگ نواز پارٹی کے طور پر وجود میں آئی تھی۔ 1972ء میں اس پارٹی نے اپنے اخبار ''گانوشکتی'' کے ذریعے دعویٰ کیا کہ ''بنگلہ دیش اپنی حقیقی آزادی حاصل نہیں کر سکا۔ ہندروسی اتحاد مجیب الرحمٰن کی کٹھ پتلی حکومت کے ذریعے بنگلہ دیش کو کنٹرول کر رہا ہے۔'' سماوادی دَل بھی سربہارا پارٹی کی طرح اس خیال کی حامل تھی کہ ہندوستان جے آر بی کے ذریعے بنگلہ دیش میں اپنی فوجی موجودگی کو برقرار رکھے ہوئے ہے۔ ہندوستانی فوج اور جے آر بی شمال مشرقی ہندوستانی ریاستوں میں قومی آزادی کی تحریک کو کچلنے کے لیے مشترکہ کارروائیاں کر رہی تھیں۔ شیخ مجیب الرحمٰن نے جاتیو راکھی باہنی کے قیام کی تجویز محض اپنے اقتدار میں رہنے کی خاطر قبول کر لی تھی۔ سماوادی دَل نے بھی جاتیو مکتی فرنٹ اور ساتھ ہی ایک زیرزمین مسلح گونو باہنی تشکیل دینے کا فیصلہ کیا۔ پارٹی کی تنظیمیں زیادہ تر ڈھاکہ، راج شاہی، پبنہ، نواکھلی، میمن سنگھ اور فرید پور میں تھیں۔ لہٰذا اس کی حکومت مخالف سرگرمیاں زیادہ تر انہی اضلاع میں ہوتی تھیں۔ اگرچہ بائیں بازو اور ترقی پسند پارٹیوں نے حکومت کے خلاف اہم کردار ادا کیا تاہم وہ ایک دوسرے سے بہت دُور رہیں۔ حتیٰ کہ وہ اکثر ایک دوسرے پر بھی کھلم کھلا تنقید کرتی رہتی تھیں۔

سماوادی دَل، بی سی پی ایل اور بی سی ایل کو سامراجیت کے بارے میں ان کے مؤقف کی بنا پر تنقید کا نشانہ بناتی تھی۔ بی سی پی ایل اور بی سی پی کا کہنا تھا کہ عوامی لیگ حکومت کا انحصار ہندوستان پر ہے۔ سماوادی دَل یہ کہتے ہوئے ان کی نفی کرتی تھی کہ ''یہ کہنا کہ عوامی لیگ کی حکومت کا انحصار ہندوستان پر ہے، غلط ہے۔ حقیقت میں عوامی لیگ کی حکومت ہندوستان حکومت کی کٹھ پتلی ہے۔'' یہ پارٹی سربہارا پارٹی پر اس مہم جوئی کی وجہ سے تنقید کرتی تھی۔ اس کے نزدیک سراج شیکدار نوجوانوں کو غلط راستے پر لے جا رہے تھے۔

جے ایس ڈی کے حوالے سے سماوادی دَل کا یہ نظریہ تھا کہ اس پارٹی کو ہندوستان نے عوامی لیگ سے علیحدہ ہونے والے عناصر کی مدد سے تخلیق کیا ہے جس کا مقصد شیخ مجیب الرحمٰن اور ان کی عوامی لیگ کو قابو میں رکھنا اور اسے ایک متبادل کے طور پر استعمال کرنا تھا۔

اس وقت ''جونو یودھا'' کے نام سے ای پی سی ایم (ایم ایل) کا ایک اخبار شائع کیا جاتا تھا، جس کی ادارت کامریڈ عبدالحق کے پاس تھی۔ کامریڈ طٰہٰ اور کامریڈ شرادیندو دستی دار ای پی سی ایم (ایم ایل) سے علیحدہ ہوئے اور سماوادی دَل تشکیل دیا۔ لیکن کامریڈ عبدالحق نے باقی ماندہ ممبران کے ساتھ جنہوں نے ان کے ساتھ رہنے کا فیصلہ کیا، وہی نام یعنی ای پی سی ایم (ایم ایل) اپنائے رکھا۔ انہوں نے بنگلہ دیش کے قیام کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے 1971ء کی جنگ آزادی کو ہندوستان کی توسیع پسندانہ جنگ قرار دیا۔ انہوں نے توسیع پسندوں کے ہاتھوں سے زیرزمین مسلح جدوجہد کے ذریعے مشرقی پاکستان کو آزاد کرانے کا راستہ اختیار کیا جیسا کہ اس پارٹی نے اپنا نام تبدیل کرنے سے انکار کر دیا۔ مجیب حکومت خاص طور پر ای پی ایم سی (ایم ایل) سے ناراض تھی اور اسے بے رحمی سے کچل دیا۔ اس گروپ کے اکثر عہدے دار اور کارکن جے بی آر اور قانون نافذ کرنے والی دوسری ایجنسیوں اور عوامی لیگ کی دوسری باہنیوں کے ساتھ جھڑپوں میں مارے

گئے۔لیکن عبدالحق کو کوئی نقصان نہ پہنچایا جاسکا اور نہ ہی گرفتار کیا جاسکا۔

پوربا بنگلار کمیونسٹ پارٹی ایم ایل (ای بی سی پی، ایم ایل) اور سماوادی دَل کے آپس میں کوئی نظریاتی اختلافات نہ تھے۔لیکن ای بی سی پی (ایم ایل) موجودہ نظام میں موجود تضادات اور جاگیرداری کی باقیات کو زیادہ اہمیت دیتی تھی۔یہ پارٹی ہندوستان کی دوسری ترقی پسند پارٹیوں خاص طور پر مغربی بنگال کے نکسل بادیوں کے ساتھ مل کر تحریک چلانے کے حق میں تھی۔لیکن باقی تمام انقلابی پارٹیاں نکسل بادی تحریک کو ایک بچکانہ ہڑبونگ یا انتشار خیال کرتی تھیں۔وہ نکسل بادیوں پر اعتماد کرنے کو تیار نہ تھیں۔ای بی سی پی (ایم ایل) خاص طور پر اترائی، راج شاہی، دیناج پور، پبنہ اور کشتیا میں سرگرم تھی۔اپنے اندرونی اختلافات سے قطع نظر تمام ترقی پسند پارٹیاں اس بات پر متفق تھیں کہ آزادی کی تحریک کو 1971ء میں اچانک اختتام پر پہنچادیا گیا تھا اور یہ نامکمل رہ گئی تھی۔وہ یہ بھی خیال کرتی تھیں کہ شیخ مجیب الرحمٰن اور ان کی عوامی لیگ کی حکومت بنگلہ دیش پر ہندروسی بالادستی قائم کرنے کی ذمہ دار ہے اور مجیب حکومت ہندوستان کی کٹھ پتلی حکومت ہے۔اس بات کا ذکر اہمیت کا حامل ہے کہ تمام دائیں بازو کی اور مذہبی پارٹیاں مثلاً مسلم لیگ اور جماعت اسلامی بعض واضح وجوہات کی بنا پر آزادی کے بعد کے دَور میں خوابیدہ اور غیر متحرک تھیں۔اس غیر یقینی صورتِ حال کی وجہ سے جس میں یہ پھنسی ہوئی تھیں ان کے لیے کسی حکومت مخالف تحریک میں حصہ لینا ویسے بھی ممکن نہیں تھا۔تاہم وہ قوم پرست قوتوں کی حمایت کرتی تھیں اور اپنے آپ کو نئے سرے سے منظم کر رہی تھیں۔

مندرجہ بالا بحث سے ایک بات ضرور واضح ہوتی ہے کہ جنگ آزادی اور آزادی کے بعد کے دَور میں بوڑھی قیادت کی نسبت نوجوان قیادت لوگوں کو جدوجہد کے لیے منظم کرنے میں زیادہ مؤثر ثابت ہو رہی تھی۔یہ معاشرے کا نوجوان طبقہ تھا جس نے حکومت مخالف تحریک میں جوش و جذبہ بھر دیا تھا۔جب نوجوان فاشسٹ حکومت کے خلاف موت اور زندگی کو داؤ پر لگائے ہوئے تھا، بزرگ قیادت اپنی فکری اور نظریاتی بحثوں اور ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالنے میں مصروف تھی لہٰذا یہ عوام سے، جن کی امیدیں اس بزرگ قیادت سے دم توڑ چکی تھیں، کٹ چکے تھے۔اس کے علاوہ قیادت کا لالچ، مثالیت پسندی، ایک دوسرے پر بداعتمادی اور شکوک و شبہات کے نتیجے میں عوام میں ان کی حیثیت فالتو ہو کر رہ گئی تھی۔اگرچہ عوام کی اکثریت نے فاشسٹ حکومت کے خلاف جدوجہد کی تھی، ان کی قربانیاں رائیگاں گئی تھیں، جیسا کہ وہ اب بھی متحد نہیں ہو سکے تھے بلکہ مختلف بنیادوں پر اپنے مفادات کے لیے لڑ رہے تھے کیوں کہ سیاسی رہنما انہیں ایک متحدہ قیادت کے تحت منظم کرنے میں ناکام ہو چکے تھے۔

اپنے دیوالیہ پن کی وجہ سے یہ رہنما جدوجہد میں قیادت نہیں سنبھال سکے تھے اگرچہ ان میں سے بہت سے رہنماؤں نے بہت بڑی بڑی ذاتی قربانیاں دی تھیں۔لیکن مجموعی طور پر ان کی غلط کاریاں ان کی کامیابیوں کی نسبت بہت زیادہ تھیں۔یہ آج بھی ایک ثابت شدہ حقیقت ہے۔ہر مرتبہ جب عوام تحریک کو اس کے عروج پر لے کر جاتے تو یہ اپنے غلط اندازوں اور منفی سوچ کی وجہ سے کسی نہ کسی طور پر پیچھے رہ جاتے ہیں یا

تحریک میں رکاوٹ ڈال دیتے تھے، جس کی وجہ سے عوام کبھی بھی اپنے مطلوبہ نتائج حاصل نہ کر سکے۔ تاریخی حقیقت یہ تھی کہ عوام ہمیشہ اپنے قائدین سے آگے چلتے رہے، یہ ایک شرم ناک لیکن تلخ سچائی ہے۔ ہر دَور میں پیوستہ مفادات کی خاطر حقیقت کو بگاڑنے کی منظم کوششیں کی جاتی رہی ہیں۔ لیکن حقیقت میں یہ بگاڑ ہمیشہ بند گلی میں لے کر جاتا ہے۔ موجودہ نسل کو ماضی کے حقائق سے سچائیوں کو تلاش کرنا ہوگا، صرف اس صورت میں ہی وہ مستقبل میں درست راستے پر آگے بڑھ سکتی ہے۔ یہ توقع بھی کی جاتی ہے کہ بزرگ قیادت نوجوان نسل کی قوت محرکہ میں رکاوٹ نہیں ڈالے گی بلکہ وہ اپنے تجربے کی بنا پر سچائیوں کو تلاش کرنے میں ان کی مدد کرے گی۔ اگر یہ بزرگ قیادت اپنی ذمہ داریاں نبھانے میں ناکام رہتی ہے تو پھر انہیں تاریخ کے کوڑے دان میں پھینک دیا جائے گا کیوں کہ وقت کی فطری قوتوں کا راستہ روکنا کبھی بھی سودمند ثابت نہیں ہوسکتا۔ دانش مندی یہی ہوتی ہے کہ وقت کے دھاروں کے ساتھ ہم آہنگ ہوتے ہوئے آگے بڑھا جائے۔

107۔ مجاہدین آزادی کی طرف سے "عوامی بکسال" کی مخالفت

باضمیر مجاہدین آزادی نے بھی عوامی لیگ کے آمرانہ اقتدار کی مخالفت کی۔ پورے ملک میں ہر مجاہد آزادی اس بدنظمی، استبداد، سزاؤں، لوٹ مار اور غارت گری کے خلاف احتجاج کی علامت بن چکا تھا۔ انہوں نے مختلف پلیٹ فارموں سے اپنی جدوجہد جاری رکھی۔ کچھ نے اس مستبد حکومت کے خلاف اپنے علاقوں میں مزاحمتی تحریکیں منظم کیں۔ کچھ نے مختلف سیاسی پارٹیوں میں شمولیت اختیار کرتے ہوئے اس جدوجہد میں حصہ لیا۔ کچھ نے مسلح افواج کے ارکان کی حیثیت سے ہر قسم کی ناانصافی کے خلاف انتظامیہ کے اندر سے مزاحمت کی کوششیں کیں۔

تاہم یہ انفرادی اور بکھری ہوئی کوششیں ثمر بار ثابت نہ ہوسکیں کیوں کہ ایک متحدہ قیادت کے قیام کی کوئی کوشش نہیں کی گئی تھی۔ جنھوں نے سیاسی پارٹیوں میں شمولیت اختیار کر لی انہیں متعلقہ پارٹیوں کے خطوط پر چلنا پڑتا تھا۔ لیکن یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ اگر ملک کی سیاسی قیادت ان مجاہدین آزادی کو منظم کر سکتی اور ان کی حب الوطنی، عوام سے محبت، ذاتی قربانی دینے کے لیے آمادگی، اور مادرِ وطن کی تعمیر نو کی شدید خواہش کو مثبت انداز میں بروئے کار لاسکتی تو بہت سے مسائل جن کا آج قوم کو سامنا ہے وہ ٹل چکے ہوتے۔ اگرچہ آزادی حاصل کرنے کے بعد اقتدار میں موجود لوگوں نے ناجائز مفادات اور مراعات پیش کرتے ہوئے ان مجاہدین آزادی کو خریدنے کی کوششیں کیں، یہ بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ مجاہدین آزادی کی ایک بڑی اکثریت ان تمام قسم کی ترغیبات سے دُور رہی۔ وہ اپنی دیانت داری اور حب الوطنی کو مادی فوائد کے بدلے فروخت کرنے پر تیار نہ تھے۔

آج کے دن تک 1971ء کا وہ جذبہ، وہ خواب اور تمنائیں ہر زندہ مجاہد آزادی کے دل میں پوری آب و تاب کے ساتھ زندہ ہیں۔ وہ اب بھی اپنے وطن کی ترقی کے لیے قیمتی اور منفرد خدمات انجام دے سکتے

ہیں اور لوگوں کو آزادی کی جدوجہد کے لیے منظم کرنے میں ہراول دستے کا کردار ادا کر سکتے ہیں اور ان کے خوابوں کو تعبیر بخش سکتے ہیں۔ مجاہدین آزادی حقیقت میں آج بھی ''سنار بنگلہ'' کے قیام کے لیے ہر قسم کی قربانی دینے کے لیے دل و جان سے تیار ہیں، اور اس طرح قوم کی گم شدہ عزت و توقیر کو بحال کر سکتے ہیں۔

108۔ مجاہدین آزادی کون تھے؟

مجاہدین آزادی کون تھے؟ ان کی عزیز ترین خواہشات کیا تھیں؟ ان کی تقدیر کیا تھی؟ آزاد بنگلہ دیش میں ان کے خلاف سازش کیسے تیار کی گئی؟ ان سوالوں کے جواب دینے کے لیے اور قارئین کے استفادہ کے لیے مجاہدین آزادی کے کردار کے بارے میں تفصیل سے بحث کرنا سود مند ثابت ہوگا۔

اکثر نوجوان جنہوں نے 1971ء میں مجاہدین آزادی کے طور پر اپنے نام درج کروائے، وہ دیہاتی علاقوں کے محنت کش کسانوں کے بیٹے تھے۔ محنت کش طبقے، طلبا، پیشہ ور افراد اور متوسط اور نچلے طبقے کے بیٹوں اور بیٹیوں نے جنگ آزادی میں شمولیت کے لیے اپنے آپ کو پیش کیا۔ وہ اپنی سرزمین کو آزاد کرانے کا تہیہ کیے ہوئے تھے۔ معاشرے کے خوشحال اعلیٰ طبقے سے بھی کچھ لوگ شامل ہوئے تھے۔ ان کے کوئی اور پوشیدہ عزائم نہیں تھے۔ ان سب کا صرف ایک خواب تھا اور وہ مقبوضہ فوج سے ملک کو آزاد کرانے کے بعد استحصال سے پاک اور خوددار بنگلہ دیش کا قیام تھا۔ ان کی بے غرض قربانیوں کے پیچھے حب الوطنی کا گہرا جذبہ کارفرما تھا۔ ان کے عزم اور جرأت نے ہر اس شخص کو ورطہِ حیرت میں ڈبو دیا تھا جس نے انہیں میدان جنگ میں لڑتے ہوئے دیکھا تھا۔ بنگلہ دیش نے ان کی جرأت مندانہ مزاحمت، قربانیوں اور بے غرض خلوص کی وجہ سے آزادی حاصل کی تھی۔ لیکن وہ معاشرہ جس کا مجاہدین آزادی اور عوام نے خواب دیکھا تھا آزادی کے بعد قائم نہ ہو سکا۔ بہرحال اگر عوامی لیگ کی قیادت ان کے بارے میں شکوک وشبہات کا شکار ہونے کی بجائے ان پر اعتماد کرتی اور ان کو موقع فراہم کرتی اور وہ اپنے لامحدود جذبوں، صلاحیتوں اور طاقت کو افرادی قوت میں تبدیل کر لیتے تو قومی تعمیر نو میں بہت اہم کردار ادا کر سکتے تھے۔ بدقسمتی سے یہ نہ ہو سکا۔ عوامی لیگ کی حکومت نے نہ صرف یہ کہ مجاہدین آزادی کو شکوک وشبہات کی نظر سے دیکھا بلکہ انہیں ظلم واستبداد کا نشانہ بنانا شروع کر دیا۔

جیسا کہ ایک فتح مند مسلح جدوجہد کے ذریعے بنگلہ دیش نے اپنی آزادی حاصل کی تھی نئے جذبوں اور تمناؤں کے ساتھ ایک نئی قوم نے جنم لیا تھا۔ لیکن بہت جلد مایوسی کے ایک مکمل احساس نے اسے نگل لیا۔ غربت، مایوسی، ناامیدی، طوائف الملوکی، سمت کی عدم موجودگی، نظریاتی شکست اور سب سے بڑھ کر مجاہدین آزادی کو نظرانداز کرنے اور ان کے ساتھ معاندانہ رویہ رکھنے کے عمل نے جنگ آزادی کی تمام تر امیدوں اور تمناؤں پر پانی پھیر دیا۔ یہ جنگ پوری قوم نے متحد ہو کر اپنے خستہ حال ماضی سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے لڑی تھی، لیکن بدقسمتی سے وہی نفرت زدہ ماضی ایک مرتبہ پھر سامنے آ گیا۔ لوگوں کو اس زندگی

سے جس کی وہ خواہش لیے ہوئے تھے، محروم کر دیا گیا اور ریاستی اقتدار پر دوبارہ غداروں اور استحصالی طبقوں نے قبضہ کر لیا تھا۔

جو شخص آزادی کے لیے لڑتا ہے، اُسے مجاہد آزادی کہا جاتا ہے۔ آزادی کا مطلب صرف جغرافیائی آزادی نہیں ہوتا۔ آزادی کا مطلب ایک ایسے منصفانہ معاشرے کا قیام ہے جہاں ہر فرد برابر کے حقوق اور فرائض، عزت و وقار، امن اور خوش حالی کی زندگی بسر کر سکے۔ ایک انسان کو اس وقت آزاد کہا جاتا ہے جب اسے اپنی خوبیوں، علم اور صلاحیتوں کو اپنا مستقبل خود بنانے کے لیے استعمال کرنے کی مکمل آزادی اور یکساں مواقع حاصل ہوں۔ ایک ایسا معاشرہ جہاں شدید سماجی اور معاشی تفرقات موجود ہوں وہاں کسی بھی فرد کو آزاد نہیں کہا جا سکتا۔ ایک ملک میں جہاں لوگوں کی دو تہائی تعداد غربت کی لکیر سے بھی نیچے زندگیاں بسر کر رہی ہو اور انہیں پیٹ بھر کر دو وقت کا کھانا بھی نصیب نہ ہو تو اس ملک کے رہنما کیسے یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ لوگ آزادی سے بہرہ وَر ہو رہے ہیں اور ان کے خواب پورے ہو چکے ہیں؟ یقیناً یہ مکاری اور قوم کے ساتھ ایک شرم ناک مذاق ہے۔

بہت سے لوگ اب بھی یہ سمجھتے ہیں کہ اگر ہندوستان مداخلت نہ کرتا تو 1971ء میں آزادی حاصل کرنا ممکن نہ تھا۔ میں کہتا ہوں کہ نہ صرف ہندوستان کی فوج بلکہ روس کی سرخ فوج بھی فتح مند نہیں ہو سکتی تھی کیوں کہ فتح یا شکست کا انحصار مکمل طور پر لوگوں کے تعاون اور جنگ کے مقصد پر ہوتا ہے۔ سوائے چند مٹھی بھر لوگوں کے باقی ماندہ پوری قوم نے مجاہدین آزادی اور ان کے مقصد کی مکمل حمایت کی تھی جس کی وجہ سے ملک آزادی حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکا۔ لیکن عوامی لیگ کی حکومت نے ان مجاہدین کو ہی نظر انداز کر دیا۔ حکومت کی جانب سے سب سے پہلا دھاوا جو بولا گیا اس کا شکار مجاہدین آزادی ہی تھے۔ پاکستانی فوج کے ہتھیار ڈالنے کے فوراً بعد مجاہدین آزادی کو غیر مسلح کرنے کا حکم جاری کیا گیا۔ ہتھیار ہندوستانی فوج کے سامنے ڈالے جانے تھے اور جب یہ کر دیا گیا تو ان کے کیمپ بند کر دیئے گئے۔ ہر مجاہد آزادی کو 50 ٹکے دے کر گھروں میں بھیج دیا گیا۔

بعد میں حکومت نے ان کو اسناد جاری کرنے کا فیصلہ کیا اور اعلان کیا گیا کہ صرف ان مجاہدین کو بحال کیا جائے گا جن کے پاس اسناد ہوں گی۔ یہ اسناد سیکٹر یا سب سیکٹر کمانڈروں کے ذریعے تقسیم نہیں کی گئی تھیں بلکہ حکومت نے وزارتِ داخلہ، مقامی ضلعی انتظامیہ اور عوامی لیگ کے ممبران پارلیمنٹ اور رہنماؤں کے ذریعے اپنی پسند کے افراد کو اسناد جاری کرنے کا فیصلہ کیا۔ اکثر ممبران پارلیمنٹ اور رہنماؤں کا مجاہدین آزادی کے ساتھ کوئی براہِ راست تعلق نہ تھا۔ عوامی لیگ نے تمام آزادی مخالف قوتوں کے لیے بھی عام معافی کا اعلان کر دیا۔ اس کے نتیجے میں بہت سے رضا کار، الشمس اور البدر باہر آ گئے اور معاشرے میں سر اٹھا کر چلنے پھرنے لگے، ان میں سے کچھ نے اسناد حاصل کرنے کے بعد اپنے آپ کو مجاہدین آزادی بھی کہنا شروع کر دیا۔ حکومت نے عام معافی کا اعلان اپنی اعلیٰ ظرفی کے ثبوت کے طور پر نہیں کیا تھا بلکہ انہوں نے

یہ کام اپنے طبقاتی مفادات کے تحفظ اور مجاہدین آزادی کے خلاف ان سازشی عناصر کی حمایت حاصل کرنے کے لیے کیا تھا۔

بھرتی کیے گئے مجاہدین آزادی کی کل تعداد 2 لاکھ کے لگ بھگ تھی، لیکن 12 سے 20 لاکھ اسناد تقسیم کی گئیں۔ اس کا مطلب تھا کہ ہر 12 مجاہدین آزادی میں سے گیارہ جعلی تھے۔ یہ عوامی لیگ حکومت کا ایک سوچا سمجھا منصوبہ تھا، جس کا مقصد مجاہدین آزادی کو بدنام کرنا اور ساتھ ہی ساتھ قوم دشمن اور آزادی دشمن عناصر کو بحال کرنا تھا۔ اب بھی وہاں سینکڑوں اور ہزاروں جھوٹے مجاہدین آزادی موجود تھے جو اغوا، لوٹ مار اور ڈکیتیوں جیسی غیر قانونی سرگرمیوں میں مصروف تھے۔ لیکن ان تمام بدفعلیوں کا الزام اصل مجاہدین آزادی پر تھوپ دیا جاتا تھا۔ ان کا تاثر معاشرے میں بُری طرح متاثر ہوا اور لوگوں کے دلوں میں ان کی عزت وتکریم میں کمی آ گئی۔

مجاہدین آزادی کو تو غیر مسلح کر دیا گیا لیکن مجیب باہنی کو ہتھیار ڈالنے کا حکم نہیں دیا گیا، حکومت نے اس مسئلے پر نہ صرف پراسرار خاموشی کا مظاہرہ کیا بلکہ ان عناصر کی سرپرستی کی اور متروکہ جائیدادیں، کاروبار، لائسنس اور پرمٹ بڑی فراخ دلی سے ان لوگوں میں تقسیم کیے گئے۔ وہ ہر قسم کے غیر قانونی دھندوں، لین دین اور سمگلنگ میں حصہ دار بن چکے تھے اور الزام مجاہدین آزادی پر تھوپ دیا جاتا تھا۔ اس شیطانی عمل کے نتیجے میں عوام بڑی تعداد میں مجاہدین آزادی سے بے تعلق ہوتے جا رہے تھے کیوں کہ حقیقی مجاہدین آزادی اور نقلی مجاہدین آزادی میں تمیز کرنا بہت مشکل ہو گیا تھا۔

مجاہدین آزادی کی ایک بڑی تعداد نے آزاد بنگلہ دیش کے لیے اپنی جانوں کے نذرانے پیش کیے تھے اور بہت سے جیلوں میں گل سڑ رہے تھے۔ حتیٰ کہ عام معافی کے بعد آزادی دشمن قوتوں اور ان کے ساتھ شامل سازشی افراد نے انتقام لینے کے لیے مجاہدین آزادی کی پکڑ دھکڑ شروع کر دی۔ ستم ظریفانہ طور پر ان کے ساتھ شامل سازشی ٹولے کے اکثر افراد اپنے اپنے متعلقہ علاقوں کے خوش حال افراد تھے۔ مقامی انتظامیہ اور پولیس پر ان کو بہت زیادہ اختیار حاصل تھا۔ جیسا کہ نئی قائم ہونے والی حکومت نے کوئی انتظامی اصلاحات نافذ نہیں کی تھیں، مقامی حکومتوں کے اختیاراتی ڈھانچے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی اور یوں ان لوگوں کی طاقت اور حیثیت جوں کی توں قائم تھی۔ اکثر ممالک جو اپنی آزادی مسلح جدوجہد کے ذریعے حاصل کرتے ہیں وہاں عام طور پر مجاہدین آزادی تعمیر نو کے دَور میں ہراول دستے کا کردار ادا کرتے ہیں۔ وہاں عوام کے ساتھ شانہ بہ شانہ مجاہدین آزادی پالیسی سازی اور اس کے نفاذ میں بھی شریک ہوتے ہیں۔ مجاہدین آزادی کو عوام اور قومی سرگرمیوں سے دُور رکھنے کی دانستہ کوششیں کی گئی تھیں۔

عزم صمیم اور باضمیری جو قومی آزادی کی تحریک کو آگے بڑھانے کے لیے دو ضروری عناصر ہیں، ان کا متعلقہ لوگوں میں ابتدا سے ہی فقدان پایا جاتا تھا۔ ہم بے خبری میں پکڑے گئے تھے۔ حقیقت میں جنگ قوم پر مسلط کی گئی تھی۔ اس لیے نظریاتی وابستگی، مسلح جدوجہد کے لیے مطلوبہ تیاری، قومی قیادت، جنگی حکمت

عملی کی تشکیل، عوامی سطح پر منصوبہ بندی اور تنظیم سازی جیسے انتہائی اہم عوامل پہلے دن سے موجود نہ تھے۔ اس کے نتیجے میں سب سے بڑے اور اعلیٰ رہنما نے کارروائی کے آغاز پر ہتھیار ڈال دیئے اور دوسرے رہنما عوام کو بے یار و مددگار چھوڑ کر اپنی زندگیاں بچانے کے لیے بھاگ گئے اور ہندوستان میں پناہ لے لی۔ مقامی طور پر لوگوں نے ذاتی دفاع کی خاطر فوری ردِعمل کے طور پر مزاحمت کی ابتدا کی، جسے افراد، مختلف گروہوں یا مسلح افواج کے ممبران نے اپنے طور پر منظم کیا تھا۔ انہوں نے کسی قسم کی منصوبہ بندی نہیں کی تھی۔ تاہم اس میں شک نہیں کہ مزاحمت شروع کرنے والے یہ لوگ جرأت مند، مخلص اور اپنے مقصد سے لگن رکھتے تھے، لیکن مسلح انقلاب کی ابتدا مکمل طور پر غیر متوقع تھی اور لوگ بتدریج اس میں شامل ہوئے۔

عوام کو انتہائی ضروری عمل سے محروم رکھا گیا اور جنگ کو فوری اختتام تک پہنچا دیا گیا۔ شاید عوام جنہوں نے جنگ کے دوران قیادت خود ہی سنبھال لی تھی، انہیں اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ عام لوگوں نے اپنے آپ کو معاشی اور سیاسی استحصال سے بچانے کے لیے عوامی لیگ کی حمایت کی تھی۔ لیکن عوامی لیگ کے لیے خود اپنے طبقاتی مفاد کے خلاف عوام کی خواہشات پر پورا اترنا ناممکن تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جنگ آزادی کی روح کو ایک بے ثمر عمل میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ لیکن وہ لوگ جنہوں نے یہ جنگ لڑی تھی اور اس کی حمایت کی تھی ان کے سامنے ایک واضح مقصد تھا۔ وہ لوگ جو آزادی کے لیے اٹھے تھے، ان کی ایک بڑی اکثریت غیر سیاسی تھی۔ محض حب الوطنی کے جذبے اور اپنے وطن عزیز کو آزاد کرانے کی شدید خواہش تھی جس نے انہیں جنگ میں شامل ہونے یا اس کی حمایت پر اکسایا تھا۔ کچھ لوگوں نے اس میں ذاتی دفاع کے لیے شمولیت اختیار کی تھی۔ دُور دراز کے علاقوں سے بوڑھے اور جوان یکساں طور پر مجاہدین آزادی کے طور پر بھرتی ہونے کے لیے آئے۔ انہوں نے تربیت حاصل کی اور پھر مختلف سیکٹروں میں لڑتے رہے۔ اس کے برعکس عوامی لیگیوں نے ہندوستان حکومت اور فوج کی مدد سے اپنی ذاتی فوج تیار کی اور اسے آزادی کے بعد کے دور میں استعمال کے لیے محفوظ رکھا تا کہ اپنا اقتدار قائم رکھ سکیں۔

زیادہ تر مجاہدین آزادی عوامی حلقوں سے آئے تھے اور کسی قسم کی نام وَری یا برتری کے خواہش مند نہ تھے اور محض قربانیاں پیش کرنے والے ہی تھے۔ اپنی سادگی اور ایثار کی وجہ سے انہوں نے حکومت کے حکم کی تعمیل کی اور اپنے ہتھیار ڈال دیئے۔ انہیں سیاسی شعور حاصل کرنے اور نظریاتی طور پر متحرک ہونے کے لیے مناسب وقت نہیں مل سکا تھا اور ان کی طاقت ایک منظم قوت کی صورت اختیار نہیں کر سکی تھی۔ اس طرح جب یہ مجاہدین آزادی دوبارہ عوامی سمندر میں شامل ہو گئے تو ان کی طاقت بھی ختم ہو گئی۔ لیکن جب حکومت نے ان پر دہشت اور ظلم کا بازار گرم کر دیا، تب جا کر انہیں اپنے آپ کو دوبارہ منظم کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ 13 فروری 1972ء کو ڈھاکہ لیڈیز کلب میں ایک بہت بڑی کانفرنس میں مجاہدین آزادی نے ایک ایسوسی ایشن تشکیل دی جس کا نام ''بنگلہ دیش مکتی یودھا سکسد'' رکھا گیا، اس کے قیام کا مقصد مجاہدین آزادی کو بحال کرنا اور ساتھ ہی ساتھ عوام کی سماجی اور معاشی فلاح و بہبود کو یقینی بنانا تھا۔ 15 ستمبر 1972ء کو ایک قومی

کنونشن کا انعقاد کیا گیا جس میں اس کا آئین اور ایک نیشنل ایگزیکٹو کمیٹی بھی تشکیل دی گئی۔ اس کمیٹی کو عوام دشمن حکومت کی جانب سے سخت چیلنج کا سامنا کرنا پڑا۔ عوامی لیگیوں نے کمیٹی کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرنے کی اپنی سی پوری کوششیں کیں، انہوں نے مجاہدین آزادی کو مختلف ترغیبات اور تحریصات کے ذریعے پھانسنے کی کوشش کی اور کمیٹی کے کچھ ارکان حقیقت میں ان کے جال میں پھنس بھی گئے۔ ان کے ذریعے حکومت نے سنگ سد میں اپنا اثر ورسوخ قائم کرنے کی کوشش کی۔ اس کے مطابق 28 فروری 1975ء کو ان غداروں نے حکومتی تحفظ کے تحت آئین سے انحراف کرتے ہوئے ایک متوازی نیشنل ایگزیکٹو کمیٹی تشکیل دی۔ اس غیر قانونی کمیٹی نے بعد میں یہ اعلان کیا کہ مکتی یودھا سنگ سد نے بکسال میں شمولیت کا فیصلہ کرلیا ہے۔

اس شرم ناک غیر آئینی قدم کے خلاف نعیم جہانگیر، محفوظ الرحمٰن اور مکتی یودھا کے چند دیگر ارکان نے ایک جرأت مندانہ قدم اٹھایا اور مارچ 1975ء کو ڈھاکہ منصف کورٹ میں ایک مقدمہ درج کروا دیا۔ عدالت نے قیادت پر زبردستی قبضہ کرنے والوں کے خلاف ایک حکم امتناعی جاری کر کے ان کی غیر جمہوری اور غیر آئینی سرگرمیوں کو روک دیا۔ لیکن بکسال کے غیظ وغضب کے خوف سے عدالت نے فیصلہ دینے سے اجتناب کرتے ہوئے اسے التوا میں ڈال دیا۔

15 اگست 1975ء کی تاریخی انقلابی تبدیلی کے بعد مکتی یودھا سنگ سد کے اس وقت کے وائس چیئرمین مظفر الرحمٰن سنگ سد اور مجاہدین آزادی کی جانب سے اس تاریخی تبدیلی کی مکمل حمایت میں آگے آئے۔ اگست کے انقلاب کی قیادت کی مدد سے انہوں نے مکتی یودھا سنگ سد کو دوبارہ متحرک کرنے کے لیے تازہ اقدامات اٹھائے۔ ستمبر کے مہینے میں عدالت نے نعیم جہانگیر، مظفر الرحمٰن اور دیگر افراد کے حق میں اپنا التوا شدہ فیصلہ جاری کر دیا۔ قیادت پر ناجائز قابض افراد کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ 4 اکتوبر کو مصنف کی موجودگی میں سابقہ قانونی نیشنل ایگزیکٹو کمیٹی کا بھرپور اجلاس ہوا۔ نعیم جہانگیر، ایک مشہور مجاہد آزادی اور نیشنل ایگزیکٹو کمیٹی کے ممبر نے ''بنگلہ دیش مکتی یودھا سنگ سد سنگ سنگ سد کھپتا اتھاس'' کے نام سے مندرجہ ذیل دستاویز تحریر کی۔

15 اگست کو مسلح افواج نے فاشسٹ حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ اُس وقت کے وائس چیئرمین اور کنوینر مظفر الرحمٰن نے مجاہدین آزادی کی جانب سے اُس تبدیلی کو خوش آمدید کہا اور مسلح افواج کو اپنا پر خلوص تعاون پیش کیا۔ ہم نے سنگ سد کو دوبارہ منظم کرنے کا آغاز کیا۔ عدالت نے ہمارے حق میں متفقہ فیصلہ دیا۔ غاصبوں پر اُن جمہوری اقدار کی خلاف ورزی کا الزام عائد کیا جن کی ضمانت ہمارا آئین دیتا ہے۔ سنگ سد کے لیے 15 اگست 1975ء کی تاریخی انقلابی تبدیلی کے بعد جرأت مندانہ فیصلے کرنا اور اقدامات اٹھانا ناگزیر ہو چکا تھا۔ اس کو مدنظر رکھتے ہوئے 4 اکتوبر 1975 کو سابقہ قانونی نیشنل ایگزیکٹو کمیٹی کا اجلاس طلب کیا گیا تھا۔

اس کے بعد اجلاس میں گزشتہ ڈیڑھ سال کی غیر قانونی سرگرمیوں پر بحث کی گئی اور تمام حاضرین نے متفقہ طور پر غیر قانونی کمیٹی کے 120 ممبران کی بنیادی ممبر شپ منسوخ کرنے کا فیصلہ دیا اور اس کے خلاف

عدم اعتماد کا ووٹ دیا گیا۔ اسی اجلاس میں سنگ سد کے معاملات کو چلانے کے لیے آئین کے مطابق 11 ممبران پر مشتمل ایک ایڈہاک نیشنل ایگزیکٹو کمیٹی تشکیل دینے کا فیصلہ بھی کیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی مکتی یودھا سنگ سد کے نظریات اور مقاصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایک لائحہ عمل تیار کیا گیا، جو ذیل میں دیا گیا ہے:

لائحہ عمل:

1۔ حقیقی اور اصل مجاہدین آزادی کی ایک فہرست تیار کرنا اور اسے حکومتی گزٹ میں شائع کرنا

2۔ زخمی ہونے والے مجاہدین آزادی کی فہرست تیار کرنا اور ان کے علاج کے لیے ضروری انتظامات کرنا

3۔ 1971ء کی جنگ آزادی میں شہید ہونے والے حقیقی مجاہدین آزادی کی فہرست تیار کرنا

4۔ ان مجاہدین آزادی کی فہرست تیار کرنا جنہیں بغیر کسی سماعت کے جیلوں میں قید کیا گیا ہے اور جن کے خلاف گرفتاری کے وارنٹ جاری کیے گئے ہیں اور تصدیق حاصل کرنے کے بعد ان کی رہائی یا وارنٹ گرفتاری کی منسوخی کے لیے جیسا بھی معاملہ ہو مناسب کارروائی کرنا

5۔ خصوصی طور پر معذور مجاہدین آزادی اور عمومی طور پر بے روزگار مجاہدین آزادی کی بحالی کے انتظامات کرنا

6۔ دلیر اور جرأت مند مجاہدین آزادی کے لیے اعزازی تمغہ جات کا انتظام کرنا تا کہ انہیں دھرتی کے انمول سپوت قرار دیا جائے

7۔ اس بات کی یقین دہانی کرنا کہ جدوجہد آزادی کی تمام یادگاریں، دستاویزات اور مجاہدین آزادی کی فہرست نیشنل میوزیم میں محفوظ کی گئی ہیں۔

فتح علی چوہدری ایک مشہور مجاہد آزادی نے اپنے مضمون ''مکتی یودھا پر شانگ'' میں لکھا:

''جنگ کے نو ماہ بعد جب ایک مجاہد آزادی نے اپنے اردگرد نظر دوڑائی تو اسے اپنی امیدوں کے مطابق کچھ بھی نظر نہ آیا۔ ہر کوئی اپنے مفاد کے لیے مصروف کار تھا۔ اپنے آپ کو محب وطن ثابت کرنے کا ایک ناخوشگوار مقابلہ جاری تھا جب کہ مجاہدین آزادی کے لیے صورت حال کو بہت خراب کیا جا رہا تھا، انہیں سب سے پہلا حکم ہتھیار ڈالنے کا دیا گیا۔ وہ جو ہتھیار نہیں ڈالیں گے، ملک کے دشمن ہوں گے۔ غیر ملکی فوجی ابھی تک بنگلہ دیش کی سرزمین پر موجود تھے اور وہ ہتھیار ڈالنے کے عمل کی نگرانی کرتے تھے۔ غیر ملکی موٹر گاڑیوں کی قطاریں اپنے اتحادیوں کی مدد سے قومی دولت لوٹ کر لے جا رہی تھیں۔ کچھ محب وطن مجاہدین آزادی نے ڈھاکہ نارائن گنج روڈ پر موٹر گاڑیوں کے ایسے قافلوں پر حملے بھی کیے۔ اس قسم کی مزاحمتی مہمات دوسرے علاقوں میں بھی شروع ہو گئیں، لیکن حکومت نے اس قسم کی کارروائیوں کو اشتعال انگیز قرار دے دیا۔ دھرتی کے دلیر اور جرأت مند سپوتوں کو غیر مسلح کر کے وہ جو کچھ لے جا سکتے تھے لے گئے اور کچھ نجی باہنیاں پیچھے چھوڑ گئے جن کو ان غیر ملکیوں نے ہی منظم کیا تھا۔ یہ باہنیاں اسلحہ اٹھا کر کھلم کھلا گھوم پھر رہی تھیں۔ یہ لوٹ مار اور اغوا وغیرہ میں مصروف تھیں لیکن کسی کو کچھ کہنے کی جرأت نہ تھی۔ وہ خواتین کی عصمت دریاں کرنے کے بعد بلاخطر

نکل جاتے تھے۔حتیٰ کہ وہ بینک ڈکیتیوں کے بعد بھی آسانی سے فرار ہو جاتے تھے۔

مجاہدین آزادی کے لیے ملازمتوں میں 30 فیصد کوٹا مخصوص کر کے ان کو تنہا کرنے کی سازشیں کی جارہی تھیں۔اسی طرح مسلح افواج اور سول ملازمین کو دو سال کی اضافی ترقیاں دے دی گئی تھیں جس کا اصل مقصد انتظامیہ کے درمیان اختلافات پیدا کر کے تفرقہ ڈالو اور حکومت کرو کی پالیسی کی راہ ہموار کرنا تھا۔جنگ کے بعد سازشیوں نے حکمران جماعت میں شمولیت اختیار کر لی لیکن بہت سے مجاہدین آزادی آج بھی پناہ گزینوں جیسی زندگی بسر کر رہے ہیں یا سلاخوں کے پیچھے پڑے ہیں۔''

15 اگست 1975ء کے بارے میں فتح علی چوہدری نے لکھا:

''ملک میں سیاسی منظر نامہ تبدیل ہو گیا ہے۔عوام حبس کی حالت سے آزاد ہو گئے ہیں۔لیکن سازش اب بھی جاری ہے۔ہماری سرحدی چوکیوں پر بیرونی فوجیں بار بار حملے کر رہی ہیں۔ملک کے اندر مسلح مداخلت کی جارہی ہے۔وہ تخریب کاری کی کارروائیوں میں مصروف ہیں۔ہمارے دلیر سپاہی دشمن افواج کی ہر کوشش کو ناکام بنا رہے ہیں۔قربانی اور حب الوطنی کے جذبے سے سرشار وہ بڑی جرأت کے ساتھ مادرِ وطن کی آزادی اور خود مختاری کے تحفظ کے لیے اپنے فرائض ادا کر رہے ہیں۔1971ء کے محبِ وطن مجاہدین آزادی کو اس نازک موڑ پر بڑے ذمہ دارانہ انداز میں عمل کرنا ہوگا۔ساڑھے تین سال کی محرومیوں، استحصال اور مایوسی کے دنوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دفن کرنے کے لیے قومی اتحاد اور قومی مزاحمت کو تشکیل دینا ناگزیر ہے۔ہمیں سماجی انصاف کے قیام کے بے حد جدوجہد کرنی ہوگی۔''

تاہم اس وقت موجودہ سماجی اور معاشی ڈھانچے کے تحت عوام کی بہتری کے لیے کوئی کام کرنا ممکن تھا اور نہ ہی مجاہدین آزادی کے خوابوں کو حقیقت کا روپ دینا ممکن تھا۔استحصال کرنے والوں اور استحصال کا شکار ہونے والوں کے درمیان خلیج بڑھتی چلی جارہی تھی۔گنتی کے چند لوگ قومی دولت کا ایک بہت بڑا حصہ ہڑپ کر رہے تھے۔دوسری جانب عوام کی ایک بہت بڑی تعداد غربت میں پس رہی تھی اور سخت تکلیف دہ زندگی بسر کر رہی تھی۔ان حالات میں مجاہدین آزادی کی ضرورت تھی کہ وہ منظم ہو کر عوام اور اُن کے حقوق کے لیے اسی انداز میں لڑیں جیسا کہ انہوں نے 1971ء میں سیاسی مقاصد کے لیے ہتھیار اٹھائے تھے۔

اس ملک کو ایک سیاسی جدوجہد نے جنم دیا تھا۔پیدائش سے لے کر موت تک زندگی بسر کرنے، معاشرتی حقوق، روزگار اور معاشی آزادی کے حصول کے لیے جدوجہد، اور افراد کا اپنی ذات، اپنے خاندان اور معاشرے کے حوالے سے ذمہ داری کا شعور سب مل کر سیاست کو جنم دیتے ہیں۔اس طرح پیدا ہونے کے فوراً بعد ہر شخص سیاسی بن جاتا ہے۔پنگھوڑے سے لے کر قبر تک اپنے آپ کو غیر سیاسی تصور کرنا محض اپنی ذات سے دھوکا کے سوا کچھ نہیں۔انسان ایک معاشرتی جانور ہے اور وہ اُس معاشرے سے لاتعلق نہیں رہ سکتا جس میں وہ رہ رہا ہو۔سیاست دراصل معاشرتی مسائل کے حل کا نام ہے، لہٰذا کوئی بھی شخص سیاست میں ملوث ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔محبِ وطن مجاہدین آزادی کو عوام کے دوستوں اور دشمنوں کو شناخت کرنا ہوگا۔

محروم اکثریت کے ساتھ ایک وجود کی مانند متحد ہوتے ہوئے اپنے عزیز ترین خوابوں کی تکمیل کے لیے انہیں معاشرے کو تبدیل کرنے کی جدوجہد کرنی ہوگی۔ 1971ء کی طرح عوام ایک مرتبہ پھر یقیناً فتح یاب ہوں گے۔ مجاہدین آزادی ہراول دستے کا کردار ادا کرتے ہوئے اس فتح کو قریب لا سکتے ہیں۔ شیخ مجیب الرحمٰن نے مجاہدین آزادی کو نظر انداز کرتے ہوئے نہ صرف قوم کو مخلص اور اپنے مقصد سے لگن رکھنے والی افرادی قوت سے محروم رکھا بلکہ محب وطن افراد کے تربیت یافتہ گروہ کی تضحیک کرتے ہوئے اپنے آپ کو بھی ناقابل تلافی نقصان پہنچایا۔

109۔ بنگلہ دیش کی مسلح افواج کے کردار نے انہیں عوام کا فطری اتحادی بنا دیا

آزادی کے بعد کے دَور میں جب قوم نے عوامی لیگ اور شیخ مجیب الرحمٰن کی ہندوستان نواز پالیسی، پچیس سالہ معاہدے، بے قابو رشوت ستانی، کھلم کھلا سمگلنگ، راکھی باہنی اور نجی باہنیوں کی تشکیل کے خلاف آواز بلند کی، اور جب سوشلزم کے نعرے کے باوجود زندگی اور جائیدادوں کا عدم تحفظ اور بگڑتی ہوئی امن وامان کی صورت حال ہر جگہ چھائی ہوئی تھی تو مسلح افواج کے محبِ وطن حصے نے حکومت کے ہاتھوں میں استحصالی ہتھیار نہ بننے فیصلہ کیا اور انصاف کے حصول کے لیے عوامی جدوجہد کا ساتھ دیا۔ ایسا کیوں تھا؟ اس سوال کا جواب حاصل کرنے کے لیے بنگلہ دیش کی مسلح افواج اور تیسری دنیا کے ممالک کی دوسری روایتی افواج کے کردار میں پائے جانے والے فرق کا تنقیدی تجزیہ کرنا ہوگا۔

تاریخ کے ایک دَور میں ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے بیشتر ممالک پر نوآبادیاتی قوتوں کا قبضہ تھا۔ اپنے نوآبادیاتی مفادات کے تحفظ کے لیے انہوں نے مقامی استحصالی طبقات کے ارکان کو اپنے ساتھ ملا کر اپنے اقتدار کو قائم رکھنے کے لیے بیوروکریسی اور مسلح افواج جیسے مضبوط ادارے قائم کیے۔ بعد میں تہذیب وتمدن کے نام پر ان اداروں کے ارکان اور ان کی نسلوں کو اپنی غیر ملکی اقدار، تہذیب اور فلسفے میں رنگ دیا۔ بتدریج عوام میں ان غیر ملکی حکمرانوں کے خلاف ایک نفرت نے جنم لینا شروع کیا۔ اب انہیں اس بات کی سمجھ آ گئی تھی کہ جب تک وہ اپنے آپ کو ان کے چنگل سے آزاد نہیں کروا لیتے، ان کے مصائب ختم اور بہتر زندگی کے خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکتے۔ اس خیال نے قومی آزادی کی تحریکوں کو جنم دیا۔

پھر جب ایک وقت میں ان کے لیے براہ راست اقتدار جمائے رکھنا ممکن نہ رہا تو ان نوآبادتی آقاؤں نے نکل جانے کا فیصلہ کیا اور بڑی ہوشیاری کے ساتھ اقتدار اپنے ان کاسہ لیسوں کے سپرد کر دیا جو انہوں نے مقامی استحصالی طبقات میں سے تیار کر رکھے تھے تاکہ اپنا بالواسطہ استحصال قائم رکھ سکیں۔ اس طرح محکوم اقوام نے اپنی آزادی تو حاصل کر لی لیکن اقتدار ان کے سابقہ حکمرانوں کے کاسہ لیسوں کے ہاتھوں میں آ گیا۔ جب یہ مقامی دلال اور کاسہ لیس اپنے سابقہ آقاؤں کی جگہ براجمان ہو گئے تو انہوں نے انہی پرانے طریقوں کے مطابق اسی قسم کا استحصال قائم رکھا۔ انہوں نے نوآبادتی ریاستی نظام کو جوں کا توں قائم رکھا اور

جب بھی ضرورت محسوس کی اپنے طبقاتی مفادات کو بچانے کے لیے پولیس، مسلح افواج اور بیوروکریسی کو عوام کے خلاف استعمال کیا۔ لہٰذا عوام کی قسمت آزادی کے بعد بھی تبدیل نہ ہوسکی۔

لیکن بنگلہ دیش کی مسلح افواج کی تاریخ کسی بھی دوسری روایتی مسلح افواج سے مکمل طور پر مختلف ہے۔ اس کا ایک اپنا منفرد پس منظر ہے۔ اس حقیقت کے باوجود کہ مشرقی بنگال کے عوام نے تحریک پاکستان میں ایک اہم کردار ادا کیا تھا، ریاستی قوت مغربی پاکستان کی اشرافیہ کے ہاتھوں میں چلی گئی، جنہوں نے مشرقی پاکستان کو نیم نوآبادیاتی استحصال کا نشانہ بنایا اور مشرقی پاکستان کے عوام کے خلاف وہی قدیم اور بے رحمانہ نوآبادیاتی ریاستی ہتھیار استعمال کیے۔ جس کے نتیجے میں لوگوں کے دلوں میں نفرت پیدا ہوگئی اور خودمختاری کی تحریک نے جنم لیا۔ حتیٰ کہ مشرقی پاکستان کی انتظامیہ اور مسلح افواج کے ارکان کو بھی امتیاز اور ناروا سلوک کا نشانہ بنایا جاتا تھا۔

مشرقی پاکستان کی خودمختاری کی تحریک آخر کار 1971ء کی جنگ آزادی میں تبدیل ہوگئی۔ پاکستانی فوج کی طرف سے سخت کارروائی کے بعد مشرقی پاکستان کے سیاسی رہنما نے عوام کو چھوڑ دیا اور بھاگ گئے۔ اس نازک موڑ پر روایتی نوآبادیاتی طرز کی پاک فوج کے ایک غیر معروف میجر نے جو قومیت اور حب الوطنی کے جذبے سے سرشار تھا، استحصال زدہ بنگالیوں کو آزادی کے حصول کے لیے متحد ہونے کا پیغام دیا۔ اس کی اس آواز پر مسلح افواج، پولیس، ای پی آر، انصار، مجاہد کور کے بنگالی ارکان، طلبا، کارکنوں، کسانوں، پیشہ ور افراد، نوجوانوں اور بیوروکریٹس سب نے متحدہ طور پر لبیک کہا اور جو بھی وسائل میسر تھے ان کی مدد سے مزاحمت کی تحریک کو منظم کرنے میں مصروف ہوگئے۔ اس طرح جنگ آزادی کا آغاز ہوا۔ جنگ لڑنے والے عناصر اور عوام کی خواہشات اور تمنائیں یکساں تھیں۔ آنے والے نو مہینوں میں جنگجو عوام کے ساتھ شانہ بہ شانہ لڑتے رہے۔ اس طرح تمام طبقاتی اختلافات اور حد بندیاں خود بخود ختم ہوگئیں اور مجاہدین آزادی کے طور پر شناخت کا ایک مشترکہ بندھن وجود میں آ گیا۔

جب بنگالی قوم جنگ میں مصروف تھی، عوامی لیگی اس جہد و جہد کے واحد رہنما ہونے کا دعویٰ کرتے ہوئے جلاوطنی میں اپنی حکومت قائم کرنے کے لیے ہندوستان کی مدد تلاش کر رہے تھے۔ ان کا واحد مقصد ملک پر قبضہ حاصل کرنا تھا اور اقتدار حاصل کرنے کے لالچ میں وہ ہندوستانی حکومت کے ہاتھوں میں ان کے چیلے بن چکے تھے۔ دوسری جانب مجاہدین آزادی چاہتے تھے کہ ایک لمبی جنگ کے بعد ایک فطری اور آزمودہ قیادت ابھر کر سامنے آئے جو لوگوں کو نظریاتی تحریک مہیا کرے اور جدوجہد کو کامیابی کی طرف لے کر جائے۔ ایسی قیادت کے بارے میں خیال کیا جاتا تھا کہ وہ عمومی سطح پر مقبول ہوگی اور آزادی کے بعد کے دَور میں عوام کو ان کے خوابوں اور خواہشات کی تکمیل کی جانب رہنمائی مہیا کرے گی۔ اگرچہ عوامی لیگ جنگ آزادی کی واحد نمائندہ ہونے کی دعوے دار تھی تاہم مجاہدین آزادی اور جلاوطن حکومت کے درمیان اختلاف رائے موجود تھا۔ عوامی لیگ ہر قیمت پر بنگلہ دیش پر اپنی قیادت مسلط کرنا چاہتی تھی جب کہ مجاہدین آزادی اور

عوام ایک حقیقی نمائندہ، آزاد اور خودمختار بنگلہ دیش اور انصاف اور مساوات پر مبنی معاشرہ چاہتے تھے۔ لہٰذا جنگ کے دنوں سے ہی موقع پرست عوامی لیگ اور عوام دوست مجاہدین آزادی کے درمیان پالیسیوں پر شدید اختلافات پیدا ہو چکے تھے۔ اس اختلافِ رائے نے عوامی لیگ حکومت اور جرأت مند محبِ وطن مجاہدین آزادی کے درمیان بداعتمادی اور مخالفت کو مزید ہوا دے کر آخری حد تک پہنچا دیا تھا۔

ان اختلافات کا ذکر کرتے ہوئے میجر (ریٹائرڈ) رفیق الاسلام نے اپنی کتاب "بنگلہ دیش شمارک شاشن گناتنتر شنکٹ" میں لکھا:

"میں اس بات سے انکار نہیں کرسکتا کہ جنگ آزادی کے دوران تسلیم شدہ سیاسی رہنما اپنی ذمہ داریاں نبھانے میں ناکام رہے۔ ان کی جانب سے عوام کی نظریاتی تربیت کی کوئی کوشش کی گئی اور نہ ہی کسی قسم کا جذبہ یا عزم پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ حتیٰ کہ لوگوں سے استحصال سے پاک معاشرہ قائم کرنے کا بھی کوئی وعدہ نہ کیا گیا۔ لہٰذا جنگ آزادی کی اصل روح کے خاتمے کو ایک تاریخی حقیقت کے طور پر تسلیم کیا جا رہا ہے۔"

وہ مزید لکھتے ہیں، "عوامی لیگ کی حکومت طویل جنگ کے بارے میں پریشانی کا شکار تھی۔ ان کا خیال تھا کہ اگر جنگ طول پکڑ گئی تو ترقی پسند مجاہدین آزادی کی نئی قیادت ابھر کر سامنے آسکتی ہے اور اگر ایسا ہو جاتا ہے تو وہ عوامی تائید کی مدد سے بنگلہ دیش میں ان کے اقتدار کو چیلنج کر سکتی ہے۔ یہ بات ذہن میں رکھتے ہوئے وہ عوام دوست قومی فوج تیار کرنے سے گریزاں تھے اور اس کی بجائے جنگ کے دوران انہوں نے نوآبادیاتی طرز کی روایتی افواج تیار کرنے کے لیے اقدامات اٹھائے۔"

انہوں نے مجاہدین آزادی کی تنظیم سازی میں بھی بہت سی رکاوٹیں کھڑی کرنے کی کوششیں کیں۔ یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ قیادت قومی جنگ آزادی سے مطابقت نہیں رکھتی تھی۔

وقت سے پہلے ہندوستانی فوج کی مداخلت کے نتیجے میں مجاہدین آزادی حسب منشا پوری طرح منظم نہیں ہو سکے تھے۔ لہٰذا ریاستی اقتدار قدرتی طور پر عوام کی بجائے، جو حقیقت میں لڑ رہے تھے، جلاوطن حکومت کے ہاتھوں میں چلا گیا۔ جنگ کو فوراً اختتام تک پہنچا دیا گیا اور نوآبادیاتی ریاستی نظام جوں کا توں قائم رکھا گیا۔ مسلح افواج کے ارکان جنہوں نے اس قسم کے روایتی نوآبادیاتی نظام سے بغاوت کرتے ہوئے جنگ آزادی میں شمولیت اختیار کی تھی، انہیں عوام سے کاٹ دیا گیا اور ایک مرتبہ پھر زبردستی ایسا نظام مسلط کر دیا گیا جو سابقہ قدیم نوآبادیاتی روایات، قوانین اور ضابطوں کی بنیاد پر قائم کیا گیا تھا۔ اگرچہ حکمران مسلح افواج کے ارکان کو بیرکوں میں بند رکھنا چاہتے تھے لیکن حقیقت میں وہ کسی نہ کسی طرح ملک کے سیاسی عمل میں شریک رہے۔ اگرچہ ان کی اس قسم کی شرکت ظاہر نہ ہو سکی۔

یہ بھی تاریخ کا حصہ ہے کہ جب عوامی لیگ کی حکومت نے پاکستانی حکمرانوں کی جگہ حاصل کر لی تو انہوں نے اس نئے آزاد ملک کو سابقہ تنظیمی خطوط پر چلانے کی کوشش کی اور ایک تباہ کن نتیجے کا سامنا کیا۔ عوامی بکسال کی فاشسٹ حکومت نے مسلح افواج کے ارکان میں شدید نفرت اور غصے کو جنم دیا جو جنگ آزادی کے

جذبے سے سرشار تھے۔ نوآبادیاتی سوچ اور نظریات اب مکمل طور پر فرسودہ ہو چکے تھے۔ مسلح افواج کو قومی سیاست سے مکمل طور پر لاتعلق رکھنا ایک احمقانہ خیال تھا۔ انہیں بیرکوں کی تنہائی میں رکھنا ممکن نہ تھا۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ آج کی دنیا میں کہیں بھی مسلح افواج کو غیر سیاسی خیال نہیں کیا جاتا اور خاص طور پر اس فوج کو جس نے قومی آزادی کی جنگ میں حصہ لیا ہو عوام سے دُور رکھنا کسی طور پر بھی ممکن نہیں ہوتا کیوں کہ اس قسم کی فوج کے ارکان مجاہدین آزادی سے لیے گئے ہوتے ہیں اور وہ معاشرے کے ہر طبقے کی مجموعی نمائندگی کر رہے ہوتے ہیں۔

لیکن مجاہدین آزادی پر اپنے عدم اعتماد کی وجہ سے جلاوطن عوامی لیگ حکومت نے ہندوستانی حکومت، فوج اور انٹیلی جینس ایجنسیوں کی مدد سے اپنی سیاسی فوج قائم کی تھی۔ اس بارے میں ابتدائی ابواب میں تفصیلی بحث کی گئی ہے۔

110۔ قومی دفاعی افواج اور بیوروکریسی کا قیام آسان کام نہ تھا

ہندوستانی فوج کے جانے کے بعد حکومت سے دفاعی افواج کے قیام اور قومی دفاعی نظام تشکیل دینے کا مطالبہ کیا گیا۔ اس مطالبے کے خلاف حکومت کی جانب سے ایک پُر زور پروپیگنڈا کیا جا رہا تھا کہ ''بنگلہ دیش جیسے غریب اور امن پسند ملک کے لیے مکمل پیمانے پر دفاعی افواج کے قیام کی کیا ضرورت ہے؟ بنگلہ دیش تین اطراف سے ہندوستان کے ساتھ گھرا ہوا ہے اور اس کے ساتھ اس کا ''دوستی کا معاہدہ'' ہے۔ اس صورتِ حال میں ہندوستان کس کے خلاف لڑے گا؟ اور اگر ہماری آزادی اور خودمختاری کو کسی جانب سے کوئی خطرہ درپیش ہوا تو اس معاہدے کے تحت ہندوستان، ہمیں ضروری تحفظ مہیا کر دے گا۔

یہ کس قدر بے ہودہ دلیل تھی، بین الاقوامی تعلقات میں کوئی مستقل دوست یا دشمن نہیں ہو سکتا۔ مزید برآں مسلح افواج قومی آزادی اور ریاست کی خودمختاری کی علامت ہوتی ہیں۔ لہٰذا حاصل شدہ وسائل کو بروئے کار لاتے ہوئے مرحلہ وار قومی دفاعی افواج کا قیام ناگزیر تھا۔ ایک لمبی کھینچا تانی کے بعد حکومت اس بات پر قائل ہوئی۔ مجاہدین آزادی کے ارکان سے ڈھاکہ، کومیلا، چٹاگانگ، رنگ پور اور جیسور میں پانچ انفنٹری بریگیڈز قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ ان بریگیڈوں کو بتدریج ڈویژنوں میں تبدیل کیا جانا تھا۔ اس کے ساتھ ایئر فورس اور نیوی کو بھی منظم کیا جانا تھا۔

اس موڑ پر سوال اٹھایا گیا کہ پاکستان میں پھنسے ہوئے 30,000 بنگلہ دیشی فوجیوں کا کیا کیا جائے؟ اگرچہ انہیں جنگ آزادی میں حصہ لینے کا موقع نہیں مل سکا تھا لیکن ان میں سے اکثریت محبِ وطن اور بنگلہ دیش کے قیام کے حامیوں کی تھی۔ بنگلہ دیش کے ساتھ ان کی وفاداری میں کسی شک وشبے کی گنجائش نہ تھی۔ لہٰذا اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ انہیں عزت ووقار کے ساتھ نئی قائم ہونے والی دفاعی افواج میں دوبارہ رکھ لیا جائے۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ بنگلہ دیش کی دفاعی افواج صرف مجاہدین آزادی پر مشتمل ہونا

چاہئیں۔ واپس آنے والے افراد کو دفاعی ملازمتوں کے قوانین اور ضابطوں کے مطابق خدمات سے سبکدوش کر دیا جائے اور انہیں غیر فوجی سول اداروں میں ملازم رکھ لیا جائے۔ حکومت نے ان افراد کو فوج میں اپنے عہدوں پر بحال کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کے ساتھ حکومت نے ان کو دو سال کی سنیارٹی دینے کا فیصلہ کیا، اس طرح عوامی لیگ حکومت نے مسلح افواج کے اندر ایک واضح تفریق کو جنم دیا۔ چند پر جوش اور ذاتی مفاد کے حامل مجاہدین آزادی نے حکومت کی اس پالیسی کی حمایت کی۔ شیخ مجیب الرحمٰن حکومت کی اس ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' پالیسی کی مسلح افواج کو بھاری قیمت ادا کرنی پڑی۔ ملک ابھی اس شیطانی فیصلے کے اثرات سے گزر رہا تھا۔ بریگیڈیئر ضیا الرحمٰن کو ایک طرف ہٹاتے ہوئے بریگیڈیئر شفیع اللہ کو چیف آف آرمی سٹاف مقرر کرنے کے حکومتی فیصلے نے بنگلہ دیش فوج کے نچلے طبقے میں شکر رنجی کو جنم دیا۔ اس طرح ایسے بہت سے اختلافات پیدا کرتے ہوئے شیخ مجیب الرحمٰن نے قوم کی ریڑھ کی ہڈی مسلح افواج کو کمزور کرنے کی کوشش کیں۔

شیخ مجیب الرحمٰن نے مجاہدین آزادی کے بعض ارکان اور سابقہ بی ایل ایف اور مجیب باہنی کے اشتراک سے اپنی متوازی سیاسی فوج جاتیو رراکھی باہنی بھی قائم کر دی۔ اگرچہ آخر کار حکومت نے مسلح افواج کے قیام کی اجازت دے دی تھی لیکن انہیں ضروری ساز و سامان سے لیس کرنے میں حکومت کی جانب سے کوئی دلچسپی ظاہر نہیں کی گئی تھی۔ اس کے برعکس ہندوستان کی مدد سے راکھی باہنی کو فوج سے بہت زیادہ طاقت ور بنانے کے لیے ایک جامع منصوبہ تیار کیا گیا۔ ہندوستانی فوج نے جے آر بی کو مسلح کرنے اور تربیت دینے کی ذمہ داریاں اٹھالیں۔ ان کا یونیفارم بالکل ہندوستانی فوج جیسا تھا۔ ہندوستان نے اسے تمام اسلحہ، گاڑیاں، ساز و سامان، راشن اور دوسری تمام ضروری اشیاء مہیا کیں۔ آفیسرز کو ڈیرہ دون میں تربیت دی گئی اور سپاہیوں کو ڈھاکہ کے مضافات ساور میں ہندوستانی انسٹرکٹروں نے تربیت دی۔ اسے براہِ راست وزیر اعظم طفیل احمد کے تحت رکھا گیا اور اس کی مجموعی نگرانی اس کے پولیٹیکل سیکریٹری کے پاس تھی۔ ڈائریکٹر جنرل بریگیڈیئر نور الزمان تھے جو اگرتلہ سازش کیس کے ایک ملزم تھے۔ یہ باہنی بہت جلد اپنی وحشیانہ کارروائیوں اور عوام پر بے رحمانہ استبداد کی وجہ سے بدنام ہو گئی۔

جے آر بی حکومت کی نامقبولیت کی ایک اہم وجہ تھی۔ چوں کہ شیخ مجیب الرحمٰن نے اس بدنامِ زمانہ فوج کو بہت زیادہ اختیارات دے دیئے تھے، اس لیے عوام بہت زیادہ ناراض تھے۔ ہندوستانی فوج جیسے یونیفارم نے بھی عوام کے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا کر دیئے، وہ سمجھتے تھے کہ یہ عوامی لیگ کی ایک شاطرانہ چال ہے تاکہ جب ضرورت محسوس ہو وہ اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے اس بھیس میں مطلوبہ تعداد میں ہندوستانی فوج کو ملک میں لاسکے۔ حکومت کے باخبر حلقوں میں یہ افواہیں بھی سنی جا رہی تھیں کہ حکومت مسلح افواج کو ختم کرنے اور اس کی جگہ راکھی باہنی کو تعینات کرنے پر غور کر رہی ہے۔ ان تمام پیش رفتوں نے مسلح افواج پر ایک ناموافق اثر اور ردِ عمل پیدا کر دیا تھا۔ وہ حکومتی پارٹی اور حکومت کے ایسے منفی رویے سے مضطرب اور مایوسی کا شکار ہو رہی تھیں۔ یہی ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' کی پالیسی سول بیورو کریسی میں بھی نافذ کر دی گئی۔

تاج الدین حکومت نے فیصلہ کیا کہ ہندوستانی بیوروکریٹس نئے آزاد ملک میں انتظامیہ کو از سرِ نو منظم کریں گے۔ لیکن مقامی بیوروکریٹس کی شدید مخالفت کی وجہ سے اس منصوبے کو عملی شکل نہ دی جا سکی۔ لیکن اس واقعہ کے بعد بیوروکریٹس کو حکومت کی جانب سے کبھی بھی قبولیت حاصل نہ ہو سکی۔ مسلح افواج کی طرح وہ بھی حکمرانوں کی نظروں میں مشکوک سمجھے جانے لگے۔

اس طرح عوامی لیگ نے ریاست کے دونوں اہم اداروں کی ناراضی مول لے لی۔ بیوروکریسی کو اپنے کنٹرول میں لانے کے لیے عوامی لیگ نے بہت سے سینئر اور قابل اعلیٰ آفیسرز کو فارغ کر دیا اور ان کی جگہ ناتجربہ کار متبادل افراد کو تعینات کر دیا گیا۔ 300 سے زائد پارٹی ممبران کا انتخاب کیا گیا اور انہیں انتظامی امور کی تربیت کے لیے سوویت یونین بھیجا گیا۔ بعد میں انہیں سول سروس میں شامل کر دیا گیا اور انہیں انتظامی انڈسٹریل مینجمنٹ سروس (آئی ایم ایس) کا نام دیا گیا۔ دوسری جانب سید حسین، جو شیخ مجیب الرحمٰن کا برادر نسبتی تھا، تمام بیوروکریٹس اور سول سروس کا غیر اعلانیہ مقتدرِ اعلیٰ بن گیا۔ وہ ایک سابقہ ای پی سی ایس آفیسر تھا اور سیکشن آفیسر کے عہدے کا حامل تھا۔ اسے تیزی سے ترقی دی گئی اور راتوں رات مکمل سیکریٹری بنا دیا گیا۔ تمام کے تمام سول سرونٹس اس کے رحم و کرم پر تھے۔ اس طرح سول سروسز کو انحطاط اور تنزل کی جانب موڑ دیا گیا۔ یہ بھی اس عظیم منصوبے کا ایک حصہ تھا۔

بنگلہ دیش کی مسلح افواج کا کردار منفرد اور بے مثال تھا۔ اس کے بیشتر ارکان مجاہدین آزادی میں سے تھے اور جنگ آزادی کے جذبے سے سرشار تھے۔ وہ بہادر، بے غرض، محبِ وطن اور سیاسی طور پر باشعور تھے۔ سیدھی بات یہ تھی کہ وہ اپنے ادارے کے اندر اور قومی زندگی میں کسی قسم کی ناانصافی قبول کر سکتے تھے اور نہ ہی انہوں نے جنگ آزادی کے دوران جلاوطن حکومت کی کسی غلط کاری کو تسلیم کیا تھا۔ انہوں نے ہمیشہ صدائے احتجاج بلند کی تھی اور اپنے دائرہ اختیار میں کسی بھی ناجائز بات کی مزاحمت کی تھی۔

فوج کی تنظیم سازی کے ابتدائی مراحل میں میری تعیناتی کومیلا میں تھی۔ کرنل ضیاالرحمٰن ہمارے پہلے بریگیڈیئر تھے۔ ان کو بریگیڈیئر کے عہدے پر ترقی دے دی گئی تھی۔ جنرل اے جی ایم عثمانی ہمارے کمانڈر انچیف تھے۔ ان کا ہیڈ کوارٹر 27 منٹو روڈ، ڈھاکہ میں تھا۔ تھوڑے عرصے بعد انہوں نے استعفیٰ دے دیا اور کابینہ میں شامل ہو گئے۔

111۔ بریگیڈیئر ضیاالرحمٰن کی حق تلفی

ضابطے کے تحت جنرل عثمانی کے بعد بریگیڈیئر ضیاالرحمٰن کو سب سے سینئر ہونے کی بنا پر چیف آف آرمی سٹاف مقرر کیا جانا چاہیے تھا۔ لیکن انہیں یہ عہدہ جس کے وہ پوری طرح حق دار تھے، دینے سے انکار کر دیا گیا۔ انہیں نظرانداز کرتے ہوئے بریگیڈیئر شفیع اللہ کو چیف آف آرمی سٹاف بنا دیا گیا۔ عوامی لیگ کی حکومت نے یہ امتیازی فیصلہ ضیاالرحمٰن کو محض ان کے تاریخی اعلانِ آزادی پر سزا دینے کے لیے کیا تھا۔ اس

پُرکشش عہدے کے حصول کے بعد بریگیڈیئر شفیع اللہ، شیخ مجیب الرحمٰن کے بااعتماد چیلے بن گئے اور اپنی وفاداری کو ثابت کرنے کے لیے وہ فوج کے مفادات کو قربان کرتے ہوئے شیخ مجیب الرحمٰن کے خیالات اور خواہشات کو زیادہ اہمیت دینے لگے۔ انہوں نے فوج کے ضابطوں اور اصولوں کے خلاف عمل کرنا بھی شروع کر دیا۔ مجیب الرحمٰن کے چند وفاداروں کو ناجائز طور پر ترقی دے کر اہم عہدوں پر فائز کر دیا گیا۔ فوج کا محب وطن حصہ، خاص طور پر نوجوان آفیسرز ایسے فیصلوں کے خلاف بولنے اور احتجاج کرنے لگے۔ فوج میں ایک بے چینی اور اضطراب کی فضا پیدا ہو چکی تھی۔ شیخ مجیب الرحمٰن کو اس کا علم تھا اور انہوں نے ایک دن مجھے ملاقات کے لیے بلایا۔ قریبی تعلقات کی بنا پر وہ مجھے خاص طور پر آرمی اور دفاعی افواج کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے اکثر بلایا کرتے تھے۔ میں اپنے طور پر بھی جب چاہتا، ان کے گھر جا سکتا تھا۔ میں جب بھی روڈ نمبر 32 گیا، میں نے ہمیشہ اپنے لیڈر سے ملاقات کے انتظار میں لوگوں کا ایک بڑا ہجوم وہاں دیکھا۔ وہ ان کے گرد شہد کی مکھیوں کی طرح جمع ہوتے تھے لیکن میں نے ایسا کوئی آدمی نہیں دیکھا تھا جو سچ بولتا ہو اور ان کے استفسارات کے درست جواب دیتا ہو۔ ہر ایک اپنا کام کرانا چاہتا تھا اور جتنی جلدی ہو سکے وہاں سے نکل جانے کے چکر میں ہوتا تھا۔ یہ ہر روز کا معمول تھا۔ وہ مجھ اور میرے ساتھ مشفقانہ رویہ رکھتے تھے اور ان کے خاندان کے دوسرے افراد بھی ہم دونوں کو پسند کرتے تھے۔ 1972ء میں پاکستان سے واپسی پر شیخ مجیب الرحمٰن اور ان کے اہل خانہ ہماری شادی کی پہلی سالگرہ میں شریک ہوئے تھے اور انہوں نے اپنی نیک تمناؤں کا اظہار کیا تھا۔ کسی غیر سرکاری تقریب میں یہ ان کی پہلی شرکت تھی جس میں وہ اپنے خاندان کے افراد اور کابینہ کے ساتھیوں سمیت شریک ہوئے تھے۔ اگرچہ سیاسی طور پر میں نے عوامی لیگ کی اور اس کی پالیسیوں کی کبھی حمایت نہیں کی تھی، ذاتی طور پر ہمارے دلوں میں شیخ مجیب الرحمٰن اور ان کے خاندان کی بہت زیادہ عزت و تکریم تھی۔ ہم ان کے پاس ذاتی مفادات یا حمایت کے لیے کبھی نہیں گئے۔ میں نے ہمیشہ ان کے سامنے سچائی بیان کرنے کی کوشش کی کیوں کہ میرے خیال میں اُن کے سامنے درست حقائق بیان کرنا ضروری تھا تا کہ حکومت کے سربراہ ہونے کی حیثیت سے درست فیصلے کرنے میں ان کی مدد کی جا سکے۔

میں روڈ نمبر 32 دھان منڈی، جیسا کہ حکم دیا گیا تھا ان سے ملنے کے لیے چلا گیا۔ وہ جاننا چاہتے تھے کہ بریگیڈیئر شفیع اللہ کو چیف آف آرمی سٹاف مقرر کیے جانے کے بعد فوج میں کیا ردِعمل تھا۔ میں نے انہیں صاف طور پر بتایا کہ ان کے اس فیصلے نے فوج میں ناموافق اثرات مرتب کیے ہیں۔ میں نے انہیں مزید بتایا کہ بریگیڈیئر ضیا الرحمٰن کو چیف آف آرمی سٹاف مقرر نہ کرنا بہت بڑی غلطی تھی کیوں کہ وہ اس عہدے کے جائز حق دار تھے اور ان کو ایک طرف کر دیئے جانے سے نہ صرف یہ کہ فوج میں ایک اضطراب کی کیفیت پیدا ہو چکی ہے بلکہ اس نے حکومت اور فوج کے درمیان غلط فہمیوں کی خلیج کو مزید وسیع کر دیا ہے۔ میں نے شیخ مجیب الرحمٰن کو یہ بھی بتایا کہ بریگیڈیئر ضیا الرحمٰن سے کی جانے والی اس ناانصافی پر ہر کوئی انہیں موردِ الزام ٹھہرا رہا ہے اور فوج میں ان کا تاثر ہر سطح پر خراب ہو چکا ہے، جس کا فوری ازالہ انتہائی ضروری ہے۔

میری بات سننے کے بعد شیخ مجیب الرحمٰن نے کہا کہ انہوں نے یہ فیصلہ جنرل عثمانی کے مشورے پر کیا ہے اور اب فوری طور پر اسے تبدیل کرنا پریشانی کا باعث بنے گا۔ یہ جواب انہوں نے اپنے سیاسی تناظر کو مدنظر رکھتے ہوئے دیا تھا۔ تاہم انہوں نے کہا کہ کچھ عرصے کے بعد وہ بریگیڈیئر شفیع اللہ کو ہٹا کر بریگیڈیئر ضیا الرحمٰن کو چیف آف آرمی سٹاف مقرر کرنے پر غور کر سکتے ہیں۔

جو کچھ مجیب الرحمٰن نے کہا تھا، وہ زیادہ قابل یقین نہیں تھا۔ تاہم جو انہوں نے کہا تھا، اس پر یقین کرتے ہوئے میں نے مشورہ دیا کہ جب تک بریگیڈیئر شفیع اللہ آرمی چیف رہتے ہیں، بریگیڈیئر ضیاالرحمٰن کو بریگیڈیئر شفیع اللہ کے تحت ایک عام بریگیڈ کمانڈر کے طور پر نہ رکھا جائے۔ اس کی بجائے بریگیڈیئر ضیاالرحمٰن کے لیے ڈپٹی چیف آف آرمی سٹاف کا عہدہ پیدا کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح فوج میں موجود اضطراب کو کافی حد تک کم کیا جا سکتا ہے۔ مجیب الرحمٰن نے وعدہ کیا کہ وہ اس معاملے پر غور کریں گے۔ انہوں نے مجھے کہا کہ میں ضیاالرحمٰن کو ان کے اس ارادے کے بارے میں آگاہ کر دوں اور فوج میں بھی محتاط انداز میں اس بات کا پرچار کروں۔ کچھ عرصہ بعد وزیراعظم کے حکم پر ڈپٹی چیف آف آرمی سٹاف کا عہدہ پیدا کیا گیا اور بریگیڈیئر ضیاالرحمٰن کی بطور ڈی سی او اے ایس تقرری کر دی گئی۔ یہاں یہ ذکر کرنا مناسب ہوگا کہ ''سی او اے ایس'' اور ''ڈی سی او اے ایس'' دونوں میجر جنرل کے عہدے کے حامل تھے۔ اس فیصلہ نے فوج میں موجود اضطرلب کو، جیسا کہ خیال کیا گیا تھا، کافی حد تک کم کر دیا اور ہم سب اس بات کے منتظر تھے کہ وزیراعظم جلد ہی ہمارے محبوب میجر جنرل ضیاالرحمٰن کو چیف آف آرمی سٹاف مقرر کرنے کا وعدہ بھی پورا کر دیں گے۔

112۔ تہی دستی کے عالم میں فوج کو منظّم کرنے کا مشکل کام

میجر جنرل ضیاالرحمٰن کی جگہ کرنل محمد ابو طاہر کو ہمارے بریگیڈ کمانڈر کے طور پر مقرر کیا گیا۔ میں کرنل طاہر کو پاکستان کے دنوں سے جانتا اور ہمارے خیالات اور سوچیں کافی حد تک ملتی تھیں۔ جنگ آزادی کے دوران میں ہمارا بڑا اقریبی تعلق رہا تھا۔ وہ محبِ وطن اور حقیقت پسند تھے۔ ان کی گرم جوشی اور کردار کی وجہ سے ہم سب ان سے محبت کرتے تھے۔ عام فوجیوں میں بھی ان کی بہت عزت تھی۔

جنگ سے تباہ حال ملک میں ایک فوج کو منظّم کرنا ہمیشہ ایک بڑا کام ہوتا ہے، ہمارے وسائل تقریباً نہ ہونے کے برابر تھے۔ ہتھیار، اسلحہ دیگر ساز وسامان، وردیاں، تربیتی ساز وسامان بہت ہی ناکافی تھا۔ کرنل طاہر کی قیادت میں ہم نے فیصلہ کیا کہ کومیلا چھاؤنی کی تعمیر نو اور اسے قابل رہائش بنانے کی کوششوں کے ساتھ ساتھ، ہمیں اپنے علاقے میں تعمیر نو کے کام میں عوام کی مدد بھی کرنا چاہیے۔ ہم نے مکانات، سکولوں، ہسپتالوں، کالجوں، پلوں، سڑکوں، اور آبپاشی کے نظام کی بحالی کے کام کا آغاز کر دیا۔ ہم نے صحت اور تعلیم کی بنیادی سہولتوں کی بحالی کے لیے بھی کوششیں شروع کر دیں۔ جنگ آزادی کے جذبے نے ہمیں ایسی سرگرمیوں کی ابتدا کے لیے اکسایا تھا۔ لوگوں نے ہماری ان کوششوں کو سراہا اور ہمیں خلوصِ دل سے خوش

آمدید کہا۔ اس قسم کے اقدامات سے ہم عوام میں یہ احساس پیدا کر سکتے تھے کہ بنگلہ دیش کی فوج اور سابقہ پاکستان کی قابض فوج کے مطمع ہائے نظر اور اقدار میں بنیادی فرق ہے۔

بنگلہ دیش کی فوج محب وطن اور عوام کی خدمت کا عزم رکھتی ہے اور ایک استبدادی ہتھیار کے طور پر استعمال کیے جانے کے لیے قائم نہیں کی گئی تھی۔ ہمارے ان کاموں نے نہ صرف یہ کہ فوج کی مقبولیت میں اضافہ کیا بلکہ فوج پر عوام کے اعتماد اور بھروسے میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ جلد ہی ہماری تعمیری سرگرمیوں کی بات پورے ملک میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ ہمارے مثبت اقدامات نے شان دار کامیابی حاصل کی اور مسلح افواج کے محب وطن حلقوں میں عمومی سطح پر اور بری فوج کی مختلف یونٹوں میں خاص طور پر بہت توجہ حاصل کی۔ ان میں سے اکثر نے تحریک پا کر ایسے ہی کاموں کا آغاز کر دیا۔ جلد ہی عوامی لیگ کی حکومت اور مسلح افواج کے رجعت پسند حلقوں میں سراسیمگی پھیل گئی اور وہ اس قسم کی پیش رفتوں پر پریشان ہو گئے۔ عوام اور مسلح افواج کے ارکان میں بڑھتے ہوئے تعلقات اور مسلح افواج کے محبّ وطن طبقے کو عوام کی جانب سے حاصل ہونے والے اعتماد اور قدر افزائی جیسے عوامل کو حکمرانوں کے مفادات کے لیے خطرناک خیال کیا جانے لگا۔

اس وقت پورے بنگلہ دیش میں عوام کی بحالی کے لیے امدادی کارروائیاں جاری تھیں۔ لیکن عوامی لیگ کی مرکزی اور مقامی قیادت کی بدعنوانیوں کی وجہ سے عوام کو ان کا جائز حصہ نہیں مل رہا تھا۔ ہم نے اپنے دائرہ کار میں آنے والے علاقوں میں تمام قسم کی بدعملیوں کو روکنے کے لیے مناسب اقدامات اٹھائے اور امدادی سامان کی مناسب تقسیم کو یقینی بنا دیا تھا۔ اس قسم کی مداخلت کے نتیجے میں حق دار لوگوں کو ان کا جائز حق ملنا شروع ہو گیا۔ دراصل یہ عوامی لیگیوں کے مفادات پر براہ راست حملہ تھا اور وہ بہت برہم ہو گئے۔ شیخ مجیب الرحمٰن نے میجر جنرل شفیع اللہ کو ایسی تمام عوام دوست سرگرمیوں کو بند کرنے کا حکم جاری کرنے کے لیے کہا۔ اس قسم کے حکم کے جواز کے طور پر یہ کہا گیا کہ فوج کوئی خیراتی ادارہ نہیں ہے۔ اس دوران اگرتلہ سازش کیس کے تمام ارکان کی فوج میں دوبارہ تعیناتی کر دی گئی۔ فوج میں بعض عناصر شیخ مجیب الرحمٰن کی آنکھوں اور کانوں کے فرائض ادا کر رہے تھے۔ ناجائز مراعات کے حصول کے لیے بہت سے بددیانت آفیسرز ایجنٹوں کا کردار ادا کر رہے تھے جو ہر قسم کی معلومات اکٹھی کرتے تھے اور ان میں سے کوئی با اعتماد آفیسر یہ تمام معلومات شیخ مجیب الرحمٰن تک پہنچا دیتا تھا۔

113۔ فوجی کونسل

اس موقع پر مسلح افواج کے ہم خیال ارکان کی ایک بڑی تعداد نے ایک خفیہ تنظیم ''فوجی کونسل'' کے نام سے قائم کرنے کے لیے اقدامات اٹھائے۔ ان اقدامات پر ایک بہت اچھا ردِعمل دیکھنے میں آیا، اور بہت تھوڑے عرصے میں قیادت فوج کی مختلف یونٹوں میں فوجی کونسل کی خفیہ شاخیں منظم کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ یہ ایئر فورس اور نیوی کی کچھ یونٹوں میں بھی قائم کی گئی۔ فوجی کونسل حکومت کے ہر پالیسی فیصلے اور عمل کو اچھی طرح جانچتی تھی۔ تنظیم کے رہنما ان پالیسیوں، حکومتی اعمال اور ان کے قوم اور مسلح افواج پر اثرات کا

بڑی باریک بینی سے تجزیہ کرتے۔ فوجی کونسل کی قیادت بڑے موزوں انداز میں عام فوجیوں اور نوجوان افسروں کو ان پالیسی معاملات اور دوسرے اہم معاملات پر آگاہی مہیا کرتی۔ حکومتی سرگرمیوں پر کڑی نظر رکھتے ہوئے تنظیم کے لیڈر تمام ابھرتے ہوئے قومی مسائل، بنگلہ دیش کے مستقبل اور مسلح افواج کے کردار کے بارے میں آپس میں غور وفکر اور بحث مباحثے کرتے رہتے تھے۔

ایسی تمام سرگرمیاں انتہائی خفیہ طور پر احتیاط اور ہوشیاری کے ساتھ انجام دی جاتی تھیں۔ فوجی کونسل نے سول بیوروکریسی، طلبا، میڈیا کے افراد، کسانوں اور کارکنوں، اساتذہ، دانشوروں، سیاسی رہنماؤں، کاروباری حلقوں، مجاہدین آزادی اور عوامی حلقوں میں موجود ہم خیال محبِ وطن افراد سے بھی معلومات کے حصول اور قومی سیاسی، سماجی اور معاشی معاملات پر تبادلہ خیال کے لیے رابطے استوار کیے۔ ایسے تمام رابطے انفرادی سطح پر رکھے جاتے تھے۔ بعد میں اس طرح حاصل ہونے والی تمام معلومات کو ترتیب سے رکھا جاتا اور مرکزی قیادت اسے دوسری یونٹوں تک منتقل کرنے سے قبل ان کا تنقیدی جائزہ لیتی تھی۔

فوجی کونسل نے عوامی لیگ میں مختلف سطحوں پر موجود محبِ وطن اور جمہوریت پسند رہنماؤں سے بھی رابطے کر رکھے تھے۔ ایک عمومی اتفاق رائے یہ تھا کہ کسی نازک وقت پر مسلح افواج کے محبِ وطن افراد کو قوم کو موجودہ بحران اور کسی بھی مشکل صورتِ حال سے نجات دلانے کے لیے اہم کردار ادا کرنا پڑسکتا ہے۔ اس حوالے سے فوجی کونسل کا نقطہ نظر یہ تھا کہ محبِ وطن مسلح افواج قوم اور عوام کے عظیم مفاد میں ہر قسم کی قربانی دینے کے لیے ہمیشہ تیار رہیں گی۔ لیکن وہ نجات حاصل کرنے کے لیے عوام کی اپنی جدوجہد کی محض معاون قوت کا کردار ادا کریں گی۔ فوجی کونسل کا یہ بھی ایمان تھا کہ سیاسی عمل میں عدم استحکام کے باعث سیاسی رہنماؤں کی ناکامی کی صورت میں ملک کے اقتدار پر قبضہ کرنا یا سیاست میں فوج کی براہ راست مداخلت کبھی بھی ایک منصفانہ اور مساوات پر مبنی معاشرے کے قیام یا لوگوں کے بنیادی حقوق کی ضمانت کے لیے فائدہ مند ثابت نہیں ہوسکے گی۔ عوام کے بنیادی حقوق کو صرف اس صورت میں یقینی بنایا جاسکتا ہے، اگر ایک قوم پرست جمہوری عمل کو جاری رکھا جائے اور یہ نتائج مخلص، محبِ وطن، ترقی پسند اور جمہوریت نواز سیاست دانوں کی قیادت میں ہی حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ اگر ضرورت محسوس ہوئی تو مسلح افواج اس قسم کے سیاسی عمل کے شروع کرنے اور جاری رکھنے میں مددگار قوت کے طور پر کردار ادا کریں گی۔

114۔ کرنل طاہر کو کمانڈ سے ہٹا دیا گیا

1972ء کے اختتام پر کرنل طاہر کو غیر متوقع اور حیران کن طور پر کمانڈ سے ہٹا کر آرمی ہیڈکوارٹرز میں بھیج دیا گیا۔ انہیں ان کی حب الوطنی اور عوام نواز رجحانات کی وجہ سے ہٹایا گیا تھا۔ اس تبدیلی سے ایک بات واضح ہوچکی تھی کہ ہم سب کی بھی قریبی نگرانی کی جارہی ہے۔ حکام نے اس کی وجہ یہ بتائی کہ وہ ایک نااہل شخص ہیں، لہٰذا انہیں عملی کمانڈ میں نہیں رکھا جاسکتا۔ وہ صرف سٹاف کی تقرریوں کے لیے موزوں ہیں۔ اس دوران

میجر جلیل نے بحال ہونے کے بعد رضا کارانہ طور پر استعفیٰ دے دیا اور ''جاتیو سماج تنترک دَل'' تشکیل دیا۔

ملک میں سیاسی ماحول گرم ہوتا چلا جا رہا تھا۔ عوامی لیگ کا بھانڈا اب اپنی قوم دشمن اور عوام دشمن پالیسیوں کی وجہ سے بتدریج پھوٹتا چلا جا رہا تھا۔ بد نظمی اور استبداد نے لوگوں کی زندگیاں تکلیف دہ بنا دی تھیں۔ امن و امان کی تیزی سے بگڑتی ہوئی صورت حال نے عوام میں عدم تحفظ کا احساس پیدا کر دیا تھا اور ملک کی مجموعی صورتِ حال غیر مستحکم ہو چکی تھی۔ آسمان کو چھوتی ہوئی قیمتیں، معاشی بدانتظامی، وسیع طور پر پھیلی رشوت ستانی اور سمگلنگ کی وجہ سے روزمرہ کی زندگی مشکل ہو گئی تھی۔ عوامی لیگ حکومت کی غداری اور ناکامی کی وجہ سے ملک میں پوری طرح انارکی پھیل چکی تھی۔

ہندوستان سے واپسی کے بعد مولانا بھاشانی نے حکومت مخالف تحریک کا آغاز کر دیا۔ ترقی پسند سیاسی قوتوں نے ان کی قیادت میں متحد ہونے کی کوششیں شروع کر دیں۔ دائیں بازو کی جماعتوں نے بھی حکومت مخالف مہم کا آغاز کر دیا تھا۔ ان سب کو شکایت تھی کہ عوامی لیگ کی حکومت میں جیسا کہ اس نے جنگ آزادی کی روح سے غداری کی ہے، قوم آزادی حاصل نہیں کر سکی۔ ہندوستان مخالف جذبات مزید بڑھ رہے تھے۔ ایک فتح یاب قوم کے خواب اور امنگیں ہوا میں تحلیل ہو چکی تھیں۔ ہندوستان کے کہنے پر جنگی مجرموں کے خلاف مقدمات روک دیئے گئے تھے۔ ''کولیبریٹرا یکٹ'' ختم کر دیا گیا تھا اور عام معافی کے اعلان کے ذریعے آزادی مخالف قوتوں کے سینکڑوں ہزاروں ارکان کو معاف کر دیا گیا تھا اور اس کی تشہیر ایک عظیم رہنما کی عالی ظرفی کے طور پر کی گئی تھی۔ لیکن حقیقت میں یہ قدم قوم پرست قوتوں کا مقابلہ کرنے کے لیے اٹھایا گیا تھا۔ شیخ مجیب الرحمٰن کی غلط پالیسیوں کی وجہ سے قوم کے غداروں کو ایک مرتبہ پھر قومی سیاست اور انتظامیہ کے اندر اپنے آپ کو بحال کرنے کا موقع مل گیا۔ شیخ مجیب الرحمٰن کو ان تمام افراد کو جو قتل، عصمت دریوں، لوٹ مار اور آتش زنی کے واقعات میں اور سب سے بڑھ کر دانش وَروں کے ظالمانہ قتل میں ملوث تھے، معاف کرنے کا کوئی حق حاصل نہ تھا۔ جیسے جیسے مجموعی صورتِ حال مزید بگڑتی چلی گئی، حکومت احتجاج کرتے ہوئے عوام کو ختم کرنے کے لیے بھوکے بھیڑیوں کی طرح ان پر مزید بے رحمی سے ٹوٹ پڑی۔

115۔ اٹاری کی بدنام کارروائی

1972ء کے وسط میں دو مشہور رہنماؤں وحید الرحمٰن اور ٹیپو بسواس کی قیادت میں اٹاری، پٹنہ اور راج شاہی میں ایک شدید حکومت مخالف جدوجہد نے جنم لیا۔ شیخ مجیب الرحمٰن نے اپنے ایک وفادار کرنل شفاعت جمیل کو اس تحریک کو کچلنے کی ذمہ داری سونپی۔ اپنے لیڈر کو خوش کرنے کے لیے کرنل شفاعت نے اس بے رحمانہ کارروائی کا آغاز کر دیا اور ان علاقوں میں تحریک کو کچلنے کے لیے بلا امتیاز بیسیوں افراد کو مار ڈالا جن میں زیادہ تر نوجوان تھے۔ عوامی لیگ کے مقامی رہنماؤں نے اس کارروائی میں اس کی مدد کی۔ اس قسم کی غیر انسانی وحشت کے خلاف کیپٹن نور چوہدری نے صدائے احتجاج بلند کی۔ کرنل شفاعت کے سٹاف افسر کے طور

پر اس نے کرنل شفاعت کو سمجھاتے ہوئے کہا، ''سر میں شیخ مجیب الرحمٰن سے آپ کی مکمل وفاداری کو جانتا ہوں۔ لیکن پھر بھی نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو بغیر کسی مقدمے کے محض اس لیے مار دینا کہ ایک شخص ان کو مروانا چاہتا ہے، انتہائی ناانصافی اور ناجائز عمل ہے۔ اس قسم کے ظالمانہ فعل پر آپ کو ایک دن اپنے ضمیر کے سامنے جواب دہ ہونا پڑے گا۔ اپنی باقی ماندہ زندگی آپ اپنے ضمیر کا مجرم بن کر بسر کریں گے۔ کسی بھی طور پر میں ایسے عمل میں شریک کار نہیں بن سکتا۔''

کرنل شفاعت اس بات کا قائل نہ ہوا اور کیپٹن نور چوہدری نے اپنی تبدیلی آرمی ہیڈ کواٹرز مین کروالی۔ بعد میں کرنل شفاعت جمیل کو اس کی کامیاب کارروائیوں کے صلے میں ڈھاکہ کا بریگیڈ کمانڈر لگا دیا گیا۔ ان دنوں میں ترقی، تبدیلی یا سزا کا معیار سیاسی تعلقات یا شخصی وفاداری ہوا کرتا تھا۔ حکومت نے اہم عہدوں پر اپنی پسند کے آفیسر لگا کر مسلح افواج پر اپنا اقتدار قائم رکھنے کی کوشش کی۔ اس کے ساتھ ہی ان افسروں کو جنہیں وفادار خیال نہیں کیا جاتا تھا لیکن وہ اپنے جوانوں میں مقبول ہونے کی وجہ سے طاقت وَر تھے، صدارتی حکم کے تحت ریٹائر کرنے یا ملک سے باہر بھجوانے کا عمل بھی جاری تھا۔

116۔ سمگلنگ کے خلاف کارروائی

1973ء کے عام انتخابات سے پہلے بڑے پیمانے پر خرد بُرد اور سمگلنگ کی وجہ سے امدادی کارروائیاں بہت زیادہ ابتری کا شکار ہو چکی تھیں۔ حکومت اس صورتِ حال سے نمٹنے اور سول انتظامیہ کی مدد کے لیے مسلح افواج کو بلانے پر مجبور ہوگئی۔ فوج کے نوجوان افسروں نے اپنے طور پر صورتِ حال کو قابو میں لانے کے لیے ذمہ داری اٹھائی۔ ان کی کوششوں نے جلد ہی عوام کے دلوں میں امید کے چراغ روشن کر دیے۔ ''اینٹی سمگلنگ آپریشن'' کے طور پر یہ کارروائی بہت مقبول ہوئی۔ فوجی کونسل کے ارکان نے پختہ ارادہ کر لیا کہ اپنے مقصد کے ساتھ لگن اور خلوص کے ذریعے اپنی حب الوطنی کو ثابت کرنے کے لیے وہ اس موقع سے بھرپور فائدہ اٹھائیں گے۔ اس کارروائی کے دوران مسلح افواج کے نوجوان افسروں اور ارکان کو حکمران جماعت کے رہنماؤں اور ان کے پٹھوؤں کے اصل کردار اور دولت کے لیے ان کی حرص و ہوا سے آگہی حاصل ہوئی اور انہیں ان بدعنوان رہنماؤں اور ان کے پٹھوؤں سے آمنے سامنے مقابلہ کرنے کا موقع میسر آیا۔ ہم آپریشن کمانڈروں نے فیصلہ کیا کہ ہم اپنے آپ کو محض ان ٹرک ڈرائیوروں اور مزدوروں کو پکڑنے تک محدود نہیں رکھیں گے جو معمولی معاوضے پر اپنا پیٹ بھرنے کے لیے یہ کام کرتے ہیں بلکہ اقتدار کے ایوانوں میں موجود اصل مجرموں اور رِنگ لیڈروں کو سامنے لائیں گے اور ان لوگوں پر ہاتھ ڈالیں گے جو پس پردہ رہتے ہوئے بڑے پیمانے پر سمگلنگ کر کے لاکھوں اور کروڑوں میں دولت سمیٹ رہے ہیں۔

جلد ہی ہمیں علم ہوگیا کہ مارواڑیوں کا ایک بڑا گروہ چند بااثر اور طاقت وَر وزرا اور ان کے عزیز و اقارب کی مدد سے سرحد پار سمگلنگ میں ملوث ہے۔ ہماری انٹیلی جینس رپورٹوں کے مطابق ریڈکراس کے

چیئرمین غلام مصطفےٰ شیخ مجیب الرحمٰن کے چھوٹے بھائی شیخ ناصر، وزیر داخلہ منصور علی، ان کا بیٹا نسیم اور شرنیابت کا بیٹا حسنات اس سمگلنگ میں مارواڑیوں کے ساتھ شامل تھے۔ جیسور، کھلنا اور دیناج پور کے آپریشنل کمانڈر کی تحقیقات میں بھی یہی بات سامنے آئی۔ تمام خطرات کو مول لیتے ہوئے ہم نے ان مجرموں کو گھیرنا اور عوام کے سامنے ان کو ننگا کرنا شروع کر دیا۔ افسروں اور فوجیوں کو سمجھ آ چکی تھی کہ سیاسی رہنما ہر برائی کی جڑ ہیں۔ ان کی آشیرباد سے ہی لٹیروں نے ملک کا دیوالیہ نکال دیا ہے۔ انہیں یہ بھی علم ہو گیا تھا کہ فوجی کونسل اپنے تجزیوں اور اندازوں میں کتنی درست ہے اور فوج کے نچلے طبقے میں اس کا تاثر بہتر کیوں ہو رہا ہے۔ انہیں یہ بھی سمجھ آ گئی کہ انہیں تعلیم اور تحریک دینے کے خطرناک اقدامات، جو فوجی کونسل کے ارکان نے اٹھائے تھے، وہ کسی خفیہ یا درپردہ مقاصد کے حصول کے لیے نہیں بلکہ محض حب الوطنی کے جذبے سے اٹھائے گئے تھے۔ اس طرح آپریشنل کمانڈرز فوجی کونسل کے قابل احترام رہنما بن گئے اور ان کے مجموعی تاثر اور مقبولیت میں فوج کے اندر اور ملک میں بھی اضافہ ہو گیا۔ میں یہاں ایک واقعہ کا ذکر کروں گا جو سمگلنگ کے خلاف مہم کے دوران پیش آیا۔ اس واقعہ سے قارئین حکومتی کردار کا بہتر اندازہ لگا سکیں گے۔ دیناج پور کے آپریشنل کمانڈر نے ایک دن ڈھاکہ میں سینٹرل کنٹرول کو ایک پیغام بھیجا کہ چار سب سے بڑے مارواڑی سمگلر اس کے علاقہ سے فرار ہو گئے ہیں اور انہوں نے وزیر داخلہ کے گھر میں ان کے بیٹے نسیم کی مدد سے پناہ لے رکھی ہے۔ وزیر داخلہ کے گھر پر چھاپا مارنے کا پروگرام بنا لیا گیا۔ لیکن آرمی ہیڈ کوارٹرز کی مداخلت کی وجہ سے منصوبہ کو ترک کرنا پڑ گیا۔ آرمی ہیڈ کوارٹرز نے وزیراعظم کے ذاتی حکم پر مداخلت کی تھی۔ اس واقعہ کے بعد حکومت فوجی کارروائی کے بارے میں تشویش میں مبتلا ہو گئی۔ اس قسم کی کارروائیوں سے فوج کی مقبولیت میں اضافہ ہو گیا تھا۔ دوسری جانب حکومت بڑی بوکھلاہٹ کے ساتھ بے نقاب ہو رہی تھی۔

حکومت اور حکمران عوامی لیگ مخمصے میں پھنسی ہوئی تھیں مگر کیا کیا جا سکتا تھا؟ ان کارروائیوں اور امداد دینے والی ایجنسیوں کے دباؤ پر حکومت نے بے دلی کے ساتھ فوج کو پورے ملک میں غذائی اجناس پہنچانے اور لوگوں میں تقسیم کرنے کی اضافی ذمہ داری بھی سونپ دی۔ ہم نے ''آپریشن فوڈ'' کا آغاز کر دیا، جس میں فوج نے اپنی مخلصانہ کوششوں اور قربانیوں کی وجہ سے بہت زیادہ کامیابی حاصل کی۔ حکمران جماعت کے ایک حصے نے مسلح افواج کو اضافی ذمہ داریاں سونپنے کے فیصلے پر ناراضی کا اظہار کیا۔ وزیراعظم پر ان تمام کارروائیوں کو فوری طور پر روکنے اور مسلح افواج کو واپس بیرکوں میں بھیجنے کے لیے دباؤ بڑھ گیا۔ انہوں نے ان کارروائیوں کو بند کرنے اور فوج کو واپس چھاؤنیوں میں جانے کا حکم دے دیا۔ قومی مفاد پر پارٹی کے تقدم کو ترجیح دی گئی۔ مسلح افواج کے ارکان اور عوام حکومت کے اس فیصلے پر بہت پریشان تھے۔

117۔ بنگا شیر دل کرنل ضیاالدین کے سنسنی خیز مضمون کی اشاعت

اس موڑ پر ڈھاکہ کے بریگیڈ کمانڈر کرنل ضیاالدین نے اپنی رائے ظاہر کی کہ موجودہ حکومت کے

تحت عوام کی خدمت کرنا ممکن رہا تھا نہ ہی حکومت کی براہِ راست مخالفت کرنا ممکن تھا۔ ان حالات میں ایک حکومت مخالف تحریک عوام کے اندر سے منظم کیے جانے کی ضرورت ہے۔ ان کے اس بیان سے ہم بھانپ گئے کہ وہ کوئی ارادہ کیے ہوئے ہیں۔ وہ حقیقت میں عملی سیاست میں داخل ہو رہے تھے۔ ہم نے ان کے بیان کو معقول پایا۔ یہ درست بات تھی کہ حتمی فتح حاصل کرنے کے لیے حکومت کے خلاف لوگوں کی جدوجہد میں تحرک پیدا کرنے کی ضرورت تھی۔ لیکن یہ سیاسی رہنماؤں اور سیاسی جماعتوں کی ذمہ داری تھی۔ تاہم ہم نے محسوس کیا کہ ایک معاون قوت کے طور پر ہم ہمیشہ اپنا حصہ ڈال سکتے ہیں۔ ہر موقع پر حکومت کے عوام دشمن کردار کو بے نقاب کرنے کا ہمارا فیصلہ یقیناً حکومت مخالف تحریک کے لیے عوام کو منظم کرنے میں سیاسی جماعتوں کے لیے مددگار ثابت ہوگا۔

پھر اچانک غیر متوقع طور پر کرنل ضیا الدین نے اپنا سنسنی خیز مضمون ''ویکلی ہالیڈے'' میں شائع کروا دیا۔ اس مضمون میں انہوں نے صاف طور پر حکومت اور اقتدار میں موجود افراد پر جنگ آزادی کی روح سے غداری کا الزام لگایا۔ اس مضمون میں انہوں نے لکھا: ''اس ملک کے عوام کے لیے آزادی ایک آزار بن چکی ہے۔ کسی گلی میں کھڑے ہو جائیں تو آپ کو زندگی کی جدوجہد میں مصروف بے مقصد، بے روح اور بے جان چہرے گزرتے نظر آئیں گے۔ عام طور پر آزادی کی جنگ کے بعد ایک نیا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور ملک بے سروسامانی کے عالم میں اپنی تعمیر نو کر لیتا ہے۔ بنگلہ دیش میں یہ بات اس کے برعکس دیکھنے میں آئی ہے۔ پورا بنگلہ دیش بھکاری بن گیا ہے، جو غمگین نغمے الاپ رہا ہے یا بغیر کسی شعور کے چیخ چلا رہا ہے۔ بھوکے اور غریب مکمل طور پر بے سمت ہو چکے ہیں۔''

جرأت مند مجاہد آزادی کرنل ضیا الدین پہلے شخص تھے جنہوں نے حکومت سے ہندوستان کے ساتھ پچیس سالہ معاہدے کو شائع کرنے کا مطالبہ کیا۔ شیخ مجیب الرحمٰن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انہوں نے لکھا: ''ہم نے ان کے بغیر جنگ لڑی اور جیت گئے۔ اگر ضرورت محسوس ہوئی تو ہم دوبارہ بھی ان کے بغیر لڑیں گے۔''

جب یہ مضمون شائع ہوا تو شیخ مجیب الرحمٰن لندن سے پتے کا آپریشن کروانے کے بعد سوئٹزرلینڈ میں آرام کر رہے تھے۔ جیسے ہی انہیں علم ہوا کہ کرنل ضیا الدین کے مضمون نے پوری قوم کو طوفان کی طرح اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے تو وہ سوئٹزرلینڈ میں اپنا قیام مختصر کرتے ہوئے وہ فوری طور پر ملک میں واپس آ گئے۔ کرنل ضیا الدین کا پیغام صاف اور واضح تھا۔ اگر قومی آزادی کے خلاف، جو بہت زیادہ قربانیاں دینے اور مصائب جھیلنے کے بعد حاصل کی گئی تھی، کوئی سازش کی گئی تو مجاہدین آزادی ضرورت کے مطابق دوبارہ ہتھیار اٹھانے میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں کریں گے۔ ان کے مضمون سے لوگوں کو سمجھ آ گئی تھی کہ قومی آزادی اور خود مختاری کے خلاف ایک گہری سازش کی جا رہی ہے۔

آرمی چیف میجر جنرل شفیع اللہ آنے والی مصیبت کو بھانپتے ہوئے سخت پریشان ہو گئے۔ انہوں

نے کرنل ضیاالدین کو مضمون شائع کرنے پر شیخ مجیب الرحمٰن سے معافی مانگنے کے لیے قائل کرنے کی اپنی تمام تر کوششیں کیں۔ میجر جنرل شفیع اللہ اس بات سے آگاہ تھے کہ اس مضمون نے سیاسی حلقوں میں خاص طور پر نوجوانوں، طالب علموں اور مسلح افواج کے ارکان میں ایک سنسنی پیدا کر دی ہے۔ اپنی واپسی پر شیخ مجیب نے دھماکہ خیز صورتِ حال کی نبض کو محسوس کر لیا اور میجر جنرل شفیع اللہ سے مشورہ طلب کیا کہ اس صورتِ حال سے کیسے نمٹا جائے۔ میجر جنرل شفیع اللہ نے وزیراعظم کو مطلع کیا کہ مضمون شائع ہونے کے بعد فوج کے نچلے طبقے میں کرنل ضیاالدین کی مقبولیت میں بے حد اضافہ ہو گیا ہے۔ اس صورت حال میں کرنل ضیاالدین کے خلاف کوئی بھی سخت قدم فوج کے اندر بے چینی اور اضطراب کو جنم دے گا۔ ایک سیاست دان کے طور پر شیخ مجیب نے خیال کیا کہ اگر کرنل ضیاالدین کو ان کے سامنے پیش کیا جائے تو وہ انہیں رام کرنے اور معافی مانگنے کے لیے قائل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اس کے مطابق کرنل شفیع اللہ کو انہیں پیش کرنے کا حکم دیا گیا۔ کرنل ضیا الدین کو گانو بھوَن طلب کیا گیا۔ جیسے ہی وہ اندر داخل ہوئے، شیخ مجیب الرحمٰن غصے میں برس پڑے، ''تم نے ایسا مضمون شائع کروانے کی کیسے جرأت کی؟ کیا تم جانتے ہو کہ یہ غداری کے مترادف ہے؟ فوج کی سروس میں رہتے ہوئے اس قسم کا بہکانے والا مضمون شائع کرنا فوج کے قوانین وضوابط کی صریح خلاف ورزی ہے۔ میں تمہیں انتہائی سخت سزا دے سکتا ہوں۔ لیکن ایسا پہلی مرتبہ ہونے کی وجہ سے اور مجاہد آزادی کے طور پر جنگ آزادی میں تمہاری خدمات کو مدِّنظر رکھتے ہوئے میں تمہیں معاف کر دوں گا، بہ شرط یہ کہ تم میجر جنرل شفیع اللہ کو تحریری طور پر لکھ کر دو کہ تم نے غلط کام کیا ہے۔'' جب شیخ مجیب بات کر رہے تھے تو کرنل ضیاالدین نے خاموشی سے ساری بات سنی۔ جب اُن کی بات ختم ہو گئی تو ضیاالدین نے جواب دیا، ''محترم وزیراعظم، میں آپ کی معافی یا رحم کا طلب گار نہیں ہوں۔ میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا۔ جو کچھ میں نے لکھا، وہ میرا ماننا ہے۔ لہٰذا معافی کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ آپ نے بالکل درست فرمایا ہے کہ حاضر سروس ہوتے ہوئے اس جیسی کوئی چیز شائع کرنا جرم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے یہ مضمون شائع کروانے سے پہلے استعفیٰ لکھ دیا تھا۔''

اس طرح سے ٹائیگر کرنل ضیاالدین نے وزیراعظم کو ششدر کر دیا اور گانو بھوَن سے باہر آ گئے۔

جب وہ باہر چلے گئے تو شیخ مجیب نے میجر جنرل شفیع اللہ سے کرنل ضیاالدین کو ایک مرتبہ پھر ٹھنڈا کرنے کی درخواست کی۔ میجر جنرل شفیع اللہ، بریگیڈیئر خالد مشرف کے ہمراہ واپس اے ایچ کیو آئے اور کرنل ضیا الدین کو صورتِ حال کو سمجھنے کا مشورہ دیا۔ کرنل ضیاالدین اپنے فیصلے پر جمے رہے اور درشتی سے جواب دیا کہ وہ اپنے ضمیر سے غداری نہیں کر سکتے، علاوہ ازیں ان جیسے اخلاقیات سے تہی دست رہنماؤں کے تحت خدمات انجام دینا وہ اپنے وقار کے منافی خیال کرتے ہیں جو کہ مخنثوں کے ایک ٹولے کے علاوہ کچھ نہیں۔ استعفیٰ دینے کے بعد کرنل ضیاالدین نے سربہارا پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی۔

چند دن بعد کرنل طاہر کو ناجائز طور پر ریٹائر کر دیا گیا۔ فوج سے فارغ ہونے کے بعد انہوں نے خفیہ مسلح تنظیم جے ایس ڈی کو منظم کرنے کی ذمہ داری اٹھالی جس کو گانو باہنی کے نام سے جانا جاتا تھا۔ اگرچہ

کرنل ضیاالدین اور کرنل طاہر اب فوج میں نہیں رہے تھے مگر ہم نے ان سے قریبی تعلقات قائم رکھے۔ ہم نے اپنی حیثیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اُسی ہدف کے حصول کے لیے کوششیں جاری رکھیں۔ ہمارا ہدف جمہوریت کے لیے عوامی جدوجہد میں اور مساوات پر مبنی ایک معاشرے کے قیام میں تعاون مہیا کرنا تھا۔ ہمارے نظریاتی بندھن اتنے مضبوط تھے کہ ہم سب جانتے تھے کہ کسی بھی نازک موڑ پر قومی مفاد کی خاطر ہم سب فردِ واحد کی طرح متحد کھڑے ہوں گے۔ 1973ء کے عام انتخابات میں عوامی لیگ نے دھاندلی کے ذریعے مکمل کامیابی حاصل کرلی، لیکن ملک کے اندر صورتِ حال میں ذرّہ بھر بھی تبدیلی نہ آسکی۔

118۔ بدنظمی اور انتشار میں مزید اضافہ

ملک کی مجموعی صورتِ حال مزید تیزی سے بگڑنے لگی۔ اپنی مخالفت کو دبانے کے لیے حکومت ہر حربہ استعمال کررہی تھی۔ بددیانتی پر مبنی اور بے مقصد حکومتی پالیسیوں کے نتیجے میں آئینی جمہوری سیاست کا سارا عمل ہی بحران کا شکار تھا۔ جمہوریت میں کوئی بھی سیاسی جماعت آئین کو اپنی ذاتی ملکیت نہیں سمجھتی بلکہ ایک سے زیادہ سیاسی جماعتوں کو آئین کے تحت کام کرنے کی اجازت ہوتی ہے اور اقتدار ان سیاسی جماعتوں میں گھومتا رہتا ہے۔ بنیادی اور اہم قومی مسائل پر وہ ایک دوسرے سے تعاون کرتی ہیں۔ آئینی جمہوریت کی بنیاد کچھ لو اور کچھ دو اور باہمی برداشت پر ہوتی ہے۔ لیکن بنگلہ دیش میں حکومت اقتدار میں موجود پارٹی کو ریاست کے برابر درجہ دے رہی تھی اور ریاست کے مفاد اور پارٹی کے مفاد کو آپس میں خلط ملط کررہی تھی۔ دوسری جانب سیاسی جماعتوں میں عدم تعاون ان کی کمزوریوں اور مناسب قوت کے فقدان کو ایک ایسی جماعت کے قیام کی راہ میں رکاوٹ خیال کیا جارہا تھا جو عوامی لیگ کا راستہ روک سکے۔ ملک میں جاری عمل عوامی لیگ کو بھی ایک آئینی جمہوری پارٹی کے طور پر پروان نہیں چڑھنے دے گا اور اس کی غیر قانونی سرگرمیاں آئین اور آئینی سیاست کی جڑیں کاٹ کر رکھ دیں گی۔ تاہم مخالفت کے شعلوں کو مخالف پارٹیوں کو پروان چڑھنے سے روک کر ٹھنڈا نہیں کیا جاسکتا۔ اس قسم کی کوششیں حقیقت میں مخالف جماعتوں کو زیرِ زمین چلے جانے پر مجبور کردیتی ہیں اور ماورائے آئین نظام حکومت طاقت حاصل کرجاتا ہے۔ حکمران جماعت کے غیر آئینی اور غیر قانونی اقدامات، قانون کی حکمرانی سے اجتناب اور آئین میں غیر جمہوری طریقوں سے ترامیم وہ عوامل تھے جنھوں نے جمہوری پارٹیوں کی جڑوں کو کمزور کردیا اور اس کے نتیجے میں عوامی لیگ نے اپنے آپ کو ایک فاشسٹ پارٹی میں تبدیل کرلیا۔ قومی سیاست میں ماورائے آئین اقدامات اور تشدد کا رجحان جنم لینے لگا اور خطرہ محسوس ہورہا تھا کہ زیرِ زمین سیاسی جماعتیں اس مستبد مطلق العنانی کا مقابلہ کرنے کے لیے تشدد اور مسلح جدوجہد کا راستہ اپنالیں گی اور انارکی قابو سے باہر ہوجائے گی۔

11 نومبر 1973ء کو طلبا یونین کے سالانہ اجلاس کی افتتاحی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے وزیرِ اعظم شیخ مجیب الرحمٰن نے کہا، ''وہ لوگ جو رات کے اندھیرے میں عام معصوم لوگوں، سیاسی کارکنوں اور طالب

علموں کو قتل کر رہے ہیں، ان میں اور ڈاکوؤں میں کوئی فرق نہیں رہ گیا۔ اگر یہ معصوم افراد کو قتل کر سکتے ہیں تو پھر ہمیں بھی ان کو مار ڈالنے کا حق حاصل ہے۔'' اسی دن چیئرمین نیشنل عوامی پارٹی مولانا بھاشانی نے راج شاہی میں ایک عوامی جلسے سے خطاب کرتے ہوئے کہا، ''جس طریقے سے حکومت مخالف جماعتوں کے کارکنوں کو جسمانی طور پر ختم کر رہی ہے، میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ملک میں آئینی سیاست کا عمل بہت جلد اختتام کو پہنچنے والا ہے۔ اگر یہی صورتِ حال جاری رہی تو پھر کسی جلسے یا اجتماع میں شرکت کرنا مشکل ہو جائے گا۔ ملک پر ظلم و استبداد کے ذریعے اور لوگوں کو قتل کرتے ہوئے حکومت نہیں کی جا سکتی۔ ایوب خان اور یحییٰ خان کو اسی وجہ سے زوال آیا تھا۔ اگر قتل و غارت کی سیاست جاری رہی تو پھر اس حکومت کا زوال بھی ناگزیر ہے۔ تاریخ سے سبق حاصل کریں۔ کوئی جمہوری حکومت مخالف سیاسی جماعتوں اور جمہوری اور آئینی عمل کے بغیر قائم نہیں رہ سکتی۔'' (بنگا وارتا، 12 نومبر 1973ء)

جے ڈی ایس کا بھی مختلف مخالف سیاسی جماعتوں کے کارکنوں کے قتل پر یہی نقطہ نظر تھا۔ حکومت اور حزبِ مخالف دونوں کے بیانات سے جو بات سامنے آئی، وہ یہ تھی کہ ان دونوں میں سے کوئی بھی اس بات پر متفق نہ تھی کہ اس دور کے بنگلہ دیش میں آئینی سیاست کی جا سکتی ہے۔ دونوں فریق یہ کہہ رہے تھے کہ موجودہ صورتِ حال جمہوری اور آئینی سیاست کے لیے موزوں نہیں۔

وزیرِاعظم کے اس بیان میں دو نکات خصوصی توجہ کے حامل ہیں جب کہ وہ خود نہ صرف حکومت کے منتخب سربراہ تھے بلکہ ملک میں امن و امان قائم رکھنے اور جمہوریت کے فروغ کے بھی ذمہ دار تھے۔

اوّل، انہوں نے مخالف جماعتوں کے ممبران کو ڈاکو قرار دیا۔

دوئم، انہوں نے کہا کہ ان ڈاکوؤں کو ہلاک کر دینے کا انہیں حق حاصل ہے۔ مخالف جماعت کے ممبران کو ڈاکو، دہشت گرد اور ملک دشمن عناصر قرار دینا کوئی نئی روایت نہیں ہے۔ اس کا آغاز 1947ء میں ہی ہو گیا تھا۔ 1950ء میں نورالامین کی حکومت نے مخالف تحریک کے رہنماؤں کو ''ڈاکوؤں کے سردار'' قرار دیا تھا۔ 1970ء میں جب مشرقی پاکستان کے عوام نے سیاسی رہنماؤں کو رہا کرنے کا مطالبہ کیا تو اُس وقت جنرل یحییٰ خان نے مشرقی پاکستان کے تمام سیاسی رہنماؤں اور سیاسی جماعتوں کے کارکنوں کو مجرموں کا جتھا قرار دیا اور ان کا مطالبہ ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ جب کوئی حکومت اپنے سیاسی مخالفین کو ڈاکو اور شرپسند کہنا شروع کر دیتی ہے تو اس کے خطرناک نتائج سے وزیرِاعظم بخوبی واقف تھے۔ اس بارے میں اپنے ذاتی تجربات کو نظر انداز کرتے ہوئے اور وہی غلطی خود دہراتے ہوئے شیخ مجیب الرحمٰن جمہوریت اور اصولی سیاست کی راہیں مسدود کر رہے تھے۔ اس وقت ملک کی سماجی معاشی اور سیاسی صورتِ حال اور طریقے اور ہتھکنڈے جو ان چیلنجوں کا سامنا کرنے کے لیے حکومت اور حزبِ مخالف استعمال کر رہی تھیں، صرف ایک بات کی گواہی دے رہے تھے کہ اس ملک میں جمہوری عمل اور اصولی سیاست مزید تباہی کی جانب گام زن ہے۔

119۔سول انتظامیہ کی مدد کے لیے مسلح فوج کی بادلِ نخواستہ طلبی

اپریل 1973ء میں ایک بڑے نازک اور تباہ کن موڑ پر بے سہارا حکومت ایک مرتبہ پھر ناجائز ہتھیاروں کی بازیافت اور ملک میں امن و امان کے قیام کے لیے سول انتظامیہ کی مدد کے لیے فوج طلب کرنے پر مجبور ہوگئی جب کہ سول انتظامیہ ناکام ہو چکی تھی۔ اس وقت کرنل نجم الھدیٰ بریگیڈ کمانڈر تھے۔ وہ اگرتلہ سازش کیس کے ملزمان میں سے ایک تھے اور مجیب الرحمٰن کے اندھے مقلدین میں سے تھے۔ لیکن وہ اپنے انتہائی سیاسی شعور کی وجہ سے اپنی ذاتی وفاداری اور ضمیر کے درمیان کشمکش سے پریشان بھی تھے۔ جنگ آزادی کے دوران ہم ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے تھے۔ اتنے نزدیک تھے کہ ہم سیاست پر کھلم کھلا اور بلاتردّد گفتگو کیا کرتے تھے۔ ہم اکثر اوقات مختلف قومی معاملات پر بغیر کسی اخفا کے تبادلہ خیال کرتے تھے۔ بعض اوقات کرنل ہدیٰ میری کھلم کھلا اور سیدھی باتوں سے خوف زدہ ہو جاتے اور کہتے:

''دیکھو دالیم! اسے ایک بھائی کا مشورہ سمجھو، دوسرں کے ساتھ بات چیت کرتے ہوئے تمہیں بہت محتاط رہنا چاہیے۔ تمہاری یہ کھلم کھلا اور سیدھی گفتگو کسی دن تمہیں مصیبت میں بھی ڈال سکتی ہے۔''

میں ان کے خلوص کو ہمیشہ عزت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ ایک دن کارروائی کے احکام ملنے کے بعد میں نے کرنل ہدیٰ کو 1972ء کے تلخ تجربے کے بارے میں یاد کرایا۔ تاہم وہ خود بھی اس افسوس ناک واقعہ سے آگاہ تھے۔ فیصلہ کیا گیا کہ سی او اے ایس کو یہاں آنے کی دعوت دی جائے اور وہ مجوزہ آپریشن کے بارے میں آفیسرز کو ہدایات دیں۔ اس طرح ہمیں بھی حکومت اور وزیراعظم کے حقیقی ارادوں کو جاننے کا موقع مل سکے گا۔ آیا وزیراعظم ان تلوے چاٹنے والوں سے واقعتاً چھٹکارا چاہتے ہیں اور عوام کے مفادات کے تحفظ کے لیے ان کا ساتھ دینا چاہتے ہیں یا نہیں؟ کیا اس مرتبہ وہ اِس قسم کے مقصد کے لیے ہماری مدد چاہتے ہیں؟ ہم ان سوالات کی وضاحت سی او اے ایس سے چاہتے تھے۔ کرنل ہدیٰ نے میجر جنرل شفیع اللہ کو کومیلا آنے کی دعوت دی۔ جنرل شفیع اللہ تشریف لائے۔ کانفرنس میں ان سے سوال کیا گیا کہ کیا فوج کو دوبارہ اسی شرم ناک صورت حال کا سامنا کرنا پڑے گا جیسا کہ 1972ء میں ہو چکا تھا؟ اس کے جواب میں چیف آف آرمی سٹاف نے کہا: ''اس مرتبہ بنگو بندھو واقعی سنجیدہ ہیں۔ حتیٰ کہ ان کے مرحوم والد بھی اگر کسی جرم میں ملوث پائے جاتے ہیں تو مقدمہ چلانے کے لیے ان کی لاش بھی نکالی جاسکتی ہے۔ اس مرتبہ کوئی استثنیٰ نہیں ہوگا۔ انہوں نے مجھے ذاتی طور پر یہی بتایا ہے اور مجھے ان کی نیت پر کوئی شک نہیں ہے۔''

بہت اچھی بات تھی۔ آخرکار وزیراعظم اپنی حکومت اور جماعت کے اصل کردار سے آگاہ ہو ہی گئے تھے۔ وہ ان تلوے چاٹنے والوں کو برطرف کرتے ہوئے ان ناانصافیوں کا ازالہ کرنا چاہتے تھے جو آج تک عوام کے ساتھ ہوتی رہی تھیں۔ وہ عوام کے رہنما بننا چاہتے تھے، یہی وجہ تھی کہ انہوں نے محبِ وطن مسلح افواج سے مدد طلب کی تھی۔ ہم نے اس دن میجر جنرل شفیع اللہ سے وعدہ کیا کہ اگر یہ بات ہے تو ہم ہر قیمت پر

اس کارروائی کو کامیاب بنانے کی کوشش کریں گے۔ چیف کومیلا سے خوش گوار مزاج میں واپس گئے۔ کرنل ہدیٰ کو کومیلا نواکھلی اور سلہٹ میں آپریشن کا کمانڈر مقرر کیا گیا۔ مجھے کومیلا کا آپریشن انچارج بنایا گیا۔ سلہٹ اور نواکھلی میں بالترتیب میجر حیدر اور میجر رشید کو یہ خدمات سونپی گئیں۔ کارروائی شروع کرنے کے بعد انٹیلی جینس ایجنسیوں کی رپورٹوں سے یہ بات سامنے آئی کہ غیر قانونی ہتھیاروں کی زیادہ تعداد عوامی لیگ کے رہنماؤں اور ان کی نمائندہ تنظیموں کے پاس اور ہتھیاروں کو استعمال کرنے والے براہِ راست ان کے تحفظ میں ہیں۔ لہٰذا کیا کرنا چاہیے؟ اس مرتبہ شیخ مجیب الرحمٰن کے بارے میں کہا گیا تھا کہ وہ اپنے والد کو بھی بخشنے کے لیے تیار نہیں۔ اپنے متعلقہ علاقوں نے میں ہم نے پورے خلوص سے کارروائی کا آغاز کر دیا۔

ہم جہاں بھی جاتے ہمیں پتا چلتا کہ علاقے کے اکثر بدنام افراد، مجرم، قاتل، لٹیرے، شر پسند، اور اسلحہ بردار خود حکمران جماعت کے رہنما ہیں یا ان کا تعلق حکمران جماعت کی ذیلی تنظیموں سے ہے یا پھر ایسے بااثر افراد ہیں جن کے حکمرانوں کے ساتھ براہِ راست تعلقات ہیں۔ حکمران جماعت کے مقامی رہنماؤں اور ان کے ساتھیوں نے بھی ہمیں نام نہاد شر پسندوں کی فہرستیں دیں۔ لیکن تحقیقات کے بعد ان میں سے اکثر علاقے کے انتہائی محترم اور دیانت دار افراد ثابت ہوئے، تاہم ان میں سے زیادہ تر مخالف سیاسی جماعتوں کے حامی یا سرگرم کارکن تھے۔ ہمارا کام حقیقی شر پسندوں کو قابو کرنا تھا، ہم کسی بھی شخص یا جماعت کے طرف دار نہ تھے۔ ہمارے نزدیک سب برابر تھے۔ ہم اپنی کارروائی میں مکمل طور پر غیر جانب داری اور دیانت داری سے کام لے رہے تھے۔

ہم نے سول انتظامیہ اور قانون نافذ کرنے والی ایجنسیوں کے اشتراک سے مجرموں کو گرفتار کرنا شروع کر دیا۔ ان میں سے اکثر بڑے بڑے لوگ تھے۔ ایم پی ممتاز بیگم سے لے کر ظہیر القیوم تک کسی کو بھی بخشا نہیں گیا۔ سلہٹ، نواکھلی اور ملک کے دوسرے علاقوں میں شیخ نصیر اور حسنات جیسے بڑے مگرمچھوں، ان کے چیلے چانٹوں، سیاسی رہنماؤں، بدعنوان کاروباری اشخاص اور بااثر ٹاؤٹوں کو فوجی کارروائی کا نشانہ بنایا گیا۔ ہر جگہ ایک ہی صورتِ حال تھی۔ ہر جگہ شر پسندوں کی اکثریت کا تعلق حکمران جماعت یا حکومت کے ساتھ تھا۔

اس کارروائی کے نتیجے میں مسلح افواج حکمران اشرافیہ کے ساتھ براہِ راست ٹکراؤ کی حالت میں آ گئیں۔ فوجی کارروائی کی کامیاب داستانوں کی وجہ سے پوری قوم میں جوش و جذبے کی ایک لہر دوڑ گئی۔ عام آدمی یہ خیال کر رہا تھا کہ آخرکار شیخ صاحب نے اپنی ''چترا دل'' کو سزا دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ ہمارے آپریشن کو کامیاب بنانے کے لیے عوام پورے جوش و جذبے کے ساتھ مدد اور حمایت کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ انارکی کا فوری خاتمہ ہو گیا اور پورے ملک میں امن و امان کی صورتِ حال میں ایک نمایاں بہتری نظر آنے لگی۔ لوگوں کی امیدیں لوٹ آئیں۔ قوم جو بدنظمی کی وجہ سے بے حسی اور سرد مہری کا شکار ہو چکی تھی، دوبارہ متحرک نظر آ رہی تھی۔ اس بات کا خاص خیال رکھا گیا تھا کہ لوگوں کو صرف جائز طور پر گرفتار کیا جائے اور

ان کے ساتھ ملک کے قانون کے مطابق سلوک کیا جائے۔ اس معاملے میں کسی قسم کا امتیاز نہ برتا گیا۔ اگرچہ ہمیں مختلف حلقوں حتیٰ کہ وزیراعظم سیکریٹریٹ سے بھی شدید دباؤ کا سامنا تھا لیکن ہم اپنے ارادے میں پختہ رہے۔ کسی بھی شخص سے ترجیحی سلوک نہ کیا گیا۔ قانون سب کے لیے برابر تھا۔

حیران کن طور پر ایک دن میجر جنرل شفیع اللہ نے بریگیڈ کمانڈر کو چند گرفتار شدہ مجرموں کو رِہا کرنے کا حکم بھیجا۔ کرنل ہدیٰ نے بہت سخت جواب بھیجا کہ ان کے لیے کسی بھی گرفتار شدہ کو رِہا کرنا ممکن نہیں کیوں کہ ان کی قسمت کا فیصلہ قانون نے کرنا ہے کہ ان پر فردِ جرم عائد کی جا چکی ہے۔ علاوہ ازیں وہ قانون ہاتھ میں لینے کا کوئی حق نہیں رکھتے تھے۔ چیف آف آرمی سٹاف نے ان کا یہ جواب وزیراعظم کو بھجوا دیا۔ وزیراعظم نے کرنل ہدیٰ کو ذاتی طور پر فون کیا، جنہوں نے بڑی معذرت کے ساتھ وزیراعظم کی خدمت میں درخواست کی کہ وہ اپنے پرسنل سیکریٹری طفیل احمد کو چیف کے ہمراہ موقع پر تحقیقات کے لیے بھجوا دیں۔ انہوں نے وزیراعظم سے یہ بھی کہا کہ اگر تحقیقات کے ذریعے یہ ثابت ہو جائے کہ فوج نے اپنے دائرہ کار سے باہر نکلتے ہوئے کوئی عمل کیا ہے یا قانون کی خلاف ورزی کی ہے تو پھر وزیراعظم کو مکمل اختیار ہوگا کہ جس قسم کی چاہیں سزا دیں اور وہ آپریشن کمانڈر کی حیثیت سے کسی بھی سزا کو قبول کرنے کے لیے تیار ہوں گے۔ اس دن میں ان کے کردار کی مضبوطی اور مقصد کے ساتھ خلوص پر بہت متاثر ہوا۔ میں یہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ کرنل ہدیٰ، شیخ مجیب الرحمٰن سے، جس کے وہ اندھوں کی طرح وفادار تھے، اس قسم کی گفتگو کر سکتے ہیں۔ وزیراعظم کسی شخص کو تحقیقات کے لیے بھجوانے پر رضامند ہو گئے۔

اسی دن ڈپٹی چیف آف آرمی سٹاف میجر جنرل ضیاالرحمٰن ہیلی کاپٹر کے ذریعے ڈھاکہ سے کومیلا پہنچے۔ مسٹر تاج الدین احمد کو میجر جنرل ضیاالرحمٰن کے ساتھ آنے پر رضامند نہ کیا جا سکا کیوں کہ تاج الدین اچھی طرح جانتے تھے کہ اگر وہ گئے تو وہ اس حقیقت کو پوری طرح تسلیم کرتے ہوئے واپس آئیں گے کہ ماخوذ افراد کے خلاف لیے گئے تمام اقدامات درست اور قانونی ہیں۔ میجر جنرل ضیاالرحمٰن کے پہنچنے کے بعد کومیلا اور دوسرے اضلاع سے عوامی لیگ کے تمام رہنماؤں کو کومیلا چھاؤنی میں ملاقات کے لیے بلایا گیا۔ وہاں ایریا کمانڈروں نے اپنے اپنے علاقوں سے گرفتار کیے جانے والے ہر شخص کے بارے میں تفصیلی معلومات بیان کیں اور ان پر لگائے گئے الزامات اور جن حالات میں انہیں گرفتار کیا گیا، دستاویزی ثبوتوں کے ساتھ تفصیلاً بیان کیے۔ کوئی بھی رہنما جو وہاں موجود تھا، کسی ایک کیس کو بھی جھٹلا نہیں سکا اور نہ ہی انہوں نے کہا کہ فوج نے زبردستی یا زیادتی سے کام لیا تھا۔

میجر جنرل ضیاالرحمٰن نے مشورہ دیا کہ کرنل ہدیٰ اور میں ان کے ساتھ ڈھاکہ جائیں اور وزیراعظم کو آپریشن کی تفصیلات سے آگاہ کریں۔ ہم اُسی ہیلی کاپٹر میں ڈھاکہ آئے۔ آرمی ہیڈکوارٹرز سے میجر جنرل شفیع اللہ بھی ہمارے ساتھ شامل ہو گئے۔ وزیراعظم سے ملاقات کے انتظامات پہلے ہی ان کی رہائش گاہ روڈ نمبر 32 میں کر لیے گئے تھے۔ وہاں پہنچنے پر ہمیں علم ہوا کہ وزیراعظم اور ان کے پولیٹیکل سیکریٹری

مسٹر طفیل احمد بڑی بے چینی سے ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔ جیسے ہی ہم اندر داخل ہوئے شیخ مجیب الرحمٰن کرنل ہدیٰ اور مجھے دیکھ کر گرج پڑے، ''تم اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہو؟ کیا عوامی لیگیوں کے علاوہ ملک میں کوئی اور شر پسند نہیں ہیں؟ کیا تمہیں جے ایس ڈی یا سربہار اپارٹی کے لوگ نظر نہیں آتے؟''

وزیر اعظم جو کچھ کہہ رہے تھے ہم اس پر بہت حیران ہوئے۔

کرنل ہدیٰ نے جواب دیا، ''سر ہم نے یہ کارروائی آپ کے حکم پر حقیقی مجرموں اور شر پسندوں کو پکڑنے کے لیے کی تھی۔ ہم غیر جانب دار ہیں، ہر کوئی ہمارے لیے برابر ہے۔ انٹیلی جینس ایجنسیوں کی دی گئی اطلاعات اور معلومات کی بنیاد پر اور اس کی تصدیق حاصل کرنے کے بعد ہم نے ہر فرد کو واضح الزامات کے تحت گرفتار کیا ہے۔ اگر وہ سارے عوامی لیگی ہیں تو سر ہم کیا کر سکتے ہیں؟''

پھر مسٹر طفیل احمد نے چند ایک نام پڑھے اور ان کو فوری طور پر رہا کرنے کا مطالبہ کیا۔ ان کے مطالبے کو دہراتے ہوئے شیخ مجیب الرحمٰن نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا، ''ٹھیک ہے جو بھی معاملہ ہے، اب ان کی فوری رہائی کا بندوبست کیا جائے۔''

''ہم کسی کو پکڑنے یا چھوڑنے والے کون ہیں؟ ہم نے تو صرف ان احکامات پر عمل کیا ہے جو ہمیں مجاز حکام کی جانب سے ملے تھے۔ اس کارروائی کا آپ ہی نے حکم دیا تھا اور شاید یہ آپ ہی ہیں جو حکومت کے سربراہ ہونے کی حیثیت سے گرفتار شدگان کو آزاد بھی کر سکتے ہیں۔ اگر آپ اِن کی رہائی کو جائز اور قانونی سمجھتے ہیں تو برائے مہربانی قانون نافذ کرنے والی متعلقہ ایجنسیوں کو احکامات جاری فرما دیں۔ میں یا ہم میں سے کوئی شخص کس طرح ان کو قانونی حراست سے رہائی دلوا سکتا ہے؟ یہ معاملہ اب ہمارے ہاتھوں میں نہیں ہے۔ اب وہ ملک کے قانون کے تحت ہیں۔ ان تمام افراد کو مجاز حکام کے سپرد کر دیا گیا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

کچھ دیر کے لیے وزیر اعظم گُنگ ہو گئے۔ پھر انہوں نے میجر جنرل شفیع اللہ کی جانب دیکھتے ہوئے کہا، ''میرے بیٹے، تم ہی کچھ کرو ورنہ عوامی لیگ ختم ہو جائے گی۔''

جیسا کہ وزیر اعظم نے انہیں ''میرے بیٹے'' کہہ کر مخاطب کیا تھا، وہ اپنی سیٹ سے اٹھے اور بڑی عاجزی سے عرض کیا، ''بنگلہ بندھو، پریشان نہ ہوں، میں یقیناً کچھ کروں گا۔ آپ مجھ پر بھروسا کر سکتے ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ دوبارہ اپنے صوفے میں دھنس گئے۔ ہم خاموشی سے چیف آف آرمی سٹاف کے اس نامناسب رویے کو دیکھتے رہے۔

اس دوران مسٹر طفیل احمد نے وزیر اعظم کے کان میں کوئی سرگوشی کی۔ جب انہوں نے بات ختم کر لی تو وزیر اعظم طیش میں آ گئے اور مطالبہ کیا، ''کومیلا میں کیپٹن جی، کیپٹن ہدیٰ اور لیفٹیننٹ طیب اور سلہٹ میں کیپٹن ظہیر کو ضرور سزا ملنی چاہیے۔ انہوں نے قیدیوں پر وحشیانہ تشدد کیا ہے۔'' یہ بات کرنل ہدیٰ کو کہی گئی تھی۔

''سر وہ ماتحت آفیسرز ہیں۔ انہوں نے جو بھی کیا ہے، وہ احکامات ملنے پر ہی کیا ہے۔ تشدد کا الزام بے بنیاد ہے۔ تاہم اگر آپ کسی کو سزا دینا چاہتے ہیں تو کومیلا کا مجموعی کمانڈر ہونے کی حیثیت سے میں ذمہ دار ہوں۔ اگر آپ میرے ماتحت آفیسرز کو سزا دینے کا فیصلہ کرتے ہیں، تو پھر یہ میرے لیے باعث شرم بات ہوگی اور میرے لیے فوج کو کمانڈ کرنے کے لیے واپس جانا مشکل ہو جائے گا۔''

وزیر اعظم کرنل ہدیٰ کی جانب سے اس قسم کے غیر متوقع جواب پر ششدر رہ گئے۔

اچانک وزیر اعظم اٹھ کھڑے ہوئے اور کہا، ''ٹھیک ہے آج کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ آپ سب جا سکتے ہیں۔'' پھر انہوں نے مجھے دیکھ کر کہا، ''دالیم، آپ رات کے کھانے کے لیے رُک جائیں۔''

لہٰذا میں وہیں رُکا رہا اور باقی لوگ چلے گئے۔ میں سمجھ گیا تھا کہ وزیر اعظم مجھے اعتماد میں لے کر کوئی بات کرنا چاہتے ہیں۔ مسٹر طفیل احمد بھی دوسرے افراد کے ساتھ جا چکے تھے۔ شیخ صاحب اور میں گھر کے اندر چلے گئے۔ یہ رات کے تقریباً گیارہ بجے کا وقت تھا۔ کھانا معمول کے مطابق اندرونی برآمدے میں لگایا گیا۔ ہم دونوں کھانے کے لیے بیٹھ گئے۔ کھانا کھاتے ہوئے شیخ مجیب الرحمٰن نے کہا، ''عوامی لیگیوں کے ساتھ یہ سب کچھ کیسے ہو گیا جب کہ تم کومیلا میں موجود تھے؟''

''چچا آپ یقین کریں ہم نے کارروائی جو بھی کی بغیر کسی تعصب یا جانب داری کے شروع کی۔ چیف نے کارروائی سے پہلے کومیلا کا دورہ کیا اور کہا کہ آپ نے انہیں کہا تھا کہ اگر آپ کے مرحوم والد بھی مجرم ثابت ہوں، انہیں بھی اس مرتبہ معاف نہیں کیا جائے گا۔ ہم نے اس کے مطابق کام کیا ہے۔ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ کومیلا تشریف لائیں اور دیکھیں کہ عوام کس قدر خوش ہیں۔ وہ ہر مسجد میں آپ کے لیے خصوصی دعائیں کروا رہے ہیں۔ ہر شخص سمجھ رہا ہے کہ اس مرتبہ آپ حقیقت میں کچھ کرنا چاہتے ہیں اور آپ چتر ادل کو درست کرنا چاہتے ہیں۔ اس قسم کی صورتِ حال ہے۔ قوم کے رہنما کے طور پر آپ کو عوام کے جذبات کو ترجیح دینا چاہیے۔ میرا خیال ہے کہ اس کارروائی کے بعد آپ کی مقبولیت میں دوبارہ اضافہ ہو گیا ہے۔ اب اگر سیاسی وجوہات کی بنا پر مجرموں کو چھوڑتے ہیں تو کیا یہ آپ کے لیے فائدہ مند ہو سکے گا؟ میرا خیال ہے کہ آپ اپنا مزید نقصان کریں گے۔ آپ کے مشیر کچھ بھی کہہ سکتے ہیں، لیکن میرے خیال میں بغیر مقدمہ چلائے ان لوگوں کو رہا کرنا درست نہیں ہوگا۔ اس قسم کے فیصلے سے آپ کی ذات پر گہرا منفی اثر پڑے گا۔''

''لیکن پھر اپنی پارٹی کے بغیر میں کیسے حکومت چلا سکوں گا؟'' انہوں نے سوال کیا۔

''ظاہر ہے آپ کو پارٹی کی ضرورت ہے۔ آپ اسے صفائی کی مہم کیوں خیال نہیں کر سکتے؟ رہنما کو ہمیشہ یہ کوشش کرنا چاہیے کہ پارٹی اچھے اور دیانت دار لوگوں پر مشتمل ہو، شر پسندوں اور بُرے لوگوں کو نکالتے رہنا چاہیے۔ برائے مہربانی چچا، بات کا بُرا مت مانیے گا، کیا آپ موزوں خیال کرتے ہیں کہ آپ کو چوروں، لٹیروں، شر پسندوں اور ٹھگوں کا لیڈر خیال کیا جائے؟ یہ درست ہے کہ اب تک پکڑے جانے والے زیادہ تر افراد عوامی لیگی ہیں۔ اس سے یہ بات خود بخود ثابت ہوتی ہے کہ آپ کی پارٹی بدعنوان عناصر سے

بھری ہوئی ہے۔انہیں نکال دیں اور پھر دیکھیں کہ عوام سے آپ کو کس قدر حمایت حاصل ہوتی ہے۔''

شیخ صاحب تندمزاج کے ساتھ خاموشی سے میری باتیں سنتے رہے۔اچانک انہوں نے خاموشی کو توڑا،''ٹھیک ہے، میں نام نہاد بنگالی جناگون کو اچھی طرح جانتا ہوں۔''میری سمجھ میں نہ آسکا کہ اس سے اُن کی کیا مراد تھی۔ہم نے کھانا ختم کیا۔وہ اپنی خواب گاہ میں چلے گئے۔

جب میں روانگی کی تیاری کررہا تھا کہیں سے شیخ کمال آن ٹپکا اور مجھے دیکھ کر کہنے لگا''باس،تم نے عوامی لیگ کو تقریباً ختم کردیا ہے، یہ اچھی بات نہیں ہے۔''

''اگر تمام بدعنوان عناصر عوامی لیگی ہیں تو اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

بات کو مزید طول دیے بغیر میں وہاں سے نکل آیا۔یہ ایک تھکا دینے والا دن تھا اور میں بہت زیادہ تھک چکا تھا۔ جب میں مالی باغ میں اپنے گھر پہنچا تو میرے ابا ابھی تک جاگ رہے تھے اور میرا انتظار کررہے تھے۔میں سمجھ گیا کہ نمی نے کومیلا سے فون کرکے میری ڈھاکہ آمد کا انہیں بتادیا ہوگا۔ابا نے پوچھا کہ کیا ہوا ہے؟ میں نے ہر بات بیان کردی۔تمام بات سن کر انہوں نے کہا،''تم کیا سمجھتے ہو؟ کیا تم حقیقت میں یہ یقین رکھتے ہو کہ شیخ مجیب الرحمٰن نے شرپسندوں کو پکڑنے کے لیے فوج کی مدد حاصل کی تھی؟ میں انہیں بڑے قریب سے جانتا ہوں۔جب میں ایس ایم ہال میں جنرل سیکریٹری تھا، ہم نے مسلم لیگ کی سیاست مل کرکی تھی۔ان کے کوئی اصول نہیں ہیں۔انہوں نے ہمیشہ اپنے مقاصد داؤ پیچ اور سازشوں سے حاصل کیے ہیں، بعض اوقات لاٹھی کے زور پر اپنی باتیں منوائی ہیں۔وہ ایک بہت بڑے موقع پرست انسان ہیں۔جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں، وہ ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہتے ہیں۔ایک جانب وہ موجودہ حکومت مخالف تحریک، خاص طور پر جے ایس ڈی اور سربہارا پارٹی کی گوشمالی کرنا چاہتے ہیں، دوسری جانب فوج اور عوام کے درمیان مخاصمت پیدا کرکے مسلح افواج کا تاثر ایک استبدادی قوت کے طور پر پیش کرنا چاہتے ہیں۔لیکن تم لوگوں نے جان بوجھ کر یا انجانے میں ان کے منصوبے کو ناکام بنادیا ہے۔دیکھو اب وہ کیا کرتے ہیں؟ مجھے تمہاری فکر ہے۔میں محض دعا کرسکتا ہوں کہ تمہیں نشانہ نہ بنایا جائے۔''

میرے پاس جواب میں کہنے کے لیے کچھ نہ تھا۔وہ کس حد تک درست تھے، یہ صرف آنے والا وقت ہی بتاسکتا تھا۔

ابا نے مجھے تھکا ہوا دیکھ کر کہا،''نمی کو فون کرلو اور سوجاؤ۔'' جانے سے پہلے انہوں نے کہا،''مجیب کو بہت زیادہ بڑا مت خیال کرو، وہ محض ایک عام آدمی ہے۔''

اگلی صبح میجر جنرل شفیع اللہ نے مجھے فون کیا اور ہیڈ کوارٹرز میں ملنے کو کہا۔وہاں میں نے کرنل ہدیٰ کو بھی دیکھا، جنہوں نے بتایا،''ان تمام افراد کو رِہا کرنے کے لیے چیف ہمارے ساتھ کومیلا جائیں گے۔''میں پوری طرح مایوس ہوگیا۔کرنل ہدیٰ بھی مایوسی کے عالم اس ساری صورتِ حال سے جلے بھنے بیٹھے تھے۔کیپٹن نور اس وقت میجر جنرل ضیاالرحمٰن کے اے ڈی سی تھے۔

میں اُن کے کمرے میں گیا اور کہا: ''میں اسی وقت باس سے ملنا چاہتا ہوں۔''

کیپٹن نور اندر گئے اور میجر جنرل ضیا الرحمٰن کو میرے بارے میں بتایا۔ مجھے فوراً اندر بلا لیا گیا۔ میں نے اُن کو بھی بہت رنجیدہ پایا۔ ''ہاں، میں سب کچھ جانتا ہوں۔ دلبرداشتہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اوپر خدا سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ تم نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے۔ باقی کے بارے میں بھول جاؤ۔''

ہم دوبارہ ہیلی کوپٹر کے ذریعے چیف کے ساتھ کومیلا واپس پہنچے، چیف نے ان افراد کو، جو گرفتار کیے گئے تھے، ذاتی طور پر رِہا کیا۔ ہماری آنکھوں کے سامنے وہ فتح کے نشے میں شیخ مجیب کی شان میں نعرے بازی کرتے ہوئے چلے گئے۔ ہمیں سب کچھ مجبوراً برداشت کرنا پڑا۔

ڈھاکہ جانے سے قبل میجر جنرل شفیع اللہ نے ہمیں کہا، ''وزیرِ اعظم کی خواہش ایک حکم ہے۔''

اس واقعہ نے پورے ملک میں فوج کو مایوس کر دیا تھا۔ یہ افواہ بھی سننے میں آ رہی تھی کہ شیخ مجیب فوجی کارروائی کو روکنے کا جلد ہی حکم دینے والے ہیں۔ اس کے بعد بظاہر تو ہم اپنے کام پر موجود رہے لیکن کارروائیوں میں کسی قسم کی دلچسپی لینا یا اقدامات اٹھانا بند کر دیئے۔ ہم محض وقت گزاری سے کام لے رہے تھے۔

120۔ جنرل ضیا کو فوج سے نکالنے کی سازش

انہی دنوں میں مجھے کیپٹن نور کا فون آیا، انہوں نے مجھے بتایا کہ میجر جنرل ضیا الرحمٰن فوری طور پر مجھے ملنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے مزید بتایا کہ میں ان کے دفتر نہ آؤں بلکہ اُن کے گھر پر اُن سے ملاقات کروں۔ مجھے محسوس ہو گیا کہ کوئی سنجیدہ معاملہ اٹھ کھڑا ہوا ہے۔ وہ عام طور پر کسی اہم اور سنجیدہ معاملے پر بات چیت کرنے کے لیے مجھے اپنے گھر بلایا کرتے تھے۔ میں ان سے ملاقات کے لیے ڈھاکہ روانہ ہو گیا۔ شروع میں ہم نے ملک کی مجموعی صورتِ حال پر بات چیت کی پھر ہم اصل موضوع کی جانب آئے۔ انہوں نے کہا، ''میں نے سنا ہے مجھے فوج سے باہر ڈیفنس اتاشی کے طور پر برما بھیجا جا رہا ہے۔ کیا تم نے کچھ سنا ہے؟''

وہ جو کچھ کہہ رہے تھے وہ سن کر مجھے شدید جھٹکا پہنچا۔ شیخ مجیب نے خود انہیں اگلا چیف آف سٹاف بنانے کا وعدہ کیا تھا۔ میں نے جواب دیا، ''مجھے اس معاملے کے بارے میں کچھ علم نہیں ہے۔ لیکن جو بھی ہو جائے آپ کہیں نہیں جا رہے ہے۔ اس مرحلے پر ہم آپ کا جانا برداشت نہیں کر سکتے۔''

''ٹھیک ہے پھر اس بارے میں کچھ کرنے کی کوشش کرو۔'' میجر جنرل ضیا نے مجھے تاکید کی۔

''ظاہر ہے سر! میں اس بارے میں کوشش کروں گا۔ میں آج ہی وزیرِ اعظم سے ملاقات کروں گا۔'' میں نے کہا۔

''جو بھی ہو مجھے ضرور آگاہ کر دینا۔'' میجر جنرل ضیا نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے سر۔'' میں نے انہیں یقین دلایا اور ان کی رہائش گاہ سے باہر آ گیا۔

اسی رات میں روڈ نمبر 32 گیا۔ ابھی تک شیخ صاحب واپس نہیں آئے تھے۔ میں وقت گزاری

کے لیے شیخ ریحانہ اور شیخ جمال سے باتیں کرنے لگا۔ باتوں باتوں میں جمال نے مجھے بتایا کہ وہ جلد ہی فوج کے آفیسر کے طور پر تربیتی کورس کے لیے سینڈھرسٹ یا یوگوسلاویہ جا رہا ہے۔ یہ سن کر میں نے کہا، ''یہ اچھی خبر ہے۔ تمہیں اس پر غور کرنا چاہیے، اپنے مستقبل کے لیے فوج کے انتخاب میں کوئی قباحت نہیں ہے۔''

تھوڑی دیر بعد کہیں سے شیخ کمال نمودار ہو گیا۔ مجھے دیکھ کر اس نے پوچھا، ''کیسے آنا ہوا؟''

''شاید کوئی بھی شخص بغیر کسی مقصد کے روڈ نمبر 32 نہیں آتا، کیا یہ بات نہیں؟'' میرے جوابی سوال پر کمال کسی حد تک گھبرایا۔

''نہیں، میرا مطلب یہ تھا کہ زیادہ تر لوگ کسی مقصد کے تحت ہی آتے ہیں لیکن استثنیٰ بہرحال موجود ہوتا ہے، جیسا کہ تم۔ تم صرف ابا سے جھگڑا کرنے کے لیے آتے ہو۔'' کمال نے کہا۔ میں نے جواب دیا، ''جو کوئی کسی کا بھلا چاہتا ہے، اسے بحث کا حق بھی حاصل ہوتا ہے۔''

''بالکل، ہم اس بات کو سمجھتے ہیں۔ باس اب مجھے ایک مشورہ دیں۔'' شیخ کمال نے کہا۔

''کس بارے میں؟'' میں نے پوچھا۔

''کینیڈا میں قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے مجھے سکالرشپ ملی ہے۔ میں مخمصے میں ہوں کہ کیا کیا جائے۔ مجھے جانا چاہیے یا نہیں؟'' کمال نے پوچھا۔

''اگر تم میری رائے لینا چاہتے ہو تو کینیڈا جانا ایک اچھا فیصلہ ہو گا۔ ہمارے پیارے نبیؐ نے فرمایا ہے کہ علم حاصل کرنے کے لیے اگر ضروری ہو تو چین بھی جاؤ۔ اس کے علاوہ یہ دو یا تین سال کا معاملہ ہو گا۔ وقت اُڑ کر گزر جائے گا۔ اگر مجھے ایسا موقع ملتا تو میں ضرور اسے قابو کرتا۔'' میرا مشورہ سننے کے بعد اس نے کہا، ''تو آپ کا خیال ہے کہ مجھے اس پیشکش کو قبول کر لینا چاہیے۔''

''بالکل درست، تمہیں اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔'' میں نے جواب دیا۔ اس وقت کوئی شخص کمال کو ڈھونڈتا ہوا وہاں آیا اور اُسے ساتھ لے گیا۔

شیخ مجیب الرحمٰن دیر سے گھر آئے۔ تھوڑی دیر بعد مجھے بلا لیا گیا۔

''کافی وقت ہو گیا ہے۔ تم کیسے آئے اور کیا معاملہ ہے؟'' شیخ صاحب نے بات کا آغاز کیا۔

''میں سرکاری فرائض کی ادائیگی کے لیے یہاں آیا تھا۔ لہٰذا آپ کو سلام کرنے کے لیے بھی حاضر ہو گیا۔'' میں نے کہا۔ وہ اپنا پائپ پی رہے تھے۔

''چچا، کیا یہ درست ہے کہ آپ نے میجر جنرل ضیا الرحمٰن کو ڈیفنس اتاشی کے طور پر برما بھیجنے کا فیصلہ کیا ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''ابھی تک فیصلہ نہیں کیا۔ لیکن کسی کو تو برما بھیجنا پڑے گا۔ شفیع اللہ نے مجھے بتایا تھا کہ ضیا الرحمٰن انٹیلی جینس کے کام کا تجربہ رکھتے ہیں۔'' میں نے یہ کہتے ہوئے بات کاٹی، ''بہت سے دوسرے آفیسرز بھی موجود ہیں جو انٹیلی جینس کے میدان میں مہارت رکھتے ہیں۔ میجر جنرل ضیا الرحمٰن اس عہدے کے لیے بہت

زیادہ سینئر ہیں۔اس کے علاوہ اگر آپ ان کو فوج سے باہر بھیج دیتے ہیں تو ہر کوئی سوچے گا کہ آپ اپنے گزشتہ وعدے پر قائم نہیں رہے اور اسی لیے کینہ پروری کے طور پر انہیں فوج سے نکال رہے ہیں۔آپ کے لیے یہ بات پریشانی کا باعث بنے گی۔فوج میں پہلے بھی مخصوص وجوہات کی بنا پر جن سے آپ بخوبی آگاہ ہیں، ایک خفگی کی فضا پائی جاتی ہے۔اب ایسا کوئی فیصلہ محض جلتی پر تیل کا کام کرے گا اور یہ لاوا پھٹ سکتا ہے۔کیا یہ حکومت کے لیے بہتر ہوگا؟''

شیخ صاحب اپنا پائپ پیتے ہوئے بڑی توجہ سے میری باتیں سن رہے تھے۔انہوں نے ایک لفظ بھی نہ کہا۔اچانک انہوں نے موضوع بدل دیا۔

''چلو اپنی سناؤ، کیسی گزر رہی ہے؟''

''آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔''میں نے جواب دیا۔

''تم ایک بات نہیں سمجھ سکتے۔پارٹی کی سیاست میں کوئی بھی شخص ہر وقت معقول نہیں رہ سکتا۔ تمہیں میری صورتِ حال کی سمجھ ہونا چاہیے۔مجھے ملکی معاملات چلانے کے ساتھ ساتھ اپنی پارٹی کا خیال بھی رکھنا ہوتا ہے۔''شیخ صاحب نے کہا۔

''چچا میں کوئی سیاست دان نہیں ہوں۔پارٹی سیاست کے حوالے سے آپ کا تجربہ بہت زیادہ ہے۔مجھے اس بارے میں کوئی علم نہیں، لیکن اس کے باوجود میں خیال کرتا ہوں کہ قدیم فلسفیانہ مقولے میں اب بھی کچھ نہ کچھ معقولیت پائی جاتی ہے۔''

''تم کس مقولے کا حوالہ دے رہے ہو؟''شیخ صاحب نے سوال کیا۔

''یہی کہ پارٹی فرد سے بلند تر ہوتی ہے اور ملک پارٹی سے بھی بالا ہوتا ہے۔''اُن کے پرسکون مزاج کو دیکھ کر میں نے بات کرنے کی جرأت کر ڈالی۔

''کیا تمہیں ضیا نے بھیجا ہے؟''وہ پرانے موضوع کی جانب پلٹ آئے۔

''مجھے ضیا نے کیوں بھیجنا تھا۔آپ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا، لہٰذا اس افواہ کو سننے کے بعد میں حقیقت جاننے کے لیے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔''میں نے جواب دیا،''اگر مجھ سے کوئی غلطی ہوگئی ہو تو برائے مہربانی معاف کر دیں۔''میں نے مزید عرض کیا۔

''نہیں کوئی ایسی بات نہیں ہے۔اب تم جا سکتے ہو۔میرے کچھ مزید مہمان آنے والے ہیں۔'' شیخ مجیب الرحمٰن نے کہا اور ان سے اجازت لینے کے بعد میں باہر آ گیا۔

دوسرے دن میں نے وزیر اعظم کے ساتھ ہونے والی ساری گفتگو میجر جنرل ضیاالرحمٰن کے گوش گزار کی اور واپس کومیلا آ گیا۔

یہ ہماری ملاقات کا اثر تھا یا کوئی اور وجہ تھی، بہر حال جو بھی تھا، جنرل ضیاالرحمٰن کو برما نہ بھیجا گیا۔ ان کی بجائے کرنل نورالاسلام شیشو کو بھجوا دیا گیا۔وہ اس تقرری پر بہت زیادہ خوش تھا۔اس کی خوشی کی ایک بڑی

واضح وجہ تھی۔ جنگ آزادی کے دوران کیپٹن شیشو نے دل کا مریض ہونے کی وجہ سے میدانِ جنگ سے نکل کر مجیب نگر ہیڈکوارٹرز میں شمولیت اختیار کر لی تھی۔ آزادی کے بعد ایک دن اچانک کیپٹن اسلام 27 منٹو روڈ ہیڈکوارٹرز سے اچانک غائب ہو گیا۔ تیسرے دن جب وہ واپس نہ آیا تو جنرل عثمانی بہت غصے میں آ گئے۔ انہوں نے کیپٹن صلاح الدین کو، جو اس وقت آرمی انٹیلی جینس کے انچارج تھے، بھگوڑے کیپٹن نورالاسلام شیشو کو ڈھونڈنے کا حکم دیا۔ ہمیں معلوم تھا کہ شیشو بھائی ملازمت میں دلچسپی نہیں رکھتا۔ لیکن اس مرحلے پر جنرل عثمانی اسے چھوڑ نہیں رہے تھے، یہی وجہ تھی کہ کیپٹن اسلام کو بھاگنا پڑا۔ تاہم اس کو ہیڈکوارٹرز میں دوبارہ شمولیت کے لیے مجبور کر دیا گیا۔ یہی نورالاسلام شیشو بعد میں فوج میں کرنل کے عہدے پر جا پہنچا اور ''بنگلہ دیش کے راسپوٹین'' کے نام سے شہرت حاصل کی۔

ہم سب جنرل ضیاالرحمٰن کو باہر بھیجنے کے اس حکومتی ارادے پر پریشان ہو گئے تھے۔ اگرچہ اس مرتبہ وہ بچ نکلے تھے لیکن یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ حکومت فوج میں سے محب وطن اور قوم پرست عناصر کو کمزور کرنے کا تہیہ کر چکی ہے۔ ہم پہلے ہی کرنل ضیاالدین، کرنل طاہر اور میجر جلیل جیسے افراد کو کھو چکے تھے۔ اب پورا امکان تھا کہ میجر جنرل ضیاالرحمٰن اور دوسرے افراد کو بہانوں بہانوں سے فارغ کر دیا جائے گا۔ ہم نے اس مسئلے پر آپس میں بحث مباحثہ کیا اور مختلف سیاسی حلقوں اور ہم خیال افراد سے بھی تبادلہ خیال کیا۔ تقریباً ہر ایک کی یہی رائے تھی کہ کوئی بھی محب وطن، قوم پرست اور کھل کر بات کرنے والا افسر فوج میں نہیں رہنے دیا جائے گا۔ انہیں کسی نہ کسی بہانے نکال دیا جائے گا۔ صرف ان افسروں کو رہنے دیا جائے گا جو شیخ مجیب الرحمٰن اور بکسال کے ساتھ ذاتی ہمدردیاں اور وفاداریاں ثابت کریں گے۔ اور پھر ایک مناسب وقت پر فوج کو جے آر بی میں مدغم کر دیا جائے گا اور منصوبے کے مطابق یہ قومی فوج بنا دی جائے گی۔ حکومت کے تمام اقدامات اسی جانب پیش قدمی کی گواہی دے رہے تھے۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ ہم اس سلسلے میں جس قدر ممکن ہو سکا معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہیں گے اور حکومت کی ہر کارروائی کا بغور مشاہدہ کرتے رہیں گے۔

121۔ شیخ کمال کی آمد

تقریباً دو ماہ بعد ایک رات اچانک شیخ کمال شہان اور طارق کے ہمراہ کومیلا کینٹ میں میرے گھر آ گیا، شہان اور طارق دونوں کمال کے قریبی دوست تھے۔ رات کے تقریباً 10 بجے تھے، میں اس عجیب وقت پر بغیر کسی پیشگی اطلاع کے شیخ کمال کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ''باس، آپ کو اور نمی کو اس وقت تکلیف دینے پر ہم معافی چاہتے ہیں۔ ہم یہاں محفوظ اور آرام دہ ماحول میں رات بسر کرنے کے لیے آئے ہیں۔ ہم پارٹی کے کسی کام کے لیے صبح ڈھاکہ سے یہاں پہنچے تھے۔ وہ کام ابھی ابھی ختم ہوا ہے۔ آج کل کسی پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ بھلے دن بیت چکے ہیں۔ للہٰذا ہم نے شہر میں کہیں رہنے کی بجائے تمہارے پاس آنے کا فیصلہ کیا۔'' کمال نے وضاحت پیش کی۔ میں اور نمی، شہان اور طارق کو اچھی طرح جانتے تھے، للہٰذا پریشانی کی کوئی بات

نہیں تھی۔

''ٹھیک ہے کوئی ایسی بات نہیں۔ مجھے علم ہے کہ آج شہر میں کچھ فائرنگ وغیرہ کے واقعات ہوئے ہیں۔''میں نے استفسار کیا۔

''نہیں کوئی ایسی تشویش ناک بات نہیں ہے۔ یہ محض طاقت کا کوئی مظاہرہ تھا، اور کچھ نہیں۔''اس نے کہا۔

اس دوران نمی کچن میں گئی اور کچھ کھانے پینے کا انتظام کر کے آئی اور کہا،''مجھے آپ کے چہروں سے نظر آ رہا ہے کہ آپ سب بھوکے ہیں۔ آئیے کچھ کھا پی لیں، کھانا تیار ہے۔ پہلے کھانا کھا لیں۔ باتوں کے لیے ساری رات پڑی ہے۔''

''نمی تم عظیم ہو!''کمال نے کہا۔

سب نے ہاتھ دھوئے اور کھانے کے لیے بیٹھ گئے۔ ہمارے آپس میں اتنے قریبی تعلقات تھے کہ تکلف کی کوئی بات نہ تھی۔ اچانک شہان نے خبر سنائی۔''دالیم بھائی، کمال شادی کر رہا ہے۔''

''کیا یہ سچ کہہ رہا ہے؟ اتنا اچانک کیوں؟''میں نے پوچھا۔

''نہیں، کوئی خاص بات نہیں ہے۔''کمال نے زیرِ لب جواب دیا۔

''سب یہ چاہتے تھے اور میں نے محض ہاں کر دی ہے، بس اتنی سی بات ہے۔''

''تمہاری سکالرشپ کا کیا ہوا؟ کیا تم اپنی بیوی کو ساتھ لے کر جاؤ گے؟''میں نے پوچھا۔

''میں نہیں جا سکتا، باس، اب مزید پڑھنے کے لیے کوئی وقت نہیں ہے۔'' یہ کہتے ہوئے کمال نے اپنا کالر اوپر اٹھا کر فخریہ انداز میں کہا،''میں مستقبل کا وزیرِ اعظم ہوں، میرے کرنے کو بہت کچھ ہے۔''

''میں یہ بات سمجھتا ہوں، لیکن علم کے لیے کوئی شارٹ کٹ نہیں ہوتا۔ یہ محض تین یا چار سال کا معاملہ ہے۔ اگر تم چلے گئے ہوتے اور اپنی ڈگری حاصل کر لیتے تو ہم مستقبل میں تعلیم یافتہ وزیرِ اعظم کی شیخی بگھار سکتے تھے۔ میں تو یہ بات جانتا ہوں۔ مزید برآں مجھے یقین ہے کہ آنے والے تین چار سال میں تو چچا ریٹائر ہونے والے نہیں ہیں۔ میں اب بھی سمجھتا ہوں کہ تم سکالرشپ سے فائدہ اٹھا سکتے ہو۔''وہ کھانا کھاتے ہوئے میری باتیں سن رہے تھے۔ میں نے بات جاری رکھی۔

''دیکھو کمال، چچا کا دعویٰ ہے کہ انہوں نے 17 سال جیل میں گزارے ہیں۔ دنیا کے اکثر رہنماؤں نے جیل میں اپنا وقت مطالعے اور لکھنے میں صرف کیا۔ ڈھاکہ سینٹرل جیل کی لائبریری اچھی خاصی ہے۔ لیکن چچا نے اپنا وقت مطالعہ میں صرف نہیں کیا تھا، ریکارڈ سے یہی بات معلوم ہوتی ہے۔ نہ ہی انہوں نے کچھ لکھا ہے۔ اگر انہوں نے اپنا یہ وقت بارآور طور پر خرچ کیا ہوتا تو شاید وہ آج ملک کے انتظام وانصرام کو بہتر طور پر چلا سکتے۔ کیا خیال ہے تمہارا؟''

کمال نے کوئی جواب نہ دیا۔ شاید میرے الفاظ کو اچھے انداز میں نہیں لیا گیا تھا۔ کھانا کھانے کے

بعد ہم نے زندگی کے ہلکے پھلکے پہلوؤں پر کچھ باتیں کیں اور ایک دوسرے کو شب بخیر کہنے سے پہلے موسیقی اور گیتوں سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ اگلی صبح وہ ڈھاکہ کے لیے روانہ ہو گئے۔

122۔ غازی غلام مصطفیٰ نے ہمیں لیڈیز کلب سے بندوق کی نوک پر اغوا کر لیا

1974ء کے وسط میں ایک ناقابل یقین واقعہ پیش آیا۔ فوج ابھی تک پورے ملک میں شرپسندوں کے خلاف مہم اور غیر قانونی اسلحہ برآمد کرنے کے لیے کام کر رہی تھی۔ میری کزن تہمینہ کی شادی کرنل رضا سے طے پائی تھی۔ دونوں فریق میرے نزدیکی رشتے دار تھے۔ نمی اور میں دونوں فریقین میں ایک واسطہ کی حیثیت اختیار کر گئے تھے۔ شادی کی تقریب سے دو دن قبل ہم ڈھاکہ آ گئے۔ شادی ڈھاکہ لیڈیز کلب میں ہونی طے پائی تھی۔ سول اور فوج دونوں میں سے اعلیٰ رتبے کی بہت سی شخصیات اس شادی میں مدعو تھیں۔ نمی اور میں میزبان کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ میرا واحد برادر نسبتی پپی، کینیڈا سے چھٹی پر آیا ہوا تھا۔ وہ بھی شادی میں مدعو تھا۔ ہر کام عمدگی سے انجام پا رہا تھا۔

ریڈ کراس کے چیئر مین مسٹر غازی غلام مصطفیٰ کی بیوی اور خاندان کے دوسرے افراد بھی مدعوین میں شامل تھے۔ پپی جو کینیڈا سے آیا تھا، مردوں کے لیے مخصوص ہال میں بیٹھا ہوا تھا۔ مسٹر غازی غلام مصطفےٰ کے بیٹے پپی کے بالکل پیچھے سیٹوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اچانک ان بچوں نے پیچھے سے پپی کے بال کھینچے۔ جیسے ہی پپی نے مڑ کر دیکھا تو انہوں نے یوں ظاہر کیا گویا انہوں نے کچھ بھی نہیں کیا۔ اس طرح انہوں نے اس کے بال تین چار مرتبہ کھینچے۔ آخر کار پپی اٹھا اور لڑکوں سے پوچھا، ''میرے بال کون کھینچ رہا تھا؟''

''ہم دیکھنا چاہتے تھے کہ آپ کے بال حقیقی ہیں یا نہیں۔'' ایک لڑکے نے جواب دیا۔ پپی کو ان کے رویے پر غصہ آ گیا۔ اس نے انہیں دوبارہ ایسا نہ کرنے کو کہا۔ جیسے ہی وہ پلٹا انہوں نے پھر سے بال کھینچ لیے۔ اس دفعہ پپی اپنے غصے پر قابو نہ رکھ سکا اور مجرم کو پکڑ کر کمرے سے باہر نکال دیا اور کہا، ''تم دوبارہ اس سیٹ پر نہیں بیٹھو گے۔ ٹھیک ہے۔''

مجھے اس واقعہ کے بارے میں کچھ علم نہ تھا کیوں کہ میں تقریب کے انتظامات اور مہمانوں میں بُری طرح الجھا ہوا تھا۔ شادی کی تقریب بہت عمدہ طریقے سے انجام پائی۔ کھانا بھی کھایا جا چکا تھا اور اس رات مہمان جلدی واپس جا رہے تھے کیوں کہ مسٹر ستیہ جیت رے کی فلم ''مہانگر'' ٹیلی ویژن پر دکھائی جانی تھی۔ لیڈیز کلب جلد ہی سنسان نظر آنے لگا۔ محبوب کو بھی شادی میں شامل ہونا تھا۔ وہ ڈھاکہ پولیس کا سپرنٹنڈنٹ اور میرا قریبی دوست تھا۔ ہم نے مجاہدین آزادی کے طور پر جنگ آزادی مل کر لڑی تھی۔ کسی ضروری سرکاری کام کے لیے انہیں مانک گنج جانا پڑ گیا تھا، لہٰذا انہوں نے ایک وائرلیس پیغام بھجوا دیا تھا کہ وہ تھوڑی دیر سے پہنچیں گے۔

اب مہمانوں کے خدمت گار، رشتہ دار اور قریبی دوست کھانا کھا رہے تھے۔ اچانک دو چھوٹی

بسیں اور ایک کار لیڈیز کلب میں داخل ہوئیں۔ مسٹر غازی غلام مصطفیٰ خود کار سے باہر آیا اور تقریباً 10 سے 12 سٹین گنیں تھامے ہوئے سویلین لوگ چھوٹی بسوں سے باہر آئے۔ مسٹر غازی پوری آواز سے چلا رہا تھا۔

''میجر دالیم کہاں ہے؟ وہ اپنے آپ کو کیا سمجھتا ہے؟ وہ بہت بڑھ چکا ہے۔ آج میں اُسے سبق سکھاؤں گا۔''

میں نے ابھی کھانا ختم نہیں کیا تھا۔ تمام دوسرے افراد بھی اندر ہی تھے۔ کوئی شخص اندر آیا اور کہا کہ غازی غلام مصطفیٰ آیا ہے اور مجھے ڈھونڈ رہا ہے۔ ''مسٹر غازی بہت دیر سے آئے ہیں، ہوسکتا ہے وہ اپنے گھر والوں کو لینے آئے ہوں۔'' میں نے سوچا۔ تاہم اس کے استقبال کے لیے میں فوراً اٹھ کر باہر آیا۔ جیسے ہی میں نے کمرے سے باہر قدم رکھا پانچ چھے افراد نے میرے گرد بندوقیں تان لیں۔ میں نے نرمی سے پوچھا کہ یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے اور مسئلہ کیا ہے۔ وہ بڑا پر جوش نظر آ رہا تھا اور چلا کر کہا، ''میں بنگلہ بندھو نہیں ہوں۔ اسے اٹھا لو اور آؤ چلیں۔''

''کہاں اور کیوں؟ تم مجھے کیوں لے جانا چاہتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے جواب دینا گوارا نہ کیا اور اپنے مسلح ٹھگوں کو اشارہ کیا جو اس کے حکم پر مجھے کھینچتے ہوئے اور دھکے دیتے ہوئے چھوٹی بس کی جانب لے جانے لگے۔ سیکیورٹی کے لیے پولیس والے وہاں موجود تھے۔ میری جیپ میں میرے مسلح فوجی گارڈز بھی موجود تھے۔

میں مکمل حیرت زدہ تھا اور میری سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کروں۔ روایت کے مطابق دلہن کو ابھی تک دلہا کے سپرد نہیں کیا گیا تھا۔ کچھ دوسری رسومات بھی ادا کرنی باقی تھیں۔ مجھے بالکل سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ عجیب وغریب صورتِ حال کیوں پیدا کی جا رہی ہے۔ سب کچھ بے سروپا اور مکمل طور پر طیش دلانے والا تھا۔ اچانک میں نے دیکھا کہ دو مشہور مجاہدین آزادی عالم اور چلو کو مارا پیٹا جا رہا ہے اور چھوٹی بس میں دھکیل کر پھینک دیا گیا ہے۔ یہ سارا شور شرابا سن کر نمی اور خالہ ماں، جو دلہن کی والدہ تھیں، بھی باہر آ گئیں۔

خالہ ماں مسٹر غازی کے پاس گئیں اور کہا، ''بھائی صاحب! آپ کیا کر رہے ہیں؟ آپ اسے کیوں ہراساں کر رہے ہیں؟ اس کا کیا قصور ہے؟ آپ اسے کہاں لے جا رہے ہیں؟''

غازی نے ان کی بات پر کوئی توجہ نہ دی۔ اس کے حکم کی تعمیل کی گئی۔ مجھے اسی چھوٹی بس میں دھکیل دیا گیا جس میں عالم اور چلو کو پھینکا گیا تھا۔ اندر جا کر میں نے دیکھا کہ عالم اور چلو بری طرح زخمی تھے اور ان کا خون بہہ رہا تھا۔ جیسے ہی مجھے اندر دھکیلا گیا، خالہ اور نمی دونوں نے غازی سے کہا، ''اگر تم اسے لے جانا چاہتے ہو تو تمہیں ہمیں بھی ساتھ لے جانا پڑے گا۔ ہم اکیلے اِن کو لے جانے کی تمہیں اجازت نہ دیں گی۔''

''ٹھیک ہے ایسے ہی کر لیتے ہیں۔'' غازی نے کہا اور اپنے ٹھگوں کو اشارہ کیا۔ اس کے حکم پر ان دونوں کو بھی چھوٹی بس میں دھکیل دیا گیا۔ بے چاری خالہ ماں ایک بوڑھی خاتون! جب ان ٹھگوں نے انہیں اندر دھکیلا تو وہ منہ کے بل گر گئیں۔ پانچ افراد نے اپنی بندوقیں ہم پر تان لیں۔ مسٹر غازی اپنی کار میں بیٹھ

گیا، دوسری چھوٹی بس باقی ماندہ مسلح افراد کو لے کر کہیں چلی گئی۔ دونوں چھوٹی بسیں سفید رنگ کی تھیں اور ان کی اطراف میں ریڈ کراس کا نشان بنا تھا۔ غازی نے اپنی کار سٹارٹ کی اور ہماری چھوٹی بس اس کے پیچھے روانہ ہوگئی۔ یہ سارا معاملہ ایک ڈرامے کی طرح انجام پایا۔ کسی قسم کے ردِعمل کا وقت نہ تھا۔

جب یہ حادثہ ہوا میرا چھوٹا بھائی، ایک دلیر مجاہد آزادی اور بیر بکرم شیپن اور پی وہاں موجود نہیں تھے۔ وہ دونوں مہمانوں کو چھوڑنے کے لیے گئے ہوئے تھے۔ وہ لیڈیز کلب سے ہماری گاڑیاں نکلنے کے فوراً بعد واپس آئے تو میرے بہنوئی لٹو سے ساری تفصیل سننے کے بعد شیپن نے فوری طور پر ریس کورس میں مرکزی جگہ پر واقع آرمی کنٹرول کو فون کیا۔ پھر اس نے ایم پی یونٹ اور بریگیڈ آفیسرز میس میں فون کیا اور ہمارے اغوا کے بارے میں بتایا۔ پھر وہ اپنے دوسرے مجاہدین آزادی دوستوں کو اکٹھا کرنے اور ہمیں تلاش کرنے کے لیے ایک مشن تشکیل دینے کے لیے نکل گیا۔ میری بہن مہوا کا خاوند ابوالخیر لٹو فوری طور پر محبوب کے گھر کی جانب نکل کھڑا ہوا۔ پہلی ترجیح ہمیں تلاش کرنا تھا۔

اغوا کار ہمیں لے کر سیدھے رمنا پولیس سٹیشن گئے۔ مسٹر غازی کار سے نکلا اور اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس آ گیا اور دوبارہ کار میں بیٹھ گیا۔ گاڑیاں اب ''سیکنڈ کیپٹل'' کی جانب رواں تھیں۔ اس دوران نمی نے اپنی ساڑھی پھاڑ کر عالم اور چلو کے خون کو روکنے کے لیے کچھ پٹیاں بنائیں اور ان کے زخموں پر باندھ دیں۔ جب ہم ''سیکنڈ کیپٹل'' کی جانب روانہ ہوئے تو مجھے کچھ پریشانی لاحق ہوگئی۔ کیا غازی ہمیں جے آر بی ہیڈ کوارٹرز کی جانب لے جا رہا تھا تا کہ ہمارا قصہ تمام کر دیا جائے؟ میں نے سوچا کہ اب کچھ نہ کچھ کرنے کی ضرورت ہے۔ میں نے بس روکنے کا حکم دیا۔ ڈرائیور میرے گرج دار حکم پر گھبرا گیا اور اس نے بس روک لی۔ جیسے ہی ہم رُکے، آگے جانے والی غازی کی کار بھی رک گئی۔ میں نے ایک اسلحہ بردار سے غازی کو بلانے کو کہا۔ مسٹر غازی ہمارے پاس آیا۔

جیسے ہی وہ نزدیک آیا، میں نے کہا، ''تم نے ہمارے ساتھ جو بھی کرنے کا ارادہ کر رکھا ہے ایک بات یاد رکھو۔ ''لیڈیز کلب'' میں تمہیں ہر کسی نے ہمیں اغوا کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ اس لیے اگر ہمارے ساتھ کوئی حادثہ ہوتا ہے تو اس کے ذمہ دار تم ہی ہو گے۔ تم ہمیں آسانی سے ''ہضم'' نہیں کر سکو گے۔ صورتِ حال قابو سے باہر ہو سکتی ہے۔ لہٰذا کوئی مزید قدم اٹھانے سے پہلے بہتر ہے کہ تم سارے معاملے پر وزیراعظم سے بات کر لو۔''

وہ بات سن رہا تھا اور غور کر رہا تھا۔ جب میں نے بات ختم کی تو وہ بغیر کوئی بات کیے کار میں جا بیٹھا اور ہمارا قافلہ پھر حرکت میں آ گیا۔ لیکن اس مرتبہ ہمارا رخ راکھی باہنی کے ہیڈ کوارٹرز کی جانب نہیں تھا۔ اس نے اپنی کار کا رخ روڈ نمبر 32 کی جانب موڑ لیا تھا۔ جب ہم شیخ صاحب کی رہائش گاہ پر پہنچے تو غازی نے ہماری چھوٹی بس کو ایک درخت کے سائے میں کھڑا کرنے کو کہا، جو قدرے ایک اندھیری جگہ تھی اور وہ خود اپنی کار سمیت اندر چلا گیا۔ 2 ایف ڈی رجمنٹ آرٹلری اس وقت گارڈز کے فرائض انجام دے رہی تھی۔ یہ اُن

یونٹوں میں سے تھی جن کے قیام میں میں نے مدد کی تھی۔ ایک مرتبہ میں نے انہیں بلانے کا ارادہ کیا۔ لیکن پھر میں نے سوچا کہ اگر اتفاقاً فائرنگ شروع ہوگئی تو ہم کراس فائر میں نشانہ بن سکتے ہیں۔ ابھی میں یہ بات سوچ ہی رہا تھا کہ میں نے دیکھا کہ للو کی سفید ٹیوٹا کار ''ڈھاکہ۔ جی اے 315'' ہمارے پاس سے گزری اور گیٹ پر جا کر کھڑی ہوگئی۔ محبوب کار سے باہر آئے اور للو نے کار چلا کر تھوڑی سی آگے کر کے پارک کر دی اور شاید محبوب کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔ ہم سب للو اور محبوب کو دیکھ مطمئن ہو گئے۔ یہ اللہ سبحانہٗ تعالیٰ کی ذات تھی جس نے ہم سب کو بچالیا۔

جب للو بلبلی روڈ پر محبوب کے گھر پہنچا تو محبوب ابھی مانک گنج سے واپس آئے ہی تھے اور شادی ہال پہنچنے کی تیاری کر رہے تھے۔ للو سیدھا ان کے بیڈروم میں چلا گیا اور کہا، ''محبوب بھائی، بڑا تباہ کن واقعہ ہو گیا ہے۔ غازی نے دالیم اور نمی کو لیڈیز کلب سے اغوا کر لیا ہے۔'' محبوب یہ سن کر ششدر رہ گئے۔ للو نے کہا، ''وزیراعظم سے فوری رابطہ کرنا چاہیے، اس سے پہلے کہ کوئی بڑا حادثہ ہو جائے، غازی کچھ بھی کر سکتا ہے۔'' محبوب ٹیلی فون اٹھانے کے لیے جا رہے تھے کہ اس کی گھنٹی بجنے لگی۔ وزیراعظم ٹیلی فون پر تھے۔

''محبوب تم فوراً یہاں پہنچو۔ غازی ایک میجر اور اس کے ساتھیوں کو ایک شادی کی تقریب سے لے کر آیا ہے۔ میجر نے شراب پی رکھی تھی اور اُس کی بیوی سے بے ہودگی کی تھی۔ اسے سبق سکھانا پڑے گا۔ یہ فوجی آفیسرز حقیقت میں بہت بڑھ چکے ہیں۔'' وزیراعظم نے کہا۔

''سر۔ برائے مہربانی غازی سے پوچھیں کہ وہ میجر کہاں ہے؟'' محبوب نے درخواست کی۔

''غازی انہیں اپنے ساتھ یہاں لے کر آیا ہے۔ وہ باہر کار میں ہیں۔'' وزیراعظم نے محبوب کو بتایا۔

''سر، غازی صاحب، دالیم اور نمی اور دوسرے افراد کو لیڈیز کلب سے اٹھا کر لائے ہیں۔ آج دالیم کی کزن کی شادی تھی۔'' محبوب نے وزیراعظم کو بتایا۔

''کیا؟ یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟'' شیخ مجیب الرحمٰن نے حیرت سے چلاتے ہوئے کہا۔

''میں آپ کو سچ بتا رہا ہوں۔ برائے مہربانی اُن کا خیال رکھیں۔ میں راستے میں ہوں۔''

اس مختصر سی گفتگو کے بعد محبوب اور للو روڈ نمبر 32 کی جانب دوڑ پڑے۔ محبوب کے گھر میں داخل ہونے کے چند منٹ بعد شیخ ریحانہ، شیخ کمال، شیخ جمال اور تمام دوسرے افراد بھاگتے ہوئے باہر آئے اور ہمیں اندر لے گئے۔ عالم اور چلو کا خون بہتے ہوئے دیکھ کر شیخ مجیب الرحمٰن اور دوسرے تمام لوگ بہت پریشان ہو گئے۔

''ڈیم فول، تم نے کیا کر دیا ہے؟'' شیخ مجیب الرحمٰن گرجے۔ کرسی سے اٹھ کر وہ آگے آئے اور ہم دونوں کو گلے سے لگالیا۔ خالہ ماں اچھی طرح چل نہیں پا رہی تھیں، کمال اور دیگر افراد ان کو سہارا دیتے ہوئے سیڑھیاں چڑھا کر اوپر لے گئے۔ کمرے میں ہم صرف چار افراد شیخ صاحب، غازی، نمی اور میں رہ گئے تھے۔ نمی ذہنی اذیت، غصے اور توہین کے خیال سے رونے لگی۔ شیخ صاحب اسے تسلی دینے کی کوشش کر رہے تھے۔

غازی ایک کونے میں کھڑا ایک خطا کار شخص کی طرح کانپ رہا تھا۔ اچانک سرخ ٹیلی فون بجنے لگا۔ کال غازی کے گھر سے تھی۔ فوج نے اس کے گھر پر حملہ کر دیا تھا اور وہاں موجود ہر شخص کو حراست میں لے لیا تھا۔ صرف یہی نہیں، فوج نے پورے شہر میں چیک پوسٹیں قائم کر دی تھیں اور ہر گزرنے والی کار کو چیک کر رہے تھے۔ جیسے ہی اغوا کی خبر آفیسرز میس میں پہنچی، نوجوان آفیسرز فوری طور پر باہر نکل آئے تھے اور میجر دالیم اور اس کی بیوی کی تلاش شروع کر دی تھی۔ ایم پی یونٹس کے ارکان سارے کے سارے سڑکوں پر نکل آئے۔ دارالحکومت میں شور شرابہ مچ چکا تھا اور غازی کو بھی غلط طور پر گمشدہ قرار دے دیا گیا تھا۔

ٹیلی فون سننے کے بعد شیخ صاحب کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ فوری طور پر انہوں نے سرخ ٹیلی فون اٹھایا اور ہماری موجودگی میں میجر شفیع اللہ کو فون کیا اور کہا، ''ہیلو! شفیع اللہ! غازی، دالیم اور نمی میرے پاس ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم فوری طور پر یہاں پہنچو۔''

میجر جنرل شفیع اللہ سے بات کرنے کے بعد وہ غازی کی طرف پلٹے اور کہا، ''آگے آؤ! اور نمی اور دالیم سے معافی مانگو!''

جیسے ہی غازی نے قدم اٹھایا، نمی زخمی شیرنی کی طرح گرجی، ''میرے نزدیک آنے کی جرأت مت کرنا۔ تم جیسے خنزیر کو معافی مانگنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔'' پھر وہ شیخ مجیب کی جانب پلٹی اور کہا، ''کن کے خون اور پسینے کے بدلے آج آپ یہاں وزیر اعظم بنے ہیں؟ آپ اپنے آپ کو قوم کا باپ کہتے ہیں۔ میں آپ سے انصاف مانگتی ہوں۔ میں وہی انصاف چاہتی ہوں جو آپ اس صورت میں کرتے اگر میری جگہ شیخ حسینہ یا شیخ ریحانہ کی توہین کی گئی ہوتی۔ میں آپ سے جواب چاہتی ہوں کیسے اس شخص غازی کمبل چور نے اُن مجاہدین آزادی پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت کی؟ کن لوگوں کی قربانیوں کے نتیجے میں آج آپ اور آپ کی پارٹی اقتدار کے مزے لوٹ رہی ہے؟ مجھے جواب چاہیے۔ آپ نہیں کہہ سکتے کہ میں نے آج تک آپ سے ذاتی طور پر کچھ مانگا ہو۔ لیکن آج میں انصاف مانگ رہی ہوں۔ اگر آپ انصاف نہیں کر سکتے تو اللہ تعالیٰ خود انصاف کرے گا۔''

اپنی پوری کوششوں کے باوجود اُس دن میں اُسے خاموش کروانے میں ناکام رہا۔ عام طور پر نرم گفتار اور خاطر جمع رکھنے والی نمی اپنے اندر ایسی آتش جوش بھی رکھتی ہے، یہ مجھے اس روز معلوم ہوا۔ یہ میرے لیے بہت حیران کن بھی تھا۔ نمی غصے اور نفرت سے کانپ رہی تھی۔ شیخ صاحب نے دوبارہ پُرشفقت انداز میں اسے گلے سے لگایا اور کہا، ''بیٹی، اپنے آپ کو پُرسکون کرو۔ تم میرے لیے بالکل حسینہ اور ریحانہ کی طرح ہو۔ میں ہر صورت میں انصاف کروں گا۔ یہ حقیقت میں بہت غلط ہوا ہے۔ برائے مہربانی اپنے آپ کو ٹھنڈا کرو۔''

پھر انہوں نے ریحانہ کو بلایا اور نمی کو اوپر والی منزل میں لے جانے کو کہا۔ ریحانہ، نمی کو لے کر چلی گئی۔ اس دوران میجر جنرل شفیع اللہ اور کرنل شفاعت جمیل، ڈھاکہ کے بریگیڈ کمانڈر دونوں پہنچ گئے۔ وزیر اعظم نے انہیں پورا واقعہ مختصراً سنایا اور میجر جنرل شفیع اللہ سے ریس کورس میں آرمی کنٹرول سے بات کرنے اور غازی

غلام مصطفیٰ کے خاندان کی رہائی کے لیے بندوبست کرنے کی درخواست کی۔ میجر جنرل شفیع اللہ نے کنٹرول کے آفیسر انچارج میجر مومن کو ٹیلی فون کیا۔

''ہیلو! مومن میں شفیع اللہ وزیر اعظم کی رہائش گاہ سے بول رہا ہوں۔ دالیم، نمی اور مسٹر غازی سب یہاں موجود ہیں۔ سب معاملہ ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ برائے مہربانی اپنی افواج کو روک لیں اور غازی غلام مصطفیٰ کے خاندان کے افراد کو رہا کر دیں۔''

دوسری جانب سے میجر مومن نے واضح طور پر چیف کو بتا دیا کہ جب تک اغوا شدہ آفیسر اور اس کی بیوی بازیاب نہیں ہو جاتے اور مسٹر غازی اپنے گن مینوں سمیت فوج کے حوالے نہیں کیے جاتے، اس کے خاندان کے افراد کو رِہا کرنے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ چیف نے بار بار کیپٹن مومن کو قائل کرنے کی کوشش کی لیکن وہ اپنی بات پر ڈٹا رہا۔ لہٰذا میجر جنرل شفیع اللہ رہائی کے لیے آپریشنل کمانڈر کی پیش کردہ شرائط وزیر اعظم کے گوش گزار کرنے پر مجبور ہو گئے۔ شیخ مجیب الرحمٰن گھبرائے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ انہوں نے مجھ سے میجر مومن سے بات کرنے کی درخواست کی۔ جب میجر جنرل شفیع اللہ نے بھی اصرار کیا تو میں انکار نہ کر سکا۔ میں نے فون اٹھایا۔

''ہیلو، سر میں دالیم ہوں۔ صورتِ حال قابو میں نظر آ رہی ہے۔ وزیر اعظم نے انصاف کرنے کا وعدہ کیا ہے۔'' میں نے ابھی فقرہ مکمل نہیں کیا تھا کہ اس نے بات کاٹتے ہوئے کہا، ''ٹھیک ہے دالیم، آپ سے بات کر کے خوشی ہوئی ہے۔ لیکن میں اب بھی اپنے مطالبات پر قائم ہوں کیوں کہ میں اپنے فرض کے ساتھ مخلص ہوں۔''

''جناب! آپ خود یہاں تشریف کیوں نہیں لے آتے تا کہ ساری صورتِ حال اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں۔'' میں نے کہا۔

''میں نہیں آؤں گا۔ میں کیپٹن فیروز کو بھیج رہا ہوں۔'' چند منٹوں میں کیپٹن فیروز پہنچ گیا۔ کیپٹن فیروز جسے شہید کے نام سے پکارا جاتا تھا، میرا بچپن کا دوست تھا۔ وہ آیا اور میرے ساتھ بغلگیر ہو گیا۔ خالہ ماں کو بلایا گیا، جیسے ہی وہ اندر آئیں شیخ صاحب نے مجھے دوبارہ کہا، ''برائے مہربانی غازی کو معاف کر دو۔'' پھر انہوں نے غصے کے ساتھ غازی کو حکم دیا، ''جاؤ، اور تمام رسومات پوری کرو، جو باقی رہ گئی ہیں۔''

''مسٹر غازی کو رسومات پوری کرنے کے لیے آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اسے کبھی معاف نہیں کر سکتا۔ یہ میرے اصولوں کے خلاف ہو گا۔ ہم نے اپنا خون بہا کر اس ملک کو آزادی دلوائی ہے۔ خون بہانا ہمارے لیے کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ہم وردی پہن کر پیسوں کی خاطر خدمت نہیں کر رہے۔ غازی نے مجاہدِ آزادی کے طور پر میرے فخر کو شدید طور پر مجروح کیا ہے اور میری وردی کی توہین کی ہے۔ آپ نے ہمیں لوگوں کو بچانے اور ان کے تحفظ کو یقینی بنانے کے لیے مسلح غنڈوں کو پکڑنے اور ان کو سزا دینے کا فرض سونپا تھا۔ اس فرض کو نبھانے پر ہمیں بے عزت کیا جا رہا ہے۔ ملک کے وزیر اعظم کی حیثیت سے آپ نے انصاف

کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ آپ نے کیا انصاف کرتے ہیں، ہم انتظار کریں گے۔''

میں نے وہاں موجود تمام افراد کی موجودگی میں کیپٹن فیروز سے کہا،''جب ملک کے وزیر اعظم نے انصاف کی یقین دہانی کروادی ہے تو پھر خاندان کے افراد کو حراست میں رکھنے کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا۔ آپ ان کو رِہا کر دیں۔'' جب میں وزیر اعظم سے جانے کی اجازت لے رہا تھا تو انہوں نے کہا،''تم میری ایک کار لے جا سکتے ہو۔''

جواب میں، میں نے کہا،''شکریہ! اس کی ضرورت نہیں ہے۔ شپن اور رِلو باہر انتظار کر رہے ہیں۔ ہم اپنا انتظام کر لیں گے۔''

اس طرح یہ معاملہ اختتام کو پہنچا اور ہم لیڈیز کلب واپس آ گئے۔ محبوب اور کیپٹن فیروز ہمارے ساتھ آئے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی مہربانی اور محبوب کی مداخلت تھی جس نے اس رات ہماری جانیں بچائیں۔ اللہ تعالیٰ حقیقت میں بہت کریم اور بار بار رحم کرنے والا ہے۔ واپس آ کر ہم نے شادی کی باقی ماندہ رسوم نمٹائیں۔

اس طرح تہمینہ کی شادی اس تاریخی واقعہ کی گواہ اور ایک یادگار رات کی حیثیت اختیار کر گئی۔ یہ واقعہ خود عوامی لیگ کے رہنماؤں اور اُن کی نجی باہنیوں کے اندھا دھند اور شرمناک ظلم و ستم کا ایک واضح ثبوت تھا۔ مجھے اس قسم کے بدترین عمل کا کوئی جواز نظر نہیں آتا تھا، جس میں غازی غلام مصطفےٰ جیسے رتبے کا انسان ذاتی طور پر ملوث ہو۔ بہت بعد میں مجھے بہت سے باوثوق ذرائع سے علم ہوا کہ کومیلا آپریشن کے بعد عوامی لیگ نے شیخ مجیب الرحمٰن پر میرے توہین آمیز عمل پر مجھے سبق سکھانے کے لیے بہت زیادہ دباؤ ڈالا تھا۔ لیکن شیخ مجیب اس دباؤ کے باوجود یہ کہتے رہے کہ''فوج نے اپنا کام اناڑی پن سے نہیں کیا۔ انہوں نے تمام کارروائیاں قانون کے مطابق کی ہیں۔ ہر آدمی ثبوتوں کے ساتھ رنگے ہاتھوں پکڑا گیا ہے۔ اس قسم کی صورتِ حال میں میں کیا کر سکتا ہوں؟'' ناکامی کا سامنا کرتے ہوئے غازی نے پارٹی کی طرف سے مجھے سبق سکھانے کی ذمہ داری اٹھائی تھی۔ کافی عرصے تک وہ موقع کی تلاش میں رہا۔ اور شادی کی رات اسے وہ موقع مل گیا، اس کے بیٹے اور بہن کے درمیان جو کچھ بھی ہوا، اس نے اسے مجھے سبق سکھانے کے لیے استعمال کرنا چاہا تھا۔

اس حوالے سے میجر رفیق الاسلام پی ایس سی اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

''غازی اور اس کے حمایتی غالباً میجر دالیم اور اس کی بیوی کو قتل کرنے کا منصوبہ رکھتے تھے۔''

123۔ آرمی ہیڈ کوارٹرز میں اضطراب

اس حادثے کے دوسرے دن صبح کے وقت مجھے آرمی ہیڈ کوارٹرز طلب کیا گیا۔ میں وہاں پہنچا تو مجھے علم ہوا کہ چیف نے مجھے بلایا ہے۔ لیکن چیف سے ملاقات سے پہلے پتا چلا کہ میجر جنرل ضیا الرحمٰن بھی مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ اس وقت میجر حفیظ سی او آر ڈی اور ڈی سی اے ایس کے پرسنل سیکریٹری تھے۔ انہوں نے

مجھے بتایا کہ باس مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ میں باس کو ملنے کے لیے ان کے دفتر میں چلا گیا۔ وہ سارے واقعہ کی تفصیل جاننا چاہتے تھے۔ میں نے انہیں مکمل تفصیل سے آگاہ کیا۔

سب کچھ سننے کے بعد انہوں نے کافی غصے سے کہا، ''یہ مکمل طور پر غیر اخلاقی اور قابل سزا جرم ہے۔ ٹھیک ہے، دیکھو چیف کیا کہتے ہیں۔''

میں باہر آیا۔ میجر حفیظ مجھے اپنے کمرے میں لے گئے۔ میجر نور چوہدری بھی وہاں موجود تھے۔ میجر حفیظ نے بات کرنی شروع کی۔ ''دالیم کل رات جو کچھ آپ اور آپ کی بیگم کے ساتھ ہوا ہے، وہ صرف تمہارے لیے ہی باعث تشویش نہیں، پوری فوج کے وقار اور عزت کو مجروح کیا گیا ہے۔ ہم نے مختلف چھاؤنیوں میں دوسرے بریگیڈوں سے بھی رابطہ کیا ہے۔ ان کا بھی یہی نظریہ ہے اور وہ ہمارے جذبات میں مکمل طور پر شریک ہیں۔ اس کی مکمل اور درست چھان بین کی ضرورت ہے۔ شیخ مجیب کیا انصاف کریں گے؟ ہم میجر جنرل شفیع اللہ کے ذریعے اپنے مطالبات وزیر اعظم کو پیش کریں گے۔ وزیر اعظم کو ہمارے مطالبات تسلیم کرنا پڑیں گے۔ ہمارے مطالبات کیا ہوں گے اس کا فیصلہ اتفاقِ رائے سے ہونا چاہیے۔ آپ میجر جنرل شفیع اللہ کی بات سنیں، وہ کیا کہتے ہیں، پھر ہم جو مناسب ہوگا کریں گے۔''

جو بھی تھا، اے ایچ کیو میں نوجوان آفیسرز میں ماحول بہت پر جوش ہو رہا تھا۔ اتنے میں چیف کے اے ڈی سی آئے اور کہا کہ چیف ملاقات کے لیے انتظار کر رہے ہیں۔ جیسے ہی میں نے کمرے میں داخل ہو کر آداب عرض کیا انہوں نے مجھے کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔ ہم آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔

''تمہارا کیا حال ہے؟ نمی کیسی ہے؟'' انہوں نے پوچھا۔

''ہم بالکل ٹھیک ہیں، سر۔'' میں نے جواب دیا۔

''دیکھو دالیم، وزیر اعظم نے خود اس واقعے پر گہرے رنج اور افسوس کا اظہار کیا ہے۔ اس سارے حادثے پر مجھے بھی انتہائی افسوس ہے۔ شیخ صاحب کے تمہارے ساتھ بڑے قریبی تعلقات ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ تمہیں غازی کو معاف کر دینا چاہیے، کیا تم خیال نہیں کرتے کہ وہ تمہارے اس قدر قریب ہونے کی بنا پر توقع رکھتے ہیں کہ تم ان کی خواہش کا احترام کرو گے؟ اگر تم ایسا کرتے ہو تو وہ بہت خوش ہوں گے۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں۔'' میجر جنرل شفیع اللہ نے کہا۔

''سر میں بہت سی وجوہات کی بنا پر ان کی بہت عزت کرتا ہوں۔ یہ بھی سچ ہے کہ خاندانی طور پر ہم بہت قریب ہیں۔ مزید برآں وہ اور ان کے خاندان کے دیگر افراد ہم دونوں سے بہت پیار کرتے ہیں۔ لیکن میں اصولوں پر سمجھوتہ نہیں کر سکتا۔ میں نے گزشتہ رات آپ کی موجودگی میں وزیر اعظم کو یہ بات کھلے الفاظ میں بتا دی تھی۔ اور میں آخر تک اسی پر قائم رہوں گا۔'' میں نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے پھر، تمہاری مرضی۔'' میجر جنرل شفیع اللہ بہت مایوس ہوئے۔

''شکریہ سر!'' میں نے باہر آنے سے پہلے کہا۔

124۔ میجر جنرل شفیع اللہ کی وزیر اعظم سے ملاقات

باہر نکل کر میں نے دیکھا کہ اے ایچ کیو کے تقریباً تمام آفیسرز چیف کے دفتر کے سامنے جمع تھے۔ انہوں نے مجھے پوچھا کہ چیف نے کیا کہا ہے۔ میں نے انہیں اپنی ساری گفتگو سنا دی۔ ہر کوئی مایوس اور شدید غصے میں تھا۔ کسی نے اے ڈی سی سے کہا، ''جاؤ اور انہیں یہاں باہر بلا کر لاؤ۔ ہم ان سے بات کرنا چاہتے ہیں۔'' چیف کو یہ پیغام پہنچا دیا گیا اور وہ اٹھ کر اپنے دفتر سے باہر آ گئے۔ تمام آفیسرز نے انہیں گھیرے میں لے لیا۔ چیف قدرے گھبرائے ہوئے نظر آتے تھے۔

''بتائیں، آپ سب کیا کہنا چاہتے ہیں؟''

''سر، جو واقعہ ہوا ہے اس کا تعلق صرف میجر دالیم اور ان کی بیگم کے ساتھ نہیں ہے۔ جب فوج کو امن و امان کے قیام اور غیر قانونی اسلحہ برآمد کرنے کا فرض سونپا گیا ہے تو غازی اور اس کے مسلح ٹھگوں کو ہمارے ایک آفیسر اور اس کی بیوی کو بندوق کی نوک پر اغوا کرنے اور انہیں قتل کرانے کا منصوبہ بنانے کی کیسے جرأت ہوئی؟ یہ نہ صرف غیر قانونی فعل ہے بلکہ اس سے پوری فوج کے وقار اور عزت کو نقصان پہنچا ہے۔ ہم اسے نظر انداز نہیں کر سکتے۔ اس کی مکمل چھان بین کی جانی چاہیے۔'' ایک آفیسر نے بات کی۔

''ٹھیک ہے۔ وزیر اعظم نے ذاتی طور پر اس سارے واقعہ پر شدید افسوس کا اظہار کیا ہے۔''

''یہ کافی نہیں ہے۔'' کسی نے چیف کی بات کاٹتے ہوئے کہا، ''سر، ان حالات میں ہمارے کمانڈر اور لیڈر ہونے کی حیثیت سے فوج کے وقار اور عزت کو بلند کرنے کے لیے آپ کو اپنی ذمہ داریاں نبھانا ہوں گی۔ ہمارے تین مطالبات ہیں:

1۔ وزیر اعظم کو غازی کو اس کے سرکاری عہدے سے ہٹا دینا چاہیے اور اسے اپنے گن مینوں سمیت فوج کے حوالے کر دینا چاہیے تاکہ مجرموں کے خلاف مناسب قانونی کارروائی عمل میں لائی جا سکے۔

2۔ وزیر اعظم کو یہ خبر قومی میڈیا پر نشر کرنے کی اجازت دینا ہو گی تاکہ عوام کو بھی آگہی ہو سکے۔

3۔ غازی کا تعلق عوامی لیگ سے ہے۔ شیخ مجیب کو پارٹی کا سربراہ ہونے کی حیثیت سے میجر دالیم اور کی بیوی سے سرعام معافی مانگنا ہو گی۔

آپ کو ہمارے یہ مطالبات اگلے 24 گھنٹوں کے اندر اندر وزیر اعظم تک پہنچانا ہوں گے۔ انہیں ہمارے مطالبات کو تسلیم کرنا ہو گا۔ اگر آپ ان کو قائل نہیں کر سکتے تو پھر آپ کو واپس آنے اور اس کرسی پر بیٹھنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ آپ کو اس فوج کی سربراہی کے قابل تصور نہیں کیا جائے گا۔'' یہ کہنے والے میجر نور چوہدری تھے۔

میجر جنرل شفیع اللہ کے چہرے پر بے بسی کے عالم میں رنگ آ جا رہے تھے۔ وہ مکمل طور پر حیرت زدہ ہو چکے تھے۔ انہوں نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن اس سے پہلے کہ وہ بات شروع کرتے، بیر بکرم اور جرأت مند مجاہد آزادی لیفٹیننٹ شمشیر معین چوہدری نے، جو جنگ آزادی میں شدید زخمی ہوئے تھے، اچانک اپنی بیلٹ

اتاری اور اسے چیف کی جانب پھینکتے ہوئے کہا،"ہم فوج میں اپنے فخر اور عزت ووقار کے لیے خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اگر یہ بھی حاصل نہیں ہو سکتے تو میں اس فوج میں مزید خدمات انجام نہیں دینا چاہتا۔"

اس پر تمام آفیسرز پکار اٹھے۔"سر، آپ کو ہمارے کھوئے ہوئے فخر اور وقار کو بحال کرنا ہے۔ ہم آپ سے درخواست کرتے ہیں، برائے مہربانی معاملے کی سنجیدگی کو سمجھنے کی کوشش کریں اور ہماری مدد کریں۔"

اس دوران میجر جنرل ضیاالرحمٰن شور شرابے کی آوازیں سن کر اپنے کمرے سے باہر آ چکے تھے۔ ہم میں سے کسی نے بھی ان کو نہیں دیکھا تھا۔ اچانک ہم نے ان کی بھاری بھرکم آواز سنی،"لڑکو! خاموش ہو جاؤ اور میری بات سنو۔ میں مسئلے کو سمجھ چکا ہوں اور آپ کے مطالبات جائز ہیں۔ شفیع اللہ! تمہیں یہ مطالبات لے کر وزیراعظم کے پاس جانا چاہیے اور انہیں مسئلے کی سنجیدگی کے بارے سمجھائیں۔"

اس طرح میجر جنرل شفیع اللہ کی جان چھوٹ گئی۔ تاہم انہوں نے دھیمی آواز میں بڑبڑاتے ہوئے کہا،"میں اسی وقت وزیراعظم سے ملنے جا رہا ہوں۔"

چند منٹوں میں وہ گانو بھوَن کے لیے روانہ ہو گئے۔ یہ دوپہر کے بعد کا وقت تھا، لہٰذا ان کے جانے کے بعد ہم بھی دوپہر کے کھانے کے لیے چلے گئے۔

یہاں ایک بات کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ جب یہ واقعہ ہوا کرنل ارشاد جو بعد میں جنرل اور جمہوریہ کے صدر بھی بنے، ہیڈ کوارٹرز میں ایجوٹنٹ جنرل کے عہدے پر فائز تھے۔"پی ایس اوز" کی کانفرنس میں جنرل شفیع اللہ نے ان کی رائے طلب کی۔

"ارشاد! تم نوجوان آفیسرز کے مطالبات کے بارے میں کیا کہتے ہو؟"

"سر میں سمجھتا ہوں کہ آفیسرز کے مطالبات بالکل جائز ہیں۔ ایسا واقعہ ہم میں سے کسی کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔ جب کہ فوج کو امن و امان کی بحالی اور شرپسندوں کے خلاف کارروائی کے فرائض سونپے گئے ہیں، اس معاملے پر علیحدگی میں غور نہیں کرنا چاہیے۔ یہ یقیناً پوری فوج کے وقار اور عزت کا سوال ہے۔ اور چیف ہونے کی حیثیت سے آپ کو یہ نکتہ وزیراعظم پر واضح کرنا چاہیے اور ان مطالبات کو تسلیم کرتے ہوئے انہیں فوج کی کھوئی ہوئی عزت بحال کرنے کا مشورہ دینا چاہیے۔"

ہم کرنل ارشاد کا یہ جواب سن کر بہت حیران ہوئے کیوں کہ وہ مغربی پاکستان سے واپس بلائے گئے آفیسر تھے، ہم حقیقت میں کرنل ارشاد سے، جو عام طور پر بڑھ چڑھ کر باتیں کرنے والے انسان نہ تھے، اس قسم کے جواب کی توقع نہیں رکھتے تھے۔ اس بات سے ثابت ہوتا ہے کہ مغربی پاکستان سے آئے ہوئے بہت سے آفیسرز بھی محب وطن اور قوم پرست تھے۔ اس دن سے ہم نے کرنل ارشاد کے بارے میں اپنا تاثر تبدیل کر لیا۔

125۔ وزیراعظم جواب کے لیے کچھ وقت چاہتے تھے

شام کے وقت پورے دن کی ملاقات کے بعد چیف گنو بھوَن سے واپس پہنچے۔ تقریباً رات

آٹھ بجے کے قریب انہوں نے ہم میں سے کچھ کو ''سینا بھون'' بلایا۔ بریگیڈیئر خالد مشرف اور کرنل شفاعت جمیل بھی موجود تھے۔ جیسے ہی ہم نشستوں پر بیٹھے چیف نے بات شروع کی، ''میں نے آپ کے مطالبات بنگلہ بندھو تک پہنچا دیئے ہیں۔ انہوں نے کچھ وقت مانگا ہے۔''

''کیوں کہ وزیر اعظم وقت مانگ رہے تھے اس لیے ہمیں دینا پڑا۔'' کرنل شفاعت جمیل درمیان میں کود پڑے۔ بریگیڈیئر خالد خاموش بیٹھے تھے۔

''سر، جب آپ کہتے ہیں ''آپ کے مطالبات'' تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ میں اور ہم میں فرق ہے؟ یہ مطالبات پوری فوج کی جانب سے پیش کیے گئے تھے۔ تو کیا ہم یہ سمجھیں کہ ہمارے سینئر ہمارے ساتھ نہیں ہیں؟''

وہ گھبرا گئے تھے۔ جنرل شفیع اللہ کی جانب سے بریگیڈیئر خالد نے جواب دیا، ''لڑکو! غلط تاثر مت پیدا کرو۔ ظاہر ہے ہم سب ایک ساتھ ہیں۔ ہم اس مسئلے پر اختلاف نہیں کر سکتے۔''

ہم میں سے ایک نے کہا، ''ہمیں خدشہ ہے کہ وزیر اعظم ہمارے مطالبات کو تسلیم نہیں کریں گے اور وہ معاملے کو ٹھنڈا کرنے کے لیے وقت مانگ رہے ہیں۔

دوئم، وہ اپنی پوزیشن مضبوط کرنے کے لیے وقت چاہتے ہیں۔ ہم آپ سے واضح طور پر جاننا چاہتے ہیں کہ اگر وہ آخر کار ہمارے مطالبات ماننے سے انکار کر دیتے ہیں تو پھر ہمیں کیا کرنا چاہیے؟''

وہ تینوں کوئی جواب دیئے بغیر خاموش بیٹھے رہے۔

''ٹھیک ہے سر، اگر آپ کے پاس کوئی جواب نہیں کہ پھر کیا کیا جائے گا تو پھر ہم سوچیں گے کہ کیا کیا جانا چاہیے۔'' میں نے کہا۔

اس طرح ہماری گفت وشنید خاتمہ کو پہنچی۔

ہم سینا بھون سے باہر آ گئے اور اپنے اگلے لائحہ عمل کے بارے میں غور کرنے کے لیے عزیز پالی میں ایک ساتھی کے گھر آ کر بیٹھ گئے۔ ہم ملک کے دوسرے حصوں میں تعینات بریگیڈز کے ساتھ بھی رابطے میں تھے۔ تقریباً 11 بجے ہمیں پیغام ملا کہ جنرل شفیع اللہ کی پرائیویٹ سفید ڈاٹسن چھاؤنی سے نکل کر شہر کی جانب جا رہی ہے۔ کار میں سول کپڑوں میں ملبوس دو افراد بیٹھے ہوئے ہیں۔ فوری طور پر ایک نوجوان افسر کو موٹر سائیکل پر کار کا پیچھا کرنے کا حکم دیا گیا۔ تقریباً 12 بجے کے قریب وہ واپس آیا اور بتایا کہ وہ دو افراد میجر جنرل شفیع اللہ اور کرنل شفاعت جمیل تھے۔ وہ سیدھے روڈ نمبر 32 گئے تھے۔ تقریباً 2 بجے ہمیں اطلاع ملی کہ راکھی باہنی حرکت میں ہے اور اس کے آدمی شہر کی اہم جگہوں پر پوزیشن لے رہے ہیں۔ دو اور دو چار ہوتے ہیں۔ مساوات واضح تھی۔ میجر جنرل شفیع اللہ اور کرنل شفاعت جمیل دو انتہائی وفادار آفیسر بھیس بدل کر شیخ مجیب کے پاس گئے تھے اور ضرور سینا بھون میں ہماری میٹنگ کے بارے میں بتایا ہوگا۔ جس کے نتیجے میں شیخ مجیب نے راکھی باہنی کو حرکت میں آنے اور کسی ہنگامی صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے پوزیشن سنبھالنے کا حکم دے دیا تھا۔

یہ شخصیت پرستی کی کیسی منفرد مثال تھی۔ تقریباً 2.30 بجے سرحد پر تعینات ہماری فوج نے سرحد کے پار ہندوستانی فوج کی غیر معمولی نقل وحرکت دیکھی۔ اس کا مطلب تھا کہ شیخ مجیب الرحمٰن اپنے تحفظ کے لیے محض جے آر بی پر انحصار نہیں کیے ہوئے تھے بلکہ ''دوستی کے معاہدے'' کے تحت انہوں نے فوج کی ممکنہ بغاوت کو کچلنے کے لیے سرحد پار کی افواج سے بھی مدد طلب کر لی تھی۔ اس پر ہم میں سے کچھ لوگوں نے شہر کا چکر لگانے کا فیصلہ کیا۔ جب ہم شہر میں گھومے پھرے تو ہم نے دیکھا کہ جو اطلاعات ہمیں ملی تھیں وہ حرف بہ حرف درست تھیں۔ یہ بات واضح ہوگئی کہ وہ آفیسرز جن کو میجر کے رتبے سے اٹھا کر راتوں رات شیخ مجیب الرحمٰن کے حکم سے جنرل بنا دیا گیا تھا، سب کے سب بکاؤ کردار کے مالک تھے۔ تاہم اس میں چند مستثنیات موجود تھیں۔ میجر جنرل ضیاالرحمٰن اُن میں سے ایک تھے۔ ان سینئر افسروں کے کردار کی کمزوری کے بارے میں علم ہونا بہت تکلیف دہ اور نفرت انگیز تھا۔

126۔ چیف نے کورٹ آف انکوائری کا حکم دے دیا

اگلی صبح جنرل شفیع اللہ کو دوبارہ گونو بھون بلایا گیا۔ وہ تقریباً گیارہ بجے صبح واپس آئے۔ وہ کل کی نسبت زیادہ پر اعتماد نظر آ رہے تھے۔

''دالیم، وزیراعظم نے کچھ وقت مانگا ہے۔ اس دوران اس معاملے پر محض سرکاری ریکارڈ کے لیے ایک کورٹ آف انکوائری کا حکم دیا ہے۔'' انہوں نے کہا۔

کیسی عجیب منطق تھی۔ غازی غلام مصطفیٰ نے جرم کیا تھا اور کورٹ آف انکوائری کا حکم میرے خلاف دیا جا رہا تھا۔ میں بہت حیران ہوا۔

''کورٹ آف انکوائری کے سامنے پیش ہونے کے بعد تم واپس کومیلا جا سکتے ہو۔'' چیف نے کہا۔

''جی، جناب۔'' میں نے جواب دیا اور اُن کے دفتر سے باہر آ گیا۔ کورٹ آف انکوائری کے سامنے پیش ہونے کے دو دن بعد میں کومیلا واپس آ گیا۔

127۔ صدارتی حکم 9 کے تحت آٹھ افسروں کو فوج سے فارغ کر دیا گیا

ایک ماہ بعد، جولائی کے آخر میں ایک شام ایک مخصوص موقع پر میں نے کومیلا میں اپنے گھر ایک پارٹی کا انتظام کر رکھا تھا۔ زیادہ تر مہمان وقت پر پہنچ چکے تھے۔ باہر بونداباندی ہو رہی تھی۔ ہدیٰ بھابی بھی پہنچ چکی تھیں لیکن کرنل ہدیٰ، جو ہمارے بریگیڈ کمانڈر تھے، ابھی آنے والے تھے۔ وہ قدرے دیر سے پہنچے۔ وہ غیر معمولی طور پر خاموش تھے اور وہ ایک کونے میں آ کر بیٹھ گئے۔ ہمیشہ خوش باش رہنے والے ہدیٰ بھائی اتنے خاموش کیوں ہو گئے؟ میں اُن کے پاس گیا اور کہا، ''سر کوئی غلط بات ہو گئی ہے؟''

''نہیں، کوئی خاص بات نہیں۔''

یہ کہنے کے بعد انہوں نے ماحول کو خوشگوار بنانے کے لیے اپنا مشروب اٹھالیا۔ نمی مہمانوں کی خاطر مدارت میں مصروف تھی۔ اچانک ہدیٰ بھائی نے نمی کو بلایا اور اسے اپنے پاس بٹھالیا۔

''نمی، فرض کرو تمہیں کوئی ایسی خبر ملتی ہے جو تمہارے خوب صورت ہنستے بستے گھر کو الٹ دے، کوئی شخص تمہاری خوشیاں چھین لے، تو پھر تم کیا کرو گی؟''

نمی حیران ہوگئی اور ہدیٰ بھائی کی بات کو سمجھنے کے لیے ٹکٹکی باندھ کر انہیں دیکھنے لگی۔

''کیا ہوا ہے ہدیٰ بھائی؟ میں سمجھ نہیں پائی آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ برائے مہربانی ہمیں بتائیں کیا خرابی ہوئی ہے؟'' اسی لمحے میں بھی ان کے پاس آ گیا۔

''والیم! کیا تم نے ڈھاکہ سے کوئی خبر سنی ہے؟'' ہدیٰ بھائی نے پوچھا۔

''نہیں سر، اگر کوئی اہم بات ہوتی تو میرے علم میں ہوتی۔ ہدیٰ بھائی ہمیں کھل کر بتائیں کیا ہوا ہے؟'' میں نے درخواست کی۔

''کچھ نامناسب بات ہوگئی ہے۔ صدارتی حکم 9 کے تحت آٹھ فوجی افسروں کو جبری ریٹائر کر دیا گیا ہے۔ تم اور میجر نور بھی ان میں شامل ہو۔''

یہ اس قدر غیر متوقع خبر تھی کہ مجھے سنبھلنے میں کچھ وقت لگا۔ نمی بہت پریشان نظر آ رہی تھی۔ میں نے اسے کہا، ''اطمینان رکھو، اپنے آپ کو سنبھالو۔ دعوت کو خراب نہ کرو۔ اسے ختم ہونے دو، پھر ہم دیکھیں گے۔ حوصلہ رکھو اور اچھی میزبان نظر آؤ۔''

آخر کار وہ ایک عورت تھی اور وہ بھی بہت نرم دل، تاہم اس شام اس نے بڑی ہمت سے کام لیا اور دعوت کو بخوبی نمٹا دیا۔ مہمانوں کو احساس تک نہ ہو سکا کہ کیا ہوا ہے، بھابی کو بھی اس بارے میں کچھ علم نہ تھا۔ پارٹی معمول کے مطابق جاری رہی اور مہمان ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے۔ اب صرف میں، نمی، ہدیٰ بھائی اور بھابی رہ گئے تھے۔ بھابی کو بھی خبر سنائی گئی۔ انہیں بہت زیادہ صدمہ ہوا اور وہ تقریباً ٹوٹ گئیں۔ وہ ہم سے بہت زیادہ پیار کرتی تھیں۔ نمی اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکی اور وہ رونے لگی۔ ہدیٰ بھائی اور میں اس کو دلاسہ دے رہے تھے۔

ہدیٰ بھائی نے کہا، ''برائے مہربانی اپنے آپ کو سنبھالو، یہ دنیا کا خاتمہ نہیں ہے۔ خدا سب سے بڑا ہے، رونا بند کرو۔''

پھر انہوں نے کہا، ''کل میں تمہارے ساتھ ڈھاکہ جاؤں گا اور بنگلہ بندھو سے ملیں گے۔ نمی تم بھی ہمارے ساتھ جانا۔''

اس دوران ڈھاکہ سے فون آ رہا تھا۔ یہ نور کا فون تھا۔

''سر، ہمیں برطرف کر دیا گیا ہے۔ جتنی جلدی ہو سکے، ہمیں آپ کی ڈھاکہ میں موجودگی کی ضرورت ہے۔''

''ہدیٰ بھائی اور میں کل آ رہے ہیں۔'' میں نے فون رکھ دیا۔

دوسرے دن کومیلا بریگیڈ میں سب کو خبر ہو گئی۔ کرنل ہدیٰ نے صبح صبح بریگیڈ آفیسرز کی کانفرنس کی اور اس کانفرنس میں کہا، ''میں آپ سب کو یقین دلاتا ہوں کہ میں ذاتی طور پر اس صریح ناانصافی کے ازالے کی ہر ممکن کوشش کروں گا۔''

128۔ کرنل ہدیٰ کی اس صریح ناانصافی کے ازالے کی کوشش

کانفرنس کے بعد ہم ڈھاکہ آ گئے۔ آرمی ہیڈ کوارٹرز میں صورتِ حال بڑی دھماکہ خیز تھی۔ میجر جنرل شفیع اللہ اپنے دفتر میں موجود نہیں تھے۔ ان کی طبیعت ناساز تھی۔ میں سیدھا میجر جنرل ضیاالرحمٰن کے دفتر میں چلا گیا۔ جیسے ہی میں داخل ہوا وہ آگے بڑھے اور پوری گرم جوشی سے مجھے گلے سے لگا لیا۔ انہوں نے کہا، ''اللہ تعالیٰ پر یقین رکھو۔ وہ ہر کام ہماری بہتری کے لیے کرتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اور بھی بہت سے سر لڑھکیں گے۔''

''شاید یہی ہونے والا ہے۔'' میں نے کہا۔

''بہر حال ہم رابطے میں رہیں گے۔ اگر میں آپ کے لیے کچھ کر سکتا ہوں تو بلا جھجک بتائیں۔ میرے دروازے آپ کے لیے ہمیشہ کھلے رہیں گے۔''

''سر آپ ہماری آخری اور واحد امید ہیں۔ اپنا خیال رکھیں۔ یہ مستقبل ہی بتائے گا کہ ہمارے مشترکہ مقدر میں آگے کیا کیا ہونے والا ہے۔'' میں نے نکلنے سے پہلے کہا۔ میں نے ایم ایس برانچ سے تحریری حکم نامہ وصول کیا اور آرمی ہیڈ کوارٹر سے باہر آ گیا۔

شام کو کرنل ہدیٰ مجھے روڈ نمبر 32 لے کر گئے۔ وہاں ہر چیز اور ہر شخص ویسے ہی تھا، لیکن آج کا موقع قدرے مختلف تھا۔ ریحانہ، کمال اور دوسرے افراد کسی حد تک پریشان اور گھبرائے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ میں نے صورتِ حال کو معمول کے مطابق لانے کی کوشش کی۔ میں نے کمال سے اس کی شادی کے بارے میں پوچھا اور کہا، ''کیا مجھے بھی دعوت دو گے؟''

اس نے قدرے شرماتے ہوئے کہا، ''کیا بات کرتے ہو باس؟ میں آپ اور نمی کو مدعو کرنے کے لیے خود حاضر ہوں گا۔ آپ کے بغیر شادی نامکمل ہو گی۔'' ریحانہ نے معمول کے مطابق چائے وغیرہ کا بندوبست کیا۔ کرنل ہدیٰ سب صورتِ حال کا خاموشی سے جائزہ لے رہے تھے۔ شیخ صاحب آ گئے۔ ہمیں دوسری منزل پر ان کے پسندیدہ کمرے میں بلایا گیا۔ دعا سلام کے بعد کرنل ہدیٰ نے کہا، ''سر، اس قسم کی ناانصافی کے بعد مجھے فوج میں خدمات ادا کرنے کی کوئی خواہش نہیں ہے۔'' انہوں نے اپنا استعفیٰ نکالا اور شیخ مجیب الرحمٰن کے سامنے رکھ دیا۔

''اس کی دوسری نقل جلد ہی آپ کو سرکاری ذرائع سے مل جائے گی۔'' کرنل ہدیٰ نے کہا۔

شیخ صاحب نے بڑے تحمل سے جواب دیا، ''آپ لوگ ہر بات کو صرف ایک زاویہ سے دیکھتے ہیں۔آپ میرے بارے میں بالکل غور نہیں کرتے۔ایک جانب میری پارٹی ہے اور دوسری جانب وہ ہیں۔ میں کیا کر سکتا ہوں؟ میرے ہاتھ تو بندھے ہوئے ہیں۔ میں اپنی پارٹی کے بغیر نہیں چل سکتا۔''

پھر انہوں نے میری طرف دیکھا اور کہا، ''تم اور نور مجھے کل ملو۔''

کرنل ہدیٰ شیخ صاحب سے بات کرتے ہوئے حقیقتاً آنسوؤں سے رو دیئے۔

129۔رسمی الوداعی تقریب سے بھی روک دیا گیا

اگلے دن چیف نے مجھے اپنے دفتر میں طلب کیا۔ چیف نے مجھے کومیلا واپس جانے سے روک دیا۔ سامان وغیرہ لینے کے لیے اکیلی نمی جائے گی۔ کرنل ہدیٰ نے اس فیصلے پر پُر زور احتجاج کیا۔لیکن میجر جنرل شفیع اللہ نے اپنے حکم کو تبدیل نہ کیا۔ وہ کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہتے تھے۔انہیں خدشہ تھا کہ اگر مجھے کومیلا جانے دیا گیا تو کوئی ناخوشگوار حادثہ ہو سکتا تھا۔

اس طرح مجھے اس فوج کی رسمی الوداعی تقریب سے بھی محروم کر دیا گیا، جس کو قائم کرنے والے بانیوں میں میرا اشمار ہوتا تھا۔اب میرے لیے ڈھاکہ ہی میں رہنے کے علاوہ کوئی متبادل نہ تھا۔ ہدیٰ بھائی نمی، خالہ ماں اور میرے برادر نسبتی کے ساتھ کومیلا چلے گئے۔

مجھے واپس کومیلا جانے کی اجازت نہیں دی گئی تھی، چنانچہ کومیلا میں موجود آفیسرز اور سپاہی غصے سے پھٹ پڑے۔ ایک دن کومیلا سے فوجیوں سے بھرے ہوئے دو ٹرک مالی باغ ہمارے گھر آ گئے۔ وہ مجھے اپنے ساتھ لے جانے کے لیے آئے تھے۔ انہوں نے درخواست کی کہ میں ان کے ساتھ ضرور جاؤں اور الوداعی پارٹی میں، جس کا انہوں نے انتظام کر رکھا تھا، شرکت کے بعد واپس آ جاؤں۔ یہ ایک مخلصانہ جذباتی درخواست تھی۔ تاہم میں نے آخر کار کسی نہ کسی طرح انہیں اس بات پر قائل کر لیا کہ اس طریقے سے میرا اُن کے ساتھ جانا مناسب نہیں ہوگا۔

جانے سے پہلے انہوں نے کہا، ''سر، آپ جہاں بھی ہوں یہ یاد رکھیے گا کہ ہم ہمیشہ آپ کے ساتھ ہیں۔ اس بات کو کبھی بھولیے گا نہیں۔ اگر ضرورت پڑے تو ہمیں آواز دیجئے گا۔ ہم تمام رکاوٹیں ایک جانب ہٹاتے ہوئے آپ کے شانہ بہ شانہ کھڑے ہوں گے۔''

یہ سب جنگ آزادی کے دنوں سے میرے ساتھی تھے۔ اُن دنوں سے لے کر آج کے دن تک ہم ہر خوشی اور غمی میں اکٹھے رہے تھے۔ ایک کمانڈر کے طور پر میں اپنے ساتھیوں اور پیارے فوجیوں کی جانب سے اس قسم کی عزت اور اعتماد حاصل کرتے ہوئے بہت خوش قسمت تھا۔ اس کے علاوہ مجھے اور کیا چاہیے تھا؟ فوج میں بہت سے جنرل اور اعلیٰ عہدوں کے حامل آفیسرز موجود ہیں، لیکن میں سوچتا ہوں کہ ان میں سے کتنے ہوں گے جن کو اس طرح کی عزت اور اعتماد حاصل ہوا ہوگا۔ میں ان کے جذبے سے اس قدر متاثر ہوا کہ

میری آنکھوں سے خود بخود آنسو نکل آئے۔ میں نے سوچا کہ اگرچہ میرے کیریئر کو اچانک ختم کر دیا گیا ہے، ایک سپاہی کے طور پر میری مختصر سی زندگی مکمل طور پر کامیاب رہی ہے۔ نہ صرف کومیلا سے بلکہ دوسری چھاؤنیوں سے بھی مہمان میرے گھر آ رہے تھے۔ میرے ہمدرد، میرے پیارے ساتھی میرے ساتھ ہمدردی اور اتحاد کے اظہار کے لیے انفرادی طور پر اور گروپس کی صورت میں آتے رہے۔

ہر زبان پر ایک ہی سوال تھا۔ ''اس قسم کی ناانصافی کیوں؟'' ''اس قسم کا ناجائز فیصلہ کیوں؟''

میں نے سب کو جواب دیا، ''ایک فاشسٹ حکومت میں ہر بات ممکن ہوتی ہے۔ وہ اقتدار کے نشے میں اندھے ہو رہے ہیں اور بھول گئے ہیں کہ ان کے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں۔ ہر کام اللہ تعالیٰ کی رضا سے ہوتا ہے، وہ جو بھی کرتا ہے، اس میں بہتری ہوتی ہے۔ میرا یہی ایمان ہے۔ وہ خطا کار لوگ جو اپنے اختیارات کا ناجائز استعمال کرتے ہیں انہیں اللہ تعالیٰ کی جانب سے ضرور سزا ملے گی۔ یہی بات ہے جو اس نے واضح طور پر قرآن مجید میں بیان کی ہے ایک مسلمان کے طور پر میرا اس پر ایمان ہے۔''

ہمارا ملک چھوٹا سا ہے۔ مسلح افواج اور بھی چھوٹی ہیں۔ فوج میں تقریباً ہر کوئی ہر کسی سے واقف ہے۔ فوجی ہر افسر کی کارکردگی، صلاحیتوں اور کردار سے پوری طرح آگاہ ہیں۔ شیخ حسینہ نے بی بی سی ورلڈ سروس کے بنگالی پروگرام کے لیے لندن میں امین الحق بادشاہ کو ایک انٹرویو دیتے ہوئے کہا تھا کہ ان کے والد نے بنگلہ دیش فوج کی تشکیل کی اجازت دی۔ جو میجر تھے، وہ جنرل بن گئے۔ یہ بہت اہم بیان تھا، جو انہوں نے دیا۔ حقیقت میں بہت سے افراد، جو میجروں سے جنرل بنا دیئے گئے تھے، جنرل بننے کے قابل نہیں تھے۔ لیکن پھر ان کو کیوں جنرل بنا دیا گیا؟ یہ کام اس بات کو یقینی بنانے کے لیے کیا گیا تھا کہ بنگلہ دیش کی فوج ان نااہل جنرلوں کے تحت کمزور رہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان بے کار جنرلوں کی مدد سے شیخ مجیب فوج کو ذاتی باہنی اور ایک استبدادی ہتھیار میں تبدیل کرنا چاہتے تھے۔ لیکن یہ محض ان کا ایک خواب تھا کیوں کہ یہ جنرل فوج کے محبِ وطن حلقوں میں اپنا اثر و رسوخ قائم کرنے میں ناکام رہے۔

نمی اور میری خوش دامن سامان وغیرہ سمیٹنے کے لیے کومیلا گئیں۔ بریگیڈ کمانڈر سے لے کر تمام لوگ خلوصِ دل سے تعاون کر رہے تھے، لہٰذا انہیں کسی مسئلے کا سامنا نہیں ہوا۔ انہوں نے ہمارا سامان پیک کیا اور اسے ٹرک کے ذریعے ڈھاکہ پہنچانے کا انتظام کر دیا۔ دونوں خواتین کو ہوائی جہاز کے ذریعے واپس آنا تھا۔ لیکن کومیلا میں فیلڈ انٹیلی جینس یونٹ سے معلومات حاصل ہوئیں کہ عوامی لیگ کے ٹھگوں نے نمی کو ہوائی اڈے سے اغوا کرنے کا پروگرام بنا رکھا ہے، اس لیے بریگیڈ کمانڈر نے تمام ضروری انتظامات کر لیے تھے اور ہوائی اڈے پر فوج تعینات کر دی تھی۔ کرنل ہدیٰ خود نمی کے ساتھ ہوائی جہاز تک گئے اور ہوائی جہاز کے اڑنے تک وہاں موجود رہے۔

130۔ نور اور میں شیخ مجیب سے ملنے کے لیے گئے

اس طرح سے میرے فوجی کیریئر کا خاتمہ کر دیا گیا۔ ہماری آخری ملاقات میں شیخ مجیب الرحمٰن

نے اگلے دن مجھے نور کے ہمراہ ملنے کو کہا تھا۔ لیکن بعض ناگزیر مصروفیات کی وجہ سے اس پر عمل نہ ہو سکا۔ تاہم جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا گیا تھا۔ مجھے یاددہانی وصول ہوئی اور ہم دونوں ان سے ملاقات کے لیے چلے گئے۔ یہ ملاقات بھی دوسری منزل پر ہوئی۔

سلام دعا کے بعد شیخ صاحب نے گفتگو کا آغاز کیا، ''دیکھو، میں حقیقتاً مجبور تھا۔ یہ ایک سیاسی فیصلہ تھا جس سے میں انکار نہیں کر سکتا تھا۔ میں جانتا ہوں کہ اس فیصلے سے تمہارے جذبات مجروح ہوئے ہوں گے۔ میں تم دونوں کے لیے کچھ کرنا چاہتا ہوں۔ اگر تم چاہتے ہو تو میں تمہیں کسی خارجہ ذمہ داری کے ساتھ باہر بھیج سکتا ہوں۔ اگر تم کاروبار کرنا چاہتے ہو میں ناصر سے مدد کے لیے کہہ سکتا ہوں۔ اس کے بہت سے کاروباری منصوبے ہیں۔ تم کو آسانی سے سمویا جا سکتا ہے۔''

''چچا، ہم سپاہی ہیں۔ ہم نے سپاہ گری کا انتخاب پیسوں کی خاطر نہیں اپنے کیریئر کے طور پر کیا تھا۔ کیوں کہ اب آپ کے ''انصاف'' کی وجہ سے ہم اسے کھو چکے ہیں، ہمیں آپ سے کچھ بھی نہیں لینا۔ اس سب کچھ کے بعد آپ ہمارے لیے کچھ کرنا چاہتے ہیں یہ آپ کی عظمت ہے۔ بس ہمارے لیے دعا کر دیں یہی کافی ہوگا۔ رزق اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔ ہم اپنی زندگی بسر کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ کرنے کی کوشش کریں گے، انشاء اللہ تعالیٰ۔ میں نہیں جانتا کہ دوبارہ آپ سے میری ملاقات ہوگی یا نہیں، اس لیے اگر آپ اجازت دیں تو میں کچھ کہنا چاہوں گا۔'' انہوں نے اجازت دے دی اور میں نے عرض کیا، ''تمام وہ لوگ جو چوبیس گھنٹے آپ کو گھیرے رکھتے ہیں وہ آپ کو ملک اور عوام کے بارے میں سچ نہیں بتاتے۔ ان میں سے اکثر موقع پرست ہیں۔ خدانخواستہ کوئی بُرا وقت آتا ہے تو آپ ان میں سے کسی کو بھی اپنے ساتھ نہیں پائیں گے۔ وہ نئی پناہ گاہ میں چلے جائیں گے۔ پھر صورتِ حال کا سامنا کرنے کے لیے آپ اکیلے رہ جائیں گے۔ آپ ہمیشہ کہتے ہیں آپ عوام کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ لیکن آج میں یہ کہنے کی جرأت کروں گا کہ آپ کو عوام سے کاٹ دیا گیا ہے۔ ہو سکتا ہے اس کی ایسے ہی منصوبہ بندی کی گئی ہو۔ آپ ہم سے بہت پیار کرتے ہیں۔ ہماری ریٹائرمنٹ سے آپ کو کتنا فائدہ حاصل ہوگا، آپ بہتر جانتے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو کافی کچھ دے رکھا ہے۔ آپ کو مزید کچھ حاصل کرنے کی ضرورت یا خواہش نہیں ہوگی۔ اس ''چتر ادَل'' سے اپنے آپ کو بچائیں اور ملک اور قوم کا لیڈر بننے کی کوشش کریں۔ آپ کے پورے سیاسی کیریئر کی کامیابی اسی بات میں پنہاں ہے۔''

شیخ صاحب اپنا پائپ پیتے ہوئے میری بات سنتے رہے اور کوئی ظاہری ردِعمل ظاہر نہ کیا۔

''اب ہم آپ سے اجازت چاہیں گے۔'' میں نے بات ختم کرتے ہوئے کہا۔

وہ کھڑے ہو گئے اور ہم نے خدا حافظ کہا۔

میں نے یہ ساری بات انتہائی اخلاص سے کہی تھی جیسا کہ میں ذاتی طور پر ان کی عزت کرتا تھا۔ مجھے علم نہیں کہ انہوں نے اسے کس حد تک سنجیدگی سے لیا۔

131۔نئی زندگی کے آغاز کی کوششیں

اس ملاقات کے بعد ہم اپنی روزی کے بندوبست میں مصروف ہو گئے۔میجر نور اور میں نے اپنے چھوٹے بھائی شپن کے ساتھ اس کے کاروبار میں شرکت کا فیصلہ کیا۔وہ ایک تجربہ کار کاروباری شخص تھا۔میں نے، میجر نور، کرنل اکبر (بعد میں پارلیمنٹ کے رکن اور بی این پی کی جانب سے کابینہ کے وزیر) اور شپن نے مل کر ایک کمپنی تشکیل دی۔کمپنی کا نام ہمارے ناموں کے پہلے حروف کے حوالے سے سانس انٹرنیشنل (SANS) رکھا گیا۔کرنل اکبر اس وقت ابھی ریٹائر ہوئے ہی تھے۔میجر شہریار رشید خان نے بھی فوج سے استعفیٰ دے کر اپنا کاروبار شروع کر دیا تھا۔ان کی کمپنی کا نام ''شیری انٹر پرائزز'' تھا۔حکومت کا رویہ معاندانہ تھا لیکن ہمارے دوستوں اور خیر خواہوں نے ہمارے کاروبار میں بہت تعاون اور مدد کی، میں ان کی پُرخلوص مدد اور ہمدردی کو عمر بھر نہیں بھول سکتا۔ایسے لوگ بھی جن کو میں جانتا تک نہیں تھا، جب انہیں پتا چلتا کہ ہم کون ہیں، مدد کے لیے خود بخود آگے آجاتے۔ہم نے کاروبار کا آغاز بڑے چھوٹے پیمانے سے کیا لیکن وہ بہت جلد وسعت اختیار کر گیا۔مالی طور پر ہم کافی خوش حال ہو گئے۔ہم باقاعدہ منظور شدہ کنٹریکٹرز اور سپلائرز بن چکے تھے، جس کی وجہ سے پورے بنگلہ دیش میں گھومتے پھرتے رہتے تھے۔اس طرح ہمیں فوج میں اور فوج سے باہر سیاسی حلقوں میں بھی متعلقہ افراد کے ساتھ رابطے پیدا کرنے کا موقع مل گیا۔وسیع پیمانے پر لوگوں سے رابطوں کی وجہ سے ہم عوام کی دھڑکنوں کو سمجھنے کے قابل ہو گئے۔جہاں بھی ہم جاتے لوگ ہماری بہت عزت کرتے حتیٰ کہ جہاں تک ممکن ہو سکتا تھا، وہ اپنے دائرہ اختیار سے بڑھ کر ہماری مدد کرنے کے لیے تیار ہو جاتے۔ہمارا وقت اس طرح گزر رہا تھا۔

132۔کوئی رشتہ یا تعلق نظریاتی وابستگی سے بلند نہیں ہوتا

ایک رات میں اور نمی دھان منڈی میں ایک دوست کے ہاں دعوت سے واپس آرہے تھے۔بڑی موسلا دھار بارش ہو رہی تھی جس کی وجہ سے باہر بہت کم نظر آرہا تھا۔ہم ابھی انٹرنیشنل ہوٹل سے گزر کر پرانے گونو بھون کے سامنے ہی پہنچے تھے، جب ایک تیز رفتار کار مخالف سمت سے ہماری جانب آئی۔ہم زیادہ دیکھ نہیں سکتے تھے لیکن ہمیں کار میں سے لوگوں کے گانے اور ہنسنے کی آوازیں آرہی تھیں۔گاڑی لہراتی ہوئی ہماری جانب بڑھی۔

نزدیک آنے پر ہم نے پانچ یا چھ نوجوانوں کو غیر حالت میں دیکھا۔وہ ہمارے ساتھ ٹکرانے ہی والے تھے، لہٰذا میں جلدی سے کار کو سڑک کے کنارے پر لے گیا۔اچانک کار پھسل گئی اور میں اس پر قابو نہ رکھ سکا۔یہ ایک کھمبے سے جا ٹکرائی۔کار وہیں رک گئی اور دوبارہ سٹارٹ نہ ہوئی۔بڑی تیز بارش ہو رہی تھی اور ہینڈل سے ٹکرانے کی وجہ سے میری ٹھوڑی زخمی ہو گئی تھی اور خون بہہ رہا تھا۔نمی بالکل محفوظ رہی تھی۔لیکن میرا

خون بہتا دیکھ کر وہ گھبرا گئی۔ اب کیا کیا جائے؟ میں باہر نکلا اور دیکھا کہ گاڑی کا انجن، بونٹ اور اگلا حصہ بری طرح سے پچک چکا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ اب یہ کار سٹارٹ نہیں ہو سکتی۔ میں مایوسی کے عالم میں کھڑا تھا۔ اچانک سائرن بجنے کی آواز آئی اور میں نے دیکھا کہ وزیراعظم کا قافلہ آ رہا ہے۔ جب یہ گزر رہا تھا تو وزیراعظم کی لیموزین میرے پاس آ کر رک گئی۔ پچھلا شیشہ کھلا وزیراعظم نے دریافت کیا کہ کیا ہوا ہے؟ کار کا بونٹ کھلا ہوا تھا اور میرا خون بہہ رہا تھا۔ وہ سمجھ گئے کہ حادثہ ہو گیا ہے۔ انہوں نے فوری طور پر اپنے ایک اے ڈی سی کو کہا کہ وہ ان کی دوسری کار میں ہمیں فوری طور پر سی ایم ایچ لے جائے۔ وہاں ٹانکے لگوائے اور ضروری علاج کے بعد ہم گھر آ گئے۔ ابا میرے سر پر بڑی سی پٹی بندھی دیکھ کر گھبرا گئے۔ میں نے انہیں دلاسا دیا کہ کوئی بڑی چوٹ نہیں آئی محض ٹھوڑی پر تین ٹانکے لگے ہیں۔

وزیراعظم نے گھر پہنچنے کے فوراً بعد ابا کو ہمارے حادثے کے بارے میں اطلاع دے دی تھی اور یہ بھی بتا دیا گیا تھا کہ کوئی بڑی چوٹ نہیں لگی اور وزیراعظم نے انہیں سی ایم ایچ بھجوانے کا انتظام کر دیا ہے۔ اس واقعہ سے پتا چل سکتا ہے کہ ہم وزیراعظم اور ان کے خاندان کے کس قدر نزدیک تھے۔ لیکن یہ ذاتی تعلقات میری نظریاتی وابستگی پر اثر انداز نہیں ہو سکے تھے، اور اس کی وجہ یہ تھی کہ میں اپنے ضمیر کے خلاف سمجھوتہ نہیں کر سکتا تھا۔

جب ہم فوج میں تھے، ہماری سرگرمیوں کے بارے میں میجر رفیق اپنی ایک کتاب میں لکھا:

''ہم عصر دنیا میں عوامی جمہوریہ چین، کمبوڈیا، کیوبا اور ویت نام میں آزادی حاصل کرنے کے بعد مجاہدین آزادی نے ملکی اقتدار پر قبضہ حاصل کر لیا تھا۔ لیکن یہ بنگلہ دیش میں استثنیٰ تھا۔ جنگ آزادی کے مجاہدین نے اپنے ہتھیار ڈال دیئے تھے اور ملک پر حکومت کرنے میں سیاسی رہنماؤں کے لیے کوئی مسئلہ پیدا نہیں کیا تھا۔ بنگلہ دیش فوج کے افسر اور فوجی، جنہوں نے جنگ آزادی میں شمولیت اختیار کی تھی ملک میں غربت، معاشی انہدام اور رشوت ستانی سے شدید ناخوش تھے۔

افسروں اور فوجیوں نے حکومت اور ریاست کاری پر غور کرنا شروع کر دیا تھا۔ میجر دالیم، میجر پاشا، میجر بزل الہدیٰ اور میجر شہریار، تمام کے تمام کومیلا چھاؤنی میں تعینات تھے۔ یہ فرصت کے اوقات میں اکثر مل بیٹھتے اور ملک میں موجود سیاسی صورتِ حال، حکومتی پارٹی عوامی لیگ کے بدعنوان رہنماؤں، حکومتی بدانتظامی اور معاشی صورتِ حال پر اپنی ناخوشی کا اظہار کیا کرتے تھے۔ ایک خفگی اور ناراضی کا ماحول پیدا ہونا شروع ہو گیا تھا۔ 1972ء میں کرنل طاہر اور کرنل ضیا الدین جو دونوں اس وقت بریگیڈ کمانڈر تھے، کومیلا اور ڈھاکہ میں باقاعدگی سے ''سٹڈی پیریڈز'' کا انتظام کیا کرتے تھے۔ وہ نوجوان افسروں سے کھلم کھلا بات چیت کیا کرتے تھے اور ملک کی مجموعی سیاسی صورتِ حال، سیاسی پیش رفتوں اور معاشی ترقی حاصل کرنے میں حکومت کی ناکامیوں کا تجزیہ کیا کرتے تھے۔''

اس کتاب میں لیڈیز کلب میں ہونے والے واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے، جس کا ذمہ دار ریڈ کراس کا چیئرمین اور ڈھاکہ عوامی لیگ کا صدر غازی غلام مصطفیٰ تھا، میجر رفیق لکھتے ہیں:

''شیخ مجیب الرحمٰن کے گھر میں میجر دالیم نے اپنے کندھے اور بازو پر جنگ آزادی کے وقت کے زخم دکھاتے ہوئے کہا،''جب ہم آزادی کے لیے لڑ رہے تھے اس وقت آپ کے یہ دستے کہاں تھے؟'' شیخ مجیب الرحمٰن نے انصاف کرنے کا وعدہ کرتے ہوئے دونوں فریقوں کو ٹھنڈا کیا۔ میجر دالیم اور ان کی بیوی کو زِچ کرنے کے اس واقعہ پر ڈھاکہ چھاؤنی میں اضطراب کی سی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ لیکن اس ناخوشگوار واقعہ کے نتیجے میں، جس کا سرغنہ قاضی غلام مصطفیٰ تھا، دالیم اور میجر نور کو ناجائز طور پر فوج سے ریٹائر کر دیا گیا۔ بظاہر یہ ایک معمولی سا واقعہ تھا لیکن اس نے فوج کے ہر طبقے میں ایک پوشیدہ بے اطمینانی پیدا کر دی تھی۔ میجر دالیم عام فوجیوں اور اپنے ساتھیوں میں بہت مقبول تھے اور ان کی بہت زیادہ عزت کی جاتی تھی۔''

133۔ میجر جنرل شفیع اللہ کا انٹرویو

بنگلہ دیش کی فوج اور جے آر بی کے ساتھ شیخ مجیب الرحمٰن کے رویوں کے بارے میں ہمیں میجر جنرل شفیع اللہ کے اس انٹرویو سے مفید معلومات حاصل ہوتی ہیں جو لندن سے شائع ہونے والے بنگالی ہفتہ روزہ ''جنامت'' میں 28 اگست 1987ء کو شائع ہوا اور بنگلہ دیش کے چند مقامی روزنامہ اخباروں میں 23 ستمبر کو شائع کیا گیا۔ یہاں انٹرویو سے چند اقتباسات دیئے جا رہے ہیں:

سوال: حکومت اور فوج کے درمیان تعلقات خوشگوار نہ تھے۔ یہاں تک کہا جاتا ہے کہ حکومت فوج پر اعتبار نہیں کرتی تھی۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ یہ بات درست ہے؟

جواب: عوامی لیگ کی حکومت ذاتی طور پر مجھ پر بھروسا کرتی تھی۔ لیکن یہ بات یقین سے نہیں کہی جا سکتی کہ آیا وہ بحیثیت مجموعی فوج پر بھروسا کرتی تھی یا نہیں۔

سوال: آزادی کے بعد آپ کو کیوں چیف آف آرمی سٹاف بنایا گیا؟

جواب: یہ ایک سیاسی فیصلہ تھا۔ یہ جنرل عثمانی کا فیصلہ نہیں تھا۔

سوال: کیا عوامی لیگ حکومت نے ''جاتیو راکھی باہنی'' قائم کرنے سے پہلے آپ سے کوئی مشورہ یا بات چیت کی تھی؟

جواب: نہیں! جے آر بی قائم کرنے کے بعد مجھے اطلاع دی گئی کہ اسے پولیس کی مدد کے لیے قائم کیا گیا ہے۔ لیکن میں نے لوگوں سے سنا تھا کہ راکھی باہنی فوج کی جگہ لینے کے لیے قائم کی گئی تھی۔

سوال: فوج اور راکھی باہنی کے درمیان کس قسم کے تعلقات تھے؟

جواب: ان کے درمیان تعلقات اچھے نہیں تھے۔ اس کی کچھ جائز وجوہات تھیں۔ ان دنوں میں یہ افواہ عام تھی کہ راکھی باہنی فوج کی جگہ لینے کے لیے تشکیل دی گئی ہے۔ ایک نئی فوج کے طور پر جے آر بی کو ہر چیز بالکل نئی مہیا کی گئی تھی۔ اس کے برعکس فوج کی حالت انتہائی افسوس ناک تھی۔ حکومت کے اس قسم کے

امتیازی سلوک پر مسلح افواج میں موجود بہت سے لوگوں کے دل دکھتے تھے۔ اس کے نتیجے میں (حکومت اور فوج کے تعلقات میں) کشیدگی پیدا ہو جاتی تھی۔ لیکن حکومت نے راکھی باہنی کو تلاشی اور گرفتاری کے اختیارات دے کر بہت بڑی غلطی کر دی۔ اس بات پر مسلح افواج کے بہت سے آفیسر بہت پریشان ہوئے اور غصے میں آ گئے۔ نہ صرف یہ کہ راکھی باہنی نے مختلف اوقات میں بہت سے فوجی افسروں کو پریشان اور زچ کیا بلکہ صورتِ حال سے یوں نظر آتا تھا گویا راکھی باہنی فوج کی نسبت زیادہ طاقت ور ہے۔

سوال: شیخ مجیب الرحمٰن مسلح افواج کو مضبوط کرنے اور اس کی ضروریات مہیا کرنے کے حق میں نہیں تھے۔ کیا یہ درست ہے؟

جواب: جی ہاں! میں یہی کہوں گا کہ یہ درست ہے۔

سوال: لیڈیز کلب میں غازی غلام مصطفےٰ اور میجر دالیم کے درمیان ہونے والے ناخوشگوار واقعہ پر چیف آف آرمی سٹاف کے طور پر آپ نے کوئی کارروائی کی تھی؟

جواب: مسئلے کا علم ہونے پر میں دالیم کی جانب سے انصاف حاصل کرنے کے لیے بنگا بندھو کے پاس گیا تھا۔ بنگا بندھو میری بات پر آگ بگولا ہو گئے۔ میں نے کہا کہ بنگو بندھو اگر میں اپنے افسروں کے لیے بات نہیں کروں گا تو کون کرے گا۔ آپ برائے مہربانی غازی غلام مصطفےٰ کے معاملے کی تحقیق کروائیں۔ اگر اس معاملے میں آپ کو کسی مدد کی ضرورت ہے تو میں مدد مہیا کرنے کو تیار ہوں۔ جیسا کہ آفیسرز غازی کے خلاف تھے اور میں آفیسرز کے حق میں تھا۔ میں نے غازی کے خلاف بات کی، جس پر وہ بہت ناخوش ہوئے اور انگریزی میں محض اتنا کہا، "شفیع اللہ کیا تم جانتے ہو، تم مجھ سے بات کر رہے ہو۔"

میں نے کہا، "سر میں جانتا ہوں۔ میں اپنے لیے بات نہیں کر رہا۔ میں آپ کے لیے بات کر رہا ہوں۔ لوگوں نے آپ کو سچ نہیں بتایا۔" اس وقت ضیا اور شفاعت بھی موجود تھے۔

سوال: اس کے بعد کیا ہوا؟

جواب: پھر ہم مایوسی کے عالم میں واپس آ گئے، کوئی انصاف نہیں کیا گیا تھا۔ بعد میں حکومت نے میجر دالیم کو فوج سے ریٹائر کر دینے کا فیصلہ کر لیا۔

134۔ عبوری حکومت اور شیخ مجیب نے ہندروسی بلاک سے ناتا جوڑ لیا کیوں کہ پاکستانی فوج کی کارروائی کا سامنا کرنے کے لیے انہوں نے کوئی پیشگی تیاری نہیں کی تھی

جنگ آزادی کے دوران میں تاج الدین کی جلاوطن حکومت مکمل طور پر ہندروسی اتحاد کے زیر اثر تھی۔ جنگ کے فوراً بعد روسی نیوی کا ایک جنگی بیڑا بندرگاہ اور سمندر سے بارودی سرنگیں اور تباہ شدہ جہازوں کا ملبہ صاف کرنے کے بہانے چٹاگانگ بندرگاہ پر پہنچا۔ انہوں نے ایک وسیع علاقے پر قبضہ کر لیا اور اسے ممنوعہ

علاقہ قرار دے دیا گیا۔ بنگلہ دیش کی مسلح افواج کو بھی اس علاقے میں جانے کی اجازت نہیں تھی۔ روسی بیڑا چٹا گانگ میں 2 سال سے بھی زیادہ رہا۔ یہ باتیں سامنے آنا شروع ہو گئی تھیں کہ روسی سرنگیں ہٹانے کی بجائے مشکوک سرگرمیوں میں مصروف ہیں۔

یہ سب کچھ شیخ مجیب الرحمٰن کی اجازت سے ہو رہا تھا۔ روسی نیوی کے چٹا گانگ پر قبضے سے یہ بات صاف ظاہر ہو رہی تھی کہ شیخ مجیب ہند روسی بلاک سے ناتا جوڑے ہوئے تھے۔

25 اور 26 مارچ کی فیصلہ کن درمیانی رات، جنگ آزادی کے لیے عوامی لیگ کی تیاری اور جنگ کے بارے میں اندرا گاندھی کے رویے کے بارے لکھتے ہوئے میجر رفیق الاسلام پی ایس سی اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

''25 کی رات کی فوجی ٹولے کی بے رحمانہ کارروائی کے بعد (جیسا کہ طاقت ور فوج کا براہِ راست سامنا کرنے کے لیے کوئی تیاری نہیں کی گئی تھی) عوامی لیگ کی قیادت عوام کو برستی ہوئی گولیوں میں چھوڑ کر کلکتہ بھاگ گئی۔ مسز اندرا گاندھی جو پنڈت جواہر لال نہرو کی قابل جانشین تھی اور اکھنڈ بھارت کا خواب دیکھتی تھی، ایک عرصہ سے اس قسم کے موقع کے انتظار میں تھی۔ اس نے اس سنہری موقع کو درست وقت پر استعمال کیا۔ نہ صرف یہ کہ دہلی اپنے دشمن نمبر ایک پاکستان کو توڑنے اور کمزور کرنے میں کامیاب ہو گیا بلکہ اس نے اپنی بڑھتی ہوئی خانہ جنگی کو بھی دبانے میں کامیابی حاصل کر لی جس کی ابتدا مغربی بنگال کے علاقے میں بائیں بازو کی طاقتوں نے کر رکھی تھی۔''

135۔ شیخ برادرز کی سونے کے تاج پہن کر شادیاں جب کہ عوام قحط سے مر رہے تھے

1976ء کے قحط کے بعد ایک دن شیخ کمال اور ریحانہ مالی باغ آئے۔ وہ ہمیں شادی میں مدعو کرنے آئے تھے۔ یہ دونوں بھائی ایک ہی دن شادی کر رہے تھے۔ شیخ جمال پہلے تربیت کے لیے یوگوسلاویہ گیا اور اسے یہ جگہ پسند نہ آئی تو وہ سینڈ ہرسٹ آ گیا۔ یہاں ایک شارٹ کورس کرنے کے بعد واپس آ گیا اور میجر جنرل شفیع اللہ کی بٹالین 2 ایسٹ بنگال رجمنٹ میں ایک آفیسر کے طور پر شامل ہو گیا۔ شادی کی تقریب نئے گانو بھون میں ادا کی گئی تھی۔ بڑے شان دار انتظامات کیے گئے تھے۔ مہمانوں کی تعداد ہزاروں میں تھی۔ ساری تقریب بہت رنگین اور شان دار تھی۔ اگلے دن اخبارات نے شادی کے انتہائی پر تکلف انتظامات کی خبریں شائع کیں اور حقیقی سونے کے تاج پہنے ہوئے دلہے دلہنوں کی تصاویر شائع کیں، ان کے ساتھ انہوں نے بھوکے ڈھانچوں کی کوڑا دانوں سے خوراک کے حصول کے لیے کتوں سے چھینا چھپٹی کی تصویریں بھی شائع کیں۔ ستم ظریفانہ طور پر 1972ء میں شادی کسی کی تقریب میں شرکت کرتے ہوئے شیخ مجیب الرحمٰن نے اپنی مایوسی کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا، ''میں بنگلہ دیش کی لڑکیوں کی شادیاں سونے کے زیورات کی بجائے

پھولوں کے ہاروں میں ہوتی ہوئی کب دیکھوں گا۔'' یہ بیان اخبارات میں خوب اچھالا گیا تھا۔

لیکن یہ الفاظ اور عمل کا کیسا تضاد تھا۔ یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں تھا لیکن اس کے بارے میں ہر جگہ باتیں ہو رہی تھیں۔

136۔ بیگم خالدہ ضیا کا پارلیمنٹ میں بیان

1974ء کے قحط کے دوران بدعنوانیوں اور امدادی اشیاء میں خرد برد کے بارے میں بیان دیتے ہوئے 13 اگست 1992ء کو وزیراعظم بیگم خالدہ ضیا نے پارلیمنٹ میں کہا، ''امدادی سامان میں خرد برد کی وبا اس حد تک بڑھ چکی تھی کہ اس وقت کے سربراہ حکومت شیخ مجیب الرحمٰن کو بھی پوچھنا پڑا تھا کہ 'میرے حصے کا کمبل کہاں ہے؟'''

اس وقت شیخ حسینہ عوامی لیگ کی رہنما بھی قائد حزب اختلاف کے طور پر پارلیمنٹ میں موجود تھیں۔ وہ اس بیان کو جھٹلا نہ سکیں اور انہیں یہ کڑوی گولی نگلنا پڑی۔

137۔ مجاہدین آزادی کے تاثر کو ایک منصوبے کے تحت خراب کیا گیا

مسٹر بدرالدین عمر ایک مشہور سیاست دان اور ملک کے نمایاں دانشور اپنی کتاب ''شادھن وتر نپاتھیا کاہینی'' میں لکھتے ہیں:

''نوجوان مجاہدین آزادی نے لوگوں کے دل جیت لیے تھے۔ ان کی قربانیاں تاریخ بن چکی ہیں۔ ان کی حب الوطنی ہمیشہ جگمگاتی رہے گی۔ کوئی بھی نہیں کہہ سکتا کہ مکتی باہنی نے کچھ لوٹا ہو، کسی کو ذاتی دشمنی کی وجہ سے قتل کیا ہو یا کسی عورت کی عصمت دری کی ہو۔ مجاہدین آزادی کے اس تاثر کو ماند کرنے کے لیے نوجوان رہنماؤں نے باقاعدہ ایک سازش کی تھی۔ انہوں نے ایک لمحے کے لیے بھی یہ نہ سوچا کہ اپنی برتری قائم کرنے کے اس مذموم کھیل میں وہ قوم کو کہاں کھینچ کر لے جا رہے ہیں۔ شیخ مونی، طفیل اور رزاق سارے غازی غلام مصطفٰے کے ساتھ شامل ہو گئے تھے جو شیخ مجیب الرحمٰن کا انتہائی محبوب اور اُن کے خاندان کا بہت بااعتماد شخص خیال کیا جاتا تھا۔ لوٹ مار روز کا معمول بن چکی تھی۔ امدادی سامان، غیر بنگالیوں کی دکانیں، گودام اور گھر تمام کے تمام غازی اور نوجوان رہنماؤں کے حکم پر تباہ و برباد کیے اور چھینے جا رہے تھے۔ لوگوں کی جائیدادوں کو لوٹنا پورے ملک میں معمول کا عمل بن چکا تھا۔ ''سولھواں ڈویژن'' اور مجیب باہنی، سب لوٹ مار میں کھلم کھلا شریک تھے۔ شیخ مجیب نے اس قسم کی سرگرمیوں کو روکنے کے لیے ایک قدم بھی نہیں اٹھایا تھا۔''

138۔ ہم خیال ترقی پسند پارٹیوں کے درمیان اتحاد کی کوشش

مخالف سیاسی جماعتیں حکومت اور اس کی باہنیوں کے استبداد کے خلاف مزاحمت کی پوری

کوششیں کر رہی تھیں۔ سر بہارا پارٹی اور جے ایس ڈی کے کارکن اپنی حکومت کے خلاف کارروائیوں میں بہت زیادہ سرگرم تھے۔ عوام عمومی سطح پر ''عوامی ایکیوجوت'' کے خلاف تھے۔ اس وحشیانہ استبداد کے تحت ہر کوئی اپنی زندگی اور جائیداد کے حوالے سے خوف زدہ تھا۔ کمیونسٹ پارٹی ایم ایل، جے ایس ڈی، سر بہارا پارٹی، جاتیولیگ اور نیپ بھاشانی کھلم کھلا اور پوشیدہ جدوجہد میں مصروف تھیں۔ ان کے کچھ مقاصد مشترک بھی تھے۔ عام آدمی بھی، جو عوامی لیگ کا مخالف ہو چکا تھا، پیچھے نہیں تھا۔ لیکن اس وقت تک کوئی واحد پارٹی اتنی مضبوط نہ ہو سکی تھی کہ پورے ملک میں اپنا اثر و رسوخ قائم کر سکتی۔ یہی وجہ تھی کہ عوام کسی مخصوص پارٹی کے پلڑے میں اپنا وزن ڈالنے کے لیے پُر اعتماد نہیں تھے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ زیادہ تر حکومت مخالف جماعتوں کے تقریباً ایک جیسے ہی مقاصد اور اہداف تھے۔ اگر چہ یہ ساری جماعتیں حکومت مخالف سرگرمیوں میں مصروف تھیں اور ایک جیسے ہی بیانات دے رہی تھیں لیکن وہ اپنی جدوجہد میں متحد نہیں ہو رہی تھیں۔ اگر چہ ان جماعتوں میں کوئی بڑے اختلافات نہیں تھے، لوگ چاہتے تھے کہ یہ متحد ہو جائیں۔ کچھ سیاسی شعور رکھنے والے بااثر افراد اس قسم کے اتحاد کے لیے کوششیں بھی کر رہے تھے۔ ہمیں اس بات میں کوئی شک نہیں تھا کہ بغیر کسی متحدہ تحریک کے ان کی تمام کوششیں بے اثر رہیں گی اور آخر کار مخالف جماعتوں میں سے کوئی بھی حکومت مخالف جدوجہد میں اپنے آپ کو قائم نہیں رکھ سکے گی۔ جماعتوں کے کارکن جو اتحاد کی حمایت کرتے تھے اپنے رہنماؤں کے خوف کی وجہ سے بات نہیں کر سکتے تھے جو آپس میں کھل کر بات چیت کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ اس کی چند وجوہات تھیں، مثلاً قیادت کا سوال، ماضی کی تلخیاں، بداعتمادی اور لمبے عرصے کی کمزوریاں اور ناکامیاں انہیں ایک دوسرے سے دُور رکھے ہوئے تھیں۔ یہ رکاوٹیں انہیں متحد نہیں ہونے دے رہی تھیں اور لوگوں کی پریشانی میں اضافہ ہو رہا تھا۔

میں نے اور چند دوسرے دوستوں نے اس قسم کی جامد صورتِ حال میں محبِ وطن اور قوم پرست قوتوں میں اتحاد کے لیے خفیہ سرگرمیاں شروع کر رکھی تھیں۔ جب ہم نے اس کام کا آغاز کیا تو ہمیں پتا چلا کہ اس قسم کا اتحاد قائم کرنا ناممکن نہیں تو بہر حال مشکل ترین کام ضرور ہو گا۔ لیکن اس کے باوجود ہم اپنی سی پوری کوشش کر رہے تھے۔ اکثر رہنما اگر چہ ہماری باتوں سے پورا اتفاق نہیں کرتے تھے لیکن وہ ہماری مخلصانہ کوششوں کو قدر کی نگاہ سے اور ہماری جدوجہد کو مثبت رنگ میں دیکھتے تھے۔ تاہم اس کام میں زیادہ پیش رفت نہ کی جا سکی، یہ حوصلہ شکن ماحول تھا لیکن ہم نے امید کا دامن کبھی بھی ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ ہم نے تمام رکاوٹوں کے باوجود اپنا کام جاری رکھا۔

139۔ یونائیٹڈ پیپلز پارٹی تشکیل دی گئی

اس دوران ایک دن کرنل اکبر آئے اور انہوں نے بتایا کہ چوں کہ ہماری اتحاد کی کوششیں بے ثمر رہی ہیں اور مستقبل میں بھی ناکامی کا سامنا ہی ہو گا، اس لیے قاضی اظہار، مینن، رونو اور انہوں نے ایک نئی

سیاسی پارٹی تشکیل دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ کرنل اکبر نے اُن کی طرف سے مجوزہ پارٹی کی نائب صدارت کا عہدہ مجھے پیش کیا۔ جواب میں میں نے کہا کہ ''ہمیں اتنی جلدی مایوس نہیں ہو جانا چاہیے۔ میرے لیے اس مرحلے پر ایک غیر جانب داراور آزاد شخص رہنا زیادہ فائدہ مند ہوگا۔ اگر میں آپ کی پارٹی میں شامل نہیں بھی ہوتا تب بھی قوم کے عظیم تر مفاد میں ضرورت کے وقت یقیناً ہم شانہ بہ شانہ کھڑے ہوں گے۔ میرا خیال ہے کہ ہم سب ایک دوسرے پر اعتماد رکھتے ہیں اس لیے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔'' چند روز کے بعد یو پی پی (یونائٹڈ پیپلز پارٹی) کے قیام کا اعلان کر دیا گیا۔ کرنل اکبر اس جماعت کے بانی نائب صدور میں سے تھے۔ تاہم ہمارے باہم رابطے قائم رہے۔

140۔ میرے بہترین دوست محبوب نے مجھے خبردار کیا

1974ء کے آخر میں میرے چھوٹے بھائی شپن کی شادی تھی۔ اس کی شادی ہمارے کزن گروپ کیپٹن کمال الدین احمد کی بیٹی مُنی سے ہو رہی تھی۔ بارات کے استقبال کا انتظام ایئر فورس آفیسرز میس میں کیا گیا تھا۔ وہاں ڈھاکہ کے پولیس سپرنٹنڈنٹ اور ایک اچھے دوست محبوب مجھے ایک طرف لے گئے اور کہا، ''دالیم! دوست کی حیثیت سے میں تمہیں ایک بات کہوں گا جس پر تمہیں بُرا نہیں ماننا ہوگا۔'' یہ ایک اندیشہ ناک بات تھی لیکن میں نے سکون میں رہتے ہوئے کہا، ''ٹھیک ہے، اِدھر اُدھر باتیں مارنے کی ضرورت نہیں، مجھے سیدھے الفاظ میں بتاؤ معاملہ کیا ہے۔''

''دیکھو میں تمہیں مصیبت میں نہیں دیکھ سکتا۔ میں تمہیں صرف خبردار کر رہا ہوں کہ ہوشیار رہو۔ سراج شیکدار ایک دو روز میں یقیناً گرفتار ہونے والا ہے۔ مجھے اس کی پروا نہیں۔ جس وجہ سے میں پریشان ہوں، وہ یہ ہے کہ تفتیش کے دوران اس کے ایک بہت قریبی ساتھی کی نوٹ بک سے تمہارا نام ملا تھا۔'' انہوں نے انکشاف کیا۔

''اگر کوئی شخص میرا نام اپنی نوٹ بک میں لکھ لے تو میں کیا کر سکتا ہوں؟'' میں نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے۔ تم بہت باشعور ہو۔ میں صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ اپنی آمدورفت اور ساتھیوں کے بارے میں محتاط رہو۔ میں سنجیدگی سے بات کر رہا ہوں۔''

کسی نے ہم دونوں کو اکٹھا دیکھا اور آگے آ کر کہنے لگا کہ کھانا لگ چکا ہے۔ ہم نے اپنی گفتگو ختم کی اور ڈائننگ ہال کی جانب چل پڑے۔ کھانے کے دوران بھی جو کچھ محبوب نے کہا تھا، میں اس پر غور کرتا رہا۔ مجھے اپنی آمدورفت میں مزید محتاط ہو جانا چاہیے۔ گویا کہ میں حکومتی ایجنسیوں کی آنکھوں میں مشکوک ہو چکا تھا۔ محتاط رہنا ہی بہتر ہے، میں نے اپنے آپ سے کہا۔ سراج شیکدار کو بھی ایک دو روز میں پکڑا جانے والا ہے، محبوب یہ بات اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتا ہے؟ کیا حکومت نے کوئی ایسا جال بچھا دیا ہے جس کا ابھی تک پارٹی کو علم نہیں؟ یقیناً یہی بات ہوگی، ورنہ محبوب اتنے یقین سے یہ بات نہیں کر سکتا تھا۔ یہ میری رائے تھی۔

مجھے یہ معلومات جتنی جلدی ہو سکے صحیح جگہ تک پہنچا دینا چاہیے۔ اگلے دن یہ معلومات صحیح حلقوں تک پہنچا دی گئیں۔ جواب آیا کہ ''پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔''

ہماری سائنس انٹرنیشنل کا دفتر موتی جھیل کے کمرشل ایریا ٹوئن بی سرکلر روڈ پر واقع تھا۔ کاروبار کے سلسلے میں یہاں ہر قسم کے لوگوں کا ہجوم رہتا تھا۔ مختلف طبقات سے تعلق رکھنے والے بہت سے لوگ ہمارے دفتر میں آیا کرتے تھے۔ اس ہجوم کا حصہ بن کر مختلف سیاسی پارٹیوں کے رہنما اور کارکن بھی آیا کرتے تھے۔ ان حالات میں کسی کی ڈائری میں میرا نام ہونا کوئی حیران کن بات نہ تھی۔ لیکن تشویش ناک بات یہ تھی کہ میرا نام سربہارا پارٹی کے ایک اہم عہدے دار کی ڈائری میں تھا۔ میرے اور بھی بہت سی سیاسی پارٹیوں سے روابط تھے لیکن محبوب نے اُن کا ذکر نہیں کیا تھا۔ کیا اس کا مطلب یہ تھا کہ سربہارا پارٹی کی طرح میرا نام بھی حکومت کی ترجیحی فہرست میں شامل تھا؟ ہم نے اس موضوع پر آپس میں بہت باریک بینی سے بحث مباحثہ کیا۔ ہر ایک نے یہی کہا کہ محبوب کے انتباہ کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے اور مجھے احتیاط کے ساتھ گھومنا پھرنا چاہیے، لیکن معمولاتِ زندگی وہی رکھنے چاہیں۔ کوئی مشکوک رویہ یا حرکت محض حکومت کے خدشات میں اضافہ کرے گی۔

شیخ مجیب اس وقت تک تاج الدین کو ان کی بیرونِ ملک سے واپسی کے فوراً بعد پارٹی کے اندرونی اختلاف اور نوجوان رہنماؤں کے دباؤ کی وجہ سے پہلے ہی برطرف کر چکے تھے۔ اگرچہ جنگِ آزادی کے دوران ہم تاج الدین کی پالیسیوں کی حمایت نہیں کر سکتے تھے، ایک انسان کے ناتے ان میں بہت سی خوبیاں تھیں جن کی وجہ سے میں ان کی عزت کیا کرتا تھا۔ اُن کی برطرفی کی خبر سن کر اس شام میں افسوس کرنے کے لیے ان کی سرکاری رہائش گاہ پر چلا گیا۔ ہم لان میں بیٹھ گئے۔

جب میں گپ شپ کے بعد اٹھنے لگا تو انہوں نے سوال کیا، ''اگر میں مستقبل میں تمہیں ملنا چاہوں تو کیا تم ملو گے؟'' میں قدرے حیران ہوا لیکن میں نے کہا، ''مجھے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔'' ہم نے آئندہ آپس میں رابطے میں رہنے کا فیصلہ کر لیا۔

141۔ میری جان لینے کی دوسری کوشش

شاریکندی اور دھنوٹ میں ہمارے منصوبے معمول کے مطابق چل رہے تھے۔ ایک دن مجھے وہاں کچھ سامان پہنچانے اور کام کی پیش رفت پر نظر ڈالنے کا فرض سونپا گیا۔ اس کے مطابق میں ٹرک کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ جب ہم نگر باڑی گھاٹ پر پہنچے تو وہاں کشتی کا کچھ مسئلہ تھا۔ ہم دوسرے کنارے پر پہنچے تو اندھیرا چھا چکا تھا۔ میں نے رات گھاٹ پر ہی بسر کرنے کا فیصلہ کیا۔ رات کے وقت سفر کرنا محفوظ نہیں تھا۔ ہمیں اس راستے پر اکثر سفر کرنا پڑتا تھا کیوں کہ ملک کے شمالی اور مغربی علاقے میں مختلف جگہوں پر ہمارے دو منصوبے چل رہے تھے۔ سڑک کنارے ایک چھوٹا سا ریستوران میری پسندیدہ جگہ تھی۔ میں وہاں کھانا پسند کرتا تھا۔ اس طرح سے میں ان کا تقریباً مستقل گاہک بن چکا تھا۔ ریستوران کے مالک حاجی صاحب

میرے اچھے دوست بن گیے تھے۔ میں نے حاجی صاحب سے کہا کہ ''میں یہاں گھاٹ پر رات بسر کرنا چاہتا ہوں۔''

''سر کوئی مسئلہ نہیں میں سارے انتظامات کر دوں گا۔'' حاجی صاحب نے جواب دیا۔ ایک چارپائی کا انتظام کر دیا گیا اور میرے لیے ایک مچھر دانی بھی مہیا کر دی گئی۔ یہ گرمیوں کی ایک گرم رات تھی۔ کھانا کھانے کے بعد مجھے نیند نہیں آ رہی تھی، لہٰذا میں باہر آ گیا اور دیکھا کہ میرا ٹرک ڈرائیور اور کنڈیکٹر تاش کھیل رہے ہیں۔ وہ 29 کی گیم کھیل رہے تھے۔ میں بھی ان میں شامل ہو گیا۔ جلد ہی میں گیم میں گم ہو گیا۔ آدھی رات ہو چکی تھی لیکن گیم اتنی دلچسپ ہو گئی کہ ہم کھیلتے ہی چلے جا رہے تھے۔ اچانک ہمیں اپنے بالکل نزدیک سے سٹین گن کے فائروں کی آواز آئی۔ ہم تینوں پناہ کے لیے ٹرک کے نیچے گھس گئے۔ وہاں سے ہم نے چار پانچ افراد کو بلا امتیاز فائرنگ کرتے دیکھا۔ انہوں نے تقریباً پانچ منٹ تک فائرنگ جاری رکھی۔ پھر ایک جیپ میں بیٹھ کر فرار ہو گئے۔ حاجی صاحب کی رہائش قریب ہی تھی۔ جب فائرنگ رک گئی تو وہ کچھ لوگوں کے ساتھ بھاگتے ہوئے آئے۔ جیسے ہی انہوں نے مجھے دیکھا بھاگ کر آئے اور مجھے گلے لگا لیا۔ ان کے آنسو بہہ رہے تھے اور سادہ دل، خدا خوف حاجی صاحب بار بار کہہ رہے، ''اللہ مہربان، اللہ مہربان۔''

یہ درست ہے کہ اللہ تعالیٰ بہت زیادہ رحم کرنے والا ہے۔ حاجی صاحب اور میں سمجھ گئے تھے کہ ہدف کون تھا، باقیوں کو علم نہ تھا۔ دوسرے دن صبح سویرے میں نے ٹرک ڈرائیور اور دوسرے افراد کو منصوبوں کے مقام پر جانے کو کہا اور خود ڈھاکہ واپس آ گیا۔ میں نے بہت سی وجوہات کی بنا پر اس واقعہ کا سوائے اپنے بہت قریبی ساتھیوں کے کسی سے بھی ذکر نہ کیا۔ اس کے بعد میں نے شاذ ہی ڈھاکہ سے باہر کا سفر کیا۔ یہ ذمہ داری نور یا شپن میں سے کوئی ادا کرتا تھا۔

142۔ تاج الدین احمد مجھے ملنا چاہتے تھے

ایک دن میں اپنے دفتر میں بیٹھا ہوا تھا، میں نے اچانک بڑی حیرانی سے دیکھا کہ میرے سُسر کے بڑے بھائی ایک معروف دانشور اور صحافی اور کسی وقت ''پاکستان ٹوڈے'' کے ایڈیٹر مسٹر سراج الاسلام چوہدری اندر تشریف لا رہے ہیں۔ میں ان کے ادب میں کھڑا ہو گیا اور کہا، ''کاکو آپ یہاں کیسے تشریف لائے ہیں۔ آپ مجھے پیغام بھیج سکتے تھے، میں خود حاضر ہو جاتا۔'' وہ ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ وہ ایک عمر رسیدہ شخص تھے اور تھکے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

''میں کسی خاص وجہ سے آیا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ میں خود آیا ہوں۔ تاج الدین تم سے فوراً ملنا چاہتا ہے۔'' تاج الدین اور کاکو رشتہ دار تھے۔ مسز تاج الدین اور مسز چوہدری دونوں بہنیں تھیں۔

''کہاں؟'' میں نے کہا۔

''نٹی بازار میں۔''

''ٹھیک ہے کل دوپہر کے کھانے کے بعد میں اور نور آئیں گے۔'' میں نے کہا۔ ٹھنڈا پینے کے بعد وہ چلے گئے۔

اگلے دن مقررہ وقت پر ہم ٹی بازاران کے گھر پہنچ گئے۔ تاج الدین انتظار کر رہے تھے۔ تاج الدین ہم دونوں کو اچھی طرح جانتے تھے۔ اوپر کی منزل میں ایک کمرے میں ہم نے ملاقات شروع کی۔

''آپ ملک کی موجودہ صورتِ حال کو کیسے دیکھتے ہیں؟'' جیسے ہی ہم سلام دعا کے بعد اپنی جگہوں پر بیٹھے، تاج الدین نے ہم سے پوچھا۔

''ملک جو آپ نے تراشا ہے یہاں مسائل کا کوئی کال نہیں ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''ملک کو آزادی دلانے والے تم ہو'' تاج الدین نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''ایسی بات ہے؟ آپ سے زیادہ کوئی نہیں جانتا کہ ہم اس قسم کی آزادی حاصل نہیں کرنا چاہتے تھے۔'' میں نے جواب دیا۔ تاج الدین خاموش تھے۔ میں نے بات جاری رکھی۔

''تاج الدین صاحب! کیا آپ اتفاق نہیں کرتے کہ 1971ء کے ہمارے سارے خدشات ایک ایک کر کے درست ثابت ہو رہے ہیں؟ تاہم آئیں ہم ماضی کی بات نہ کریں۔ اب بتائیں کہ آپ نے مجھے کس لیے بلایا ہے؟'' میں نے براہِ راست سوال کیا۔

''ملک کو بچانے کی ضرورت ہے۔'' انہوں نے زور دیتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ مگر کیسے؟'' میں نے پوچھا۔

''عوام کو مکمل نجات سوشلزم کے ذریعے حاصل ہو سکتی ہے۔'' تاج الدین نے کہا۔

''یہ بحث طلب معاملہ ہے۔ ساری عمر آپ نے بورژوا سیاست کی ہے اور اب آپ سوشلزم قائم کرنا چاہتے ہیں، یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟ لوگ آپ پر کیوں یقین کریں گے۔ اس کے علاوہ عوامی لیگ بھی ایک بورژوا تنظیم ہے۔ شیخ مجیب پر الزام کیوں لگایا جائے؟ اس قسم کی پارٹی کے ساتھ کوئی بھی حقیقی سوشلزم قائم نہیں کر سکتا۔ مجھے یقین ہے اب آپ بھی اس بات کو سمجھتے ہیں۔ سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ جس طرح آپ نے سوشلزم کو بدنام کیا ہے، اب ملک کے لوگ سوشلزم کی اصطلاح سے اس قدر خوف زدہ ہیں کہ وہ آنے والے کئی سالوں تک اس کا نام بھی سننا پسند نہیں کریں گے۔

مزید برآں پورے ملک میں گھومنے کے بعد، جو تجربہ مجھے حاصل ہوا ہے، وہ یہ ہے کہ ہمارے عوام جنونی نہیں ہیں لیکن وہ مذہبی ضرور ہیں۔ آپ لوگ عوام کو اپنے ''چار اصولوں'' کا قائل نہیں کر سکے۔ جب میں عوام کا نام لیتا ہوں تو میری مراد ڈھاکہ، چٹاگانگ اور کھلنا کے عوام نہیں ہوتے۔ میں ان 95 فیصد عوام کی بات کر رہا ہوتا ہوں جو اب بھی دیہاتی علاقوں میں رہتے ہیں۔ آپ اوپر سے کوئی چیز مسلط نہیں کر سکتے۔ انسان گوشت اور خون سے بنے ہوتے ہیں۔ اُن کی مادی اور روحانی دونوں ضروریات ہوتی ہیں۔ وہ مشین نہیں ہوتے۔ اس پہلو کو نظر انداز کرتے ہوئے جو کچھ بھی کیا جائے گا وہ عارضی ہوگا۔

اب برائے مہربانی ہمیں اپنے سیاسی پروگرام کے بارے میں بتائیں۔ آپ ایک روشن خیال انسان ہیں۔ ہوسکتا ہے ہم آپ کے سیاسی فلسفے سے متفق نہ ہوں لیکن ہم پر یقین کریں کہ ہم آپ کو ایک اچھا انسان سمجھتے ہیں۔ تاہم میں بات کی وضاحت کرنا چاہوں گا۔ اگر ہندوستان نے ہماری مدد کی ہے تو وہ اس نے اپنے مفادات کے لیے کی ہے۔ پھر بھی ایک قوم کی حیثیت سے ہم ان کے شکرگزار ہیں۔ لیکن بنگلہ دیش کو حقیقی آزاد اور خوش حال ملک بنانے کے لیے ہم اپنی کوششوں میں ہندوستان اور روس کو کس طرح موافق قوتیں خیال کرسکتے ہیں؟ یہ بات خود ان کے مفادات کے خلاف ہے۔ آپ ان کے بارے میں کسی حد تک نرم گوشہ رکھتے ہیں یہ بات تقریباً ہر شخص جانتا ہے۔ ہم اس بارے میں آپ سے براہِ راست سننا چاہتے ہیں۔ سوشلسٹ فلاسفی کے مطابق سوشلزم کا نفاذ صرف پرولتاریہ کی قیادت کے تحت ہی ہوسکتا ہے۔ آپ کی پارٹی کون سی ہے؟ ہم یہ بھی ضرور جاننا چاہیں گے۔''

تاج الدین نے میری ساری باتیں سنجیدگی سے سنیں۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ہم سیاست پر سنجیدہ گفتگو کررہے تھے۔

''کیا آپ سب سیاست کے بارے میں اتنے ہی باشعور ہیں؟'' انہوں نے پوچھا۔

''میں سمجھ نہیں سکا کہ جب آپ ''سب'' کہتے ہیں تو آپ کا کیا مطلب ہوتا ہے۔ لیکن مسلح افواج کا ایک بڑا حصہ یقیناً ''سیاسی طور پر بہت باشعور'' ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی ہے۔ اب مجھے کچھ امید کی کرن نظر آرہی ہے۔ ہاں تو دوستو! میں سوشلزم کو ایک سیاسی فلسفے کے طور پر تسلیم کرتا ہوں۔ لیکن اس کا نفاذ اور اس کو لاگو کرنے کے انداز اور طریقے مختلف ہوسکتے ہیں اور ان کا انحصار کسی معاشرے یا ملک کے معروضی حالات پر ہوتا ہے۔ ہندوستان میں سوشلزم کا نفاذ روس کے ماڈل کے مطابق نہیں ہے۔ جمہوریہ ہندوستان نے ہماری جنگ آزادی کی حمایت اصولوں پر کی تھی۔ روس کے بارے میں بھی یہی کہا جاسکتا ہے، روس پہلے ہی دنیا کی دوسری اقوام کو آزادی حاصل کرنے کے لیے مدد دے رہا ہے۔ اب بنیادی طور پر سامراجی اور بنیاد پرست قوتیں ان سے مخالفت کی فضا پیدا کررہی ہیں۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ یہ سازش ہمارے ملک کے لیے کسی بہتری کا سبب بنے گی؟''

جیسے ہی تاج الدین نے اپنا دلچسپ نظریہ پیش کیا، میں نے عرض کی، ''سر، لوگوں کی اکثریت جن کے جذبات اور اعتقادات کی میں بات کررہا ہوں ان میں سے بہ مشکل ہی کسی نے ''بنیاد پرست'' یا ''سامراجی'' کے الفاظ سنے ہوں گے، ان اصطلاحات کی سمجھ اور مطلب سے آگاہی تو دُور کی بات ہے، وہ صرف وہ بات کہتے ہیں جو وہ اپنے تجربے سے محسوس کرتے ہیں۔ ایسے تمام بحث مباحثے شہری دانشوروں کے ڈرائنگ روموں تک ہی محدود ہوتے ہیں۔ یہ ملک کی آبادی کا ایک یا دو فیصد بھی نہیں ہیں۔

ہم پختہ یقین رکھتے ہیں کہ ہندوستان اصل مفہوم میں جمہوری ملک نہیں ہے۔ جمہوریت کے لبادے میں پچھلے 25 سال سے وہاں صرف ایک پارٹی یا زیادہ واضح بات کرنے کے لیے ایک خاندان کی

حکومت چلی آ رہی ہے۔ مسز اندرا گاندھی نے پاکستان کو توڑنے کے لیے صورتِ حال سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور جواہر لعل نہرو اور مہاتما گاندھی کے عزیز ترین خواب اکھنڈ بھارت کو پورا کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اب ہندوستان کی مرکزی حکومت ہرگز یہ نہیں چاہتی کہ بنگلہ دیش ایک نمو پذیر اور خود انحصار خوش حال قوم کے طور پر مضبوط ہو سکے بلکہ ہماری معیشت کا گلا گھونٹنے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ ہندوستان اپنا سیاسی تسلط قائم رکھ سکے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارا ملک بھوٹان اور سکم جیسی طفیلی ریاستوں کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہوگا۔ اس طرح ہندوستان کے اندر سرگرم اور جوشیلی قوم پرست تحریکوں کو یہ باور کروانا مقصود ہے کہ اس علاقے میں ہندوستان سے علیحدہ ہو کر کوئی بھی قوم زندہ نہیں رہ سکتی۔ انہیں یونین کے تسلط ہی میں رہنا ہوگا۔

اگر ہندوستان، بنگلہ دیش کو ایک دست نگر علاقہ یا ایک طفیلی ریاست بنانے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو پھر آزادی کی باقی ماندہ قومی تحریکیں خود بخود دم توڑ جائیں گی۔ اس کے برعکس اگر ہم کامیاب ہو گئے تو یہ سلگتی ہوئی قومی تحریکیں الاؤ کی صورت اختیار کر لیں گی اور اس کے نتیجے میں مستقبل قریب میں ہی ہندوستان یونین بکھر جائے گی۔ اکھنڈ بھارت کا خواب ہوا میں تحلیل ہو جائے گا۔ جب ہندوستان یونین کی اپنی ممبر ریاستیں استحصال اور استبداد کا نشانہ بنی ہوئی ہیں تو ہمارے لیے ایک طفیلی ریاست بننا کہاں تک سودمند ہوگا؟ اس کے برعکس اگر ہندوستان یونین، جو خود سامراجیت پسندوں کی پیداوار ہے، اپنی تاریخی ہیئت کی جانب لوٹتی ہے تو یہ نہ صرف بنگلہ دیش بلکہ برصغیر کی تمام اقوام کے لیے سودمند ہوگا۔

قومی ریاستیں جو یہاں صدیوں سے قائم چلی آ رہی تھیں، انہیں بیرونی حملہ آوروں نے اپنے نوآبادیاتی مفادات کو دوام بخشنے کے لیے زبردستی اکٹھا کر کے ہندستان یونین تشکیل دی تھی۔ اس زبردستی کے اتحاد کے نتیجے میں آج بھی یہ علاقہ مصائب میں گھرا ہوا ہے۔ اس برصغیر کے عوام کے لیے پائیدار استحکام اور خوش حالی تب ہی ممکن ہو سکتی ہے جب ان حل طلب قومی مسائل کے درست تاریخی تناظر میں حل تلاش کیے جائیں۔ اس کا کوئی اور متبادل نہیں ہے۔ ہندوستان ایک کثیر القومی ملک ہے، یہ ایک تاریخی حقیقت ہے۔''

میری ساری تقریر سننے کے بعد تاج الدین نے کہا کہ مستقبل میں اس موضوع پر مزید غور و فکر کی ضرورت ہے۔ انہوں نے جاتیو سماج تنترک دَل (جے ایس ڈی) کو اپنا سیاسی ذریعہ اظہار قرار دیا۔ جواب میں میں نے کہا کہ یقیناً جے ایس ڈی آج حکومت مخالف تحریک میں ہراول دستہ کا کردار ادا کر رہی ہے۔ وہ سائنٹیفک سوشلزم کی بات بھی کر رہے ہیں۔ لیکن کیا عوامی لیگ سے علیحدہ ہونے والے یہ تمام نوجوان رہنما حقیقی سوشلسٹ ہیں؟ کیا جے ایس ڈی کو اس کی موجودہ قیادت کے تحت ہم ایک پرولتاری پارٹی قرار دے سکتے ہیں؟ اس کے زیادہ تر رہنما بورژوا یا پیٹی بورژوا پس منظر کے حامل ہیں۔ شاید مستقبل ہی بتا سکے گا کہ انہوں نے کس حد تک اپنے طبقے کو تبدیل کیا ہے لیکن اس مرحلے پر جے ایس ڈی کو ایک پرولتاری پارٹی خیال کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔'' اس بات پر اس دن کی ملاقات اختتام کو پہنچی۔ روانہ ہونے سے پہلے ہم نے جلد دوبارہ ملنے کا فیصلہ کیا۔

نظریاتی نقطہ نگاہ سے جے ایس ڈی کی قیادت کا ایک حصہ روس کو ایک سوشلسٹ ریاست اور ہندوستان کو ایک جمہوری ملک خیال کرتا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ ہندوستان اور روس دوست ممالک ہیں اور قومی نجات اور سوشلزم کے نفاذ میں معاون قوتیں ہیں۔ یہ نظریات تاج الدین احمد کے نظریات سے میل کھاتے تھے۔ لیکن جے ایس ڈی کی نچلی اکثریت ہندوستان مخالف جذبات رکھتی تھی۔ بعد میں جے ایس ڈی کے خاتمے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی۔ ہم جانتے تھے جے ایس ڈی کی قیادت بھی ہندوستان کے حوالے سے پالیسی میں اختلاف رکھتی ہے۔ تاج الدین سے ملاقات کے بعد ہمارے ذہن میں ایک سوال پیدا ہوا، ''کیا اس افواہ میں کوئی حقیقت موجود ہے کہ جے ایس ڈی، عوامی لیگ کی بی ٹیم ہے؟'' اگر معاملہ یہ نہ تھا تو جے ایس ڈی تاج الدین کی قیادت کو کیسے تسلیم کر سکتی تھی؟ ہمیں جواب تلاش کرنا تھا۔

ایک دن ہم کرنل طاہر سے ملنے کے لیے نارائن گنج گئے۔ مختلف معاملات پر بات چیت کرتے ہوئے ہم نے جے ایس ڈی اور تاج الدین کے درمیان تعلق تلاش کرنے کی کوشش کی۔ کرنل طاہر ذاتی طور پر خیال کرتے تھے کہ پارٹی کے حوالے سے تاج الدین کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ اس نے معاملے کو مزید الجھا دیا۔ ہوسکتا ہے کہ کرنل طاہر اس بارے میں نہ جانتے ہوں یا تاج الدین کے جے ایس ڈی کی اعلیٰ قیادت کے ساتھ کسی ایسے ذریعے سے تعلقات ہوں جو دوسرے رہنماؤں سے کسی وجہ سے پوشیدہ رکھے گئے ہوں۔ ہم میں سے ایک آدمی نے جے ایس ڈی کے ایک اور مرکزی رہنما مسٹر شاہجہان سے بھی پوچھا۔ اس نے بھی یہی جواب دیا کہ تاج الدین کا جے ایس ڈی کے ساتھ پارٹی کے حوالے سے کوئی تعلق نہیں۔

143۔ ہماری دوسری ملاقات

چند دن کے بعد ہماری دوسری ملاقات ہوئی۔ اس ملاقات میں ہم نے زیادہ تر ہندوستان اور بنگلہ دیش کے تعلقات پر بات چیت کی۔ اپنی گزشتہ بحث کے حوالے سے میں نے کہا، ''ہندوستان، بنگلہ دیش میں تین چیزیں بالکل برداشت نہیں کرے گا،

1۔ بنگلہ دیش ایک آزاد اور نمو پذیر ملک کے طور پر پروان چڑھے۔
2۔ بنگلہ دیش ایک اسلامی ریاست بنے۔
3۔ مشرقی اور مغربی بنگلہ دیش ایک آزاد مملکت کے طور پر متحد ہو جائیں۔''

جب ہم نے ان نکات پر ان کے خیالات جاننے کی کوشش کی تو انہوں نے جواب دیا، ''ہندوستان برصغیر میں ایک ''منی سپر پاور'' ہے، اگر ہم اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں تو پھر بنگلہ دیش کا وجود خطرے میں پڑ جائے گا۔ اپنی بقا کے لیے ہمیں ہندوستان کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھنے ہوں گے۔''

مثال کے طور پر انہوں نے نیپال کو پیش کیا اور کہا، ''ہندوستان کے نیپال کے ساتھ معاشی

تعلقات بڑے گہرے ہیں۔ نیپال کی معیشت کا حقیقت میں ہندوستان پر انحصار ہے۔لیکن ہندوستان نیپال کی خودمختاری اور آزادی میں مداخلت نہیں کر رہا۔''

میں نے جواب میں کہا،''نیپال ایک ہندو ریاست ہے۔ جہاں تک ہمارا علم ہے نیپال کی پالیسیوں میں ہندوستان کا بہت زیادہ عمل دخل ہے اور اس کی قومی اور وہ سیاسی زندگی میں بہت زیادہ اثر ورسوخ کا حامل ہے۔لیکن آپ بنگلہ دیش کا نیپال کے ساتھ کیسے موازنہ کر سکتے ہیں؟ بنگلہ دیش 10 کروڑ سے زائدلوگوں کا ملک ہے جن کی اکثریت مسلمان ہے۔ہم ایک چھوٹا ملک لیکن بڑی قوم ہیں۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس قوم نے پاکستان کے حکمران ٹولے کے استحصال سے نجات کے لیے ایک خوں ریز جنگ آزادی ہندوستان کے تسلط کے قیام کے لیے نہیں لڑی۔ اگر ہم زندہ رہتے ہیں تو ہم اپنی علیحدہ شناخت اور آزادی کے ساتھ زندہ رہیں گے۔ یہ لوگوں کی خواہشات اور ارادوں کے مطابق بات ہے۔ اگر ہم قوم کو قوم پرست جذبات کے ساتھ منظم کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ہندوستان جتنا بھی بڑا اور طاقت ور ہے کبھی بنگلہ دیش کو سکم، نیپال اور بھوٹان میں تبدیل کر سکتا ہے؟ ایک سچی قوم پرست اور عوامی حکومت قوم پرستانہ جذبے کو ابھار کر عوام کو ایک وجود کی مانند متحد کر سکتی ہے اور بنگلہ دیش کو بیرونی خطرات یا جارحیت کے خلاف ایک مضبوط قلعے میں تبدیل کر سکتی ہے۔ اور کیا آپ یہ نہیں سمجھتے کہ ہر قوم پرست کو اس کے لیے کام کرنا چاہیے؟''

تاج الدین نے اس کے جواب میں کوئی بات نہ کی۔ تاہم ان دو ملاقاتوں سے یہ بات واضح ہو گئی کہ تاج الدین، ہندوستان کے لیے یقیناً ایک نرم گوشہ رکھتے ہیں اور اس بندھن کو وہ توڑنا نہیں چاہتے۔ ایسی کمزوری کیوں تھی؟ کیا مجبوریاں تھیں؟ ہماری ملاقاتوں میں انہوں نے کبھی بھی یہ ظاہر نہیں ہونے دی تھیں۔ ہم نے بھی آئندہ ملاقاتوں میں کبھی ہندوستان کی جانب ان کے اس جھکاؤ پر انہیں مزید پریشان نہیں کیا۔

اندرا گاندھی کی ہندوستانی حکومت نے بنگلہ دیش کی آزادی سے کیا فوائد حاصل کیے، اس پہلو کو ایک معروف مصنف اور صحافی مسٹر سمار سین نے ہندوستان کے ایک مشہور ہفت روزہ ''دی فرنٹیئر'' میں وضاحت کے ساتھ بیان کیا۔ وہ لکھتے ہیں:

''16 دسمبر 1971ء کو ہندوستان کی مسلح افواج نے پاکستانی فوج پر فتح حاصل کر لی اور بعد میں 1972ء میں شیخ مجیب الرحمٰن کو اقتدار میں لاتے ہوئے انہوں نے وہاں اپنا اثر ورسوخ قائم کر لیا۔''

144۔ حکمران جماعت کے رہنماؤں سے رابطے

اس کے ساتھ ساتھ ہم نے مختلف سطحوں پر عوامی لیگ کے رہنماؤں اور کارکنوں سے بھی رابطے قائم رکھے جن میں خاص طور پر کھنڈکر مشتاق، ایم آر صدیقی، نورالاسلام منجو، ریاض الدین بھولا میاں، ملک

عقیل، پھنی بھوشن، منورنجن دھر، دیوان فرید غازی عبدالمنان اور چند دیگر افراد شامل تھے۔ ان کی غلط فہمی مکمل طور پر دُور ہو چکی تھی اور وہ شیخ مجیب الرحمٰن اور ان کے طرزِ حکومت سے بیزار تھے۔ ان کے خیال میں شیخ مجیب کی تنہائی اور ناکامی کی بڑی وجہ نوجوان رہنماؤں پر اُن کا مکمل انحصار تھا۔ لیکن ان کے پاس اپنی بے گناہی ثابت کرنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا اور نہ ہی وہ نوجوان رہنماؤں کی ظالمانہ بالادستی کے خوف سے کوئی بات کہنے کی جرأت کرتے تھے۔ عوامی لیگ کے یہ رہنما تاج الدین احمد کی برطرفی کے بعد زیادہ خطرے میں گھر چکے تھے۔

145۔ شیخ مجیب الرحمٰن کو بنگلہ دیش کا معمار ثابت کرنے کی کوشش

مسز اندرا گاندھی کی حکومت نے نہ صرف شیخ مجیب الرحمٰن کو اقتدار کی کرسی پر بٹھایا بلکہ انہیں بنگلہ دیش کا ''اصل خالق'' ثابت کرنے کے لیے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا، حالاں کہ وہ ایک ایسے رہنما تھے جنہوں نے قوم کو ظالمانہ تشدد اور نسل کشی کے دوران بے یارو مددگار چھوڑ دیا تھا۔ اپنی پوزیشن کو مستحکم بنانے کے لیے مسز گاندھی نے شیخ مجیب کو دو ہتھیار ''مجیب واد'' (مجیب ازم) اور ''بکسال'' تھمادیئے۔

ایک مصنف اور صحافی مسٹر کھنڈکر محمد الیاس کو پُرکشش معاوضے پر نظریاتی مقالے کے طور پر ایک کتاب ''مجیب واد'' لکھنے کے لیے رکھا گیا۔ اس کتاب میں تمام عجیب و غریب باتیں لکھی گئی تھیں۔ اس نے دعویٰ کیا کہ ''مجیب واد'' نے کارل مارکس کے ''کمیونسٹ مینی فیسٹو'' جیسے ایک سیاسی فلسفے کے طور پر جنم لیا ہے۔ مجیب واد، مارکسزم کی ایک جدید اور بہتر صورت ہے۔ لیکن اگر قارئین یہ کتاب پڑھیں اور اس کا موازنہ نازی رہنما ہٹلر کی سوانح عمری ''میری جدوجہد'' سے کریں تو انہیں یہ سمجھنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی کہ یہ مقالہ بہت حد تک اُس نیشنل سوشلزم کا چربہ ہے بلکہ اس کا ایک گھٹیا ترجمہ ہے۔

مسٹر حیدر اکبر خان رونو اور ملک کے دیگر نمایاں مارکسسٹ دانشوروں اور سیاسی تجزیہ نگاروں نے ''مجیب واد'' کو معتبر سیاسی فلسفے کے طور پر تسلیم نہ کیا۔ بنگلہ دیش کا ایک جانا پہچانا حلقہ شیخ مجیب الرحمٰن کو ''بنگا بندھو'' اور ''بابائے قوم'' کے طور پر پیش کرنے پر تُلا بیٹھا ہے جب کہ بنگلہ دیش جنگ آزادی کے نتیجے میں قائم ہوا تھا۔ فتح عوام کی خود بخود شمولیت کی وجہ سے ممکن ہو سکی تھی۔ یہ عوام کا پسینہ اور خون تھا جو بنگلہ دیش کو وجود میں لے کر آیا۔ لہٰذا یہ عوام تھے جنہیں نجات دہندہ قرار دیا جا سکتا تھا۔ اس حقیقت سے انکار تاریخ کے بگاڑنے کے مترادف ہوگا۔ تاہم یہ درست ہے کہ بہت سے دوسرے قومی رہنماؤں کی طرح شیخ مجیب نے بھی قومی آزادی کی تحریک میں حصہ ڈالا تھا۔ لیکن یہ حقیقت بھی اپنی جگہ قائم ہے کہ یہ خود عوام ہی تھے جنہوں نے 1971ء میں جدوجہد کو اس کے منطقی انجام تک پہنچایا اور آزادی کے حصول کے لیے مجیب الرحمٰن کی عدم موجودگی میں ایک خونریز جنگ لڑی۔

25 اور 26 مارچ 1971ء کی فیصلہ کن درمیانی رات سے پہلے شیخ مجیب نے ناگزیر فوجی کارروائی کے خلاف عوام کی مسلح جدوجہد کی قیادت سے انکار کرتے ہوئے عدالتی گرفتاری پیش کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

جب برہنہ تشدد کا آغاز کیا گیا تو عوامی لیگ کی قیادت لوگوں کو بے یقینی کی حالت میں بے یار و مدد گار چھوڑ کر اپنی زندگیاں بچانے کے لیے فرار ہوگئی۔ قیادت کی اس قسم کی بے وفائی سے عوام مایوسی کا شکار ہو گئے تھے لیکن انہوں نے اس موقع پر اٹھ کھڑے ہونے میں کوئی دیر نہیں کی۔ انہوں نے ایک غیر معروف میجر کی آواز پر لبیک کہا اور آزادی کی قومی جنگ میں کود پڑے۔ یہ تاریخی حقیقت کبھی بھی جھٹلائی نہیں جا سکتی۔ موجودہ اور مستقبل کی نسلیں کبھی بھی جھوٹ کو سچ کے طور پر تسلیم نہیں کریں گی۔

آزادی حاصل ہونے کے بعد شیخ مجیب الرحمٰن کی رہائی عمل میں آ سکی اور انہیں مسند اقتدار پر بٹھا دیا گیا۔ لیکن اقتدار حاصل کرنے کے فوراً بعد انہوں نے دوبارہ بے وفائی کا مظاہرہ کیا۔ اپنی حیثیت کے تحفظ اور پارٹی کے مفادات کی خاطر انہوں نے عوام کو تمام قسم کے حقوق، بشمول جمہوری حق، بنیادی انسانی حقوق، انصاف کا حق، قانون کی حکمرانی کا حق، معاشی آزادی، تقریر اور پریس کی آزادی دینے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے یک حزبی فاشسٹ آمریت قائم کر دی۔ ''عوامی بکسال وادیوں'' کی حکومت ہماری تاریخ کا سیاہ باب ہے۔ ان حقائق کے پیش نظر وہ لوگ، جو انہیں ''بنگو بندھو'' یا ''بابائے قوم'' کے طور پر پیش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، انہیں ذلت کی گندگی میں دھکیل دینا چاہیے۔ تاریخ ان لوگوں کو کبھی معاف نہیں کرتی جو سچ کو جھٹلانے کی کوشش کرتے ہیں۔

146۔ اتحاد کی کوششیں اور حکومت کا ردّ عمل

1973ء کے انتخابات سے پہلے اتحاد کی کوششوں کے نتیجے میں سات سیاسی جماعتوں نے پندرہ نکات کی بنیاد پر اتحاد کیا اور ایک ایکشن کمیٹی تشکیل دی۔ اس کے ساتھ ہی بہت کوششوں کے بعد تمام سیاسی جماعتوں کا ایک متحدہ محاذ (شرب دلیوا ویکیوفرنٹ) مولانا بھاشانی کی سربراہی میں تشکیل دیا گیا۔ ان پارٹیوں میں نیپ بھاشانی، بنگلہ دیش جاتیو لیگ، جاتیو گونومکتی یونین، بنگلہ دیش جاتیو لیگ (علی احد) بنگلہ دیش کمیونسٹ پارٹی (لیننسٹ)، بنگلہ دیش کریشک سرامک شامیووادی دَل شامل تھیں۔ اپنے پہلے اجلاس میں یہ فرنٹ اپنے چار نکاتی ایکشن پروگرام کے ساتھ سامنے آیا۔

1۔ سیاسی قیدیوں کی رہائی
2۔ زندگی کے تحفظ اور امن کی بحالی
3۔ بڑھتی ہوئی قیمتوں کو روکنا
4۔ نابرابری کی سطح پر کیے گئے ہندوستان، بنگلہ دیش معاہدے کا خاتمہ

مولانا نے حکومت کو الٹی میٹم دیا کہ اگر وہ ان مسائل پر مثبت ردِ عمل دینے میں ناکام رہتی ہے تو وہ ملک گیر مہم کا آغاز کریں گے۔ لیکن ان کی کمزور صحت کی وجہ سے آخر کار یہ فرنٹ زیادہ مؤثر ثابت نہ ہو سکا۔ اس کے بعد مسٹر عطاالرحمٰن نے قوم پرست قوتوں کو از سر نو منظم کرنے اور نیشنل کنونشن بلانے کے

لیے پھر سے مہم کا آغاز کیا۔ لیکن 28 دسمبر 1974ء کو حکومت نے ہنگامی حالت کا اعلان کر دیا، چنانچہ اسے عملی شکل نہ دی جا سکی۔ اس طرح حکومت مخالف جذبات میں اضافے کے باوجود عوام اس کے خلاف مؤثر طور پر منظم نہ ہو سکے۔

چوں کہ ملک میں ایک سیاسی خلا پیدا ہو چکا تھا، اس لیے لوگ مایوس ہو چکے تھے۔ اس موقع پر چند ممتاز دانشور اور سیاسی شعور رکھنے والے افراد آگے آئے اور انہوں نے 1974ء میں بنیادی حقوق کے تحفظ اور قانونی مدد مہیا کرنے کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی۔ کمیٹی کا مقصد انسانی حقوق اور فرد کی آزادی کے لیے جدوجہد کرنا اور قانون کی حکمرانی قائم کرنا تھا۔ کمیٹی کو عوام کی بڑی اکثریت کی حمایت حاصل تھی۔

اس کے مطالبات درج ذیل تھے:

1۔ آئین کے خلاف تمام قوانین اور ایکٹ ختم کیے جائیں۔
2۔ ہنگامی حالت کے ایکٹ اور سپیشل پاور ایکٹ کو ختم کیا جائے۔
3۔ راکھی باہنی ایکٹ کو ختم کیا جائے اور اس کے ظلم و ستم کو روکا جائے۔
4۔ تمام سیاسی قیدی غیر مشروط طور پر رہا کیے جائیں۔
5۔ پریس کی آزادی بحال کی جائے۔
6۔ گرفتاری کے تمام غیر قانونی وارنٹ واپس لیے جائیں۔

جلد ہی حکومت آہنی ہاتھوں سے کمیٹی ممبران پر ٹوٹ پڑی۔ بیرسٹر مودود احمد نے، جو کمیٹی کے اہم ارکان میں سے ایک تھے اور بعد میں بنگلہ دیش نیشنل پارٹی کے رہنماؤں میں شامل ہو گئے، 1972ء اور 1974ء کے دوران عوامی بکسال حکومت کی غلط کاریوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا، ''28 دسمبر 1974ء کو ہنگامی حالت کے نفاذ کے بعد اگلے دن 29 دسمبر کو مجھے بغیر کسی وجہ کے سپیشل پاور ایکٹ کے تحت گرفتار کر لیا گیا۔ حکومت میرے خلاف کوئی مخصوص الزامات عائد کرنے میں ناکام رہی۔'' اس وقت مسٹر طفیل احمد راکھی باہنی کے انچارج تھے اور اس بدنام باہنی کے ہاتھوں 40 ہزار بے گناہ افراد اپنی زندگی ہار چکے تھے۔ ملک کے عوام ابھی تک سراج شیکدار کے وحشیانہ قتل کو بھول نہیں پائے۔ 1972ء سے 1975ء تک کا ''عوامی بکسال'' کا دور ہمیشہ بنگلہ دیش کی تاریخ کا ایک سیاہ ترین باب رہے گا۔

147۔ ''عوامی بکسال'' کی غیر حکومت کے بارے میں ذرائع ابلاغ کی رائے

اس وقت عوامی لیگ حکومت کی ناکامی کی بین الاقوامی ذرائع ابلاغ میں بہت زیادہ تشہیر کی گئی۔ مسٹر جوناتھن ڈمبلبی 27 دسمبر 1974ء کو ''سٹیٹس مین'' لنڈن میں لکھتے ہیں:

''ایک وقت تھا کہ بنگلہ دیش کے عوام جب بھی انہیں سڑکوں پر دیکھتے تو خود بخود ہاتھ اٹھا کر ''جیو بنگلہ'' کے نعرے سے ان کا استقبال کیا کرتے تھے۔ اب جب وہ اپنے گھر سے دفتر کے لیے روانہ ہوتے ہیں تو

ان کی دونوں جانب پوری طرح مسلح محافظ ہوتے ہیں اور عوام ان کے آنے جانے کو جان بوجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ''بابائے قوم'' بھی اب اپنی کار کی کھڑکیوں سے ہاتھ نہیں ہلاتے۔ ان کی نظریں سیدھی لگی ہوتی ہیں۔ بنگلہ دیش کو آج امن و امان کے حوالے سے خطرناک صورتِ حال کا سامنا ہے۔ لاکھوں افراد فاقے کر رہے ہیں۔ ہزاروں بھوک کے ہاتھوں مر رہے ہیں۔ اضلاع کی مقامی حکومتیں آنے والے تین ماہ کے بارے میں فکر مند ہیں۔ دارالحکومت میں آپ بھوکے چہروں کے ہجوم میں اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس کریں گے۔ حالیہ سیلاب کی وجہ سے اب مزید لوگ بھی ڈھاکہ کا رُخ کر رہے ہیں۔ پناہ گزین ایسی غلیظ جگہوں پر رہ رہے ہیں جو دنیا میں اور کہیں نظر نہیں آتیں۔ اگر کوئی گڑبڑ ہو جائے تو پناہ گزین آپس میں لڑنا شروع کر دیتے ہیں۔ دانشوروں کا کہنا ہے کہ اگر یہ بھوکے عوام اٹھ کھڑے ہوئے تو پھر کچھ بھی نہیں بچے گا۔ آج بنگلہ دیش دیوالیہ ہو چکا ہے۔ پچھلے 18 ماہ میں چاولوں کی قیمتوں میں چار مرتبہ اضافہ ہو چکا ہے۔ حکومت کے ملازمین کی تنخواہ کا ایک بڑا حصہ کھانے پینے کی اشیاء خریدنے میں صرف ہو رہا ہے اور غریب لوگ بھوکے رہتے ہیں۔ شیخ مجیب اپنی ہی خوابوں کی دنیا میں رہ رہے ہیں جب کہ صورتِ حال بگڑ رہی ہے۔ وہ اب بھی سمجھتے ہیں کہ لوگ ان سے محبت کرتے ہیں، وہ ان تمام مصائب کا ذمہ دار پاکستان کو ٹھہراتے ہیں۔ یہ سوچ محض ایک خیالی بات ہے کہ بیرونی دنیا ان کی اور بنگلہ دیش کی مدد کے لیے آگے آئے گی۔ ملک تباہ و برباد ہو رہا ہے لیکن وہ آدھے سے زیادہ دن عوامی لیگ میں اپنے جگری دوستوں کے ساتھ بسر کرتے ہیں۔ تمام اہم فیصلے وہ خود کرتے ہیں۔ وہ بہت معمولی اور چھوٹے چھوٹے معاملات بھی خود حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ آج وہ اپنے کھوکھلے غرور کے قیدی بن چکے ہیں اور خوشامدیوں اور کاسہ لیسوں میں گھرے ہوئے ہیں۔ بیرونی دنیا بنگلہ دیش میں جاری بدعنوانیوں کی کھل کر بات کرتی ہے۔ غریب لوگ ایک وقت کا کھانا کھا کر دوسرے کھانے کے لیے بے یقینی کا شکار ہیں۔ ایسے ملک میں بدعنوانی ضرور ہوتی ہے۔ لیکن کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کے بدعنوان یا راشی ہونے کا کوئی جواز نہیں بنتا۔ یہ نوجوان نو دولتیا طبقہ انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل کے شراب خانے میں ہجوم کیے ہوتا ہے، وہ بہت پرسکون نظر آتے ہیں۔ یہ نام نہاد مجاہدین آزادی ہیں۔ یہ آج بہت زیادہ طاقت وَر بن چکے ہیں۔ سیاسی پٹھوگری اور کاروباری افراد کو پرمٹ اور لائسنس دلوانے کے لیے دلالوں کا کردار ادا کرتے ہوئے یہ لوگ بہت دولت مند ہو چکے ہیں۔ یہ حکومتی عہدے داروں کو دھمکیاں دے رہے ہیں، سیاسی رہنماؤں پر اثر انداز ہو رہے ہیں اور اگر ضرورت محسوس کریں تو بندوق کا استعمال بھی کرنے سے نہیں چوکتے۔ یہ عوامی لیگ کے قریبی ساتھیوں میں شمار ہوتے ہیں۔ عوامی لیگ کے اعلیٰ رتبے کے افراد ان سے بھی بدتر ہیں۔ یہ عوام کی، جنھوں نے ملک کو آزادی دلوائی کمر توڑ کر انتہائی دولت مند ہو چکے ہیں۔ آج یہ سب لوگ اپنی سمیٹی ہوئی دولت کے بارے میں فکر مند ہیں اور صرف اپنی ذاتوں کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔ کل کے بارے میں سوچ کر وہ پریشان ہیں۔ اگرچہ یہ بات ناگوار محسوس ہوتی ہے لیکن ہنری کسنجر نے درست کہا ہے، ''بین الاقوامی طور پر بنگلہ دیش ایک پیندے کے بغیر ٹوکری ہے۔'' اس خوف ناک صورتِ حال میں حکومت کے لیے چیلنجوں کا سامنا کرنا

مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ بین الاقوامی برادری بنگلہ دیش کے لیے پریشان ہے۔ پچھلے 32 ماہ کی امدادی کارروائیاں مکمل طور پر ناکام رہی ہیں۔ اس حوالے سے امدادی تنظیمیں، سفارتی مشن اور یو این ایجنسیاں کھلم کھلا حکومت اور حکمران جماعت کو موردِ الزام ٹھہرا رہی ہیں۔

لندن سے شائع ہونے والے اخبار ''ڈیلی میل'' کے 17 ستمبر 1974ء کے شمارے میں ''مسٹر جان پنزر'' نے لکھا، ''جنوبی ایشیا میں غربت اور بھوک کا گڑھ بنگلہ دیش ایک بہت بڑے قحط کی زد میں ہے۔ ماضی قریب میں اتنا بڑا قحط دیکھنے میں نہیں آیا۔ اموات کے کوئی قابل اعتبار اعداد و شمار حاصل نہیں ہو سکے۔ جولائی کے سیلابوں میں فصلوں اور فصلوں کے بیجوں کے تباہ ہو جانے کے باعث بنگلہ دیش اور مغربی بنگال میں چند لاکھ لوگ بھوک سے مر گئے ہیں۔ ''سیو دی چلڈرن فنڈ'' کے میجل پروسر نے کہا، ''ہمارے خدشات درست ثابت ہوئے ہیں۔ ہم ایک ایسی قدرتی تباہی کے دہانے پر کھڑے ہیں جس کی مثال میں نے اس علاقے میں اپنے 31 سالہ قیام کے دوران پہلے کبھی نہیں دیکھی۔

بہار کے موسم سے پہلے نئی فصل کی آمد متوقع نہیں ہے۔ اگر بنگلہ دیش کو ہر ہفتے ایک لاکھ ٹن غلہ جات اور دیگر طبی سہولتیں مہیا نہ ہو سکیں تو بہت سے لوگ مر جائیں گے۔ یہ افسوس ناک پہلو ہے کہ ملک کے تمام ہسپتالوں میں بچوں کے لیے صرف 75 بستر ہیں۔ بیسیوں خواتین، مرد اور بچے میر پور کے پناہ گزین کیمپ کے آہنی گیٹ کے سامنے جمع ہیں۔ کچھ سپاہی قدیم 303 رائفلوں کے ساتھ ارد گرد کھڑے ہیں۔ زیادہ تر پناہ گزین شمالی رنگ پور اور دیناج پور کے علاقوں سے آئے ہیں۔ وہ بغیر کسی خوراک کے دو دن پیدل چل کر یہاں پہنچے ہیں۔ تمام بچے سوائے دو بچوں کے چیچک سے متاثر ہیں۔ وہ اتنے کمزور ہو چکے ہیں کہ اپنے اوپر بیٹھنے والی مکھیاں بھی نہیں اڑا سکتے۔ کیمپ میں ان پناہ گزینوں کو رکھنے کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ ایک غیر ملکی صحافی کو دیکھتے ہوئے کسی نے گیٹ کھول دیا۔ مسٹر عبدالاسلام نے ہمیں اندر بلایا۔ وہاں ایک ہجوم اکٹھا ہو گیا۔ ہر کوئی اندر جانے کی کوشش میں تھا۔ مسٹر اسلام نے ہمیں بتایا کہ کیمپ میں پہلے ہی تین ہزار پناہ گزین ٹھنسے ہوئے ہیں۔ جمعہ سے انہیں کھانے کو کچھ نہیں ملا۔ جمعہ گزشتہ دن تھا۔ ہفتے کے دن انہیں کچھ امریکی بسکٹ پہنچنے کی توقع تھی۔ اس ملک میں ایک بچے کی زندگی بچانے کے لیے صرف 25 سینٹ روزانہ درکار ہیں۔ تین سال کا ایک بچہ اتنا چھوٹا تھا کہ آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ ابھی اپنی ماں کے پیٹ میں ہے۔ میں نے اس کے ہاتھ کو چھوا، وہ موم کی طرح پگھل گیا۔ اس قحط کا ایک اور الم ناک پہلو یہ ہے کہ 50 ہزار سے زائد خواتین لباس کے بغیر ہیں، انہیں خوراک حاصل کرنے کے لیے اپنے کپڑے تک بیچنے پڑے تھے۔ یہ شام کا وقت تھا اور میری کار ''انجمن مفید الاسلام'' کی ایک گاڑی کے پیچھے چل رہی تھی، یہ ایک خیراتی تنظیم ہے۔ یہ تنظیم ڈھاکہ سے قحط کے شکار لوگوں کی لاشیں اٹھاتی ہے۔ اس تنظیم کے ڈاکٹر عبدالوحید نے بتایا کہ عام طور پر ہم روزانہ دو درجن کے قریب لاشیں اٹھاتے ہیں۔ لیکن اب ان کی تعداد 600 روزانہ کے قریب پہنچ چکی ہے۔ یہ سب بھوک سے مر رہے ہیں۔ جب گاڑی قبرستان کے قریب پہنچی تو یہ سات لاشیں اٹھا چکی تھی۔ ان میں سے چار بچے تھے۔ مذہبی

رسوم ادا کرنے کے بعد ان لاشوں کو دفنا دیا گیا۔''

مسٹر عنایت اللہ خان ''ویکلی ہالیڈے'' کے ایڈیٹر نے لکھا، ''بنگلہ دیش ہندوستان کی توسیع پسندی اور عوام کی خواہشات کی پیداوار ہے۔ بڑھتے ہوئے اندرونی مسائل کی وجہ سے ہندوستان کے حوالے سے پائی جانے والی جنونی مسرت ہوا ہو چکی ہے۔ کچھ لوگ خیال کرتے ہیں کے ہندوستان بنیادی طور پر بنگلہ دیش کے قیام کا ذمہ دار ہے، اور اسی طرح وہ زیادہ تر اُن مسائل کا بھی ذمہ دار ہے جن کا آج بنگلہ دیش کے عوام کو سامنا ہے۔ ان میں سے ایک فرخا بیراج کا مسئلہ ہے، جسے ہندوستان نے یک طرفہ طور پر تعمیر کیا ہے۔ کچھ لوگوں کو یہ بھی شکایت ہے کہ ہندوستان، بنگلہ دیش سے چاولوں اور پٹ سن کی ہندوستان سمگلنگ کی حوصلہ افزائی کر رہا ہے۔ ہندوستان کے ذمہ دار عہدے داروں نے تسلیم کیا ہے کہ بنگلہ دیش سے چاول اور پٹ سن ہندوستان میں سمگل ہو رہی ہے۔ کچھ بددیانت مقامی کاروباری افراد سمگلنگ میں اس لیے دلچسپی رکھتے ہیں کیوں کہ بلیک مارکیٹ میں ہندوستانی روپے کی قیمت تقریباً دوگنا ہے جب کہ سرکاری طور ٹکے اور روپے کی شرح مبادلہ برابر ہے۔ بنگلہ دیش کے کاروباری افراد سمگلنگ سے حاصل ہونے والی رقم سے ہندوستان سے ایسی اشیاء خریدتے ہیں جن کی یہاں ضرورت ہے۔ اس طرح وہ سمگلنگ کے ذریعے دگنا منافع حاصل کر رہے ہیں۔ ہندوستان کو مستقبل کے چین بنگلہ دیش تعلقات کے بارے میں تشویش ہے۔ چین، ہندوستان کا ایک بڑا حریف ہے۔ ہندوستان کبھی بھی بنگلہ دیش کو چین کے ساتھ قریبی تعلقات استوار کرنے کی اجازت نہ دے گا۔ ہندوستان سختی سے چاہتا ہے کہ بنگلہ دیش غیر جانب دار رہے اور ہندوستان کے مفادات کے خلاف کسی قسم کے خارجہ تعلقات استوار نہ کرے۔ کچھ مبصرین کا یہ بھی کہنا ہے کہ اگر ساحلی علاقوں سے تیل یا گیس کے ذخائر ملتے ہیں تو ہندوستان عملی طور پر بنگلہ دیش کے ساحلوں پر قبضہ کر لے گا۔ ہندوستان ساحلوں پر دریافت ہونے والے تیل اور گیس کے ذخائر کے لیے بھی خطرہ ثابت ہو سکتا ہے۔ ایک اعلیٰ عہدیدار نے ایک ستم ظریفانہ بیان دیا تھا کہ بنگلہ دیش کی تقدیر اس کے اپنے ہاتھوں میں نہیں ہے۔''

148۔ یکسال، آخر کیوں؟

اس موڑ پر شیخ مجیب کی ہوسِ اقتدار میں مزید اضافہ ہو گیا۔ وہ اوجِ اقتدار پر ہونے سے مطمئن نہیں تھے۔ انہوں نے مکمل طور پر اقتدار اپنے ہاتھوں میں لینے کا سوچنا شروع کر دیا اور اس طرح یک حزبی حکومت متعارف کروانے کے لیے کام کا آغاز کر دیا۔ جنگ آزادی لڑنے والوں کی ایک خواہش ملک میں جمہوریت کا نفاذ بھی تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ ابھی تک اپنے ان غیر قانونی نظریات کو لاگو نہیں کر سکے تھے۔ ان کے ان ارادوں کو بھانپتے ہوئے عوامی لیگ کے اندر اور عوامی لیگ کے باہر خفیہ مفادات کے حامل حلقوں نے اپنے مفادات اور اقتدار کو مستحکم کرنے کے لیے انہیں یک حزبی نظام حکومت قائم کرنے پر اکسانا شروع کر دیا۔ ماسکو نواز جماعتوں نے بھی یہ پروپیگنڈا شروع کرایا تھا کہ جمہوریت ناکام ہو چکی ہے اور اس کا

حل یک حزبی نظام حکومت ہے۔شیخ مجیب کے بااعتماد وزیر داخلہ مسٹر منصور علی کو روسی سفارت خانے میں بلایا گیا اور انہیں مشورہ دیا گیا کہ حکومت کو یک حزبی نظام حکومت اپنانا چاہیے۔

اس طرح ملک کو اپنی جماعت کے تسلط میں لانے کے پروپیگنڈے نے شیخ مجیب کو اپنی ہوس اقتدار کی وجہ سے اس قسم کا فیصلہ کرنے میں پوری طرح مستعد کر دیا۔صدارتی حکم کے ذریعے ہنگامی صورتِ حال کے نفاذ کے محض 27 دن بعد جمہوریت کو دفن کرتے ہوئے بکسال کی یک حزبی حکومت قائم کر دی گئی۔وہی شیخ مجیب جو ساری زندگی جمہوریت کے لیے لڑتے رہے تھے وہ آزاد بنگلہ دیش میں پہلی مرتبہ آمرانہ اقتدار متعارف کروانے میں پل بھر کے لیے بھی نہ ہچکچائے۔انہوں نے اس سلسلے میں ضابطے کی کارروائی کی بھی کوئی پروانہ کی۔جب ایوان کے اکثر نمائندوں نے بل کی مخالفت کرنے کی کوشش کی تو انہیں واضح الفاظ میں بتادیا کہ اگر بل کی مخالفت کی گئی تو شیخ مجیب یا تو مستعفی ہو جائیں گے یا پھر اسمبلی کو تحلیل کر دیں گے اور اس کی جگہ بل کی منظوری کو یقینی بنانے کے لیے ایک زیادہ لچک دار اسمبلی لائی جائے گی۔جب مسٹر میزان الرحمٰن چوہدری اور شمس الحق نے بات کرنے کی کوشش کی تو انہوں نے خود کہا، ''اب مزید تقریریں نہیں ہوں گی۔میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آپ مجھے چاہتے ہیں یا نہیں۔''

اس قسم کے چونکا دینے والے بیان کے بعد کسی نے بھی مکمل طور پر بااختیار شیخ مجیب کی مخالفت کرنے کی جرأت نہ کی۔شیخ نے اپنے اور اپنے خاندان کے اقتدار کو دوام بخشنے کے لیے بکسال متعارف کروائی۔تمام آمر اسی طرح سے ابھرتے ہیں۔جرمنی میں ہٹلر اور اٹلی میں میسولینی اس طرح سے ابھرے تھے۔نازی پارٹی نے ہٹلر کو ایک ''عظیم شخص'' قرار دیا تھا۔بکسال وادیوں نے یہ نعرہ لگایا:

''ایک نیتا ایک دیش.......... بنگا بندھو بنگلہ دیش''

اس کے نتیجے میں مجیب ایک آمر کے روپ میں سامنے آئے۔

عوامی لیگ کے پرانے ممبران اور جمہوری سوچ رکھنے والے رہنماؤں کی اکثریت اس قسم کے فیصلے پر خوش نہیں تھی۔وہ سخت پریشان تھے۔کیسی ستم ظریفی تھی، یہ خود شیخ مجیب تھا جس نے جمہوریت کا خاتمہ کرتے ہوئے یک حزبی حکومت قائم کر دی۔بہت سے لوگوں کا کہنا تھا کہ انہوں نے اپنے ذاتی مفاد کی خاطر جماعت کے اصولوں کو قربان کر دیا تھا۔اس طرح سے بکسال کا پہاڑ قوم کی چھاتی پر رکھ دیا گیا تھا اور اب وہ اس وقت تک آزادی کا سانس نہیں لے سکتی تھی جب تک اس بوجھ کو اس کی چھاتی سے اتارا نہ جائے۔اس کے فوراً بعد نام نہاد بنگا بندھو، بابائے قوم شیخ مجیب الرحمٰن نے ایک آمر کے روپ میں عوام کے بنیادی انسانی حقوق اور پریس کی آزادی بھی سلب کر لی۔

اس کے بعد ہمیں کھنڈکر مشتاق احمد اور عوامی لیگ کے دوسرے سینئر رہنماؤں سے بکسال کی تشکیل کے حوالے سے کچھ مزید مفید معلومات بھی حاصل ہوئیں۔انہوں نے یک حزبی بکسال حکومت کے قیام کے لیے اکسانے والے اہم لوگوں میں سیّد نذرالاسلام، شیخ فضل الحق مونی، عبدالرزاق اور منصور علی کے نام

لیے۔ان افراد کو عوامی لیگ میں پر جوش ہندوستان نواز اور روس نواز عناصر بھی خیال کیا جاتا تھا۔ یہ بھی کہا جاتا تھا کہ یہ گروہ ہندوستان اور روس کے اتحاد سے تشکیل دیئے گئے وسیع تر منصوبے کے اندر اپنے اقتدار کا کھیل کھیل رہا تھا۔ طالع آزما گروہ شیخ فضل الحق مونی کی قیادت میں اپنی بندوقوں کو شیخ مجیب الرحمٰن کے کندھوں پر رکھ کر فائر کرنے کے لیے تیار کر رہا تھا۔

149۔فوجی کونسل کی کھنڈ کر مشتاق کے بارے میں جانچ

ہمارے علم میں یہ بات بھی آئی کہ اس فیصلہ کن دن اگر چہ اکثر پرانے رہنماؤں کو دھمکیوں اور تعلقات کے ذریعے خاموش کر دیا گیا تھا تاہم وہ اس شرم ناک اور غیر قانونی تحریک کو قبول نہ کر سکے۔ وہ پریشان تھے اور کھنڈ کر مشتاق کے پاس گئے اور اُن سے درخواست کی کہ وہ قوم کے خلاف اس سازش کو روکنے کا کوئی راستہ تلاش کریں۔ ان تمام انکشافات سے ہمیں یقین ہو گیا کہ بکسال کے معاملے میں عوامی لیگ میں واضح دراڑیں پڑ چکی ہیں اور کھنڈ کر مشتاق کو عوامی لیگ کے ایک بڑے حلقے کا اعتماد اور حمایت حاصل ہے۔

کھنڈ کر مشتاق ایک بزرگ سیاست دان تھے جو مکمل سیاسی بصیرت رکھتے تھے۔ انہوں کے جنگ آزادی کے دنوں سے ہی ہماری ہمدردیوں اور توجہ کو اپنی جانب کھینچ لیا تھا۔ وہ ہندوستان اور اس کی بالادستی کے شدید خلاف تھے۔ کھنڈ کر مشتاق ایک انتہائی خوددار اور کسی بھی صورت میں اصولوں پر سمجھوتہ نہ کرنے والے تجربہ کار اور زیرک سیاست دان تھے۔ ان کی اعلیٰ ذہانت، زیرکی اور سیاسی بصیرت اور پیش بینی کی وجہ سے تمام لوگ انہیں بڑی عزت و توقیر کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ کھنڈ کر مشتاق احمد ایک صاحب کردار اور آزاد خیال جمہوریت پسند کی حیثیت سے قومی اور بین الاقوامی سطح پر ایک جانی پہچانی شخصیت تھے اور تمام حلقوں میں انہیں بہت پذیرائی حاصل تھی۔ انہوں نے اپنے لمبے سیاسی کیریئر کے دوران مغربی جمہوری ممالک اور اسلامی دنیا کی اہم اور با اثر شخصیات کے ساتھ گہرے ذاتی مراسم استوار کیے تھے۔ کھنڈ کر مشتاق احمد نہ صرف ایک ذی شعور اور قابل سیاست دان تھے بلکہ بہت بڑے صاحب مطالعہ اور خوب صورت حس مزاح رکھنے والے انسان تھے۔ وہ اپنی سوچ اور عقیدہ پر سختی سے جمے رہنے والے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک حلیم، نرم خو اور نرم گو انسان تھے۔ انہوں نے اپنی حب الوطنی اور کردار کا مظاہرہ کرتے ہوئے وزیر توانائی، آبپاشی اور آبی وسائل کی حیثیت سے اپنے ہندوستانی ہم منصب سے گنگا اور فرخا کے پانی کی تقسیم پر مذاکرات کرتے ہوئے اپنے موقف سے ایک انچ بھی پیچھے ہٹنے سے انکار کر دیا تھا۔ تاہم انہیں اپنے اس موقف کی قیمت بھی چکانا پڑی اور شیخ مجیب الرحمٰن نے انہیں مضبوط قومی جذبے کی پاداش میں وزارت سے ہٹا دیا تھا۔

150۔بکسال کی یک حزبی حکومت کے قیام پر بین الاقوامی ردِّعمل

بکسال اور یک حزبی آمریت کے قیام پر بین الاقوامی ردِعمل کے بارے میں جاننے کے لیے

میں چند تحریریں پیش کر رہا ہوں جو چند معروف بین الاقوامی اخبارات میں شائع ہوئیں۔

لندن سے شائع ہونے والے ''ڈیلی ٹیلی گراف'' کے 27 جنوری 1975ء کے شمارے میں مسٹر پیٹر گرل لکھتے ہیں:

''بنگلہ دیش کے وزیراعظم شیخ مجیب الرحمٰن نے پارلیمانی جمہوریت کو مکمل طور پر خیرباد کہہ دیا ہے۔ پچھلے ہفتے عوامی لیگ نے اپنی وحشیانہ اکثریت سے شیخ مجیب الرحمٰن کو جمہوریہ کا صدر مقرر کر دیا ہے اور انہیں یک حزبی حکومت قائم کرنے کا اختیار سونپ دیا ہے۔ بغیر کسی شک و شبے کے جمہوریت دفن کر دی گئی ہے۔ حزب مخالف نے اس قسم کے سنجیدہ مسئلے پر کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے بحث مباحثہ کے لیے تین روز کا وقت مانگا تھا۔ اس کے جواب میں حکومت نے ایک قرارداد پاس کی، جس میں کہا گیا کہ اس مسئلے پر کسی قسم کا بحث مباحثہ نہیں ہو سکتا۔ جنگ سے تباہ حال بنگلہ دیش کے، جس نے اپنی آزادی نو ماہ کی خوں ریز خانہ جنگی کے بعد حاصل کی تھی، غیر متنازع لیڈر شیخ مجیب الرحمٰن نے پارلیمنٹ کے ارکان سے کہا کہ پارلیمانی جمہوریت نو آبادیاتی نظام کا تحفہ ہے۔ (برطانوی ماہرین نے بنگلہ دیش کا آئین بنانے میں مدد کی تھی) انہوں نے یہ شکایت بھی کی کہ ملک کی آزاد عدلیہ نو آبادیاتی ہے اور مقدمات کے جلد نمٹانے میں رکاوٹ ہے۔ اب صدر اپنی مرضی سے ججوں کو برخاست کر سکتا ہے۔ شہری حقوق اگر عنایت کیے بھی گئے تو نئی پارلیمنٹ کی تشکیل دی گئی مخصوص عدالتوں کی صوابدید پر ہو گا۔ نئے آئین نے مجیب کو ایک قومی پارٹی تشکیل دینے کا اختیار دے دیا ہے۔ یہ ملک کی واحد تسلیم شدہ سیاسی پارٹی ہو گی۔ اگر کوئی رکن پارلیمنٹ اس میں شامل نہیں ہوتا یا اس کے خلاف ووٹ دیتا ہے تو اس کی رکنیت ختم ہو جائے گی۔

ڈھاکہ میں اس ایکٹ کے خلاف تنقید قابل فہم وجوہات کی بنا پر مخفی رہی ہے۔ لیکن 319 ارکان پارلیمنٹ میں سے حزب مخالف کے آٹھ ممبران میں سے پانچ ممبر احتجاج کے طور پر واک آؤٹ کر گئے۔ عوامی لیگ کے گیارہ ممبران نے ووٹنگ میں حصہ نہیں لیا۔ ان میں سے ایک سابقہ وزیر اور جنگ آزادی کے دوران گوریلا افواج کے کمانڈر انچیف کرنل عثمانی ہیں۔ شیخ مجیب اپنی آمرانہ حکومت 1980ء تک قائم رکھنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ نئے آئین میں 1973ء کی منتخب پارلیمنٹ کی مدت بھی 1980ء تک بڑھا دی گئی ہے۔ لیکن پارلیمنٹ سال میں صرف دو مختصر اجلاس کیا کرے گی۔ نائب صدر، وزیراعظم اور وزرا کی کونسل حکومت چلائے گی۔ سید نذرالاسلام اور منصور علی کو بالترتیب نائب صدر اور وزیراعظم مقرر کیا گیا ہے۔

بنگلہ دیش کو جن شدید سماجی معاشی بحرانوں کا سامنا ہے اس کی روشنی میں مبصرین آمریت اور حتیٰ کہ شیخ مجیب کی عالی ظرفی کو بھی ملک کے لیے سودمند خیال نہیں کر رہے۔ اس وقت بنگلہ دیش کو جس قحط اور لاقانونیت کا سامنا ہے، آیا شیخ مجیب کو ملنے والا یہ نیا عوامی اختیار اس میں کوئی بہتری لا سکے گا۔ ایک ماہ قبل شیخ مجیب نے ہنگامی حالت کا نفاذ کیا تھا۔ کچھ لوگوں کو گرفتار کیا گیا اور سراج شیکدار کو قتل کر دیا گیا۔ لیکن پہلے سے ہی شکوک و شبہات پائے جا رہے ہیں کہ آیا ہنگامی حالت کا یہ نفاذ امن و امان کو بحال کر سکے گا۔ (اس وقت

ملک میں مکمل بدامنی اور لاقانونیت کا راج ہے)۔

یہ بات پچھلے سال مکمل طور پر ثابت ہو چکی ہے کہ نئے صدر انتظامی صلاحیتوں سے یکسر محروم ہیں۔ ان کا انداز اپنی نوعیت میں فاشسٹ ہے۔ وہ اہم مسائل کو ایک طرف کرتے ہوئے چھوٹے چھوٹے عہدے داروں کی ترقی اور تنزلی میں زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں۔ آمرانہ حکومت بدعنوانیوں کو روکتی نہیں بلکہ ان میں اضافہ کا موجب بنتی ہے۔ منہ زور عوامی لیگ کو صرف صدر ہی روک سکیں گے۔ وہ شدید دباؤ میں رہیں گے۔ حزب مخالف کو زیر زمین جانے کے لیے جتنا دبایا جائے گا، دیہاتی علاقوں میں انتہا پسندوں کی لوٹ مار، قتل و غارت اور گوریلا کارروائیوں میں اتنا ہی اضافہ ہوگا۔''

''فار ایسٹ اکنامک ریویو'' کے 14 مارچ 1975ء کے شمارے میں مسٹر ہارڈی سکاٹ لکھتے ہیں، ''ایشیا کی ایک اور جمہوریت کو تباہ کر دیا گیا ہے۔ ایک مرتبہ پھر معاشی ترقی کے نام پر جمہوریت کا صفایا کر دیا گیا ہے۔ برطانوی راج کے خاتمے کے بعد دوسری مرتبہ جمہوریت کو بے فائدہ خیال کیا گیا ہے۔ یقیناً فیلڈ مارشل ایوب خان کی روح مسکراتے ہوئے چہرے سے کہہ رہی ہوگی، ''میں نے آپ کو بتایا تھا...'' 1958ء میں ایوب کا اقتدار پر قبضہ جمہوریت کے خلاف تھا۔ انہوں نے قیادت میں ایک خلا دیکھا اور قومی اور انفرادی زندگی میں اس ادارہ جاتی خلا کو پر کرنے کے لیے خود آگے آئے۔ 1975ء میں یہ پس منظر موجود نہیں ہے۔ شیخ مجیب رہبرِ اعلیٰ ہیں اور ایوب خان کا روپ دھار لینے کے بعد بھی رہبرِ اعلیٰ ہیں۔ اگرچہ جمہوریت کو اس انداز میں تشکیل دیا گیا ہے کہ وہ اپنے اختیارات میں کسی قسم کی کمی کی شکایت نہیں کر سکتے تھے۔ انہوں نے ایوب خان کی طرح فوج کو شامل نہیں کیا۔ تاہم مسلح افواج کی بعض بڑی اور اہم شخصیات کو نئی قومی پارٹی میں شامل کر لیا گیا ہے۔ ''دوسرے انقلاب'' سے قبل بھی تو شیخ کو سول انتظامیہ کو فوجی رنگ دینے کے اختیارات حاصل تھے کیوں کہ ان کی ذاتی فوج، راکھی باہنی کو، جسے فوج کی طرح تشکیل دیا گیا تھا، ناخوشگوار کام انجام دینے کے لیے استعمال کیا جاتا رہا ہے۔

راکھی باہنی نے جو کام انجام دیئے، ان میں سڑکوں پر سرعام لڑائی جھگڑے، مخالف پارٹیوں کو دبانا اور انقلابیوں کا استیصال اور نام نہاد شر پسندوں کا خاتمہ وغیرہ شامل ہیں۔ ''نظم و ضبط کا قیام اور بدعنوانی کا خاتمہ''، محض اپنے مطلق العنان اقتدار کو دوام بخشنے کا بہانہ ہے۔ ایوب اور مجیب کے اقتدار پر قبضے کے طریقہ کار میں کچھ فرق پایا جاتا ہے۔ ایوب خان نے اقتدار پر قبضہ کرنے کے بعد کچھ طاقت ور سمگلروں اور کالا دھندا کرنے والوں پر ہاتھ ڈالا تھا جس نے پورے پاکستان میں گہرے اثرات پیدا کیے تھے۔ چاولوں کی قیمت پورے پاکستان میں بہت زیادہ گر گئی تھی۔ تاہم بعد میں بدعنوانی نے دوبارہ سر اٹھا لیا۔ حتیٰ کہ ایوب خان کے دوست احباب بھی اس میں شامل تھے۔ شیخ کے ''دوسرے انقلاب'' کے دوران ایسا کوئی قدم نہیں اٹھایا گیا۔ حقیقت میں ''دوسرے انقلاب'' کے اثرات اس قدر برائے نام ہیں کہ چاول کی قیمت مسلسل بڑھ رہی ہے۔ شیخ اور ایوب کے درمیان کسی مشابہت کو اجاگر کرنے کے لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے جمہوریت کو پنپنے کا

کوئی موقع نہیں دیا اور استحصال کا شکار عوام کی کوئی مدد نہیں کی گئی۔ ایک متوسط طبقے کے دانشور نے بالکل درست کہا: ''جو غلطی ایوب نے کی تھی شیخ بھی وہی غلطی دہرا رہا ہے۔ ایوب کا خیال تھا کہ عوام صرف معاشی خوش حالی چاہتے ہیں۔ لہٰذا وہ انسانی حقوق کی قیمت پر معاشی خوش حالی کے حصول کے لیے سرگرداں رہا جس کے نتیجے میں شیخ مجیب کو اپنی تحریک کو پروان چڑھانے کا موقع ملا۔ شیخ اس بات کو بھول چکا ہے یا وہ سمجھتا ہے کہ اس کے بھول جانے کو برداشت کیا جاسکتا ہے۔''

برطانوی راج کے دوران مشرقی بنگال کو انتظامی طور پر نظر انداز کیا گیا تھا۔ جب تقسیم ہوئی بنگالی سول ملازمین کو انگلیوں پر گنا جاسکتا تھا۔ اس لیے مغربی پاکستان کی انتظامیہ کو مشرقی پاکستان لانا پڑا۔ حتیٰ کہ خود بنگلہ دیشی آج کھلے بندوں تسلیم کرتے ہیں کہ آزادی کے بعد بعض شعبوں میں، خاص طور پر ریلوے میں صورتِ حال بہت خراب ہوگئی ہے۔ اس سے پہلے ریلوے میں زیادہ تر بہاری کام کرتے تھے اب وہ بے روزگاری کا شکار ہیں۔ بعض ممالک میں انسانی حقوق کی مخالف حکومتیں ایک مؤثر انتظامیہ مہیا کرنے میں کامیاب ہیں۔ لیکن کیا بنگلہ دیش میں بھی ایسا ممکن ہوسکے گا اس میں شکوک وشبہات پائے جاتے ہیں۔ نئے سیاسی نظام کے تحت تمام اختیارات صدر کے ہاتھوں میں ہیں۔ سویکارنو نے امداد دینے والے مغربی ممالک پر شدید تنقید کی تھی۔ ہندوستان کے ہفت روزہ ''السٹریٹڈ'' کو انٹرویو دیتے ہوئے شیخ مجیب نے بھی کئی مرتبہ مغربی میڈیا پر اسی طرح حملہ کیا۔ ''بنگلہ دیش متزلزل ہو جائے گا''، جب انہیں اس پر تبصرہ کرنے کو کہا گیا تو شیخ مجیب نے جواب دیا، ''انہیں کہو کہ وہ جہنم میں جائیں۔ میری حکومت نہیں ان کی دانش اور علم متزلزل ہو جائے گا۔ مغربی اخبارات صرف تنقید کر رہے ہیں اور مشورے دے رہے ہیں۔ یہی کام انہوں نے 1971ء میں بھی کیا تھا۔ وہ دوبارہ یہی کر رہے ہیں۔'' ان کا یہ تبصرہ دلچسپ تھا کیوں کہ بنگلہ دیش آج کے دن تک جنگ آزادی کے دوران بیرونی پریس کے کردار کی تعریف کرتا رہا تھا۔''

151۔ شیخ مجیب ایک موقع پرست انسان تھے

عصر حاضر کی تاریخ میں کتنے رہنما ہیں جنہیں شیخ مجیب کی طرح اپنے عوام کی محبت اور اعتماد حاصل ہوا ہو؟ لیکن اس کے جواب میں انہوں نے کبھی بھی عوام کو اپنا خیال نہ کیا۔ بددیانت پارٹی رہنماؤں اور خوشامدیوں کو ہمیشہ سبقت دی گئی اور ناجائز طور پر چشم پوشی سے کام لیا گیا۔ حتیٰ کہ اپنے خاندان کے ارکان کی غلط کاریوں کی ٹھوس شہادتیں ملنے کے بعد بھی انہوں نے کوئی کارروائی نہ کی۔ انہوں نے انہیں کبھی انہیں اپنے طور طریقے درست کرنے کا کہنا بھی گوارا نہ کیا۔ اپنی اندھی انا اور احساس برتری کی وجہ سے انہوں نے کبھی بھی کسی دانش اور سیاسی معاملہ فہمی رکھنے والے کو برداشت نہیں کیا۔ ان میں خود اعتمادی کا فقدان تھا۔ انہوں نے اپنے سارے آزمودہ اور قابل ساتھیوں سے گلوخلاصی کرالی۔ یہاں تک کہ وہ حقیقی دوستوں، پیروکاروں اور بااعتماد ساتھیوں تک کو شناخت کرنے سے قاصر ہو چکے تھے۔ ان کی سیاسی ناکامی اور افسوس ناک خاتمے کی

ایک وجہ ان کی انانیت تھی۔

ان کی تمام انتظامیہ نوجوان رہنماؤں کی بالا دستی کی وجہ سے غیر فعال ہو چکی تھی۔ ملک کو قحط کا سامنا تھا اور لوگ ہر روز قتل و غارت کے مناظر دیکھ رہے تھے۔ لوگوں کو دن دیہاڑے موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا تھا۔ راکھی باہنی اور پارٹی غنڈوں کو سیاسی مخالفین کو ختم کرنے کی کھلی چھٹی ملی ہوئی تھی۔ پارٹی کے کلیدی عہدے دار غیر قانونی طور پر مسلح تھے۔ ملک مکمل طور پر تباہی کے دہانے پر کھڑا تھا۔ وہ لوگ جو کبھی قید سے ان کی رہائی کے لیے روزے رکھتے تھے، دعائیں کرتے تھے، اب اللہ تعالیٰ سے مجیب حکومت کی بدنظمی سے نجات کے لیے دعائیں مانگ رہے تھے۔ اگر چہ عوامی لیگ کی حکومت کی ناکامی نے شیخ مجیب کو عوام سے تنہا کر دیا تھا تو بکسال کے قیام نے پارٹی کے اندر شدید بے چینی کو جنم دیا تھا۔ پارٹی کے اندر اکثریت ان کے فیصلوں کو قبول نہیں کرتی تھی۔ اگر کوئی شخص ان کے سیاسی کیریئر کا جائزہ لے تو وہ آسانی سے سمجھ سکتا ہے کہ شیخ مجیب ایک خود غرض اور موقع پرست انسان تھے۔ وہ اپنی گرفت کو مضبوط کرنے اور اثر و رسوخ کو بڑھانے کے کسی بھی موقع کو حاصل کرنے کے لیے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے کچھ بھی کر سکتے تھے۔

152۔ اگرتلہ سازش کیس کے اصل منصوبہ ساز شیخ مجیب نہیں بلکہ لیفٹیننٹ کمانڈر معظم حسین تھے

اگرتلہ سازش کیس ایک کھلی مثال ہے۔ بڑے وسیع پیمانے پر یہ پروپیگنڈا کیا گیا کہ شیخ مجیب پہلے بنگالی رہنما ہیں جنہوں نے سوچا تھا کہ مشرقی پاکستان کو مسلح بغاوت کے ذریعے اپنی آزادی حاصل کرنی چاہیے۔ لیکن یہ حقیقت نہیں ہے۔ اگر چہ اس میں شک نہیں کہ اگرتلہ سازش کیس نے شیخ مجیب کو راتوں رات ایک دیو مالائی لیڈر بنا دیا، تاہم یہ لیفٹیننٹ کمانڈر معظم حسین تھے جو اصل منصوبہ ساز تھے۔ یہ غیر معروف اور گم نام نوجوان نیوی آفیسر پہلا بنگالی تھا جس نے آزاد اور خود مختار بنگلہ دیش کا خواب دیکھا تھا۔ اُن کا خیال تھا کہ آزادی صرف مسلح انقلاب کے ذریعے حاصل ہو سکتی ہے۔ ان کے دل میں یہ خیال پچاس کی دہائی کی ابتدا میں، اُس وقت پیدا ہوا، جب انہوں نے نیوی میں شمولیت اختیار کی۔ وہ 1950ء میں رائل اکیڈمی میں تربیت حاصل کرنے کے لیے 8 سے 9 سال کے لیے انگلینڈ چلے گئے۔ واپسی پر انہوں نے مسلح انقلاب کی تیاریاں شروع کر دیں۔ ابتدا میں انہوں نے اپنی انقلابی سرگرمیاں اپنے دو ساتھیوں کی مدد سے شروع کیں۔ جیسے جیسے وہ آگے بڑھے، انہیں ایک سیاسی رہنما کی ضرورت محسوس ہوئی کیوں کہ نیوی کا آفیسر ہونے کی وجہ سے ان کے لیے کھلم کھلا سامنے آنا ممکن نہ تھا۔ وہ یہ بھی سمجھ چکے تھے کہ صرف مسلح افواج کے ارکان کو منظم کرنا کافی نہ ہوگا بلکہ عوامی سطح پر وسیع تر تنظیم تشکیل دیئے جانے کی ضرورت ہے جو انقلاب کی حمایت میں ہو۔ اس کے لیے ایک معروف سیاسی رہنما کی ضرورت تھی، جو وقت آنے پر عوام کو انقلاب کے لیے کھڑا کر سکے۔ انہوں نے سیاسی پارٹیوں اور ان کے رہنماؤں سے ملاقاتیں شروع کیں۔ لیکن ان میں سے زیادہ تر خود اپنے مراتب کے

بارے میں زیادہ متفکر تھے۔ان میں سے اکثر رہنماؤں نے اسے ناعاقبت اندیش اور جنونی قرار دے دیا۔

بہت سے قدآ ور اور جرأت مند سیاست دان اُن کی اس تجویز پر شدید خوف زدہ ہو گئے۔1964ء میں انہوں نے اپنے اس منصوبے پر شیخ مجیب کے ساتھ بات چیت کی جو بالواسطہ اخلاقی حمایت کے علاوہ مزید کچھ کرنے پر تیار نہ ہوئے۔1962ء میں کمانڈر معظم کی تقرری چٹاگانگ میں کردی گئی جس سے انہیں اپنے مقصد کو آگے بڑھانے میں بہت مدد ملی۔1967ء میں انہوں نے اپنے دوساتھیوں مسٹرعلی رضا اور سٹیورڈ مجیب الرحمٰن کو ہندوستان کی مدد حاصل کرنے کے لیے اگرتلہ بھیجا۔ہندوستانی حکام اور اس کے نمائندوں کے درمیان گفتگو زیادہ بارآور ثابت نہ ہوسکی۔آزادی کے صرف ایک ماہ بعد سٹیورڈ مجیب الرحمٰن کو نامعلوم افراد نے بنگلہ دیش کی سرزمین پر قتل کردیا۔جنگ آزادی کے دوران اس نے اپنے سیکٹر کے عوامی لیگی رہنماؤں سے اختلاف کیا تھا جس کی پاداش میں اس دلیر مجاہد آزادی کو آزاد بنگلہ دیش میں زندگی بسر کرنے کی اجازت نہ دی گئی۔نومبر 1967ء کو کمانڈر معظم حسین کو ایک کانفرنس کے بہانے اسلام آباد بلایا گیا۔جب وہ اسلام آباد پہنچے تو انہیں علم ہوا کہ کانفرنس محض ان کے لیے ایک جال تھا۔پاکستان انٹیلی جینس کو علم ہو چکا تھا کہ کمانڈر معظم، بنگلہ دیش کی آزادی کے لیے ایک انقلاب منظم کرنے کی تیاریاں کررہا ہے۔اس بات کا علم ہونے پر انہوں نے ایک فرضی نام کے تحت 7 دسمبر 1967ء کو واپس ڈھاکہ پہنچنے کا انتظام کیا اور سدھیش واڑی ڈھاکہ میں اپنے چھوٹے بھائی کے گھر میں پناہ حاصل کرلی۔9دسمبر کو تقریباً10 اور 11 بجے رات کیپٹن نورالاسلام شیشو نے (جو بعد میں بنگلہ دیش فوج میں جنرل بن گئے) فوجی انٹیلی جینس کے چند دوسرے ممبران کے ساتھ ان کے گھر پر چھاپہ مارا اور انہیں گرفتار کر لیا۔اس وقت کمانڈر معظم کی طبیعت ٹھیک نہ تھی۔انہیں لے جاتے ہوئے کیپٹن اسلام نے ان کی بیوی مسز کوہ نور حسین سے کہا کہ انہیں کسی خاص مقصد کے لیے محض ایک گھنٹے کے لیے ڈھاکہ کلب لے جایا جارہا ہے۔ لیکن انہیں 14 ماہ کے بعد رِہا کیا گیا۔حراست میں ان پر وحشیانہ تشدد کیا گیا تھا۔

کمانڈر معظم حسین نے فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ ٹوٹ جائیں گے لیکن جھکیں گے نہیں۔14 ماہ کے وحشیانہ تشدد کے باوجود پاکستانی انٹیلی جینس ان سے کچھ بھی نہ اگلوا سکی۔جون 1968ء کو ڈھاکہ چھاؤنی میں مشہور "اگرتلہ سازش کیس" کی سماعت شروع ہوئی۔ملزم نمبر1 کمانڈر معظم حسین تھے۔بعد میں حکمران فوجی ٹولے کو احساس ہوا کہ اگر یہ مقدمہ "ریاست بنام کمانڈر معظم حسین" شروع کیا گیا تو ان کی بدنامی ہوگی کیوں کہ اس حوالے سے سوال پیدا ہوگا کہ کس طرح ایک 32، 34 سال کا حاضر ڈیوٹی نوجوان آفیسر اتنے لمبے عرصے تک اس قسم کی سرگرمیوں میں مصروف رہا جب کہ پاکستان کی انٹیلی جینس ایجنسیاں بہت مستعد سمجھی جاتی ہیں؟ یہ سارے سیٹ اپ کے لیے نقصان دہ ثابت ہوگا۔لہٰذا ایک پنتھ دو کاج کے مصداق دوہرا فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا گیا۔شیخ مجیب الرحمٰن کو ملزم نمبر1 کی حیثیت سے شامل کرلیا گیا اور معظم حسین کا نام دوسرے نمبر پر رکھ دیا گیا۔یہ مقدمہ شیخ مجیب کے لیے رحمت ثابت ہوا اور وہ راتوں رات ایک ہیرو بن گئے۔

15 فروری 1969ء کو سارجنٹ ظہورالحق کو گولی مار کر ہلاک کردیا گیا اور کہا یہ گیا کہ وہ بھاگنے کی

کوشش کرتا ہوا مارا گیا تھا۔ شیخ مجیب الرحمٰن نے بھی کامریڈ سراج شیکدار کے قتل پر یہی جواز پیش کیا تھا۔

شیخ مجیب الرحمٰن کے بارے میں کمانڈر معظم حسین کے خیالات اچھے نہ تھے اور نہ ہی انہوں نے عوامی لیگ پر زیادہ اعتماد کیا تھا۔ انہوں نے آزادی کے سوال پر شیخ مجیب کو ڈگمگاتے ہوئے دیکھا تھا۔ انہیں علم ہو گیا تھا کہ شیخ مجیب پاکستانی وفاق کے تحت خود مختاری پر مطمئن تھے اور اسی طرح شیخ مجیب الرحمٰن بھی کمانڈر معظم کی صاف گوئی کو پسند نہیں کرتے تھے۔

26 مارچ 1971ء کو انہیں اٹھایا گیا اور ان کے گھر کے سامنے مار ڈالا گیا۔ مرحوم کے خاندان نے لاش وصول کرنے سے انکار کر دیا، اس لیے ان کی لاش کو چھاؤنی لے جایا گیا۔

کمانڈر معظم، اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے تھے۔ دھرتی کا یہ بہادر سپوت اپنے وطن سے محبت کرتا تھا اور اس کی آزادی کے لیے اس نے اپنی جان قربان کر دی۔ ملک نے آزادی حاصل کر لی۔ شیخ مجیب الرحمٰن غیر متنازع رہنما بن گئے اور اقتدار پر قابض ہو گئے۔ لیکن اتنے فراخ دل ثابت نہ ہو سکے کہ کمانڈر معظم کی بے غرض قربانیوں کو مناسب خراجِ تحسین پیش کر سکتے۔ اگرتلہ سازش کیس کے اصل حقائق کے بارے میں بھی انہوں نے کبھی وضاحت کے ساتھ بات نہ کی اور ساری نیک نامی اپنے ہی کھاتے میں ڈالنے کی کوشش کرتے رہے۔ پیوستہ مفادات کے حامل حلقے عموماً مخالف آوازوں کو خاموش کر دیتے ہیں جب کہ سمجھوتہ باز موقع پرستوں کے لیے دروازے ہمیشہ کھلے رکھے جاتے ہیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ 26 مارچ 1971ء کو کمانڈر معظم کو مار دیا گیا تھا اور شیخ مجیب کو فوجی ٹولے نے حراست میں لے لیا تھا۔ یہ تھا وہ کچھ جو ماضی میں ہوا اور مستقبل میں ہمیشہ دہرایا جاتا رہے گا۔

153۔ تیسرا قاتلانہ حملہ

فروری 1975ء کے آغاز میں ایک شام میں، نمی اور نور مسز ساجدہ چوہدری اور ان کے گھر والوں سے ملنے کے لیے گئے۔ وہ اندرا روڈ پر ایک دو منزلہ عمارت کی دوسری منزل میں رہتے تھے۔ جبکہ جے آر بی کے ڈپٹی ڈائریکٹر کرنل صبیح الدین نچلی منزل میں رہتے تھے۔ چچا اور چچی، یعنی مسٹر غلام اکبر چوہدری (سابقہ جنرل سیکریٹری اور عوامی لیگ کی کابینہ کے ایک وزیر) اور مسز ساجدہ چوہدری دونوں ہمارے ساتھ بڑا مشفقانہ برتاؤ کرتے تھے۔ خاندانی طور پر ہمارے بڑے قریبی تعلقات تھے۔ جنگ آزادی کا سارا عرصہ وہ کلکتہ میں میرے سسر کے گھر رہے تھے۔ انہوں نے رات کا کھانا کھائے بغیر ہمیں واپس نہ جانے دیا۔ یہ رات کے دس ساڑھے دس کا وقت تھا، ہم نے جانے کی اجازت چاہی اور باہر نکل کر کار میں بیٹھ گئے۔ اندرا روڈ سے ایک تنگ گلی مکان تک آتی تھی۔

جیسے ہی ہماری کار گیٹ سے باہر نکلی، اچانک نور نے پچھلی سیٹ سے چیخ کر کہا، ''سر وہ فائرنگ کر رہے ہیں۔'' میں نے سامنے چادر میں لپٹے ہوئے دو آدمیوں کو دیکھا جو ہم پر مشین گن تانے ہوئے تھے۔ میں نے پلک جھپکنے میں گاڑی کو بیک گیئر میں ڈالا اور تیزی سے دوبارہ اندر آ گیا۔ جیسے ہی ہم واپس ہوئے،

ان دونوں حملہ آوروں کو سمجھ آ گئی کہ اب کھیل بگڑ گیا ہے، لہٰذا وہ تیزی سے بھاگ نکلے۔ ہم سب بھاگ کر اوپر گئے۔ بے چاری نمی، زرد اور ٹھنڈی پڑ چکی تھی۔ وہ سیدھی چچی کے پاس گئی اور آنسوؤں سے رونے لگی۔ چچی نے فوراً اسے اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ گھر کا ہر فرد گنگ ہو گیا تھا۔ ''کیا معاملہ ہے؟ کیا ہوا ہے؟'' ہبلو، چھٹکا، لبو اور مانو سب بھاگتے ہوئے آ گئے۔ میں نے انہیں سارا واقعہ بتایا۔ چچا اور چچی سکتے میں آ گئے۔ کرنل صبیح الدین کی وجہ سے گھر پر 24 گھنٹے پہرہ رہتا تھا۔ راکھی باہنی یونیفارم میں اور سول کپڑوں میں ہر وقت پہرے پر ہوتی تھی۔ ایسی صورتِ حال میں یہ سب کیسے ہو سکتا تھا؟ چچی بہت زیادہ پریشان تھیں۔ وہ مجھے اور نور کو نیچے کرنل صبیح الدین کے پاس لے کر گئیں اور سارا واقعہ سنایا۔ کرنل صبیح الدین نے گھبرائے ہوئے انداز میں کہا: ''حالات اچھے نہیں ہیں۔ مجھے بتائیں اب کیا کرنا چاہیے؟''

ہم سمجھ گئے کہ وہ معاملے کو ٹالنا چاہ رہے ہیں۔ چچی بھی ان کے رویے پر زیادہ خوش نہیں تھیں۔ ہم واپس اوپر آ گئے۔ چچی نے روڈ نمبر 32 شیخ مجیب کے گھر فون کیا۔ ان کے درمیان کیا باتیں ہوئیں، ہمیں علم نہیں لیکن بات ختم کرنے کے بعد وہ بڑی افسردہ نظر آ رہی تھیں اور انہوں نے کہا، ''گھر فون کر دو کہ تم آج رات نہیں آ رہے ہو۔ تم رات یہیں بسر کرو گے۔''

ان کے کہنے کے مطابق ہم نے رات اندرا روڈ پر ہی بسر کی اور دوسرے روز صبح گھر واپس آئے۔ جس چیز نے مجھے متوجہ کیا، وہ یہ تھی کہ راکھی باہنی کے لڑکے گھر کی حفاظت سول کپڑوں میں کر رہے تھے۔ وہ دونوں لڑکے بھی سول کپڑوں میں تھے اور ان کے پاس بھی ہندوستان کی 9 ایم ایم سب مشین گنیں تھیں۔ مجھے پولیس سپرنٹنڈنٹ محبوب کی تنبیہ یاد آئی۔ دو جمع دو چار ہوتے ہیں۔ میں ابھی تک حکومت کی ''نظروں میں محبوب'' تھا، لہٰذا مجھے زیادہ ہوشیار اور محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔

154۔ انقلابی کارروائی ناگزیر

بکسال کے قیام سے پہلے بڑے زور شور سے یہ پروپیگنڈا شروع کیا گیا تھا کہ شیخ مجیب الرحمٰن کو اقتدار کا کوئی لالچ یا ہوس نہیں، اور وہ اپنی پارٹی کے ارکان اور رہنماؤں کی بدعنوانیوں سے لاتعلق نہیں ہیں۔ وہ جان چکے ہیں کہ ان کی پارٹی کا تمام کردار تباہ و برباد ہو چکا ہے۔ اس قسم کی پارٹی کو ساتھ لے کر ملک کی بہتری کے لیے کچھ کرنا ممکن نہیں رہا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی پارٹی کو ختم کرنا اور یک حزبی حکومت متعارف کروا کر ایک ''دوسرے انقلاب'' کی ابتدا کرنا چاہتے ہیں۔ عوام نے سمجھا کہ ان کے ''دوسرے انقلاب'' کے ذریعے بدکردار عناصر کو رد کر دیا اور اقتدار سے الگ کر دیا جائے گا۔ لیکن ان کی توقعات بہت جلد ہوا ہو گئیں۔ لوگوں نے دیکھا کہ غازی غلام مصطفیٰ، منصور علی اور شیخ مونی اینڈ کمپنی جیسے بدکردار اور نفرت انگیز کردار کے حامل افراد بکسال کے قیام کے بعد مزید طاقت ور ہو گئے۔ شیخ مجیب نے اپنے دوسرے انقلاب کا آغاز ان کی مدد سے کیا تھا جو عوامی لیگ کو بدنام کرنے کے زیادہ تر ذمہ دار تھے۔ نتیجتاً

عوام مزید مایوس ہو گئے۔ شیخ مجیب الرحمٰن نے اپنی پارٹی چھوڑ دی تھی لیکن اپنے ''چترا دل'' (لنگوٹیے یاروں) کو نہیں چھوڑ سکے تھے۔ بکسال کی تشکیل سے ایک اور بات جو واضح ہوگئی، یہ تھی کہ ان کے اپنے خاندان کے افراد اب اقتدار کے ڈھانچے میں زیادہ مضبوط اور مستحکم پوزیشنوں پر فائز ہو چکے تھے۔ بنگلہ دیش، شیخ مجیب کی ذاتی جاگیر نظر آنے لگا تھا۔

بکسال کے قیام کے ساتھ ہی سیاست اور تمام سیاسی جماعتوں پر پابندی لگا دی گئی۔ تمام سیاسی سرگرمیوں کو زیرِ زمین دھکیل دیا گیا۔ ہم نے مختلف سیاسی پارٹیوں سے اس نئی صورتِ حال پر تبادلہ خیال شروع کر دیا۔ مناسب سوچ بچار کے بعد ہم میں سے اکثر اس بات پر متفق تھے کہ بغیر کسی مزید تاخیر کے قوم کو ہر صورت میں بکسال کی آمرانہ اور استبدادی حکومت سے نجات دلانی ہوگی اور بنیادی انسانی حقوق اور جمہوریت کی بحالی ضروری ہو چکی ہے۔ اس سے پہلے کہ بکسال جڑیں پکڑے، اسے اکھاڑ پھینکنا ہوگا۔ ڈریکولائی بکسال کو ختم کرتے ہوئے اور عوام کو اس کے پنجوں سے رہائی دلاتے ہوئے قومی آزادی اور خود مختاری کی ہر صورت میں حفاظت کرنا ہوگی۔ لیکن محبّ وطن اور قوم پرست سیاسی قوتیں جو اس کام کو انجام دینے کا جواز رکھتی تھیں، وہ کمزور اور بے وسیلہ تھیں۔ اس فاشسٹ حکومت کے تحت وہ مزید کمزور ہو رہی تھیں۔ لہٰذا ان کے لیے ممکن نہ تھا کہ حکومت کو گرانے کے لیے کسی انقلابی قدم کا آغاز کرتیں۔

لیکن اس صورتِ حال میں خاموش تماشائی بن کر بیٹھے رہنا بھی ممکن نہ تھا۔ آمریت کو، اس سے پہلے کہ قدم جمالے، اکھاڑ پھینکنا ضروری ہو چکا تھا۔ اکثر لوگ جن سے ہم ملے، ان کا کہنا تھا کہ اگر مسلح افواج کا محبّ وطن حلقہ انقلاب کو منظم کرنے میں ہراول دستے کا کردار ادا کرے تو صرف اس صورت میں قوم کو اس حبس زدہ ماحول سے آزاد کروایا جا سکتا ہے۔ ہم مابین السطور کو پڑھ سکتے تھے۔

جب ایک آمر کو کسی آئینی یا جمہوری طریقے سے ہٹانا ناممکن ہو جاتا ہے تو پھر ایسے جابر فرماں روا کو ہٹانے کے لیے غیر آئینی ذرائع اختیار کرنا ناگزیر ہو جاتے ہیں۔ جمہوریت کی بحالی کے لیے کسی بھی آمرانہ حکومت کے خاتمہ کے لیے اٹھائے گئے انقلابی اقدامات کو عوام کی پُر جوش حمایت خود بخود جواز مہیا کر دیتی ہے اور اس طرح یہ عوامی انقلاب میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

کھنڈکر مشتاق احمد نے بھی اپنی گفتگو میں ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا۔ انہوں نے مسلح افواج کے محب وطن حلقے کی جانب سے جمہوریت کی بحالی کے لیے آمرانہ حکومت کے خاتمے کے لیے اٹھائے گئے کسی بھی قدم کی مکمل حمایت کا یقین دلایا۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ کھنڈکر مشتاق احمد جن خیالات کا اظہار کر رہے تھے ان کے پیچھے عوامی لیگ کے ایک بڑے حلقے کی حمایت بھی شامل تھی۔ جب ہم جنرل عثمانی کو ان کے استعفیٰ کے بعد ملنے کے لیے گئے تو انہوں نے دوسری باتوں کے علاوہ کہا:

''مجیب کو اتارنا ضروری ہے، لیکن بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے گا؟''

155۔فوجی کونسل نے عوامی انقلاب منظّم کرنے کا فیصلہ کرلیا

فوجی کونسل نے فیصلہ کیا کہ عوام کو ہر قیمت پر بکسال کی غلامی سے نجات دلانا ضروری ہے۔ملک کے عظیم تر مفاد میں ایک عوامی انقلاب منظّم کر کے جمہوریت کو ہر حال میں بحال کرنا ہوگا۔فوجی کونسل کی مرکزی قیادت نے اس کام کے لیے حکمت عملی طے کرنے کے لیے غور وخوض شروع کر دیا۔اس دوران تنظیمی کوششیں پورے زور شور سے جاری تھیں۔فوجی کونسل کی خفیہ برانچیں تمام چھاؤنیوں میں متحرک تھیں۔سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں،عوام کے مختلف طبقات،اور متعلقہ سیکٹروں کے ساتھ تفصیلی گفتگو کی روشنی میں حاصل شدہ آراء اور نظریات کی بنیادوں پر اور مرکزی قیادت کے باریک بینی سے کیے گئے تجزیے اور بحث مباحثے کے بعد مندرجہ ذیل مقاصد،اہداف اور انقلاب کا کم از کم پروگرام تشکیل دیا گیا۔

مقصد: فوج کے محبِ وطن حلقوں کی مدد سے شیخ مجیب کی کٹھ پتلی آمرانہ بکسال حکومت کا خاتمہ۔

اہداف: بکسال کی جگہ ایک عبوری سول حکومت کا قیام،بعد میں ایک قابل اور مقبول رہنما کی قیادت میں قومی حکومت کا قیام،جسے موجودہ پارلیمنٹ میں ایک خاصے بڑے حلقے اور ساتھ ہی ساتھ عوام کی حمایت بھی حاصل ہو۔

میجر جنرل شفیع اللہ کو ہٹا کر میجر جنرل ضیاالرحمٰن کو چیف آف آرمی سٹاف مقرر کرنا اور نام ور جنرل عثمانی کو عبوری حکومت کا دفاعی مشیر مقرر کرنا۔

مارشل لاء کے نفاذ کے ذریعے عبوری حکومت،اور جس قدر جلد ممکن ہو سکے قومی حکومت کے قیام کی کوششوں میں اس کی مدد کرنا۔

حکومت کے غور وخوض کے لیے مندرجہ ذیل کم از کم پروگرام پیش کرنا۔

کم از کم پروگرام:

1۔ جمہوریت اور عوام کے بنیادی حقوق بحال کرنا۔

2۔ ملک میں جمہوری کلچر کی بحالی کے لیے سیاسی پارٹیوں پر سے پابندی اٹھانا اور کھلی کثیر الجماعتی سیاست کی اجازت دینا۔

3۔ ممکنہ حد تک کم مدت میں عام انتخابات کی تاریخ طے کرنا اور آزاد اور منصفانہ انتخابات کروانے کے لیے ضروری اقدامات اٹھانا۔

4۔ ہندوستان کے ساتھ 25 سالہ معاہدہ فسخ کرنے کے عمل کی ابتدا کرتے ہوئے بنگلہ دیش کو ہندروسی اتحاد سے باہر لانے کے لیے ضروری اقدامات اٹھانا۔

5۔ قومی آزادی اور خودمختاری کو درپیش کسی بھی چیلنج سے نمٹنے کے لیے صدر کے تحت ایک نیشنل سکیورٹی کونسل تشکیل دی جائے۔تمام سروسز چیف اس کونسل کے ممبر ہوں گے۔

6۔ ہنگامی بنیادوں پر دفاعی افواج کی از سرِ نو تنظیم کی جائے گی اور ایک جامع نیشنل ڈیفنس سروس نظام متعارف کروایا جائے گا۔

7۔ آئین کی چوتھی ترمیم، پریس اور پبلی کیشن کا ضابطہ، جاتیو راکھی باہنی کا قانون، بین الاقوامی لیبر قوانین کے خلاف تمام لیبر قوانین اور تمام کالے اور عوام دشمن قوانین اور ایکٹ جو عوامی لیگ اور بکسال کی حکومت نے نافذ کیے تھے، ختم کر دیئے جائیں گے۔

8۔ تمام سیاسی قیدیوں کو غیر مشروط پر رِہا کرنا۔

9۔ عوام کو بکسال کے قیام کے پس پردہ حقیقی محرکات اور شیخ مجیب کی غداری سے آگہی مہیا کرنا۔

10۔ تیزی کے ساتھ ملک میں امن وامان کی صورتِ حال بحال کرنا۔

11۔ عدلیہ کی آزادی کو یقینی بناتے ہوئے قانون کی حکمرانی بحال کرنا۔

12۔ قومی دولت کی لوٹ مار کو روکنے کے لیے، جو عوامی بکسال حکومت کے تحت بلا روک ٹوک جاری تھی، ضروری اقدامات کرنا اور دیوالیہ معیشت کو مضبوط کرنے اور اس کی تشکیل نو کے لیے فوری اقدامات اٹھانا۔

13۔ انتظامی اور قانون نافذ کرنے والی ایجنسیوں کو مضبوط کرنے اور ان کو عوام دوست اداروں میں تبدیل کرنے کے لیے مناسب اصلاحات کے لیے ضروری اقدامات اٹھانا۔

14۔ ایک آزاد خارجہ پالیسی پر عملدرآمد۔

15۔ آئین کی ان دفعات اور ضابطوں کو ختم کرنا جو اکثریتی مسلم آبادی کے طرزِ زندگی کے برعکس ہیں یا ان کے عقائد سے مطابقت نہیں رکھتے اور ساتھ ہی اقلیتوں کے لیے برابر کے مذہبی اور ثقافتی حقوق کو یقینی بنانا۔

156۔ مجیب تاعمر صدر رہنا چاہتے تھے

اس دوران شیخ مجیب الرحمٰن بکسال کی تشکیل کے بعد بھی محفوظ محسوس نہیں کر رہے تھے۔ انہوں نے اپنے آپ کو ''تاعمر صدر'' نامزد کروانے کا فیصلہ کیا۔ 15 اگست 1975ء کو ڈھاکہ یونیورسٹی میں اجلاس کے دوران انہیں ''تاعمر صدر'' نامزد کیے جانے کا اعلان کیا جانا تھا۔ بکسال کے قیام اور چوتھی ترمیم کے ذریعے انہوں نے پہلے ہی پانچ سال یقینی بنائے ہوئے تھے لیکن انہیں کافی خیال نہیں کیا جا رہا تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ باوثوق ذرائع سے اطلاعات ملی تھیں کہ مختلف انٹیلی جینس ایجنسیوں کی مدد سے ایک ''ہٹ لسٹ'' تیار کر لی گئی تھی جس میں مختلف پیشوں اور شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے افراد شامل تھے۔ اس فہرست میں شامل تمام لوگوں کو مقرر کردہ ضلعی گورنروں کے ذریعے جن کے تحت جے آر بی یونٹیں رکھی گئی تھیں ختم کرنے کا حتمی فیصلہ کر لیا گیا تھا تاکہ مستقبل میں بکسال کے خلاف کسی بھی قسم کی احتجاجی آواز کو ہمیشہ کے لیے دبا دیا جائے۔ ہر قسم کی سیاسی مخالفت کو ابتدا ہی میں ختم کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ شیخ مجیب الرحمٰن اپنی پوزیشن کو مضبوط کرنے کے لیے اور اپنے خاندانی اقتدار کو یقینی بنانے کے لیے فوج کے خاتمے اور اس کی جگہ جاتیو راکھی باہنی کو

بحال کرنے پر غور کر رہے تھے۔ لہٰذا ان حقائق کی روشنی میں اس سے پہلے کہ شیخ مجیب الرحمٰن ''تاعمر صدر'' بن سکیں اور اپنے شرم ناک منصوبے کو عملی جامہ پہنا سکیں، انقلاب کا فیصلہ کر لیا گیا۔ جیسا کہ واقعات بڑی تیزی سے رونما ہو رہے تھے، ہمیں انقلاب کی منصوبہ بندی کے لیے اپنی کوششوں کو دو چند کرنا پڑ گیا۔

157۔ لیفٹیننٹ کرنل رشید کا فوجی کونسل کے رہنماؤں سے رابطہ

تھوڑے ہی عرصہ بعد ایک دن لیفٹیننٹ کرنل کھنڈکر عبدالرشید نے فوجی کونسل کے بعض مرکزی رہنماؤں سے ملاقات کی۔ اس ملاقات میں ملک کی مجموعی صورتِ حال پر کچھ بات چیت ہوئی۔ حال ہی میں تشکیل دی گئی بکسال اور شیخ مجیب الرحمٰن کو تاعمر صدر قرار دینے کے حالیہ حکومتی فیصلے پر تبصرہ کرتے ہوئے لیفٹیننٹ کرنل رشید نے کہا کہ اگر شیخ مجیب کو پوری طرح پاؤں جمانے کا موقع مل گیا تو ملک کو فاشسٹ بکسال کی غلامی سے آزاد کروانا بہت مشکل ہو جائے گا۔ ان کی بھی یہی رائے تھی کہ موجودہ سیاسی قوتوں کے لیے اپنی کمزور حیثیت کی وجہ سے حکومت کو اقتدار سے ہٹانا ممکن نہیں ہوگا۔

لیفٹیننٹ کرنل رشید نے مزید کہا کہ ان حالات میں وہ اور لیفٹیننٹ کرنل سید فاروق الرحمٰن، دونوں سمجھتے ہیں کہ بکسال کو صرف انقلاب کے ذریعے ختم کیا جاسکتا ہے۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ تجربہ کار سیاست دان کھنڈکر مشتاق احمد کے تحت متبادل حکومت قائم کی جاسکتی ہے۔ لیفٹیننٹ کرنل رشید اس معاملے میں فوجی کونسل کے نظریات جاننا چاہتے تھے۔ لیفٹیننٹ کرنل رشید اور لیفٹیننٹ کرنل فاروق دونوں مجاہدین آزادی تھے اور اس وقت بالترتیب سیکنڈ فیلڈ آرٹلری رجمنٹ اور فرسٹ بنگال لانسرز کے کمانڈنگ آفیسرز تھے۔ ان کی یونٹیں اس وقت ڈھاکہ چھاؤنی میں تھیں۔ یہ دونوں فوجی کونسل کے رہنماؤں میں جانی پہچانی شخصیات تھے۔ ان کی حب الوطنی کسی شک وشبے سے بالاتر تھی اور پوری طرح قابل اعتماد تھے۔ اس لیے کرنل رشید کو بتایا گیا کہ فوجی کونسل بھی اس قسم کے منصوبے پر غور کر رہی ہے۔ اس پر لیفٹیننٹ کرنل رشید نے مشترکہ کوششوں سے انقلاب منظم کرنے کی تجویز پیش کی۔ انہوں نے یہ تجویز انتہائی خلوص اور جذبے سے دی تھی جسے خوش آمدید کہا گیا اور پورے اتفاقِ رائے سے انقلاب کے مقصد، اہداف اور کم از کم پروگرام پر معاہدہ طے پا گیا۔ گفتگو کے دوران لیفٹیننٹ کرنل رشید نے ایک تجویز پیش کی کہ ایئر وائس مارشل اے کے کھنڈکر کو عہدے سے ہٹا کر ان کی جگہ گروپ کیپٹن ایم جی تواب کا چیف آف ایئر سٹاف کے طور پر تقرر کیا جائے۔ جب میجر جنرل ضیاالرحمٰن کو چیف آف آرمی سٹاف بنایا جائے تو یہ کام بھی اس کے ساتھ ہی کر دیا جائے۔

فوجی کونسل نے ان کی تجویز منظوری کر لی۔ اس قسم کے معاہدے کے بعد ایک عوامی انقلاب کے لیے تیاریاں شروع کی گئیں۔ لیفٹیننٹ کرنل رشید نے انقلاب کے مقصد، اہداف اور کم از کم پروگرام پر کھنڈکر مشتاق احمد کی رضامندی حاصل کرنے کے لیے اپنی خدمات پیش کیں کیوں کہ وہ کھنڈکر مشتاق احمد کے رشتہ دار بھی تھے۔ آئندہ باقاعدہ رابطوں کے ذریعے معلومات کے تبادلے اور ''ایکشن پلان'' مل کر تیار کرنے کا

فیصلہ بھی کیا گیا۔اس طرح انقلاب کی کامیابی کے امکان مزید روشن ہو گئے تھے۔

158۔''خفیہ سرکلر''جو فوجی کونسل کی یونٹوں میں بھیجا گیا

مرکز سے فوجی کونسل کی تمام یونٹس کو ایک انتہائی خفیہ سرکلر بھیجا گیا، جس میں 1971ء اور 1975ء کے دوران پروان چڑھنے والی سیاسی صورتِ حال کی وضاحت کی گئی تھی اور انقلاب کے امکان کا ذکر تھا۔اس سرکلر کا مجملہ متن یہ تھا:

''روسی سامراجیت اور ہندوستان کی توسیع پسندی نے 1971ء کی جنگ آزادی کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے عوامی لیگ، جو رجعت پسند طبقے کی نمائندگی کرتی ہے، کی مدد سے بنگلہ دیش کو ایک طفیلی ریاست میں تبدیل کر دیا ہے۔شیخ مجیب الرحمٰن اور ان کی عوامی بکسال حکومت نے پہلے سے طے شدہ منصوبے کے مطابق ''ہندروس'' بلاک کی اطاعت قبول کرتے ہوئے جنگ آزادی کو بے معنی بنادیا ہے۔ جنگ آزادی کی روح مکمل طور پر کچل دی گئی ہے۔16 دسمبر 1971ء کو بنگلہ دیش نے اپنی جغرافیائی آزادی تو حاصل کر لی لیکن کٹھ پتلی حکومت اور اس کے بیرونی آقاؤں نے نجات کا راستہ بند کر دیا ہے۔قومی آزادی اور ملکی خودمختاری کو ''ہندروس'' بلاک کے آگے گروی رکھ دیا گیا ہے۔شیخ مجیب اور ان کی پارٹی کا چار سالہ ظالمانہ فرماں برداری کا دَور تاریخ کا سیاہ باب ہے۔روسی سامراجیت کے استحصال، توسیع پسند ہندوستان کے عظیم منصوبے، فاشسٹ آمریت ناانصافی، استبداد، دہشت اور بے قابو رشوت ستانی نے زندگی ناقابل برداشت بنادی ہے۔ایسی لوٹ مار اور غارت گری، جس کی ماضی میں کہیں مثال نہیں ملتی، کی وجہ سے قومی معیشت تباہ کر دی گئی ہے اور قوم بربادی کے کنارے پر کھڑی ہے۔سیاسی میدان میں عدم استحکام اور لاقانونیت چھائی ہوئی ہے۔یقیناً یہ محبِ وطن اور قوم پرست سیاسی جماعتوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ قوم کو اس حبس زدہ حالت سے نجات دلوائیں۔لیکن ایک طے شدہ سازش اور عوامی بکسال حکومت کی برہنہ دہشت کی وجہ سے قانون کے پابند شہریوں کے لیے آئینی ذرائع سے اس مطلق العنان آمرانہ حکومت سے جان چھڑوانا ممکن نہیں رہا۔اس صورتِ حال میں ایک عوامی انقلاب منظم کرنے کے سوا کوئی دوسرا راستہ نظر نہیں آ رہا، جو یک حزبی حکومت اور شیخ مجیب الرحمٰن کے آمرانہ راج کا خاتمہ کرسکتا ہو۔یہی وجہ ہے کہ فوجی کونسل نے مسلح افواج کے محبِ وطن حلقوں کی جانب سے رضاکارانہ طور پر اس مقدس ذمہ داری کو قبول کرتے ہوئے بکسال کی آمرانہ حکومت کو الٹنے اور عوام کو آزاد کرانے کے لیے ایک عوامی انقلاب لانے کا فیصلہ کیا ہے۔

انقلاب کا مقصد اقتدار پر قبضہ اور فوجی حکومت کا بوجھ ڈالنا نہیں ہے۔تیسری دنیا کے بہت سے ممالک میں فوج نے ملکی اقتدار پر قبضہ کرنے کے لیے ان مواقع سے فائدہ اٹھایا ہے جو سیاست دانوں کی نااہلی اور ناکامی کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔لیکن قومی سیاست میں مسلح افواج کی اس قسم کی براہِ راست مداخلت نے صرف حکومتی ٹولے کے ارکان کو ہی فائدہ پہنچایا ہے۔اس طرح کسی بھی ملک یا قوم کو کوئی فائدہ

حاصل نہیں ہوا۔

ہم کسی ایسے طالع آزما جتھے کے لیے کام نہیں کر رہے۔ ہمارا مقصد اپنی نوعیت میں ایک مکمل طور پر مختلف قسم کا انقلاب لانا ہے۔ ہم اپنے ہم وطنوں اور دنیا کے سامنے ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ بنگلہ دیش کی مسلح افواج محبِ وطن ہیں۔ ہم اقتدار کے بھوکے موقع پرست نہیں ہیں۔ ہم وہ نہیں جو صورتِ حال کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے نجات دہندوں کی صورت میں آتے ہیں اور ظلم کرنے والے بن جاتے ہیں۔ ہم نے اپنے آپ کو ملک اور قوم کے مفاد کے تحفظ کے لیے وقف کر رکھا ہے۔ ہم بنیادی حقوق اور جمہوریت کی بحالی کے لیے انقلاب لائیں گے تا کہ محبِ وطن اور قوم پرست سیاسی قوتیں جمہوری کلچر کے تحت سیاست میں حصہ لینے کے لیے اپنے آپ کو منظم کر سکیں۔

اس طرح قومی مفاد کو فروغ دینے کے ایک نئے باب کا آغاز ہوگا۔ ضروری ہے کہ ملک پر جمہوری طور پر منتخب نمائندے حکومت کریں۔ ہم مسلح افواج کے ارکان کی حیثیت سے ہمیشہ بہت چوکنے اور عوام سے مخلص رہیں گے۔ صرف اپنی قربانیوں کے ذریعے ہی ثابت کر سکتے ہیں کہ ہم اس دھرتی کے قابل سپوت ہیں۔''

159۔ معلومات کی فراہمی، ان کا باریک بینی سے تجزیہ اور 12 اگست کا اجلاس

فوجی کونسل کو اطلاع ملی کہ یونیورسٹی میں 15 اگست کی تقریب میں کابینہ کے تمام ممبران، عوامی لیگ کے مرکزی رہنما، نئے مقرر کیے گئے گورنرز اور اضلاع کے رہنما موجود ہوں گے۔ وہ پہلے ہی ڈھاکہ پہنچنا شروع ہو گئے تھے۔ ان میں زیادہ تر ایم پی ہوسٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ سیکیورٹی پولیس اور سپیشل سکواڈ انہیں تحفظ مہیا کر رہی تھی۔ اس کے علاوہ چترا لیگ اور جبو لیگ کے مسلح عہدے دار بھی شیخ کمال کی سربراہی میں بھی وہاں موجود ہوں گے۔ جاتیو راکھی باہنی کو یونیورسٹی کے علاقے میں گشت کا حکم دیا گیا تھا۔ راکھی باہنی کے ڈائریکٹر بریگیڈیئر نور الزمان اور ڈپٹی ڈائریکٹر کرنل صبیح الدین کسی خارجی مشن پر ملک سے باہر ہوں گے۔ 15 اگست کو ہندوستان کا یومِ آزادی ہونے کی وجہ سے ہندوستانی حکومت بھی اپنی تقریبات اور جشن میں مصروف ہوگی۔ 14 اور 15 کی درمیانی رات 46 بریگیڈ ''رات کی تربیت'' کے حوالے سے بھی اپنی شناخت رکھتی تھی۔

12 اگست کے اجلاس میں بعض متعلقہ امور کے بارے میں اہم فیصلے کیے گئے جس میں یہ بھی شامل تھا کہ انقلاب کا آغاز 15 اگست 1975ء کی صبح صادق کے وقت کیا جائے گا۔ تیز رفتاری اور رازداری انقلاب کی کامیابی کے دو اہم عوامل تھے۔ معروضی صورتِ حال کے پیشِ نظر انقلاب صرف ڈھاکہ میں لایا جانا تھا۔ پہلے سے منتخب اہداف پر کم سے کم افراد کی مدد سے ایک برق رفتار کارروائی کا منصوبہ تیار کیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی دوسری چھاؤنیوں کی تمام یونٹوں کو پوری تیاری میں رکھا گیا تھا۔ ملک کے اندر کسی مخالفت کا سامنا کرنے یا سرحد پار سے کسی فوجی مداخلت کے خطرے سے نمٹنے کے لیے فوجی کونسل کی تمام برانچوں میں بلا تعطل مواصلات کا نظام قائم کر دیا گیا تھا۔ کارروائی کا آغاز اذان اور فجر کی نماز کے بعد کیا جانا تھا۔ اہداف میں

صدر، شیخ فضل الحق مونی، منصور علی، سید نذرالاسلام، قمر الزمان، شر نیابت، سید حسین، تاج الدین احمد، طفیل احمد اور عبدالرزاق شامل تھے۔ ان سب کو حفاظتی تحویل میں لے لیا جانا تھا۔ اس کے ساتھ ہی بنگلہ دیش ریڈیو، بنگلہ دیش ٹیلی ویژن، وائرلیس سینٹر، ٹی اینڈ ٹی، ایم پی ہوسٹل، ہوائی اڈے، ریلوے سٹیشن، جاتیو راکھی باہنی ہیڈ کوارٹرز اور جے آر بی کے بڑے کیمپ پر مکمل کنٹرول حاصل کرنا شامل تھا۔

160۔ 15 اگست 1975ء

اجلاس کے بعد گھڑیال کی ٹک ٹک شروع ہو چکی تھی۔ مرکزی قیادت حکومت کی ہر حرکت پر کڑی نگاہ رکھے ہوئے تھی اور مختلف چھاؤنیوں اور یونٹوں کے طوفانی دورے کرنے میں مصروف تھی۔ ہر کام منصوبے کے عین مطابق ہو رہا تھا۔ آخر کار مقررہ دن آ پہنچا۔ اللہ سبحانہٗ تعالیٰ کا نام لے کر گرمیوں کی صبح کے ابتدائی اوقات میں، جب شہر ابھی تک سویا پڑا تھا، کارروائی کا آغاز کر دیا گیا۔

بعض اہداف پر انقلابیوں کو مسلح مزاحمت کا سامنا ہوا، جو شدید مقابلوں پر منتج ہوئی۔ بدقسمتی سے شیخ مجیب الرحمٰن، شیخ فضل الحق مونی، شر نیابت اور ان کے خاندانوں کے کچھ افراد ان حملوں میں جاں بحق ہو گئے۔ 3 انقلابی بھی شہید ہوئے اور چند شدید زخمی ہوئے۔

منصوبے کے مطابق اکثر اہداف پر قابو پا لیا گیا اور تنصیبات پر کنٹرول حاصل کر لیا گیا۔ شیخ مجیب اور ان کی حکومت کو اقتدار سے اتارنے اور صدر کے طور پر کھنڈکر مشتاق احمد کے اقتدار پر قبضے کی خبر ریڈیو سے نشر کر دی گئی۔ قوم کے عظیم تر مفاد میں عارضی طور پر مارشل لاء نافذ کر دیا گیا۔ عوام کو انسانی جانوں کے تحفظ کے لیے امن و امان کے قیام میں مسلح افواج کے ساتھ تعاون کرنے کی اپیل کی گئی۔

اس دن پوری قوم نے بکسال کی حکومت کے خاتمے کی خبر کو خوش آمدید کہا اور خبر نشر ہوتے ہی انقلاب کے حق میں اپنی رائے اور خوشی کا اظہار کرنے کے لیے سڑکوں پر نکل آئے۔ ڈھاکہ کی سڑکیں عوام سے بھر گئیں اور لوگ انقلاب کے حق میں نعرے لگانے لگے۔ پورا ملک ظالمانہ آمریت کے پنجے سے رہائی پانے پر خوشی اور جذبات سے دیوانہ ہو رہا تھا۔ مسجدوں میں خصوصی دعائیہ اور میلاد کی مجالس کا انعقاد کیا گیا۔ ہر گلی محلے میں مٹھائیاں تقسیم کی جا رہی تھیں۔ ہر ایک کی زبان پر ایک یہی الفاظ تھے کہ ملک کو ظالم فرماں رواؤں کے ہاتھوں سے بچا لیا گیا ہے۔ سب جانتے تھے کہ لوگ اس حکومت سے بیزار ہو چکے ہیں، لیکن یہ بات کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ شیخ مجیب الرحمٰن اور عوامی بکسال والدی اس قدر غیر مقبول ہو چکے ہیں اور لوگوں کے دلوں میں ان کے لیے اتنی نفرت پائی جاتی ہے۔ یہ بات صرف کامیاب انقلاب کے بعد سامنے آئی۔ عوام نے ماضی میں بھی ہمیشہ درست فیصلے دیئے تھے اور تاریخ کے اس نازک موڑ پر انہوں نے ایک مرتبہ پھر انقلاب کی حمایت کرتے ہوئے اس کے حق میں فیصلہ دے کر یہ بات ثابت کر دی تھی۔

میں خود بھی عوامی ردِ عمل دیکھ کر بہت جذباتی ہو گیا تھا۔ میں نے اپنا سر جھکایا اور اپنے ہم وطنوں کی

حب الوطنی کو سیلوٹ پیش کیا۔ میں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا انتہائی شکرگزار ہوا کہ اس نے مجھے اپنے ملک اور اپنے عوام کی کچھ خدمت کرنے کے قابل بنایا۔ ہم نے تمام خطرات جو مول لیے تھے اور محنت کی تھی، اس کا صلہ مل گیا تھا۔ لوگوں کی جو نیک خواہشات اور دعائیں ہم نے حاصل کی تھیں وہ ایک بہترین صلہ تھا۔ اپنے ہم وطنوں پر میرے اعتماد میں زیادہ مضبوطی آ گئی اور میں اس بات کا قائل ہو گیا کہ دنیا کی کوئی طاقت کبھی بھی بنگلہ دیش کے دس کروڑ عوام کو دبا نہیں سکتی۔ جرأت مند عوام ہر سازش کو ناکام بنا دیں گے اور یقیناً ایک دن اپنے ملک کو اقوامِ عالم میں عزت و وقار کے ساتھ جائز مقام دلانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ خوشی کی اس لہر میں ہندروسی اثر رسوخ دم توڑ گیا۔ عوام دشمن غدار دُم دبا کر بلوں میں جا گھسے تا کہ اپنے آپ کو عوامی غیظ وغضب سے بچا سکیں۔ لیکن انہیں ان کی پناہ گاہوں میں بھی نہ چھوڑا گیا۔

لوگ اپنے طور پر مجرموں کو تلاش کر رہے تھے اور مقامی حکام کے حوالے کر رہے تھے۔ ان بدمعاشوں کا عوام کی تیز نگاہوں سے بچ نکلنا مشکل ہو چکا تھا، اس لیے بہت سے لوگ جو فرار ہو گئے تھے، انہوں نے خود ہی اپنے آپ کو حوالے کرنا شروع کر دیا۔ مسٹر طفیل احمد اور مسٹر عبدالرزاق کا شمار بھی انہی میں تھا۔ مسٹر قادر صدیقی نے بھی صدر کو اپنی حوالگی پیش کرنے پر رضامندی کا ٹیلی گرام بھیجا تھا۔ اسے کوئی جواب نہ دیا گیا۔ پھر وہ بھاگ کر ہندوستان چلا گیا اور سرحد پار سے ملنے والی مدد کے سہارے ملک دشمن سرگرمیوں کا آغاز کر دیا۔ اس نے سرحدوں پر کچھ ناکام مسلح حملے کیے اور ان حملوں کو پسپا کرتے ہوئے بنگلہ دیش کے ایک افسر اور چار سپاہیوں نے اپنی جان کے نذرانے پیش بھی کیے۔ میجر جنرل ضیاالرحمٰن کی حکومت نے اس کی غیر موجودگی میں اس پر غداری کا مقدمہ چلایا۔ اس کا جرم ثابت ہو گیا اور اسے 12 سال کی قید بامشقت کی سزا سنائی گئی۔ وہ کئی سال تک ہندوستان میں جلاوطنی کی زندگی بسر کرتا رہا اور بڑی دیر بعد بنگلہ دیش واپس آیا۔

161۔ دوبارہ 15 اگست کی جانب

آیئے ایک مرتبہ پھر 15 اگست کی جانب واپس چلتے ہیں۔ آپریشن جلد ہی مکمل ہو گیا تھا۔ بکسال حکومت کے خاتمے اور شیخ مجیب الرحمٰن کی موت کی خبر پہلے ہی ریڈیو پر نشر ہو چکی تھی۔ میں اس دن ریڈیو بنگلہ دیش میں کسی اہم کام میں مصروف تھا۔ اچانک میجر شہریار اندر آیا اور اس نے اطلاع دی کہ ٹی ایس سی کی جانب سے راکھی باہنی کی ایک جیپ اور تین ٹرک آ رہے ہیں ہم نے خیال کیا کہ وہ پٹرولنگ یونٹ کا حصہ ہوں گے اور یونیورسٹی کے علاقے میں اپنی ڈیوٹی انجام دے رہے ہوں گے۔ لیکن اگر انہوں نے شیخ مجیب کی موت اور حکومت کے گرائے جانے کی خبر سن لی ہو گی تو ان کا ردِعمل خطرناک بھی ہو سکتا ہے۔ اس صورت میں جھڑپ ناگزیر تھی۔ تاہم اگر انہوں نے خبر نہیں سنی تو ہمیں صورتِ حال کی وضاحت کرتے ہوئے انہیں بے اثر کرنا تھا۔ میں نے تمام امکانات کے بارے میں تھوڑی دیر کے لیے سوچا اور پھر میجر شہریار سے کہا، ''میں ان کا رویہ اور ردِعمل دیکھنے کے لیے ان کے پاس جا رہا ہوں۔ اگر میں ان پر قابو پانے میں ناکام رہوں پھر تمہیں ضروری

اقدامات کے لیے تیار رہنا چاہیے۔''

میں اکیلا خود جیپ چلاتا ہوا ان کا سامنا کرنے کے لیے چل پڑا۔ جیسے ہی میں پی جی ہسپتال کے سامنے پہنچا تو میں نے ان کے دستے کو پبلک لائبریری کے سامنے کھڑے ہوئے دیکھا۔ میں جیپ میں باہر نکل آیا اور چل کر ان کے پاس گیا۔ ان کا لیڈر (جے آر بی کا آفیسر) جیپ میں بیٹھا ہوا تھا۔ جیسے ہی اس نے مجھے وردی میں دیکھا وہ جیپ سے نیچے اترا اور مجھے سیلیوٹ کیا۔

''تم یہاں کیا کر رہے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''ہم گشت پر ہیں سر۔ ہم نے ابھی ابھی اس طرف فائرنگ کی آواز سنی ہے اور اس طرف آ گئے ہیں۔ کیا معاملہ ہے سر۔'' لیڈر نے مجھ سے پوچھا۔ میں سمجھ گیا کہ ان کو ابھی تک اصل واقعہ کا علم نہیں ہے۔ میں نے جواب دیا، ''بنگلہ دیش کی مسلح افواج نے شیخ مجیب الرحمٰن کی حکومت الٹ دی ہے اور وہ مر چکے ہیں۔ اس صورتِ حال میں تمہیں فیصلہ کرنا ہو گا کہ تم انقلاب کی حمایت کرتے ہو یا نہیں۔''

لیڈر نے کچھ دیر کے لیے سوچا اور پھر کہا، ''ہم انقلاب کے حق میں ہیں۔''

میں نے سپاہیوں کو بھی باہر نکلنے کو کہا اور ساری بات کی وضاحت کرتے ہوئے ان کے نظریات کے بارے میں پوچھا۔ ہر ایک نے حمایت میں آواز اٹھائی۔ پھر میں نے انہیں اپنے پیچھے آنے کو کہا۔ انہوں نے نعرہ تکبیر اللہ اکبر، بنگلہ دیش زندہ باد، شیخ مجیب مردہ باد، سینا بھاہنی (مسلح افواج) زندہ باد کے نعروں کے ساتھ میرے حکم کی تعمیل کی۔ ان کے اس ردِعمل سے میں قائل ہو گیا کہ جے آر بی کے نچلے طبقے کے بارے میں ہمارا تجزیہ بالکل درست تھا۔ تھوڑے ہی وقت میں وہاں کرنل (ریٹائرڈ) ابوطاہر، کرنل (ریٹائرڈ) اکبر حسین، میجر (ریٹائرڈ) شاہ جہان عمر، میجر (ریٹائرڈ) ضیا الدین، میجر (ریٹائرڈ) رحمت اللہ، کیپٹن (ریٹائرڈ) ماجد اور پاکستان ملٹری اکیڈمی کے سابقہ کیڈٹ مشتاق احمد، شرافت اور دیگر بہت سے لوگ جمع ہو گئے۔ ریڈیو پر اعلان سننے کے بعد وہ سب لوگ کامیاب انقلاب پر مبارک باد دینے، اپنی حمایت کے اظہار اور ضرورت کے مطابق خدمات انجام دینے کے لیے بھاگتے ہوئے آئے تھے۔ لیفٹیننٹ کرنل امین چوہدری نے ساور پر جے آر بی کے مرکزی کیمپ کو پہلے ہی بے اثر کر دیا تھا۔ لیفٹیننٹ کرنل رشید کھنڈکر مشتاق احمد کو ریڈیو سٹیشن لانے کے لیے روانہ ہو چکے تھے۔

میں میجر جنرل ضیاالرحمٰن اور فوج، بحریہ اور ایئر فورس کے تینوں چیفس آف سٹاف کو لانے کے لیے چھاؤنی کی جانب چلا گیا۔

ڈھاکہ چھاؤنی اس وقت مکمل طور پر انقلاب کی حامی تھی۔ اس وقت وہاں کا سارا ماحول بہت زیادہ شادمان تھا اور ہر کوئی کامیابی پر خوشیاں منا رہا تھا۔ جب میں چھاؤنی سے گزر رہا تھا تو لوگ مجھے دیکھ کر فتح کے نشان بنا رہے تھے اور نعروں کے ساتھ میرا استقبال کر رہے تھے۔ صبح سویرے جب میجر جنرل شفیع اللہ، آرمی چیف آف سٹاف کو انقلاب کا علم ہوا تو انہوں نے ڈھاکہ کے 46 بریگیڈ کمانڈر شفاعت جمیل کو انقلاب کو

روکنے کے لیے کارروائی کا حکم دیا لیکن بریگیڈ کمانڈر کو معطل کر دیا گیا تھا کیوں کہ ان کے بریگیڈ کی وفاداریاں فوجی کونسل کے ساتھ تھیں اور وہ عوامی انقلاب کے حق میں تھا۔ پھر میجر جنرل شفیع اللہ نے چیف آف جنرل سٹاف بریگیڈیئر خالد مشرف سے رابطہ کیا، جنہوں نے جواب دیا،''بنگو بندھو مر چکے ہیں۔ فوجیوں نے بغاوت کر دی ہے اور پوری فوج خوشیاں منا رہی ہے۔''

انہوں نے عوامی انقلاب کے بارے میں اپنی رائے دیتے ہوئے کہا،''اب اس عمل کو واپس لانے کے لیے کچھ بھی نہیں کیا جا سکتا۔''

ایک گھنٹے کے بعد میں میجر جنرل ضیا الرحمٰن، میجر جنرل شفیع اللہ، آرمی چیف آف سٹاف، ایئر وائس مارشل اے کے کھنڈکر اور نیول چیف آف سٹاف وائس ایڈمرل ایم ایچ خان کے ساتھ بنگلہ دیش ریڈیو واپس پہنچ گیا۔

ڈائریکٹر جنرل بی ڈی آر میجر جنرل خلیل الرحمٰن اور آئی جی پی مسٹر نور الاسلام کو بھی ریڈیو سٹیشن پہنچنے کے لیے کہا گیا۔

لیفٹیننٹ کرنل امین احمد چوہدری ڈائریکٹر جے آر بی کرنل حسین کے ساتھ تشریف لائے۔

لیفٹیننٹ کرنل رشید جمہوریہ کے نئے صدر اور انقلاب کے تسلیم شدہ رہنما مشتاق احمد کھنڈکر کے ساتھ پہنچ گئے۔ جیسے ہی وہ اندر آئے، انہیں گارڈ آف آنر پیش کیا گیا۔

162۔ کھنڈکر مشتاق احمد کا نئے صدر کے طور پر حلف اور نئی کابینہ کی تشکیل

کھنڈکر مشتاق احمد نے عوامی جمہوریہ بنگلہ دیش کے نئے صدر کے طور پر ریڈیو سے اپنی تاریخی تقریر نشر کی۔ افواج کے تینوں سربراہان نے اپنی تقریروں میں صدر کھنڈکر مشتاق احمد کی حکومت کے ساتھ وفاداری کا اعلان کیا اور عوامی انقلاب کی بھرپور تائید کی۔ چند گھنٹوں کے اندر اندر قانون نافذ کرنے والی ایجنسیوں نے عوامی بکسال کے بہت سے رہنماؤں کو گرفتار کر لیا۔ اسی دن کھنڈکر مشتاق احمد نے بنگا بھون میں ایک سادہ سی تقریب میں نئے صدر کی حیثیت سے باقاعدہ رسمی طور پر حلف اٹھا لیا۔ عبوری چیف جسٹس اے بی محمود حسین نے حلف لیا، محمود اللہ نے نائب صدر کے طور پر حلف اٹھایا۔

کابینہ کے نئے وزرا نے بھی اُسی دن حلف اٹھایا۔ فی الواقع ان تمام کا تعلق عوامی لیگ اور بکسال سے تھا اور پارلیمنٹ کے منتخب ارکان تھے۔

کابینہ کے وزرا:

1۔ جسٹس ابو سعید چوہدری

2۔ پروفیسر یوسف علی

3۔ پھنی بھوشن موجمدار

4۔ سہراب حسین

5۔ عبدالمنان

6۔ اسدالزمان خان

7۔ ڈاکٹر اے آر ملک

8۔ ڈاکٹر مظفر احمد چوہدری

وزرائے مملکت:

1۔ شاہ معظم حسین

2۔ دیوان فرید غازی

3۔ طاہرالدین ٹھاکر

4۔ پروفیسر نورالاسلام

5۔ نورالاسلام منجو

6۔ کے ایم عبیدالرحمٰن

7۔ مسلم الدین خان

8۔ کھتیش چندرا منڈل

9۔ ریاض الدین احمد

10۔ سیدالطاف حسین

11۔ معین الدین احمد

163۔صدر مشتاق کی حکومت کے اقدامات

انقلاب کے وقت بکسال کے ایک سرکردہ رہنما لندن کے دورے پر تھے۔ جب صحافیوں نے شیخ مجیب الرحمٰن کی ہلاکت کے بارے میں ان کا ردِعمل جاننا چاہا تو انہوں نے کہا، ''بنگلہ دیش میں فرعون اپنے انجام کو پہنچ گیا ہے۔''

عوامی بکسال کے ایک اور اہم عہدے دار مسٹر محی الدین احمد کو روس کی قیادت کو انقلاب کی وجوہات کی تفاصیل بتانے کے لیے صدر مشتاق احمد کے نمائندے کے طور پر سوویت یونین بھیجا گیا۔

سابق صدر مسٹر جسٹس ابوسعید چوہدری اپنی مرضی سے کھنڈکر مشتاق کے خصوصی نمائندہ بن گئے اور بعد میں وزیرخارجہ بنادیئے گئے۔ انہیں یو این اور دوسرے یورپی ممالک میں بھیجا گیا تاکہ وہ 15 اگست کے انقلاب اور سیاسی تبدیلی کی وجوہات اور جواز پیش کرسکیں۔

بدنامِ زمانہ غازی غلام مصطفےٰ کو ان کے عہدے سے ہٹا دیا گیا اور ایک اچھی شہرت رکھنے والے

جج جسٹس بی اے صدیقی کو ریڈ کراس کا چیر مین مقرر کیا گیا۔ صدارتی فرمان نمبر 9 ختم کر دیا گیا۔ کھنڈ کر مشتاق احمد نے ایک صدارتی فرمان کے ذریعے بکسال کو ختم کر دیا اور ملک میں کثیر الجماعتی سیاست کی بحالی کے اپنے وعدے کو دہرایا۔ شیخ مجیب کے ملک کو 61 اضلاع میں تقسیم کرنے اور گورنروں کی تقرری کے منصوبے کو کالعدم قرار دے دیا گیا۔ انیس اضلاع، جو پہلے سے موجود تھے، ان کی اصلاح کی گئی اور ان کی نگرانی کے لیے تجربہ کار ڈسٹرکٹ کمشنر مقرر کیے گئے۔ رشوت ستانی اور اختیارات کے غلط استعمال کے الزامات کے تحت جمہوریہ کے سابق نائب صدر، شیخ مجیب کابینہ کے چھ وزرا، پارلیمنٹ کے دس ممبران، چار بیوروکریٹس اور بارہ کاروباری اشخاص کو گرفتار کر لیا گیا۔ ان پر مقدمات چلانے کے لیے دو خصوصی عدالتیں قائم کی گئیں۔ مسلح افواج کے 36 اعلیٰ آفیسرز کے خلاف کارروائی کے لیے غور کیا گیا۔

حکومت نے متعلقہ حکام کو سیاسی قیدیوں کی فہرست تیار کرنے کا حکم دیا۔ سیاسی جماعتوں کو قیدیوں کی اپنی فہرستیں بھیجنے کو کہا گیا۔ 25 اگست کو ممتاز سیاسی رہنما مسیح الرحمٰن اور مسٹر اولی احد کو غیر مشروط طور پر رہا کر دیا گیا۔ اُسی دن جنرل عثمانی کو صدر کا دفاعی مشیر مقرر کیا گیا۔ میجر جنرل خلیل الرحمٰن کو چیف آف ڈیفنس سٹاف مقرر کیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی میجر جنرل شفیع اللہ اور ایئر وائس مارشل اے کے کھنڈ کر کو ان کے عہدوں سے سبکدوش کر دیا گیا اور میجر جنرل ضیا الرحمٰن اور ایئر وائس مارشل ایم جی تواب کو بالترتیب چیف آف آرمی سٹاف اور چیف آف ایئر سٹاف مقرر کیا گیا۔ روزنامہ اتفاق اور روزنامہ سنگباد دو بڑے اخبار ان کے مالکوں کو واپس کر دیئے گئے۔ 16 اگست کو مولانا عبدالحمید خان بھاشانی نے کھنڈ کر مشتاق احمد کی نئی حکومت کی حمایت میں مبارک باد کا پیغام بھیجا۔ نئی حکومت کو قوم پرست اور جمہوری سیاسی جماعتوں، عوامی تنظیموں، رہنماؤں اور گروپس کی حمایت بھی حاصل ہوگئی تھی۔ ان سب نے مسلح افواج کو ان کے جرأت مندانہ کارنامے پر مبارک باد کے پیغام بھیجے۔ 3 اکتوبر کو صدر مشتاق نے اعلان کیا کہ 15 اگست 1976ء سے ملک میں کھلی کثیر الجماعتی سیاست کی اجازت دے دی جائے گی اور عام انتخابات 28 فروری 1977ء کو منعقد ہوں گے۔

مندرجہ بالا اقدامات اٹھانے سے نہ صرف ملک کی مجموعی صورتِ حال میں بہت زیادہ بہتری آئی بلکہ ملک میں امن و امان کی صورتِ حال، انتظامی امور اور ملوں اور فیکٹریوں میں پیداوار میں بھی قابل قدر بہتری پیدا ہوگئی۔ روز مرہ کی اشیائے ضرورت اور کھانے پینے کی اشیاء کی قیمتوں میں کمی آنی شروع ہوگئی۔ ڈاکوؤں، چوروں، ذخیرہ اندوزوں اور سمگلنگ میں خاطر خواہ کمی واقع ہوئی۔ لوگوں میں تحفظ کا احساس پیدا ہوا۔ عبوری حکومت کے تمام اقدامات کی ملک کے اندر اور ملک سے باہر بہت زیادہ تعریف کی گئی۔

164۔ اگست کے انقلاب نے اپنا اخلاقی جواز ثابت کر دیا

عوامی بکسال کی حکومت کا دَور وحشیانہ ظلم و ستم سے بھرا ہوا تھا۔ یہ وہ دَور تھا جب جمہوریت کا گلا گھونٹ دیا گیا تھا اور یک حزبی آمریت متعارف کروا دی گئی تھی۔ بنیادی اور انسانی حقوق، پریس کی

آزادی اور دوسرے تمام شہری حقوق عوام سے چھین لیے گئے تھے جوان خوف ناک یادوں کو اپنے ذہنوں سے کبھی بھی نکال نہ پائیں گے۔ عوامی بکسال وادیوں کے اقتدار کی تاریخ بنیادی طور پر قتل و غارت، استبداد، غارت گری، قحط، بیرونی استحصال کنندگان کی غلامی، کھلم کھلا دہشت گردی اور سب سے بڑھ کر جنگ آزادی کی روح سے غداری کی تاریخ تھی۔ سوشلزم کے نام پر انہوں نے قومی دولت کو لوٹا، سرحدوں کو بلا روک ٹوک سمگلنگ کے لیے کھلا رکھا، معیشت میں بدانتظامی کا مظاہرہ کیا اور ملک کو بین الاقوامی طور پر بغیر پیندے کی ٹوکری کا خطاب دلوایا۔ جنگ کے دوران ملک میں کوئی قحط نہ تھا۔ لیکن عوامی بکسال وادیوں کے دورِ حکومت میں لوگ بھوک سے مرتے رہے تھے۔

شیخ مجیب الرحمٰن نے جمہوریت کے نام پر لوگوں کو فاشزم، سوشلزم کے نام پر سماجی ناانصافی، بنگالی قومیت کے نام پر قومی انتشار اور سیکولرازم کے نام پر فرقہ وارانہ مخاصمت کا تحفہ دیا۔ اگر 15 اگست کا کایا کلپ انقلاب برپا نہ ہوا ہوتا تو اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے جمہوریت کے اس قبرستان میں 70 سے زائد سیاسی جماعتوں کو صرف بکسال کا ایک پرچم لہرانے پر مجبور کیا جانا تھا۔ یوں لوگوں کو ایک غیر معینہ مدت تک ملکی بدنظمی کے اس بوجھ کو سہارنا پڑنا تھا۔ کوئی بھی قدم، جو عوام کی مرضی اور خواہشات کے خلاف اپنے اقتدار کو دوام بخشنے کے لیے اٹھایا جائے، دیرپا نہیں ہوسکتا۔ کوئی بھی نظام عوامی تائید اور تعاون کے بغیر پروان نہیں چڑھ سکتا۔ جب قومی غدار عوام پر آمریت یا فاشزم ٹھونس دیتے ہیں تو محبِ وطن افراد عوام کو ان سے آزاد کرانے کے لیے انقلاب منظم کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے 15 اگست 1975ء کو بنگلہ دیش میں یہ تاریخ ایک مرتبہ پھر دہرائی گئی اور عوامی انقلاب کے ذریعے ایک اور آمر شیخ، مجیب الرحمٰن اور اس کی فاشسٹ حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا۔ اس انقلاب میں عوام کی خود بخود شمولیت اور صدق دل سے صدر کھنڈکر مشتاق احمد کی حکومت کی حمایت نے عوامی انقلاب کو قومی انقلاب میں تبدیل کر دیا۔ اس سے یہ بات واضح ہوگئی تھی کہ بکسال کا عوامی خواہشات سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ نہ صرف عوام بلکہ خود عوامی لیگ کے ایک بڑے حلقے نے شیخ مجیب الرحمٰن کے یک حزبی آمرانہ اقتدار کو قبول نہیں کیا تھا۔ ان حالات کی روشنی میں 15 اگست کے اس کامیاب انقلاب کو خود بخود اخلاقی جواز حاصل ہوگیا تھا۔

165۔ منتخب پارلیمنٹ نے اگست کے انقلاب کو آئینی جواز مہیا کر دیا

4 اپریل 1979ء کو پارلیمنٹ میں مرحوم شیخ مجیب الرحمٰن کے لیے ایک تعزیتی تحریک پیش کی گئی۔ اس وقت جنرل ضیا الرحمٰن ملک کے صدر تھے اور پارلیمنٹ کے سپیکر مرزا غلام حفیظ تھے۔ عام طور پر جب کوئی ایسی تحریک پیش کی جاتی ہے تو مرحوم کی سوانح عمری کا ایک خاکہ بھی پیش کیا جاتا ہے اور اسے کارروائی میں شامل کیا جاتا ہے۔ مرزا غلام حفیظ نے خود تعزیتی تحریک پیش کی تھی۔ شیخ مجیب کے سوانحی خاکے کے آخری

فقرے میں کہا گیا، ''15 اگست 1975ء کو شیخ مجیب الرحمٰن ایک سیاسی تبدیلی کے نتیجے میں مارے گئے''، یہ حقیقت تھی۔ شیخ مجیب اور چند دوسرے افراد کی عام اموات نہیں تھیں۔ ان کی زندگیاں عوامی انقلاب کے دوران ضائع ہوگئی تھیں جو ملک میں سیاسی تبدیلی لانے کے لیے منظم کیا گیا تھا۔

اسی روز اس وقت کے وزیر اعظم مسٹر شاہ عزیز الرحمٰن نے اپنی تقریر میں بڑے واضح الفاظ میں شیخ مجیب الرحمٰن کے زوال کے سیاسی پہلوؤں پر روشنی ڈالی جس کی تصدیق صدر ضیاالرحمٰن نے کی تھی۔ انہوں نے کہا، ''25 جنوری 1975ء کو جس طریقے سے پارلیمنٹ میں 15 منٹ کے اندر اندر کالا قانون پاس کیا گیا اور بکسال کے یک حزبی آمرانہ اقتدار کا جوا آٹھ کروڑ عوام کی گردنوں پر رکھ دیا گیا تھا، ایک آئینی بغاوت کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ 15 اگست 1975ء کا فوجی انقلاب اسی یک حزبی فاشسٹ حکومت کے خلاف تھا۔ پارلیمنٹ کی اسی نشست میں برأت کا ایک بل بھی پیش کیا گیا جسے 300 ممبران میں سے 241 نے دو تہائی سے زیادہ اکثریت کے ساتھ پاس کر دیا اور یہ پانچویں ترمیم کے طور پر آئین کا حصہ بن گیا۔ اس طرح براہِ راست منتخب صدر ضیاالرحمٰن اور منتخب پارلیمنٹ نے 15 اگست کے عوامی انقلاب کے حق میں فیصلہ دے کر انقلاب کو نا قابلِ مواخذہ قرار دیتے ہوئے اسے آئینی جواز مہیا کر دیا۔

166۔ 15 اگست ''قومی نجات'' کے دن کے طور پر منایا گیا

15 اگست دراصل ایک قومی نجات کا دن تھا۔ قومی اور بین الاقوامی میڈیا اور اخبارات اس حقیقت کی گواہی دیتے ہیں۔ تاریخ بھی یہی ثابت کرے گی۔

یہ بات صاف ظاہر ہے کہ عشروں پہلے بنگلہ دیش کے قیام سے ہی اگر ملک میں قانون کی حکمرانی، بنیادی اور انسانی حقوق کی پاسداری اور آزادیٔ تحریر و تقریر موجود ہوتی اور اگر حکومت کو تبدیل کرنے کے لیے جمہوری اور آئینی طریقے اور ذرائع میسر ہوتے تو عوام کو شیخ مجیب الرحمٰن کی فاشسٹ بکسال حکومت کے ظلم و ستم سے نجات دلانے کے لیے 15 اگست 1975ء کے انقلاب کی ضرورت نہ پڑتی۔

167۔ 15 اگست 1975ء کے انقلاب پر روزنامہ اتفاق کا اداریہ

میں یہاں ایک ممتاز اخبار روزنامہ اتفاق میں 15 اگست 1975ء کے انقلاب پر شائع ہونے والا اداریہ پیش کرنا چاہوں گا۔

''بنگلہ دیش کی قوم اور مسلح افواج کے تاریخی مطالبات کو پورا کرنے کے لیے بزرگ سیاست دان اور عوام کے ہیرو کھنڈکر مشتاق احمد نے 15 اگست 1975ء کی صبح کو اقتدار پر قبضہ کر لیا تھا۔ پہلی حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا تھا اور پُروقار لیکن سادہ سی تقریب میں کھنڈکر مشتاق احمد نے بطور صدر حلف اٹھایا۔ بنگلہ دیش رائفلز اور پولیس جیسی قانون نافذ کرنے والی ملک کی تمام ایجنسیوں اور مسلح افواج کے سربراہان نے بھی نئی

حکومت اپنی پختہ حمایت اور اعتماد کا یقین دلایا۔ قومی زندگی میں اس سیاسی تبدیلی کا ایک افسوس ناک پس منظر ہے۔ جب ہم نے اپنے 30 لاکھ شہدا کی قربانیوں اور لاتعداد ماؤں اور بہنوں کی عصمت کی قیمت پر آزادی حاصل کی تو ہماری خواہشات اور توقعات بہت بلند تھیں۔ لیکن اس ساڑھے تین سال یا کچھ زائد عرصہ میں لوگوں کو محرومیوں کے سوا کچھ حاصل نہ ہو سکا۔ قوم کے عظیم تر مفاد میں اور بنگلہ دیش کے ساڑھے سات کروڑ عوام کی توقعات اور خوابوں کو حقیقت کا روپ دینے کے لیے کھنڈکر مشتاق احمد کی قیادت میں مسلح افواج کے آگے آنے اور اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے کی ٹھوس وجوہات موجود تھیں۔ ماضی کے حکمران حلقوں نے آئینی تبدیلی کے تمام راستے بند کر دیئے تھے، لہٰذا فوجی مداخلت ناگزیر ہو چکی تھی۔ اقتدار کی ہوس تاریخ کے دھاروں کا رخ نہیں پھیر سکتی۔ اس تاریخی موڑ پر ہماری ذمہ داریاں کئی گنا بڑھ گئی ہیں۔ مسلح افواج نے عوام کے ہیرو کھنڈکر مشتاق احمد کی قیادت میں جو تاریخی قدم اٹھایا ہے، اس کے فوائد کو مستحکم کرنے اور عوام کے ساتھ کیے گئے وعدوں کو پورا کرنے کے لیے ہم سب کو ایک وجود کے طور پر متحد ہو کر آگے بڑھنا ہوگا۔

15 اگست 1975ء کا کامیاب انقلاب جمہوریت کی بحالی اور اپنی نجات کے لیے لوگوں کی جدوجہد کی تاریخ میں ایک سنگ میل ثابت ہوگا۔ یہ ہمیشہ ہر قسم کی فاشسٹ آمریت کے خلاف لوگوں کو لڑنے اور جدوجہد پر اکسانے کے لیے ایک مینارۂ نور کی طرح روشن رہے گا۔

اگست انقلاب نے عوامی بکسال وادیوں کی حکومت کے سیاہ باب کا خاتمہ کر دیا ہے اور یہ بنگلہ دیش کی سیاسی تاریخ میں ایک نئی صبح کا نقیب ہے۔

15 اگست 1975ء کی تاریخی سیاسی تبدیلی کے ساتھ آنے والی قوم پرستی کی روح اور جمہوری سیاسی عمل کی نوید ہمہ وقت بڑھتی ہوئی توانائی اور قوت کے ساتھ قوم دشمن عناصر کی تمام سازشوں کو برباد کرتے ہوئے ہماری قومی زندگی کی ہر جہت میں جاری وساری ہے۔ مقبولِ عام اگست انقلاب یقیناً موجود اور آئندہ نسلوں کے لیے قومی آزادی، خودمختاری اور نئے میر جعفروں کی سرکوبی کی خاطر ابدلآباد تک ایک محافظ و مہمیز ہے۔

حصہ پنجم

3 نومبر کی انقلاب مخالف خفیہ بغاوت
اور
7 نومبر کا تاریخی ''سپاہی جنتا'' انقلاب

168۔ مشتاق حکومت اور فوجی کونسل

نئی حکومت کی تشکیل کے بعد سے فوجی کونسل انتہائی مشکل حالات میں اپنے پروگرام کو لاگو کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اگرچہ عوام نے ہر طرح سے اپنے طور پر خود بخود تبدیلی کی حمایت کی تھی، تاہم شکست خوردہ اور قوم دشمن قوتیں اتنی آسانی سے اپنی شکست تسلیم نہیں کر رہی تھیں۔ تاہم قومی انقلاب کے حق میں عوامی جذبات کے پیش نظر ان عناصر میں اس تبدیلی کی کھلم کھلا مخالفت کرنے کی جرأت نہیں تھی۔ اس لیے انہوں نے اپنے بیرونی آقاؤں کی مدد سے اس سارے عمل کو پلٹانے اور ملک کو ایک مرتبہ پھر 75ء سے پہلے کے دَور میں لے جانے کے لیے خفیہ سازشوں کا آغاز کر دیا تھا۔ اس قسم کی سرگرمیاں دراصل 15 اگست ہی سے شروع ہو چکی تھیں جن کے خلاف ہمیشہ چوکنا رہنے کی ضرورت تھی۔

نمائندہ حکومت تشکیل دینے اور قومی انتخابات کم سے کم ممکنہ مدت میں کروانے کے لیے تمام تر کوششیں کی جا رہی تھیں تاکہ بنگلہ دیش کے سیاسی ماحول میں حب الوطنی، اتحاد اور باہمی اتفاق کی فضا جڑیں پکڑ سکے۔ اس کے ساتھ ساتھ راکھی باہنی کو فوج میں مدغم کرنے اور خود فوج کی تنظیم نو کے لیے اقدامات اٹھائے جا رہے تھے تاکہ 1975ء کے بعد کے عمل کو مضبوط بنیادوں پر استوار کرنے کے لیے قوم پرست قوتوں کو مستحکم کیا جا سکے۔ یہ ذمہ داری نئے مقرر کردہ چیف آف آرمی سٹاف میجر جنرل ضیاالرحمٰن کو سونپی گئی جو فوجی کونسل کے سب سے طاقت وَر نمائندے تھے۔ جنرل عثمانی کو بھی کھنڈکر مشتاق احمد کی حکومت کا دفاعی مشیر مقرر کیا گیا تھا۔ ان کی اہم ترین ذمہ داری قومی دفاعی ضروریات کے مطابق حاصل شدہ وسائل کے اندر رہتے ہوئے نظر انداز کی گئی مسلح افواج کی تعمیر نو تھی۔ اس وقت مسلح افواج خاص طور پر بری فوج کی تنظیم نو ایک بہت پیچیدہ اور مشکل کام تھا۔ راکھی باہنی کے ارکان کو محتاط چھان پھٹک کے بعد فوج میں شامل کیا جانا تھا۔

مسلح افواج میں موجود بکسال کے حامی اور طالع آزما عناصر کو بھی باہر نکالنا تھا۔ کچھ یونٹوں کی

تنظیم نو اور کمانڈ کے ڈھانچے کو تبدیل کرنے کی ضرورت تھی۔ عام فوجیوں اور افسروں کو انقلاب اور اس کے مقاصد سے روشناس کرانا انتہائی ضروری تھا۔ ان کے ضمیر کو مطمئن کرنے کی ضرورت تھی۔ میجر جنرل ضیا الرحمٰن کو مختلف چھاؤنیوں میں موجود تمام یونٹوں کی مکمل حمایت اور تعاون حاصل تھا۔ انہیں اُن آفیسرز کو بحال کرنے کی ذمہ داری بھی سونپی گئی جن کو عوامی بکسال کے سابقہ دور حکومت میں ناجائز طور پر فوج سے نکال دیا گیا تھا۔

169۔ فوجی کونسل کے قوم پرست اور ترقی پسند سیاسی جماعتوں سے مذاکرات

اس کے ساتھ ہی ہم نے مختلف محبِّ وطن اور قوم پرست سیاسی جماعتوں کے گروپس اور افراد کے ساتھ قومی حکومت کی تشکیل، جمہوری سیاسی عمل کے مستقبل، انتخابات اور قومی سیاست کے ڈھانچے پر گفتگو کا آغاز کیا۔ اکثر سیاسی جماعتیں اپنے مفادات کو سامنے رکھے ہوئے تھیں، جماعتی مفادات کو قومی مفادات ترجیح دیتی تھیں۔ حتیٰ کہ کھنڈ کر مشتاق احمد نے بھی ابتدائی طور پر قومی حکومت کی تشکیل کی مخالفت کی۔ وہ انتخابات کے انعقاد تک اپنی عبوری حکومت کو جاری رکھنا چاہتے تھے لیکن ہمارے اصرار پر وہ آخرکار قومی حکومت تشکیل دینے پر راضی ہوئے۔ سب سے پہلے بکسال کے ارکان کے ساتھ جمہوری عمل شروع کرنے کا فیصلہ کیا گیا، جنہوں نے جمہوریت کا گلا گھونٹا تھا۔ اس کا مقصد ثابت کرنا تھا کہ عوامی لیگ کی اکثریت بکسال مخالف تھی اور بعد میں عبوری حکومت کو قومی حکومت کے حق میں تحلیل کیا جانا تھا۔

جے ایس ڈی اور چند دوسری سیاسی جماعتیں چاہتی تھیں کہ ہم اقتدار میں انہیں شریک کر کے ان کے جماعتی پروگرام کا نفاذ کریں۔ لیکن ہمارا جواب واضح تھا۔ ہم نے مسلح افواج کی قومی سیاست میں براہِ راست شمولیت کو سختی سے مسترد کر دیا تھا۔ ہماری ترجیح ایک قومی حکومت یا پھر غیر جماعتی حکومت تھی جو کسی سیاسی جماعت کے پروگرام کو نہیں بلکہ فوجی کونسل کے پروگرام کا نفاذ کرے۔ ضروری تھا کہ حکومت ایک غیر جانب دار حکومت ہو جو جلد از جلد آزادانہ منصفانہ انتخابات کا انتظام کرے۔ کسی مخصوص سیاسی جماعت کے پروگرام کا نفاذ اُس جماعت کی ذمہ داری ہو گی جو انتخابات کے ذریعے اقتدار میں آئے۔

170۔ بریگیڈیئر خالد اور کرنل شفاعت کسی بڑے سازشی منصوبے کے مہرے

ہمیں میجر جنرل ضیا الرحمٰن نے بتایا کہ میجر خالد مشرف اور کرنل شفاعت جمیل ان کے کام میں رکاوٹیں ڈال رہے ہیں جب کہ بکسال کے کچھ حامی آفیسرز نے بھی ان کے ساتھ گٹھ جوڑ کر لیا۔ بریگیڈیئر خالد مشرف ایک بہادر مجاہد آزادی تھے، تاہم وہ بہت زیادہ جاہ طلب بھی تھے۔ جنگ آزادی کے دنوں سے ہی وہ بڑی ہوشیاری کے ساتھ اپنے اثر ورسوخ اور طاقت کے دائرے کو وسیع کر رہے تھے۔ حکومت اور عوامی بکسال وادی بھی ان کی سرپرستی کر رہے تھے۔ لیکن بکسال حکومت کے فوری خاتمے نے ان کے تمام منصوبے کو خراب کر

دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اب اپنی جاہ طلبی کی خواہشات کی تکمیل کے لیے زیادہ بے تاب ہو رہے تھے۔ میجر جنرل ضیاالرحمٰن اپنی پوری کوششوں کے باوجود انہیں روک نہیں سکے تھے۔ بریگیڈیئر خالد کی اقتدار کی ہوس کو عوامی بکسال وادی اور ہندروسی اتحاد پوری طرح استعمال کر رہے تھے۔ وہ قوم دشمن حلقوں اور غیر ملکی قوتوں کی ان سازشوں میں ایک مہرہ بن چکے تھے اور گھڑی کو الٹ سمت میں گھمانے کے لیے تیار کر رہے تھے۔

ہمیں اس سازش کی اطلاعات انٹیلی جینس ایجنسیوں اور دوسرے مختلف ذرائع سے موصول ہو رہی تھیں۔ کرنل شفاعت جمیل جو شیخ مجیب الرحمٰن کے اندھے مقلد اور حامی تھے، اس تبدیلی کو قبول نہ کر سکے تھے اور بریگیڈیئر خالد کو اکسا رہے تھے۔ کرنل شفاعت جمیل اس حقیقت کو تسلیم نہیں کر پا رہے تھے کہ مجیب کی حکومت کو خود ان کے بریگیڈ نے الٹ دیا تھا اور بریگیڈ کمانڈر کے طور پر وہ کچھ بھی نہیں کر سکے تھے۔ یہ ناکامی انہیں ہر وقت کچوکے لگاتی رہتی تھی۔ اسی لیے انہوں نے اپنی ذاتی ناکامی کا انتقام لینے کے لیے بریگیڈیئر خالد اور دوسری قوم دشمن قوتوں کے ساتھ سازباز کر رکھی تھی۔ راکھی باہنی کے چند اعلیٰ عہدے دار جو اگرتلہ سازش کیس میں ملوث تھے اور شیخ مجیب پر اندھا اعتماد رکھتے تھے ان کے ساتھ شامل ہو چکے تھے۔

شروع میں ہمیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ بریگیڈیئر خالد ایک مجاہد آزادی ہوتے ہوئے محض اپنی ذاتی جاہ طلبی کی خاطر اس قسم کی عوام دشمن سرگرمیوں میں ملوث ہو سکتے ہیں۔ تاہم بتدریج ہمیں بھی مختلف چھاؤنیوں اور فوجی کونسل کی شاخوں سے اسی قسم کی اطلاعات ملنے لگی تھیں۔ اس قسم کی اطلاعات نے ہمیں پریشان کر دیا تھا۔ یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ کوئی بدشگونی سر اٹھا رہی ہے۔

میں بریگیڈیئر خالد کو خود ملنے کے لیے گیا تا کہ انہیں اس قسم کی عوام دشمن سرگرمیوں سے علیحدہ کیا جا سکے۔ ذاتی طور پر ہمارے بڑے قریبی تعلقات تھے اس لیے میرا خیال تھا مجھے یہ کوشش کر کے دیکھ لینا چاہیے۔ انہوں نے میرے سامنے اس الزام کو مکمل طور پر مسترد کر دیا کہ وہ کسی ایسی سرگرمی میں مصروف ہیں۔ انہوں نے اس بات سے بھی انکار کر دیا کہ وہ میجر جنرل ضیاالرحمٰن کے ساتھ تعاون نہیں کر رہے تھے۔ یہ بہت مایوس کن بات تھی اور مجھے سمجھ آ گئی کہ وہ اپنی جاہ طلبی کی خواہش سے اس قدر مغلوب ہو چکے ہیں کہ وہ اس کے مضمرات کو سمجھنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ حقیقت میں وہ دانستہ یا غیر دانستہ طور پر ایک گہری سازش کا شکار ہو چکے تھے۔ مجھے بریگیڈیئر خالد جیسے شخص سے اس قسم کی بے وفائی کا مظاہرہ دیکھ کر بہت افسوس ہوا۔ میں نے انہیں ہمیشہ ایک قوم پرست اور محب وطن شخص خیال کیا تھا۔

میں نے کرنل شفاعت جمیل کو بھی ایسی تمام سرگرمیوں سے باز رہنے کے لیے قائل کرنے کی کوشش کی جو ملک اور قوم کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتی تھیں۔ لیکن ان کا رویہ بھی بالکل بریگیڈیئر خالد جیسا تھا۔ میں نے ان دونوں کو بتایا، ''اس نازک موڑ پر کوئی بھی ایسا عمل، جو فوج میں تقسیم کا موجب ہو، اسے قومی غداری تصور کیا جائے گا۔ اس وقت مسلح افواج کے اندر ایک مضبوط اتحاد کا موجود ہونا ناگزیر ہے تا کہ ملک کے اندر استحکام کو یقینی بنایا جا سکے اور یہ چیف آف آرمی سٹاف میجر جنرل ضیاالرحمٰن کے ساتھ مکمل وفاداری کے

ذریعے ہی ممکن ہوسکتا ہے۔ اس قسم کی وفاداری کے بغیر ہم انقلاب کے اہداف حاصل نہیں کر سکتے۔ آپس کے نظریاتی اختلافات کے باوجود ہمارے ذاتی تعلقات جو جنگ آزادی کے دوران پروان چڑھے تھے۔ ہمیں آپس میں کھل کر بات چیت کرنے کا موقع مہیا کررہے تھے۔ ہماری گفتگو کے اختتام پر دونوں نے بظاہر مجھے میجر جنرل ضیاالرحمٰن کے ساتھ مکمل تعاون کی یقین دہانی کرائی تھی، لیکن میرا ذاتی تاثر یہ تھا کہ یہ سب کھوکھلے وعدے تھے۔ حقیقت میں دونوں اپنے منصوبے پر عمل جاری رکھے ہوئے تھے۔

میجر جنرل ضیاالرحمٰن سمیت ہم نے غور کرنا شروع کردیا کہ بریگیڈیئر خالد اور کرنل شفاعت کے مسئلے کو کیسے حل کیا جائے اور قوم کو کسی ناخوشگوار حادثے سے بچایا جائے۔

171-36 جاہ طلب اور بدعنوان فوجی آفیسرز کو ریٹائر کرنے کا فیصلہ

لمبے غور وخوض کے بعد ان کو فوج سے نکالنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس انتہائی نازک اور خطرناک معاملے کو ختم کرنے کا صرف یہی ایک طریقہ تھا۔ لیکن ان تمام معاملات کو ہر قیمت پر حتمی شکل دینا ابھی باقی تھا۔ مجاہدین آزادی کے اکثر قابل اور لائق کمانڈروں نے ان فوجیوں اور افسروں کی ذاتی وفاداریاں اور محبتیں حاصل کررکھی تھیں جن کے ہمراہ وہ لڑتے رہے تھے۔ بریگیڈیئر خالد اور کرنل شفاعت جرأت مند مجاہدین آزادی تھے اور کامیاب کمانڈروں کی حیثیت سے اپنے ماتحت عملے کی مکمل وفاداریاں رکھتے تھے، اس لیے ان کو ہٹانے سے کچھ مسائل پیدا ہوسکتے تھے۔ لیکن میجر جنرل ضیاالرحمٰن اور ہم اس طرح کے کسی بھی امکان سے مؤثر طور پر نمٹنے کے لیے پراعتماد تھے۔ جب یہ آخری فیصلہ کرلیا گیا تو جنرل عثمانی کو ساری صورتِ حال سے آگاہ کردیا گیا۔

ساری بات سننے کے بعد انہیں شدید دھچکا محسوس ہوا۔ وہ یقین نہیں کررہے تھے کہ بریگیڈیئر خالد اور کرنل شفاعت اس قسم کی سرگرمیوں میں ملوث ہوسکتے ہیں۔ لیکن جب انٹیلی جینس کے سربراہان نے اپنی رپورٹیں پیش کیں تو مکمل طور پر مایوس ہوگئے اور غصے سے پھٹ پڑے۔ رپورٹ میں کہا گیا تھا کہ اس سازش کی پشت پناہی بکسال وادیوں کا ایک طاقت ور گروہ کررہا ہے۔ ہندوستان اور روس دونوں ضروری مدد اور تعاون فراہم کررہے ہیں کیوں کہ وہ مسلح افواج میں اس کے کچھ ممبران کی مدد سے تقسیم پیدا کرکے ملک کو خانہ جنگی میں دھکیلنا چاہتے ہیں۔ اس صورتِ حال میں بکسال وادیوں کے اس گروہ کی درخواست پر ہندوستانی فوج 25 سالہ معاہدے کے تحت ملک پر حملہ کرسکتی ہے۔ اس طرح موجودہ عمل کو روک کر بنگلہ دیش کو دوبارہ ایک طفیلی ریاست میں تبدیل کردیا جائے گا۔

انٹیلی جینس رپورٹوں میں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ ڈھاکہ میں ہندوستانی ہائی کمیشن اور روسی سفارت خانہ اور ''را'' کے ایجنٹس بہت سرگرم ہوچکے ہیں۔ مختلف مقامات پر باقاعدہ اجلاس کیے جارہے ہیں اور ان میں سے بعض اجلاسوں میں بریگیڈیئر خالد کو دیکھا گیا ہے۔ ہندوستانی ہائی کمیشن کی ہدایت پر بکسال کے ایک

سابق ایم پی اور بریگیڈیئر خالد کے بڑے بھائی راشد مشرف مختلف متعلقہ فریقین اور بریگیڈیئر خالد کے درمیان رابطوں کے لیے کام کررہے ہیں۔اس سازش سے متعلق ہفت روزہ ''ہالیڈے'' میں مسٹر عنایت اللہ خان کا ایک مضمون شائع ہوا تھا۔مسٹر لیف شلز نے بھی اپنی کتاب ''نامکمل انقلاب'' میں اس کے بارے میں لکھا تھا:

''مسٹر عتیق عالم، ''رائٹر'' کے ایک پریس رپورٹر، کے پاس تاج الدین احمد کا ان کے اپنے ہاتھ سے لکھا ہوا ایک خط تھا جس میں انقلاب کے خلاف ایک بغاوت کا منصوبہ تھا۔یہ خط ڈھا کہ میں ہندوستانی ہائی کمشنر سمار سین کے نام تھا۔''

ظل الرحمٰن خان اپنی کتاب ''بنگلہ دیش میں قیادت کا بحران'' میں لکھتے ہیں:

''جیل میں موجود چار رہنما (تاج الدین احمد، نذرالاسلام، قمرالزمان اور مسٹر منصور علی) بریگیڈیئر خالد کے انقلاب سے بخوبی آگاہ تھے۔یہ مجیب کے حق میں جوابی انقلاب تھا کیوں کہ یہ چاروں رہنما جیل سے ہیروز کے طور پر نکلنے اور حکومت بنانے کی تمام تیاریاں کررہے تھے۔''

مسلح افواج کے کل 36 افسروں کو نکالا جانا تھا۔اس کے ساتھ ہی ریٹائرڈ افسروں کی دوبارہ بحالی کے عمل کو تیز کرنے کی ضرورت تھی۔اس عمل میں ہم سب کو دوبارہ بحال کردیا گیا۔اس طرح میجر جنرل ضیا الرحمٰن کے ہاتھ مضبوط ہوگئے۔

پھر انہوں نے اہم یونٹوں میں ہماری تعیناتی کے احکام جاری کیے۔ ہماری بحالی کے بعد بریگیڈیئر خالد اینڈ کمپنی گھبرا گئے۔وہ سمجھ گئے تھے کہ ایک مرتبہ جب ہم یونٹوں میں پہنچ گئے تو ان کے لیے اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانا مشکل ہوجائے گا۔ان پر یہ بھی عیاں ہو چکا تھا کہ اب ان کے دن گنے جا چکے ہیں۔اس لیے وہ جلد از جلد اپنے سازشی منصوبے پر عمل کرنے کے لیے بے چین ہوگئے۔

172۔میجر جنرل ضیا نے خطرے کی گھنٹی بجادی

اس دوران ایک دن میجر جنرل ضیا نے کرنل رؤف اور کرنل مالک کی ریٹائرمنٹ کی تجویز پر صدر سے منظوری حاصل کرلی۔کرنل رؤف، شیخ مجیب الرحمٰن کے بااعتماد دفاعی انٹیلی جنس کے سربراہ تھے۔بکسال کی تشکیل کے بعد کرنل رؤف کی جگہ کرنل جمیل کو مقرر کردیا گیا تھا جو شیخ مجیب کے آبائی ضلع سے تعلق رکھتے تھے اور زیادہ وفادار خیال کیے جاتے تھے۔ضروری احکام جاری کردیے گئے تھے۔جب مجھے اس بارے میں علم ہوا تو میں بہت پریشان ہوا اور فوراً میجر جنرل ضیا الرحمٰن سے ملنے کے لیے چھاؤنی پہنچا۔میں نے کہا، ''سر آپ نے کیا کردیا ہے؟36 افسروں کو بہ یک وقت ریٹائر کرنے کا فیصلہ ہوا تھا۔اس کی بجائے آپ نے ان میں سے صرف دو کو ریٹائر کیا ہے۔اس طرح آپ نے باقی ماندہ کے لیے خطرے کی گھنٹی بجادی ہے۔کیا آپ اسے خطرناک نہیں سمجھتے؟''

میجر جنرل ضیا نے جواب میں کہا، ''فکر نہ کرو! ہمیں قدم قدم آگے بڑھنا ہوگا۔ تمام معاملات درست ہوجائیں گے۔ مجھے اپنے طریقے سے کام کرنے دو۔''

میں ان کی منطق سے مطمئن نہیں تھا لیکن کچھ بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ وہ ہمارے باس تھے اور ہم میں سے ہی ایک تھے۔ ہم ان پر فیصلے مسلط نہیں کرسکتے تھے اور نہ ہی ان کے کام کرنے کے طریقے میں مداخلت جائز تھی۔ لہٰذا میں پریشانی کے عالم میں واپس آ گیا۔

اس دوران بریگیڈیئر خالد اور ان کے مقلدین نے مسلح افواج کے اندر ایک پرزور مہم کا آغاز کردیا۔ یہ پروپیگنڈا کیا جارہا تھا کہ میجر جنرل ضیاالرحمٰن ایک قابل انقلابی نہیں ہیں اور ان کی قیادت میں انقلاب کے اہداف کو حاصل کرنا ممکن نہ ہوگا۔ اس کے علاوہ میجر جنرل ضیاالرحمٰن ایک جاہ پسند انسان ہیں اور بڑی ہوشیاری سے انقلاب کی روح کے خلاف کام کررہے ہیں، وہ خفیہ طور پر اپنے اقتدار کا راستہ ہموار کررہے ہیں۔

ان حالات میں ایک متبادل راستہ سوچنا ضروری تھا۔ عام فوجیوں کے لیے جنرل ضیا دیانت داری کی علامت تھے۔ وہ تمام فوج میں بہت مقبول بھی تھے۔ لیکن بریگیڈیئر خالد مشرف جیسے مجاہد آزادی کی قیادت میں افسروں کے ایک گروپ کا یہ کینہ پرور پروپیگنڈا نچلے طبقے میں شکوک وشبہات کو جنم دے رہا تھا۔ اس نے صورتِ حال کو قدرے مزید تاریک کردیا۔ سازشیوں کو یہ فائدہ محض اس لیے حاصل ہوگیا تھا کہ چیف تمام کے تمام 36 افسروں کو بہ یک وقت فارغ کرنے میں ہچکچاہٹ کا شکار ہوگئے تھے۔ مجھے مسلح افواج کے اندر کی خطرناک صورتِ حال اُس وقت واضح نظر آنے لگی جب ایک اجلاس میں ہمارے دو ساتھیوں میجر حفیظ الدین اور کیپٹن اقبال نے میجر جنرل ضیاالرحمٰن کی کارکردگی پر سوال اٹھایا۔ انہوں نے نہ صرف ان کی اہلیت پر شک وشبے کا اظہار کیا بلکہ یہ مشورہ بھی دیا کہ اگر ضروری ہو تو فوجی کونسل کو ان کی جگہ بریگیڈیئر خالد یا کسی دوسرے کو چیف آف سٹاف مقرر کرنے پر بھی غور کرنا چاہیے۔ تاہم ان کی تجویز پر غور نہ کیا گیا کیوں کہ مرکزی قیادت کی اکثریت مختلف خیالات کی حامل تھی۔ اکثریت کا خیال تھا کہ میجر جنرل ضیاالرحمٰن ایک مخلص اور انقلاب کے اہداف حاصل کرنے کے لیے پوری طرح پرعزم ہیں۔ ان سے کچھ غلطیاں ہوگئی ہوں گی لیکن یقیناً انہوں نے انقلاب کی روح کے خلاف کوئی ایسا کام نہیں کیا جو ان کے اخلاص کے بارے میں کسی قسم کے شکوک کو جنم دے سکے۔ لہٰذا اس مرحلے پر انہیں ہمارے مکمل اعتماد اور بھروسے کی ضرورت ہے۔ ہم نے بریگیڈیئر خالد اینڈ کمپنی کے خلاف ان کے ساتھ خلوصِ دل کے ساتھ تعاون کو جاری رکھنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ سودمند نہیں ہوسکتا۔ یہ فیصلہ کیا گیا کہ اگر وہ عمل درآمد منصوبے کے نفاذ میں کوئی بڑی غلطی کرتے ہیں تو اس کو تحمل کے ساتھ سامنے لایا جائے گا اور ہم اس قسم کے سارے باہمی مسائل گفت وشنید سے حل کرسکتے ہیں۔

قوم مسلح افواج کے اندر اس قسم کی دھماکہ خیز صورتِ حال سے بے خبر تھی۔ سب کچھ پس منظر میں

ہو رہا تھا۔ مسلح افواج کے اندر انقلاب مخالف سرگرمیوں اور سیاسی گفت وشنید کے عمل میں الجھاؤ نے پہلے ہی صورتِ حال پیچیدہ بنا رکھی تھی۔ اس نازک وقت میں بعض لوگوں کی تجویز تھی کہ قومی حکومت کی بجائے میجر جنرل ضیاالرحمٰن کی قیادت میں ایک انقلابی کمانڈ کونسل ملک کا اقتدار سنبھال لے اور تمام مسائل کو فوجی حکومت کے ذریعہ حل کیا جائے۔ لیکن فوجی کونسل کی مرکزی قیادت اس قسم کی تمام ترغیبات کے خلاف مضبوطی سے ڈٹی رہی۔ ہمارا مؤقف واضح تھا۔ یقیناً یہ اگست کے مقبول انقلاب کی روح کے منافی تھا کہ اقتدار پر قبضہ کرلیا جائے اور فوجی آمریت متعارف کروائی جائے۔ اس کا مقصد جمہوریت کا ازسرنو قیام تھا تاکہ ملک کے اندر قوم پرست اور محبِ وطن سیاسی قوتیں منظم کی جاسکیں۔ لہٰذا جیسے کہ فیصلہ کیا گیا تھا ہر قیمت پر انقلاب کے مقاصد کو حاصل کرنا تھا اور تمام قسم کی ترغیبات کی مزاحمت کرنی تھی۔ ہم اقتدار کے بھوکے فوجیوں کا کردار ادا نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اس کی بجائے ہم قومی آزادی اور خودمختاری کے امین اور عوام کی آزادی کے لیے ایک معاون قوت کے طور پر اپنا تاثر قائم رکھنا چاہتے تھے۔ یہی پہلو تھا جو ہمیں ہمارے مقصد کے حصول کی ذمہ داری نبھانے میں مزید پرعزم بنا رہا تھا۔ چیف اور بریگیڈیئر خالد کے درمیان مخاصمت ہر گزرتے دن کے ساتھ شدت اختیار کرتی چلی جا رہی تھی۔ تقریباً ہر رات میں ان کی غلط فہمیوں کو دُور کرنے کے لیے ایک جگہ سے دوسری جگہ بھاگا پھرتا تھا۔ میں بریگیڈیئر خالد اور کرنل شفاعت کو بار بار قائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن کوئی خاطرخواہ نتیجہ سامنے نہیں آ رہا تھا۔

173۔ بریگیڈیئر خالد کو باز رکھنے کی آخری کوشش

آخری حربے کے طور پر میں نے رنگ پور کے بریگیڈ کمانڈر کرنل نجم الہدیٰ کو ڈھاکہ آنے کی درخواست کی۔ گڈو بھائی، یعنی کرنل ہدیٰ بریگیڈیئر خالد کے بچپن کے دوست تھے۔ وہ ایک دوسرے کے اتنے قریب تھے گویا یک جان دو قالب تھے۔ اگرچہ گڈو بھائی اگرتلہ سازش کیس کے ایک ملزم تھے مگر وہ ہیرا انسان تھے اور جنگ آزادی کے دور سے ان کے ساتھ میرے تعلقات بڑے قریبی ہو گئے تھے۔ وہ وسیع المطالعہ اور سیاسی طور پر باشعور شخص اور محبِ وطن انسان تھے۔ لیکن وہ شیخ مجیب کے اندھے پیروکار تھے۔ تاہم جنگ آزادی کے فوراً بعد عوامی لیگ اور بکسال کے بارے میں ان کی تمام غلط فہمیاں دُور ہو چکی تھیں۔ عوامی بکسال حکومت کی غلط کاریوں کے ساتھ سمجھوتہ نہ کر پانے کی وجہ سے انہوں نے کومیلا آپریشن کے دوران عوامی بکسال وادیوں کی غلط کاریوں سے پردہ اٹھانے میں ہمارا مکمل ساتھ دیا تھا۔ جب مجھے اور چند دوسرے افسروں کو 1974ء میں صدارتی حکم نامے 9 کے تحت فوج سے فارغ کیا گیا تو کرنل ہدیٰ نے احتجاج کے طور پر اپنا استعفیٰ بھی پیش کر دیا تھا۔ تاہم وزیراعظم نے ان کا استعفیٰ منظور نہ کیا تھا۔

لہٰذا میں نے خیال کیا کہ شاید کرنل ہدیٰ، بریگیڈیئر خالد کو ان کی انتشار انگیز سرگرمیوں سے روکنے میں کامیاب ہو جائیں۔ جب کرنل ہدیٰ، ڈھاکہ پہنچے میں نے ان کے ساتھ تفصیلی بات چیت کی،

ساری بات سننے کے بعد انہوں نے مجھے یقین دلایا کہ وہ بریگیڈیئر خالد کو صورتِ حال کی گمبھیرتا سمجھانے کی پوری پوری کوشش کریں گے۔ اگلے دو روز انہوں نے بریگیڈیئر خالد کے ساتھ دو لمبی ملاقاتیں کیں، لیکن انہیں کامیابی نہ ہوسکی۔ گڈو بھائی نے ہمیں بتایا کہ بریگیڈیئر خالد اپنے مؤقف سے ٹس سے مس نہ ہوئے اور وہ میجر جنرل ضیا کے ساتھ کوئی سمجھوتہ کرنے کے لیے تیار نہیں۔ مجھے وہ رات کبھی بھی نہیں بھول سکتی۔ بریگیڈیئر خالد کے ساتھ اپنی آخری لیکن لمبی ملاقات کے بعد انہوں نے مجھے اپنے بھائی 'کے کیو ہدیٰ' کی رہائش گاہ بانانی پر ملنے کو کہا۔ جب میں وہاں پہنچا، گڈو بھائی پوری طرح مایوس نظر آ رہے تھے۔ وہ بڑی بے چینی سے میرا انتظار کر رہے تھے۔ ہم ڈرائینگ روم میں بیٹھ گئے۔ صرف ہم دونوں ہی تھے۔

''دالیم! خالد کو قائل نہیں کیا جا سکتا۔ مجھے خوف ہے کہ اب کیا ہوگا، خالد اپنے منصوبے پر اس قدر تلا ہوا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ اس نے مجھے بھی شامل ہونے کو کہا ہے۔'' کرنل ہدیٰ نے کہا۔

میں بہت پریشان ہوا اور کہا، ''اب آپ نے کیا کرنے کا سوچا ہے سر؟''

''میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا کیا جائے۔'' کرنل ہدیٰ نے بہت پریشانی کے عالم میں کہا۔ انہوں نے مزید کہا، ''اگرچہ میں اسے سمجھا نہیں سکا، شاید میں اسے قابو کر سکتا تھا اگر میں ڈھاکہ میں ہوتا۔ وہ بریگیڈیئر نذر الزمان کے ساتھ بھی رابطے میں ہے۔''

بریگیڈیئر نذر الزمان جو اس وقت جے آر بی کے ڈائریکٹر تھے، حال ہی میں اپنے غیر ملکی دورے سے واپس آئے تھے۔ یہ بات بہت واضح ہوگئی کہ اس وقت تک سازش بہت آگے جا چکی تھی۔

''میں کرنل خالد کو انکار بھی نہیں کر سکا۔ تم ہمارے تعلقات کے بارے میں سب کچھ جانتے ہو۔'' کرنل ہدیٰ نے کہا۔

''یہ تو آگ میں چھلانگ لگانے والی بات ہے۔'' میں نے تبصرہ کیا۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو، لیکن میں بہت پریشان ہوں۔'' کرنل ہدیٰ نے یہ الفاظ یوں ادا کیے گویا اپنے آپ سے بات کر رہے ہوں۔

''ٹھیک ہے سر، میں آپ کو ایک محبِ وطن اور ذمہ دار شخص خیال کرتا ہوں۔ آپ نے ماضی میں بھی اپنی حب الوطنی ثابت کی ہے اور مجھے یقین ہے کہ مستقبل میں بھی قومی مفاد آپ کے نزدیک سب سے زیادہ اہم ہوگا۔ چلیے دیکھتے ہیں کہ آخر کار کیا ہوتا ہے۔ ہمیں اللہ پر بھروسا رکھنا چاہیے۔ اب آپ تمام صورتِ حال سمجھ چکے ہیں، میں آپ سے رابطے میں رہوں گا۔ رنگ پور سے یہاں آنے کی تکلیف اٹھانے پر میں آپ کا بہت زیادہ شکر گزار ہوں۔''

اس طرح ہماری یہ آخری ملاقات ختم ہوئی۔ رخصت ہوتے ہوئے میں نے ہدیٰ بھائی سے کہا، ''جانے سے پہلے میری ایک بات سنیں۔ میں خلوصِ دل سے آپ کی بے غرض حب الوطنی کو سلام پیش کرتا ہوں۔''

یہ نہ صرف ہماری آخری ملاقات تھی بلکہ یہ آخری موقع تھا کہ میں نے کرنل ہدیٰ اپنے پیارے

گڈو بھائی کو دیکھا۔ اس رات میں پریشان ذہن اور غیر یقینی واقعات کے خدشات لیے ہوئے واپس آیا۔ سارے راستے میں سوچتا آیا کہ شاید ہماری کوششیں تباہ کن واقعات کو روکنے کے لیے کافی ثابت نہیں ہوں گی۔ وقت خاموشی سے گزر رہا تھا، ہر کوئی اپنے اپنے کھیل میں مصروف تھا۔ لیکن کسی کو یہ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ قوم بارود کے ڈھیر پر بیٹھی ہوئی ہے جو کسی بھی وقت پھٹ سکتا ہے۔ یہ سب کچھ پس پردہ ہو رہا تھا اور ہم میں سے چند ایک کو علم تھا کہ کیا کھچڑی پک رہی تھی۔ بریگیڈیئر خالد اور کرنل شفاعت زیادہ منہ زور ہو گئے تھے اور تمام حدود پار کر گئے تھے۔ انہوں نے میجر جنرل ضیاالرحمٰن کے تقریباً ہر حکم کو ماننے سے نکار کرنا شروع کر دیا تھا۔ صورتِ حال کو قابو میں رکھنے اور فریقین کے درمیان ثالثی کے لیے مجھے تقریباً ہر روز رات کو چھاؤنی جانا پڑتا تھا۔ صورتِ حال میں شدید تناؤ پایا جاتا تھا۔

ایک شام میجر جنرل ضیاالرحمٰن نے مجھے فوری طور پر ملاقات کرنے کے لیے کہا۔ میں ان کی رہائش گاہ پر گیا۔ وہ تھکے ہوئے اور کسی قدر پریشان نظر آ رہے تھے۔

''خالد اپنے اقتدار کی خواہش میں بہت بے چین ہو چکا ہے۔ پیشتر اس کے کہ بہت دیر ہو جائے ہمیں فوری طور پر کچھ کرنا چاہیے۔'' میجر جنرل ضیا نے کہا۔

''آپ اس پوزیشن میں ہیں اور کوئی بھی کارروائی کرنے کا مکمل اختیار رکھتے ہیں۔ لیکن آپ کو بڑی عقل مندی سے قدم اٹھانا ہوں گے، ہر قدم پوری طرح نپا تلا ہونا چاہیے۔'' میں نے جواب دیا۔

''میں نے باقی ماندہ 34 افسروں کی تمام فائلیں ایک یا دو روز میں منظوری کے لیے صدر کے پاس لے جانے کا فیصلہ کیا ہے۔ مزید وقت ضائع کرنا بہتر نہیں ہوگا۔'' میجر جنرل ضیاالرحمٰن نے کہا۔

''آپ کو یہ کام بہت پہلے کر دینا چاہیے تھا سر۔ تاہم دیر سے کر لینا نہ کرنے سے بہتر ہوتا ہے۔ آپ نے 1 ایف ڈی آرٹلری رجمنٹ اور 8 بنگال رجمنٹ کو ڈھاکہ لانے کے لیے اب تک کیا کیا ہے۔'' میں نے پوچھا۔

''خالد کسی نہ کسی بہانے اس میں تاخیر کر رہا ہے۔'' میجر ضیا نے جواب دیا۔

''یہ تو ایسے ہی ہوگا۔ وہ اس کی اجازت نہیں دیں گے۔ وہ جانتے ہیں کہ اگر 4 بنگال رجمنٹ کو ڈھاکہ سے باہر بھیج دیا گیا اور 1 ایف آرٹلری اور 8 بنگال کو یہاں لایا گیا تو ان کے لیے اور ان کے ساتھیوں کے لیے دارالحکومت میں ساز باز اور گٹھ جوڑ کرنا ناممکن ہو جائے گا۔ لہٰذا یہ آپ کے اپنے مفاد میں ہے کہ ان دو یونٹوں کو جس قدر جلدی ممکن ہو سکے، ڈھاکہ لے کر آئیں۔ اگر ضرورت محسوس ہو تو بریگیڈیئر خالد کو نظر انداز کرتے ہوئے بھی یہ کام انجام دے دیں۔ اور ہماری تعیناتیوں کا کیا ہوا ہے؟ آپ کو ہماری تعیناتی کے احکام جاری کرنے میں دیر نہیں کرنا چاہیے، یہ کام فوراً کرنے کی ضرورت ہے تا کہ ہم آپ کے ہاتھ مضبوط کرنے کے لیے اپنے فوجیوں کے ساتھ ہوں۔''

میجر جنرل ضیا خاموشی سے میری بات سن رہے تھے اور گہری سوچ میں نظر آ رہے تھے۔ اس کے

دو روز بعد میجر جنرل ضیا فائلیں لے کر صدر کے پاس گئے۔ صدر نے انہیں کہا کہ وہ ان پر جنرل عثمانی کے ساتھ مشورے کے بعد دستخط کریں گے۔ تب میں جنرل عثمانی کے پاس گیا اور فائلوں کے بارے میں جاننے کی کوشش کی، جواب میں جنرل عثمانی نے محض یہ کہا کہ یہ معاملہ صدر کے زیر غور ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ صدر نے اس معاملے پر جنرل عثمانی سے بات چیت کی تھی اور کسی وجہ سے فیصلے کو التوا میں رکھا ہوا تھا۔ میں نے اسے قدرے پریشان کن اور غیر یقینی خیال کیا۔ یہ "انتظار کرو اور دیکھو" کی صورتِ حال تھی۔

174۔ بریگیڈیئر خالد اور کرنل شفاعت اینڈ کمپنی نے شر انگیز پروپیگنڈا شروع کر دیا اور میجر جنرل ضیا کے مزید نافرمان ہو گئے

اس دوران لیفٹیننٹ کرنل فاروق اور لیفٹیننٹ کرنل رشید کی ادعا پسندی اور گستاخی نے چند سینئر آفیسرز میں ناراضی کے جذبات پیدا کر دیئے۔ ان کی بے مہار گفتگو اور اشتعال انگیز رویے سے بہت سے لوگوں کے جذبات مجروح ہوئے۔ اگرچہ یہ معمولی اور غیر اہم معاملات تھے لیکن خالد اینڈ کمپنی نے ان جذبات کو اپنے مفاد میں استعمال کیا اور فوج کے اندر بدنیتی پر مبنی پروپیگنڈا شروع کر دیا۔ انہوں نے یہ افواہیں پھیلانا شروع کر دیں کہ ہم بنگا بھون میں رہتے ہیں اور فوج میں کمانڈ کے سلسلے کو توڑنے کی کوشش کر رہے ہیں اور یہ کہ میجر جنرل ضیا الرحمٰن ہمارے مہرے بن چکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ فوج کے لیے کوئی بہتر کام نہیں کر سکتے۔ فاروق اور رشید سینئر افسروں کے ساتھ بدسلوکی کر رہے تھے اور ہر کام اصولوں اور ضابطوں کے خلاف انجام دے رہے تھے۔ اس قسم کے شیطانی اور من گھڑت پروپیگنڈے نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور صورتِ حال مزید پیچیدہ ہو گئی۔

اس کے ساتھ ہی بریگیڈیئر خالد اور کرنل شفاعت نے حقیقت میں کمانڈ کے سلسلے کو بے عمل کر دیا۔ لہٰذا بتدریج میجر جنرل ضیا الرحمٰن ان کے ہاتھوں میں یرغمالی بن گئے۔ وہ ان کے روزمرہ کے کاموں میں مداخلت کر رہے تھے۔

175۔ سیاسی تعاون کے حصول کے لیے کوششیں

سنجیدگی سے غور و خوض کرنے کے بعد ہم نے متوقع بربادی کے بارے میں مختلف سیاسی جماعتوں کے محبِ وطن رہنماؤں سے، جن کو ہم اعتماد میں لے سکتے تھے، گفت و شنید کا فیصلہ کیا۔ اس معاملے میں سمیو وادی دَل کے طٰہٰ بھائی، سربہارا پارٹی کے محبوب، جے ایس ڈی کے میجر جلیل اور کرنل طاہر سے بات چیت کی گئی۔ وہ تمام کے تمام ہندروسی بلاک کے تعاون سے انقلاب کے خلاف اٹھائے جانے والے کسی بھی قدم کا متحد ہو کر مقابلہ کرنے پر متفق تھے۔

ہم سے تمام معلومات حاصل کرنے کے بعد کرنل طاہر نے کہا کہ اس نازک وقت میں میجر جنرل

ضیا کے خلاف اٹھائے جانے والے کسی بھی قدم کو انقلاب دشمنی تصور کیا جائے گا کیوں کہ جہاں تک فوج کی تنظیم نو کا تعلق ہے۔ میجر جنرل ضیاالرحمٰن کا کوئی بھی متبادل موجود نہیں۔ مزید برآں کسی بھی قومی بحران کی صورت میں ان کی شخصیت فوج کے اتحاد اور حتیٰ کہ قوم کے اتحاد کے لیے بھی انتہائی اہم ہے۔ لہٰذا 15 اگست کے انقلاب کے اہداف کو حاصل کرنے کے لیے ان کی ہر قیمت پر حفاظت کرنا ہوگی۔

کرنل طاہر نے مزید کہا کہ اگر بریگیڈیئر خالد کوئی قدم اٹھاتا ہے تو پھر عظیم تر قومی مفاد میں وہ اور ان کی گانو باہنی جوابی حملے کے لیے فوجی کونسل، اور دوسری قوتوں کے شانہ بہ شانہ کھڑی ہوگی۔ اگر ضرورت محسوس ہوئی تو اس قسم کی سازش کو ناکام بنانے کے لیے ایک دوسرا انقلاب بھی لایا جاسکتا ہے۔ اس دن ہم سارا وقت مندرجہ بالا مسائل پر ذاتی سطح پر بات چیت کرتے رہے۔ ہم جو جنگ کے دنوں میں ساتھی رہے تھے، پورے اعتماد کے ساتھ ایک دوسرے سے بات چیت کرتے رہے۔ وہ ایک سیاسی جماعت کے رہنما کی بجائے ایک بااعتماد دوست کی حیثیت سے بات کررہے تھے۔ ہم ان میں سچے قومی جذبے سے لبریز ایک محبِ وطن مجاہد آزادی دیکھ سکتے تھے۔ ایک ایسا شخص جس کے دل میں ملک کی فلاح و بہبود کا ایک سچا جذبہ موجزن تھا۔ وہی بے لوث جذبہ جس نے ایک دن ہمیں اکٹھا مل کر پاکستان سے فرار ہونے پر اکسایا تھا تاکہ ہم جنگ آزادی میں اپنا حصہ ڈال سکیں آج پھر ہمیں اسی مقدس عہد کے لیے تیار کررہا تھا کہ ہم سب مل کر ایسے تمام ناپاک منصوبوں کے خلاف سینہ سپر ہو جائیں جو ہماری آزادی کو سلب کرنے کے لیے تیار کیے جائیں گے۔ ہماری ذاتی سوچوں میں زندگی کے بارے میں نظریات کے حوالے سے فرق ہوسکتا تھا لیکن قومی مفادات کے سامنے یہ سب ثانوی حیثیت رکھتے تھے۔ قوم اور ملک کی خاطر ہم سب ایک تھے۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ ملک کی آزادی کو درپیش کسی بھی خطرے یا امکان کا مقابلہ کرنے کے لیے فوجی کونسل اور گانو باہنی شانہ بہ شانہ کھڑی ہوں گی۔ ہم نے آپس میں مسلسل رابطہ رکھنے اور ہر قسم کی معلومات کے تبادلے کا بھی فیصلہ کیا۔

دیگر سیاسی رہنماؤں نے بھی ہر قسم کے قوم دشمن منصوبوں کے خلاف فوجی کونسل کے ساتھ اپنے پورے تعاون کی یقین دہانی کرائی۔

وقت گزرتا گیا۔ آخرکار ہماری دوبارہ بحالی کے احکام جاری کر دیئے گئے۔ ہماری تعیناتی کے احکام ابھی تک التوا میں تھے۔ صدر نے ابھی تک بریگیڈیئر خالد اور 35 دوسرے افسروں کی فائلوں پر دستخط نہیں کیے تھے۔ یہ واضح ہو چکا تھا کہ اس سلسلے میں فیصلے میں تاخیر خفیہ مفادات رکھنے والے حلقوں کی جانب سے کی جانے والی مشکوک سرگرمیوں کا نتیجہ تھی۔ میں نے یہ جاننے کی پوری کوشش کی کہ رکاوٹ کس جگہ پر ہے لیکن ناکام رہا۔ بحران زور پکڑتا چلا گیا۔

176۔ ایک عجیب واقعہ

ایک رات جب کابینہ کا اجلاس ختم ہو چکا تھا اور وزرا ابھی تک بنگا بھون کی لابی اور راہداریوں

میں موجود تھے کہ اچانک مسٹر ریاض الدین احمد نے مجھے بلایا۔ جب میں ان کو ملنے کے لیے گیا تو انہوں نے کہا، ''دالیم، میں نے اس آدمی کا کام کر دیا ہے جسے آج تم نے میرے پاس بھیجا تھا۔ سیکریٹری کل پرمٹ جاری کر دے گا۔''

میں بہت حیران ہوا اور جواب دیا، ''میں نے کسی کو بھی آپ کے پاس نہیں بھیجا تھا، چچا کیا آپ وضاحت فرمائیں گے کہ بات ہے کیا؟''

مسٹر احمد گھبرا گئے اور کہا کہ آج صبح ایک نوجوان ان کو ملنے کے لیے آیا اور بتایا کہ میں نے اسے 25 لاکھ ٹکے کی ساگوان کی لکڑی کے پرمٹ کی درخواست کے ساتھ ان کے پاس بھیجا ہے۔ میں حیران رہ گیا اور وزیر کو بتایا کہ یہ خالص فراڈ کا کیس ہے۔ میں بہت زیادہ پریشان بھی ہوا کہ لوگ ہمیں بیچنے پر لگے ہوئے ہیں۔ میں نے وزیر سے درخواست کی کہ کل جب وہ پرمٹ لینے کے لیے آئے تو مجھے اطلاع کر دیں میں موقع پر ہی معاملہ کی تہ تک پہنچنا چاہتا تھا۔

دوسرے دن صبح جیسے ہی وہ آدمی آیا، انہوں نے مجھے بلا بھیجا۔ میں نے آئی بی اور پولیس کے کچھ آدمی سادہ کپڑوں میں ساتھ لیے اور سیکریٹریٹ میں سیدھا وزیر کے چیمبر میں چلا گیا۔ ایک درمیانی عمر کا نوجوان خوش پوش شخص وہاں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ چائے پی رہا تھا۔ میں نے وزیر کو آنکھ ماری کہ میری شناخت ظاہر نہ کریں۔ میں اس کے نزدیک بیٹھ گیا اور وزیر سے کہا، ''سر، آج آپ نے مجھے میرے چھوٹے بھائی کو فوج میں بھرتی کروانے کے سلسلے میں بلوایا تھا۔ آپ نے مجھے بتایا تھا کہ ایک آدمی ہے جو اس سلسلے میں میری مدد کر سکتا ہے۔''

''اوہ ہاں! یہ وہ صاحب ہیں جن کی میں بات کر رہا تھا۔'' وزیر نے کہا۔ پھر وزیر نے بڑی معصومیت کے ساتھ اس شخص کو درخواست کی، ''بھائی صاحب، یہ آدمی میرا نزدیکی واقف کار ہے۔ اس کے ایک چھوٹے بھائی نے فوج میں کمیشن رینک کے لیے درخواست دے رکھی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ ہم ایک ایسے معاشرے میں رہ رہے ہیں جہاں تعلق داری سے ہی سب کام نکلتے ہیں۔ لہٰذا میں سوچ رہا ہوں کہ آپ اس کی کچھ مدد کر دیں۔ میں نے آپ کا کام کر دیا ہے اور اب اگر آپ اس کے چھوٹے بھائی کے لیے کچھ کر سکیں تو میں بھی آپ کا شکر گزار ہوں گا۔''

''آپ نے بہت معمولی سا کام بتایا ہے۔ یہ تو ایک انتہائی حقیر خدمت ہے، جو میں آپ کے لیے انجام دے سکتا ہوں۔ ایسے چھوٹے چھوٹے کاموں کے لیے میجر دالیم کی ضرورت نہیں ہے۔ میجر جنرل ضیا یا بریگیڈیئر خالد ہی یہ کام کر دیں گے۔''

وہ شخص بڑے اعتماد سے بات کر رہا تھا پھر اس نے مجھے اپنا کارڈ دیا اور کہا کہ کسی بھی روز میرے دفتر میں آ جانا، میں آپ کے سامنے ہی آپ کا کام کروا دوں گا۔ اس نے کہا کہ وہ میجر جنرل ضیا یا بریگیڈیئر خالد، کسی کو بھی فون کر دے گا۔ بعد میں تحقیق پر وہ پتہ جعلی ثابت ہوا۔ میں اس کی جرأت اور اعتماد دیکھ کر حیران

رہ گیا۔ وہ ہم سے باتیں کرتے ہوئے 555 کے سگریٹ پی رہا تھا۔ وزیر اور میں نے آنکھیں ملائیں، لیکن ہم نے ظاہر نہ ہونے دیا۔ پھر میں ان دونوں کا شکریہ ادا کر کے باہر آ گیا۔ قانون نافذ کرنے والے ادارے کے افراد نے میرے نکلنے کے بعد اپنا کام کیا۔ میں نے انہیں تفتیشی رپورٹ کی نقل بھجوانے کا کہہ دیا۔ مجھے سمجھ نہ آ سکی کہ آیا یہ ایک دھوکا دہی کا کیس تھا یا اس میں کوئی دوسرے بد اراد ے شامل تھے۔ اللہ تعالیٰ نے محض اپنے کرم کی وجہ سے مجھے بچا لیا تھا۔

177۔ عبید الرحمٰن نے رشوت دینے کی جرأت کی

اکتوبر کے آخری ایام میں ایک اور واقعہ رونما ہوا۔ ایک شام میجر شہریار نے ریڈیو سٹیشن سے مجھے فون کیا۔ ''ہیلو سر، السلام علیکم! صدر نے مسٹر عبید الرحمٰن کو حراست سے رہا کروانے اور آج رات انہیں ''بیمان'' کے ذریعے لندن بھجوانے کا بندوبست کیا ہے، مجھے یہ خبر ایک قابل اعتماد ذریعے سے ملی ہے۔ کیا آپ اس بارے میں کچھ جانتے ہیں؟''

''نہیں، جو بھی ہے میں بالکل نہیں جانتا۔''

''سر، وہ لوگ جو مخصوص الزامات کے تحت گرفتار کیے گئے ہیں۔ اگر اب انہیں بغیر کسی مقدمے کے رہا کر دیا جائے تو حکومت کا تاثر ماند پڑ جائے گا۔ لوگ کہیں گے کہ وہی کھیل دوبارہ شروع کر دیا گیا ہے۔ بدعنوان لوگوں کو ان کی دولت کی طاقت کی وجہ سے رہا کیا جا رہا ہے۔'' میجر شہریار نے کہا۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو، اگر تمہاری معلومات درست ہیں تو پھر عبید الرحمٰن کو یوں آزادی سے باہر نہیں جانے دیا جائے گا۔ اسے دوبارہ پکڑنے کا بندوبست کرو۔ تمہیں اسے ہوائی اڈے سے گرفتار کرنا ہوگا تا کہ خبر عوام تک پہنچ سکے اور ہم ان لوگوں کو تلاش کر سکیں جو پس پردہ کام کر رہے ہیں۔ کسی کو بھی ایسے مجرموں کو رہا کرنے کا حق حاصل نہیں جنہیں مخصوص الزامات کے تحت گرفتار کیا گیا ہے۔ جب اسے گرفتار کر لو تو مجھے فون کرنا۔''

''ٹھیک ہے سر، میں ضروری انتظامات کر رہا ہوں۔'' میجر شہریار نے فون رکھ دیا۔

مسٹر عبید الرحمٰن کو تقریباً آدھی رات کے قریب بیمان کی لندن کی جانے والی پرواز پر سوار کر دیا گیا۔ اسے جہاز کے اندر سے میجر شہریار کی بھیجی ہوئی ٹاسک فورس نے دوبارہ گرفتار کر لیا۔ جب اسے ہیڈ کوارٹرز پہنچا دیا گیا تو مجھے اطلاع دی گئی۔ ہمیں پتا چلا کہ آئی جی پی مسٹر نور الاسلام اور ایڈیشنل آئی جی پی مسٹر ای اے چوہدری اس کے ذمہ دار ہیں۔ دونوں کو بلا لیا گیا۔

میں نے مسٹر ای اے چوہدری سے پوچھا، ''سر میں جانتا ہوں کہ آپ ان لوگوں کے انچارج ہیں جن کو بدعنوانیوں اور دوسرے جرائم میں مخصوص الزامات کے تحت گرفتار کیا گیا۔ کیا یہ درست ہے؟''

''جی ہاں!'' مسٹر چوہدری نے جواب دیا۔

''تو پھر آپ نے مسٹر رحمٰن کو کس کے کہنے پر رہا کیا اور اسے باہر بھیجنے کی کوشش کی۔ آپ کس کے حکم پر کام کر رہے تھے؟'' میں نے پوچھا۔

مسٹر چوہدری میرے سوال پر کچھ گھبرا گئے۔

''میں نے آئی جی پی مسٹر اسلام کے حکم پر عمل کیا تھا۔''

''مسٹر اسلام آپ ایسا حکم کیسے دے سکتے ہیں؟ میں نے آئی جی پی سے سوال کیا۔

''میں نے صدر کے حکم پر عمل کیا تھا۔'' انہوں نے جواب دیا۔

''کیا صدر نے کوئی تحریری حکم دیا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں انہوں نے مجھے فون کیا تھا۔''

''اب اگر صدر انکار کر دیتے ہیں تو آپ کی کیا پوزیشن ہوگی مسٹر اسلام؟ کیا آپ قانون کی نظروں میں مجرم نہیں ٹھہریں گے؟'' میں نے پوچھا۔

مسٹر اسلام سینئر پولیس آفیسر لاجواب ہو گئے۔

''میجر صاحب، سینئرز کی خواہشات ہم جونیئرز کے لیے حکم کا درجہ رکھتی ہیں۔'' مسٹر اسلام نے کہا۔

''درست کہا ہے جناب، یہ نو آبادیاتی دور کی باتیں ہیں۔ لیکن ایک آزاد ملک کا سول عہدے دار ہونے کے حوالے سے آپ اس رواج کو مثال کیسے بنا سکتے ہیں؟ یہ آپ کا قصور نہیں ہے۔ پوری انتظامیہ ابھی تک نو آبادیاتی ماضی کے نقش قدم پر چل رہی ہے۔ تیسری دنیا کے اکثر ممالک میں آزادی کے بعد بھی حکمران اشرافیہ نے نو آبادیاتی انتظامی ڈھانچے کو جوں کا توں قائم رکھا ہوا ہے، جسے وہ عوام کے استحصال کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔ بیورو کریٹس لوٹ کے مال میں سے حصہ لینے کے لیے سیاست دانوں کے ساتھ چشم پوشی کا سلوک کرتے ہیں۔ لیکن جب وقت آتا ہے تو سیاست دانوں کو قربانی کا بکرا بنا دیا جاتا ہے۔ بیورو کریٹس ہمیشہ محفوظ رہتے ہیں اور پھر نئے سیاست دانوں کے ساتھ یہ کھیل کھیلنے کے لیے دوبارہ سامنے آجاتے ہیں۔ لیکن 15 اگست کا انقلاب اس قسم کی کارروائیوں کو جاری رکھنے کے لیے نہیں لایا گیا تھا۔ یہ تبدیلی بیورو کریٹس کو تبدیل کرنے اور اسے ایک مؤثر ادارے میں تبدیل کرنے کے عزم کے ساتھ لائی گئی تھی۔ اس لیے ذہنیتوں کو تبدیل کرنے کی ضرورت ہے۔ مسٹر اسلام اگر صدر بھی یہ احکام جاری کرتا ہے تو آپ کو اسے درست مشورہ دینا چاہیے۔ ایک پیشہ ور عہدے دار کے طور پر آپ کو یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ آپ نے انتہائی نامناسب حرکت کی ہے۔ حکومت کی شہرت کو داغ دار ہونے سے بچانے کے لیے مسٹر رحمٰن کو دوبارہ حراست میں لے لیا گیا ہے۔ لہٰذا اب انہیں اپنے ساتھ لے جائیں۔ پیشہ ور افراد کے طور پر ہمیں مستقبل میں زیادہ بااخلاق، قانون کے پابند اور دیانت دار ہونا چاہیے۔

پھر مسٹر رحمٰن کو اندر بلایا گیا۔ مسٹر اسلام اور مسٹر ای اے چوہدری کو دوسرے کمرے میں انتظار کرنے کو

کہا گیا۔ جیسے ہی مسٹر رحمٰن کو اندر لایا گیا وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور بولا، ''سر، میں نے بہت سے غلط کام کیے ہیں۔ میں نے غلط ذرائع سے بہت سی دولت بھی اکٹھی کی تھی۔ اب میں اپنے کیے پر ندامت کا اظہار کرنا چاہتا ہوں۔ برائے مہربانی مجھے معاف کر دیں اور ایک موقع دیں۔''

ڈرامائی انداز میں انہوں نے ایک غیر ملکی بینک کی چیک بک نکالی اور چند خالی چیکوں پر دستخط کرتے ہوئے چیک بک ہمیں دی اور کہا، ''سر، بیرون ملک جو بھی میرے پاس ہے وہ میں اپنی مرضی سے واپس دینا چاہتا ہوں۔''

یہ شخص کس قدر خطرناک تھا۔ وہ ہمیں رشوت دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ پیشکش بڑی ڈرامائی تھی اور چالاکی سے کی گئی تھی۔ اس کے بعد ہم نے ان سے مزید بات کرنا گوارا نہ کیا۔ میں نے میجر شہریار سے اجازت مانگی کیوں کہ بہت دیر ہو چکی تھی اور آئی جی پی مسٹر نور الاسلام اور مسٹر ای اے چوہدری کی مسٹر عبید الرحمٰن کے ساتھ روانگی کے بعد میں بھی وہاں سے واپس آ گیا۔

میں صبح سویرے بنگا بھوَن واپس پہنچا۔ یہ سارا واقعہ جو ہوا تھا، وہ تمام وقت میرے ذہن پر چھایا رہا۔ یہ بیوروکریٹس بھی کیسی مخلوق ہیں۔ یہ اپنی مرضی کے ساتھ قانون بناتے اور توڑتے ہیں۔ صرف بنگا بھوَن میں کام کرنے کے بعد میں ان کرداروں کو اس قدر اچھی طرح جان پایا۔ بعض اوقات میں سوچتا تھا کہ ایک قوم یا ملک کس طرح باعزت مقام حاصل کر سکتا ہے اگر یہ دیانت دار افراد کے ہاتھ میں نہیں ہے۔

178۔ میں نے تھوڑے ہی عرصہ میں بہت کچھ سیکھا

اقتدار کی راہداریوں میں جو کچھ ہوتا ہے، اس سے میں نے بہت تجربہ حاصل کیا۔ یہاں ہر کوئی اپنے سے اوپر والوں کی حمایت حاصل کرنے کے چکر میں مصروف تھا۔ یہاں آپ کو احساس ہوتا ہے کہ انسان، جب وہ اپنے اردگرد جمع ہجوم پر نظر ڈالتا ہے جس نے اسے گھیر رکھا ہوتا ہے تو اپنے آپ کو کتنا طاقت وَر تصور کرتا ہے۔ یہ ہوشیار طبقہ ہر وقت اہل اقتدار کی کمزوریاں تلاش کرنے میں مصروف رہتا ہے تاکہ انہیں اپنے مفادات حاصل کرنے میں آسانی رہے۔ اس طرح یہ اپنے لالچ اور خواہشات کو پورا کرنے کے لیے سیاست دانوں کے کندھوں پر بندوق رکھ کر چلاتے ہیں۔ جب عوام کا غیظ و غضب حکمرانوں پر گرتا ہے اور انہیں اقتدار سے نکال باہر پھینکتا ہے تو یہ بیوروکریٹس بڑے تحمل کے ساتھ اگلی کھیپ کے انتظار میں بیٹھ جاتے ہیں۔ بعض اوقات یہ خود بھی اعتماد کھو دینے والی حکومتوں کو گرانے میں پورے جوش و جذبے سے حصہ لیتے ہیں تاکہ آنے والے نئے آقاؤں کے ساتھ اپنے کھاتے کھول سکیں۔ چاہے یہ جمہوری حکومت ہو یا آمرانہ حکومت ہو انہیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کیوں کہ اقتدار میں آنے والے اپنی نااہلی اور ریاستی امور سے لاعلمی کی وجہ سے مکمل طور پر ان بیوروکریٹس پر انحصار کرتے ہیں، حتیٰ کہ لوٹ مار اور غارت گری کے طور طریقے بھی انہی سے سیکھتے ہیں۔ اقتدار کا پہیہ اسی طرح گھومتا چلا جاتا ہے اور اس مسلسل استحصال کے نتیجے میں ملک امداد اور

خیرات اکٹھا کرنے والی ایک بے پیندے کی ٹوکری بن جاتا ہے۔اس کے نتیجے میں عوام بے بسی اور محرومیوں کے جوئے تلے محض بار برداری کے جانور اور زندہ لاشیں بن کر رہ جاتے ہیں، انہیں محض گوشت اور خون کے بے مقصد لوتھڑوں میں تبدیل کر دیا جاتا ہے اور وہ زمین پر خدا کا نائب کہلانے کے قابل بھی نہیں رہ جاتے۔

179۔مخصوص بیوروکریٹک ذہنیت

اس دوران ایک دن سیکریٹری خارجہ میرے ساتھ کسی اہم مسئلے پر بات کرنا چاہتے تھے۔لہٰذا میں ان سے ملنے کے لیے گیا۔

''تمہارے سسر میرے اچھے دوستوں میں سے ہیں۔وہ اس ماہ ریٹائر ہوئے ہیں۔لیکن ہمیں ان جیسے تجربہ کار شخص کی لندن مشن میں ضرورت ہے۔لہٰذا میں نے سوچا ہے کہ میں صدر سے درخواست کروں کہ انہیں تین سال کی مزید توسیع دے دیں۔صدر کو اس قسم کی توسیع دینے کا اختیار حاصل ہے۔''

میں نے خاموشی سے ان کی بات سنی اور پھر کہا،''میرے سسر سرکاری ملازمت کے اصولوں اور ضابطوں کے مطابق ریٹائر ہو رہے ہیں۔آیا انہیں ملازمت میں توسیع دینے کی ضرورت ہے یا نہیں، یہ آپ کا محکمانہ معاملہ ہے۔آپ اس کو زیادہ بہتر سمجھتے ہیں لیکن آپ نے مجھے کیوں بلایا ہے؟'' وہ میرے سوال پر پریشان ہو گئے اور کہنے لگے،''میں نے محض یہ سوچا تھا کہ تمہیں بھی آگاہ کر دوں۔''

معاملہ بہت واضح تھا۔وہ مجھے اس بات سے آگاہ کرنا چاہتے تھے کہ میرے سسر کی ملازمت میں توسیع کے ذمہ دار وہ ہیں۔انہوں نے صدر کے پاس فائل بھیج دی تھی۔لیکن میں نے ان سے درخواست کی کہ کسی قسم کی توسیع نہ دی جائے۔میں نے یہ دلیل دی کہ موجودہ حکومت کی عمومی پالیسی اس قسم کی توسیع کے خلاف ہے۔لہٰذا میرے سسر کو توسیع دینا مناسب نہیں ہوگا۔

180۔صدر کے گرد خوشامدی اور چاپلوس گھیرا ڈالنا چاہ رہے تھے

ایک اور موقع پر میں نے سٹیٹ بینک کے گورنر کے ایک نمائندے کو نئے کرنسی نوٹوں پر جو جلد ہی چھپنے والے تھے صدر کھنڈ کر مشتاق احمد کی تصویر لگانے کے لیے پُرزور دلالت کرتے ہوئے پایا۔میں خاموش نہ رہ سکا اور اس سے پوچھا،''سر، آپ ایک عبوری صدر کی تصویر نوٹوں پر چھاپنے کے لیے اس قدر بے چین کیوں ہو رہے ہیں؟'' ظاہر ہے کہ اُس کے پاس اِس بات کا کوئی جواب نہ تھا۔

ایک دن کچھ سیاست دان اور بیوروکریٹس ایک فضول سی بات پر بڑے جوش و خروش سے بحث کر رہے تھے۔موضوع قومی لباس تھا۔جیسا کہ ہمارا کوئی رسمی قومی لباس نہیں ہے، لہٰذا یہ ضرور ہونا چاہیے۔وہاں موجود اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ لباس چاہے جو بھی منتخب کیا جائے، مشتاق برانڈ ٹوپی ضرور شامل کرنی چاہیے۔مجھے یہ بات تو سمجھ میں آ رہی تھی کہ مسلمان ہونے کے حوالے سے سر ڈھانپنے کے لیے کوئی چیز ضرور ہونی

چاہیے لیکن مشتاق برانڈ ٹوپی ہی کیوں؟ یہ بات میری سمجھ سے باہر تھی۔ ہم معاشرے میں چاروں طرف اخلاقی گراوٹ اور تنزلی کو سرایت کرتا ہوا دیکھ سکتے ہیں۔ اقدار بڑی تیزی سے ان پڑھ اور پڑھے لکھے دونوں طبقوں میں سے تباہ ہو رہی ہیں۔ اس بربادی سے قوم کو بچانا اوّلین ترجیح ہونا چاہیے۔ تاریخ نے ہمارے کندھوں پر یہ ذمہ داری ڈالی تھی کہ ناممکن کو امکان میں تبدیل کرنے کے لیے تطہیر کے عمل کا آغاز کریں۔ اس سلسلے میں ہم اپنی بہترین کوششیں کرنے کے پابند تھے لیکن یقین سے نہیں کہہ سکتے تھے کہ ہم کس قدر کامیابی حاصل کر سکیں گے۔ یہ سب کچھ سوچتے ہوئے میں نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

دوسرے روز صبح معمول کے مطابق تقریباً 6 بجے کے قریب میں بیدار ہوا۔ میں دن کا آغاز کرنے کے لیے تیاری کر رہا تھا کہ ملازم اندر آیا اور کہا کہ صدر صاحب ناشتے پر میرا انتظار کر رہے ہیں۔ میں کمرے میں داخل ہوا تو میں نے وہاں تقریباً تمام عملے کو موجود پایا۔ میرا خیال تھا کہ صدر مجھ سے پوچھیں گے کہ کل رات کیا ہوا تھا۔ لیکن انہوں نے اس بارے میں ایک بات نہ کی بلکہ انہوں نے کہا، ''بیٹو! آپ سب میں سے کون کون کمیونسٹ ہیں؟''

وہ تیز نگاہوں سے ہم سب کا مشاہدہ کر رہے تھے جب کہ ہم کھانے میں مصروف تھے۔ ان کے چہرے پر ایک پراسراری مسکراہٹ تھی۔ ہم میں سے کسی نے بھی کچھ نہ کہا۔ انہوں نے دوبارہ خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا، ''جو کوئی بھی ہے، اسے علم ہونا چاہیے کہ میں خود نمبر ایک کمیونسٹ ہوں۔''

اس کے بعد ہم میں مزید کوئی بات نہ ہوئی۔ ناشتہ ختم ہونے کے بعد ہم سب باہر آ گئے۔ میں سوچ رہا تھا کہ انہوں نے ایسا کیوں کہا؟ کیا انہیں ہم میں سے کسی کے قوم پرست اور ترقی پسند جماعتوں اور ان کے ارکان کے ساتھ رابطوں کا علم ہو گیا ہے؟ یا وہ محض اپنے آپ کو ایک ترقی پسند شخص ظاہر کرنا چاہتے ہیں؟ میں سمجھ نہ سکا۔

181۔ آخر کار، الٹی میٹم

اکتوبر کے آخر میں ایک سہ پہر کو میجر نور مجھے ملنے کے لیے آیا۔

''کیا بات ہے نور، تم پریشان نظر آ رہے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''سر بہت پریشانی والی بات ہے۔ میں پچھلے دو دنوں سے میجر حفیظ اور کیپٹن اقبال کے ساتھ ہوں۔ وہ اپنے اس خیال پر مضبوطی سے قائم ہیں کہ میجر جنرل ضیا الرحمٰن کو ان کے عہدے سے ہٹا دینا چاہیے۔ وہ اس بات کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کوئی بھی قدم اٹھانے کو تیار ہیں اور انہوں نے آخری مرتبہ ہمیں اپنی تجویز کے ساتھ متفق ہونے کی درخواست کی ہے۔'' میجر نور نے کہا۔

آخر کار یہ بات واضح ہو گئی کہ مقررہ دن قریب آن پہنچا ہے۔ بریگیڈیئر خالد نے کسی طرح سے میجر حفیظ اور کیپٹن اقبال کو اپنے ساتھ شامل کر لیا تھا جو میجر جنرل ضیا الرحمٰن سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے

اس کے ساتھ کام کرنے کو تیار تھے۔ کیپٹن اقبال کا 1 بنگال رجمنٹ میں بہت زیادہ اثر ورسوخ تھا۔ بریگیڈیئر خالد کو یقین ہو چکا تھا کہ وہ میجر حفیظ اور کیپٹن اقبال کے ذریعے اس رجمنٹ کو بے اثر کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ 4 بنگال رجمنٹ کے بارے میں بھی خیال کیا جاتا تھا کہ وہ ان کے پیچھے کھڑی ہے۔ لہٰذا وہ 1 بنگال رجمنٹ پر قابو پاکر کارروائی کا آغاز کر سکتے ہیں۔ جہاں تک میں سمجھ سکتا تھا، اُن کا یہی منصوبہ تھا۔ میجر نور بھی انہی خدشات کا اظہار کر رہا تھا۔

میں نے انتہائی پریشانی کے عالم میں میجر نور سے کہا، ''وہ جو چاہیں کر سکتے ہیں۔ ہوسکتا ہے ہم انہیں روکنے کے قابل نہ ہوں لیکن یقیناً میں ان کی سوچ کے مطابق نہیں جاؤں گا۔ تم میرا یہ فیصلہ ان تک پہنچا سکتے ہو۔''

''میں آپ سے پوری طرح متفق ہوں، سر۔ ہم کسی بھی ایسی سازش میں فریق نہیں بن سکتے جس میں قوم کے لیے کوئی بہتری موجود نہ ہو اور جو 15 اگست کے انقلاب کی روح کے منافی ہو۔ بہتر ہے کہ آپ میجر جنرل ضیاالرحمٰن کو صورت حال کی گمبھیرتا سے آگاہ کریں اور آنے والے امکانات کے بارے میں انہیں متنبہ کر دیں۔'' میجر نور نے کہا۔

182۔ میجر جنرل ضیاالرحمٰن سے آخری ملاقات

اسی شام کو میں میجر جنرل ضیا کے پاس پہنچ گیا۔ ہم دونوں ہرے بھرے لان میں بیٹھ گئے۔

''سر، آپ کی چھاؤنی کا کیا حال ہے؟'' میں نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے پوچھا۔

''خالد اور شفاعت کی گستاخیاں اب برداشت سے باہر ہو چکی ہیں۔ مجھے ان کی غیر قانونی سرگرمیوں کی ساری اطلاعات ملتی رہتی ہیں۔ صورتِ حال بہت پریشان کن ہو چکی ہے۔'' میجر جنرل ضیا نے کہا۔

''مجھے معلوم ہوا ہے کہ بریگیڈیئر خالد 1 بنگال پر اپنے ہاتھ ڈالنے کی کوشش کر رہا ہے۔ آپ کو اس بارے میں محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ اگر وہ یہ کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو وہ کچھ بھی کرنے کا فیصلہ کر سکتا ہے۔'' میں نے پیغام پہنچانے کی کوشش کی۔

''پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ 1 ایف ڈی رجمنٹ کا ہراول دستہ یہاں پہنچ چکا ہے۔ چند دنوں میں کومیلا سے پوری رجمنٹ یہاں پہنچ جائے گی۔ 1 بنگال کے بارے میں پریشانی کی کوئی وجہ نہیں، یہ میری بٹالین ہے۔ مزید برآں میجر حفیظ اور کیپٹن اقبال پہلے ہی وہاں موجود ہیں۔ خالد 1 بنگال پر کیسے ہاتھ ڈال سکتا ہے۔'' معمول کی خوداعتمادی کے ساتھ میجر جنرل ضیا نے جواب دیا۔

میں مزید کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ نہ ہی میں انہیں یہ بتا سکا کہ میجر حفیظ اور کیپٹن اقبال کیا سوچ رہے ہیں۔ تاہم میں نے کہا، ''پھر بھی ہمیشہ ہوشیار رہنا بہتر ہوتا ہے، جیسا کہ صورتِ حال بہت زیادہ تشویش ناک

ہے۔ سر، آپ کو بہت زیادہ محتاط رہنا چاہیے۔ برسبیل تذکرہ، ہماری تعیناتی کے احکام کیوں نہیں آرہے؟ ایم ایس برانچ کیوں انہیں دبائے بیٹھی ہے؟ اس دھماکہ خیز صورتِ حال پر قابو پانے کے لیے ضروری ہے کہ منصوبے کے مطابق ہماری تعیناتی ہو جائے۔ آپ کو مزید تاخیر کے بغیر اسے یقینی بنانا چاہیے۔''

لیکن ان کی سوچیں کہیں اور پہنچی ہوئی تھیں۔ مجھے ان کے چہرے کے تاثرات سے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ خوف زدہ اور پریشان ہیں کیوں کہ میں انہیں بہت قریب سے اور لمبے عرصے سے جانتا تھا۔ ان کے تاثرات میرے لیے جانے پہچانے تھے۔ 2 اور 3 نومبر 1975ء کی فیصلہ کن رات سے پہلے میری میجر جنرل ضیاالرحمٰن کے ساتھ یہ آخری ملاقات تھی۔

183۔ 3 نومبر کی انقلاب مخالف شورش

اب ہم 2 اور 3 نومبر 1975ء کی جانب آتے ہیں۔ میری مصروفیات نے مجھے کافی عرصہ سے گھر نہیں جانے دیا تھا۔ لہٰذا 2 نومبر کو دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد میں نے تھوڑی دیر کے لیے مالی باغ جانے کا فیصلہ کیا۔ میں مالی باغ پہنچا تو ہر فرد مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ شام کو میں اور نمی، مینو پھوپھو کا حال پوچھنے کے لیے چھاؤنی گئے۔ ہم نے رات کو کھانا وہیں کھایا اور کافی رات گئے واپس آئے۔ اچانک نمی نے کہا کہ وہ آج رات میرے پاس رہنا چاہتی ہے، لہٰذا میں نے اسے بنگا بھوَن لے جانے کا فیصلہ کیا۔ 15 اگست کے بعد میں بہ مشکل ہی اسے کوئی وقت دے پایا تھا۔ ہم بنگا بھوَن آ گئے۔ جیسے ہی میں اپنے کمرے تک پہنچا حوالدار ہاشم آیا اور کہنے لگا، ''سر، میجر حفیظ اور کیپٹن اقبال نے 1 بنگال رجمنٹ کے گارڈز کو ہٹا دیا ہے اور لیفٹیننٹ کرنل رشید اور لیفٹیننٹ کرنل فاروق، صدر سے ملاقات کر رہے ہیں۔''

یہ خبر مایوس کن تھی لیکن غیر متوقع نہیں تھی اور جو کچھ گزشتہ دو دنوں سے ہو رہا تھا۔ یہ اس کا ایک منطقی نتیجہ تھا۔ میں نے نمی کو کمرے میں انتظار کرنے کو کہا اور تیزی کے ساتھ صدر کے کمرے کی طرف گیا۔ صدر کھنڈکر مشتاق احمد صوفے پر رنجیدہ اور جھنجھلاہٹ کے عالم میں بیٹھے ہوئے تھے۔ لیفٹیننٹ کرنل رشید سرخ فون پر کسی سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیفٹیننٹ کرنل فاروق ایک دوسرے صوفے پر خاموش بیٹھے تھے۔

''کیا ہو رہا ہے؟'' میں نے لیفٹیننٹ کرنل رشید سے پوچھا۔

''جس بات کا احتمال تھا، وہ ہو چکی ہے۔ تمہارے اچھے دوستوں حفیظ اور اقبال نے بنگا بھوَن سے 1 فرسٹ بنگال کے گارڈز ہٹا لیے ہیں اور ابھی تک ان کی جگہ لینے کے لیے کوئی بھی نہیں پہنچا۔ چھاؤنی میں غیر معمولی سرگرمیاں جاری ہیں۔ ابھی تک کچھ واضح نہیں ہے۔ چیف، سی جی ایس اور بریگیڈ کمانڈر کوئی بھی فون پر دستیاب نہیں ہیں۔ میں نے جنرل عثمانی سے رابطہ کیا ہے وہ راستے میں ہیں۔ وہ ٹھیک طور پر نہیں کہہ سکتے کہ چھاؤنی میں کیا ہو رہا ہے۔ انہوں نے میجر جنرل خلیل کو دو بی ڈی آر کمپنیاں جس قدر جلدی ممکن ہو سکے، بنگا بھوَن بھجوانے کو کہا ہے۔''

میرے ساتھ بات ختم کرنے کے بعد انہوں نے لیفٹیننٹ کرنل فاروق سے ریس کورس اپنے ہیڈ کوارٹرز جانے کو کہا۔ اس موقع پر میں نے کہا، ''ٹھیک ہے فاروق، آپ ریس کورس جائیں لیکن اپنے ٹینک اور فوجیوں کو حرکت میں نہ لائیں۔ پہلے ہمیں یقینی طور پر جان لینا چاہیے کہ کیا ہو رہا ہے، پھر ہم فیصلہ کریں گے کہ کیا کرنا ہے۔ سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ آیا اس تعطل کو ہم پُر امن طور پر گفت وشنید کے ذریعے حل کر سکتے ہیں یا نہیں۔ اس مقصد کے لیے میں چھاؤنی جاؤں گا۔ لیکن میرے واپس آنے تک آپ کو کسی بھی قسم کی کارروائی سے باز رہنا ہوگا۔'' لیفٹیننٹ کرنل رشید اور فاروق دونوں نے اس بات پر اتفاق کیا۔ اس دوران میجر شہریار اور کیپٹن ہدیٰ بھی ہمارے پاس پہنچ چکے تھے۔

میجر شہریار کو ریڈیو بنگلہ دیش کے کنٹرول روم جانے کے لیے کہا گیا۔ کیپٹن ہدیٰ کو بنگا بھون میں جنرل عثمانی اور لیفٹیننٹ کرنل رشید کی معاونت کے لیے رکھا گیا۔ باقی تمام کو اپنے دستوں میں پوزیشنیں سنبھالنے کے لیے بھیج دیا گیا۔

184۔ امن کی تلاش میں

جب میں باہر آ رہا تھا تو لیفٹیننٹ کرنل رشید نے کہا، ''ڈالیم دوبارہ سوچ لو کہ کیا اس وقت تمہارا چھاؤنی جانا تمہارے لیے محفوظ ہوگا یا نہیں؟''

یہ بات درست تھی کہ یہ انتہائی خطرناک عمل تھا لیکن میں نے جواب دیا، ''ملک اور قوم کو بچانے کے لیے کسی کو یہ جھگڑا چکانا ہی ہوگا۔''

میں اپنے کمرے میں واپس آیا، نمی صورت حال کی گمبھیرتا کو سمجھ چکی تھی اور قدرے گھبرائی ہوئی تھی۔ ''اب کیا ہو رہا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''تم ڈرائیور کو لو اور بنگا بھون سے کسی محفوظ جگہ پہنچ جاؤ کوئی اعتبار نہیں کہ حالات کس طرف پلٹا کھاتے ہیں۔ جو بھی ہوتا ہے اگر میں زندہ بچ گیا تو ہم دوبارہ ملیں گے۔'' میں نے ڈرائیور کو بلایا اور اسے کہا کہ نمی جہاں بھی جانا چاہتی ہو، اسے لے جاؤ۔ نمی مجھے تنہا چھوڑ کر جانے سے ہچکچا رہی تھی لیکن میں نے اصرار کیا اور وہ ایک غیر یقینی مستقبل کی جانب روانہ ہوگئی۔

جاتے ہوئے اس نے محض اتنا کہا، ''دھیان رکھنا، اللہ آپ کی حفاظت کرے۔''

اُس کے جانے کے بعد میں نے اپنا یونیفارم پہنا اور اپنے محافظ اور وائرلیس آپریٹر کو ساتھ لیا اور بنگا بھون سے روانہ ہوگیا۔ سب سے پہلے میں مسٹر معظم حسین کی رہائش گاہ اعظم پور گیا۔ میجر نور وہاں تھا۔ تازہ ترین صورتِ حال سے آگاہ کرتے ہوئے میں نے اسے اپنے ساتھ لے لیا۔ ساری بات سننے کے بعد میجر نور نے کہا، ''خون خرابہ روکنے کے لیے ضروری ہے کہ میجر حفیظ، کیپٹن اقبال اور بریگیڈیئر خالد سے براہِ راست رابطہ کیا جائے۔ دوسرا کوئی متبادل نہیں ہے۔'' میں نے میجر نور سے مکمل اتفاق کیا۔ ہم نے معروضی صورتِ

حال جاننے کے لیے چھاؤنی کی طرف جانے سے پہلے شہر کا ایک چکر لگانے کا فیصلہ کیا۔

ہم یونیورسٹی کے علاقے فُلر روڈ پر پروفیسر عبدالرزاق کی رہائش گاہ پر گئے۔ میری بہن مہوا، میرا بہنوئی رِلٹو یہاں رہتے تھے۔ ہمارا مقصد کچھ سویلین کپڑے حاصل کرنا تھا۔ انہیں جگا کر ہم نے ساری صورتِ حال سے آگاہ کیا اور وردیاں تبدیل کرنے کے لیے رِلٹو کے کچھ کپڑے حاصل کیے۔ مہوا نے پوچھا کہ نمی کہاں ہے؟ میں نے کہا کہ میرے اصرار پر وہ بنگا بھوَن سے کسی محفوظ جگہ چلی گئی ہے۔ میں نے مہوا سے کہا کہ وہ تمام قریبی رشتہ داروں کو صورتِ حال سے آگاہ کردے اور پھر مہوا اور رلٹو کو خدا حافظ کہہ کر باہر نکل آیا۔

ہم نے شہر کا چکر لگانا شروع کر دیا۔ یونیورسٹی کے علاقے سے گزرتے ہوئے ہم نے فیل خانہ، نیو مارکیٹ، سیکنڈ کیپٹل، ایئرپورٹ، رام پورا انڈسٹریل ایریا کا چکر کاٹا، کہیں بھی ہمیں غیر معمولی صورتِ حال نظر نہ آئی۔ ہمیں صرف چیک پوسٹیں نظر آئیں جہاں ہمارے آدمی تعینات تھے۔ ہمیں اہم مقامات پر کھڑے کیے گئے اپنے ٹینک بھی نظر آئے۔ اس طوفانی دورے کے بعد ہم ریڈیو سٹیشن پہنچے۔ کنٹرول روم میں میجر شہریار فون پر کسی سے بات کر رہے تھے۔ ہمیں دیکھ کر انہوں نے اپنی گفتگو مختصر کر کے فون بند کیا اور پوچھا کہ کیا صورتِ حال ہے؟ جو کچھ ہم نے دیکھا تھا، اسے آگاہ کیا۔ میجر شہریار نے بتایا کہ انہیں بھی مختلف ذرائع سے ایسی ہی اطلاعات ملی ہیں۔

اس نے بتایا کہ بعض نامعلوم وجوہات کی بنا پر ساور بوسٹر سٹیشن کام نہیں کر رہا تھا۔ وہاں کوئی مسئلہ ہے۔ اس سے ریڈیو اور ٹی وی دونوں کی ٹرانسمشن متاثر ہو رہی ہیں۔ پھر میں نے میجر شہریار کو بتایا کہ میں اور نور کسی خوں ریز جھڑپ سے بچنے کے لیے چھاؤنی جا رہے ہیں تاکہ ''ہمسائے'' کو مداخلت کا کوئی موقع نہ مل سکے۔ ریڈیو سٹیشن جانے سے قبل ہم میری پھوپھو بیوا کے گھر شانتا نگر گئے۔ میں ان کے گھر سے کچھ اہم فون کرنا چاہتا تھا۔ لیکن بدقسمتی سے فون خراب تھا۔ لہٰذا میرے پھوپھا مسٹر ایمان علی جو ایک پولیس آفیسر تھے، مجھے نزدیک ہی اپنے ایک ساتھی کے گھر لے گئے۔ میں نے اس گھر سے فون کیے۔ میں فوجی کونسل کے کچھ رہنماؤں سے رابطہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ لیکن ان میں سے اکثر ان واقعات سے لاعلم تھے۔ میں نے انہیں صورتِ حال سے آگاہ کیا اور کسی قسم کی انقلاب مخالف سرگرمیوں کے خلاف ہوشیار اور تیار رہنے کو کہا، جو کسی وقت بھی شروع ہو سکتی تھیں۔ پھر میں نے جنرل ضیاالرحمٰن سے رابطہ کرنے کی کوشش کی۔ ڈائلنگ ٹون سے میں نے اندازہ لگایا کہ ان کا فون کام نہیں کر رہا۔ میجر شہریار نے بھی ہمیں بتایا تھا کہ بار بار کی کوششوں کے باوجود وہ میجر جنرل ضیا کے ساتھ رابطہ نہیں کر سکے تھے۔

ریڈیو سٹیشن سے ہم چھاؤنی کے لیے روانہ ہوئے۔ ایئرپورٹ سے گزرنے کے بعد ہم نے فوجیوں سے بھرے ہوئے دو ٹرک چھاؤنی کے گیٹ کے سامنے سڑک کے کنارے کھڑے ہوئے دیکھے۔ وہ بنگال رجمنٹ سے تھے۔ میں نے دستے کے کمانڈر سے پوچھا کہ وہ وہاں کیوں کھڑے ہیں۔ صوبے دار نے کہا، ''کل کچھ بکسال نواز مظاہروں کا خدشہ ہے لہٰذا امن وامان کی صورتِ حال کو قائم رکھنے کے لیے ہمیں ایئر

پورٹ کے گرد پوزیشن سنبھالنے کا حکم ملا ہے۔'' اس کے جواب سے میں نے اندازہ لگایا کہ بریگیڈیئر خالد اینڈ کمپنی نے فوجیوں کی جانب سے کسی قسم کے انکار کے خطرے کے پیشِ نظر انہیں ان کی تعیناتی کی اصل وجہ نہیں بتائی۔ فوجیوں کو انقلاب مخالف بغاوت کے بارے میں نہیں بتایا گیا تھا۔ وہ انہیں یہ بتانے سے خوف زدہ تھے کہ میجر جنرل ضیاالرحمٰن کو حراست میں لے لیا گیا ہے اور یہ کارروائی کھنڈکر مشتاق احمد کی مقبول عوامی حکومت کے خلاف کی جارہی ہے۔ انہیں حقائق اس لیے چھپانے پڑے تھے کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ فوج کی اکثریت موجودہ حکومت کے خلاف کسی قدم کی حمایت نہیں کرے گی۔

گیٹ پر فوجیوں سے بات چیت کرنے کے بعد میری خود اعتمادی میں اضافہ ہوا اور میرا حوصلہ بحال ہو گیا۔ خوں ریز جھڑپ سے بچا جا سکتا تھا۔ سب سے پہلے میں بریگیڈیئر خالد کی رہائش گاہ پر گیا، وہ گھر پر نہیں تھے۔ ہمیں بتایا گیا کہ وہ آرمی ہیڈ کوارٹرز میں ہیں۔ یہاں سے ہم اے ایچ کیو گئے۔ وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ پورا اے ایچ کیو بغیر ڈیوٹی آفیسر، سٹاف اور گارڈز کے خاموش پڑا تھا۔ وہاں سے ہم میجر حفیظ کی رہائش گاہ پر گئے۔ وہ بھی گھر پر نہیں تھے۔ کیپٹن اقبال بھی دستیاب نہیں تھا۔ کرنل شفاعت بھی اپنے گھر پر نہیں ملے اور نہ ہی چیف کے گھر کے باہر کوئی غیر معمولی بات نظر آئی۔ پھر ہم بریگیڈ ہیڈ کوارٹرز گئے۔ ان میں سے کوئی بھی وہاں موجود نہ تھا۔

یہاں سے ہم جیسے ہی 2 ایف ڈی رجمنٹ آرٹلری کے گیٹ پر پہنچے تو وہاں ہم نے بہت سرگرمیاں دیکھیں۔ ہمیں بتایا گیا کہ آدھی رات کے بعد سے 4 بنگال نے آر آر (recoillus riffles) سے مسلح اپنے فوجیوں کو 2 ایف ڈی رجمنٹ کی جانب رخ کر کے صف آراء کر رکھا ہے۔ اس نے رجمنٹ میں اضطراب پیدا کر دیا ہے۔ وہ بھی جوابی کارروائی کی تیاری کر رہے ہیں۔ یہ دونوں یونٹیں ایک دوسرے کے آمنے سامنے واقع تھیں۔ کوئی اضطراری حرکت ایک دھماکے کی صورت اختیار کر سکتی تھی۔ میں نے فوجی کونسل کے اہم رکان کو فون کیا اور صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ میں نے انہیں برانگیختہ نہ ہونے کو کہا اور کسی بھی اشتعال انگیزی کے خلاف پُرامن اور ہوشیار رہنے کو کہا۔ میں نے انہیں یہ بھی بتایا کہ میں بریگیڈیئر خالد اور کرنل شفاعت سے ملنے کے لیے جا رہا ہوں تا کہ مسئلے کو گفت وشنید کے ذریعے حل کیا جا سکے۔ میں نے انہیں یقین دہانی کروائی کہ بریگیڈیئر خالد اور کرنل شفاعت سے میری بات چیت ہونے کے بعد 4 بنگال کی جانب سے تمام اشتعال انگیز کارروائیاں رک جائیں گی۔

185۔ تاریخی آمنا سامنا

2 ایف ڈی رجمنٹ آرٹلری سے نور اور میں 4 بنگال ہیڈ کوارٹرز گئے جیسے ہی گیٹ سے اندر داخل ہوئے ہم نے وہاں بہت زیادہ سرگرمیاں اور بھاگ دوڑ دیکھی۔ فوجی جنگی لباس میں کھڑے تھے۔ جیسے ہی ہم نیچے اترے میں نے کیپٹن کبیر کو کندھے پر شارٹ مشین گن لٹکائے تیزی سے بھاگتے دوڑتے ہوئے دیکھا۔

میں نے اسے پوچھا کہ بریگیڈیئر خالد اور کرنل شفاعت کہاں ہیں؟

''وہ سب یہاں موجود ہیں، سر۔'' کیپٹن کبیر نے جواب دیا۔ میں نے لانسرز کے کیپٹن ناصر کو آتے دیکھا۔ وہ آگے آیا اور کہا، ''خوش آمدید سر، خوش آمدید!'' اس نے ملانے کے لیے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ میں اور نور دونوں قدرے پریشان تھے۔ اس نے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا، ''سر، ہم مشتاق یا میجر جنرل ضیا کے ذریعے کچھ بھی حاصل نہیں کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ان کو ہٹانا چاہتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ دونوں بھی ہمارا ساتھ دیں گے۔''

میں نے بات کاٹتے ہوئے کہا، ''بریگیڈیئر خالد اور کرنل شفاعت کہاں ہیں؟''

''وہ دونوں یہاں ہیں سر، میجر حفیظ اور کیپٹن اقبال بھی یہاں موجود ہیں۔'' کیپٹن ناصر نے اطلاع دی۔

''ناصر میرا ایک کام کرو، جاؤ اور حفیظ سے کہو کہ میں اس سے بات کرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے اسے کہا۔ ''میں ایک منٹ میں جاتا ہوں سر، برائے مہربانی آپ ایجوٹنٹ کے دفتر میں انتظار کریں۔'' کیپٹن ناصر، میجر حفیظ کو بلانے چلا گیا۔

جیسے ہی ہم ایجوٹنٹ کے دفتر میں داخل ہوئے ہم نے لیفٹیننٹ کرنل امین الحق اور لیفٹیننٹ اسلام چوہدری کو (بعد میں بالترتیب بریگیڈیئر اور لیفٹیننٹ کرنل) وہاں مایوسی کے عالم میں بیٹھے دیکھا۔

''سر، کیا معاملہ ہے؟ آپ یہاں کیوں ہیں؟'' میں نے لیفٹیننٹ کرنل امین الحق سے پوچھا۔

''تم بہتر طور پر سمجھ سکتے ہو کہ کمانڈنگ آفیسر ہوتے ہوئے میرے یہاں اس حالت میں ہونے کا کیا مطلب ہے۔'' انہوں نے جواب دیا۔

ہم سمجھ گئے۔ 4 بنگال کے کمانڈنگ آفیسر اور ایجوٹنٹ کو غیر مسلح کر کے یہاں حراست میں رکھا گیا تھا جیسا کہ انہیں قابل اعتبار خیال نہیں کیا جا رہا تھا۔ جلد ہی میجر حفیظ اور کیپٹن اقبال بھی وہاں آ گئے۔ وہ مجھے اور نور کو دوسرے کمرے میں لے گئے۔

''حفیظ تم نے یہ کیا کیا ہے۔ آخر کار تم نے وہی غیر ذمہ دارانہ قدم اٹھا ہی لیا ہے، جس کا مجھے خدشہ تھا۔ بہت افسوس ناک بات ہے۔'' میں نے حفیظ سے کہا۔

''آپ اسے ایک غیر ذمہ دارانہ قدم کیوں کہہ رہے ہیں؟ مشتاق اور ضیا دونوں ہمارے پروگرام کو نافذ کرنے کے قابل نہیں۔ آپ اچھی طرح جانتے ہیں، پھر آپ تسلیم کیوں نہیں کر رہے؟'' میجر حفیظ نے مجھ پر حملہ کیا۔ ''وہ ہمارے انقلاب سے غداری کر رہے ہیں۔ ہم نے انہیں مسترد کر دیا ہے۔ عوامی یکساں وادیوں کی پارلیمنٹ کو تحلیل کرنے کی ضرورت ہے۔ امید ہے کہ آپ، نور، پاشا، شہریار، ہدیٰ، راشد اور فوجی کونسل ہمارے ساتھ شامل ہو کر ہمارے ہاتھ مضبوط کریں گے۔'' میجر حفیظ نے کہا۔

''دیکھو حفیظ! میں پہلے بھی تسلیم کر چکا ہوں اور اب بھی کہہ رہا ہوں کہ ہمارے پروگرام کا نفاذ

مطلوبہ رفتار سے نہیں کیا جارہا اور اس کے لیے صدر مشتاق اور میجر جنرل ضیا کی ''آہستہ چلو'' کی حکمت عملی کافی حد تک ذمہ دار ہے۔ لیکن اس کے لیے اس قسم کی اضطراری کارروائی ہمارے لیے قابل قبول نہیں ہے۔ اب جب کہ آپ پہلے ہی نقصان پہنچا چکے ہیں، برائے مہربانی غور سے سنیں کہ ہم یہاں کیوں آئے ہیں۔ ہم اس بات کو یقینی بنانے کے لیے آئے ہیں کہ خون خرابہ نہیں ہونا چاہیے۔ آؤ بریگیڈیئر خالد اور کرنل شفاعت کے پاس جاتے ہیں اور بات چیت کرتے ہیں کہ اس بند گلی سے کیسے باہر نکلا جاسکتا ہے۔''

''ٹھیک ہے، آئیں چلتے ہیں۔'' میجر حفیظ نے کہا۔ جیسے ہی ہم باہر آئے ہم نے بریگیڈیئر خالد، کرنل شفاعت، کیپٹن ناصر، بریگیڈیئر معین الحسن، جے آر بی کے بریگیڈیئر نذرالزمان، کرنل رؤف اور لیفٹیننٹ کرنل مالک کو آفس بلاک کے سامنے آموں کے درختوں کے جھنڈ کے تلے کھڑے ہوئے دیکھا۔ وہ باتوں میں مصروف تھے۔ جیسے ہی ہم وہاں پہنچے انہوں نے اپنی باتیں بند کر دیں۔ میں نے بریگیڈیئر خالد کو سلیوٹ کیا۔ انہوں نے اپنا ہاتھ ملانے کے لیے آگے بڑھایا اور کہا، ''خوش آمدید، خوش آمدید، میں جانتا تھا کہ تم دونوں ضرور آؤ گے۔'' اس سے پہلے کہ وہ کوئی مزید بات کرتے میں نے کہا، ''خالد بھائی، آخر کار آپ نے یہ کر ہی دیا ہے۔''

''میں نے کیا کیا ہے؟ یہ میرا کام نہیں ہے۔ ڈالیم میری بات پر یقین کرو۔ یہ ان کا کام ہے، ان نوجوان آفیسرز کا۔ ان کا خیال ہے کہ ضیا کچھ بھی نہیں دے سکتے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ وہ 15 اگست کے انقلاب کے اہداف حاصل کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں کریں گے اور چیف کی حیثیت سے وہ فوج کے مفادات کے تحفظ کے قابل بھی نہیں ہیں۔ اس لیے یہ تبدیلی چاہتے ہیں۔'' بریگیڈیئر خالد نے بڑی معصومیت سے جواب دیا۔

''اور یہی وجہ ہے کہ اس بحران کو پیدا کیا گیا ہے تاکہ زیادہ مؤثر قیادت مہیا کرنے کے لیے آپ میجر جنرل ضیا کی جگہ لے سکیں؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں، ہرگز نہیں۔ میں چیف نہیں بننا چاہتا۔ تمہیں میری بات پر یقین کرنا چاہیے۔'' بریگیڈیئر خالد نے اپنی معصومیت ثابت کرنے کے لیے کہا۔

تاہم اس دوران کسی نے کہا، ''ہم بریگیڈیئر خالد کی قیادت قبول کرنے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتے۔''

''چھوڑو! خاموش رہو۔'' بریگیڈیئر خالد نے آواز کو دبا دیا۔

''جیسے بھی ہے، سر، میں اور نور یہ یقین دہانی کرنے کے لیے آئے ہیں کہ کوئی خون خرابہ نہیں ہوگا۔ ہم نے لیفٹیننٹ کرنل رشید اور لیفٹیننٹ کرنل فاروق سے کہہ دیا ہے وہ کوئی فوجی یا ٹینک حرکت میں نہیں لائیں گے۔ جب ہم یہاں آرہے تھے تو ہم نے 4 بنگال کی جانب سے بعض اشتعال انگیز کارروائیوں پر 2 ایف ڈی رجمنٹ میں کچھ اضطراب موجود تھا۔ برائے مہربانی 4 بنگال کو پیچھے ہٹنے اور اپنی آر آر ہٹانے کا حکم دیں جو انہوں نے 2 ایف ڈی رجمنٹ آرٹلری کی جانب نصب کر رکھی ہیں۔'' بریگیڈیئر خالد نے کرنل شفاعت کو فوری طور پر 4 بنگال کو پیچھے ہٹانے کا حکم دے دیا۔

اس دوران دن چڑھ چکا تھا۔ میں نے اس بے جواز بحران کے خاتمے کے لیے سکون سے بیٹھ کر بات چیت کرنے کی تجویز پیش کی۔ میری تجویز کو قبول کر لیا گیا۔ ہم سب کمانڈنگ آفیسر کے دفتر میں جا کر بیٹھ گئے۔

میٹنگ کے آغاز سے پہلے میں نے بریگیڈیئر خالد سے میجر جنرل ضیاالرحمٰن کے اتے پتے کے بارے میں جاننا چاہا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ اپنے گھر پر ہیں اور بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں، کچھ لوگ اُن کی حفاظت کر رہے ہیں۔ یہ گھر پر نظر بندی کے لیے نرم الفاظ تھے۔

میں نے بریگیڈیئر خالد سے یقین دہانی طلب کی کہ میجر جنرل ضیا کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔ انہیں محض ان کے عہدے سے ہٹایا جائے گا، اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا جائے گا۔ بریگیڈیئر خالد نے وعدہ دے دیا۔ جیسے ہی میٹنگ کا آغاز ہوا، میں نے بات گھمائے پھرائے بغیر سیدھے الفاظ میں سوال کیا، ''جب ایک مقبول عام حکومت قائم ہے تو پھر اس انقلاب مخالف عمل پر کس بات نے اکسایا ہے؟'' سب لوگ میرے اس براہِ راست سوال پر مکمل خاموش ہو گئے۔ شاید ہر کوئی اس کا کوئی موزوں جواب تلاش کر رہا تھا۔ پھر کرنل شفاعت نے کہنا شروع کیا، ''ہم مشتاق حکومت اور ساتھ ہی موجودہ پارلیمنٹ کا خاتمہ چاہتے ہیں کیوں کہ یہ عوامی بکسال وادیوں کی پارلیمنٹ ہے۔''

''مزید کیا چاہتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''ہم میجر جنرل ضیا کو اپنے چیف کے طور پر نہیں چاہتے۔'' کرنل شفاعت نے کہا۔

''حکومت کون چلائے گا؟'' میں نے سوال کیا۔

''ہم ایک انقلابی کونسل قائم کریں گے۔'' کیپٹن اقبال نے کہا۔ کرنل شفاعت نے اس کی نفی کرتے ہوئے کہا، ''کھنڈکر مشتاق اقتدار چیف جسٹس کے سپرد کریں گے۔''

بریگیڈیئر خالد نے ایک اور تجویز پیش کی۔ انہوں نے کہا، ''تسلسل کو قائم رکھنا چاہیے۔ کھنڈکر مشتاق صدر رہیں گے لیکن تینوں چیفس کو برطرف کرنا ہوگا۔''

مجھے یقین ہو گیا کہ انہوں نے انقلاب کا جوکھم بغیر کسی منصوبے کے شروع کر دیا ہے۔ انہوں نے اس کی تیاری کے لیے کوئی کام نہیں کیا۔ ان میں خیالات اور منصوبہ بندی کا فقدان پایا جاتا تھا۔ اچانک ہم سب ایک جیٹ فائٹر کی نیچی پرواز کی آواز سن کر حیران رہ گئے۔ ''سر، یہ مگ طیارے کیوں پرواز کر رہے ہیں۔ خدا کے لیے ان اشتعال انگیز کارروائیوں کو بند کریں ورنہ لیفٹیننٹ کرنل فاروق کو روکنا مشکل ہو جائے گا۔ وہ چھاؤنی کی جانب اپنے ٹینک لے کے آجائیں گے۔'' بریگیڈیئر خالد نے اے ٹی سی (ایئر ٹریفک کنٹرول) سے فون پر بات کی اور یہ معلوم کر کے کہ یہ سکواڈرن لیڈر لیاقت تھے جو مگ 21 لے کر اوپر چلے گئے تھے۔ انہوں نے اے ٹی سی کے ذریعے سکواڈرن لیڈر لیاقت کو لینڈ کرنے اور 4 بنگال ہیڈکوارٹرز آنے کو کہا۔

اس دوران فیلڈ میس کا بیرا اندر آیا اور کہا کہ ناشتہ لگ چکا ہے۔ ہم سب اٹھ کر ٹی روم میں چلے

گئے۔ رجمنٹ کی کینٹین پر دال پوری اور چائے کا انتظام کیا گیا تھا۔ ناشتے کے بعد جیسے ہی ہم باہر نکلے، ہم نے کرنل مناف کو یونیفارم میں کھڑے دیکھا۔ وہ تیزی سے آگے آئے اور سیلوٹ کرتے ہو کہا: "خالد، آپ باس ہیں اور میں ایک سپاہی کی حیثیت سے آپ کو سیلوٹ پیش کرتا ہوں، اور میں آپ کے ساتھ ہوں۔" وہ ایک دلچسپ کردار تھے انہوں نے بالکل اسی انداز میں 15 اگست کے انقلاب کی حمایت کی تھی۔ شاید وہ ایک قواعد و ضوابط کے پابند آفیسر کی طرح اپنا فرض نبھا رہے تھے۔ تاہم یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ایسے آفیسرز گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے ہوئے کس طرح اپنے ماتحتوں میں عزت و وقار حاصل کر پاتے ہیں؟ ہر کوئی ان کی اس حرکت سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ بریگیڈیئر خالد نے جواب دینا بھی گوارا نہ کیا اور ہمیں کہا، "آئیں، ہمیں اپنی بات چیت جاری رکھنی ہے۔" ان کے چہرے پر ان کی معمول کی مسکراہٹ نظر آ رہی تھی۔ ہم دوبارہ سی او کے دفتر میں بیٹھ گئے۔ کرنل صبیح الدین بھی آ گئے اور ہماری گفتگو میں شامل ہو گئے۔

"دالیم، آپ مجھ پر خواہ مخواہ کی الزام تراشی کر رہے ہیں۔ آج جو کچھ ہوا ہے، میں کسی طور پر بھی اس کا ذمہ دار نہیں ہوں۔ نوجوان آفیسرز کو میجر جنرل ضیا کے ساتھ شکایات ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ان میں قیادت کی صلاحیتیں نہیں ہیں۔ اس لیے انہوں نے انہیں ہٹانے کے لیے کارروائی کا آغاز کیا ہے۔" بڑے ٹھنڈے مزاج سے یہ بات کہتے ہوئے بریگیڈیئر خالد نے میجر حفیظ، کیپٹن اقبال، کرنل شفاعت جمیل، کیپٹن کبیر اور لیفٹیننٹ قادر کی جانب اشارہ کیا، "مجھے یہاں ان کی درخواست پر آنا پڑا ہے۔"

یہ بات بڑی واضح نظر آ رہی تھی کہ بریگیڈیئر خالد اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے بڑی ہوشیاری سے اپنے جونیئرز کے کندھوں پر رکھ کر بندوق چلا رہے تھے۔

"کیا ایک قابل قیادت مہیا کرنے کے لیے آپ میجر جنرل ضیا کی جگہ لے رہے ہیں۔" میں نے دوبارہ پوچھا۔

اس کے جواب میں انہوں نے پوچھا، "کیا تم سمجھتے ہو کہ میں یہاں محض چیف بننے کے لیے آیا ہوں؟"

"میں کچھ بھی نہیں سمجھتا سر، میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آپ کا مقصد کیا ہے؟" میں نے جواب دیا۔ "برائے مہربانی مجھے بتائیں آپ کے مطالبات کیا ہیں۔ جب آپ مجھے بتا دیں گے تو انشاءاللہ ہم اس برزخ سے نکلنے کا کوئی راستہ تلاش کر لیں گے۔"

جیسے ہی میں نے بات ختم کی لانسرز کیپٹن ناصر بول پڑا، "ہاں! ہم بریگیڈیئر خالد کو اپنا چیف بنانا چاہتے ہیں۔" "ہاں! ہاں!" چند نوجوان افسروں نے اس کی تائید کی۔

اس وقت کوئی اندر آیا اور بتایا کہ سکواڈرن لیڈر لیاقت آیا ہے۔ بریگیڈیئر خالد نے اسے اندر آنے کو کہا۔ سکواڈرن لیڈر اندر آیا اور بریگیڈیئر خالد کو سیلوٹ کیا۔

"کیا مسئلہ تھا، کیا مصیبت تھی کہ تم نے ٹیک آف کیا؟" بریگیڈیئر خالد نے پوچھا۔

''سر مجھے اطلاع ملی تھی کہ ریس کورس سے لیفٹیننٹ کرنل فاروق نے اپنے ٹینک سٹارٹ کر لیے ہیں اور وہ چھاؤنی کی طرف آنا چاہتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ میں اوپر چلا گیا۔'' سکواڈرن لیڈر لیاقت نے جواب دیا۔

''دالیم، تم نے کہا تھا کہ تم یہاں خوں ریزی کو روکنے کے لیے آئے ہو۔ لیکن تمہارا ایک ساتھی چھاؤنی پر حملہ کرنے کی کوشش میں ہے۔ کیا یہ تضاد نہیں ہے؟'' بریگیڈیئر خالد مشتعل نظر آ رہے تھے۔

''سر، برائے مہربانی مجھ پر اعتماد کریں۔ مجھے دیکھنے دیں کہ کیا ہو رہا ہے۔ آپ سب کو مطمئن رہنا چاہیے کہ اس قسم کا کوئی حادثہ نہیں ہوگا۔'' میں نے کہا۔

میں لیفٹیننٹ کرنل رشید سے رابطہ کرنے کے لیے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ وہاں میں نے ایئر وائس مارشل تواب اور ریئر ایڈمرل ایم ایچ خان کو دیکھا۔ دونوں خوف زدہ، سہمے ہوئے اور زرد نظر آ رہے تھے۔ مجھے وہاں دیکھ کر انہیں قدرے اطمینان ہوا۔ ایئر وائس مارشل تواب میرے نزدیک آئے اور پوچھا، ''دالیم آپ یہاں کیسے آئے ہو؟ کیا آپ بتا سکتے ہو کہ کیا ہو رہا ہے؟''

میں نے جواب میں کہا، ''سر اطمینان رکھیں اور دیکھیں کیا ہوتا ہے۔'' پھر میں نے لیفٹیننٹ کرنل رشید سے رابطہ کیا۔ ''رشید، میں دالیم بول رہا ہوں۔ 4 بنگال ہیڈ کوارٹرز سے۔ بریگیڈیئر خالد، کرنل شفاعت اور باقی تمام لوگ یہاں ہیں۔ میجر حفیظ اور کیپٹن اقبال بھی یہاں موجود ہیں۔ ایئر مارشل تواب اور ریئر ایڈمرل ایم ایچ خان کو ابھی ابھی یہاں لایا گیا ہے۔ جنرل ضیا اپنی رہائش گاہ پر ہیں۔ میجر نور میرے ساتھ ہے۔ ہم سب اسی معاملے پر بات چیت کر رہے ہیں۔ سکواڈرن لیڈر لیاقت اپنے طیارے کے ساتھ واپس آ چکا ہے۔ اطلاع ملی ہے کہ لیفٹیننٹ کرنل فاروق اپنے ٹینکوں کے ساتھ چھاؤنی کی طرف آنے کی تیاری میں ہیں۔ کوئی ٹینک سٹارٹ نہیں ہونا چاہیے۔ میں ان کے مطالبات کے ساتھ بہت جلد بنگا بھوِن پہنچ رہا ہوں۔ میں نے بریگیڈیئر خالد کو بتایا ہے کہ میں اور نور ملک اور قوم کے عظیم تر مفاد میں کسی بھی قسم کی خوں ریزی روکنے کے لیے اور ساتھ ہی اس بحران کا کوئی پر امن حل تلاش کرنے کے لیے یہاں آئے ہیں۔ لہٰذا آپ اس بات کو یقینی بنائیں کہ ہماری جانب سے کوئی اشتعال انگیزی نہ ہونے پائے۔''

''میں لیفٹیننٹ کرنل فاروق سے رابطہ کرتا ہوں اور اسے کوئی ایسی کارروائی نہ کرنے کو کہوں گا۔'' لیفٹیننٹ کرنل رشید نے جواب دیا اور میں واپس کانفرنس روم میں آ گیا۔

''فکر نہ کریں سر، کرنل فاروق اپنے ٹینک حرکت میں نہیں لائیں گے۔'' میں نے بریگیڈیئر خالد کو بتایا۔

اچانک بریگیڈیئر خالد نے پوچھا، ''ایئر وائس مارشل تواب کہاں ہیں؟''

''وہ یہاں ہیں۔'' کسی نے جواب دیا۔

''انہیں اندر لائیں۔''

ایئر وائس مارشل تواب بظاہر بہت گھبرائے ہوئے اندر آئے۔ انہوں نے چاروں طرف دیکھا

اور بریگیڈیئر خالد سے پوچھا، ''خالد برائے مہربانی مجھے بتائیں کہ ایئر چیف کو اس قدر بے توقیر طریقے سے یہاں کیوں لایا گیا ہے، کیا ہو رہا ہے؟ میری کیا حیثیت ہے؟ کیا میں اب بھی چیف ہوں؟''

انہوں نے بمشکل بات ختم ہی کی تھی کہ سکواڈرن لیڈر لیاقت گرجا، ''منہ بند کرو۔ اب تم چیف نہیں ہو۔ میں نے ایئر فورس کی کمان سنبھال لی ہے۔'' ایئر وائس مارشل تواب محض گنگ ہو کر رہ گئے اور خالی خالی نظروں سے دیکھنے لگے۔ یہ حقیقت میں ایک انتہائی افسوس ناک حالت تھی۔

''انہیں کسی دوسری جگہ بٹھا دیں۔'' بریگیڈیئر خالد نے حکم دیا۔ ایئر وائس مارشل تواب کو کانفرنس روم سے نکال دیا گیا۔ ''والیم ہمارے چار مطالبات ہیں۔'' بریگیڈیئر خالد نے گننے شروع کر دیئے۔

1۔ کھنڈکر مشتاق احمد صدر رہیں گے۔

2۔ تمام چیفس کو فارغ کر دیا جائے گا اور نئے قابل قبول چیفس کو صدر مقرر کریں گے۔

3۔ فوج میں چین آف کمانڈ کو برقرار رکھا جائے گا۔ تمام افواج اور ٹینکوں کو چھاؤنی واپس بھیج دیا جائے گا۔

4۔ موجودہ پارلیمنٹ تحلیل کر دی جائے گی۔ آئین منسوخ کر دیا جائے گا۔ نئی پارلیمنٹ قوم کی خواہشات اور توقعات کے مطابق نیا آئین تشکیل دے گی۔ اُس وقت تک ملک مارشل کے تحت چلایا جائے گا۔

یہ اقتدار پر مرحلہ وار قبضہ کرنے اور ساتھ ہی سیاسی عمل کی بساط کو لپیٹ دینے کے لیے ایک بڑی شاطرانہ چال تھی۔ ان کے مطالبات سننے کے بعد میں نے کہا: ''ٹھیک ہے سر، آئیں صدر سے ان مطالبات پر بات چیت کرنے کے لیے مل کر بنگا بھون جاتے ہیں۔'' بریگیڈیئر خالد میری تجویز پر تھوڑے پریشان نظر آئے، کرنل شفاعت نے ان کی جانب سے جواب دیا۔ ''بریگیڈیئر خالد خود نہیں جائیں گے ان کے نام زَد نمائندے بنگا بھون جائیں گے۔''

میں ہنسا اور بے تکلفانہ انداز میں کہا، ''خالد بھائی، آپ میرے ساتھ بنگا بھون کیوں نہیں جانا چاہتے؟ کیا آپ ڈرتے ہیں؟ دیکھیں، ہم یہاں آپ کے پاس آتے ہوئے نہیں ڈرے۔ تو پھر آپ کیوں ڈرتے ہیں؟ تھوڑی جرأت سے کام لیں۔ ہمیں ایک دوسرے پر اعتماد اور بھروسا ہونا چاہیے۔ انہی بنیادوں پر ہم قوم کو اس غیر متوقع بحران سے نجات دلوا سکتے ہیں۔'' بریگیڈیئر خالد نے کوئی جواب نہ دیا۔ ان کی جانب سے فیصلہ کیا گیا کہ کرنل مناف اور لیفٹیننٹ کرنل مالک میرے ساتھ بنگا بھون جائیں گے۔ میں ان دونوں کے ساتھ بنگا بھون واپس آ گیا۔ سڑکوں پر ہر چیز معمول کے مطابق نظر آ رہی تھی۔ لوگ حسب معمول گھوم پھر رہے تھے۔ بظاہر ماحول پر سکون اور پر امن دکھائی دے رہا تھا۔ لیکن پس پردہ کیسی دھماکہ خیز صورت حال پیدا ہو چکی تھی، ابھی تک لوگ اس سے بالکل بے خبر تھے۔

186۔ بنگا بھون

بنگا بھون کے گیٹ پر مجھے بی ڈی آر کے فوجی کھڑے نظر آئے۔ میجر جنرل خلیل نے مزید دستے

بھجوا دیئے تھے۔ میں نے کرنل مناف اور لیفٹیننٹ کرنل مالک کو ملٹری سیکریٹری کے دفتر میں بٹھایا اور خود صدر سے ملنے کے لیے چلا گیا۔ صدر کے پاس جنرل عثمانی، لیفٹیننٹ کرنل رشید اور کیپٹن ہدیٰ موجود تھے۔ وہ جاننا چاہتے تھے کہ چھاؤنی میں کیا ہو رہا ہے۔ میں نے انہیں ہر بات تفصیل سے بتائی اور انہیں بتایا کہ انقلاب مخالفوں کے نمائندوں کے طور پر کرنل مناف اور لیفٹیننٹ کرنل مالک اپنے مطالبات کے ساتھ آئے ہیں۔ جنرل عثمانی ان دونوں افسروں کو خوب اچھی طرح جانتے تھے۔ یہ نام سنتے ہی انہوں نے انتہائی حیرانی سے کہا، ''یہ کس طرح بریگیڈیئر خالد کا ساتھ دے سکتے ہیں۔''

''سر، انسانی فطرت کو سمجھنا ایک مشکل کام ہے، اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں۔ موجودہ حالات میں ہمارے پاس سوچنے کے لیے زیادہ بڑے مسائل موجود ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

اس پر لیفٹیننٹ کرنل رشید نے مجھے کہا، ''تمہاری کیا رائے ہے؟''

''میرا خیال ہے کہ اوّل تو بریگیڈیئر خالد اور ان کے ساتھی زیادہ عرصہ نہیں گزار سکیں گے۔ طاقت کے حوالے سے ہم 4 بنگال کے ہیڈکوارٹرز میں موجود لوگوں سے زیادہ طاقت وَر ہیں۔ مسلح افواج کے محبِّ وطن ارکان اور عوام جب ان کے منصوبے سے آگاہ ہوں گے تو اسی وقت اسے مسترد کر دیں گے۔ لیکن اپنی برتر طاقت کے باوجود جب تک لوگوں کو ان کے حقیقی ارادوں کا علم نہیں ہو جاتا، اپنی طرف سے ہمیں فوجی کارروائی نہیں کرنا چاہیے۔ اگر ہم ایسا کرتے ہیں تو پھر لوگ اس کو فوج کے دو گروہوں کے درمیان اقتدار کے لیے اندرونی کشمکش خیال کر سکتے ہیں۔ اس سے مسلح افواج تقسیم ہو سکتی ہیں اور پورے ملک میں ایک خوں ریز خانہ جنگی کا آغاز ہو سکتا ہے اور ہمارا ہمسایہ ملک ایسی کسی بھی صورتِ حال سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کر سکتا ہے۔ اس سے پہلے کہ عوام کو اصل صورتِ حال کا علم ہو شکست خوردہ عوامی بکسال وادیوں کا اقتدار ایک مرتبہ پھر بحال ہو جائے گا۔ ہم کسی صورت میں بھی اس کی اجازت نہیں دے سکتے۔

اس کے برعکس مجھے یقین ہے کہ اگر اس وقت ہم کسی عملی لڑائی میں نہیں پڑتے اور ایک طرف ہو جاتے ہیں تو پھر بریگیڈیئر خالد اینڈ کمپنی اپنی کارروائیوں کے ذریعے توقع سے بہت پہلے عوام اور مسلح افواج کے ارکان کی نگاہوں میں ظاہر ہو جائے گی۔ عوام ان کے ارادوں کے بارے میں پوری طرح آگاہ ہو جائیں گے۔ وہ جان جائیں گے کہ جاہ طلب بریگیڈیئر خالد اپنے ذاتی مفادات کے لیے شکست خوردہ قوتوں اور اپنے ہندروسی آقاؤں کے ہاتھوں میں کھلونا بن گیا ہے۔ جب لوگوں کو علم ہو جائے گا کہ ملک کو 15 اگست سے پہلے کے دَور کی جانب لوٹ جانے کے خطرے کا سامنا ہے تو اس وقت اگر ہم اس قوم دشمن گروہ کے خلاف کوئی فوجی کارروائی منظم کرتے ہیں تو عوام اور مسلح افواج کے محبِّ وطن ارکان خود بخود اس قسم کی انقلابی کارروائی کے حق میں اٹھ کھڑے ہوں گے، جیسا کہ اگست کے انقلاب میں ہوا تھا۔ اس صورت میں ہمارے ہمسایہ ملک کی کسی قسم کی براہ راست مداخلت کا جواز نہیں ہوگا۔ اور اگر وہ ایسا کرتا ہے تو پھر پوری قوم اس کے مدمقابل ہوگی، جیسا کہ 15 اگست کے بعد انہوں نے اپنا منصوبہ ترک کر دیا تھا۔

دوئم، میں محسوس کرتا ہوں کہ بریگیڈیئر خالد بڑی ہوشیاری سے لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے صدر کھنڈ کر مشتاق احمد کو سامنے رکھتے ہوئے ہماری افواج کے سربراہان کو ہٹانے کی کوشش کر رہا ہے۔ مسلح افواج کا کنٹرول حاصل کرنے کے بعد وہ صدر کو بھی ہٹا دیں گے اور ان کی اپنی سیاسی قیادت اقتدار پر قابض ہو جائے گی۔ میں خلوصِ دل سے یہ سمجھتا ہوں کہ صدر کو ان کے شیطانی منصوبے کی تکمیل میں کسی قسم کی مدد یا تعاون فراہم نہیں کرنا چاہیے۔ اگر وہ صدر رہتے ہیں تو پھر انہیں 15 اگست کے انقلاب کی روح کے مطابق پورے اختیارات کے ساتھ رہنا ہوگا اور بریگیڈیئر خالد کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی نہیں بننا چاہیے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بات واضح الفاظ میں بریگیڈیئر خالد تک پہنچا دینا چاہیے۔ اگر وہ اس پر متفق نہیں ہوتے تو پھر کھنڈ کر مشتاق احمد کو صدارت چھوڑ دینا چاہیے۔''

میری تجاویز پر غور کیا گیا اور پھر متفقہ طور پر فیصلہ کیا گیا کہ ہمیں کوئی فوجی کارروائی نہیں کرنا چاہیے۔ بریگیڈیئر خالد کے نمائندوں کو ان کے مطالبات کے حوالے سے صدر کا کیا جواب ہونا چاہیے، اس پر بھی فیصلہ کرلیا گیا۔

187۔صدر مشتاق احمد نے اپنے آپ کو ایک لائق مدبر ثابت کردیا

اس کے بعد کرنل مناف اور لیفٹیننٹ کرنل مالک کو اندر بلایا گیا۔ ملٹری سیکریٹری انہیں اندر لایا۔ وہ اندر آئے اور صدر کو سیلوٹ کیا۔ ہم سب لوگ ایک طرف بیٹھے ہوئے تھے، ماحول انتہائی سنجیدہ تھا۔

صدر نے ان سے کہا ''جو کچھ آپ کہنا چاہتے ہیں، کہیں۔''

کرنل مناف نے بریگیڈیئر خالد کی جانب سے پیش کیے گئے چار مطالبات دہرائے اور عزت مآب صدر کا جواب جاننا چاہا۔

صدر مشتاق احمد نے تمام باتیں بڑے تحمل سے سنیں، پھر اپنے مخصوص انداز میں بڑے نپے تلے اور سنجیدہ انداز میں کہا، ''میں نے آپ کی تمام باتیں بڑے تحمل سے سنی ہیں۔ جاؤ اور چھاؤنی میں موجود ان لوگوں کو بتا دو کہ اگر میں صدر رہتا ہوں تو پھر میں اپنی ذمہ داریاں قوم کے بہترین مفاد میں اپنی سوجھ بوجھ کے مطابق نبھاؤں گا۔ میں ایسا سربراہ مملکت ہرگز نہیں رہنا چاہتا، جسے ایک بریگیڈیئر ہدایات دے رہا ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ کمانڈ کا سلسلہ فوری طور پر بحال کیا جائے اور بریگیڈیئر خالد میرے تینوں چیفس آف سٹاف کو فوری طور پر میرے پاس بنگا بھون بھیج دیں۔ خالد کو فوری طور پر ان فوجیوں کو ہٹا دینا چاہیے جنہیں ریلے سٹیشن کو کاٹ دینے کے لیے مقرر کیا گیا ہے تاکہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی نشریات بحال ہو سکیں۔ اگر بریگیڈیئر خالد میرے احکام پر عمل نہیں کرتا تو پھر اسے بتا دیں، وہ بنگا بھون آ جائے اور ملک کا اقتدار سنبھال لے اور جو چاہتا ہے کرتا رہے۔ میں رکشا منگوا کر آغا موسیٰ لین اپنی رہائش گاہ واپس چلا جاؤں گا۔''

188۔ 4 بنگال ہیڈ کوارٹرز دوبارہ واپسی

صدر سے ملاقات کے بعد ہم واپس 4 بنگال ہیڈ کوارٹرز پہنچ گئے۔ بریگیڈیئر خالد اور تمام لوگ ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ کرنل مناف نے صدر سے ہونے والی تمام گفتگو من وعن سنا دی۔ بریگیڈیئر خالد مایوس اور پریشان نظر آنے لگے۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ کھنڈکر مشتاق پر قابو پانا آسان نہیں ہے۔ کسی بھی مقصد کے لیے ان کے کندھوں کو استعمال کرنا ممکن نہ تھا۔ کھنڈکر مشتاق احمد بہت زیادہ ذہین اور تیز فہم انسان تھے، وہ سارے کھیل کو اچھی طرح سمجھتے تھے اور انہوں نے اس کے ہاتھوں میں کھیلنے سے انکار کر دیا تھا۔

بریگیڈیئر خالد کے باقی ماندہ ساتھی سخت غصے میں آ گئے۔ کرنل شفاعت نے کہا، ''انہوں نے ایسی باتیں کرنے کی کیسے جرأت کی؟''

''ٹھیک ہے، ہم دیکھیں گے کہ اب کیا کرنا ہے۔'' بریگیڈیئر خالد نے کہا اور کرنل شفاعت، بریگیڈیئر نذرالزمان، میجر حفیظ، کیپٹن اقبال اور سکواڈرن لیڈر لیاقت کو بند کمرے میں اجلاس کا اشارہ کیا تاکہ اگلے قدم کے بارے میں فیصلہ کیا جا سکے۔ وہ سارے ایک دوسرے کمرے میں چلے گئے اور اپنا علیحدہ اجلاس شروع کر دیا۔ تقریباً 15 یا 20 منٹ بعد وہ سب واپس آ گئے۔

''دالیم جیسا کہ کھنڈکر مشتاق احمد ہماری شرائط ماننے پر تیار نہیں ہیں تو اس صورت میں اقتدار چیف جسٹس صائم کو منتقل کرنا ہوگا۔'' بریگیڈیئر خالد نے کہا۔

''جسٹس صائم کو اقتدار سونپنا آئینی دفعات کے خلاف ہوگا۔ علاوہ ازیں کیا جسٹس صائم ایک قانون دان ہونے کی حیثیت سے اس قسم کے انتقال اقتدار کو قبول کر لیں گے؟'' میں نے بریگیڈیئر خالد سے سوال کیا۔

''ٹھیک ہے، کسی نہ کسی طرح اس انتقال اقتدار کو قانونی شکل دینا ہوگی۔ جسٹس صائم کو قائل کرنا میرا کام ہے۔'' بریگیڈیئر خالد نے کہا۔ ان کے اصرار سے یہ بات واضح ہو گئی کہ وہ کسی مجبوری کی وجہ سے جسٹس صائم کو صدر مقرر کرنے کے لیے آئینی دفعات کی خلاف ورزی کرنے کو بھی تیار تھے۔

''میں اس تجویز کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ آپ اس معاملے پر صدر سے بات چیت کرنے کے لیے دوبارہ اپنے نمائندوں کو میرے ساتھ بنگا بھون بھیج دیں اور دیکھیں وہ کیا فیصلہ کرتے ہیں۔'' میں نے بریگیڈیئر خالد کو مشورہ دیا۔

''ٹھیک ہے، وہ دوبارہ تمہارے ساتھ جائیں گے۔'' بریگیڈیئر خالد نے اتفاق کیا۔

''سر اگر مزید کوئی بات نہیں رہ گئی تو ہم اب اجازت چاہیں گے۔''

جیسے ہی میں کرسی سے اٹھا بریگیڈیئر خالد نے کہا، ''دالیم ایک مزید بات، ہم سب جانتے ہیں کہ تم، نور، پاشا، شہریار، ہدیٰ اور دوسرے لوگ محب وطن ہیں۔ ہمارے بھی قوم اور ملک کے بارے میں ایسے ہی

خیالات ہیں۔ جنگ آزادی کے زمانے سے ہم ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ میں اپنی اور اپنے دوسرے ساتھیوں کی جانب سے یہ کہنا چاہوں گا کہ سوائے لیفٹیننٹ کرنل رشید اور لیفٹیننٹ کرنل فاروق کے ہماری تم میں سے کسی کے ساتھ ناراضی نہیں ہے بلکہ ہمیں اپنے خوابوں کی تکمیل کے لیے تمہارے کے تعاون کی ضرورت ہے۔ میں تم سے بہت خلوص کے ساتھ درخواست کرتا ہوں کہ تم لوگ ہمارے ساتھ شامل ہو کر ہمارے ہاتھ مضبوط کرو۔ سمجھنے کی کوشش کرو، ضیا کچھ بھی نہیں دے سکتے۔ انہوں نے ہم سب کے ساتھ اور ہمارے مقصد کے ساتھ بے وفائی کی ہے۔''

بریگیڈیئر خالد کے الفاظ نے مجھے حیران کر دیا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ اپنے الفاظ میں کس قدر مخلص تھے۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ بریگیڈیئر خالد اور دیگر ساتھی اپنی انقلاب دشمن بغاوت کے مضمرات کو نہیں سمجھتے تھے۔ اگر وہ جانتے تھے تو پھر ان کی پیشکش کو کھنڈ کر مشتاق جیسی ہوشیار چال کے طور پر لیا جانا چاہیے تھا۔ وہ ہمیں پھانسنا چاہتے تھے۔

میں نے کچھ دیر غور کیا اور کہا، ''سر، اس وقت تک ہمیں اپنے بارے میں سوچنے کا کوئی موقع نہیں ملا۔ میں اکیلا اپنے مستقبل کے لائحہ عمل کے بارے میں فی الحال کچھ نہیں کہہ سکتا۔ یہ ایک متفقہ فیصلہ ہونا چاہیے۔ بہت سے لوگ جو آج آپ کے ساتھ ہیں، 15 اگست کو ہمارے ساتھ بھی تھے۔ میں اپنے ان دوستوں کو ایک مرتبہ پھر وثوق سے کہنا چاہوں گا کہ ہم نہیں سمجھتے کہ میجر جنرل ضیا نے ہم سے یا 15 اگست کے انقلاب کی روح سے بے وفائی کی ہے۔ ہمارے پاس ایسی کوئی وجہ بھی نہیں ہے کہ ہم انہیں اپنے مطلوبہ مقاصد حاصل کرنے کے قابل نہ سمجھتے ہوں۔ ہم یہ بھی سمجھتے ہیں کہ ان کے خلاف تمام پروپیگنڈا ناجائز ہے اور نہ ہی ان پر بداعتمادی کی کوئی ٹھوس وجہ موجود ہے۔ وہ ہم میں سے ایک تھے اور اب بھی ہم میں سے ہی ہیں۔ آپ کے ساتھ شامل ہونے کی آپ کی تجویز پر میں صرف یہ کہنا چاہوں گا کہ 15 اگست کی روح اور 3 نومبر کی روح ایک جیسی نہیں ہے۔ تاریخ میں دو واقعات کو کبھی بھی ایک طریقے سے نہیں پرکھا جاتا۔ 15 اگست کے کامیاب انقلاب اور سیاسی تبدیلی کو تاریخ میں فاشسٹ اور مستبد حکومت کے خلاف جدوجہد میں، اور ساتھ ہی غیر ملکی بالادستی کے خلاف عوامی جدوجہد میں ایک سنگ میل کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔ اس کے برعکس 3 نومبر 1975ء کے سازشی انقلاب کو تاریخ میں قومی غداری کی داستان طور پر یاد رکھا جائے گا۔ اسے قومی تاریخ کے ایک سیاہ باب کے طور پر دیکھا جائے گا۔ میں جانتا ہوں کہ اس وقت آپ میں کوئی بھی میری اس بات کو تسلیم نہیں کرے گا، لیکن جلد ہی مستقبل کے بارے میں مَیں اور میرے ساتھی جو بھی فیصلہ کریں گے آپ کو وقت پر بتا دیا جائے گا۔''

اس طرح بریگیڈیئر خالد کے ساتھ دن بھر کی ملاقاتوں کے سلسلے کے بعد ہم بنگا بھوَن واپس پہنچے۔ کرنل مناف اور لیفٹیننٹ کرنل مالک دونوں ہمارے ساتھ آئے۔ واپسی میں میجر نور نے کہا، ''سر، بریگیڈیئر خالد کو دیا گیا آپ کا جواب بہت زیادہ تلخ تھا۔ آپ کو ایسا خطرہ مول نہیں لینا چاہیے تھا۔''

یہ بالکل درست تھا۔ نور ٹھیک کہہ رہا تھا۔ اس قسم کی کھلم کھلا اور سخت گفتگو بہت خطرناک ہو سکتی ہے۔

لیکن اس وقت میں اپنے آپ کو روک نہیں سکا۔ میرے منہ سے الفاظ خود بخود نکلتے چلے گئے تھے۔ جب کوئی شخص بے لوث انداز میں سچ بولنے کی کوشش کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے ضروری جرأت اور قوت عطا کر دیتا ہے۔

تاہم، واپسی پر میں نے صدر کو بتایا کہ سازشی جسٹس صائم کے ذریعے اقتدار پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ کھنڈکر مشتاق احمد نے آخرکار جسٹس صائم کو اقتدار سونپنے کا فیصلہ کر لیا۔ بریگیڈیئر خالد کے نمائندے صدر کا فیصلہ سننے کے بعد 4 بنگال ہیڈ کوارٹرز واپس چلے گئے۔

189۔ حب الوطنی اور جرأت کی ایک روشن مثال

میر اتھن جیسی اس تھکا دینے والی گفت وشنید کے اختتام کے بعد جب ہم بنگا بھون واپس پہنچے تو ہمیں ایک چونکا دینے والے واقعہ کا علم ہوا۔ جو اس وقت وقوع پذیر ہوا جب ہم 4 بنگال ہیڈ کوارٹرز میں بریگیڈیئر خالد سے گفت وشنید کر رہے تھے۔

3 نومبر کی صبح سویرے بریگیڈیئر خالد نے کیپٹن ناصر کو میجر مومن کو لانے کا حکم دیا۔ حکم کے مطابق وہ میجر مومن کے گھر گیا اور بیگم مومن کو بغیر بتائے کہ انہیں کہاں لے جایا جا رہا ہے، اپنے ساتھ لے آیا۔ اس وقت میجر مومن بنگال لانسرز کے کمانڈنگ آفیسر تھے۔ مسز مومن کو شک گزرا اور انہوں نے فوری طور پر بنگا بھون میں میجر ہدیٰ کو ساری صورتِ حال سے آگاہ کر دیا۔ میجر ہدیٰ فوراً سمجھ گئے کہ کچھ گڑبڑ ہو گئی ہے اور انہوں نے براہ راست لیفٹیننٹ قسمت ہاشم کو اس واقعہ کی اطلاع دی اور ہوشیار رہنے کو کہا۔ وہ ان ٹینکوں کے بھی کمانڈر تھے، جو چھاؤنی کے گرد کھڑے کیے ہوئے تھے۔

اس واقعے کے بارے میں علم ہونے کے بعد قسمت کو کوئی شک نہیں رہ گیا تھا کہ بریگیڈیئر خالد نے میجر مومن کو ٹینک سکواڈرن پر کنٹرول حاصل کرنے کے لیے حراست میں لے لیا ہے، کیوں کہ اس وقت یہ ٹینک طاقت کے توازن میں ایک انتہائی اہم حیثیت رکھتے تھے۔ لہٰذا اس نے کسی بھی متوقع کارروائی کے خلاف تمام تر احتیاطی تدابیر اختیار کر لیں۔ لیفٹیننٹ قسمت کے خدشات درست ثابت ہوئے۔ تھوری ہی دیر میں شریف نامی راکھی باہنی کا ایک لیڈر فوجی یونیفارم میں لیفٹیننٹ کے بیج لگائے ہوئے آیا۔ بریگیڈیئر خالد نے اسے بھیجا تھا۔ لیفٹیننٹ قسمت پہلے ہی ایسے مشکوک مہمانوں کے استقبال کی تیاری کیے ہوئے تھا اور اس نے اپنے گارڈز کو حکم دے رکھا تھا کہ کسی بھی شخص کو محافظوں کے بغیر رجمنٹ کے علاقے میں آنے کی اجازت نہ دی جائے۔ اس لیے راکھی باہنی کے اس فریبی لیڈر کو گارڈ، لیفٹیننٹ قسمت کے پاس لے کر آ گئے۔ لیفٹیننٹ قسمت نے راکھی باہنی کے لیڈر سے پوچھا کہ اس نے فوجی یونیفارم کیوں پہن رکھا ہے؟ شریف گھبرا گیا اور کوئی تسلی بخش جواب نہ دے سکا۔ قسمت نے اسے سختی سے کوئی احمقانہ کوشش نہ کرنے کی ہدایت کرتے ہوئے گرفتار کر لیا۔ راکھی باہنی کے لیڈر کے پاس بے بسی کے عالم میں سوائے احکامات پر عمل کرنے کے کوئی چارہ نہ رہا۔

یہ بریگیڈیئر خالد کی جانب سے پہلی کوشش تھی، اس کے بعد مزید بھی کوئی حرکت ہو سکتی تھی،

قسمت نے سوچا اور یہی ہوا۔ لیڈر شریف کے بعد کیپٹن ناصر، دفعہ دار مجیب کے ساتھ آیا جو لیفٹیننٹ قسمت کا بی ایم اے میں چیف ڈرل انسٹرکٹر تھا۔ گارڈز پھر دونوں کو ساتھ لے کر رجمنٹل ہیڈ کوارٹرز آئے۔

معمول کی دعا سلام کے بعد کیپٹن ناصر نے لیفٹیننٹ قسمت سے بڑی چالبازی کے ساتھ معلوم کرنا چاہا کہ رجمنٹ میں اس وقت کون سے آفیسر موجود ہیں اور دفعہ دار مجیب نے لیفٹیننٹ قسمت کو کمانڈ کیپٹن ناصر کے سپرد کرنے کو کہا۔ یہ بات لیفٹیننٹ قسمت کے لیے ان کے در پردہ محرکات کو سمجھ جانے کے لیے کافی تھی۔ اس نے گارڈز کو فوری طور پر ردِ عمل کا کوئی موقع دیئے بغیر کیپٹن ناصر اور دفعہ دار مجیب کو گرفتار کر لینے کا حکم دیا۔ دونوں سازشیوں کو رجمنٹل کوارٹر گارڈ میں سلاخوں کے پیچھے بند کر دیا گیا۔ اس قسم کی فوری اور جرأت مندانہ کارروائی نے لیفٹیننٹ قسمت کو ایک سچا انقلابی ثابت کر دیا۔

جلد ہی قسمت کی کارروائی کی خبر بریگیڈیئر خالد کو پہنچ گئی۔ لیفٹیننٹ قسمت کو میجر مومن کا فون آیا اور انہوں نے بریگیڈیئر خالد کے بھیجے ہوئے تینوں افراد کو رہا کرنے کا حکم دیا۔ لیفٹیننٹ قسمت فوراً سمجھ گیا کہ میجر مومن دباؤ کے تحت یہ حکم دے رہے ہیں اور اس نے میجر مومن کے حکم پر عمل نہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ قواعد و ضوابط کا پابند افسر ہونے کے ناتے اس کے لیے اپنے کمانڈنگ آفیسر کی نافرمانی کرنا آسان نہیں تھا، لیکن لیفٹیننٹ قسمت نے ایک دلیر اور ذہین افسر ہونے کی وجہ سے اس نازک مرحلے پر اپنے زبردست حوصلے اور جرأت کا ثبوت دیتے ہوئے جواب دیا، ''میں ان کو اُس وقت تک نہیں چھوڑوں گا، جب تک میجر مومن رجمنٹ میں خود نہیں پہنچ جاتے۔'' لیفٹیننٹ قسمت کا جواب سننے کے بعد بریگیڈیئر خالد سمجھ گئے کہ ان کا شیطانی منصوبہ زمیں بوس ہو چکا ہے اور اب اس میں کامیابی کا کوئی امکان باقی نہیں رہا۔ اس کے بعد ان کے پاس کوئی متبادل نہ رہ گیا تھا اور وہ مجبور ہو گئے کہ میجر مومن کے بدلے اپنے تین آدمیوں کو آزاد کروالیں۔ اس طرح میجر مومن اپنی رجمنٹ میں واپس پہنچ گئے۔

میجر ہدیٰ کی سوچی سمجھی کارروائی اور لیفٹیننٹ قسمت کی ایک قابل انقلابی کے طور پر صورت حال سے فوری طور پر نمٹنے کی صلاحیت نے سازشیوں کے ایک اور شیطانی منصوبے کو ناکام بنا دیا۔

واپسی پر میجر مومن نے لیفٹیننٹ قسمت کی اس کے تیز فہم اور جرأت پر اور حتیٰ کہ اپنے کمانڈنگ آفیسر کی زندگی بچانے کے لیے اُس کی حکم عدولی کرنے پر برا بھلا کہنے کی بجائے اس کی تعریف کی اور شکریہ ادا کیا۔

اس واقعہ نے بریگیڈیئر خالد کو ایک دھوکا باز شخص ثابت کر دیا تھا، جو اقتدار کی خاطر کچھ بھی کر سکتا تھا۔

190۔ بند کمرے کا اجلاس

صدر کے فیصلے کے بعد فوجی کونسل کی مرکزی قیادت نے، جو اس وقت وہاں موجود تھی، ایک بند کمرے میں اجلاس منعقد کیا۔ اس میں فیصلہ کیا گیا کہ معروف اعلیٰ رہنما عارضی طور پر ملک چھوڑ جائیں گے۔

غور وخوض کے بعد بنکاک کو سب سے زیادہ موزوں جگہ قرار دیا گیا۔ اس بات پر بھی بحث کی گئی کہ ہماری روانگی کے بعد فوجی کونسل بریگیڈیئر خالد اور دوسروں کے ساتھ کیسے مقابلہ کرے گی۔ فوجی کونسل دیگر محبِ وطن اور قوم پرست قوتوں، خاص طور پر کرنل طاہر اور اس کی گونو باہنی سے روابط استوار کرنے کے بعد ایک مناسب وقت پر جب بریگیڈیئر خالد اینڈ کمپنی شکست خوردہ عوامی بکسال وادیوں اور ان کے غیر ملکی آقاؤں ہندروسی بلاک کے مطیع درباریوں کے طور پر سامنے آجائے گی، ان کے تعاون سے ایک نئے انقلاب کے لیے تیاری کرے گی۔ بریگیڈیئر خالد اینڈ کمپنی کے خاتمے کے بعد میجر جنرل ضیا الرحمٰن اور صدر کھنڈکر مشتاق احمد کے بارے میں بھی فیصلہ کرلیا گیا۔ میجر جنرل ضیا الرحمٰن کو رہائی دلا کر دوبارہ چیف آف آرمی سٹاف کے عہدے پر بحال کر دیا جائے گا۔ پھر میجر جنرل ضیا، کھنڈکر مشتاق سے صدر کے طور پر اپنی ذمہ داریاں دوبارہ سنبھالنے کی درخواست کریں گے۔ یہ فیصلہ بھی کیا گیا کہ ملک سے روانہ ہونے والے رہنما بنکاک سے فوجی کونسل اور کرنل طاہر سے جس قدر ممکن ہو سکا، رابطہ رکھیں گے۔ ان فیصلوں کو فوجی کونسل کی تمام یونٹوں تک پہنچانے کے انتظامات کیے گئے۔ کرنل طاہر اس وقت بنگا بھون میں موجود تھے اور ہر بات کا فیصلہ ان سے مشورے کے بعد کیا گیا۔ اس دوران صدر کے سیکریٹریٹ سے ہماری بنکاک روانگی کے بارے میں متعلقہ وزارتوں کو ہدایات بھی جاری کر دی گئیں۔

191۔ میں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا

پھر میں نے بریگیڈیئر خالد کو فون کیا جیسا کہ میں نے ان سے اپنے مستقبل کے لائحہ عمل کے بارے میں اطلاع دینے کا وعدہ کیا تھا۔

''سر، ہم نے ملک چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ میں، نور، پاشا، شہریار، ہدیٰ، راشد، رشید، فاروق، محی الدین، شرفل، ماجد، قسمت، نجمل، ہاشم اور مسلم الدین، ہم تمام لوگ اپنے بیوی بچوں سمیت آج رات باہر روانہ ہو رہے ہیں۔ صدر کے سیکریٹریٹ کے ذریعے ضروری انتظامات کیے جا رہے ہیں۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہم آپ اور آپ کے ساتھیوں کے ساتھ تعاون نہیں کر سکتے۔''

''آپ ملک کیوں چھوڑ رہے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا؟ رشید اور فاروق کے بارے میں ہمارے کچھ تحفظات ہیں لیکن آپ سب کیوں جا رہے ہیں؟'' بریگیڈیئر خالد نے یہ الفاظ ایک مرتبہ پھر دہرائے۔ اگرچہ انہوں نے اپنے خلوص کے اظہار کی کوشش کی لیکن مجھے یقین تھا کہ وہ ہمارے سب کے ملک چھوڑ جانے کا سن کر بہت زیادہ خوش اور مطمئن ہیں۔ وہ خوش تھے کیوں کہ ان کے خیال میں ان کے راستے کا فوری خطرہ خود بخود صاف ہو رہا تھا۔

اس طرح ہم نے حکمت عملی کے تحت ملک اور قوم کو ممکنہ خوں ریز خانہ جنگی سے بچانے کے لیے بنکاک جانے کا فیصلہ کرلیا۔ 3 نومبر 1975ء کی رات ساڑھے دس بجے ہم بیمان کی ایک خصوصی پرواز کے

ذریعے ڈھاکہ سے بنکاک کے لیے روانہ ہو گئے۔

192۔ 7 نومبر کا انقلاب

ہمارے ملک چھوڑنے کے صرف 3 روز بعد، جب ہم بنکاک میں تھے، 7 نومبر 1975ء کو فوجی کونسل اور کرنل طاہر کی گونو باہنی کی مشترکہ قیادت میں انقلاب برپا کر دیا گیا۔

عوام 15 اگست 1975ء کی طرح خود بخود بے ساختہ طور پر اس کی حمایت میں نکل آئے۔ انقلاب کا ہراول دستہ مسلح افواج کے محب وطن ارکان پر مشتمل تھا جس کی قیادت فوجی کونسل اور کرنل طاہر کی گونو باہنی کے ہاتھوں میں تھی۔ اس طرح یہ ایک عوامی انقلاب بن چکا تھا۔ بریگیڈیئر خالد اینڈ کمپنی کو اقتدار سے نکال دیا گیا۔ فوجیوں اور عوام نے شکست خوردہ قوتوں اور ان کے غیر ملکی آقاؤں کی شیطانی سازش کو کچل دیا۔

15 اگست اور 7 نومبر، دونوں مواقع پر ڈھاکہ اور ملک کے دوسرے بڑے شہروں کی گلیوں میں عوام کا ایک سیلاب امڈ آیا تھا۔ قومی بحران کا سامنا کرتے ہوئے پوری قوم نے ایک منفرد اتحاد اور یک جہتی کا مظاہرہ کیا تھا۔ پورا بنگلہ دیش غداروں اور قوم دشمن بالا دست اور توسیع پسند قوتوں کے خلاف ایک قلعے میں تبدیل ہو چکا تھا۔ کامیاب انقلاب کے بعد بریگیڈیئر خالد مشرف اور ان کے چند قریبی ساتھیوں نے ملک سے فرار ہونے کی کوشش کی، لیکن وہ اپنی اس کوشش میں بھی ناکام رہے اور انقلابیوں کے ہاتھوں مارے گئے۔ دوسروں کو گرفتار کر لیا گیا۔ پہلے سے کیے گئے فیصلے کے مطابق میجر جنرل ضیاالرحمٰن کو قید سے رہائی دلائی گئی اور چیف آف آرمی سٹاف کے طور پر بحال کر دیا گیا۔ پھر فیصلے کے مطابق انہوں نے کھنڈکر مشتاق احمد کو صدر کی ذمہ داریاں سنبھالنے کی دعوت دی۔ لیکن انہوں نے میجر جنرل ضیاالرحمٰن کی درخواست قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ بعد میں ایک تاریخی تقریر میں جو قومی میڈیا پر نشر کی گئی، کھنڈکر مشتاق احمد نے صدارت قبول نہ کرنے سے اپنے انکار کی وجوہات تفصیل سے بیان کیں اور 7 نومبر کے جرأت مندانہ انقلاب کو شاندار خراجِ تحسین پیش کیا۔ 2 نومبر سے 7 نومبر تک کے واقعات کے بارے میں میرے بیانات کی حقانیت کی گونج ان نعروں سے سنائی دے رہی تھی، جو انقلابی اور خوشیاں مناتے ہوئے وہ عوام لگا رہے تھے، جنہوں نے 7 نومبر کو ڈھاکہ کے آسمانوں کو چیر ڈالا تھا۔

"نعرہ تکبیر............اللہ اکبر"

"سپاہی جنتا بھائی بھائی............خالد اور روکتا چائی"

"کھنڈکر مشتاق زندہ باد............بنگلہ دیش زندہ باد"

"میجر دالیم............زندہ باد"

"رشید، فاروق زندہ باد............خالد، مشرف مردہ باد"

"جنرل ضیا جکھانے............امارا اچھی شیکھانے"

193۔ انقلابیوں کا جذبہ اور اقدار وسیع اکثریت سے مختلف نہ تھے

تاریخی طور پر ہمارے عوام چند عزیز ترین اقدار کے جذبے سے سرشار ہیں۔ وہ ہیں حکومت خود اختیاری، بنیادی اور انسانی حقوق، اظہار خیال کی آزادی، جمہوریت، قانون کی حکمرانی اور معاشرتی مذہبی تہذیب۔ وہ ان کے حصول کے لیے غاصبوں سے ہمیشہ پورے جوش و جذبے سے ٹکر لیتے آرہے ہیں اور بڑی سے بڑی قربانیاں دیتے چلے آرہے ہیں۔ عصر حاضر کی تاریخ میں اس کی تین بڑی مثالیں مشہور قرار داد لاہور، لسانی تحریک اور جنگ آزادی ہے۔

15 اگست اور 7 نومبر 1975ء کے انقلابی، تمام کے تمام اس دھرتی کے فرزند اور دلیر مجاہدین آزادی تھے۔ لہٰذا یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ان کے جذبے اور اقدار وہی تھیں، جو بنگلہ دیش میں بسنے والے عوام کی وسیع اکثریت کی ہیں۔

ان کا جذبہ قوم کو یکساں وادیوں کے آمرانہ اقتدار سے نجات دلانا، جمہوریت اور بنیادی انسانی حقوق کی بحالی، قانون کی حکمرانی کا قیام اور بنگلہ دیش کو بیرونی آقاؤں کی غلامی میں جانے سے روکنا تھا۔ دوسرے الفاظ میں ہماری درخشاں جنگ آزادی کے پس پردہ یہی جذبے کارفرما تھے۔

تاریخی طور پر 7 نومبر کو 15 اگست سے جدا نہیں کیا جاسکتا کیوں کہ ان دونوں عوامی انقلابات کے ہراول دستے انہی جذبات سے سرشار ہماری مسلح افواج کے محب وطن ارکان تھے۔ تاہم 7 نومبر کے انقلاب میں ایک استثنیٰ یہ تھا کہ اس میں کرنل طاہر اور ان کی گانو باہنی نے فوجی کونسل اور دوسری محب وطن قوم پرست قوتوں اور عوام کے ساتھ شانہ بہ شانہ حصہ لیا تھا۔

قوم پرستی کا جذبہ، جس نے 15 اگست 1975ء کی تاریخی سیاسی تبدیلی میں جان ڈالی تھی، بڑی قوت سے ہماری قومی زندگی کے ہر میدان میں سرایت کر چکا ہے۔ اگست کا انقلاب عوام کی بے لوث حب الوطنی اور قومی آزادی کے ساتھ ان کی شدید وابستگی کی علامت ہے۔ یہ ایک ایسا مینارۂ نور ہے جو آنے والے تمام ادوار میں محب وطن افراد کی قومی غداروں اور مطلق العنان حکمرانوں کے خلاف جدوجہد میں ہمیشہ ایک سنگ میل کی حیثیت کا حامل رہے گا۔

حصہ ششم
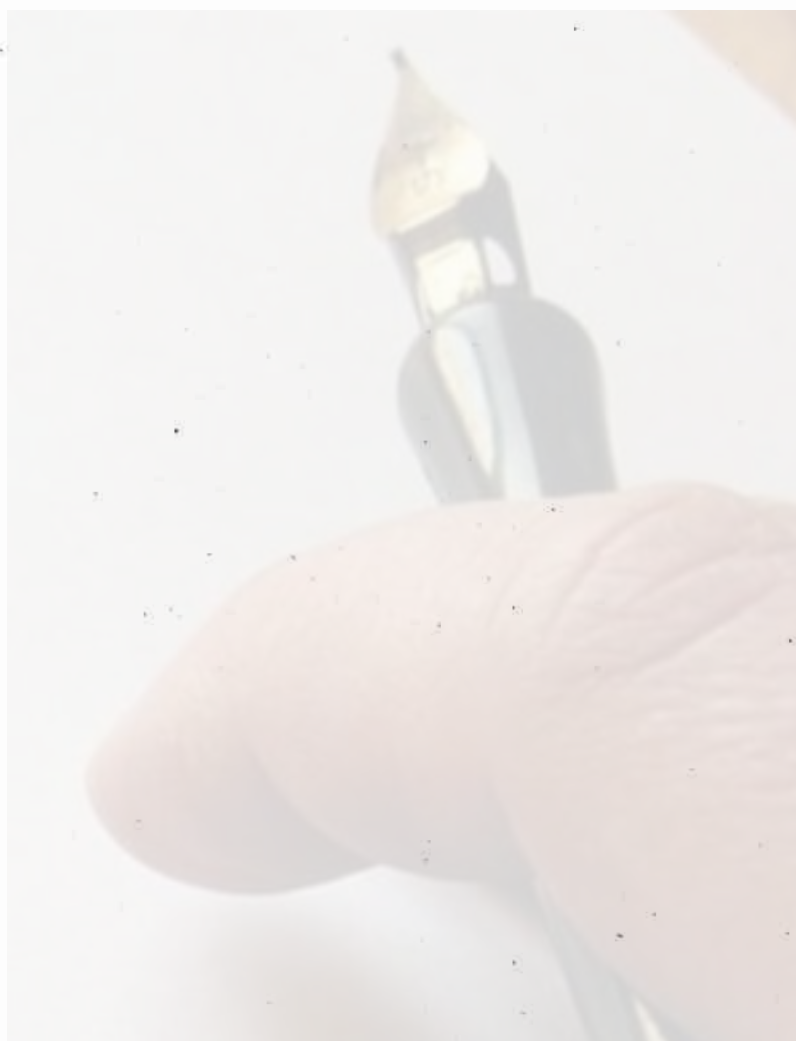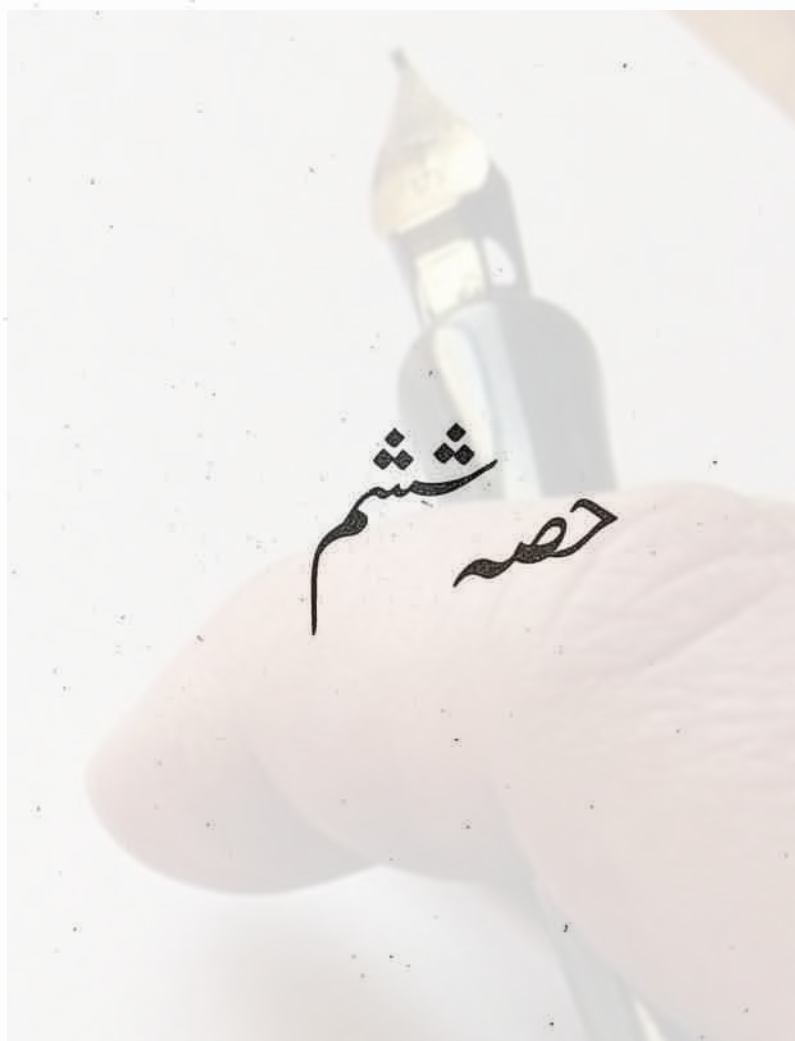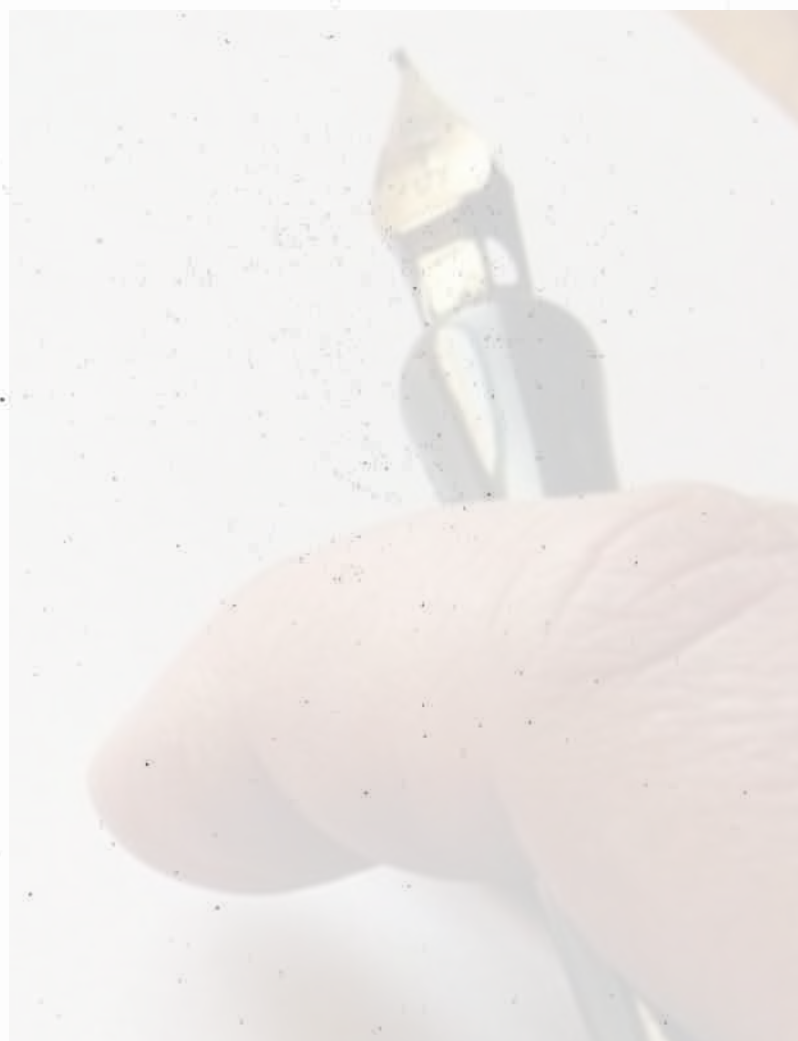
''قومی انقلاب اور یوم یک جہتی''

اور

سزاؤں سے استثنیٰ

194۔ بنگلہ دیش کے آئین میں سزا سے استثنیٰ کی دفعات اور قوانین

بی این پی کی حکومت نے 7 نومبر 1975ء کی بغاوت کو 15 اگست کے عہد ساز انقلاب اور ان دونوں کے باہمی تعلق کا ذکر کیے بغیر ''قومی انقلاب اور یوم یک جہتی'' کا دن قرار دیا تھا۔ صرف 7 نومبر کی مدح سرائی کرنا گھوڑے کے آگے تانگہ جوتنے کے مترادف ہے۔ اس وقت سے قوم 7 نومبر کو اس انداز سے مناتی آ رہی ہے جو اس شان دار دن کے شانِ شایان ہے۔ واحد استثنیٰ شیخ حسینہ اور ان کی جماعت عوامی لیگ رہی ہے۔ وجہ صاف ظاہر ہے، اگر وہ اس دن کو اس کی روح کے ساتھ تسلیم کرتے ہیں تو یہ عوامی بکسال کی آمرانہ اور مستبد حکومتوں کی احمقانہ رام کہانیوں کے ساتھ ماضی کی فاش غلطیوں کو تسلیم کرنے کے مترادف ہے۔ شیخ حسینہ یا ان کی پارٹی کی جانب سے اس قسم کی عالی ظرفی کی امید نہیں کی جا سکتی۔

15 اگست اور 7 نومبر کے عوامی انقلاب ہماری تاریخ کے نا قابل فراموش واقعات ہیں۔ اس قسم کے قابل جواز جرأت مندانہ واقعات قوموں کی تاریخ کے نازک لمحات میں وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ یہ انقلاب بھی اسی نوعیت اور ایک ٹھوس پس منظر کے حامل تھے۔ اب تک لوگوں نے ان کے بہت سے معترفین دیکھے ہوں گے اور مختلف حلقوں سے بہت سے قصے سن رکھے ہوں گے، لیکن کوئی شخص بھی ان دو عظیم واقعات کے سیاسی پس منظر اور اس جذبے کے بارے میں بات نہیں کرتا جس نے محبّ وطن فوجیوں اور عوام کو ان دو عہد ساز انقلابات کو عملی جامہ پہنانے پر اکسایا، یا یہ بتانا گوارا نہیں کرتا کہ وہ کون لوگ تھے جو ان کی قیادت کر رہے تھے اور یہ جدوجہد کس نظام اور کن لوگوں کے خلاف تھی؟ نام نہاد دانشور بھی بہت محتاط انداز میں ان معاملات پر بولنے سے گریزاں نظر آتے ہیں جس کی وجہ شاید وہ خود ہی جانتے ہیں۔ حتیٰ کہ ستم ظریفانہ طور پر کچھ طفیلی دانشور 15 اگست اور 7 نومبر کو دو مختلف واقعات کے طور پر پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں جن کا آپس میں کوئی تعلق نہیں۔ 15 اگست کے بارے میں بہت سے لوگ پہلے ہی بہت کچھ کہہ چکے ہیں۔ لہٰذا میں اب صرف 7 نومبر

کے واقعہ پر پڑے ابہام کے پردے ہٹانے اور ہماری قومی تاریخ کے ان دو اہم واقعات کے درمیان پائے جانے والے تعلقات کو ان کے درست پس منظر میں بیان کرنے کی کوشش کروں گا۔

7 نومبر 1975ء کی روح اور اہمیت کو سمجھنے کے لیے لوگوں کو اور خاص طور پر موجودہ نسل کو مندرجہ ذیل سوالات کے واضح جوابات سے آگاہ ہونا ضروری ہے۔

1۔ فوج اور عوام کو 7 نومبر کا انقلاب کیوں برپا کرنا پڑا؟

2۔ انقلاب کی روح اور مقاصد کیا تھے؟

3۔ یہ انقلاب کس نظام اور کن لوگوں کے خلاف تھا؟

4۔ انقلاب میں ہراول دستے کا کردار کس نے ادا کیا؟

ان کے جوابات جانے بغیر ''قومی انقلاب اور یوم یک جہتی'' کے دن کو منانا محض ایک رسمی کارروائی رہ جاتی ہے اور ان درخشاں انقلابات کی اصل روح لوگوں کے دلوں اور ذہنوں پر نقش نہیں کی جاسکتی، جو اپنے وجود میں بہت اہم بات ہے۔

ان وجوہات کو تلاش کرنے کے لیے اپنی جنگ آزادی کے تاریخی پس منظر سے درست آگہی حاصل ہونا ضروری ہے۔

25 مارچ 1971ء کی فیصلہ کن رات کو پاکستان کے اس وقت کے بد دیانت اور بے اصول حکمران فوجی ٹولے نے اپنی مسلح افواج کو مشرقی پاکستان کے امن پسند عوام پر ٹوٹ پڑنے کا حکم دے دیا تھا۔ ہزاروں نہتے اور معصوم بنگالی اس غیر انسانی خون ریزی کا شکار ہوئے۔ قوم اس قسم کی برق رفتار قتل وغارت کا سامنا کرنے کے لیے بالکل تیار نہ تھی، کیوں کہ عوامی لیگ اور شیخ مجیب کی جانب سے جن پر پوری قوم نے قیادت کے لیے انحصار کیا ہوا تھا، اسے متنبہ کیا گیا تھا اور نہ ہی کوئی تیاری کروائی گئی تھی۔ انتہائی مایوسی کا پہلو یہ تھا کہ پاکستانی فوج کے اس حملے کی پیشگی اطلاع کے باوجود مجیب نے قوم کی قیادت کے لیے آگے آنے عوام کے ساتھ کھڑا ہو کر لڑنے سے انکار کر دیا تھا جو ہزاروں کے تعداد میں مارے گئے۔ انہوں نے ایک رہنما کے طور پر اپنے آپ کو قوم کی رہنمائی کے لیے نااہل ثابت کر دیا تھا۔ ان کی قیادت کا سحر طشت ازبام ہو چکا تھا۔ لوگ ان کی اہلیت، ارادوں اور دیانت داری پر سوال کر رہے تھے۔ وہ پاکستانی فوج کے خلاف عوام کی مسلح مزاحمت میں متنازع ناقابل اعتبار اور غیر متعلق حیثیت اختیار کر گئے تھے۔ عوام اس بات کے قائل ہو گئے تھے کہ اس قسم کی شدید فوجی سیاسی پیش رفت کو چیلنج کرنے کے لیے وہ کوئی واضح سوجھ بوجھ رکھتے تھے اور نہ ہی انہوں نے کوئی معقول تیاری کر رکھی تھی۔ پھر بھی عوام آخری فیصلہ کن گھڑی کے آنے تک سرتوڑ کوشش کرتے رہے کہ ان کی جانب سے مسلح جدوجہد کا اعلان آسکے۔ مجیب بالکل بے حس وحرکت رہے، یہ بات سب کی سمجھ سے باہر تھی۔ اپنی بزدلی اور قوم کو جنگ کے لیے قیادت مہیا کرنے کی اپنی نااہلی کو چھپانے کے لیے شیخ مجیب نے اپنے چند گھبرائے ہوئے بہت قریبی ساتھیوں کو کہا کہ وہ روایتی سیاست پر یقین رکھتے

ہیں اور مسلح جدوجہد میں شریک ہونے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ مجیب نے ہزاروں معصوم زندگیوں کے قتل عام پر آنکھیں بند کر لیں گویا یہ ان کے لیے اقتدار کی سیاست میں ہونے والا معمول کا ضمنی نقصان ہو۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ متحدہ پاکستان کا لیڈر بننے کی ان کی ذاتی خواہش ہر دوسری چیز سے زیادہ اہم تھی۔ پُرسکون مجیب اپنے گھر میں بیٹھا انتظار کرتا رہا اور مشکوک انداز میں اپنی گرفتاری پیش کر دی۔ بعد میں انہیں مغربی پاکستان کی محفوظ جنت میں منتقل کر دیا گیا۔ ان کی بیوی اور شیخ حسینہ کے سوا باقی ماندہ خاندان حکومت پاکستان کے سرکاری مہمان بن گئے۔

شیخ مجیب کی بے وفائی پر پوری قوم کو دھچکا لگا تھا۔ ان نازک لمحات میں ایک غیر معروف نوجوان فوجی افسر میجر ضیاالرحمٰن نے، جو حب الوطنی کے جذبے سے سرشار تھا، اپنے اپنے ہم خیال ساتھی افسروں کے مشورے کے بعد اور ان کے عملی تعاون کے ساتھ کلور گھاٹ ریڈیو سٹیشن چٹا گانگ سے آزادی کا اعلان کیا۔ انہوں نے قوم سے اٹھ کھڑے ہونے اور مسلح جدوجہد کا آغاز کرنے کی پرزور اپیل کی۔ اس تاریخی اعلان نے پوری قوم کو متحرک کر دیا۔ زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے افراد نے بنگال رجمنٹس اور دوسری تمام پاکستانی یونٹس، ای پی آر، پولیس، انصار، مجاہد فورس سے فرار ہونے والے فوجیوں اور سول انتظامیہ کے ممبران کے ساتھ شامل ہو کر نہتے سویلین افراد پر پاکستانی فوج کی جارحیت کے خلاف مزاحمت کی جدوجہد کا آغاز کیا۔ تمام لوگ، جو بھی ہتھیار ان کے ہاتھ میں آیا، لے کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کے ہتھیار لاٹھیاں، بلمیں، شارٹ گنیں اور پرانی 303 رائفلیں تھیں۔ اس قسم کی ملک گیر خود ساختہ، بکھری ہوئی، بغیر کسی تیاری کے برائے نام مزاحمت قتل و غارت میں مصروف پاکستان فوج کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتی تھی، لہٰذا کوئی ٹھوس صورت اختیار کرنے سے پہلے ہی دم توڑ گئی۔

عوامی لیگ کی ہر سطح کی قیادت سب سے پہلے عوام کو تنہا چھوڑ کر ہندوستان فرار ہو گئی تھی۔ بغیر کسی قیادت اور سمت کے مشرقی پاکستان کے بے بس لاچار بنگالی ہجرت کرنے لگے۔ آنے والے چند ماہ میں ہندوستان میں ہمارے پناہ گزینوں کی تعداد لاکھوں تک جا پہنچی۔ ہماری محب وطن قوتیں سرحد کے ساتھ ساتھ مقامی قیادت میں از سرِ نو منظم ہوئیں اور سرحد پار پاکستانی اہداف پر گوریلا حملوں کا آغاز کر دیا۔ جیسے جیسے دن گزرتے گئے گوریلا حملوں میں شدت آئی گئی۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ مشرقی پاکستان کی سرحدوں کے اندر دُور دُور تک حملوں کی تعداد میں اور ان کے ساتھ ساتھ پاکستان افواج اور ان کے مقامی ساتھیوں کی اموات میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا۔ ہر کامیابی کے بعد گوریلے مشرقی پاکستان کی سرحدوں کے ساتھ اپنا حلقہ اثر بڑھاتے چلے جاتے تھے۔ فوجی اور سیاسی سرگرمیوں میں اضافے کے ساتھ زیادہ جرأت مندانہ فوجی کارروائیوں کے نتیجے میں ایک نئے اعتماد نے جنم لیا کہ وہ پوری طرح منظم اور جدید اسلحہ سے لیس پاکستان کی باقاعدہ افواج کے ساتھ جنگ لڑنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ اس طرح خوں ریز جنگ آزادی کا آغاز ہوا۔ جس کی قیادت عوام اور صرف عوام کے ہاتھوں میں تھی۔

عوامی لیگ کے کسی بھی سطح کے رہنماؤں میں سے صرف چند ایک ہی تھے، جو بندوقیں اٹھائے ہوئے تھے یا دشمن کے علاقوں کے اندر موجود تھے۔ ان میں سے اکثر اپنے خاندانوں کو نکالنے اور محفوظ علاقوں کی جانب منتقل کرنے میں مصروف تھے۔ ان میں زیادہ تر ہندوستان کے علاقوں میں مشرقی پاکستان کے بینکوں اور خزانوں سے لوٹی ہوئی رقموں کے ساتھ عیاشیوں اور تماش بینیوں میں مصروف تھے، وہ عورتوں، شراب اور پیسوں اور لطف وانبساط کے حصول کے لیے سرگرداں تھے۔ ان کے لیے یہی جنگ آزادی تھی۔ وہ بڑی بے چینی کے ساتھ واپسی کے دن گن رہے تھے تاکہ غلط طریقوں سے حاصل کی گئی دولت اور عوام کے آقاؤں کے طور پر اپنے اثر ورسوخ سے لطف اندوز ہو سکیں۔ کچھ آزادی کے بارے میں یاس اور قنوطیت کا شکار تھے اور وہ اپنی لوٹی ہوئی رقموں کو شمار کرنے اور چھپانے یا سرمایہ کاری کے پروگراموں کی منصوبہ بندیوں میں مصروف تھے۔ ان کی تمام تر سوچیں اپنے ذاتی تحفظ اور بقا تک محدود تھیں جب کہ جنگ میں مصروف اگلی صفوں کے جنگجو ہر روز اپنی کامیابی اور بنگلہ دیش کو آزاد کروانے کے بارے زیادہ سے زیادہ پُر امید ہو رہے تھے۔

لیکن انتہائی بدقسمتی سے ہماری آزادی کی جنگ ہمسایہ ملک ہندوستان کے چانکیوں کے ہاتھوں میں چلی گئی۔ بناوٹی دوست کے روپ میں ایک طویل المدتی منصوبے کو آخری شکل دیتے ہوئے ہندوستان نے عوامی لیگ کو ایک محدود سا تعاون پیش کیا۔ اس کا مقصد مشرقی پاکستان میں تیزی سے پروان چڑھنے والی صورت حال سے پیدا ہونے والے مواقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہندوستان کے ازلی دشمن پاکستان کے حصے بخرے کرنا اور مشرقی پاکستان کو طفیلی ریاست میں تبدیل کرتے ہوئے ''اکھنڈ بھارت'' کے اپنے عزیز ترین خواب کو عملی جامہ پہنانا تھا۔

ہندوستانی حکومت نے یقین دہائی کروائی تھی کہ عوامی لیگ کو جنگ آزادی کا واحد دعوے دار ہونے اور ملک کی آزادی کے بعد اقتدار پر قابض ہونے کی اجازت دی جائے گی۔ اس کے بدلے میں کلکتہ میں قائم اس وقت کی جلاوطن عبوری حکومت اور بعد میں شیخ مجیب الرحمٰن نے غلامی کے ایک اقرار نامے (ہندوستان کے ساتھ 25 سالہ دوستی کا معاہدہ) پر دستخط کیے۔ یہ ایک اور غداری تھی۔ اپنے اقتدار کی ہوس میں مجیب اور ان کی عوامی لیگ نے لاکھوں انسانوں کے خون اور قربانیوں کو بے توقیر کیا، اور بغیر کسی شرم کے غلط طور پر جنگ آزادی کی قیادت کا جھوٹا دعویٰ کیا۔ اب بھی مجیب کی بیٹی اور عوامی لیگ بے شرمی کے ساتھ جنگ آزادی پر اجارہ داری کا دعویٰ جاری رکھے ہوئے ہیں۔ یہ محض جھوٹ اور دروغ گوئی پر مبنی پروپیگنڈا ہے۔ ہم یعنی بنگلہ دیش کے عوام کے لیے پاکستان 25 مارچ 1971ء کی رات کو ختم گیا تھا اور عوامی لیگ کا قومی قیادت کا دعویٰ بھی بے محل ہو گیا تھا۔ لہٰذا یہ نا کام عوامی لیگ قومی جنگ آزادی کی تنہا قیادت کا دعویٰ کرنے کا کوئی اخلاقی جواز نہیں رکھتی۔ معاملات کو مزید بدتر کرتے ہوئے شیخ مجیب اور ان کی جماعت نے اقتدار پر قبضہ حاصل کرنے کے بعد ملک کو ذاتی جاگیر کے طور پر استعمال کرتے ہوئے اور کھلم کھلا لوٹ مار اور غارت گری میں مصروف ہوتے ہوئے دہشت کے ذریعے حکومت کرنا شروع کر دی۔ مجیب کی عوامی بکسال کا دورِ حکومت کسی

خوف ناک خواب کی مانند تھا۔ یہ اس وقت تک ہمارا پیچھا کرتا رہے گا جب تک ان کے بھوتوں کا آسیب اتار نہیں دیا جاتا۔

مجیب، پاکستان سے براستہ ہندوستان اپنی واپسی کے ساتھ نئے جنم لینے والے ملک کے لیے ایک تحفہ لے کر آئے تھے۔ انہوں نے چار اصولوں کی پیوند کاری کی، یعنی اندرا گاندھی کے حکم کے مطابق، قوم پرستی، سوشلزم، جمہوریت اور سیکولرازم کو بغیر عوامی استصوابِ رائے کے قومی آئین کے چار ستونوں کے طور پر نافذ کر دیا گیا۔ انہوں نے ایک عجیب وغریب سیاسی فلسفہ ایجاد کیا جس کو ''مجیب واد'' کا نام دیا گیا۔ عوامی لیگ کی جانب سے کھنڈکر محمد الیاس نے فلسفی ہونے کا دعویٰ کرتے ہوئے ''مجیب واد'' کو کتابی صورت میں شائع کیا۔

ملک کے معروف دانشوروں نے اس کا موازنہ ہٹلر کی کتاب ''مین کیمف'' سے کیا۔ ملک کے مشہور سیاسی تجزیہ نگاروں اور مفکرین نے کبھی بھی ''مجیب واد'' کو سیاسی فلسفے کے طور پر تسلیم نہ کیا بلکہ انہوں نے اسے فاشزم اور آمریت کی تمہید قرار دیا۔

عوامی بکسال کا دَور بنگلہ دیش کی تاریخ کا سیاہ ترین باب ہے۔ 1975ء میں شیخ مجیب الرحمٰن نے بہ یک جنبش قلم جمہوریت کو دفنا دیا قوم پر یک حزبی بکسال حکومت مسلط کر دی اور اپنے ''دوسرے انقلاب'' مجیب واد کے نفاذ کی جانب پیش قدمی شروع کر دی۔ انہوں نے عوام سے پریس کی آزادی، اظہارِ خیال کی آزادی اور بنیادی حقوق چھین لیے۔ حکومتی کنٹرول میں چھپنے والے چار روزنامہ اخبارات کے علاوہ تمام قومی روزناموں اور رسائل پر پابندی لگا دی۔ عدلیہ کو ایگزیکٹو برانچ کے تحت انتظامی کنٹرول میں دے دیا گیا۔ اس طرح قانون کی حکمرانی کو بھی دفنا دیا گیا۔ عوامی بکسال کا دَور حقارت آمیز ظلم وستم، قتل و غارت، عصمت دریوں، لوٹ مار، استبداد، غارت گری، قحط اور غیر ملکی توسیع پسندوں کی اطاعت گزاری کی داستان ہے۔ یہ جنگ آزادی سے غداری کی تاریخ ہے۔ لوگ ان خوف ناک یادوں کو کبھی بھول نہیں پائیں گے۔ سوشلزم کے نام پر عوامی بکسال وادیوں نے قومی دولت کو لوٹا، سمگلنگ کے لیے سرحدوں کو کھولے رکھا اور سماجی ناانصافی کو فروغ دیا۔ معاشی بدنظمی کی وجہ سے ہمارے پیارے ملک کو ''بے پیندے کی ٹوکری'' جیسا بدنامی اور رسوائی کا داغ سہنا پڑا۔ جنگ کے فوراً بعد بنگلہ دیش میں کوئی قحط نہ تھا، لیکن ہزاروں افراد انسانوں کے پیدا کردہ قحط کے ہاتھوں بھوک سے مر گئے، جو عوامی لیگ کی جنگ زدہ ملک کے بچے کھچے وسائل کی لوٹ مار کے نتیجے میں پیدا ہوا۔ مکمل طور پر بدانتظامی اور امدادی سامان کی منظم قسم کی سمگلنگ نے لوگوں کے دکھوں اور تکالیف میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔

شیخ مجیب اور ان کی حکومت نے جمہوریت کے نام پر عوامی فاشزم، بنگالی قوم پرستی کے نام پر قومی نفاق اور سیکولرازم کے نام طبقاتی ابتری کو فروغ دیا۔ پوری قوم کا گلا گھونٹتے ہوئے، ریاستی دہشت گردی کے ذریعے تمام قسم کی مخالفت کو کچل دیا گیا۔ اس طرح حکومت میں تبدیلی لانے کے تمام جمہوری اور آئینی راستے مسدود کر دیئے گئے۔ قوم کو ایک ایسی تحت الثریٰ میں پھینک دیا گیا جہاں اس کا سانس لینا بھی دوبھر ہو رہا تھا۔

یوں عوامی لیگ حکومت پوری قوم کو اپنا دشمن تصور کرنے لگی تھی۔

23 جنوری 1992ء کو بنگلہ دیش کی قومی اسمبلی میں 1972ء سے 1975ء تک عوامی بکسال وادیوں کے وحشیانہ دَور کو بیان کرتے ہوئے اتحادی حکومت کے قانون اور پارلیمانی امور کے وزیر مودود احمد نے کہا، ''28 دسمبر 1974ء کو ہنگامی حالت کے نفاذ کے بعد 29 دسمبر کو مجھے سپیشل پاور ایکٹ کے تحت بغیر کسی وجہ کے گرفتار کر لیا گیا۔ حکومت میرے خلاف کوئی خاص الزام لگانے میں ناکام رہی۔ مسٹر طفیل احمد راکھی باہنی کے انچارج تھے اور اس رسوائے زمانہ باہنی کے ہاتھوں 40 ہزار معصوم لوگ اپنی زندگیوں سے محروم کر دیئے گئے تھے۔ اس ملک کے عوام ابھی تک سراج شیکدار کا بہیمانہ قتل نہیں بھولے۔ 1972ء اور 1975ء کا درمیانی دَور ہمیشہ بنگلہ دیش کی تاریخ کا سیاہ ترین باب رہے گا۔''

لیکن جنگ آزادی کے دنوں سے ہی بہت سے بےلوث مجاہدین آزادی ہندوستان کے شیطانی منصوبے عبوری حکومت اور بعد میں شیخ مجیب حکومت کی توسیع پسند قوتوں کی مکمل اطاعت کی پالیسی کے ساتھ سمجھوتہ نہ کر سکے۔ وہ ایسی آزادی ہرگز نہیں چاہتے تھے جس میں پاکستان کی جگہ ہندوستان سنبھال لے۔ وہ حقیقی آزادی کے لیے لڑے تھے۔ ان کا خواب خوش حال اور آزاد بنگلہ دیش تھا۔ اس لیے یہ انتہائی منطقی بات تھی کہ جنگ کے بعد کے دَور میں انہوں نے عوامی بکسال وادیوں کے ظلم واستبداد کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے اپنی آوازیں بلند کیں۔

ملک گیر مزاحمت تشکیل دی گئی۔ یہ کسی طور پر بھی آسان کام نہ تھا۔ حزب مخالف کے ہزاروں رہنما، کارکن اور معصوم لوگ اس فاشسٹ حکومت کے ہاتھوں بےدردی سے مارے گئے۔ حتیٰ کہ مسلح افواج کے ارکان کو بھی نہ بخشا گیا۔

بنگلہ دیش کی مسلح افواج آزمودہ محبِ وطن مجاہدین آزادی اور سابقہ پاکستانی مسلح افواج سے بھاگے ہوئے ارکان پر مشتمل تھی جنہوں نے بنگلہ دیش کے ساتھ وفاداری پر لمبی قید کی تکالیف برداشت کی تھیں۔ اسی لیے بنگلہ دیش کی مسلح افواج کا کردار دنیا کی دیگر روایتی افواج سے مختلف ہے۔ بنگلہ دیش کی مسلح افواج کے ارکان کا ایمان تھا کہ عوام اور قومی مفاد سب سے افضل ہے نہ کہ کوئی فردِ واحد یا پیوستہ مفادات کے حامل گروہ یا کوئی سیاسی پارٹی۔ لہٰذا انہوں نے شیخ مجیب الرحمٰن کی حکومت کا استبدادی ہتھیار بننے سے انکار کر دیا۔ مسلح افواج کی اس قسم کی حب الوطنی نے عوامی بکسال حکومت کے غضب کو بھڑکا دیا۔ شیخ مجیب، بنگلہ دیش کی مسلح افواج کو قائم نہیں رکھنا چاہتے تھے۔ وہ محض تنہا اپنے طور پر مضبوط اور طاقت وَر بننا چاہتے تھے۔ انہوں نے مسلح افواج کے مقابلے میں جاتیو راکھی باہنی کو متبادل کے طور پر تشکیل دیا۔ شدید استبداد کے نتیجے میں تمام مخالف سیاسی پارٹیوں کو زیر زمین چلے جانے پر مجبور کر دیا گیا اور مسلح افواج کے پاس دو خفیہ تنظیمیں فوجی کونسل اور گانو باہنی تشکیل دینے کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں رہ گیا تھا۔ قومی مفاد اور قومی اہمیت کے بہت سے معاملات پر دوسری کئی ایک محبِ وطن قوم پرست، ترقی پسند سیاسی جماعتوں اور گروہوں کی طرح ان دونوں

تنظیموں کے نظریات یکساں تھے۔ اختلاف صرف نظریے اور اصولوں پر تھا۔ فوجی کونسل مذہبی جوش وجذبے کی طرح قوم پرستی پر یقین رکھتی تھی۔

آزادی کے فوراً بعد، ہندوستانی افواج نے جب عوامی لیگیوں کے ساتھ گٹھ جوڑ کر کے قومی دولت کو کھلم کھلا لوٹنا شروع کر دیا تو یہ مسلح افواج کے ارکان اور مجاہدین آزادی ہی تھے جو ان سرگرمیوں کے خلاف مزاحمت پیدا کرنے کے لیے ہراول دستہ بن گئے۔ 1972ء میں جب پوری قوم دہشت زدہ تھی تو اس وقت بھی ایک وردی والا آدمی کرنل ضیاالدین، ایک نمایاں مجاہد آزادی ہی تھا، جس نے شیخ مجیب کی حکومت کی قومی غداری کے خلاف سب سے پہلے آواز بلند کی اور مطالبہ کیا کہ اس قوم دشمن 25 سالہ معاہدے کے مندرجات سے عوام کو آگاہ کیا جائے جس پر شیخ مجیب نے دستخط کیے تھے۔

ایسے کوئی بھی اقدامات جو عوام کی مرضی اور خواہشات کے خلاف محض اپنے اقتدار کو دوام بخشنے کے لیے اٹھائے جاتے ہیں، زیادہ دیر نہیں چل سکتے۔ کوئی بھی نظام عوام کی حمایت کے بغیر زیادہ دیر قائم نہیں رہ سکتا۔ جب قوم کے غدار لوگوں پر آمریت یا فاشزم مسلط کر دیتے ہیں تو ہمیشہ محب وطن افراد آگے آتے ہیں اور ملک اور اس کے عوام کو ڈریکولائی حکومت اور اس کے مستبد حکمرانوں سے نجات دلانے کے لیے انقلاب منظم کرتے ہیں۔ 15 اگست 1975ء کو بنگلہ دیش میں تاریخ نے اپنے آپ کو پھر دہرایا جب ایک اور آمر شیخ مجیب الرحمٰن اور ان کی فاشسٹ بکسال حکومت کا تختہ ایک کامیاب انقلاب کے ذریعے الٹ دیا گیا جس کی قیادت مسلح افواج کے محب وطن ارکان کے ہاتھ میں تھی۔ حکومت کی تاریخی تبدیلی کے ساتھ عوام کو غلامی کی زنجیروں اور مستبد حکومت سے اپنی آزادی دوبارہ حاصل ہوئی۔ بکسال حکومت کے خاتمے پر عوام کے بے ساختہ جشن و انبساط اور کھنڈکر مشتاق احمد کی حکومت کو ملنے والی پُرجوش حمایت نے ثابت کر دیا بکسال کی حکومت عوامی خواہشات اور تمناؤں کے ساتھ کوئی میل نہیں رکھتی تھی۔

عوامی لیگیوں کی ایک بڑی اکثریت بھی شیخ مجیب کی یک حزبی مطلق العنان آمریت کی حمایت میں نہیں تھی۔ لوگوں کی پرزور حمایت نے 15 اگست کے انقلاب کو ایک عوامی انقلاب میں تبدیل کر دیا تھا۔ بنگلہ دیش کے جرأت مند عوام نے ماضی میں بھی ہر قومی بحران میں ہمیشہ درست فیصلہ دیا تھا اور انہوں نے 15 اگست کے انقلاب کی خود بخود اپنے طور پر حمایت کرتے ہوئے ایک مرتبہ پھر اس حقیقت کو ثابت کر دیا تھا۔ بغیر کسی کے اکسانے کے عوام کی بے مثال اور پُرجوش شمولیت نے اگست انقلاب کو اخلاقی جواز بھی مہیا کر دیا تھا۔

4 اپریل 1979ء کو پارلیمنٹ میں اس وقت کے سپیکر مرزا غلام حفیظ نے کہا تھا ''15 اگست 1975ء کو شیخ مجیب الرحمٰن سیاسی تبدیلی کے نتیجے میں مارے گئے تھے۔'' یہ بات بالکل درست تھی۔ شیخ مجیب الرحمٰن اور چند دوسرے لوگوں کی افسوس ناک موت کسی بھی طور پر معمول کی ہلاکت یا قتل نہیں تھا۔ ان کی زندگیاں ایک مقبول انقلاب کے دوران مسلح جھڑپ میں ضائع ہوئی تھیں، جو ایک سیاسی تبدیلی لانے کے لیے برپا کیا گیا تھا۔ اسی دن اس وقت کے وزیراعظم مسٹر شاہ عزیز الرحمٰن نے صدر ضیاالرحمٰن کی اجازت سے بڑے واضح انداز

میں اپنی تقریر میں، جو انہوں نے ایوان میں کی تھی، شیخ مجیب کی ناکامی کے سیاسی پہلوؤں پر روشنی ڈالی تھی۔ انہوں نے کہا، ''25 جنوری 1975ء کو جس انداز میں کالا قانون پارلیمنٹ میں صرف 15 منٹوں کے اندر منظور کیا گیا اور یک حزبی حکومت کا جوا آٹھ کروڑ عوام کی گردنوں پر رکھ دیا گیا تھا وہ ایک آئینی بغاوت کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ 15 اگست 1975ء کا فوجی انقلاب اس یک حزبی فاشسٹ بغاوت کے خلاف تھا۔'' بعد میں اسی اجلاس میں انہوں نے سزاؤں سے استثنیٰ کا بل پیش کیا۔ یہ بل پارلیمنٹ کے 300 ممبران میں سے 241 ووٹوں سے پاس ہوا، جو کہ دو تہائی سے زاید اکثریت تھی۔ اس طرح یہ بل قانون اور پانچویں ترمیم کے طور پر آئین کا حصہ بن گیا۔ اس طرح براہ راست منتخب صدر ضیاالرحمٰن اور منتخب پارلیمنٹ کی بی این پی حکومت نے 15 اگست کے انقلاب کو قانونی استحقاق مہیا کرتے ہوئے اس کے حق میں حتمی فیصلہ دے دیا۔

اس پس منظر میں کس توجیح کی بنیاد پر شیخ حسینہ اور ان کی جماعت عوامی لیگ ڈھنڈورا پیٹ رہی ہے کہ شیخ مجیب کی مطلق العنان فاشسٹ حکومت کا خاتمہ اور چند افراد کی افسوس ناک موت ''قتل'' کا سیدھا سادا جرم ہے جس کا ارتکاب چند ناراض اور قواعد وضوابط سے عاری نوجوان فوجی افسران نے کیا؟ اگر یہ معاملہ تھا تو پھر کیوں حکومت کی تاریخی تبدیلی کے بعد مسلح افواج، بی ڈی آر، پولیس، قانون نافذ کرنے والی ایجنسیوں، عدلیہ، انتظامیہ، حتیٰ کہ راکھی باہنی کے سربراہان نے بھی کھنڈکر مشتاق احمد کی حکومت کی نہ صرف تائید کی بلکہ مکمل تعاون بھی پیش کیا؟ انہوں نے 15 اگست کے انقلاب کے حق میں بیان کیوں دیئے جو قومی سطح پر ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے نشر کیے گئے؟ پھر کیوں عوامی بکسال وادی رہنماؤں اور ارکانِ پارلیمنٹ نے کابینہ کی تشکیل کے لیے کھنڈکر مشتاق احمد کی حکومت میں شمولیت اختیار کی؟ کیوں جشن کے انداز میں خوشیاں مناتے ہوئے عوام کے ہجوم دارالحکومت ڈھاکہ سمیت تمام بڑے شہروں کی گلیوں اور سڑکوں پر اُمڈ آئے تھے؟ پُرجوش عوام نے کرفیو توڑ دیا، نعرۂ تکبیر اللہ اکبر، سینا باہنی زندہ باد، شیخ مجیب مردہ باد، بنگلہ دیش زندہ باد وغیرہ کے نعرے بلند کیے۔ بکسال کے بڑے بڑے لیڈران کیوں اُس دن ملک کے کسی بھی حصے میں احتجاجی جلوس نکالنے میں ناکام رہے؟ کسی میں بھی اتنی اخلاقی جرأت پیدا نہ ہوسکی کہ وہ میڈیا میں مجیب کے خاتمے کے خلاف کوئی بیان یا تبصرہ کرتا۔ یہ حقائق محض یہی ثابت کرتے ہیں کہ اگرچہ اگست کے انقلاب کی قیادت مسلح افواج کے محبِ وطن ارکان کے ہاتھوں میں تھی لیکن ان کے پیچھے اصل طاقت بنگلہ دیش کے باضمیر عوام کی تھی۔

اگر 15 اگست کا انقلاب نہ ہوتا تو کثیر الجماعتی سیاست آج بھی ایک دُور افتادہ حقیقت ہوتی۔ اس کے نتیجے میں 80 سے زائد سیاسی جماعتیں جو آج بنگلہ دیش میں موجود ہیں کثیر الجماعتی سیاست میں حصہ نہ لے سکتیں۔ حتیٰ کہ عوامی لیگ بھی نیا جنم نہ لے سکتی۔ قوم کو ایک غیر یقینی مدت تک ظلم واستبداد کا تکلیف دہ بوجھ اٹھانا پڑتا۔

1996ء کے انتخابات سے قبل شیخ حسینہ نے حجاب اوڑھ کر اور ہاتھ میں تسبیح تھام کر کھلے عام قوم کے سامنے عوامی بکسال کی ماضی کی غلط کاریوں کو تسلیم کیا اور عوام سے ووٹوں کی بھیک مانگی۔ لوگوں کو ووٹ کے

مؤثر استعمال سے گمراہ کرنے کے لیے اور 72ء اور 75ء کے دوران عوامی بکسال حکومت کی انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں اور انسانیت کے خلاف سرزد کیے جانے والے جرائم کے خوف کو عوام کے دلوں میں دوبارہ سر اٹھانے سے روکنے کے لیے بنگلہ دیش عوامی لیگ (بی اے ایل) نے بڑی چالاکی کے ساتھ اپنے 1996ء کے منشور میں اگست کے انقلاب یا ''قومی انقلاب اور یوم یک جہتی'' کا کسی بھی شکل میں کوئی حوالہ نہیں دیا تھا۔ اس قسم کی نمود ونمائش اور عبوری حکومت کے تحت بددیانت انتظامیہ کے بعض حلقوں کی جانب سے تعاون کے باوجود 1996ء میں شیخ حسینہ کی عوامی لیگ واحد اکثریتی جماعت نہ بن سکی۔ سابقہ فوجی حکمران جنرل ارشاد کے ساتھ ایک خفیہ معاہدے کے تحت عوامی لیگ جاتیو پارٹی کے ساتھ اتحاد قائم کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ حسینہ نے ارشاد کو رِہا کردیا جو خالدہ کے دورِ حکومت میں سنائی گئی سزا کاٹ رہے تھے۔ اگر ''بی این پی'' ''جے پی'' سے اتحاد قائم کر لیتی تو بھی بی اے ایل (بکسال عوامی لیگ) اقتدار میں واپس نہیں آ سکتی تھی۔ 21 سال کے لمبے عرصے کے بعد شیخ حسینہ نے اقتدار سنبھالنے کے بعد حجاب اور تسبیح کو پھینک دیا اور وہ اور ان کے ساتھی اپنے اصل رنگ میں دوبارہ سامنے آ گئے۔ حکومت تشکیل دینے کے فوراً بعد انہوں نے حکم دیا کہ ''قومی انقلاب اور یوم یک جہتی'' آئندہ حکومتی سطح پر نہیں منایا جائے گا۔ ان کی حکومت نے آئین کی تحقیر کرتے ہوئے غیر قانونی طور پر 1979ء کا سزاؤں سے استثنیٰ کا قانون ختم کردیا اور 15 اگست اور 7 نومبر کے ہیروز کو گرفتار کرلیا اور ''مجیب قتل'' اور ''جیل قتل'' کے نام سے دو مقدمات کا آغاز کردیا۔ اس طرح شیخ مجیب کی قابل احترام جانشین شیخ حسینہ اور ان کی عوامی لیگ نے 1996ء سے 2001ء تک اپنے پانچ سالہ دورِ حکومت میں موجودہ نسل کو اپنے بے رحمانہ فاشسٹ کردار اور رونگٹے کھڑے کردینے والے خوف ناک ماضی سے دوبارہ روشناس کروا دیا۔ انہوں نے یہ بھی ثابت کردیا کہ ان میں اور ان کی جماعت میں کسی قسم کی تبدیلی رونما نہیں ہوئی بلکہ وہ پہلے سے زیادہ ظالم اور منتقم بن چکی ہے۔ عوام پریشان اور غصے میں تھے۔ اس کے نتیجے میں 2001ء کے انتخابات میں عوام نے عوامی لیگ کو ایک مرتبہ پھر تاریخ کے کوڑے دان میں پھینک دیا۔ حسینہ اور ان کی جماعت کو شرم ناک شکست کا سامنا کرنا پڑا۔

اب میں مختصراً سزاؤں سے استثنیٰ کے قوانین پر بحث کروں گا جو بنگلہ دیش کی حکومتیں گاہے بہ گاہے وضع کرتی رہی ہیں۔ اب تک موجودہ اور سابقہ حکومتوں کے وضع کردہ سزاؤں سے استثنیٰ کے قوانین کے حق اور مخالفت میں بہت کچھ لکھا اور کہا جا چکا ہے جن میں اکثر تحریریں نہ صرف الجھاؤ پیدا کرنے والی بلکہ قابل اعتراض بھی ہیں۔ اس قسم کی آئینی شقوں کے بارے میں عوامی لیگ نے سب سے زیادہ شور برپا کر رکھا ہے۔ شیخ حسینہ اپنی جماعت کی نسبت سے بھی زیادہ کینہ جُو نظر آتی ہیں۔ عوامی گھرانے کے چند معروف دانشوروں نے بھی اس غل غپاڑے میں اپنا حصہ ڈالنا شروع کر رکھا ہے۔ میں مناسب خیال کرتا ہوں کہ اس صورتِ حال میں بنگلہ دیش کے حوالے سے ایک شہری اور ایک ناچیز مجاہد آزادی ہونے کے ناتے سزاؤں میں استثنیٰ کے قوانین کے بارے میں چند حقائق قوم کے سامنے پیش کروں۔ مجھے امید ہے کہ اس سے میرے ہم وطنوں کو

سزاؤں سے استثنیٰ کے بارے میں اس ہیر پھیر کو سمجھنے میں کچھ مدد مل سکتی ہے جو مخصوص خفیہ مقاصد کے حصول کے لیے پیدا کیا جا رہا ہے۔ اس سے حقائق کی روشنی میں سچائی کی تلاش میں بھی مدد مل سکتی ہے۔

کولنز ڈکشنری میں لفظ indemnity کے معنی ''کسی پر عائد کی گئی سزا سے قانونی خلاصی'' ہیں۔

سزاؤں سے استثنیٰ کا قانون عام طور پر کسی ایسے شخص یا اشخاص کو ان کے کسی فعل یا افعال پر قانونی تحفظ دینے کے لیے وضع کیا جاتا ہے جس نے یا جنہوں نے یہ فعل یا افعال عوام اور ملک کے عظیم تر مفاد میں انجام دیئے ہوں۔ اس قسم کے سزاؤں سے استثنیٰ کے قوانین کے ذریعے ایسے تمام افعال اور اشخاص کو قانون کی عدالتوں میں مقدمات کا سامنا کرنے کے خلاف تحفظ فراہم کیا جاتا ہے۔

یہ عمل پہلی مرتبہ صرف بنگلہ دیش ہی میں متعارف نہیں کروایا گیا، اس کی بانی وہ نام نہاد تہذیب یافتہ اقوامِ عالم ہیں جو انسانی حقوق اور جمہوریت کی امین اور چمپئن ہونے کی دعوے دار ہیں۔ نہ صرف یہ، بلکہ یہ وہ ممالک ہیں، جنہوں نے اپنی مسلح افواج کو سول قوانین کے دائرۂ اختیار سے باہر رکھا ہوا ہے۔ اس قسم کا قانونی استثنیٰ مہیا کرنے کے لیے ہمیشہ عظیم تر قومی اور عوامی مفادات کو جواز بنایا جاتا ہے، جیسا کہ فاشسٹ ظالمانہ حکومتوں اور بے رحم آمریت سے چھٹکارا دلوانا، قومی آزادی اور خود مختاری پر بیرونی جارحیت کے خلاف دفاع کرنا، انسانی حقوق اور جمہوریت کو تحفظ دینا اور امن وامان کا قیام وغیرہ۔ اس حوالے سے آیئے اب بنگلہ دیش کی جانب واپس آتے ہیں۔

بنگلہ دیش میں سزاؤں سے استثنیٰ کا قانون سب سے پہلے شیخ مجیب الرحمٰن اور ان کی حکومت نے متعارف کروایا تھا۔ 1972ء میں ایک آرڈیننس کے ذریعے حکومت نے جنگ آزادی سے متعلق تمام کارروائیوں اور ان تمام افراد کو جن کا ان سے تعلق تھا، سزاؤں سے مستثنیٰ کر دیا تھا۔ یہ آرڈیننس بعد میں دو تہائی اکثریت کے ساتھ پارلیمنٹ میں ایک ایکٹ کے طور پر منظور کر لیا گیا۔ اس طرح یہ قانون آئین کا حصہ بن گیا۔ ایسا کرنے کی وجہ ملک اور عوام کے عظیم تر مفادات میں اُٹھائے گئے اقدامات کو تحفظ فراہم کرنا تھا۔ یہ قانون اس وقت کے مشرقی پاکستان کے عوام کی فوجی آمریت، ناانصافی، ظلم وستم اور استبداد کے خلاف جدوجہد کو قانونی جواز مہیا کرتا تھا۔ 6 مئی 1974ء کو شیخ مجیب الرحمٰن حکومت نے سزاؤں سے استثنیٰ کا دوسرا ایکٹ پاس کیا جس کا مقصد بدنامِ زمانہ راکھی باہنی اور اس کی تمام ظالمانہ سرگرمیوں کو تحفظ فراہم کرنا تھا۔

سزاؤں سے استثنیٰ کے پہلے قانون کے حوالے سے عوامی لیگ کے سیکریٹری جنرل مسٹر عبدالجلیل نے یہ کہتے ہوئے تصدیق کی تھی، ''عوامی لیگ کی حکومت نے 28 فروری 1972ء تک کی مدت کے لیے سزاؤں سے استثنیٰ کا اعلان کیا تھا'' (روزنامہ جگنتار، 13 مارچ 2003ء)۔ قائد حزب اختلاف شیخ حسینہ نے بھی اس وقت کے وزیر اعظم کے بیان کی تردید کرتے ہوئے اس حقیقت کو تسلیم کیا تھا۔ (روزنامہ جگنتار اور دیگر روزنامے، 13 مارچ 1972ء)۔ تاہم عبدالجلیل اور شیخ حسینہ دونوں سزاؤں کے اُس استثنیٰ کے بارے میں خاموش رہے جو راکھی باہنی کو دیا گیا تھا۔

صدر کھنڈ کر مشتاق احمد نے سزاؤں سے استثنیٰ کا تیسرا آرڈیننس 15 اگست 1975ء کے عوامی انقلاب کے بعد جاری کیا تھا۔ حکومت کی تاریخی تبدیلی کے بعد ملک میں عارضی طور پر ہنگامی حالت اور مارشل لاء کا نفاذ کر دیا گیا تھا۔ اس کے بعد صدر مشتاق احمد کو ایک آرڈیننس جاری کرنا پڑا جس میں انقلاب سے متعلق تمام کارروائیوں اور ان کے ساتھ منسلک تمام افراد کو سزاؤں سے استثنیٰ مہیا کیا گیا تھا۔ سزاؤں سے استثنیٰ کے اس قانون کی وجہ بھی وہی تھی جو پہلے دو قوانین کی تھی یعنی ملک اور عوام کا عظیم تر مفاد۔

15 اگست کا انقلاب یک حزبی ظالمانہ بکسال حکومت کے خلاف عوام کو ایذا رسانی اور حکومتی بد نظمی سے نجات دلانے اور بنیادی اور انسانی حقوق، جمہوریت اور قانون کی حکمرانی کی بحالی کے لیے منظم کیا گیا تھا۔ 3 نومبر 1975ء کو مسلح افواج کے اندر سے ایک شیطانی ٹولے نے جس کی قیادت بریگیڈیئر خالد مشرف کر رہے تھے، ایک رجعت پسندانہ انقلاب برپا کرنے کی کوشش کی۔ بریگیڈیر خالد اینڈ کمپنی نے پُر اسرار حالات میں فوجی کونسل کے نمائندے جنرل ضیا الرحمٰن کو، جو 15 اگست کے انقلاب کے بعد سے چیف آف آرمی سٹاف مقرر کیے گئے تھے، حراست میں لے لیا۔ اس سازشی انقلاب کا اصل مقصد پوری قوم کو 15 اگست سے پہلے والی صورتِ حال میں واپس دھکیلنا اور بکسال کو دوبارہ اقتدار میں لانا تھا۔ پوری قوم پریشان تھی۔ ملک میں ظلم و استبداد کی واپسی کے خوف سے مایوسی کی فضا طاری ہو چکی تھی۔

اگست کے انقلابیوں نے اس قوم دشمن شیطانی منصوبے کا مقابلہ کرنے کے لیے مناسب حکمت عملی سے کام لیا۔ فوجی کونسل کے اہم رہنما ملک سے باہر چلے گئے۔ خالد اور اس کے ساتھی سازشیوں کے چہروں کو بے نقاب کرنے کے لیے تمام انتظامات کر دیئے گئے تھے۔ واقعات بڑی تیز رفتاری سے وقوع پذیر ہوتے چلے گئے۔ عوامی لیگ کے ایم پی اور خالد کے بھائی راشد مشرف، ان کی ماں، ان کے گنتی کے چند قریبی رشتہ داروں اور کرائے کے لوگوں نے ڈھاکہ میں شیخ مجیب الرحمٰن کی تصویر اور بکسال کے نعروں کے ساتھ ایک جلوس نکالا جب کہ خالد کی خود اپنے آپ کو دی گئی اگلے عہدے پر ترقی اور چیف آف آرمی سٹاف کے طور پر تقرری کی خبر اخبارات میں اس کی تصویر کے ساتھ شائع کی گئی۔ ہماری عظیم قوم ایک مرتبہ پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔ فوجی کونسل نے 1 بنگال لانسرز، 2 فیلڈ آرٹلری اور انجینئرنگ، سگنل، آرڈیننس اور سپلائی کور کی یونٹوں، ایئر فورس، نیوی اور بنگال رجمنٹوں کے ارکان کی مدد سے جوابی کارروائی کا آغاز کیا۔ فوجی کونسل کے رہنماؤں اور ارکان کے ساتھ اگست انقلاب کے بڑے قابل اور بے لوث اگلی صفوں کے کمانڈروں نے ہندوستانی ایجنٹ خالد اور اس کی افواج پر حملے کی رہنمائی کی۔ 7 نومبر 1975ء کو کرنل ابو طاہر بیر اُتم جو فوجی کونسل سے مسلسل رابطے میں تھے، کی زیر قیادت گونو باہنی اگست کے انقلابیوں کے ساتھ شامل ہو چکی تھی۔ ''سپاہی جنتا ر بپلوپ'' (فوج اور عوام کا انقلاب) کا آغاز ہو چکا تھا۔ یہ جنگل کی آگ کی طرح پھیلتا اور اپنے راستے میں آنے والی ہر چیز کو نگلتا چلا گیا۔ خالد اور اس کے سازشی ساتھی افراتفری کے عالم میں اِدھر اُدھر بھاگے پھر رہے تھے۔ وہ اور اس کے چند قریبی ساتھی فرار ہونے کی کوشش میں اپنے ہی سپاہیوں کے ہاتھوں مارے گئے۔ ان سپاہیوں

کا تعلق اگر چہ ان کی اپنی بریگیڈ سے ہی تھا لیکن درحقیقت وہ اگست کے انقلاب کے ساتھ وفادار تھے۔ کچھ گرفتار کر لیے گئے جب کہ باقی ماندہ نے ہتھیار ڈال دیئے اور بپھرے ہوئے ہجوم کے ہاتھوں مارے جانے سے تحفظ طلب کر لیا۔ بکسال حکومت بحال کرنے کی ہندوستانی سازش، جس کی قیادت بریگیڈیر خالد کر رہا تھا، محض تین دن کے اندر اندر بری طرح ناکام ہو گئی۔ ضیا کو رہا کروا لیا گیا۔ پورے ملک میں جشن کا سماں تھا اور وہ اگست کے انقلاب کی بحالی کی خوشیاں منا رہے تھے۔

7 نومبر کے ''سپاہی جنتار پلوپ'' (فوجی عوامی انقلاب) کی قیادت اور منصوبہ بندی انہی محب وطن لوگوں کے ہاتھوں میں تھی جو اگست کے انقلاب کی روح اور جذبے سے سرشار تھے، اس لیے انہیں ایک مرتبہ پھر وہی بے پناہ ملک گیر حمایت حاصل ہوئی۔ لہٰذا یہ ایک منطقی اور قدرتی امر تھا کہ صدر کھنڈکر مشتاق احمد کے سزاؤں سے استثنیٰ کے آرڈیننس کے وقت اور دائرہ کار کو چند ترامیم کے ساتھ بڑھا کر 15 اگست سے 7 نومبر تک محیط کر دیا گیا اور یہ ترمیم شدہ آرڈیننس 1979ء میں اس وقت کی منتخب بی این پی کی حکومت اور صدر ضیاالرحمٰن کی قیادت میں آئین کی پانچویں ترمیم کے حصے کے طور پر ایک قانون کی صورت اختیار کر گیا۔

عوامی لیگ نے 1996ء اور 2001ء کے دوران 15 اگست اور 7 نومبر کے انقلابات اور ان کے رہنماؤں پر، جو بے لوث محب وطن تھے، مقدمات چلانے کو اپنی پہلی ترجیح بناتے ہوئے لوگوں کے اس اعتماد سے ایک مرتبہ پھر بے وفائی کی، جو انہوں نے 1996ء کے انتخابات میں اس پر کیا تھا۔ یہ ایک ایسی فاش غلطی تھی، جس کے نتیجے میں 2001ء میں بی این پی کی قیادت میں بننے والے اتحاد نے انتخابات میں ایک بڑی اکثریت کے ساتھ کامیابی حاصل کر لی۔ بی این پی نے دوتہائی سے زیادہ اکثریت کے ساتھ جوٹ سرکار (متحدہ حکومت) تشکیل دی۔ عوامی لیگ کی حکومت سے ورثے میں ملنے والی طوائف الملوکی اور ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوتی ہوئی انتظامیہ اور قانون نافذ کرنے والی ایجنسیوں کی مدد سے قابو پانے میں ناکامی کا سامنا کرتے ہوئے نئی منتخب حکومت نے محب وطن مسلح افواج کو سول انتظامیہ کی مدد کے لیے بلایا۔ یہ ایک ضروری قدم تھا تاکہ اپنے انتخابی وعدوں کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے ملک میں استحکام اور تحفظ کا ماحول پیدا کیا جا سکے۔ مسلح افواج نے قوم کے وسیع تر مفاد میں اس اہم ذمہ داری کو قبول کرتے ہوئے پورے خلوصِ دل سے ''آپریشن کلین ہارٹ'' کا آغاز کر دیا۔ حکومت نے امن و امان کی صورتِ حال پر گرفت حاصل کر لی جو بہت مختصر سے وقت میں متاثر کن حد تک بہتر ہو گئی۔ لوگوں نے ''آپریشن کلین ہارٹ'' کو خوش آمدید کہا۔

اس سلسلے میں جوٹ سرکار (متحدہ حکومت) نے سزاؤں سے استثنیٰ کا چوتھا بل ایوان میں دوتہائی اکثریت سے پاس کیا۔ سزاؤں سے استثنیٰ کا یہ ایکٹ بھی سابقہ تین کی طرح آئین کا حصہ اور قانون بن گیا۔ اس کا قانونی جواز دوبارہ قوم اور ملک کا عظیم تر مفاد ہی بیان کیا گیا ہے۔

اگر چہ بڑے پیمانے پر عوام کو سزاؤں سے استثنیٰ کے ان قوانین کے بارے میں کسی قسم کی شکایت نہیں ہے لیکن عوامی لیگ اور اس کے حواری شر انگیز طور پر سزاؤں سے استثنیٰ کے تیسرے اور چوتھے قانون کی

مخالفت میں بدمعاش بنے ہوئے ہیں جب کہ سزاؤں سے استثنیٰ کے پہلے دو قوانین کے بارے میں مکارانہ خاموشی اختیار کیے ہوئے ہیں جو شیخ مجیب الرحمٰن کی حکومت نے پاس کیے تھے۔ اب وہ بی این پی کی جوٹ سرکار کو نقصان پہنچانے کی نیت سے سزاؤں سے استثنیٰ کے تیسرے اور چوتھے قوانین کے خلاف غیر معقول اور بے بنیاد پروپیگنڈا کرنے میں دن رات مصروف ہیں۔

1996ء میں عوامی لیگ نے شیخ حسینہ کی قیادت میں بڑی بے شرمی اور ڈھٹائی کے ساتھ سزاؤں سے استثنیٰ کے تیسرے قانون کو ختم کر دیا جو 15 اگست اور 7 نومبر کے انقلابات کے دوران میں اُٹھائے گئے اقدامات کو استثنیٰ مہیا کرتا ہے اور جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے، ''مجیب قتل'' اور ''جیل قتل'' کے نام سے دو مجرمانہ مقدمات کا آغاز کر دیا گیا ہے۔ یہ آئین کی کھلم کھلا خلاف ورزی کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ جب عوامی لیگ کے اس غیر قانونی عمل کو عدالت میں چیلنج کیا گیا تو حکومت نے گنتی کے چند عوامی لیگ نواز وکلا کے ذریعے ایک (amices curie) (کسی قانونی معاملے میں رضا کارانہ تعاون کرنے والا) تشکیل دی، جس نے ششدر کر دینے والی یہ رائے دی کہ سزاؤں سے استثنیٰ کا 1975ء کا آرڈیننس، سزاؤں میں استثنیٰ کا 1979ء کا ایکٹ اور پانچویں ترمیم آئین کا جزو لاینفک نہیں ہیں اور یہ بنیادی انسانی حقوق کے خلاف ہیں لہٰذا کالے قانون ہیں، لہٰذا حکومت کا ان کو دو تہائی اکثریت کے بغیر ختم کر دینا قاعدے کے مطابق ہے۔ اس کے بعد عدالت نے حکومت کے دباؤ میں آ کر اس رائے پر کسی قسم کی سماعت سے انکار کر دیا۔ اس قسم کا رویہ کسی بھی طور پر ایک عاقبت نااندیش غیر ذمہ داری کو ظاہر کرتا ہے۔ آئینی طور پر عدالت سے جب استفسار کیا جائے تو وہ کسی بھی قانون کی تشریح کرنے کا اختیار رکھتی ہے۔ لیکن عوامی لیگ کے ایک پُر جوش حامی ادارے کے ذریعے رائے دینا کہ آئین میں بغیر دو تہائی اکثریت کے ترمیم کرنا قانون کے مطابق اور جائز ہے، نہ صرف آئین کی صریح نفی ہے بلکہ تمام اُن اخلاقیات اور اصولوں کی تحقیر ہے، جن پر یہ قوانین استوار ہیں۔ ایسے وکلا جو حکومتی بچہ جمہوروں کی طرح حکومتی دباؤ یا اپنے ذاتی مفادات کی خاطر خود اپنی اخلاقیات اور پیشہ ورانہ دیانت داری کا جنازہ نکال دیتے ہیں اور عدلیہ کے مقدس چہرے کو دھندلانے کا سبب بنتے ہیں، تاریخ کے کوڑے دان کا حصہ بن جاتے ہیں۔ اس قسم کا فعل ہمیشہ قابل افسوس اور قابل سزا گردانا جاتا رہے گا۔

جوٹ سرکار کے وزیر قانون و پارلیمانی امور بیرسٹر مودود احمد نے 2001ء کے انتخابات کے نتیجے میں اقتدار میں آنے کے بعد ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا، ''آپریشن کلین ہارٹ وقت کی ضرورت تھا۔ 14 کروڑ لوگوں کے انسانی حقوق کے تحفظ کے لیے چند افراد کے انسانی حقوق کی خلاف ورزی کو ناگزیر ضرورت کے طور پر حکومت کو قبول کرنا پڑا تھا۔ سزاؤں سے استثنیٰ کا یہ قانون مسلح افواج کی توقیر کو بچانے کے لیے پاس کرنا پڑا تھا۔'' سزاؤں سے استثنیٰ کے قانون کے حوالے سے انہوں نے مزید کہا کہ راکھی باہنی نے اپنی کارروائیوں کا آغاز یکم فروری 1972ء سے کیا تھا۔ لیکن قانون 8 مارچ 1972ء کو بنایا گیا تھا۔ باہنی نے 40 ہزار افراد کو قتل کیا لیکن اس قسم کے کسی ایک قتل کا مقدمہ بھی نہ چلایا جا سکا کیوں کہ ایکٹ میں ترمیم کر دی

گئی جسے 6 مئی 1974ء کو پارلیمنٹ میں منظور کر لیا گیا۔ اس طرح آرٹیکل 16 قانون اور آئین کا حصہ بن گیا جس نے ان کی تمام کارروائیوں کو سزاؤں سے استثنٰی دے دی تھی۔ لہٰذا راکھی باہنی کو سزاؤں سے استثنٰی دینے کے بعد عوامی لیگ کو موجودہ سزاؤں سے استثنٰی کے قانون پر تنقید کرنے کا کوئی حق نہیں رہتا۔ (روزنامہ جگنتار، 13 مارچ 2003ء)۔

یہ حقیقت میں ایک ٹھوس دلیل ہے!

یہ سزاؤں سے استثنٰی کے 1979ء کے ایکٹ اور آئین میں پانچویں ترمیم پر بھی برابر لاگو ہوتی ہے جو اگست کے انقلاب اور سپاہی جنتا ر بپلوب کی تمام کارروائیوں کو بھی سزاؤں سے استثنٰی مہیا کرتی ہے۔ یہ روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔ اس کے لیے کسی قسم کے تفصیلی دلائل کی ضرورت نہیں ہے۔ نظیر کی موجودگی، قانون کی اپنی نوعیت اور آئین میں ترمیم کا طریقہ کار جیسا کہ ہمارے آئین میں صراحت کی گئی ہے، اس قدر واضح ہیں کہ ایک عام آدمی بھی سمجھ جائے گا کہ سزاؤں سے استثنٰی کا ایکٹ 1979ء اور پانچویں ترمیم آئین کا لاینفک حصہ ہیں۔ اسے دوتہائی اکثریت کے بغیر ختم نہیں کیا جا سکتا۔ عوامی لیگ کا اسے سادہ اکثریت سے ختم کرنا کوئی قانونی بنیاد نہیں رکھتا۔ اس لیے سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق ''مجیب قتل'' اور ''جیل قتل'' کے نام سے سیدھے سادے قتل کے مقدمات کا آغاز غیر آئینی، غیر قانونی، مضحکہ خیز اور نامعقول فعل ہے۔ اس کے خالق جو بھی ہیں اور جو بھی کردار انہوں نے ادا کیا ہے، خواہ وہ فعال ہے یا منفعل، انہوں نے قانون اور آئین کے خلاف ایک گھناؤنا جرم کیا ہے۔ تاہم عزت مآب وزیر مودود احمد نے حیران کن طور پر اپنے بیان میں اس کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ ان کی جانب سے یہ فروگزاشت جان بوجھ کر تھی یا نہیں یہ صرف وقت ہی بتائے گا۔ معاملہ جو بھی ہو ان کے متذکرہ بالا دلائل کی بنیاد پر عوام جائز طور پر ایک اور سوال کر سکتے ہیں۔

''عزت مآب وزیر قانون مودود احمد کیا آپ اس بات کی وضاحت کرنا گوارا کریں گے کہ 15 اگست اور 7 نومبر کے ہیرو کیوں سلاخوں کے پیچھے ابھی تک موت کی کال کوٹھڑیوں میں گل سڑ رہے ہیں؟ کس اخلاقی یا قانونی جواز پر موجودہ جوٹ سرکار جو قوم پرست حکومت ہونے کی دعوے دار ہے، ان کی اس حالت زار اور بدحالی سے آنکھیں بند کیے ہوئے ہے۔ عوام یہ توقع کرتے ہیں کہ جوٹ سرکار کو سزاؤں سے استثنٰی کے تیسرے قانون کو فوری بحال کرنا چاہیے اور اس کے تحفظ کے لیے ایک ایسا ناقابل تنسیخ قانون وضع کرنا چاہیے کہ آئندہ کوئی بھی شخص آئین کی تحقیر کرنے کا سوچ بھی نہ سکے اور اس کے ساتھ ہی حکومت کو فوری طور پر اعلان کرنا چاہیے کہ عوامی لیگ کی حکومت جس نے سزاؤں سے استثنٰی کے تیسرے قانون کو ختم کر دیا تھا اور 15 اگست اور 7 نومبر کے انقلابات کے رہنماؤں کو مضحکہ خیز فوجداری مقدمات کی آڑ میں مارنے کا ناپاک منصوبہ تیار کیا تھا جو دراصل تمام کے تمام نڈر مجاہدین آزادی اور محب وطن مسلح افواج کے سابقہ ممبران ہیں۔ یہ حقیقت میں ایک ستم ظریفی ہے کہ قوم کے یہ ہیرو ابھی تک موت کی کال کوٹھڑیوں میں اذیت ناک غیر انسانی سلوک کا نشانہ بنے ہوئے ہیں جب کہ بی این پی کی حکومت اقتدار میں ہے۔ عوام کے ذہنوں میں پائی جانے والی تمام

غلط فہمیوں کو دُور کرنے کے لیے بیگم خالدہ ضیا کی زیر قیادت جوٹ سرکار کو ان تمام افراد کو بغیر کسی مزید تاخیر کے فوری طور پر رہا کر دینا چاہیے اور ان لوگوں کی واپسی کا راستہ صاف کرنا چاہیے جو جلا وطنی کی زندگیاں بسر کر رہے ہیں۔ صرف یہ کام کر کے ہی موجودہ جوٹ سرکار عوام کے سامنے اپنی نیک نیتی اور آئین کی بالادستی قائم رکھنے کے اپنے عزم صمیم کو ثابت کر سکتی ہے۔

اس حقیقت کو سمجھنے کی انتہائی ضرورت ہے کہ کسی کو بھی قومی تفاخر کو مجروح کرنے کی گنجائش نہ دی جائے۔ یہ قومی یک جہتی، آزادی، خودمختاری اور استحکام کی حفاظت کی آخری آزمودہ چیز ہے۔

موجودہ جوٹ سرکار کی رہنما بیگم خالدہ ضیا کو ذاتی طور پر بہت سے لوگ پسند کرتے ہیں۔ لوگوں کے دلوں میں مزید گہری جگہ بنانے کے لیے ان کے اس تاثر کو مزید تقویت دینے کی اشد ضرورت ہے۔ ان کے اس تاثر میں مزید اضافہ اس وقت کی انتظامیہ کے پیدا کردہ بہت سے تضادات کو ختم کرنے کے لیے خاص طور پر مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔ بنگلہ دیش کے جرأت مند عوام، اس کی محب وطن مسلح افواج اور حقیقی قوم پرست حکومتی بدنظمی، بدعنوانی، قومی غداروں اور ان کے غیر ملکی آقاؤں کے شیطانی منصوبوں کے خلاف شفافیت اور جرأت کے فقدان کی وجہ سے قیادت کا ایک خلا محسوس کر رہے ہیں۔ قوم پرست ایک ایسا رہنما چاہتے ہیں جو عوام پر اعتماد کرتا ہو اور سچا قوم پرست ہوتا کہ ایک ایسی طاقت و رقوت منظم کی جا سکے جو ملک کے اندر اور باہر تشکیل دیئے جانے والے شیطانی منصوبوں کو ناکام بنا سکے۔ عوام ایک قوم کے طور پر ہماری ناقص کارکردگی اور ترقی پر نظریں گاڑے ہوئے ہیں اور ایک حقیقی اور تبدیلی کے خواہاں ہیں۔ تبدیلی ضرور آئے گی۔ سوال یہ ہے کہ یہ تبدیلی کب، کس کی قیادت میں اور کتنی ہمہ گیر ہو گی۔

ملک اور قوم کو کثیر الجہتی سازشی سرگرمیوں سے بچانے کے لیے کوئی بھی جماعت یا موجودہ جوٹ سرکار تنہا کچھ نہیں کر سکتی۔ نہ صرف اس حکومت کو، بلکہ مستقبل کی تمام قوم پرست حکومتوں کو بھی، ہمارے جرأت مند عوام اور محب وطن مسلح افواج، دونوں پر برابر کا انحصار کرنا ہو گا۔ تاریخی طور پر کوئی بھی شخص اب اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ یہ بات ایک ثابت شدہ حقیقت بن چکی ہے۔

اس حقیقت کو تسلیم کر لینا انتہائی دانش مندی ہو گی۔ اگر ایسا نہیں کیا جاتا تو پھر جنگ آزادی، 26 مارچ 1971ء کو میجر ضیا کا جنگ آزادی کی ابتدا کا اعلان، اگست کا عظیم انقلاب، جس نے بنیادی حقوق اور جمہوریت کی بحالی کی صبح نو کا آغاز کیا اور 7 نومبر کا فوجی عوامی انقلاب جس نے اگست کے انقلاب کے آگے بڑھنے کے راستے کو صاف کیا، جیسے عظیم واقعات ہمارے قومی فخر اور قوت کے سرچشموں کے طور پر اپنے پُرجوش جذبے اور روح سے عاری ہو جائیں گے۔ ہمیں ان شان دار اور درخشاں واقعات کی اصل روح کو، جو لوگوں کے دلوں میں جاگزیں ہیں، محفوظ رکھنے اور پروان چڑھانے کی ضرورت ہے۔ یہ واقعات ہماری قومی بقا کی روح کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اگر ہم ان تاریخی واقعات کو مناسب قدر شناسی کے ساتھ عزت و توقیر دینے میں ناکام ہو جاتے ہیں تو پھر ہم اپنے اخلاقی دیوالیہ پن اور پست ہمتی کے نتیجے میں ناکامی کی

راہوں پر چل نکلیں گے۔

اس طرح کے قعرِ مذلت میں گرنے اور قابلِ رحم بے طاقت پسماندگی سے قبل اپنے قومی وجود کو مضبوط ترین کرنا اور اوّلین ترجیح کے طور پر اس صورتِ حال کو مکمل طور پر تبدیل کرنا لازم ہے۔ چنانچہ اس سے قبل کہ بہت دیر ہو جائے، ایسے تمام قوانین اور متعلقہ آئینی شقوں کو مزید مضبوط اور غیر مبہم بنانا ضروری ہے۔ اگر ضروری ہو تو اس ضمن میں مناسب آئینی ترامیم اور نئے قوانین بھی بنا دینے چاہئیں۔ اس طرح مسلح افواج اور قوم پرستوں کو آئینی استثنائی قوانین کے ذریعے حاصل جائز تحفظ یقینی ہو جائے گا۔ انہیں کسی کی خواہش پر قومی مفاد کو سر بلند کرنے کی بنا پر تختہ دار پر نہیں کھینچا جا سکتا۔ صرف ایسی ہی مؤثر آئینی شقیں اور قوانین موجودہ اور مستقبل کے بنگلہ دیش کو بچا سکتے ہیں۔ ایسے اقدامات ہی آنے والے تمام وقتوں میں بنگلہ دیش کو حقیقی نا قابلِ تسخیر قلعہ میں تبدیل کر سکتے ہیں۔ جو کچھ اوپر عرض کیا گیا ہے، جتنی جلدی قومی رہنما اور عوام اس کی اہمیت کو سمجھ لیں، اُتنا ہی ملک اور قوم کے لیے بہتر ہوگا۔

ہماری محبِ وطن مسلح افواج اور حقیقی قوم پرستوں نے ہمارے پیارے وطن کے مستقبل کو سنوارنے کے لیے بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ اعلانِ آزادی کرتے ہوئے، جنگِ آزادی لڑتے ہوئے، مجیب کے جبر و استبداد کو کچلنے کے لیے اگست کا عظیم انقلاب برپا کرتے ہوئے، سپاہی جنتر بپلوب کے ذریعے اگست کے انقلاب کے ثمرات کو تحفظ دینے کے لیے جس نے ہندوستان نواز بکسال وادی رجعت پسندوں کی سازش کو کچل دیا تھا، وہ پرعزم انداز میں اپنے مؤقف پر ڈٹے رہے۔ یہ چاروں تاریخی واقعات ایک قوم کے طور پر ہمارے خود مختار وجود کے لیے مرکزی حیثیت کے حامل ہیں اور ایک دوسرے سے خلقی طور پر جڑے ہوئے ہیں۔ ان کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا اور جیسے جیسے ہمارے وجود کو خطرہ محسوس ہوتا رہا ہے، یہ یکے بعد دیگرے فطری انداز میں جنم لیتے رہے ہیں۔ آزادی کے اعلان کے بغیر جنگِ آزادی کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ یہی تعلق اگست کے انقلاب اور سپاہی جنتار بپلوب کے درمیان ہے۔ بغیر اگست کے عظیم انقلاب کے اس کے ثمرات کو تحفظ دینے کے لیے سپاہی جنتار بپلوب وقوع پذیر نہیں ہو سکتا تھا۔

یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم آج بھی جماعتی بنیادوں پر ان اہم قومی واقعات پر منقسم ہیں۔ عوامی لیگ جنگِ آزادی کی ابتدا اور اس کی قیادت کا اعزاز تنہا حاصل کرنے کے لیے مصر ہے اور اس اٹل حقیقت کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہے کہ اعلانِ آزادی ضیاالرحمٰن نے کیا تھا۔ وہ حقیقت کو مسخ کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ اسی طرح 15 اگست کے انقلاب کو جماعتی مفادات کے ہاتھوں میں لڑکھڑاتا ہوا چھوڑ کر بی این پی کی حکومت نے 7 نومبر کے سپاہی جنترا بپلوب کو ''قومی انقلاب اور یومِ یک جہتی'' قرار دیتے ہوئے اسے قومی چھٹی کے طور پر منانے کا اعلان کیا۔ عوامی لیگ نے اپنے دورِ حکومت میں اسے ختم کر دیا اور بی این پی نے واپس آ کر پھر بحال کر دیا۔ اگست کے انقلاب کو یومِ حساب کے طور پر تسلیم کرنا تو کجا، عوامی لیگ نے دو حزبی سیاست کے ذریعے اسے عدالتی کارروائی کا نشانہ بنا دیا اور جوٹ سرکار نے ابھی تک اس کو ختم کرنے کے لیے

کچھ نہیں کیا۔ یہ تاریخ کو درست کرنے کا بہترین موقع ہے۔ فولاد جیسا مضبوط اتحاد، جس کی ہر قوم کو آگے بڑھنے کے لیے ضرورت ہوتی ہے، صرف سچائیوں کو تسلیم کرنے سے جنم لیتا ہے۔ محض فصیح و بلیغ تقریروں اور جھوٹے بھیس اپنانے سے نہیں۔

15 اگست اور 7 نومبر کے واقعات ایک دوسرے سے جدا نہیں کیے جا سکتے۔ ان دونوں تاریخی انقلابات کے پیچھے ایک ہی جذبہ اور قوت کارفرما تھی۔ اس لیے یہ کہنا انتہائی مناسب ہوگا کہ ''قومی انقلاب اور یوم یک جہتی'' کی اصل روح، اہمیت اور خوب صورتی کو سمجھنے کے لیے اور قومی وجود پر نقش کرنے کے لیے 7 نومبر اور 15 اگست میں سے کسی ایک کو اہمیت دینا یا تسلیم کر لینا کافی نہیں۔ عوام کو عظیم تر قومی مفاد میں قربانیاں دینے کے لیے تیار کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ان دونوں کامیاب انقلابات کو ان کے شانِ شایان اور برابر کی عزت و توقیر کے ساتھ تسلیم کیا جائے۔ اس دلیل کی معقولیت عام آدمی اور خاص طور پر نئی نسل کی سمجھ میں تب ہی آ سکتی ہے اگر انہیں 15 اگست اور 7 نومبر کے درمیانی عرصے میں وقوع پذیر ہونے والے پس پردہ واقعات اور حالات سے پوری سچائی کے ساتھ آگاہ کیا جائے۔ گزشتہ ابواب میں ان پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ اگست کے انقلاب نے عوامی بکسال حکومت کے سیاہ باب کا خاتمہ کیا تھا اور جمہوریت، بنیادی وانسانی حقوق اور قانون کی حکمرانی بحال کرتے ہوئے بنگلہ دیش کی سیاسی تاریخ میں ایک نئے افق کی نوید دی تھی جب کہ 7 نومبر کا ''سپاہی جنتا ر بپلوب'' سازشیوں اور ان کے غیر ملکی آقاؤں کے شیطانی منصوبے کو ناکام کرتے ہوئے اگست کے انقلاب کو ہی آگے لے جانے اور اس کی روح کو دوبارہ بحال کرنے کے لیے منظم کیا گیا تھا۔

مندرجہ بالا حقائق کو مدنظر رکھتے ہوئے کیا یہ جائز ہوگا کہ 15 اگست کو نظرانداز کرتے ہوئے محض 7 نومبر کو ''قومی انقلاب اور یوم یک جہتی'' کے طور پر تسلیم کیا جائے؟ کیا ان دونوں عہد ساز، کامیاب اور مقبولِ عام انقلابات کو ایک دوسرے سے پیوست تسلیم کرتے ہوئے برابر کا درجہ نہیں ملنا چاہیے؟ میں اس کا فیصلہ اپنے پیارے ہم وطنوں کے ضمیر پہ چھوڑتا ہوں۔

بھارت امریکہ گٹھ جوڑ اور جنوبی ایشیا کا مستقبل

لوگ دنیا کے سات عظیم عجائبات کے بارے میں بات کرتے ہیں لیکن میرے لیے سب سے حیرت انگیز عجوبہ ہندو غلبے کے تحت برصغیر میں مسلمان اقلیتی آبادی کا اپنے لیے ایک الگ وطن کا قیام ہے۔ مسلمانوں کی ان تھک جدوجہد کے پس منظر میں برٹش راج اوران کی شریک کار انڈین کانگرس کو، جس پر اونچی ذات کے برہمنوں کا تسلط تھا، مسلمانوں کے الگ وطن کے مطالبے کو متذبذب طور پر منظور کرنا پڑا اور یوں پاکستان وجود میں آیا۔

بنگالی مسلمانوں نے ہندوستان کے مختلف علاقوں کے مسلمانوں کے ہمراہ اس جدوجہد میں ہر اول کردار ادا کیا۔ ہندوستان کی دیگر مختلف اقوام نے بھی ایسے مطالبات کیے لیکن ان کی شنوائی نہ ہوئی۔ آزادی کے لیے ان کی جدوجہد مرکز کے انتہائی جوروستم کے باوجود اب بھی جاری ہے۔ بعض پر سفاکانہ طور پر غلبہ پالیا گیا اور بالآخران کا الحاق کرلیا گیا۔ تاہم مکار نوآبادیاتی آقاؤں نے روانگی سے قبل کانگرس قیادت کو یقین دلایا تھا کہ پچاس برس کے عرصے کے دوران تقسیم شدہ حصہ یعنی پاکستان ایک بار پھر ''بھارت ماتا'' کا حصہ بن جائے گا۔ اِس کتاب کا کور ''بھارت ماتا'' (اکھنڈ بھارت) کی عکاسی کرتا ہے۔

منصوبے کے حصے کے طور پر آزادی کے بعد بھارتی حکومتی اشرافیہ کو جاگیرداری نظام ختم کرنے، آزاد اور خودمختار ریاست کے لیے موزوں ریاستی ڈھانچے اور حکومتی اداروں، قومی دفاع، قانون نافذ کرنے والے اداروں اور آزاد عدلیہ کی تشکیل نو کی تلقین کی گئی تھی۔ قوم کی تعمیر میں مؤثر کردار ادا کرنے کے لیے عوام کی نچلی سطحوں تک اختیارات کی تقسیم۔ آئین کے ضمانت شدہ گورننس کی ہر سطح پر چیک اینڈ بیلنس کے ضروری سیف گارڈز۔ یوں ایک ترقی یافتہ اور خوش حال بھارت کی تعمیر کے لیے ایک ٹھوس مضبوط بنیاد رکھی گئی۔ برمحل سماجی اقتصادی اقدامات کے ذریعے ایک زرعی پس منظر رکھنے والے معاشرے کے عوام کی بڑی اکثریت کی بہتری اور ترقی میں تسلسل کو برقرار رکھنے کے لیے عوام دوست پالیسیاں اختیار کی گئی ہیں۔

اس کے برعکس، نئے جنم لینے والے پاکستان کے ساتھ کیا کیا گیا، آزادی کے فوراً بعد نوآبادیاتی کرتا دھرتاؤں نے نہ صرف نوآبادیاتی ریاست اور انتظامی ڈھانچے کو برقرار رکھنے بلکہ اسے مزید مضبوط بنانے

کے لیے اپنی پٹھو، نااہل، انتہائی بدعنوان، موقع پرست، ابن الوقت اور بے رحم حکمران اشرافیہ کی حوصلہ افزائی کی تا کہ غاصب اپنی جاگیردارانہ ذہنیت کے ساتھ اپنے اقتدار کو دوام بخش سکیں۔ اصل نیت نااہل حکمران طبقہ اشرافیہ کو عوام کی بڑی اکثریت سے الگ تھلگ کر دینے کی تھی تا کہ یہ اپنے وابستہ مفادات کے تحفظ کی خاطر اپنے غیر ملکی آقاؤں کے مکمل طور پر محتاج ہو جائیں۔ یوں صرف 2 فیصد ''امیر طبقے'' کی جانب سے اندھیر نگری یا خراب حکمرانی، بے رحم جور وستم، قومی مفادات پر سمجھوتہ کرتے ہوئے قومی وسائل کی لوٹ مار کا آغاز ہو گیا۔ نتیجے کے طور پر قومی وسائل کا 80 فیصد سے زائد حصہ اب اس چھوٹے سے ٹولے کے قبضے میں ہے اور باقی 98 فیصد عوام اب غلاموں کے طور پر وجود رکھتے ہوئے اس پھندے میں بہ مشکل سانس لے رہے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اگر داخلی حقائق راہ نہ دیں تو کوئی بھی بیرونی طاقت اس ملک کے داخلی معاملات میں مداخلت نہیں کر سکتی۔ پاکستان کے معاملے میں غیر ملکی طاقتوں کی نمائندہ حکومت اشرافیہ کی جانب سے یہ ایونیو پوری طرح کھلا تھا کہ وہ اپنے درپردہ ایجنڈا کے نفاذ کے لیے، پاکستان کو کمزور اور تباہ کرنے کے لیے مختلف بھیس میں اپنا نیٹ ورک تشکیل دیں اور پورے ملک کو مشکل میں ڈال دیں۔ اسی پر بس نہیں، ہمیں یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ دشمن نے کیسے اپنے سول اور فوجی حاشیہ برداروں کی چشم پوشی کے ساتھ، جواب بھی ریاستی طاقت واختیار پر قبضہ کیے ہوئے ہیں، اپنے ایجنڈا کو قدم بہ قدم آگے بڑھایا۔

عظیم چینی ماہر تزویرات اور فلسفی سن زو (Sun-t Zu) کا کہنا ہے، ''جنگ ایک خطرناک اور تباہ کن کھیل ہے۔'' اس سنہری مقولے سے کوئی سبق حاصل نہ کیا گیا۔

اپنے غیر ملکی آقاؤں کے اُکسانے پر حکمرانوں نے 1948ء میں، جب ملک اپنے ابتدائی تشکیلی مراحل میں تھا، کشمیر میں مہم جوئی کا آغاز کیا اور اس سے بھارتی فوج کو کشمیر میں داخل ہو کر قبضہ کرنے کا بہانہ میسر آ گیا۔

بعد ازاں، 1965ء میں ایک اور جنگ کا آغاز کیا گیا، جس میں ہمیں املاک اور جانوں کے شدید نقصان کا سامنا ہوا اور بھارتی افواج کو مزید آگے بڑھ کر کشمیر کے دو تہائی حصے پر قبضے کا موقع مل گیا۔

1971ء میں اس وقت کی فوجی انتظامیہ اور اقتدار کے بھوکے سیاست دانوں کے ناپاک اتحاد نے ملک کو دو ٹکڑے کر دیا، جس کے ساتھ ساتھ سیز فائر یا فائر بندی کی لائن کی حیثیت بھارتی مقبوضہ کشمیر کی حقیقی سرحد میں تبدیل کر دی گئی۔ متذکرہ بالا کسی بھی بحران میں، سینٹو اور سیٹو کے رکن کے طور پر ہمارے مفروضہ اتحادی اینگلو امریکن nexus ان مصائب سے ہمیں نکالنے کو آگے نہ آئے۔ یہ ہے انعام جو ہمیں یک طرفہ خارجہ پالیسی پر عمل درآمد کے نتیجے میں ملا۔ یہ کتاب ماضی میں کی جانے والی ہولناک غلطیوں اور حماقتوں کو آشکار کرتی ہے، جو قوم دشمن حکومتی ٹولے نے اپنے غیر ملکی گروؤں کی ہدایت پر کی تھیں۔ کیا ہم نے ایک قوم کے طور پر اور ہماری موجودہ سیاسی اور فوجی قیادت نے اس شرم ناک ماضی سے کوئی سبق حاصل کیا ہے؟ کیا ہم دوستوں اور دشمنوں میں پہچان کرنے کے قابل ہو پائے ہیں؟ ان سوالات کے جوابات صرف اس ''بڑے

کھیل'' کے اختتام پر ہی حل پا ئیں گے، جو ابھی جاری ہے۔

''برصغیر کی سرحدیں 2020ء سے 2025ء تک تبدیل ہو جائیں گی۔''اکھنڈ بھارت'' (بھارت ماتا) کے قیام نو کا خواب مکمل ہونے (یا تعبیر پانے) کی راہ پر ہے۔'' یہ امریکی محکمہ دفاع کی ایک رپورٹ کی شہ سرخی ہے۔اس رپورٹ کی روشنی میں پینٹا گون کی جانب سے برصغیر کے مستقبل کے نقشے کا ایک خاکہ بھی کھینچا گیا ہے جس میں پاکستان، بنگلہ دیش، نیپال، سری لنکا اور مالدیپ کی موجودہ سرحدیں مٹادی گئی ہیں اور پورے خطے کو انڈیا کے طور پر دکھایا گیا ہے۔یہ اس کی پالیسی دستاویز ''ایشیا2025ء'' میں موجود ہے۔

18 ستمبر 2000ء کو انڈیا کے انتہائی بااثر ہفت روزہ ''آؤٹ لک'' نے ''گریٹ گیم'' پر ایک کور سٹوری شائع کی۔ ابتدائی طور پر برصغیر بھر کے بیشتر دانش وروں نے اس معاملے کو محض بھارتی میڈیا کا پروپیگنڈا جانا۔ تاہم خطے میں ہونے والے حالیہ واقعات، خصوصاً پاکستان اور بنگلہ دیش کی مکمل دستاویز ''ایشیا2025ء'' ابھی تک کلاسیفائیڈ ہے اور شائع نہیں کی گئی۔

تاہم ہفت روزہ آؤٹ لک، 17 مارچ 2000ء کے دی واشنگٹن پوسٹ اور 24 ستمبر 2000ء کے سنگاپور کے ایک روزنامے سٹریٹ ٹائم، میں دستاویز ''ایشیا2025ء'' کا متعلقہ خلاصہ لیڈ سٹوری کے طور پر شائع کیا جاچکا ہے۔

دی واشنگٹن پوسٹ نے اپنی سٹوری میں تحریر کیا:

گزشتہ سال نیول کالج، روڈ آئی لینڈ میں ماہرین کے ایک پینل کا بند کمرے کا اجلاس منعقد ہوا، جس کی سربراہی انتہائی قابل احترام، زیرک اور انتہائی تجربہ کار مسٹر آندرے مارشل نے کی۔ ماہرین کے اس اجلاس کے بعد پینٹا گون کو پیش کرنے کے لیے ''ایشیا2025ء'' کے عنوان سے اسسٹنٹ سیکریٹری آف ڈیفنس کے لیے ایک دستاویز تیار کی گئی۔

سنگاپور سٹریٹ ٹائم کے مطابق، مسٹر مارشل اوران کے پینل کی تیار کردہ دستاویز چائنا سینٹرک تھی۔

دستاویز میں ایشیا کی ارضی تزویراتی یا جیوسٹریٹیجک صورتِ حال سے متعلق پانچ منظرنامے پیش کیے گئے تھے۔

1)۔ تیل اور قدرتی گیس کی بڑھتی ہوئی طلب کے باعث امریکن نیکسس، مشرق وسطیٰ اور انڈونیشیا پر کہ یہ امریکہ اور اس کے یورپی یونین کے مغربی اتحادیوں کو تیل اور گیس کے بنیادی فراہم کار ہیں، کنٹرول کو مزید بڑھائے گا۔ اسی طرح ایران، وسطی ایشیا، بنگلہ دیش، خلیج بنگال اور میانمار کی براعظمی پٹی پر بھی نگاہ رکھی جائے گی۔

2)۔ تمام ریاستی اداروں کے مکمل طور پر تباہ ہونے پر پاکستان 2020ء تک ایک ناکام ریاست بن جائے گا۔ بری گورننس اور حد سے زیادہ بدعنوانی کے باعث تباہ ہوتی سماجی اقتصادی صورتِ حال غربت زدہ آبادی کی اکثریت کے لیے زندگی کو ناقابل برداشت بنا دے گی، جس کا نتیجہ کنٹرول سے باہر انارکی کی صورت میں نکلے گا۔ یوں ملک اپنی علاقائی سالمیت کھودے گا۔ تقریباً اسی طرح ہفت روزہ آؤٹ لک نے تحریر

کیا، ''2020ء تک پاکستان مکمل تباہی کے دہانے پر ہوگا اور اپنی خودمختاری کھودے گا۔ حکومت کو اسلام پسند جہادیوں پر کوئی کنٹرول نہ رہے گا جو ملک پر اختیار حاصل کرلیں گے اور کشمیر میں داخل ہونے کی کوشش کریں گے۔ بھارت اس وقت پاکستان پر اس اشتعال بھری مداخلت کو روکنے کے لیے دباؤ ڈالے گا۔ جب پاکستان جہادیوں کو روکنے یا ان پر کنٹرول پانے میں ناکام ہوگا تو بھارتی افواج موجودہ لائن آف کنٹرول کو پار کرتے ہوئے آزاد کشمیر میں داخل ہوجائیں گی۔ اپنے دفاع کے طور پر پاکستان ایٹمی ہتھیاروں کے استعمال کی دھمکی دے گا۔ چین، پاکستان کے اتحادی کے طور پر اس کی حمایت کرتے ہوئے نیپال اور بھوٹان کے درمیان ''چکن نیک'' (بھارتی سرزمین کا 75 کلومیٹر علاقہ) کو قطع کرنے کے لیے اپنی افواج کو آگے بڑھادے گا۔ اس پر بھارت کو اپنی سات شمال مشرقی ریاستوں اروناچل، میزورام، منی پور، تری پورہ، میگھالیا، ناگالینڈ اور آسام (جنہیں سات بہنوں کے نام سے جانا جاتا ہے) کی سلامتی اور دفاع سے متعلق سنگین خطرہ لاحق ہوجائے گا جو 1947ء سے بھارتی یونین سے الگ ہونے کی خاطر آزادی کی جنگ جاری رکھے ہوئے ہیں۔ اس منظرنامے میں امریکہ، بھارت کے سٹریٹجک اتحادی کے طور پر، پہلے تو جنگ سے باز رہنے کی اپیل کرے گا مگر پھر اپنا بحری بیڑہ چین کو الٹی میٹم کے طور پر خلیج بنگال میں اتار دے گا۔ تاہم یک قطبی دنیا کی واحد سپر پاور اور اس کے اتحادیوں کے پاس دنیا بھر میں نمٹنے کے لیے مزید مسائل بھی ہوں گے۔ یہ خدشہ محسوس کرتے ہوئے کہ پاکستان ''پہلے حملے'' کا آپشن اختیار کرسکتا ہے، بھارت اس کے ایٹمی اثاثوں اور تنصیبات کو روایتی ہتھیار استعمال کرتے ہوئے تباہ کرنے کی کوشش کرے گا لیکن کامیاب نہ ہو پائے گا۔ بدلے میں، جیو یا مرو کی صورتِ حال کا شکار پاکستان تعداد میں اپنے سے کہیں زیادہ بڑی حملہ آور بھارتی افواج پر ''پہلے حملہ'' کرنے پر مجبور ہوجائے گا۔ امریکہ دونوں ممالک کو ایٹمی تصادم میں عجلت پر اکسائے گا۔ ایک بار ایٹمی تصادم شروع ہونے پر بھارت کے انتہائی درست وار ہیڈ سے مسلح امریکی بیڑوں سے بی ٹو سٹیلتھ بومبرز کے حملوں سے امریکہ، پاکستان کے باقی ماندہ ایٹمی اثاثے اور تنصیبات تباہ کردے گا اور اسے کسی بھی ایٹمی صلاحیت سے مکمل طور پر محروم کردے گا۔ امریکہ اور اس کے سٹریٹجک پارٹنر بھارت کی جانب سے طاقت کے اس ہولناک مظاہرے کے بعد چین، بھارت کی مقبوضہ شمال مشرقی ریاستوں سے واپس چلا جائے گا۔ اس مرحلے پر پورا غیر مستحکم پاکستان اس ناقابل تصور جھٹکے کے باعث خونیں انتشار کا شکار ہوجائے گا۔ تب بھارت امن کی بحالی کے لیے بڑی فوج کے ساتھ پاکستان میں داخل ہو جائے گا۔ لیکن اصل عزائم آزاد بلوچستان، سندھ، شمال مغربی سرحدی صوبے (پختونخوا) اور کشمیر کے قیام میں مدد دیتے ہوئے پاکستان کو غیر مستحکم کرنے کے ہوں گے۔ وہ شمال مشرقی سات ریاستوں کو بھی ان کے عوام کی آرزوؤں کی تکمیل کرتے ہوئے آزادی دے دیں گے۔ یہ تمام چھوٹی ریاستیں بتدریج اپنی حفاظت کی غرض سے بھارت کی کنفیڈریشن کے تحت آجائیں گی۔ ایک بار کنفیڈریشن یا وفاق کے قیام کے بعد مغربی پنجاب اپنے الگ وجود کے ساتھ قائم رہنے کے قابل نہ رہے گا اور یوں منطقی نتیجے کے طور پر مشرقی اور مغربی پنجاب باہم ضم ہوجائیں گے اور کنفیڈریشن کا حصہ بن جائیں گے۔

3)۔ سب سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ حقیقت ہے کہ بالکل تذکرہ نہیں کیا گیا کہ بنگلہ دیش، نیپال، بھوٹان، سری لنکا اور مالدیپ اس کنفیڈریشن کا حصہ کیسے بنیں گے جب کہ نقشے میں ان تمام ہمسایہ ممالک کو ''گریٹر انڈین یونین'' یعنی ''بھارت ماتا'' کا لازمی حصہ دکھایا گیا ہے۔

4)۔ امریکہ کے ماہنامے ''اٹلانٹک'' کے ستمبر 2000ء کے شمارے میں مسٹر رابرٹ کیپلن نے، جو کہ پینٹا گون کے ایک اعلیٰ عہدیدار ہیں، ایک اور منظر نامے کا انکشاف کیا ہے۔ اپنے تجزیاتی مضمون میں انہوں نے تحریر کیا، ''پاکستان کو سابقہ یوگوسلاویہ کی طرح ٹکڑے ٹکڑے کیا جا سکتا ہے۔'' نیویارک ٹائمز کے 18 نومبر 2000ء کے کالم میں انہوں نے لکھا، ''جنرل مشرف کے دور میں پاکستان کے ایٹمی اثاثوں اور تنصیبات کو مخفی رکھنے کے لیے لوکیشنز کی تلاش میں امریکہ، پاکستان کی مدد کرتا رہا تھا۔'' مسٹر رابرٹ کیپلن، برصغیر پاک و ہند کے معاملات پر پینٹا گون کے مشیر اعلیٰ ہیں۔ اپنی حال ہی میں شائع ہونے والی کتاب میں انہوں نے ایک نقشہ بھی فراہم کیا ہے جس میں عکاسی کی گئی ہے کہ مستقبل قریب میں برصغیر کیسا دکھائی دے گا۔

5)۔ یہ اب ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ نیو کانز کے کنٹرول کے تحت طاقت ور بین الاقوامی میڈیا پہلے ہی دنیا بھر میں چھوٹے ممالک خصوصاً تیسری دنیا کے نوآبادیاتی ورثہ رکھنے والے ممالک کی قومی آزادی اور خودمختاری کے خلاف دلائل دیتے ہوئے ایک پرجوش مہم کا آغاز کر چکا ہے۔ امریکہ اور اس کے یورپی یونین کے اتحادیوں کی زیرنگرانی نیو کانز کے بھاری مالیاتی وسائل کے ساتھ را (RAW) کے کارکن یا ماہرین انٹرنیٹ بلاگز اور ساؤتھ ایشین اینلسز گروپ (SAAG) جیسے ویب سائٹ فورمز کے ذریعے کام کر رہے ہیں، جیسا کہ www.dividepakistan.blogspot.com اور www.saag.org وغیرہ۔ یہ انتہائی مؤثر پروپیگنڈا میکنزم کے Gobbolian ورژن کی جدید نقلیں ہیں۔ یہ حیرت انگیز ہے کہ مستقبل کے ایسے تمام نقشے مسٹر رابرٹ اور ''ایشیا 2025ء'' کے برصغیر کے نقشوں سے مشابہ ہیں۔ اس بدخواہ پروپیگنڈے کا زیادہ دلچسپ پہلو پاکستان، بنگلہ دیش، نیپال اور سری لنکا میں قومی افواج کو بدعنوان حکومتی اشرافیہ اور اس کی ہم کار سماجی اشرافیہ کے ذریعے اپنے ہی ہم وطنوں کے خلاف کھڑے ہونے پر اکسانا ہے۔ اگر ہم آزادی کے بعد کی ماضی کی تاریخ پر نظر دوڑائیں اور ہر واقعے کو موجودہ منظر نامے کے تناظر میں دیکھیں تو کوئی بھی باشعور شخص یا سچا محب وطن اوپر متذکرہ باتوں کو نظر انداز کرنے کا متحمل نہیں ہو سکتا ہے۔

پاکستان، اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا عطا کردہ تحفہ ہے جو ہم تک ہمارے محبوب اور عظیم رہنما قائداعظم ؒ کے ذریعے پہنچا، جو ایک مضبوط عقیدے اور یقین کے حامل شخص تھے۔ وہ ایک ایسے شخص تھے، جنہیں نایاب صلاحیتوں اور الہامی خوبیوں سے نوازا گیا تھا۔ انہوں نے تقریباً تن تنہا ناقابل تسخیر مشکل حالات کے خلاف جنگ کی اور اپنے مشن میں کامیابی حاصل کرتے ہوئے ہندو چانکیہ اور برٹش راج دونوں کو شکستِ فاش سے دوچار کیا۔ پاکستان ایک حقیقت بن سامنے آیا اور وہ ہم پر پاکستان کو ایک طاقت ور، ترقی یافتہ اور خود انحصار ملک بنانے اور عزت و وقار کے ساتھ اقوام عالم میں اپنا مقام بنانے کی بھاری ذمے داری ڈالتے ہوئے خود

ابدی سفر پر روانہ ہو گئے۔

ہندو، پاکستان کی تخلیق کو بھی قبول نہ کر سکتے تھے خصوصاً اوپری طبقے کی حکمران اشرافیہ کہ اس نئے ملک کے قیام نے ان کے بھارت پر مسلمانوں کے ایک ہزار سالہ دورِ حکومت کا بدلہ لینے کے خواب کو چکنا چور کر دیا تھا۔ انہوں نے مسلمان حکمرانوں کو شکست دینے اور برٹش راج قائم کروانے کے لئے انگریز حملہ آوروں کے ساتھ سازباز کی تھی تا کہ انہیں یہ موقع مل سکے لیکن اللہ کی مرضی کچھ اور ہی تھی۔

ایک الگ وطن کے طور پر پاکستان کے قیام نے لاکھوں مسلمانوں کو ہندوستان میں حکومتی طبقہ امرا کی ابدی غلامی سے بچا لیا تھا۔ نام نہاد سب سے بڑی جمہوریہ اور سیکولر ملک ہونے کا پروپیگنڈا کیے جانے والے بھارت میں تقریباً 20 کروڑ بدقسمت مسلمان دیگر اقلیتوں کے ساتھ دوسرے درجے کے شہریوں کی حیثیت سے قابل اندازہ حد تک امتیازی سلوک برداشت کرتے ہوئے اپنی زندگیاں گزار رہے ہیں۔ یہ بھی ایک ذومعنی اور شرمناک بات ہے کہ تقریباً 18 کروڑ پاکستانی بھی الگ وطن کے قیام کے کم و بیش 65 سال بعد تک بھی قائداعظمؒ کے خوابوں کو شرمندۂ تعبیر کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ہم قائد کی راہ سے بھٹک چکے ہیں۔

آج پاکستان کا وجود خطرے میں ہے۔ قوم گویا مکمل تباہی کے دہانے پر کھڑی ہے۔ ایسی سنگین صورتِ حال میں حکمران ٹولے اور نام نہاد سماجی اشرافیہ کے کیچڑ اچھالنے اور الزام دہی کے ڈراموں میں ملوث ہونے کی بجائے، محروم اور جور و ستم کا شکار سچے مسلمانوں کی بڑی اکثریت (98 فیصد) کو ان تمام رکاوٹوں کو توڑنے اور راستے سے ہٹانے کا فیصلہ کرنا ہوگا جو اپنے وابستہ درپردہ مفادات رکھنے والے طبقات اور ان کے غیر ملکی آقاؤں کی جانب سے تقسیم کرنے اور حکومت کرنے کے لیے ارادتاً یا مقصد کے تحت قائم کی گئی تھیں۔ اب وقت آ گیا ہے کہ وہ مذہب، ذات اور نسل سے بالاتر ہو کر قائداعظمؒ کے نقوشِ قدم کی پیروی میں پاکستان کے وجود اور استحکام کے دفاع اور حفاظت میں متحد ہو کر اٹھ کھڑے ہوں، قبل اس کے کہ یہ جنت ہم سے چھن جائے۔ دوسرا کوئی آپشن نہیں ہے۔ ایسے سنگین خطرے کے مقابل کیا ہمیں اپنے ماضی کی تاریخ سے سبق سیکھنے سے انکار کر دینا چاہیے کہ تاریخ خود کو دہرانے لگے! وگرنہ 1971ء میں تو ملک کو دو ٹکڑے کر دیا گیا تھا مگر اس مرتبہ پاکستان کو بالکل نیست و نابود کر دیا جائے گا۔

لیفٹیننٹ کرنل (ر) شریف الحق دالیم

1946ء میں پیدا ہونے والے شریف الحق نے بی ایس سی کرنے کے بعد 1964ء میں پاکستان ائیر فورس میں شمولیت اختیار کی۔ 1965ء کی پاک بھارت جنگ کے بعد وہ فضائیہ سے بری فوج میں آ گئے اور اپریل 1971ء تک خدمات انجام دیتے رہے۔ وہ پاک آرمی کے بنگالی افسران کے اُس پہلے گروپ کے لیڈر تھے، جو مغربی پاکستان سے فرار ہو کر 1971ء میں بنگلہ دیش کی جنگ آزادی میں شامل ہوا۔ انہیں بنگلہ دیش میں شجاعت کے اعلیٰ ترین اعزاز ''بیر اتم'' سے نوازا گیا۔

بانی اراکین میں سے ایک ہونے کے طور پر انہوں نے بنگلہ دیش کی فوج کو منظم کرنے میں بے پناہ حصہ ڈالا۔ 1974ء میں شیخ مجیب کی آمرانہ حکومت کے تحت صدارتی حکمنامے (PO-9) کے تحت انہیں جبراً ریٹائر کر دیا گیا۔ اس تاریخی انقلاب کے بعد، جس کے نتیجے میں بنگلہ دیش کی حکومت 15 اگست 1975ء کو تبدیل ہوئی، انہیں فوج میں دوبارہ بحال کرتے ہوئے لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے پر ترقی دے دی گئی۔

1976ء میں وزارتِ خارجہ نے ان کی خدمات حاصل کیں اور انہیں عوامی جمہوریہ چین میں سفیر کے طور پر تعینات کر دیا گیا۔ 1980ء میں وہ لندن کے بنگلہ دیش ہائی کمیشن سے منسلک ہو گئے۔ 1982ء میں انہیں ہائی کمشنر کے طور پر ہانگ کانگ میں تعینات کر دیا گیا۔ 1988ء میں انہیں کینیا اور اس کے ساتھ ساتھ تنزانیہ میں بنگلہ دیش کے ہائی کمشنر کی ذمہ داریاں تفویض کی گئیں۔ انہیں UNEP اور HABITAT میں بھی بنگلہ دیش کی مستقل نمائندگی کا موقع ملا۔

صومالیہ کی جنگ کے دوران، انہیں اقوامِ متحدہ کی امن فوج کے حصے کے طور پر صومالیہ روانہ کئے جانے والے بنگلہ دیشی دستوں کے مفادات کی دیکھ بھال کی اضافی ذمے داریاں بھی سونپی گئیں۔ 1995ء میں وہ گورنمنٹ سروس سے ریٹائر ہو گئے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد انہوں نے اپنے بزنس کا آغاز کیا۔ وہ شادی شدہ ہیں اور ان کی ایک بیٹی ہے۔ ان کے مشغلوں میں سیاحت، کتب بینی، سپورٹس اور موسیقی شامل ہیں۔